



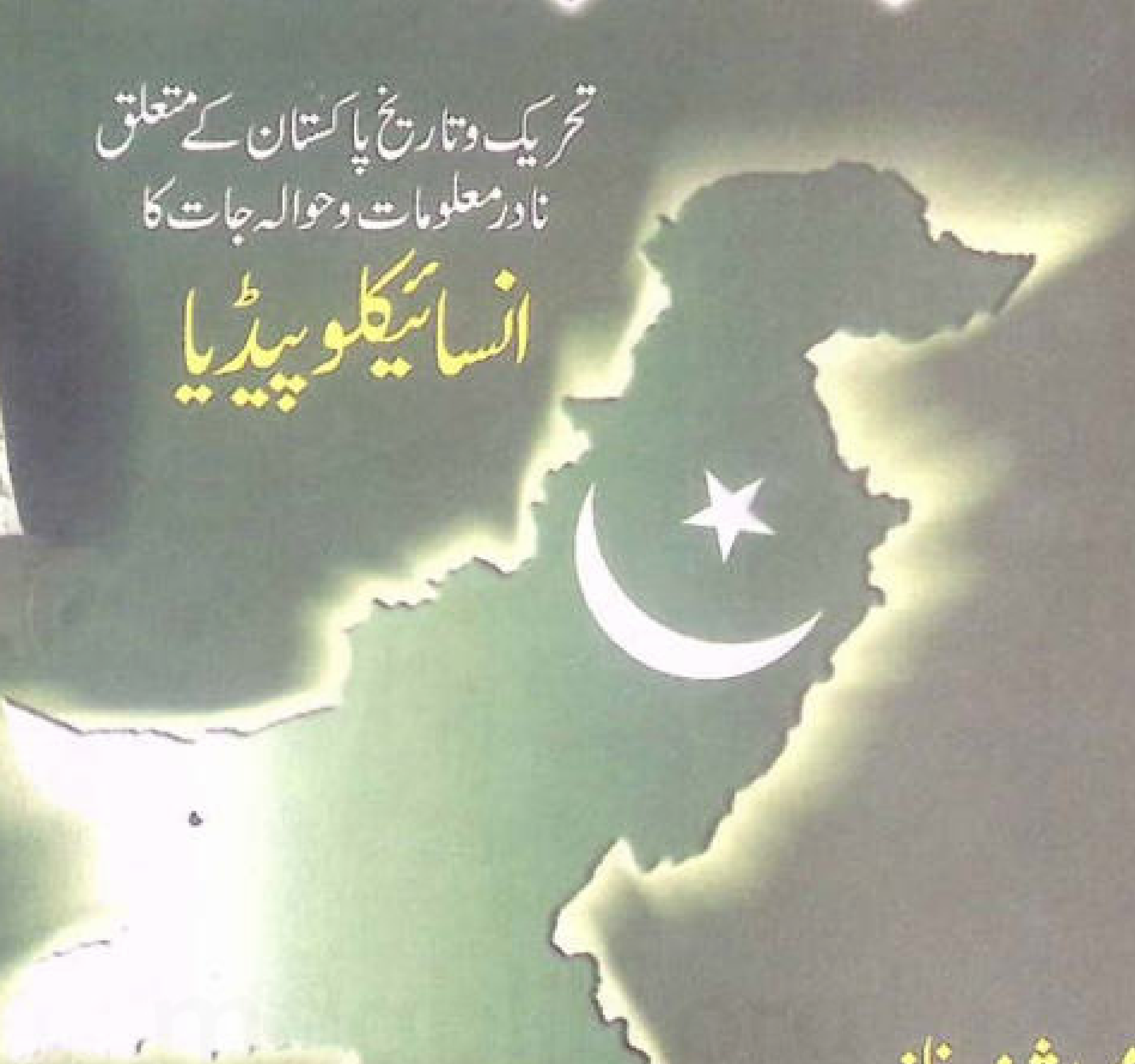
اقبال اور قائد کے

پاکستان پہ کیا گزری؟

تحریک و تاریخ پاکستان کے متعلق
نادر معلومات و حوالہ جات کا

انسائیکلوپیڈیا





محمد اشرف ظفر

سر سید ریسرچ اکیڈمی

اقبال اور قائد کے

پاکستان پہ کیا گزری؟

تحریک و تاریخِ پاکستان کے متعلق
نادر معلومات و حوالہ جات کا

انسائیکلوپیڈیا

محمد اشرف ظفر

سرسید ریسرچ اکیڈمی
309۔ جی ٹی روڈ لاہور

نام کتاب: اقبال اور قائد کے پاکستان پہ کیا گزری؟

مصنف: محمد اشرف ظفر

ناشر: سرسید ریسرچ اکیڈمی
309۔ جی ٹی روڈ لاہور

مطبع: معراج دین پرنٹرز لاہور

قیمت: -/950 روپے

قیام پاکستان کا مقصد
علامہ اقبالؒ کی نظر میں

"اس مملکت کے قیام سے اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے، اس سے نہ صرف اس کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی۔ بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

خطبہ الٰہ آباد -- ۱۹۳۰ء

اس سے قبل بھی انہوں نے سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں اپنے خطبات تشکیل جدید کے چھٹے خطبہ میں کہا تھا کہ

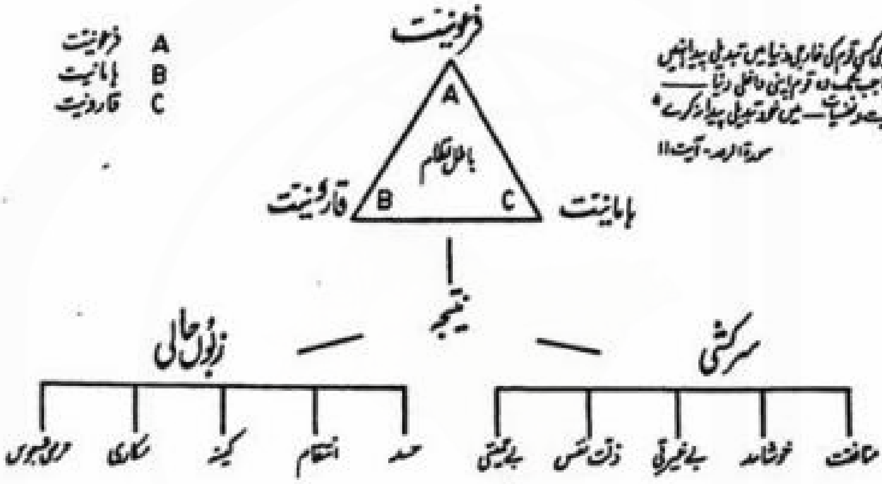
"ہمارے لئے کشاد کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ آئینہ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کر دیا جائے اور حریت، اسالیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سر نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیل جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو"

منفی رویّے

(بحوالہ قرآن حکیم)

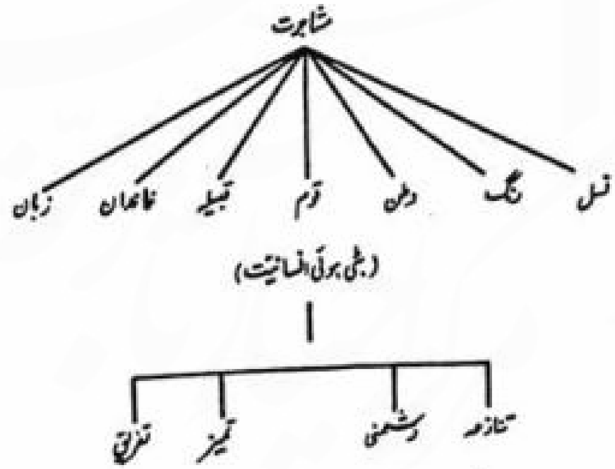
"خدا بھی کسی قوم کی خارجی دنیا میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا —— نفسیات —— میں خود تبدیلی پیدا نہ کرے"

سورۃ الرعد۔ آیت ۱۱



(ننگِ انسانیت)

ہلاکتِ انسان



آشفتہ حالی

انجمن تحقیق و تدریس علوم و ادبیات قرآن

فہرست مشمولات

سولھواں باب

قائداعظم اور علامہ اقبال کی رفاقت ۴۶۰

سترہواں باب

پاکستان کے سابقہ حکمران کردار کے آئینہ میں ۴۶۵

اٹھارھواں باب

سیاسی فرقہ بندی

انیسواں باب

دنیا کی حالت زار

دیباچہ

ہمارے اس دَور کے ماہرِ سیاسیات ایچ۔ جے مینکن (H.J. MENCKEN) نے اپنی کتاب TREATISE ON RIGHT AND WRONG میں لکھا ہے:

"تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے۔ اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لیے آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقع محیرالعقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جراُت آزما تھیں۔ لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا نتیجہ حسرت ویاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت کا خاکہ کھینچ لینا اور بات ہے، اور عملی طور پر اسے نافذ کرنا اور بات۔ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ جب حکومت ہاتھ آجاتی ہے تو اس پبلک کی حکومت نہیں بلکہ سلب و نہب ہوتا ہے۔"

مندرجہ بالا حقیقتِ حال کے پیشِ نظر اگر یہ پوچھا جائے کہ آخر ایسا کیوں ہے تو اس کا جواب علامہ اقبال کے الفاظ کے علاوہ اور کچھ ہو نہیں سکتا کہ ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں
راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات

یہی وہ بنیادی خامی تھی جس کے پیشِ نظر خدائے علیم نے نوعِ انسانی کو قرآن حکیم کی روشنی عطا فرمائی تاکہ وہ زندگی جیسی عظیم نعمت کو "زبوں کارِ حیات" ہونے سے محفوظ رکھ سکے۔ چنانچہ نبی اکرم ؐ نے آج سے چودہ سو سال پیشتر اس وحیِ خداوندی کی روشنی میں ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کی جس سے مقصود یہ تھا کہ آنے والی نسلیں اِس پیش کردہ قرآنی تعلیم پر قولاً اور فعلاً ایمان لا سکیں۔ لیکن افسوس کچھ ہی عرصہ بعد امتِ مسلمہ وحی کے اس متعین کردہ راستے پر گامزن نہ رہی اور آہستہ آہستہ اس کی حالت بھی اس اونٹنی کی سی ہوگئی جو کمزور و ناتواں ہونے کے باعث اپنے قافلے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور مضمحل ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ

اُمّتِ مسلمہ کی اس زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے علامہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

رشتۂ وحدت چو قوم از دست داد
صد گرہ بر روئے کار ما فتاد!

جب اُمّتِ مسلمہ نے وحدت و یکجہتی کے مشرب کو خیرباد کہہ دیا اور اُمّتِ واحدہ فرقوں میں تبدیل ہوگئی تو ہمارے ہر کام میں ہزاروں رخنے پڑنے شروع ہوگئے۔ ہماری کامیابی کا راز ملّت کی وحدت میں تھا۔ جب یہ وحدت گئی تو ہماری سرفرازیاں بھی ختم ہوگئیں۔ اب ہماری حالت یہ ہے کہ ؎

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم
ہمدم و بے گانہ از یک دیگریم!

ہم تعداد کے لحاظ سے تو کثیر ہیں لیکن ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے انفرادی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم بظاہر ایک دوسرے سے واقف اور قریب ہیں لیکن درحقیقت ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا اور اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے محور کے گرد گھومتا ہے۔ ہمارا نصب العین حیات اور ایک روشِ زندگی نہیں۔ اِسی لیے قائدِ اعظم نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے اہلِ پاکستان سے اپیل کی تھی کہ:

"اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے کہ آپ کچھ بھی ہوں اوّل و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لیے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ مملکت ہے۔ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ سندھی کی ہے اور نہ پٹھان کی بلکہ یہ آپ سب کی ہے۔ اس لیے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لیے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے ویسی ہی لعنت جیسی فرقہ بندی شیعہ سنی کی تفریق ہے۔"

لیکن ملّتِ اسلامیہ ہزار سال سے مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کی اسی لعنت میں گرفتار ہے جس کی بنیادی وجہ علامہ اقبال کی نظر میں صرف یہ ہے کہ:

"عربی اسلام ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے (کیونکہ) ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں اور ان کو عربی اسلام اس کے نصب العین اور اس کی غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔" (بحوالہ انوارِ اقبال۔ صفحہ ۹۳-۱۹۲)

چنانچہ اسی نصب العین حیات اور اس روشِ زندگی کے فقدان کے باعث نہ تو یہ اُمّت خود اُمّتِ واحدہ

رہی اور نہ ہی دنیائے عالم کو نیشنلزم کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کے نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے ترغیب دے سکی۔ وہ نیشنلزم جس پر تبصرہ کرتے ہوئے اہلِ یورپ کے ایک مفکر نے کہا تھا کہ:

"نیشنلزم جسے ہم نے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے اس کی وجہ سے دنیا قریب پچاس ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہے جنہیں اقوامِ عالم کہا جاتا ہے یہ ان میں سے ہر قوم کا "ملکی" مذہب ہے۔ یعنی خدا کی بجائے قوم کی پرستش جسے اعلیٰ اقتدار کا مظہر سمجھا جاتا ہے اور ان پچاس دیوتاؤں میں سے ہر ایک دیوتا کا پجاری باقی انچاس پجاریوں کو ملکیتی تصور کرتا ہے۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتا ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت خدائے واحد اور احترامِ آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی انائیت خود اور اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ نفرت اور جنگ کا جواز ہی نہیں بلکہ اس کا وجوب ہوتا ہے یاد رکھیے ہر نیشلزم ایک ملت پرستانہ مذہب ہے۔" (انسان نے کیا سوچا صفحہ ۲۴۱-۲۴۰ از پرویز)

ہماری یہی وہ بے اعتنائی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صدر ایوب خاں مرحوم نے ایک مرتبہ قاہرہ یونیورسٹی میں ایک ایسی تقریر کی تھی کہ جس کا ایک ایک لفظ آج بھی ہر صاحبِ دردِ دل کے لیے بانگِ درا کا کام دے گا۔ آپ نے فرمایا:

"جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا۔ اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل متحرک اور حرکت بخش ضابطہ حیات بنے۔ محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس دنیا میں جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے۔ اور عصرِ حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے

کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دُور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے
تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ
کی غلامی سابقہ دَور کی غلامی کے مقابلہ میں بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔" (ڈان ۱۵ نومبر ۱۹۶۰)

راقم نے اس مہلت کے وقفے کے پیشِ نظر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کی خارداروادی سے تصنیف و تالیف کی شکل میں، جو یہ خار اپنی پلکوں سے چلنے کی کوشش کی ہے وہ صرف اور صرف اس لیے ہے کہ آج کا انسان قرآنی معاشرہ کی اس فردوس گم گشتہ کو پانے میں کامیاب ہوسکے جس فردوس کی بادِ نسیم اور جس کے پھولوں کی مہک کسی نفسیاتی بیماری کو باقی نہیں رہنے دیتی اور جس کی رنگین فضا انسانی آنکھ میں اس قدر چمک پیدا کردیتی ہے کہ پھر زندگی کے طویل سفر کی کوئی منزل بھی تاریک نہیں رہتی۔ جس میں تیری میری کا نام ونشان تک مِٹ جاتا ہے۔ جہاں ہر شخص محض انسان ہونے کی جہت سے عزت و تکریم کی نظروں سے دیکھا اور پہچانا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس جہانِ نو میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہوتا ہے نہ محتاج۔ اس میں جنگ و جدل اور افراط و تفریط کی کوئی گنجائش تک باقی نہیں رہتی نہ ہی اس میں سیاسی طور پر حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کا کوئی تصور ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ اس میں بار پاتا ہے۔ اس قرآنی معاشرے کا میزبان انسان کی بجائے خود خدا ہوتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ جس جہانِ نو کا میزبان خود خدا ہو وہاں نہ کوئی فرعون باقی رہتا ہے نہ ہامان اور نہ قارون۔ نتیجہ یہ کہ اس معاشرے میں نہ کسی کو بھوک ستاتی ہے اور نہ پیاس، نہ کسی کو موسم کی سردی کی فکر ہوتی ہے نہ گرمی کا اندیشہ۔ اور وہ اس لیے کہ اس قرآنی معاشرہ میں رزق کے سرچشموں سے ہر ضرورت مند اس طرح متواتر مستفید ہوتا ہے جس طرح پیاسا جوئے آب سے۔ اس کے علاوہ یہاں سکونِ قلب کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ نہ تو کسی کو کوئی خوف ہوتا ہے نہ حزن۔ کیونکہ اس نظامِ زندگی میں کسی لات و منات کی حکمرانی نہیں ہوتی۔ المختصر یہی وہ قرآنی نظامِ حیات ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں آسمان پر اور ان شاخوں کا پھل ان افراد کے جسموں میں ایسا صالح خون پیدا کرتا ہے کہ ان کے چہرے کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی لیکن یہ سب کچھ اس وقت تک ممکن رہتا ہے جس وقت تک انسانی عقل وحی کو اپنا امام بنائے رکھتی ہے۔

اور اب یہ دیکھنے کے لیے کہ ملتِ اسلامیہ نے وحی کی بجائے صرف عقلِ انسانی کو ہی اپنا امام تسلیم کر لینے سے کیا کھویا اور کیا پایا تو اس مقصد کے لیے ہمیں کئی ایک موضوعات کو سامنے لانا ہوگا۔

لٰہذا زیرِ نظر کتاب میں جن موضوعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے ان کا تعلق مسئلے مسائل سے نہیں بلکہ ہماری عملی زندگی سے ہے اور وہ اس لیے کہ بقول اکبر الٰہ آبادی ؎

مذہبی بحث میں نے کبھی کی ہی نہیں　　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

راقم نے کتاب میں مختلف موضوعات کے تحت جن امور کا ذکر کیا ہے، وہ یہ ہیں:

پہلے حصّے میں زیرِ بحث آنے والے عنوانات

قرآن حکیم کی افضلیت و اہمیت اور امّت واحدہ کے سلسلہ میں اس کی تعلیم و ترغیب کا تفصیلی ذکر، لیکن اس قول فیصل کتاب کے ہوتے ہوئے جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات کی طویل بحثیں، جھگڑے اور اکابرین کے مختلف بیانات، مقامِ حدیث اور کفر کے باہمی فتاوے، فقہی اختلافات اور اس کے نتائج، اجتہاد کی اہمیت اور اس سے انحراف، ایک آنے والے کا تصور اور ختمِ نبوت، فرقہ واریت پر مبنی قرآنِ حکیم کے تراجم، اور تفاسیر اور پھر فرقہ پرستی کے تحت مساجد کا استعمال اور ان پر قبضہ کی کوششیں، کتاب و سنّت کی مروجہ اصطلاح کے متعلق چند ایک گذارشات، ایک متفقہ علیہ اسلامی آئین کی "مدوین میں سب سے بڑی رکاوٹ کی وجہ جواز، علمائے کرام کا اسلامی آئین کے مدون کرنے میں حصّہ، ۳۱ علمائے کرام کے ۲۲ نکات کا تجزیہ، ہماری عجمی تاریخ اور اس کے اثرات میں گرفتار ملتِ اسلامیہ قرآنِ حکیم اور اعراب، قرآنی آیات کے متعلق ناسخ و منسوخ کا عقیدہ، قرآنِ حکیم کا معاشی نظام اور عجمی نظام کا تقابلی جائزہ، اور اخبارات کے اداریے، ۱۹۸۲ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے زکوٰۃ کمیٹی کا تقرر اور اس کی رپورٹ اور موجودہ حکومت کی مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ میں زکوٰۃ کی تعریف اور قرآن کے معاشی نظام کے خدوخال، عشر اور ربٰو کا قرآنی مفہوم، سکولوں۔ کالجوں۔ اور دارالعلوموں میں دین کے نام پر دی جانے والی مذہبی تعلیم اور اس کے دُوررس اثرات کا اجمالی ذکر، مرد کے پنجۂ استبداد میں عورت کی مظلومیت، علمائے کرام کے متعلق دانشوروں کی رائے اور پھر تصوّف اور اس کی مختلف شاخوں یعنی وحدت الوجود، کشف و الہام اور انسانی ذات کا خدا کی ذات کے ساتھ "رشتہ" اور اس کے متعلق علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت کی تفصیل، تبلیغی جماعت کی تگ و تاز اور اس کا ماحصل، اسلامائزیشن اور فنڈامینٹیلزم کے نام پر چلائی جانے والی تحریک کے خطرناک نتائج، فریضۂ حج کے مقاصد کا ذکر شامل ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آخر قرآن حکیم کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کیوں نہیں ہو سکتا؟ اور یہ کہ قرأت کے اختلاف کی حقیقت کیا ہے۔

دوسرے حصّے میں زیرِ بحث آنے والے عنوانات

پہلے حصّے کے بعد دوسرے حصّے میں زیرِ بحث لائے جانے والے موضوعات درج ذیل ہیں :۔
تحریکِ پاکستان کے بارے میں نظریاتی اور سیاسی مشکلات، ہندوؤں کی عیّار سیاست، انگریزی کی ریاکاری اپنوں کی بے اعتنائی، مخالفت اور روگردانی کے مختلف طریق اور حربے اور ان حالات میں گھرے ہوئے دو قومی نظریہ کے محافظ علامہ اقبال کے مردِ مومن اور مردِ آہن، قائدِ اعظم کی عظیم شخصیت کے پائے استقلال کے نقوش

اوران کی شبانہ روز محنت کی تفصیل، تشکیلِ پاکستان کے بعد پھر اپنوں کے ہی ہاتھوں اس مملکت کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کو کمزور کرنے کی گہری سازشوں کی جگر خراش داستان، ون یونٹ کی بجائے چار صوبوں کی تفریق اور پھر ان میں چار قومیتوں کا نعرہ اور اس کے بعد علاقائی خود مختاری اس کے ساتھ مشرقی پاکستان کا بنگلادیش بن جانے کا ذکر اور اس کی دینی وجوہات اور اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار، اُمت کے سلسلہ میں اس تمام تر اور طویل تر داستان کے علاوہ قندیلِ آسمانی سے محروم دنیائے عالم کی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی بے چارگی کا ذکر المختصر کتاب کے ایک ایک ورق پر علمی، مادی، ثقافتی، تہذیبی، نظریاتی اور طبقاتی تفریق کا جائزہ لینے اور اس کی وجوہات بیان کرنے کے ساتھ اس کے سدِّ باب کا بنیادی علاج بھی تجویز کیا گیا ہے۔

کتاب میں تقریباً (۱۶) صفحہ کا ایک طویل خط جو ملک کے نامور دانشوروں، یونیورسٹی کے وائس چانسلروں اور حکام کے نام تحریر کیا گیا تھا شامل کر دیا گیا ہے جس میں ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ہونے والی اس گہری سازش کا ذکر اور قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آخر یہ جنت سے نکلا ہوا آدم اور مسجودِ ملائکہ اب حقیقی معنوں میں کب اور کس طرح مسجودِ ملائکہ بن سکے گا۔ اور وہ فردوس گم گشتہ دوبارہ کب اور کس طرح اس کے ہاتھ آئے گی؟

قوم کی مثال تو ایک جوئے رواں کی سی ہوتی ہے جس میں ہر آن نیا پانی سامنے آتا ہے یعنی قوم کے پرانے افراد آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اور نئے افراد ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اس لیے قوم کے یہی وہ نئے افراد ہیں جنہیں یہ رہنمائی کرانے کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے کہ قرآنی آئیڈیالوجی کیا ہے، پاکستان کی غرض وغایت سے مقصود کیا تھا، اس کے حصول کے لیے محسنانِ ملت کو کن کن مشکلات سے گزرنا پڑا اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مجھے امید واثق ہے کہ یہ کتاب ہر آنے والی نئی نسل کے لیے حقائق تک پہنچنے کی خاطر یقیناً ممد و معاون ثابت ہوگی۔

لہٰذا راقم نے اپنی آنکھوں کی شبنم اور خونِ جگر سے جو کچھ تحریر کیا ہے وہ اسی امید کی بنا پر ہے کہ

شاید کوئی غنچہ چٹکے شاید کوئی پھول کھلے!
اس اِک آس پہ گلشن گلشن ہم نے نغمے گائے ہیں

اظہارِ تشکر

کتاب ہٰذا کی تالیف کے لیے راقم کو کئی ایک علمی ذرائع سے استفادہ کرنا پڑا۔ جس میں ملکی اخبارات وجرائد اور رسائل اور کتابوں کے علاوہ جناب رئیس امروہوی۔ جناب بشاد احمد حقانی۔ جناب پروفیسر محمد عثمان۔ جناب رفیق احمد باجوہ۔ جناب عبدالقادر حسن۔ جناب محمد سعید (سابق ڈپٹی

ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ) جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ (سابق ڈائریکٹر محکمہ اوقاف) جناب پیر علی محمد راشدی۔ جناب پروفیسر وارث میر۔ جناب مسکین حجازی (چیئرمین شعبہ صحافت پنجاب یونیورسٹی) محترمہ حمیرا ہاشمی۔ قرآن حکیم کی طالبہ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ۔ جناب حافظ محمد یعقوب تاجیک۔ قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں اسلامیات کے پروفیسر جناب سید نواب حیدر نقوی۔ مرکزی وزارت خزانہ کے سیکرٹری جناب اے ایچ۔ یو بیگ۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر جناب رفیق احمد۔ پشاور یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر جناب میاں ایم نذیر۔ جناب حنیف رامے (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب) تحریک تعمیر انسانیت لاہور کے حوالہ سے قرآن حکیم کے نوجوان اتالیق اور صاحب نظر جناب محمد علی خارق (ایم اے سیاسیات۔ ایم اے عربی) جنہوں نے کتاب ہذا کے مسودے کی پروف ریڈنگ بھی کی نیز جناب قربت صاحب کے اُن تمام اہم اور علمی شخصیات کا بھی ممنون ہوں جن کی تحریریں کسی نہ کسی شکل میں میرے کام آئیں۔ خصوصاً تحریک طلوع اسلام کے بانی جناب غلام احمد پرویز صاحب مرحوم کا ممنون اور مشکور ہوں جن کی درجنوں کتابیں اور ۱۹۳۸ء سے ۱۹۸۶ء تک ماہنامہ طلوع اسلام کے ہزاروں صفحات میرے لیے وجہ تکمیل تصنیف و تالیف بنے۔

جہاں تک جناب پرویز صاحب کی ذات کا تعلق ہے، مجھے اس سلسلہ میں قارئین کی خدمت میں اپنی زبان سے نہیں بلکہ آغا شورش کاشمیری (مرحوم) کی زبان سے ایک گزارش کرنا ضروری ہے جو آپ نے پرویز صاحب کی کتاب "شاہکار رسالت" پر تبصرہ کرتے ہوئے کی تھی۔ جس کا اقتباس یہ ہے:

"ایڈیٹر چٹان کو آج تک غلام احمد پرویز سے ذاتی نیاز حاصل نہیں ہو سکا، کبھی ان سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی عظیم کتاب "شاہکار رسالت" پڑھنے کے بعد ایڈیٹر چٹان کو یقین ہو چکا ہے کہ اپنی اس کتاب کی بدولت پرویز صاحب بارگاہِ رسالت میں سرفراز ہو کر باریاب ہوں گے۔ اور یہ کتاب ان کے لیے توشۂ آخرت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان فضلاء کے ساتھ اپنی جگہ دیں گے جن کے دل اسلام کے لیے ہر دور میں دھڑک رہے ہیں۔"

اس تحریر کے بعد آغا صاحب (مرحوم) علماء حضرات سے اپیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب بھی افکار اسلام کی کربلا میں حسینی قافلے کی ایک آواز ہے۔ علماء کو ان سے متعلق اپنا فتویٰ واپس لینا چاہیئے۔"

اس کے بعد جہاں تک پرویز صاحب کے تحریک پاکستان اور قائد اعظم کے ساتھ قرآنی مراسم کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مولانا کوثر نیازی صاحب نے پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ کے مشترکہ اجلاس منعقدہ ۲۱ دسمبر ۱۹۷۶ء میں بانئ پاکستان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"جناب غلام احمد پرویز جن سے کسی کو ہزار اختلاف ہو لیکن قائد اعظم کے ساتھ ان کی رفاقت تحریک پاکستان میں ان کی قلمی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔"

اور اس کے بعد مولانا صاحب نے مزید فرمایا کہ:

بسان مذہبی تاجر نہ تھے، مذہب کے مفکر تھے اور دنیاوی امور میں پروٹوکول کا شدت سے قائل و عامل جس کا اپوائنٹمنٹ کے بغیر ملنے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس کی جلوت و خلوت میں اس شخص (پرویز صاحب) کو ہر وقت ہر لمحے تمام فارمیلیٹیز کے بغیر حاضر ہونے کی اجازت تھی۔ یہ انہیں کلام اللہ میں تدبّر کرنے کے لیے آیاتِ قرآنی سُنایا کرتے تھے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ دسمبر ۱۹۸۲ء)

ان تصریحات کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ قائدِ اعظم جیسی علمی، سیاسی اور قرآنی بصیرت رکھنے والی تحقیق کے اس قدر قریب تر رہنے والے کی اگر کوئی بات ہمارے سامنے آجائے تو اسے خالی الذہن ہو کر بغیر کسی تعصّب کے ضرور سُن لینا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ اسلام کی کربلا میں حسینی قافلے کی یہ آواز ہمارے کسی کام آ جائے۔

بہرحال میں نے کتاب ہٰذا کے شروع سے آخر تک جو کچھ عرض کیا ہے اس سے مقصد صرف علامہ اقبال کے اس شعر کی تشریح کرنا ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ: ؎

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام   بتانِ عجم کے پجاری تمام

لہٰذا راقم نے ان عجمی سازشوں کی بنا پر پیدا ہونے والے ان مختلف امراض کی جو نشان دہی کی ہے اور اس کا جو علاج تجویز کیا ہے یہ سب کچھ ایک انسانی کوشش ہے جس میں سہو و خطا کا ہر وقت امکان موجود ہے جس کی تصحیح کے لیے میں قارئین کی طرف سے راہنمائی کا منتظر رہوں گا۔ بشرطیکہ یہ نشان دہی قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ نہ کسی خاص مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے مسلک کے مطابق۔ بہرحال اگر میری یہ حقیر سی کوشش کسی کام آگئی تو شاید روزِ محشر میں اس سرمایۂ حیات کے سہارے خدائے رحیم و کریم کی بارگاہ میں نہایت عجز و انکساری کے ساتھ یہ کہنے کے کچھ قابل ہو سکوں کہ ؎

داورِ حشر مجھے تیری قسم!
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تُو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبّت کی ہے

لاہور
جنوری ۱۹۸۷ء

محمّد اشرف ظفر

نوٹ

زیرِ نظر موضوعات میں قرآنی آیات کے حوالہ جات کی ترتیب اس طرح ہے۔ مثلاً ۳۹ (سورت) / ۲۷ (آیت)
آیات کے علاوہ کتاب ہٰذا میں درج کیے گئے اقتباسات اور ان کے حوالہ جات انتہائی احتیاط سے نوٹ کیے گئے ہیں۔ پھر بھی کہیں کوئی غلطی ہو، تو اسے سہواً تصور کیا جائے۔ قارئین کے مطلع فرمانے پر ممنون ہوں گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی جائے۔ (راقم)

نظرِ ثانی

یہ اس خالق کائنات کا احسانِ عظیم ہے کہ جس کی بے پناہ نوازشوں سے آج مجھے کتاب کا دوسرا ایڈیشن پیش کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

انفرادیت کے اس جنگل میں نوع انسانی کی اجتماعی بہتری کے پیش نظر عموماً اور ملتِ اسلامیہ کے ان بکھرے ہوئے تسبیح کے دانوں کو ایک لڑی میں پروتے کے لئے خصوصاً اس تصنیف میں کس حد تک اور کس قسم کا مواد موجود ہے اور یہ ہمیں آپس میں ایک دوسرے کے قریب لانے میں کس حد تک ممد ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ انہی قارئین کو ہے یا ہو گا جنہوں نے اس کا مطالعہ از خود کیا ہے یا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ

میرے ہونے ٹپک کر جنہیں تماشا ہے
وہ گلستان کبھی ویراں ہو نہیں سکتے

کتاب کے اس نئے ایڈیشن کے موقع پر جہاں راقم ان قابل صد احترام اور محسن شخصیات جناب میرزا ادیب جناب ظفر علی راجہ، محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ، جناب حافظ محمد یعقوب خاں تاجیک، جناب محمد علی فارق کا دوبارہ ممنون ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ (جن کے تاثرات پہلے ایڈیشن میں شائع ہو چکے ہیں) وہاں اب میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کے صدر جناب مسکین علی حجازی، جناب محمد یوسف گورایہ، جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نیز ملکی اخبار پاکستان ٹائمز اور روزنامہ نوائے وقت کے علاوہ ادارہ طلوع اسلام اور ادارہ تعمیر انسانیت اور ماہنامہ ندائے فرقان کے مدیر مسئول ابو سلمان قاضی محمد کفایت اللہ ایم-اے کا بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میری اس تعمیری کوشش کو پذیرائی بخشی اور اس کے متعلق اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار فرمایا۔

کتاب ہذا کا پہلا ایڈیشن اٹھارہ مختلف ابواب پر مشتمل تھا جب کہ یہ دوسرا ایڈیشن انیس ابواب کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ نیا باب "پاکستان کے سابق حکمران کردار کے آئینہ میں" کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا ہے جس میں غلام محمد مرحوم سے لے کر جنرل ضیا الحق مرحوم تک کا ذکر شامل ہے اس نئے باب کے علاوہ دیگر ابواب میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا ہے مثلاً قرآنی تعلیم کے علی الرغم سیاسی پارٹیوں کے وجود کو برقرار رکھنے کے متعلق تحریر کے لئے مختلف سیاسی اور مذہبی اکابرین کے بیانات کے بعد بے نظیر بھٹو کے بیس ماہ کے دورِ حکومت میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین رونما ہونے والی باہمی چپقلش، خلفشار اور بدنظمی کو ضبط تحریر میں لایا گیا ہے اور پھر اس غیر قرآنی نظام حیات کے عبرت ناک نتائج کے باوجود جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو

ڈیڑھ ہزار سال میں پہلی مرتبہ دربار نبویؐ سے "پاکستان عوامی تحریک" کے نام پر سیاسی فرقہ بندی کو مزید فروغ دینے کی خاطر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرنے کی اس "منظوری" کی روداد کو بھی محفوظ کیا ہے جو "منظوری" موصوف کو خاص طور پر روضہ اقدسؐ پر حاضری کے دوران ملی۔۔۔۔۔۔ یہ داستان ہمارے سب کے لئے قابلِ غور بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ " عورت کی حالت زار" کے باب میں عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر جناب مولانا مودودی (مرحوم) اور جناب مولانا کوثر نیازی صاحب کے علاوہ کئی ایک مختلف حوالوں کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ قرآن حکیم کے معاشی نظام کے باب میں مروجہ زکوٰۃ کے مفہوم کے سلسلہ میں کسی قدر اضافہ ہوا ہے۔

اہل علم خوب جانتے ہیں کہ ہماری مروجہ شریعت کا تمام تر انحصار عقل و خرد کی بجائے تقلید محض پر ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مستند مذہبی مدارس کی تعلیم و تدریس معقولات کی بجائے منقولات پر مبنی ہے علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس فراہمیٔ بصیرت کے باوجود ہم نے علامہ کے نام پر سنگ وخشت کے پرشکوہ ایوان تو تعمیر کئے لیکن ان کی طرف سے عطا کردہ قرآنی فکر ونظر کے ایوان کی بنیادوں تک کو منہدم کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ علامہ اقبال جنہوں نے اپنے خطبہ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں کہا تھا کہ (مسلم مملکت کے قیام سے) " اسلام کو ایسا موقعہ میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپہ کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے" لیکن سوال یہاں یہ ہے کہ کیا ہم نے مختلف ادوار میں شریعت کے نام پر عرب ملوکیت کے اس ٹھپے کو جسے مٹانے کے لئے پاکستان کا قیام بے پناہ قربانیوں کی بدولت عمل میں آیا تھا اس کو مزید گہرا کرنے کے علاوہ اور کچھ کیا ہے؟ اس کا ایک عملی مظاہرہ سینیٹر جناب سمیع الحق کی طرف سے پیش کردہ وہ شریعت بل بھی ہے جس کو ۱۹۹۰ء میں سینٹ نے ۵ سال کے بعد منظور کیا اور اب یہ بل پاکستان کی قومی اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش ہونے والا تھا کہ جناب صدر غلام اسحاق خاں نے اس ملکی ادارے کو بدنظمی اور سیاست کے باہمی انتشار کا باعث قرار دیتے ہوئے ۱۹۹۰-۸-۶ کو توڑ دیا۔ اس قسم کے المیے کے پیش نظر جناب فیض کوثر صاحب نے کیا خوب کہا ہے؟

رہزن کو ڈھونڈتے ہیں مسافر اِدھر اُدھر
رہبر سے کارواں کی قیادت نہ ہو سکی

اس شریعت بل کے متعلق ممتاز روحانی پیشوا اور سینیٹر جناب پیر پگاڑا کا کہنا یہ ہے کہ شریعت محمدیؐ اور شریعت سمیع الحق میں بنیادی فرق ہے اور سینیٹ شریعت بل بعض مرحومین کی روح کو ایصالِ ثواب کی خواہش کے سوا اور کچھ نہیں" آپ نے مزید فرمایا کہ

"شریعت بل کے محرکین اور صدر غلام اسحاق کا تعلق ایک علاقے اور ایک مکتبِ فکر سے ہے اس لئے (صدر کی طرف سے) سمیع الحق کو دی جانے والی مبارک باد دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے" موصوف نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ ملائیت کے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے اذانیں دی جائیں" (بحوالہ ہفت روزہ "رضاکار" لاہور ۸ جون ۱۹۹۰ء)

سو راقم نے باب فتنہ میں فرقہ واریت پر مبنی اس جامد شریعت کی فسوں کاری کو توڑنے کے لئے علامہ اقبال کے حوالے سے کچھ بلند آواز سے اذان دینے کی مزید کوشش کی ہے ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اذان کے ان الفاظ کو پسند کریں گے اس موقع پر ایک صاحب بصیرت شخصیت جناب اصغر علی گھرال ایڈووکیٹ بھٹی شہید "نشان حیدر" نامی کتاب کے مصنف کی ہم نوا ہیں ہماری دعا ہے کہ (پاکستان کی نئی نسل شریعت بل کے اس جال سے محفوظ رہتی ہوئی) "شاہ دولہ کے چوہوں میں تبدیل ہونے سے بچی رہے"!

ان تمام کوششوں کے علاوہ تعلیم کے باب میں ایک نہایت اہم اضافہ پیدائش آدم کے متعلق ہے جس میں حضرت علامہ اقبالؒ اور حضرت علامہ عنایت اللہ خاں مشرقیؒ کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور جہاں ان ہر دو مقتدر علمی شخصیات نے ہمارے ہاں صدیوں سے مروجہ تصورات کو غلط قرار دیتے ہوئے ایک دوسرا زاویہ نگاہ پیش کیا ہے قارئین کو یہ تمام معلومات "قصہ آدم کی پیدائش" کے عنوان کے تحت مل سکتی ہیں۔ علامہ اقبالؒ اور علامہ مشرقی کے علاوہ مظاہر فطرت اور قرآن جیسی مشہور زمانہ کتاب کے مصنف جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے حوالے سے بھی آدم کی پیدائش، ہبوطِ آدم، جنت اور ملائکہ پر مزید سیر حاصل معلومات فراہم کی گئیں ہیں جب کہ سیاسی فرقہ بندی کے باب میں قائد اعظمؒ کے سفر آخرت کی ایک واضح جھلک دی گئی ہے جو ہر صاحب فکر کے لئے اپنے اندر کئی ایک تحقیقاتی رموز لئے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں کتاب ہذا کے آخری باب "دنیا کی حالت زار" میں علامہ عنایت اللہ مشرقی کا وہ خط بھی شامل کیا گیا ہے جو آپ نے ۱۹۵۶ء میں دنیا کے ہوش مند انسانوں (سائنس دانوں) کے نام لکھا تھا۔ یہ خط نوع انسانی کے کائناتی شعور میں اضافہ کرنے کے لئے اپنی مثال آپ ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے سامنے قرآن حکیم کی متعین کردہ وہ منزل آ جائے جسے رب جلیل نے صراط مستقیم کہہ کر پکارا ہے۔

والسلام

محمد اشرف ظفر

۱۸ ستمبر ۱۹۹۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علامہ اقبال نے اپنے ہاں مثنوی اسرار و رموز میں مقامِ مومن کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا ؎

لالۂ کوہ بر سرِ کوہے دمید ، گوشۂ دامانِ گلچینے ندید
آتشِ او شعلۂ گیرد بہ بر ، از نفس ہائے نخستینِ سحر
آسماں ز آغوشِ خود نگذاردش ، کوکبِ واماندۂ پنداردش

بوسدش اوّل شعاعِ آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گردِ خواب

پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر لالہ کا ایک پھول کھلا ہے۔ اس تک کسی گلچیں کا ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ صبح کی پاکیزہ ہوا اس کی پرورش کرتی ہے۔ آسمان اسے اپنی آغوش سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کا منہ چومتی ہیں۔ شبنم اپنی نرمزہم باریوں سے اس کی آنکھوں سے نیند کی گرد صاف کرتی ہے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے ایک مردِ مومن کی۔ جو ساری دنیا سے بلند ہو کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکتا ہے۔

یہ تھا وہ مردِ مومن جس کی تلاش میں علامہ اقبال عمر بھر سرگرداں رہے اور آخر کار پکار اٹھے کہ ؎

اے بندۂ مومن تو کجائی تو کجائی

سو کتاب ہٰذا کے آئندہ تمام تر صفحات اسی مردِ مومن کے مقامِ بلند کے کھو جانے اور اسے دوبارہ حاصل کرنے کی داستان اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

آیئے ہم خالی الذہن ہو کر ان اوراق کا مطالعہ کریں۔

پہلا باب

قرآنِ حکیم کی عظمت

مسلمان ہونے کے ناطے سے ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ حکیم جہاں زندگی کے تمام اہم اور بنیادی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ ۳۹/۲۷ ، ۳۰/۵۸ وہاں وہ ان اصولوں کو نہایت وضاحت کے ساتھ دلیل و براہین کے تابع بغیر کسی تضاد اور ابہام کے دو ٹوک تصریف آیات کی رو سے بیان بھی فرماتا ہے ــــ ۱۷/۴۱ ، ۱۷/۸۹ کیونکہ اس طرح کی وضاحت خود خدا کے ذمّہ تھی۔ ۱۷/۱۹ اور وہ اِس لیے کہ ہر صاحبِ عقل و بصیرت اِس سے سبق حاصل کر سکے۔ ۳۸/۲۹ بلکہ اس وضاحت کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں شک و شبہ اور اضطراب کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ ۳۲/۲ ، ۲/۲ ، ۱۰/۳۷ اور نہ ہی اس میں کوئی کمی باقی ہے۔ ۱۸/۱ بلکہ یہ کتابِ عظیم اپنے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں یہ چیلنج پیش کرتی ہے کہ یہ اگر من جانب اللہ نہ ہوتی تو اِس میں بہت سے اختلاف پائے جاتے۔ ۴/۸۲۔ لہٰذا یہ کتاب اپنی تمامتر خوبیوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ متنازعہ فیہ معاملات کے فیصلے قرآن حکیم سے کرائے اس نے یہ حکم ہی نہیں دیا بلکہ وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ فاسق ہیں۔ ظالم ہیں۔ ۵/۴۴ – ۴۵ ، ۴۷۔ لہٰذا فرمایا کہ تم پر لازم ہے کہ اس کے مطابق فیصلے کرو۔ ۵/۴۸ ، ۴۹ ، ۶/۱۱۵ ، ۵۰ یہی وہ حکمِ خداوندی ہے جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اختلافی امور کی وضاحت قرآنِ حکیم ہی سے کرتے تھے۔ ۱۶/۶۴ اور قرآن ہی سے نصیحت فرماتے تھے۔ ۶/۱۹ کیونکہ قرآن حکیم نازل ہی اِسی لیے کیا گیا تھا کہ انسان مشکلات میں نہ اُلجھ جائے ۲۰/۲ بلکہ اس لیے کہ انسان کو رسولِ خدا کی وساطت سے خطراتِ زندگی سے آگاہ کر دیا جائے۔ ۶/۱۹ اور اس میں ہر بات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ ۱۶/۸۹۔

حدیث نبوی ؐ یہی وہ حقیقت تھی جسے رسولِ اکرم ؐ نے اِس طرح ارشاد فرمایا کہ : " اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ قرآنِ حکیم کی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے اور اگر غلطی کرتا ہوں تو اس کی ذمّہ داری مجھ پر ہے"

قرآن حکیم نے اپنی تعلیم پر عمل پیرا ہونے کا ماحصل یہ بتایا ہے کہ اس سے مُردوں کو زندگی ملتی ہے۔ انسان کو اِس سے ایک روشنی ملتی ہے جسے لے کر وہ دنیا میں پھرتا ہے۔ ۶/۱۲۳ اور یہ تعلیم سینے میں تنگی پیدا ہونے ہی نہیں دیتی۔ ۷/۲ بلکہ یہ انسان کو ظلمت سے نُور کی طرف لے آتی ہے۔ ۱۴/۱، ۵۷/۹، ۵/۱۶ اور پھر فرمایا یہی وہ لوگ ہیں جو صحیح راستے پر ہیں اور فلاح پانے والوں میں سے ہیں۔ ۲/۴، ۵، ۷/۱۵۷ اور اسی طریق سے انسان ربّانی بن سکتا ہے۔ ۳/۷۸ — اور آخر پر یہ کہ یہ وہ نعمت ہے جو مکمل بھی ہے ۶/۱۱۶، ۱۵/۹ اور غیر متبدل بھی ۶/۳۴ — پھر یہ واضح ہدایت اور رہنمائی بھی ہے جو قدرت کی طرف سے بغیر کسی معاوضہ اور کاوش کے انسان کو مل گئی اور جس کے مل جانے پر خود خدا نے نوعِ انسانی کو پکارا اور کہا کہ تم نزولِ قرآن کی خوشی میں عید مناؤ اور مسرتوں کے جھولے جھولو۔ ۱۰/۵۸، ۱۶/۳۶ کیونکہ "یہ نعمت وہ ہے کہ جو کچھ تم اکٹھا کرتے ہو یہ اُس سے کہیں زیادہ بیش بہا اور قیمتی ہے" — اور اسے نہ زوال آسکتا ہے اور نہ ہی اِس میں کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے۔ یہ وہ رسّی ہے جس سے تمہارے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا جاسکتا ہے۔ اِس سے خون کے "رشتے" نہیں بلکہ دلوں کے "رشتے" استوار ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے تمہاری عداوتیں محبتوں میں بدل سکتی ہیں۔ اور دشمنی دوستی کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ قرآن کی تلاوت کے بعد گروہ بندی نہیں رہ سکتی ۲/۱۱۳ اور صحیح راستہ پانے کے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی، بلکہ قرآن تو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنایا گیا ہے۔ ۵۴/۱۶، ۲۲، ۴۰۔

مجھے اِس چیز کا احساس ہے کہ میرا موضوع صرف قرآن حکیم کی عظمت بیان کرنا ہی نہیں بلکہ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی بھی ہے لیکن جس وقت تک یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ معاشرتی، سیاسی، عائلی اور تمدنی زندگی کے لیے جس چیز (قرآن حکیم) کو اپنا امام تسلیم کیا جا رہا ہے وہ کن کن خصوصیات کا حامل ہے؟ اِس وقت تک اسے اس معاملے میں مرکزی حیثیت دی نہیں جاسکتی اور نہ ہی اسے اتھارٹی تسلیم کیا جاسکتا ہے لہٰذا مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ تو ظاہر ہے کہ قرآنِ حکیم میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو قندیلِ آسمانی ہونے کی وجہ سے ہماری مکمل راہنمائی کر سکتی ہے۔ اسی لیے تو فرمایا کہ قرآن سے اعراض برتنے والوں سے زیادہ ظالم کون ہوگا۔ ۱۸/۵۷ لہٰذا جہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ قرآنِ حکیم نے فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی کس حد تک مخالفت کی ہے وہاں یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ وہ اِس اہم اور پیچیدہ مسئلہ کا آخر کیا حل پیش کرتا ہے؟ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ پاکستان کا یہ خطۂ زمین جو قرآن کی حکمرانی کے لیے حاصل کیا گیا تھا، اس کی یہ حالتِ زار کیوں ہے؟۔ اور اس کے ذمہ دار کون لوگ ہیں۔ اور پھر یہ کہ اِس خلفشار کے باعث نئی نسل جو آج اسلام کے نام سے اِس قدر لاتعلق ہی نہیں بلکہ متنفر

ہو چکی ہے، اِسے ایک بار پھر قرآن حکیم کا گرویدہ کیوں کر بنایا جا سکتا ہے تاکہ یہ درخشندہ ستارے قرآنی حکومت کے لیے حاصل کردہ اس تجربہ گاہ کو عملی طور پر نوعِ انسان کے لیے ایک مثالی حیثیت سے پیش کرنے کے قابل بن سکیں۔

فرقہ بندی اور قرآن حکیم

جہاں تک قرآنِ حکیم کے نزدیک فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی مخالفت کا تعلق ہے، وہ اسے نہایت خطرناک اور تباہ کُن تصور کرتا ہے۔ چنانچہ اِس سلسلہ میں ارشاد ہے کہ "انبیاءِ کرام کو جو دین دیا گیا تھا" اس میں تاکید کی جاتی تھی کہ وہ دین کو قائم کریں اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کریں" (۱۳/۴۲) — پھر کہا " اے جماعت مومنین تم مومن ہونے کے بعد شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ تم ان میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے تفرقہ پیدا کیا اور اپنے اپنے فرقہ پر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے جس پر وہ کاربند ہیں ۔" ۳۲،۳۱/۳۰ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ" جو مسجد مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے بنائی گئی ہو اس میں قدم تک نہ رکھو" اور اِس کے ساتھ یہ بھی متنبہ کر دیا کہ" جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور پارٹیوں میں بٹ گئے، اے رسول تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں"۔ ۶/۶۰ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ خود کو عاشقِ رسول قرار دے گا۔

فرعون کی سب سے بڑی سرکشی ہی یہ بتائی گئی کہ" فرعون انتہائی سرکشی پر اُتر آیا تھا، وہ مُلک کے باشندوں (قوم) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا اور پھر اپنی ابلیسی سیاست کی رُو سے کبھی ایک پارٹی کو کمزور کر دیتا کبھی دوسری کو۔ ۲۸/۴

اور ایک دوسری جگہ فرمایا" اِن سے کہہ دو کہ خدا اِس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہاری پارٹیاں بنا کر تمہیں آپس میں بھڑا دے اور (اِس طرح) تمہیں ایک دوسرے کی لڑائی کا مزا چکھا دے۔" ۶/۶۵ - قرآن حکیم نے اِس مہلک مرض کی طرف نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ اِس کی بیخ کنی کے لیے علاج بھی تجویز فرما دیا کہ" تم سب مل کر اللہ کی رسّی (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔ اللہ کی اِس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اور اُس نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت ڈال دی اور اس طرح تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے۔" ۳/۱۰۳ اور اِس حقیقت کو رسولِ خدا نے اپنے آخری خطبہ حجتہ الوداع میں جو پوری انسانیت کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتا ہے تقریباً ایک لاکھ ۲۴ ہزار کے

صحابہ کرام رضؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے اگر اس پر قائم رہے اور وہ خدا کی کتاب ہے اور ہاں یاد رکھو دینی معاملات میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ اپنی انہیں باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے" اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا "میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا حکم اللہ نے مجھے دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین جانو جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی زندگی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔" لوگوں نے عرض کیا کہ حضورؐ کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو؟ فرمایا "ہاں اگر یہ نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے اور بزعم خویش اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو" ایک روایت میں حضورؐ نے فرمایا" جو جماعت سے الگ ہوا وہ جاہلیت کی غیر اسلامی موت مرا" دوسری جگہ فرمایا" جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہوا سیدھا جہنم میں گیا۔"

اور اس حکم خداوندی اور حکم رسولؐ پر عمل نہ کرنے والوں کے متعلق رسول خداؐ قیامت کے روز فرمائیں گے کہ" اے باری تعالیٰ یہ لوگ ہیں جنہوں نے تیرے قرآن پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا" ۲۵/۳۰ لہٰذا اگر قرآنی تعلیم کی روشنی میں دیکھا جائے تو خدا کے دین پر قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی مسلمان نہ تو خود پارٹی بازی کا تباہ کن تصور اپنائے اور نہ ہی دوسروں کو اس کے لیے ترغیب دے۔ کیونکہ ایسا کرنے والا خدا کے دین سے خارج ہو جاتا ہے اور رسول خدا سے اس کا کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رہتا۔ اور پارٹی بازی کی سیاست گری فرعونی عمل ہے اور شیطان کی پیروی کرنے کے مترادف ہونے کے ساتھ ساتھ شرک عظیم بھی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے پارٹی بازی اور تفرقہ پروری سے صرف منع ہی نہیں کیا اور اس میں مبتلا ہونے کی صورت میں اس کا علاج ہی تجویز نہیں کیا بلکہ اس کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کر دیا جب فرمایا" اے مسلمانو! دیکھنا واضح احکام آ جانے کے بعد تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جو فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئے اور باہمی اختلاف کرنے لگے۔ یہ لوگ عذاب عظیم میں مبتلا ہوں گے۔" قرآنی تعلیم کی اس طرح تکذیب کرنے والوں کی اس زندگی میں ہی اس کرۂ ارضی پر ہی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ" دین کی تکذیب سے اس قوم کی جڑیں کٹ جاتی ہیں" ۷/۷۲ اور اس سے انسان پستیوں میں گر جاتا ہے ہوس سے اس کی حالت کتے کی سی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ (کس قدر) اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ ۷/۱۷۶ اور خوف کا عذاب ان پر مسلط ہو جاتا ہے۔ ۱۱۲، ۷/۱۱۳۔

ٹیلی ویژن پر مذاکرہ

۱۹۷۶ء میں ٹیلی ویژن پر ایک پروگرام بعنوان "دانشکدہ" زیرِ صدارت جناب اشفاق احمد صاحب ڈائریکٹر مرکزی اُردو بورڈ ٹیلی کاسٹ کیا جاتا تھا جس میں مختلف حضرات اپنی تعمیری قسم کی اُلجھنیں پیش کرتے اور متعلقہ اہلِ دانش مِل بیٹھ کر اُن کا حل پیش کرنے کی سعی فرماتے تھے۔ تو راقم نے قرآن کریم کی مندرجہ بالا تعلیم کے پیشِ نظر ملّتِ اسلامیہ سے مذہبی فرقہ بندی اور سیاسی پارٹی بازی کو ختم کرنے کے لیے مذکورہ بالا ٹی وی پروگرام "دانشکدہ" کے نام ایک خط تحریر کیا تھا جو مارچ ۱۹۷۷ء میں ٹیلی ویژن پر پورا گھنٹہ زیرِ بحث رہا جس میں دیگر گذارشات کے علاوہ راقم نے یہ عرض کیا تھا کہ:

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ پارٹی بازی سے مِلّی خلفشار اور انحطاط کے علاوہ خود انسان اپنی آزادئ رائے جیسی نعمتِ عظمٰی کو پارٹی کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور پارٹی کے اندر رہتے ہوئے وہ کسی صورت میں بھی اِس پارٹی کے کیے گئے فیصلے کے خلاف کسی اسمبلی میں بھی باآوازِ بلند یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری پارٹی کا یہ طے شدہ فیصلہ حق و انصاف پر مبنی نہیں۔ خواہ یہ طے شدہ فیصلہ واقعتاً قرآنی تعلیم کے صریحاً خلاف ہی کیوں نہ ہو، جب آزادئ رائے ہی باقی نہ رہے تو اِس سے انسانی عظمت کو جس قدر نقصان پہنچتا ہے، اِس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

راقم نے اِس خط میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ:

"کیا یہ حقیقت نہیں کہ قرآن حکیم نے اپنے غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے تمام اُمّت کو باہمی مشاورت کا سبق دیا ہے نہ کہ بے لگام مغربی جمہوریت کے تحت حزبِ اختلاف کا۔ اور کیا پھر یہ بھی حقیقت نہیں کہ اس قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر حضرت ابوبکر رضؓ کے دور میں حضرت عمر فاروق رضؓ نے کوئی حزبِ اختلاف قائم نہ کی اور نہ ہی حضرت عمر فاروق رضؓ کے دور میں حضرت عثمان رضؓ یا حضرت عثمان رضؓ کے دور میں حضرت علی رضؓ نے حزبِ اختلاف کا کوئی وجود قائم کیا۔"

اور اس کے بعد اہلِ دانش کی خدمت میں یہ عرض کیا تھا کہ:

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ حکومت تمام پارٹیوں کو ختم کرتے ہوئے اپنے اپنے علاقے سے تمام کے تمام صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے امیدواروں کے لیے صرف اور صرف آزاد امیدوار کی حیثیت سے ہی الیکشن لڑنے کی بنیاد ڈالے اور اس کے بعد اسمبلیوں کے اندر اور باہر پارٹی بازی کی تشکیل

کو ہمیشہ کے لیے قانوناً جرم قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح قوم جہاں پارٹی بازی کے خلفشار سے محفوظ ہو جائے گی وہاں ان کے ساتھ وہ لوگ جو قابلیت رکھنے کے باوجود پارٹی بازی کی لعنت میں اُلجھنا نہیں چاہتے قوم کی خدمت کے لیے آگے آ سکیں گے۔"

لیکن افسوس اہلِ دانش کی طرف سے اس کا کوئی خاطر خواہ جواب ملت کے سامنے پیش نہ کیا گیا۔

فرقہ بندی کا نتیجہ

سچ تو یہ ہے کہ پارٹی بازی اور فرقہ بندی کے باعث انسان اپنی آزادیٔ رائے کو ہی دوسروں کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا بلکہ نتیجتاً وہ خوف و حزن کا بھی شکار ہو جاتا ہے اور جب کوئی قوم اجتماعی طور پہ پارٹی بازی میں اُلجھ کر رہ جائے تو وہ خوف کے باعث اعصابی مریض بن کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ دوسری قومیں اس سے کہیں آگے نکل چکی ہوتی ہیں۔ قرآن حکیم نے جماعت مومنین کو جو منتشر حالت کی زندگی گزارنے سے منع فرمایا تھا تو جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان اپنی آزادیٔ رائے سے محروم ہو کر کہیں خوف و حزن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے کیونکہ خوف و حزن میں مبتلا انسان نفسیاتی طور پر ہمیشہ انتشار و خلفشار کی آگ میں جھلستا رہتا ہے اور یہ وہ آگ ہے جس سے اس کی خداداد صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ اللہ کا یہ شاہکار وہ کچھ نہیں بن سکتا جو کچھ اسے قرآن بنا دینا چاہتا ہے اور نہ ہی اس کی یہ صلاحیتیں کائنات کے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کے کام آ سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ یہ جیتا جاگتا انسان راکھ کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

فرقہ بندی پیدا کیسے ہوئی؟

اِس مقام پر یقیناً سوال پیدا ہوگا کہ آخر انسان میں یہ مرض پیدا کیونکر ہوتا ہے تو اس کا جواب بھی قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ ہے کہ" یہ فرقہ بندی پیدا ہی باہمی تعصب اور عناد کی بنا پر ہوتی ہے۔ ۴۲/۱۴

یہ تھے فرقہ بندی کے وہ نتائج جن کے متعلق قرآن حکیم نے چودہ سو سال پیشتر ہی یہ سب کچھ واضح کر رکھا تھا لیکن افسوس کہ ہم نے خدا کے اِس دیئے ہوئے نُور سے کوئی راہنمائی حاصل نہ کی بلکہ اس کے برعکس اِس قدر جھوٹ بولا کہ وہ سچ نظر آنے لگ گیا اور آہستہ آہستہ فرقہ بندی اور حزبِ اختلاف کا تصور ذہنوں میں کچھ اس طرح پختہ ہوا کہ توحید کے تحت ملّت واحدہ کے عملی مفہوم سے پوری اُمت اسلامیہ محروم ہو کر رہ گئی اور یہ زوال ملّتِ اسلامیہ پر اسی وقت شروع ہو گیا جب اس کے ہاں خلفاءِ راشدین کے بعد قرآنی احکام پر عمل کروانے والی کوئی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی۔ وہ مرکزی اتھارٹی جس نے دین اور

دنیا کو یکجا کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس "دورِ جدید میں" دین و دنیا کی ثنویت پیدا کر دی گئی اور ملوکیت نے اپنا کاروبارِ سیاست الگ کرتے ہوئے انسان کو سیاسی طور پر اپنا محکوم بنا لیا اور مذہبی پیشواؤں نے اللہ کے نام پر اسکی الگ دنیا بسا لی۔ ملوکیت کے پجاریوں نے انسان کے جسموں پر حکومت کی تھی جبکہ مذہبی پیشواؤں نے بغیر کسی مشینری کے ان کے دلوں پر قبضہ کیا اور انسانی عقل و فکر کو مفلوج کرتے ہوئے گروہ بندانہ نظریات کے تحت خود ساختہ تصورات کے پردے کچھ اس طرح لٹکائے کہ مرکزِ ملت کی طرف جانے والے تمام راستے آنکھوں سے ہی اوجھل ہو گئے اور سرزمینِ اسلام میں فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے اس اجنبی پودے کی آبیاری اس طرح کی کہ یہ ایک سایہ فگن پیڑ کی صورت اختیار کر گیا جس کے پتے پتے پر اسباب زوالِ امت کی تاریخ رقم تھی اور اب حالت یہ ہے کہ اس کی ہر شاخ مفاد پرستی اور عناد پسندی کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہے۔ جہاں تک اس کے پھل کا تعلق ہے یہ دیکھنے میں جاذبِ نظر لیکن ذائقہ میں اتنا ہی ترش اور کڑوا واقع ہوا اور اس کی تاثیر میں سوائے عناد، حسد، بغض، محکومی، محتاجی، خوف و حزن کا زہرِ ہلاہل اور عزتِ نفس کی تباہی، اصول پرستی کی بجائے شخصیت پرستی اور شخصیت پرستی میں بھی انتہا پسندی، نتیجتہً سرکشی دل کی پژمردگی، دل گرفتگی اور پریشان خیالی، یاس و ناامیدی، صلاحیت سلبی اور جنگ و جدل کے سوا کچھ اور رکھا ہی نہ تھا لیکن اس کے باوجود کہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، ہم برابر اس کا پھل کھائے چلے گئے اور اب حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس ذلت ناکی سے نہ ہماری نظریں بھرتی ہیں اور نہ ہی پیٹ اور نہ ہی ہم اس دوزخ کی آگ سے نکلنے کی خاطر خالص قرآنی حکومت کے قیام کے لیے عہدِ رفتہ کو آواز دیتے ہیں بلکہ اس کے برعکس کیا تو یہ کیا کہ آنکھوں میں اس قسم کی پژمردگی پیدا کر دی کہ آنے والی نسلوں کو اس برگِ حشیش کے پتے پتے پر اس ذلت آمیزی کی وجہ جواز تک دکھائی نہ دے۔

اس مقصد کے لیے کتنی فقہیں مرتب ہوئیں اور ان فقہوں کی بنیادوں پر کئی فرقوں کا وجود مستقل طور پر قائم کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ یہ بُعد اور یہ دوری کفر کے فتوؤں تک جا پہنچی (اس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی) حتیٰ کہ ہر مسجد کی پیشانی پر فرقہ بندی کے بُت کا بورڈ چسپاں کر دیا گیا اور یہ بھول ہی گئے کہ قرآن عظیم نے تو فرقہ پرستی کو شرکِ عظیم قرار دیا تھا۔ ۳۰/۳۱۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان کتاب اللہ کی بجائے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت نہ کرتا تو آج نہ کوئی شیعہ ہوتا، نہ سنی، حنفی، نہ دیوبندی، نہ بریلوی، نہ اہلحدیث اور نہ کوئی نقشبندی ہوتا بلکہ سب کے سب ربانی ہوتے۔ اور یہی خدا تعالیٰ کا حکم تھا اور سنتِ رسول ؐ بھی۔

قائدِ اعظم اور فرقہ بندی

قائدِ اعظم نے فرقہ بندی اور گروہ بندی کے متعلق قرآنِ حکیم کی عظمت کو کس حد تک جان رکھا تھا۔ اِس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا :

"صوبہ پرستی ایک لعنت ہے جس طرح مذہبی فرقہ بندی شیعہ سنی وغیرہ بہت بڑی لعنتیں ہیں"

(بحوالہ تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صہ ۸۴)

پاکستان کی ضرورت کیوں ؟

اِس اذیت ناک حالت کے باعث ملّتِ اسلامیہ کے پاس نہ دنیا باقی تھی نہ دین۔ ضرورت تھی کہ اِس کرۂ ارض پر ایک ایسی مملکت کی بنیاد رکھی جائے جس کا تمام کاروبارِ حیات ایک بار پھر قرآن کے ابدی اصولوں پر استوار ہو۔ اور اقبال کے الفاظ میں "میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اِس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اِس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک قائم ہیں اس جمود کو توڑ ڈالے۔ جو اِس کی تہذیب و تمدن شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔" (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

چنانچہ مفکرِ پاکستان علامہ اقبال نے اِس خواب کو دیکھا اور قائدِ اعظم کے ہاتھوں یہ شرمندۂ تعبیر ہوا۔ لیکن صرف ایک خطۂ زمین کے حصول کی حد تک کیونکہ "شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد" اور اس مملکتِ خداداد جس میں قرآنِ حکیم کی حکمرانی قائم کرنی مقصود تھی؟ وہاں اس کے علی الرغم مسلم لیگ جیسی واحد نمائندہ جماعت کو بھی جسے جلد از جلد ختم کیا جانا مقصود تھا) اسی پاکستان میں سنہ ۱۹۷۹ء تک سیاسی جماعتوں کی تعداد ۵۶ تک جا پہنچی۔ ملاحظہ ہو اداریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۷۹ء اور اس کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوا اور یہ تعداد ۵۶ کی بجائے ۸۴ تک جا پہنچی اور اس کے ساتھ دنیا کے دیگر ممالک کی طرح پاکستان کے ہر مسلم گھرانے اور مسجد میں اسی قرآن کریم کی تلاوت ہوتی رہی اور ہو رہی ہے جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ مسلمانو دیکھنا آپس میں تفرقہ پیدا مت کرنا۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے کہ

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

پاکستان میں فرقہ بندی

ہم نے اِس فتح مندی کے لیے کیا کیا کارنامے انجام دیئے اِس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل سطور سے لگا سکتے ہیں لیکن اِس مقام پر میں یہ عرض کر دینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ اِس سلسلہ میں جو کچھ عرض کیا جائے گا اِس سے کسی کی بھی تضحیک مقصود نہیں۔ اور نہ ہی کسی کی شخصیت پرستی پیشِ نظر ہے کیوں کہ اگر کسی کی تضحیک جرم ہے تو شخصیت پرستی شرکِ عظیم۔ لہٰذا میرا مقصد صرف حقائق کو بیان کرنا ہے۔ یہ حقائق خود بتا دیں گے کہ ہم نے کیا کچھ نہیں کیا اور کیا کچھ نہیں کہا۔

جب میں اپنی موجودہ حالت کو نظریہ پاکستان کے پس منظر میں دیکھتا ہوں تو زباں پر بے ساختہ یہ شعر آجاتا ہے ؎

مدّت کے بعد اذنِ تبسم مِلا مجھے　　　وہ بھی کچھ ایسا تلخ کہ آنسو نکل پڑے

جناب مودودی (مرحوم) اور جماعت سازی

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے مودودی صاحب (مرحوم) کی تحریر کا ایک اقتباس پیش ہے ۔ جس سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں میں فرقہ بندی اور سیاسی پارٹیوں کا وجود کتنا خطرناک اور نقصان دہ ہے، فرماتے ہیں :

"یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اِس جمعیت کے اندر کوئی الگ نام سے مسلمانوں کے درمیان کسی وردی یا ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کرنا ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا در اصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں بلکہ فرقہ بندی ہے، فرقہ پروری ہے اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے طریقے اہلِ مغرب سے لیے ہیں مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیز دوسروں کے مزاج کے موافق آتی ہے وہ مسلمانوں کے مزاج کے مطابق نہیں آتیں۔"

(بحوالہ خطبات صفحہ ۱۲۸ - ایڈیشن ۱۹۶۹ء)

لیکن یہ بات ۱۹۴۰ء کی ہے جب مودودی صاحب نے اپنی سیاسی پارٹی قائم نہیں کی تھی - اور جب

جماعتِ اسلامی وجود میں آگئی تو پھر پاکستان آنے کے بعد آپ نے یہ بیان جاری کیا :

"جماعتِ اسلامی کسی بھی ایسی پارٹی کے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہے جو ملک کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔ جماعت کو دوسری پارٹیوں سے کوئی کدورت نہیں لیکن پہلے ان جماعتوں کا وجود میں آنا ضروری ہے۔"[1]

(بحوالہ نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر کسی قدر ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں۔ جناب مودودی (مرحوم) نے اِس کے ساتھ ایک دوسری جگہ یہ بھی فرمایا کہ :

"آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اِس فرقہ بندی سے مسلمانوں کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ کہنے کو یہ مسلمان ایک اُمّت ہیں مگر حقیقت میں اِس فرقہ بندی کی بدولت اِس اُمّت کے سینکڑوں ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اِن کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ اگر آپ اپنی خیر چاہتے ہیں تو اِن بُتوں کو توڑ دیجئے۔ ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر رہیئے اور ایک اُمّت بن جائیے۔ خدا کی شریعت (قرآن) میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر اہلحدیث حنفی، دیوبندی، شیعہ اور سنّی وغیرہ الگ الگ اُمّتیں بن سکیں۔ یہ اُمّتیں جہالت کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اللہ نے صرف ایک اُمّت، اُمّتِ مُسلِمہ بنائی ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۲۸ اگست ۱۹۶۲ء)

۳۱ علماء کے ۲۲ نکات

لیکن اِس کے ساتھ پھر ہمیں پچھلے پاؤں لوٹنا ہو گا جہاں تاریخ اِس دوسرے رُخ کو بھی اپنے دامن میں محفوظ کیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں ۲۱ تا ۲۴ جنوری کراچی میں تمام فرقوں کے نمائندوں کی حیثیت سے ۳۱ جیّد علماءِ کرام کا اجتماع ہوا جن میں خود مودودی صاحب مرحوم کے علاوہ سید سلیمان ندوی مرحوم، مولانا شمس الحق، مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم، مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم، مولانا محمد حسین مرحوم، (جامعہ اشرفیہ) مفتی کفایت حسین مرحوم، مولانا احمد علی مرحوم اور مولانا شمس الدین فرید پوری مشرقی پاکستان، اب (بنگلہ دیش) جیسے حضرات شامل تھے اور انہوں نے مملکتِ پاکستان کے لیے دستور کی اساس کے پیشِ نظر بائیس نکات پیش کیے اور توقع ظاہر کی کہ اگر ان بائیس نکات کو تسلیم کر لیا جائے تو پاکستان بآسانی اسلامی مملکت بن جائے گا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قدر علمی شخصیات کی حامل ہستیوں نے اہلحدیث، دیوبندی، بریلوی اور

---

[1] پارٹی بازی کے حق میں مزید بیانات کی تفصیل آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

شیعہ جن کا خدا کی شریعت میں کوئی ذکر نہیں اور جنہیں اِس سے پیشتر جہالت کی اٹتیں قرار دیا گیا تھا، کو ختم کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں۔ مَیں اِس موقع پر ان مذکورہ بالا ۲۲ نکات میں سے چوتھی (۴) اور نویں شق پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

شق نمبر ۴ میں مذکور ہے کہ :

" اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ کتاب و سُنّت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے۔ منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و ایما اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔"

شق نمبر ۹ میں اِس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے کہ :

" مسلّمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی انہیں پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے۔ اور ایسا انتظام کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔"

مقامِ حیرت ہے کہ قرآن حکیم کی تعلیم کی بجائے اپنے اپنے پیروؤں کے مسالک کی حکمرانی کے تابع 'اسلامی فرقوں' کی موجودگی میں وہ کون سی 'اسلامی تعلیم' دی جائے گی جو اِن سینکڑوں ٹکڑوں کو امّتِ واحدہ میں منتشکل کر سکے گی۔ نہ معلوم اس کو خود فریبی کہا جائے یا جہاں فریبی سے تعبیر کیا جائے۔

اِس قسم کے تھے وہ بائیس نکات جن کی تعریف میں ڈاکٹر محمد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے ایک مضمون بعنوان " اسلامی نظامِ حکومت کا متعین مفہوم " روزنامہ نوائے وقت میں مورخہ ۲۲ فروری سنہ ۱۹۸۳ء کو رقم کیا تھا۔ اور انہیں بائیس نکات کی تعریف روزنامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۳ اگست ۱۹۸۴ء کو اپنے اداریہ میں کچھ اس طرح کی کہ :

" مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر (مذہبی فرقوں) کے مابین اتحاد و یک جہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے وحدت امّہ کمیٹی نے ایک آٹھ رکنی سب کمیٹی قائم کی ہے جو علماءِ کرام، خطباء اور واعظین کے لیے ایک متفقہ اور قابلِ عمل ضابطہ تیار کرے گی۔ اس سلسلہ میں اگلے روز وحدتِ امّہ کمیٹی کا ایک اجلاس صوبائی سیکرٹری

ــــہ انا ء بر مزید گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔

اوقاف مسٹر آفتاب احمد خاں صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تمام مکاتبِ فکر (تمام فرقوں) کے جید علمائے کرام نے شرکت کی۔"

اِس کے بعد لکھا ہے:

"امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے قرآن حکیم کا یہ ارشاد مشعلِ راہ ہونا چاہیئے کہ خدا کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور اپنے اندر تفرقہ پیدا نہ کرو۔" قرآن نے مسلمانوں کو تفرقہ بازی کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ اس طرح دشمن کے مقابلے پر تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی عظمت و شوکت صرف اتحاد اور یک جہتی سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔"

اور اس کے بعد اداریہ نگار نے وحدتِ اُمّت کمیٹی کی طرف سے تیار کردہ ضابطہ اخلاق کی تیاری کے سلسلہ میں اظہارِ مسرّت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

"مقامِ مسرّت ہے کہ مذکورہ اجلاس میں علمائے کرام نے ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء کے ۲۲ نکات کی بنیاد پر ایک ضابطۂ اخلاق کی تیاری اور اس کی پابندی پر اتفاق کرلیا ہے۔"

راقم اِس اظہارِ مسرّت کے سلسلہ میں اِس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہے کہ جن ۲۲ نکات میں بذاتِ خود فرقہ بندی کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کا اثر شامل ہو اسے ضابطہ اخلاق قرار دینے اور ان کی پابندی پر اتفاق کرنے کے نتیجہ میں کس قسم کی یک جہتی معرضِ وجود میں آئے گی جس پر یہ داد دی جارہی ہے۔ اِس قسم کے ضابطۂ اخلاق پر تو جس قدر بھی تعزیت کی جائے کم ہے۔

ارشاد احمد حقانی صاحب کی دل سوزی

فرقہ بندی کی بدولت آج ہمارے ہاں کس قدر جذباتی اشتعال پیدا ہو چکا ہے یہ جاننے کے لیے ہمیں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کا وہ کالم دیکھنا ہوگا جو انہوں نے اپنے خونِ جگر کے ساتھ روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۲ مئی ۱۹۸۵ء کے لیے تحریر کیا۔ آپ نے فرمایا:

"ایم آر ڈی کے لیڈر اور سندھ کے ممتاز سیاستدان مسٹر غلام مصطفےٰ جتوئی نے بیرونِ ملک روانہ ہونے سے پہلے ایک بیان میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ سندھ میں مذہبی فرقہ واریت بڑے زوروں پر ہے۔ مختلف مذہبی عناصر ایک

دوسرے کے خلاف نفرت و اشتعال پھیلا رہے ہیں۔ ان کے بقول زہریلے پمفلٹ تقسیم کیے جا رہے ہیں لیکن انتظامیہ اس صورتِ حال کا کوئی نوٹس نہیں لے رہی۔ اور مذہبی منافرت کے اس کاروبار کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات نہیں کیے جا رہے"

جناب حقانی صاحب کے کہنے کے مطابق:

"سندھ میں مذہبی منافرت میں اضافہ اور شدت اور اس کے ناپسندیدہ اثرات و نتائج کی شکایت مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی کے علاوہ بعض دوسرے لوگوں نے بھی کی ہے اور کہا ہے کہ بعض دوسرے علاقے اس کی زد میں ہیں۔ کراچی کے بارے میں تو بطور خاص ایک عرصہ سے ایسی اطلاعات آ رہی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں فقہی مسلک اور عقیدہ کی بنیاد پر آبادی کے مختلف طبقات کے درمیان اختلافات اور کشیدگی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس ناپسندیدہ اور تکلیف دہ کیفیت کا اثر تو پورے ملک میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس کے اثرات بیرونِ ملک بھی پہنچ چکے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، ایک عرصہ سے ایسا ہو رہا ہے لیکن کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے اضلاع میں مذہبی منافرت کی فضا خوفناک شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ گذشتہ فروری کے عام انتخابات کے دوران چونکہ سیاسی جماعتوں کو ان میں شرکت کی اجازت نہیں تھی اس لیے جن تعصبات نے ان میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا، ان میں ذات برادری کے علاوہ عقیدہ و مسلک کی بحث نمایاں رہی تھی۔ کراچی میں تو اکثر حلقوں میں کھلم کھلا دیوبندی اور بریلوی اور شیعہ اور سنی کے حوالہ سے انتخابی مہمات منظم کی گئی تھیں اور مسلمانوں کو فرقوں کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے بغض میں پختہ تر کرنے کے لیے مذہب ہی کے نام پر زبردست کام لیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کراچی اور سندھ کے دوسرے حصوں میں مذہبی منافرت اور مغائرت پورے عروج پر ہیں۔ مذہبی پیشواؤں کی ایک بڑی تعداد مذہب اور خدا اور رسولؐ کے نام پر فرقہ واریت کو فروغ دے رہی ہے اور مسلمانوں کو آپس میں بانٹ اور لڑا رہی ہے شیعہ سنی اختلاف پہلے سے موجود ہے اور اس کے تباہ کن اثرات سے ہم ہمیشہ دوچار رہے ہیں۔ ان دنوں شیعہ حضرات اپنے بعض مطالبات کی تکمیل پر زور دینے کے لیے احتجاج اور گرفتاریوں کی ایک مہم منظم کیے ہوئے ہیں اور اسلام آباد کے بعد اب دوسرے مقامات پر بھی گرفتاریاں پیش کی جا رہی ہیں۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے گذشتہ انتخابات کے موقع

پر پنجاب کے بعض اضلاع میں بھی متعدد ایسے فتوے جاری کیے گئے جن میں کسی خاص مذہبی مسلک اور عقیدے کے امّیدوار کو ووٹ دینے اور مخالف مذہبی مسلک اور عقیدہ کے امّیدوار کو ووٹ نہ دینے کی ہدایت اور تلقین کی گئی اور ایسی تمام اپیلیں مذہب اور خدا اور رسولؐ کے نام پر کی گئیں ۔"

اور حقّانی صاحب کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ:

" یہ کیفیت تعلیم یافتہ لوگوں کو اہلِ مذہب اور اس کے نتیجہ میں خود مذہب سے دُور کرنے کا باعث بن رہی ہے۔ آپ یہ جو اکثر سُنتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگ مذہبی حکومت اور مذہبی ریاست اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی وجہ وہی فرقہ وارانہ سرگرمیاں ہیں جو ہمارے ہاں اِس قدر عام ہو گئی ہیں اور وہ مذہبی تصوّرات ہیں جو فروغ پا رہے ہیں۔"

یہ کیفیت کن حضرات کی پیدا کردہ ہے اِس کے متعلق جناب حقّانی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

"اِس میں بڑا قصور ان مذہبی پیشواؤں کا ہے جو فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینا ہی دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے ہیں اور جن کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں اور مدّاحوں اور معتقدین کو مسلک اور عقیدہ کے اختلاف میں اس قدر پختہ اور متشدد کر دیں کہ وہ دوسرے مسلک کے لوگوں کو کافروں سے بدتر سمجھنا شروع کر دیں اور ہو سکے تو ان کے درمیان سماجی و خاندانی تعلّقات بھی منقطع ہو جائیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں مذہب کا تذکرہ ایسے انداز میں ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔"

لیکن اس کے باوجود اِن حضرات کو معاشرہ میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور حقّانی صاحب اپنے زیرِ نظر مضمون میں اِس امر کا تذکرہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

"سرکار دربار کی سطح پر مذہب کے مفرط تذکرہ نے مذہبی پیشواؤں کے حوصلوں اور عزائم میں ایک خاص شدّت پیدا کر دی ہے۔ انہیں معاشرہ میں غیر معمولی اہمیّت مل گئی ہے جس کا وہ تعمیری سے زیادہ تخریبی اور اصلاحی سے زیادہ منافرانہ استعمال کر رہے ہیں۔"

اِن حضرات نے نفرت سازی کی فیکٹریاں صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ملک میں بھی قائم کرنا شروع کر دی ہیں تا کہ آج کی طرح آنے والی نسلیں بھی دنیا کے سامنے سر اُٹھا کر چلنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ لٰہذا بیرونِ ملک سرپھٹول کی یہی وہ کیفیت ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ جنگ لاہور نے اپنے اداریہ بابت ۲۰ جون ۱۹۸۵ء کو لکھا کہ:

"فروعی اختلافات اور مذہبی گروہ بندی نے پاکستان میں جو گل کھلائے ہیں وہی کچھ کم نہیں تھے کہ اب بیرونی ممالک میں بھی بریلوی اور دیوبندی حضرات دست و گریباں ہوکر مذہب اسلام کے لیے تضحیک کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ انگلستان میں جنوبی یارک شائر کے دو شہروں میں ان دونوں گروہوں کے درمیان تصادم کی خبریں آئی ہیں۔ اِس تصادم میں ۲۴ افراد زخمی ہوئے بعض کو شدید چوٹیں آئیں اور انہیں ہسپتال داخل کرانا پڑا۔ انتہا یہ ہے کہ بعض فرقہ پرست علماء انگلستان جاکر باقاعدہ مورچہ بندی کرتے اور اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ مخالفین کو طعن و تشنیع سے نوازنے میں معروف رہتے ہیں۔ یہ حضرات تبلیغ کے نام پر بیرونی دورے کرتے ہیں لیکن وہاں جاکر مسلمانوں کے درمیان تفریق و انتشار کے بیج بوتے اور اسلام کو دوسروں کی نگاہوں میں رسوا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے شہر روتھرم کی مسجد کو حکومت نے محض اِس لیے تالا لگا دیا تھا کہ اندیشۂ نقضِ امن کے تحت ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔"

انتخابی منشوروں میں سیاسی پارٹیوں کا وجود

(انتخابی منشوروں میں فرقہ بندی نیز مختلف راہنماؤں کے بیانات)

قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ "تم اپنے تمام معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو کیونکہ یہی تمہارا سب کا مشترکہ منشور ہے۔" لیکن آج جو اہلِ پاکستان زندگی کے ہر معاملے میں اس قدر ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں تو اس کی بنیادی وجہ اسی حکم سے انحراف ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ ہمیں اِس ذہنی انتشار کا اندازہ کچھ عرصہ پیشتر اندرونِ ملک شروع ہونے والی اُس بحث سے بخوبی ہو سکے گا کہ کیا انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں یا غیر جماعتی بنیادوں پر — کوشش یہ کی گئی ہے کہ اِس سلسلہ میں چیدہ چیدہ حضرات کے خیالات کو ہی قلمبند کیا جائے تاکہ آنے والی نسلیں اِس امر کا اندازہ کر سکیں کہ اِس سلسلہ میں ہمارے ان اکابرین کی رائے کیا تھی۔ چنانچہ ان خیالات اور بیانات کو چند صفحات میں یکجا کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

سیاسی جماعتوں کا منشور

دسمبر ۱۹۷۰ء میں ملک میں عام انتخابات ہوئے جن میں مختلف سیاسی جماعتوں نے حصّہ لیا۔ ظاہر ہے اِس سلسلہ میں ہر جماعت نے اپنا اپنا منشور مرتب کر رکھا تھا۔ چنانچہ خالص سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر جو قرآنی تعلیم سے بے بہرہ تصوّر کی جاتی تھیں، دیکھنا یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتوں نے اس فرقہ بندی کو ختم کرنے کے لیے کیا تدابیر تجویز کیں لیکن افسوس کہ ہر " اسلام پسند جماعت " خواہ وہ جماعتِ اسلامی ہو اور خواہ کُل پاکستان جمعیت اسلام (مفتی محمود مرحوم صاحب کی پارٹی) ہر ایک نے اپنے اپنے منشور میں یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو اِن بائیس نکات کو مملکتِ پاکستان کے دستور کی اساس بنا دیں گے یعنی اُن بائیس نکات کو جس میں شق نمبر ۴ اور شق نمبر ۹ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

قومی اتحاد کا منشور

۱۹۷۰ء کے بعد ۱۹۷۷ء میں ملکی سطح پر ایک بار پھر عام انتخابات کا دَور آیا اس وقت سب سے اہم سطح پر قومی اتحاد کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان حضرات کا تو نعرہ ہی نظام مصطفےٰ کا قیام تھا اور اس کے سربراہ (مفتی محمود[1] صاحب مرحوم) تھے لیکن اِن حضرات نے بھی اجتماعی طور پر اس فرقہ بندی اور پارٹی بازی کے اِس موذی مرض کو ختم کرنے کے لیے کوئی فارمولا ملت کے لیے تجویز نہ کیا جبکہ اس کا بہترین علاج تو یہ تھا کہ دین اور دنیا کی ثنویت کو ختم کرنے کی خاطر ان مذہبی فرقہ بندی کے گہواروں (یعنی مذہبی دار العلوموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرتے ہوئے اس کی جگہ قرآنی تعلیم کا مشترکہ نصاب سکولوں اور کالجوں میں رائج کرنے کا کوئی پروگرام قوم کے سامنے رکھا جاتا تاکہ اُمّتِ واحدہ کے تصوّر کو عملی تشکل دی جا سکتی۔ لیکن یہ کچھ نہ پہلے تھا اور نہ اب بلکہ اِس کے برعکس انہوں نے کہا تو یہ کہا کہ "دینی (دار العلوموں اور) مدارس کو قومی تحویل میں نہ لینے کی ضمانت دی جائے گی"۔ (بحوالہ منشور پاکستان قومی اتحاد صفحہ نمبر ۱) بالفاظ دیگر اگر ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو ہر فرقہ کی غیر قرآنی فرقہ بندی کے تصوّر کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے انہیں قانونی حیثیت دی جائے گی۔

ع خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

۱۔ مفتی محمود صاحب مرحوم، سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر بھی فائز کر دیئے گئے تھے۔

ان مدارس اور دار العلوم کے متعلق مولانا فضلِ حق صاحب نے اپنے مضمون "قرآن کا سفر" میں لکھا تھا کہ:

"بین الاقوامی سرحدوں کو نظر انداز کر کے آپ پشاور سے ترچنا پلی تک بس یا کار میں سفر کریں تو جہاں آپ کو مناظر ارضی اور آب و ہوا کی نیرنگیاں نظر آئیں گی وہاں مسلمان آبادیوں میں آپ کو دار العلوموں کے رنگا رنگ سائن بورڈ بھی ملیں گے ایک قرآن کے ہزار مکتب اور مدرسے کوئی حنفیہ کوئی چشتیہ اور کوئی صرف قرآنیہ اور حقانیہ۔ ان مدرسوں کے بانی یقیناً نیک نیت اور مخلص لوگ گزرے ہوں گے اور ان کی کاوش کا مقصد نورِ بصیرت کو عام کرنا ہی ہوگا۔ لیکن آدمی فانی اور وراثت زمانی ہے۔ بات جب وراثتوں تک پہنچی تو یہ مراکز اشاعتِ قرآن کے ساتھ ساتھ حصولِ دنیا، فروغِ سیاست، اور کسبِ رزق کے ذریعے بن گئے۔ اصل مقصد پہلے پس منظر میں گیا پھر بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۶ جنوری ۱۹۸۴ء)

نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

دار العلوموں کی اِس حقیقتِ حال کے بعد پارٹی بازی کے سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سوالنامہ کا جواب دیتے ہوئے جماعتِ اسلامی نے کہا تھا: "اسلامی ریاست میں سیاسی پارٹیوں کی پوری گنجائش موجود ہے۔" نیز انہوں نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ "جن جماعتوں نے قرآن و سنّت کی بنیاد پر اپنے منشور تیار کیے ہیں انہیں فی الفور بحال کر دیا جائے اور جو جماعتیں پاکستان کی اساس کی مخالف ہیں انہیں ہرگز پنپنے کا موقع نہ دیا جائے" (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۳ء)

بلکہ ۱۹۶۲ء کی قومی اسمبلی نے ایک طویل اجلاس کے بعد جب سیاسی پارٹیوں کے احیا اور تشکیل سے متعلق بل پاس ہوا تو جماعتِ اسلامی کے امیر جناب مودودی مرحوم نے اس وقت فرمایا تھا کہ "سچ پوچھیے تو ملک میں سیاسی جماعت بنانے کا سب سے زیادہ حق اب ہمیں حاصل ہوگیا ہے باقی جماعتیں تو رعایتاً اِس امر کی مجاز ہوں گی کہ اپنی الگ تنظیم کریں۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۱۶ جولائی ۱۹۶۲ء۔ طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۶۲ء)

کالعدم جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کی ۴۲ ویں یوم تاسیس کے موقع پر فرمایا "جو لوگ سیاسی جماعتیں ختم کر دیں وہ اسلامی نظام کیسے منظور کر سکتے ہیں" اور مزید کہا:

"صحابہ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔ اس لیے مسلمانوں کے اندر جماعت کو حرام قرار نہیں دیا جاسکتا۔" (بحوالہ جنگ لاہور مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۸۲ء)

یعنی معاذاللہ صحابہ کرام رضؓ قرآن کی اس آیت کو بھی نہ سمجھ سکے کہ فرقے اور پارٹیاں بنانے والوں کا خدا کے رسولؐ کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔" ۶/۱۶۰۔

جہاں تک صحابہ کرام رضؓ کا آپس میں جماعتیں بنانے کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں شاید میاں صاحب کو علم نہیں کہ مودودی صاحب مرحوم) اس سے پہلے فرما چکے تھے کہ" نبی اکرم اور خلفائے راشدین رضؓ کے زمانے میں تمام مسلمان ایک ہی پارٹی تھے۔" (بحوالہ نوائے وقت ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۸ء)

میاں طفیل صاحب کے بعد جہاں تک ۱۹۸۵ء کے ضمنی انتخابات میں نو منتخب ممبر سید اسعد گیلانی کا تعلق ہے تو آپ نے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک اجتماع میں فرمایا کہ:

"اگر سیاسی جماعتوں کو بحال نہ کیا گیا تو کالعدم جماعتِ اسلامی خود ایک تاریخ مقرر کرے گی اور اس تاریخ کے ۲۴ گھنٹے کے اندر جماعتِ اسلامی کو بحال کردینے کا اعلان کردیا جائے گا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۸۵ء)

اور قومی اسمبلی کے رکن ایئر مارشل ریٹائرڈ نور خاں نے کہا کہ "سیاسی جماعتوں کو آزادی دیئے بغیر جمہوریت نہیں چل سکتی۔" (روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ مئی ۱۹۸۵ء)

جماعتِ اسلامی کے شیخ التفسیر مولانا گوہر الرحمان کا فرمان یہ ہے کہ" اسلام میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں پر کوئی پابندی نہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۸۳ء)

پنجاب اسمبلی کے رکن مولانا منظور احمد چنیوٹی نے جنگ فورم میں انٹرویو کے دوران فرمایا کہ" تمام سیاسی جماعتوں کو بحال کردینا چاہیئے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ دسمبر ۱۹۸۵ء)

نظریاتی کونسل کی رپورٹ

کچھ عرصہ پیشتر اسلامی نظریاتی کونسل نے پاکستان میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کے سلسلہ میں ۸۶ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ بھی تیار کی تھی جس میں رائے ظاہر کی گئی کہ غیر جماعتی انتخابات بہتر رہیں گے۔ اس سلسلہ میں مختلف حضرات کے بیانات اور انٹرویوز اخبارات میں شائع ہوئے چنانچہ کالعدم جماعتِ اسلامی کے مرکزی رہنما اور سابق وفاقی وزیر پروفیسر غفور احمد صاحب نے فرمایا "ہم نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ اگر عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرائے گئے تو یہ ملک کے لیے

نقصان وہ ہوگا۔" (بحوالہ نوائے وقت میگزین ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۲ء) اِس کے علاوہ اِسی جماعت کے نائب صدر مولانا جان محمد عباسی نے فرمایا: "غیر جماعتی بنیاد پر تو کوئی سیاسی عمل ہی ممکن نہیں۔"

(بحوالہ نوائے وقت میگزین مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اور اگر اِس سلسلہ میں مولانا کوثر نیازی صاحب سابق وفاقی وزیر مذہبی امور کا وہ کالم دیکھا جائے جو انہوں نے بعنوان "سیاسی جماعتیں اور اسلام" کے تحت روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء کو رقم کیا تو وہ بھی اِس میدان میں کسی سے پیچھے دکھائی نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ:

"سیاسی جماعتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ کہ ان کا وجود خلافِ اسلام ہے جبکہ نبی اکرمؐ کے زمانے کے قبائل ہی موجودہ سیاسی جماعتوں کا بدل تھے اور ہر قبیلہ اپنی اپنی جگہ ایک مضبوط سیاسی جماعت کی حیثیت رکھتا تھا۔[1] پھر اللہ کے رسولؐ نے سیاسی جماعتوں کے قیام کی مخالفت بھی نہیں کی۔"[2] پھر مزید فرمایا کہ "موجودہ سیاسی جماعتوں کے قیام کو غیر اسلامی قرار دے دینا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔"

۱۹۸۵ء کے عام ملکی انتخابات سے قبل مولانا کوثر نیازی صاحب جو کالعدم پروگریسو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ہیں، پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:

"مجھے خوشی ہے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے آخر کار نظریاتی بحث ترک کردی ہے جس میں ان کے خیال کے مطابق اسلام میں سیاسی جماعتوں کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ نقطۂ نظر بالکل غلط تھا۔ قرآن پاک میں اچھے مقصد کے لیے جماعت سازی کا حکم موجود ہے۔ خود رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں مختلف منظم گروہ موجود تھے اور بعض قبائل کا تشخص تسلیم کیا جاتا تھا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۸ دسمبر ۱۹۸۳ء)

خان محمد اشرف خان صاحب سربراہ کالعدم خاکسار تحریک پاکستان نے فرمایا:

"غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ارکان اسمبلی میں جاکر اپنے اغراض و مقاصد کے لیے نت نئے گروپ بناتے اور توڑتے رہیں گے۔ ایسی حکومت بھی مستحکم نہیں ہوگی۔ انتشار کا

---

[1] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی قبیلوں کو اُمت واحدہ کا تصور پیش کیا تھا تاکہ قبائلی سطح کی سیاست گری باقی ہی نہ رہے بلکہ سب کے سب خدا کی ایک پارٹی میں شامل ہوجائیں۔

[2] کس قدر بہتان ہے رسولِ خدا پر۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی اپنی مفاد پرستی کسی کو بھی معاف نہیں کرتی۔

شکار رہے گی۔ ذاتی اغراض پرورش پائیں گی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ راگست ۱۹۸۳ء)

مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب جنرل سیکرٹری کالعدم جمعیت العلمائے پاکستان نے فرمایا:

"روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں جہاں غیر جماعتی انتخابات ہوتے ہوں۔ اِس سے نسلی قومیت، وطن، علاقائیت، زبان اور رنگ کے تعصبات اُبھریں گے اور ملکی سلامتی کے لیے زہرِ قاتل۔ (لہٰذا) جماعتی بنیادوں پر انتخابات سے پاکستان کی وحدت و استحکام حاصل ہوگا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ ۶ راگست ۱۹۸۳ء)

پھر نومبر ۱۹۸۳ء میں مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات ملکی مفاد کے منافی ہیں (کیونکہ) اِس سے علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات پیدا ہوں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۶ نومبر ۱۹۸۳ء)

کے۔ایچ خورشید سابق صدر آزاد کشمیر نے فرمایا " پارلیمانی نظام اور پارٹی سسٹم کے بغیر دعوام کی ترجمانی ہو سکتی ہے اور نہ عوام کا کردار ابھر سکتا ہے۔"

نجیاب علی خاں مزدور کسان پارٹی کے رہنما نے فرمایا" میں غیر جماعتی انتخابات کو نامناسب سمجھتا ہوں۔ غیر جماعتی انتخابات سے پاکستان کا مستقبل متاثر ہوگا۔" (ایضاً)

ملک قاسم جنرل سیکرٹری مسلم لیگ خیرالدین گروپ نے فرمایا" غیر جماعتی انتخابات کے ملک پر اچھے اثرات مرتب نہیں ہوں گے اِس سے برادری سسٹم فروغ پائے گا۔" (ایضاً)

نفیس صدیقی سابق مرکزی سیکرٹری اطلاعات تحریکِ استقلال نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات میں ہر شخص مسائل کو اپنے طریقے سے حل کرنا چاہے گا۔ یہ ملک و قوم کے لیے خطرناک ہوں گے۔" (ایضاً)

ریٹائرڈ جسٹس شوکت علی ایک ممتاز سیاسی رہنما نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات کسی بھی لحاظ سے سود مند نہیں ہو سکتے۔ جماعتی انتخابات ملکی سالمیت کی ضمانت فراہم کر سکتے ہیں۔" (ایضاً)

جناب مسٹر جسٹس شوکت علی صاحب نے سیاسی جماعتیں اور انتخابات کے سلسلہ میں مزید فرمایا: "اگر ہم نے غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات کی بنیاد رکھ دی تو ملک چھوٹی چھوٹی برادریوں میں بٹ جائے گا اور ایک پاکستانی قومیت کا تصور بالکل ختم ہو جائے گا جس سے پاکستان کی سلامتی اور بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۹۸۳ء)

نواب اکبر بگٹی سابق گورنر بلوچستان: "غیر جماعتی انتخابات سے ترقی کی رفتار رک جائے گی اور

گروہ بندی ہوگی۔" (ایضاً)

خورشید حسن میر، سربراہ کالعدم عوامی جمہوری پارٹی نے فرمایا: "غیر جماعتی انتخابات کہاں اور کس ملک میں ہوتے ہیں اس سے ہر شخص برادری کی بنیاد پر اسمبلی میں آئے گا۔ ایک فرد کی معاشی پالیسی کیا ہوگی خارجہ پالیسی کیا ہوگی۔ صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر اس کا موقف قومی نوعیت کا کیسے ہوگا وہ نہ کسی کے سامنے جواب دہ ہوگا نہ کسی ضابطہ کا پابند۔" (ایضاً)

خواجہ خیرالدین، صدر مسلم لیگ (خواجہ خیرالدین گروپ) نے فرمایا: "غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے نتیجے میں منتخب ہو کر اسمبلی میں جانے والے افراد اپنے علاقے کی بات کریں گے ملک کی نہیں۔" (ایضاً)

میر غوث بخش بزنجو، سربراہ پی این پی نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات جمہوریت کا حصہ نہیں ہیں ایسے افراد جس طرح چاہیں گے سودے بازی کریں گے۔

زین العابدین قائم مقام صدر کالعدم پی ڈی پی نے فرمایا "غیر جماعتی انتخابات سے عجیب قسم کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور ہم بہت پیچھے چلے جائیں گے۔" (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۶ راگست ۱۹۸۳ء)

جمعیۃ علمائے پاکستان کا انتخابی منشور

جمعیۃ علمائے پاکستان کا انتخابی منشور جس کا نام ہی "اسلامی منشور" تھا اگر اسے دیکھا جائے تو اس کے صفحہ ۲۰ پر یہ پروگرام ملے گا:

"پاکستان کی مجلس شوریٰ (اسمبلیوں) وغیرہ میں نمائندگی کے لیے انتخابات کا نظام شخصی مقابلہ کے بجائے جماعتی مقابلہ پر قائم کیا جائے گا اور افراد کی بجائے جماعتیں اپنے منشور و پروگرام کی اساس پر انتخابات میں حصہ لیں گی اور فی صد کامیابی کے تناسب کے مجالس شوریٰ کی رکنیت کی حقدار بنیں گی اور تشکیل حکومت کریں گی۔"

نیز کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی کنونشن جو جامعہ نعیمیہ لاہور میں پیر سید برکات احمد کی صدارت میں مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۸۵ء کو منعقد ہوا ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ "سیاسی جماعتوں پر رجسٹریشن کی پابندی عائد نہ کی جائے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۴ر نومبر ۱۹۸۵ء)

بالفاظ دیگر ان کی باگ ڈور بھی کسی ادارہ کے ہاتھ میں نہ ہو۔

کالعدم جمعیت العلمائے پاکستان کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل شاہ فرید الحق جنگ فورم میں کہتے ہیں: "انتخابات جماعتی بنیاد پر ہوتے چاہئیں۔"

جہاں تک جمیعت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کا تعلق ہے تو آپ نے ایک انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہمارا موقف یہ ہے کہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو عام انتخابات میں حصّہ لینے کا حق حاصل ہو۔"

اور جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا جمیعت علمائے پاکستان عام انتخابات میں کسی سیاسی جماعت سے انتخابی اتحاد کرے گی تو کہا "نہیں۔ ہماری یہی سوچی سمجھی رائے ہے کہ انتخابی اتحاد مفید نتائج پیدا نہیں کرتا اس لیے جمیعت انتخابی اتحاد نہیں کرے گی۔" (بحوالہ روز نامہ جنگ جمعہ میگزین ص۲۴ مورخہ ۸ ۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

اور ایس۔ایم ظفر سابق وفاقی وزیر قانون نے انتخابات کے سلسلہ میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

"سیاسی جماعتوں کا تجربہ انسانی فکر کا ایک نیا تجربہ ہے اور تمام مملکتیں سیاسی جماعتوں کے ذریعے ہی حکومت چلا رہی ہیں اس لیے اس مفید فکری ایجاد سے گریز مناسب نہیں"

پھر فرمایا: "آخر گھڑی کی سوئی کو پچھلی جانب گھمانے کا شغل بے کار کیوں اپنایا جائے کیونکہ آگے بڑھ کر بیسویں صدی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئی راہیں اختیار کی جائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیاسی جماعتوں کے بننے اور ان کی نشوو نما میں رکاوٹ بننے کی بجائے حکومت ان کی مددگار بنے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

اور جاذب سہیل نمائندہ جنگ لاہور نے ایک ملاقات کے دوران محمد بخش مسلم سے جب سوال کیا کہ:

"جب انتخابات جائز ہیں تو کیا اسلام میں سیاست اور سیاسی پارٹیوں کی گنجائش ہے؟" تو آپ نے فرمایا:

"قائدِ اعظم۔ لیاقت علی خاں بھی ایک سیاسی پارٹی سے منسلک تھے۔ جمیعت علمائے پاکستان، جمیعت العلمائے السلام، مسلم لیگ اور جماعتِ اسلامی کیا ہیں۔ آخر جماعتیں ہی تو ہیں۔ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی گنجائش ہے۔ کون کہتا ہے نہیں ہے۔"

(بحوالہ روز نامہ جنگ لاہور جمعہ میگزین ۱۲ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

مولانا محمد بخش مسلم کے اِس سوال کا جواب کہ کون کہتا ہے کہ اسلام میں پارٹیوں کی گنجائش نہیں سوائے اِس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ ہمارا خود ساختہ اسلام تو یقیناً اس کی اجازت دیتا ہے لیکن خدائے واحد کی طرف سے نازل کردہ ضابطہ حیات میں تو کہیں بھی اس کی گنجائش نہیں۔ افسوس

ﻟﮧ قائدِ اعظم کی مسلم لیگ کو ختم کرنے کی بات آئندہ صفحات پر سامنے آئے گی۔

تو یہ ہے کہ ہم اپنی بات کو مؤثر ثابت کرنے کے لیے اور دوسروں سے منوانے کے لیے بڑی جرأت کے ساتھ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام نے یہ کہا اور شریعت کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔ اگر یہ حضرات اسلام اور شریعت کی غیر متعین اصطلاح کی بجائے قرآن حکیم کا لفظ استعمال کریں تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ حضرت یہ بات قرآن حکیم کے کس مقام پر درج ہے۔ اس نے تو پورے قرآن میں امّت واحدہ کی تعلیم دی ہے اور یہی ہمارا آئیڈیل نظام ہے ـــــ اِس کے بعد ایک اور قابلِ غور اور دلچسپ انٹرویو ملاحظہ فرمائیں۔

جناب محترم جاذب سہیل صاحب نے اپنی ان تمام اخباری ملاقاتوں کے دوران مجلس شوریٰ کے رکن اور جمعیت اہلحدیث کے رہنما میاں فضل حق صاحب سے انٹرویو لیتے ہوئے جب یہ سوال کیا کہ "صاحب یہ بتا دیجئے کہ سیاسی پارٹیوں کے وجود کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟" تو آپ نے فرمایا:

"سیاسی پارٹیاں نظامِ حکومت چلانے کے لیے معرضِ وجود میں آسکتی ہیں۔ اسلام اِس کی اجازت دیتا ہے۔"

آپ کا دوسرا سوال یہ تھا کہ "پھر یہ بتا دیجئے کہ آپ انتخابات جماعتی بنیادوں پر پسند کرتے ہیں یا غیر جماعتی بنیاد پر؟" تو آپ نے جواب دیا:

"یہ مسئلہ بالکل واضح ہے۔ آپ اجتماعی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، خوب جانتے ہیں کہ اِس وقت ملک میں کتنی جماعتیں ہیں ـــ ۸۰ سے زائد ہیں۔ صرف بڑی جماعتوں کو شمار کیا جائے تو وہ بھی دس سے زیادہ ہیں۔ جب یہ ملک بنا تھا تو اس وقت کتنی جماعتیں تھیں، صرف ایک اور پورے برِ صغیر میں ایک نظریئے کے تحت کام کر رہی تھی۔ اس نے پاکستان جیسا بڑا مقصد حاصل کیا۔ اب ڈھیر ساری جماعتیں کیا کریں گی؟ منتخب ہو کر وزارتوں کی تقسیم ہوگی۔ باہمی کشمکش کو فروغ ملے گا، ذاتی مفادات پر جھگڑے ہوں گے۔ اِس طرح یک جہتی اور اتحاد کے جذبات پروان نہیں چڑھ سکیں گے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات کرائے جائیں۔ ایسے انتخابات کے نتیجے میں اتحاد کو فروغ ملے گا۔"

س : جب آپ سیاست اور دین کو الگ قرار نہیں دیتے، سیاسی پارٹیوں کے عمل کو اسلام کے خلاف نہیں کہتے تو جماعتی انتخابات کے خلاف چہ معنی دارد؟

ج : ہمیں حکم ہے کہ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو (القرآن)۔ جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ہمارا

دین ہے، اسلام ہماری سیاست ہے تو پھر زیادہ جماعتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

س : میرا یہ سوال ابھی تشنۂ جواب ہے کہ اگر علمائے کرام ایک پارٹی نہیں بنا سکتے تو سیاسی پارٹیوں کی تعداد پر اعتراض کیوں ؟"

ج : علماء فقہی طور پر جداگانہ مسالک رکھتے ہیں لیکن اجتماعی طور پر اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے کوئی شوریٰ میں اختلاف نہیں رکھتا۔ یعنی فقہی لحاظ سے جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کی زد میں نہ زکوٰۃ آتی ہے، نہ عشر، نہ شراب کی تعریف آتی ہے، نہ وراثت کے سلسلہ میں وصیت، نہ چوری کے معاملہ میں ہاتھ کاٹنے پر اختلاف ہے، نہ زمین کی بٹائی اور مزارعت نہ سنّت کی تعریف متضاد ہے، نہ قرآن کی تفسیر اور تراجم متضاد بلکہ ان تمام علمی، سماجی، سیاسی عدلی اور تعزیری نظام اور تعلیم پر مکمل اتفاق ہے۔[۱]

... اس کے بعد موصوف نے ۳۱ علمائے کرام کے مرتب کردہ ان ۲۲ نکات پر سوال اٹھایا جس پر راقم اس سے پہلے تبصرہ کر چکا ہے۔ سوال تھا کہ کیا حکومت نے ۲۲ نکات کا فارمولا تسلیم کر لیا ہے جواب یہ تھا "کر لیا ہے"۔ اس کے بعد پوچھا گیا کہ "کیا اس کے مطابق عمل ہو رہا ہے؟" تو آپ نے فرمایا "بائیس نکات کے رہنما اصولوں کے مطابق یقیناً عمل ہوگا"۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین صفحہ ۶ مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

یعنی فرقہ بندی کی گرہوں کو مضبوط کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ تعلیمی ادارے ضرور قائم ہوں گے۔

اے کاش کوئی اللہ کا بندہ ان سوالات اور ان بیانات پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔

قرآن حکیم نے سچ کہا تھا کہ "اگر یہ کتاب خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو اس میں بہت سارا اختلاف ہوتا" $\frac{۴}{۸۲}$

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (جو مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہ چکے ہیں) ان کا خصوصی انٹرویو روزنامہ جنگ کی ۱۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ انٹرویو کے دوران آپ سے سوال کیا گیا کہ "کیا آپ سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے حق میں ہیں؟" تو آپ نے جواب میں فرمایا :

---

[۱] اہل علم حضرات خوب جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

" مَیں اِس کے حق میں ہوں کہ اِس کے بغیر یہاں کوئی نظام نہیں چل سکتا لیکن کُل پاکستان سطح پر گریجوایٹ اسمبلی یا منتخب مجلس شوریٰ کی میری تجویز ہے۔ مَیں اس کے لئے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کے حق میں ہوں۔"

آپ کے اِس جواب پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اور جب آپ سے یہ سوال کیا گیا کہ " جب سیاست اور دین جداگانہ چیزیں نہیں ہیں تو پھر سیاسی پارٹیوں کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ " تو آپ نے فرمایا:

" (۱) ہمارا آئیڈیل نظام تو حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا قائم کردہ نظام ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں بھی قائم رہا۔ میرے نزدیک وہ نظام غیر جماعتی یا ایک جماعتی نظام تھا کسی سیاست کا وجود نہیں تھا۔ تاہم موجودہ حالات میں سیاسی جماعتوں کے رول کے لیے گنجائش پیدا کرنی پڑے گی۔

(۲) بنیادی طور پر دین اس کے خلاف نہیں ہے۔"

جب آپ سے یہ پوچھا گیا کہ " کیا سیاسی پارٹیاں دینِ اسلام کے خلاف نہیں ہیں؟ " تو آپ کا جواب تھا کہ:

" جی نہیں۔ میرے نزدیک سیاسی جماعتیں اپنے منشور کے ساتھ عوام کے سامنے آئیں۔ ان کو انتخابات میں حصہ لینے کی کھلی اجازت ہو لیکن حکومت کی تشکیل کے بعد میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں آزادانہ اور اپنے ضمیر کے مطابق رائے دینے کا حق دینا چاہیئے۔ پارٹی کی رائے کے مطابق ہی چلنے کی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔"

یعنی ہمارا آئیڈیل نظام تو حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا بخشی کردہ ہے جس میں کسی سیاسی پارٹی کی گنجائش نہیں لیکن اسلام اِس آئیڈیل نظام کے خلاف اجازت بھی دیتا ہے۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔

اسلامی نظریاتی کونسل میں سیاح الدین کاکاخیل نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

" غیر اسلامی دستور و منشور والی سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں شرکت کا حق نہ دیا جائے اور اسلامی دستور و منشور والی سیاسی جماعتوں کو موقع دیا جائے کہ ان کے ذریعے دستورِ پاکستان کے مقاصد کو حاصل کیا جائے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ادارتی صفحہ ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء)

آزاد کشمیر کے صدر جناب عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا:

"بگڑے ہوئے حالات صرف سیاسی جماعتیں ہی سنوار سکتی ہیں۔ اگر حالات مخدوش ہوجائیں تو انہیں ختم کرنے کے لیے بھی سیاسی جماعتیں مؤثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین مورخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

کالعدم قومی محاذ آزادی کے قائمقام صدر اقبال حیدر نے کہا:

"غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات حکومت کو استحکام دینے کے مترادف ہیں۔" نیز آپ نے فرمایا کہ اس طرح حکومت عوام کو جماعتی اور غیر جماعتی انتخابات میں اُلجھا کر ملک میں آمریت نافذ کرنا چاہتی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

تحریکِ اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد نے کہا "غیر جماعتی انتخابات سے ملکی سلامتی کو نقصان پہنچے گا۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۳ء)

ممتاز سیاسی دانشور اے کیو ایم شفیق الاسلام سابقہ مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اور سیکرٹری اطلاعات نے روزنامہ جنگ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے ۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کے حوالے سے فرمایا:

"مارشل لاء کا ختم ہونا بھی ضروری ہے اور انتخابات جماعتی بنیادوں پر کرانا بھی لازم ہے۔ غیر جماعتی بنیاد پر انتخابات تباہ کن نتائج کے حامل ہوں گے جس سے ملک کو انتشار اور ایک نئے بحران کے سوا کچھ نہ ملے گا۔"

پاکستان کے سابق چیف جسٹس جناب مسٹر جسٹس شیخ انوار الحق نے جناب سہیل صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو کے دوران ایک سوال (کہ کیا انتخابات سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر ہونے چاہئیں یا غیر جماعتی بنیاد پر) کے جواب میں فرمایا:

"اس کے بارے میں تفصیلی رائے کا اظہار سیاست دان کر سکتے ہیں۔ میں سیاستدان نہیں ہوں۔ البتہ ایک شہری ہونے کی حیثیت سے میری ذاتی رائے ہے کہ انتخابات جماعتی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔ پاکستان ایک سیاسی جماعت کی جدوجہد کے نتیجے میں بنا ہے، اس کی بنیاد سے انحراف ٹھیک نہیں۔ غیر جماعتی بنیادوں پر جو افراد اسمبلیوں میں جائیں گے وہ کوئی مشترکہ مؤقف کس طرح اختیار کریں گے۔ ان کا منشور کیا ہوگا۔ وہ قومی اور عالمی پالیسیوں کے بارے میں کیا رائے دے سکیں گے۔ انفرادی طور پر کوئی شخص کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس کی اجتماعی سوچ کیا ہوسکتی ہے البتہ سیاسی

پارٹیوں کو نظریہ پاکستان، ملکی وحدت کی سالمیت، اور مسلّمہ اسلامی اقدار کا پاسدار بنایا جاسکتا ہے۔ الیکشن کمشن کو اپنے طور پر ایسی پارٹیوں کے بارے میں چھان بین کرنی چاہیئے۔ جس پارٹی کو وہ مسلّمہ اصولوں کے خلاف سرگرم پائیں اس کو الیکشن میں حصّہ لینے سے روک دیں۔ لیکن اس صورت میں پارٹی کو اپنی پوزیشن صاف یا واضح کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین ۲۵ر نومبر ۱۹۸۳ء)

جناب حنیف رامے سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے فرمایا کہ:

"سیاسی جماعتوں پر عائد پابندیاں ختم کرکے انتخابات کرائے جائیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء)

پاکستان کے سابق وزیرِ خارجہ جناب آغا شاہی نے جنگ فورم کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ: "میں اصولاً سیاسی جماعتوں کو کردار ادا کرنے کا موقع دینے کے حق میں ہوں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۸ر فروری ۱۹۸۴ء)

نوابزادہ نصراللہ خاں صاحب نے فرمایا کہ

"سیاسی جماعتوں نے وطن کی سالمیت کے لیے ہر آڑے وقت میں مؤثر کردار ادا کیا ہے اس لیے غیر جماعتی انتخابات سے وجود میں آنے والے ادارے کو کوئی لائق احترام نہیں سمجھے گا۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ر اگست ۱۹۸۴ء)

وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو

اور بالآخر ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے بعد پاکستان کے وزیرِ اعظم جناب محمد خان جونیجو نے فرمایا کہ:

"سیاسی جماعتوں کو بحال ہونا چاہیئے۔" آپ نے مزید فرمایا کہ "سیاسی جماعتوں کی بحالی تک ..... گروہ بندی سے گریز کرنا ہوگا۔" (بحوالہ روزنامہ مشرق لاہور مورخہ ۲۴ مارچ ۸۵ء)

(نیز) وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو نے اسلام آباد میں مسلم لیگ پارلیمانی گروپ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کوئی بھی حکومت کسی منظّم سیاسی جماعت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ اس لیے موجودہ حکومت نے اپنی سیاسی جماعت تشکیل دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ گذشتہ اجلاس کے دوران بعض ارکان

نے فلور کراسنگ کی شق کے حوالے سے یہ تاثر قائم کیا تھا کہ شاید ہم ان پر کوئی پابندی عائد کر رہے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ۔

فخر امام

وزیر اعظم جناب جونیجو نے جو کچھ کہا ہے قومی اسمبلی کے سپیکر جناب فخر امام نے بھی اگلے روز انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ جدید سیاسی نظام جماعتوں کے بغیر نہیں چل سکتا غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والی اسمبلی نے اب تک کافی کام کیا ہے لیکن طویل عرصہ تک سیاسی جماعتوں کے بغیر اس نظام کا چلنا ممکن نہیں ۔"

(بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۵ء)

اور جہاں تک سینٹ کی سیاسی کمیٹی کے چیئرمین جناب فدا محمد خاں کا تعلق ہے تو آپ نے روزنامہ نوائے وقت سے ایک ملاقات کے دوران فرمایا کہ "سیاسی پارٹیوں کی بحالی کے بعد ان کی تعداد میں کمی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۳۰ جولائی ۱۹۸۵ء)

اور اس کے بعد اگست ۱۹۸۵ء میں قومی اسمبلی کی ۲۹ رکنی خصوصی سیاسی کمیٹی نے آئندہ سیاسی نظام کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی اس کے مطابق :

قومی اسمبلی کی سیاسی کمیٹی کی رپورٹ

" ایسی کوئی سیاسی جماعت قائم نہیں ہونی چاہیئے جس کا مقصد کسی ایسی رائے یا نظریہ کا پرچار اس انداز میں کرنا ہو جس سے اسلامی نظریے ، پاکستان کی خود مختاری ، سالمیت ، اخلاقیات یا امن و امان کو نقصان پہنچ سکتا ہو ۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ ر اگست ۱۹۸۵ء)

روزنامہ جنگ لاہور کا اداریہ

صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر پارٹی بازی کے انتشار اور نقصانات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ مملکتِ پاکستان میں عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کروانا چاہتے ہیں تو روزنامہ جنگ لاہور نے ۶ دسمبر ۱۹۸۳ء کو اداریہ سپردِ قلم کیا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اہم حصہ یہاں درج کر دیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہماری سوچ کا رخ کیا ہے ۔

" صدر ضیاء الحق نے ایک بار پھر کہا ہے کہ وہ صرف پہلے عام انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر کرانے کے خواہشمند ہیں۔ ان کی اس خواہش کا اظہار مجلس شوریٰ کے ابتدائی اجلاس میں ان کے افتتاحی خطاب کے دوران بھی ہو چکا ہے تاہم ان کی اس خواہش کے باوجود پاکستان میں جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے انعقاد کی ملک میں تمام سیاسی مکاتب فکر کی جانب سے بدستور حمایت کی جا رہی ہے اور ہم اس ضمن میں ان ہی کالموں میں ایک سے زیادہ بار جماعتی بنیاد پر عام انتخابات کے انعقاد کی افادیت پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ صدر ضیاء الحق نے اس ضمن میں چونکہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا اور انہوں نے کبھی کسی معاملے کو اپنی ذاتی انا کا مسئلہ نہیں بنایا ہے اس لیے ہم ان سے مکرر گزارش کریں گے کہ وہ عام انتخابات کے معاملے میں مجلس شوریٰ اور ملک کے تمام مکاتب فکر کے جذبات و احساسات ہی کو مقدم جانیں اور تمام محب وطن سیاسی جماعتوں کو اس میں شرکت و شمولیت کا موقع فراہم کریں۔

جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کے انعقاد کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ کسی سیاسی حلقے کو ان میں شرکت پر اعتراض نہیں ہوگا اور اگر کسی ضمن میں کسی کالعدم سیاسی جماعت کی جانب سے ان میں عدم شرکت کا فیصلہ کیا جائے گا تو عوام الناس کی نگاہ میں اس فیصلے کی ذمہ داری متعلقہ کالعدم سیاسی جماعت کے سر پر رہے گی اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ کالعدم سیاسی جماعتوں کے صف اوّل کے رہنما صوبائی اور قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لے سکیں گے اور اس طرح جو طبقہ ان انتخابات کے نتیجے میں اسمبلیوں میں پہنچے گا اس کی صلاحیت، کارکردگی، تدبّر اور تجربہ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والے ارکان سے کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ رائے دہندگان رائے دیتے وقت سیاسی جماعتوں کے منشور اور پروگرام کو پیش نظر رکھیں گے۔ برادری اور پیشہ کے نقطۂ نگاہ سے نہیں قومی نقطۂ نگاہ سے اپنے نمائندہ کا انتخاب کریں گے۔ جس کی وجہ سے یہ انتخاب وحدت فکر اور قومی فہم و فراست کے آئینہ دار ثابت ہوں گے اور اس طرح ملک میں قومی یک جہتی کی فضا پروان چڑھ سکے گی۔"

اس اداریہ کو دیکھنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کالعدم سیاسی پارٹیوں کے مخلص ارکان

باہمی مشاورت سے پارٹی بازی کے خلفشار اور انتشار سے بالاتر رہ کر اپنے علم، تدبّر، اور تجربہ کو بروئے کار لاتے ہوئے قرآن حکیم جیسے عظیم اور روشن منشور کی روشنی میں اس کی مقرر کردہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی خاطر اپنے حالات کے مطابق جزئیات اور قانون کیوں مرتب نہیں کر سکتے؟ کیا قرآن حکیم کے منشور میں انسان کو انسان کی محکومیت سے آزاد کرانے کا طریق موجود نہیں؟ کیا اس میں انسانیت کے لیے معاشی محکومی کا علاج موجود نہیں؟ کیا اس نے عائلی زندگی کو ایک مہکتے ہوئے چمنستان میں تبدیل کرنے کے لیے کوئی حدود متعین نہیں کیں؟ اور کیا اس میں یہ نہیں دیا گیا کہ خوف وحزن سے پاک معاشرہ کے لوازم کیا ہیں؟ کیا اس میں فرد اور معاشرہ کے حسین امتزاج کے لیے کوئی نشاندہی نہیں کی گئی؟ اور بقول قائدِاعظم کہ "کیا یہ وہی کتابِ عظیم نہیں جو ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتی ہے؟" جب اس کتاب کے منشور میں یہ تمام خصوصیات یقینی طور پر موجود ہیں اور اس کی تیار کردہ نرسری کے نوخیز پودے اور تکریم آدمیت کے حامل عالمِ انسانیت کے لیے ایک سایہ فگن پیڑ کی صورت اختیار کر سکتے ہیں تو کیا اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے انسان پارٹیوں اور فرقوں میں تقسیم ہو اور پھر ایک دوسرے کے لیے بغض و عناد کی فضا پیدا کرے جو پارٹی بازی کا خاصہ ہے۔ اگر بقول برٹرنڈرسل کے "نوعِ انسانی کے اندر قومیت کا مدار نفرت پر ہوتا ہے" تو قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق ایک ملّت کے اندر پارٹی بازی کا وجود اور احیا بھی تو نفرت و عداوت کا ہی رہینِ منت ہے کیا تاریخ اس کی شہادت نہیں دیتی کہ "مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنہوں نے اپنے الگ الگ نام رکھ لیے تھے، جس نے وحدتِ انسانی کی جڑ کاٹ دی۔ قرآنِ حکیم کے نزدیک انسان صرف دو گروہوں میں بٹ سکتے ہیں۔ حق کے طرف دار اور باطل کے حامی اور حق کے طرف داروں کی جماعت میں مزید جماعتیں شرک ہے۔

ہماری حالت بھی کچھ عجیب واقع ہوئی ہے پہلے تو ہم خود ہی اُمت واحدہ کو پارٹیوں اور فرقوں کے مختلف خانوں میں بانٹ دیتے ہیں اور جب ہمیں اپنے ان اعمال کی بنا پر کامیابی نصیب نہیں ہوتی تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہم معتوب کیوں ہیں؟ اور زبوں حال کیوں؟ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ۳۸ سالہ تاریخ ہی نہیں بلکہ ملّتِ اسلامیہ کی ہزار سالہ زندگی اس ادھیڑپن کا منہ بولتی تصویر ہے۔

اس قدر ذہنی انتشار کے باعث آج ہم اپنے ان اعمال کی بدولت کس قدر ادھیڑبن میں مبتلا ہو چکے ہیں اس کا اندازہ قارئین از خود روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۹ راگست ۱۹۸۵ء کے اداریہ سے ہی لگا

سکیں گے جو اداریہ نگار نے "یک جماعتی نظام اور روحِ اسلام" کے عنوان سے تحریر کیا :

"یک جماعتی نظام اور روحِ اسلام

قومی اسمبلی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث کر رہی ہے جس میں مستقبل کے سیاسی ڈھانچے کے لیے سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔ اس پر جن ارکان نے اختلافی نوٹ لکھے ان کی تفصیل شائع نہیں ہوئی مگر ان میں ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ملک میں یک جماعتی سیاسی نظام رائج کر دیا جائے کیونکہ یہ قابلِ عمل بھی ہے اور روحِ اسلام کے مطابق بھی اِس کے علم بردار جناب پیر اشرف نے بحث کے دوران کہا کہ پاکستان کے عوام کے لیے یہی نظام قابلِ قبول ہے۔ پھر اس سے مارشل لاء اُٹھنے کے بعد جس بدامنی کا اندیشہ لاحق ہے اس کا بھی مداوا ہو جائے گا۔ ہمیں یہ گمان نہیں کہ پارلیمنٹ اِس نظریئے کو قبول کر لے گی مگر اسلام کے نام پر ملک میں یک جماعتی سیاسی نظام کی آواز آگے چل کر بھی اُٹھتی رہے گی اِس لیے اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ کا دین مبین ہے جس میں کوئی اُبہام نہیں مگر اسلام کے مفسر بے شمار ہیں جو اپنے طبقاتی اور سیاسی مفاد کی روشنی میں وقتاً فوقتاً اس کی من مانی تعبیریں کرتے اور فکری اُلجھنیں پیدا کرتے رہتے ہیں اور پوری اسلامی تاریخ اِس کی شہادت دیتی ہے۔ ہم بہت دُور نہیں جاتے گذشتہ چار چھ ماہ میں جو کچھ ہوا اسی پر نظر ڈال لیجئے۔ مجلسِ شوریٰ کے عہد میں رُوحِ اسلام کا تقاضا شورائی نظام تھا۔ عہدے کی طلب حرام اور انتخابات ممنوعہ تھے۔ مگر پھر شورائی نظام کی جگہ منتخب اسمبلی نے لے لی۔ عہدے کی طلب بھی حلال ہوگئی اور رُوحِ اسلام کی نفی بھی نہ ہوئی۔ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہوئے تھے کیونکہ جماعت سازی رُوحِ اسلام کے منافی تھی مگر پھر جماعت سازی کو مشرف بہ اسلام کر لیا گیا۔ پیر صاحب یہ عمل خلافِ اسلام سمجھتے ہیں مگر یک جماعتی سیاست ان کے اسلامی نقطۂ نظر سے اب مباح ہو گئی ہے۔ جماعتِ اسلامی ایک مدت تک ان کی فکری اساس رہی مگر جماعتِ اسلامی کے نزدیک مختلف سیاسی پارٹیوں کا وجود اسلامی فلسفے کے عین مطابق ہے اور دیگر دینی مکاتبِ خیال بھی اس نظریئے سے اختلاف نہیں کرتے۔ پھر عام مسلمان کدھر جائیں؟"

کاش ہم قرآنِ حکیم سے پوچھ لیتے کہ ہم کدھر جائیں؟ تو وہاں سے اِس کا جواب یقیناً مل جاتا کہ "خدا کی

رسی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ:
حکمت ہے یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

نوائے وقت کی پکار

روزنامہ جنگ لاہور کے اِس متذکرہ اداریہ سے قبل ۲۰ ستمبر ۱۹۸۳ء کو روزنامہ نوائے وقت لاہور نے جو اداریہ شائع کیا اس میں یہی خواہش ظاہر کی گئی کہ سیاسی جماعتوں کو جلد بحال کریں اور اس کے بعد نوائے وقت لاہور نے ۸ ر نومبر ۱۹۸۳ء کو جو اداریہ لکھا ہمارے خیال میں اسے یہاں پورے کا پورا درج کر دینا چاہیئے تاکہ وہ خدشات نکھر اور اُبھر کر سامنے آجائیں جس کی بنا پر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کے لیے اِس قدر زور دیا جاتا ہے۔

"جماعتی بنیادوں پر انتخابات اور شوریٰ

وفاقی مجلس شوریٰ کے چیئرمین خواجہ محمد صفدر نے کہا ہے کہ مجلس شوریٰ اپنے موجودہ اجلاس میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کی اپنی سفارش پر نظر ثانی نہیں کر رہی ہے صدر ضیاء الحق نے شوریٰ کے آٹھویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے شوریٰ کے ارکان سے کہا تھا کہ وہ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کی سفارش پر نظر ثانی کریں۔ خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ صدر کی تقریر اور رائے بلاشبہ ریکارڈ پر موجود ہے "تاہم مجلس شوریٰ کا اپنا طریق کار ہے ....." اس وضاحت سے یہ شبہ باقی رہتا ہے کہ ممکن ہے شوریٰ کے اگلے اجلاس میں یہ مسئلہ زیر غور آئے۔ تاہم خود صاحبِ صدر نے ارکان شوریٰ کی جو کمیٹی نظام حکومت کے بارے میں سفارشات پیش کرنے کے لیے قائم کی تھی اس کی متفقہ رائے یہ تھی کہ اگلے انتخابات ۱۹۷۳ء کے آئین کی اساس پر کرائے جائیں اور یہ انتخابات جماعتی بنیاد پر ہوں اب اس کمیٹی اور ان ہی ارکان سے یہ توقع رکھنا غلط ہوگا کہ وہ اس قدر جلد اپنی متفقہ رائے تبدیل کر دیں گے۔ صدر صاحب نے مجلس شوریٰ کے اجلاس میں خطاب کے دوران اس بات کا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا تھا کہ جن کالعدم سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے ان کے مذاکرات ہوئے ہیں ان سب نے ان جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے پر زور دیا ہے۔ صدر صاحب نے یہ اعتراف بھی کیا کہ جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ لیکن ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آئندہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں

پر ہونے چاہئیں۔ انتخابات کے متعلق صدر صاحب کا ذاتی رجحان کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اور وہ اپنی پسند اور ترجیح کے اس طریقے کی پہلے بھی حمایت اور وکالت کرتے رہے ہیں اور اس معاملے میں ان کا ذاتی رجحان اس قدر پختہ اور گہرا ہے کہ تمام کالعدم سیاسی جماعتوں کی طرف سے پُرزور مطالبے اور اپنی ہی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے مجموعی اتفاق سے سفارش کے باوجود ان کی یہی خواہش اور مطالبہ ہے کہ کم از کم آئندہ انتخابات غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے چاہئیں۔

اس ضمن میں لوکل باڈیز کے حالیہ غیر جماعتی انتخابات اگر ہماری راہنمائی کر سکتے ہیں تو ان سے یہ بات منظرِ عام پر آچکی ہے کہ ووٹ کھلے بندوں فروخت ہوتے رہے اور ہر جگہ "نقدی گروپ" کی ہی جیت رہی ہے۔ اس قباحت سے لبظاہر کسی طرح نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ۱۹۵۸ء سے ہم یہی تماشا دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اسے نیم دلانہ طریقے سے ختم کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ مثبت اور صحت مند بنیادوں پر کوشش کر کے ملک کو صحیح راستے پر ڈالا جائے تاکہ سیاست مستحکم اساس پر استوار ہو جس کے لیے جماعتی بنیادوں پر انتخابات سے انکار نہیں کیونکہ ایک بار جماعتی بنیادوں پر انتخابات ہو جائیں تو جو بھی آئندہ چار یا پانچ سال کا دور ہوگا وہ ہر قسم کی پابندی سے آزادی کا دور ہوگا جس سے محض انتشار کو فروغ ہوگا۔ نہ کوئی قومی تعمیری پروگرام پیش ہوگا نہ کسی متفقہ قومی لائحہ عمل کی تیاری ممکن ہو سکے گی۔ دولت مند اور صاحبِ غرض طبقہ تجوریوں کا منہ کھول دے گا۔ سودے بازیاں ہوں گی، برادری ازم چلے گا۔ ووٹوں کی بڑھ چڑھ کر نیلامی ہوگی اور قوم کو ملک کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جائے گا۔ مختصر یہ کہ بلدیاتی انتخابات میں جو کچھ مختصر پیمانے پر ہوا ہے صوبائی اور قومی انتخابات میں وہی کچھ وسیع پیمانے پر دیکھنے میں آئے گا۔" اس کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ

" ان حقائق کے پیشِ نظر ہم صاحبِ صدر سے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ گذارش کریں گے کہ جب ملک کی سب ہی سیاسی جماعتیں، جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا مطالبہ کر رہی ہیں تو صاحبِ صدر کو بھی عوام کی پسند اور مزاج و رجحان کا خیال کرتے ہوئے اپنی ہی رائے پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔"

راقم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہے لیکن اِس کے باوجود میں اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پا رہا ہوں کہ اگر اصل صرف یہ ہے کہ "غیر جماعتی بنیاد . . . پر دولت مند اور صاحبِ غرض طبقہ تجوریوں کا منہ کھول

گا، سودے بازیاں ہوں گی برادری ازم چلے گا، ووٹوں کی بڑھ چڑھ کر نیلامی ہوگی اور قوم اور ملک کے مفادات کو داؤ پر لگا دیا جائے گا۔ اور مختصر یہ کہ بلدیاتی انتخابات میں جو کچھ مختصر پیمانے پر ہوا ہے صوبائی اور قومی انتخابات میں وہی کچھ وسیع پیمانے میں دیکھنے میں آئے گا۔" بالفاظِ دیگر قوم کو ان تمام خدشات اور خطرات سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ عام انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں لیکن اس کے برعکس پاکستان دستور کمشن کے سربراہ مولانا ظفر احمد انصاری صاحب ——— کے الفاظ میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ" ماضی میں جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرا کر سرمایہ داروں اور وڈیروں کو منتخب ہونے سے کون روک سکا جو غیر جماعتی بنیادوں پر رک سکیں گے۔" آپ نے مزید فرمایا کہ" ہم نے اسلامی ریاست میں جماعتوں کے وجود کے خلاف سفارش کی ہے۔ متناسب نمائندگی کا مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب جماعتوں کا وجود تسلیم کیا جائے تو ہمیں یہ اجازت بھی دینا ہوگی کہ سیکولرازم اور سوشلزم اور دوسرے ازموں کے لیے کام کرنے والوں کو بھی جماعتیں بنانے کی اجازت دیں۔ اور اگر اجازت نہیں تو پھر صرف قرآن و سنت نافذ کرنے کے لیے اتنی ساری جماعتوں کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں تو تمام مسلمان ایک ہی پارٹی ہیں اگر ان میں اختلافات ہیں تو شوریٰ یا اسمبلی میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حزبِ اختلاف کا تصور ہی اسلام سے بغاوت پر مبنی ہے۔ کیونکہ کسی حزبِ اختلاف کا اسلام میں کبھی وجود نہیں رہا۔" انہوں نے کہا کہ اب تو بہت سے لوگ یہ تک کہنے لگ گئے ہیں کہ حضورؐ کے دَور میں بھی پارٹیاں تھیں۔ انہوں نے پوچھا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ پارٹی تو وہ تھی جو حضورؐ کو اپنا رہنما مانتی تھی اور انؐ کی اطاعت کو جزوِ ایمان سمجھتی تھی۔ تو دوسری پارٹی کون سی تھی؟ ان کا رہنما کون تھا؟ کیا وہ (نعوذ باللہ) حضورؐ کے سوا کسی دوسرے رہنما کی اطاعت کرتی تھی۔ انہوں نے سوال کیا کہ کیا حضورؐ کی اطاعت کو چھوڑ کر کسی اور کی اطاعت قبول کرنے والا مسلمان رہ سکتا تھا؟ انہوں نے کہا کہ حضورؐ کے دَور میں منافقین کی پارٹیاں تو تھیں لیکن مسلمانوں کے اندر جماعتیں یا گروہ موجود نہیں تھے۔ ان سے ایک سوال یہ کیا گیا کہ پاکستان کی ایک جماعت جمعیت علمائے پاکستان کے ترجمان نے کہا تھا کہ جماعت تو حضورؐ کے دَور سے مختلف شکلوں میں موجود رہی تو مولانا انصاری نے کہا کہ ہر جماعت وہیں سے رشتہ جوڑتی ہے وہ اس پر کیا کہہ سکتے ہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور صفحہ ۴۔ مورخہ ۳ ردسمبر ۱۹۸۳ء)

لہٰذا اِس کا علاج یہ نہیں کہ قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے پارٹی بازی کے گروہ بندانہ نظام کے جہنم میں دھکیل دیا جائے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق جس معاشرہ کی تعمیر ہی بغض و عناد کے

خمیر سے ہوئی ہو اس میں اتنی کشش ہی کہاں سے ہوتی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کو اپنی طرف مانوس کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم نے بھی غیر قرآنی معاشرہ کی تعمیر کی تو پھر اجتماعیت کے لیے چیخ و پکار اس کا مقدر بن گئی۔ کیا پاکستان کے ۳۸ سالہ اخبارات کی تاریخ خود اس امر کا زندہ ثبوت نہیں؟ یہی وہ چیخ و پکار تھی جو اٹھارہویں صدی میں امریکہ کے صدر جارج واشنگٹن کی آواز میں سنی گئی۔ اس نے بآوازِ بلند کہا تھا کہ:

"سیاست دان انسانی جذبات کی رو میں بہہ کر قوم کی تباہی کا راستہ اختیار کرنے سے گریز کریں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ اداریہ صفحہ۔ مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۳ء)

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدائے علیم و خبیر نے انسانی زندگی کے لیے جو بھی غیر متبدل اصول مقرر کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کی بھی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج ازل سے تا امروز ہر جگہ مرتب ہوئے جس کی نشاندہی قدرت نے روزِ ازل سے کر رکھی ہے لہٰذا جہاں تک اس مشاجرت کی زندگی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق تو آدم کو پہلے دن ہی سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ اگر تُو نے اِس شجر کو چھونے کی کوشش کی تو (سکونِ قلب) کی یہ جنت تم سے چھین لی جائے گی اور پھر ذلت و خواری جو اس عمل کا فطری نتیجہ ہے تمہارا مقدر بن جائے گی۔ نیز تمہارا شمار ان مغضوب علیہ قوموں میں ہو گا، جس کا ذکر فلسفۂ تاریخ کی شکل میں قرآن حکیم نے اپنی دفتین کے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ لہٰذا اگر یہ خیال ہو کہ غیر جماعتی انتخابات کو نظرانداز کر دینے سے وہ تمام خطرات (جن کا خدشہ اداریہ میں ظاہر کیا گیا ہے) چاروں طرف سے قوم کو گھیر لیں گے جبکہ اس کے برعکس جماعتی انتخابات کو روا رکھنے پر یہ جنت سے نکلا ہوا آدم دوبارہ اِس فردوسِ گم گشتہ میں داخل ہو جائے گا جس کو حاصل کرنے کے لیے یہ خطہ حاصل کیا گیا تھا تو ہمارا خیال ہے اقبال کے الفاظ میں اِس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎ تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا،
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

نظامِ سرمایہ داری اور انتخابات

نظامِ سرمایہ داری کی وجہ سے طبقاتی تفریق کے علاوہ کس قسم کی جمہوریت وجود میں آتی ہے؟ اس کے لیے راقم کو ۱۹۸۵ء میں ملکی عام انتخابات کو بطور شہادت پیش کرنا ہو گا اور یہ شہادت اپنی طرف سے نہیں بلکہ ملک کی نہایت معتبر شخصیات کی طرف سے ہے مثلاً

فروری ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات کے دوران اس وقت کے مجلس شوریٰ کے چیئرمین محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنے حلقۂ انتخاب واقع سیالکوٹ میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے قومی سیاست کے حوالے سے فرمایا کہ:

"سیاست ایک آدمی کا کام نہیں بلکہ یہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا کھیل ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۸۵ء)

جناب صفدر صاحب کے بعد جہاں تک مولانا ظفر احمد انصاری صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے ایک انٹرویو کے حوالہ سے فرمایا:

"موجودہ طریق کار سے صرف بڑے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہی منتخب ہوں گے"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ جون ۱۹۸۵ء)

آخر کار بحالی جمہوریت کے سلسلہ میں میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کو یہ کہنا پڑا کہ:

آج کوئی غریب شخص انتخابات میں حصہ لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۹۰ء)

لہٰذا یہ اسی نظام سرمایہ داری کا ثمر ہے کہ کوئی غریب خواہ کتنا ہی باشعور، باعلم اور بہترین صلاحیتوں کا مالک ہی کیوں نہ ہو کبھی آگے نہیں آسکتا۔

جمہوریت کس طرح بحال ہوگی

صحیح جمہوریت کی بحالی کے سلسلہ میں نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ یہی وہ خامی تھی جس کا علاج تجویز کرتے ہوئے ادارہ طلوعِ اسلام نے اکتوبر ۱۹۶۷ء میں اپنے ہاں لکھا تھا کہ:

"اس نظام کو اگر واقعی جمہوری نظام بنانا مقصود ہے تو اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہر حلقۂ انتخاب آمدنی کے معیار کے مطابق متعین کیا جائے۔ مثلاً سو روپیہ ماہوار آمدنی والے افراد پر مشتمل ایک حلقہ۔ ان افراد کی تعداد کی نسبت سے اس میں نشستوں کا تعین۔ اور اس کے بعد شرط یہ کہ اس حلقہ میں سے امیدوار وہی کھڑے ہو سکتے ہیں جن کی آمدنی اتنی ہو۔ اسی شکل کو آگے بڑھاتے جائیے۔ مثلاً سو سے پانچ سو روپے ماہوار آمدنی والوں کا الگ حلقۂ انتخاب۔ اور امیدوار بھی انہی میں سے۔ اسے اسی طرح بڑھاتے جائیے۔ آپ لاکھوں روپے ماہوار آمدنی تک لے جائیے۔ ظاہر ہے کہ جوں جوں ہم اوپر اٹھتے جائیں گے نشستوں کی تعداد کم ہوتی جائے گی اور آخری نتیجہ یہ

ہوگا کہ (خواہ بی۔ڈی ممبر ہوں یا پارلیمانی ارکان) پورے کا پورا ایوان قوم کے صحیح نمائندگان پر مشتمل ہوگا اور ان میں اکثریت ان کی ہوگی جن کی بہ لحاظ آبادی ملک میں اکثریت ہوگی۔

اِس پر ہم اتنا اضافہ اور کرنا چاہیں گے کہ امیدواروں کے لیے کم از کم تعلیم کی شرط بھی عائد ہونی چاہیئے۔اِس کے لیے تعلیمی معیار بھی آمدنی کی نسبت سے رکھا جائے۔

یہ تو رہا عام آبادی کی نمائندگی کا سوال۔ جہاں تک خصوصی مفادات کا تعلق ہے، ان کے لیے نشستیں الگ مخصوص کی جا سکتی ہیں۔"خصوصی مفادات" سے ہماری مراد ہے (مثلاً) ڈاکٹر، وکلاء، جج صاحبان، اساتذہ، اہلِ قلم، سائنٹفک تحقیقات کے ماہر، صنعت و حرفت، تجارت، زراعت وغیرہ۔ ان کے لیے یہی انتخابی حلقے ہوں۔ وہی ووٹ دینے والے اور انہی میں سے امیدوار۔"

اِس کے بعد طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ:

" (اِس طریقہ سے) اقتدار فی الواقعہ جمہور کے ہاتھ میں ہوگا ورنہ موجودہ کشمکش تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہر ایک اپنے اقتدار کے لیے تڑپ رہا ہے اور عوام کے نام کو حصولِ اقتدار کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی اور بحالی جمہوریت

انتخابات ۱۹۸۸ء کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور میں احمد ندیم قاسمی صاحب بحالی جمہوریت کے متعلق ایک مضمون تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

انہی دنوں ہماری گفتگو دو ووٹروں سے ہوئی۔ ایک نہایت دور دراز کے ایک گاؤں سے آیا تھا۔ ہم نے اس کے علاقے میں انتخابی مہم کی صورتحال معلوم کرنا چاہی اور پوچھا کہ تم کسے ووٹ دو گے؟ وہ بولا۔۔۔۔ لیجئے! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے! ووٹ اسی کو دوں گا جس کو ہمیشہ سے ووٹ دیتا آیا ہوں۔ اپنے زمیندار کو ووٹ دوں گا۔ اسے ووٹ نہیں دوں گا تو کیا مجھے ناقوں مرنا ہے؟ کیا میں اپنی، بیوی بیٹی کی عزت کو نیلام پر چڑھا سکتا ہوں؟ کیا میں اس عمر میں ایک زمیندار کی زمینوں سے بیدخل ہو کر کوئی نیا زمیندار ڈھونڈ سکتا ہوں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نے کچی مٹی کا جو گھروندا زمیندار کی زمینوں پر کھڑا کر رکھا ہے اسے زمیندار کے کارندوں کے ہاتھوں جلنے کا ایک ڈھیر ہوتے دیکھوں؟ میں تو صاحب ووٹ دوں گا تو اسی کو دوں گا کیونکہ مجھے اپنی اور اپنوں کی عزت اور زندگی پیاری ہے۔ آپ سمجھ گئے نا؟

دوسرا ووٹر دیہاتی نہیں قصباتی تھا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ ہم نے وہی سوال اس سے بھی پوچھا کہ کسے ووٹ دینے کا ارادہ رکھتے ہو؟ وہ بولا "لیجیئے۔۔۔۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ اپنے قبلہ پیر جی کو دوں گا اور کسے دوں گا۔ پیر جی نے جس امیدوار پر ہاتھ رکھ دیا میں پرچی اسی امیدوار کے قدموں پر رکھ دوں گا۔ ہمارے قصبے میں قبلہ پیر جی کے اکیاسی مرید ہیں۔ ہم سب نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حکم دیجیئے ہم کسے ووٹ دیں۔ انہوں نے جو نام ارشاد فرمائے، انہی کے نشان کو ہم ووٹ ڈالیں گے۔ آخر شرافت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میرا سلونتی کا بیٹا پیر جی ہی کے تعویذوں کی برکت سے پیدا ہوا تھا۔ میرے داماد کے گردے میں قبلہ پیر جی ہی کے تعویذوں نے پتھری کو ریت بنا کر پیشاب کے رستے خارج کرا دیا۔ تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ان احسانات کو بھول جاؤں اور ووٹ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کو دے دوں؟ جی نہیں۔۔۔۔ ہماری جمہوریت تو یہ کہتی ہے کہ قبلہ پیر جی کا حکم مانو اور بس۔ اس سے زیادہ نہ ہمیں کچھ معلوم ہے، نہ ہم کچھ اور معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ قبلہ پیر جی ہی تو ہمارے دین و دنیا ہیں۔"

جمہوری طریق انتخاب کے دونوں نہایت تشویشناک رخ ہیں مگر جیسا کہ ہم اس سے پہلے ایک سے زیادہ بار عرض کر چکے ہیں، انتخابات جس طرح بھی ہوتے ہیں ہونے دیجیئے۔ پھر جو حکومتیں بھی برسراقتدار آئیں ان سے ایسی اصلاحات اور ایسی قانون سازی کا مطالبہ کیجیئے کہ ہمارے کسان اور مزارعین بڑے زمینداروں کے محتاج ہی نہ رہیں اور وہ محتاج نہیں رہیں گے جب بڑے زمینداروں کی زمینوں کو بے زمین کسانوں اور کھیت مزدوروں میں منصفانہ طور پر بانٹ دیا جائے گا۔ اسی طرح جب ہم عقل و دانش کی تعلیم کو عام کریں گے اور موجودہ سائنٹفک دور میں توہمات کے شکار لوگوں کو خود آگاہی کی دولت سے مالا مال کر دیں گے تو ووٹروں کے ووٹ پیری مریدی کے دائرے کو توڑ کر بیلٹ بکسوں کا رخ کریں گے۔ چنانچہ جب تک ہم ملک کو صد فیصد تعلیم یافتہ نہیں بنا لیتے اور جب تک ہم دینی تعلیم کے پہلو بہ پہلو سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کو بھی عام نہیں کرتے ہمارے ووٹوں کی بے حرمتی کا سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔"

جمہوریت کے سلسلہ میں علامہ مشرقی کا فرمان

"ہیوسے نے کہا کہ مغربی جمہوریت دنیا کا سب سے بڑا فریب ہے جس کا نتیجہ ہر ملک میں سرمایہ دار کی حکومت کا قیام ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے ہر ملک اور قوم میں یہ ہیجان پیدا کر دیا جائے کہ جمہوریت کے معنے سرمایہ داری کا عروج نہیں بلکہ اس طبقہ کی حکومت ہے جو اکثریت میں ہے اور چونکہ ہر ملک اور قوم میں غریب اکثریت میں ہیں اس لئے جمہوریت کے صحیح معنی صرف

غریب کی حکومت ہے لہٰذا غریب کی حکومت ہر ملک میں قائم کرنے کے لئے لازمی ہے کہ غریب کا حلقہ امیر سے الگ ہو تاکہ سرمایہ دار غریب کے ووٹ خرید نہ سکے۔" (حدیث القرآن)

اصل حل

لہٰذا اگر اِس مملکت کو حقیقی طور پر قرآنی حکومت میں منتشکل کرنا مقصود ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ قوم کو مزید ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی بجائے نظام سرمایہ داری کے بُت کو پاش پاش کرنے کی ترغیب اور تدبیر پیدا کی جائے جس کی شکل و صورت نے آج نوعِ انسانی کو اِس قدر ہراساں کر رکھا ہے۔

ایک مزید ثبوت

گروہ بندانہ زندگی کی موجودگی میں اُمّتِ واحدہ کے تصوّر کا پیدا ہونا مشکل اور محال ہی نہیں، بلکہ ناممکن بھی ہے اور اس کا ثبوت ہمیں ۱۹۷۷ء میں قائم ہونے والے "قومی اتحاد" (جو کہ مختلف سیاسی جماعتوں کا رہینِ منت تھا) کی کارکردگی سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ہمیں اِس اتحاد کے اندرونی جوڑ توڑ کی کہانی سننے کے لیے کالعدم خاکسار تحریک (جو خود بھی اِس اتحاد میں شامل تھی) کے سربراہ خان محمد اشرف صاحب کے انٹرویو کا کچھ حصّہ ضرور دیکھ لینا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ یہ انٹرویو کچھ طویل ہے لیکن راقم اِس کی دلچسپی اور سبق آموزی کے پیشِ نظر اُسے قارئین کی خدمت میں پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہے۔ چنانچہ آپ شروع سے آخر تک اِن کے مندرجہ ذیل بیان کے

ایک ایک لفظ پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا انفرادیت کی اِس کالی دیوی کے چہرے پر اجتماعیت کے نور کا کہیں بھی کوئی نشان نظر آتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ:

قومی اتحاد کی اندرونی چپقلش کے سلسلہ میں خان محمد اشرف خان صاحب کا انٹرویو

"قومی اتحاد کی تشکیل سے پیشتر یو ڈی ایف (متحدہ جمہوری محاذ) میں جماعتیں مشترکہ طور پر کام کر رہی تھیں۔ اِس اتحاد کو زیادہ مؤثر بنانے اور جو جماعتیں باہر رہ گئی تھیں، انہیں شامل کرنے کے لیے کوشش کی جا رہی تھی۔ جمعیت علمائے پاکستان جو یو ڈی ایف آخری

دنوں میں چھوڑ گئی تھی ، اسے واپس لانے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی سے بھی بات چیت ہوئی آخر مشترکہ طور پر اجلاس کا پروگرام بنایا گیا مگر ایئر مارشل اصغر خان خود کسی دوسری جماعت کے پاس آنے کے لیے تیار نہ ہوئے بلکہ اپنے دفتر میں اجلاس بلانے پر اصرار کیا۔ یہ چھوٹا سا اختلاف اجلاس کے انعقاد کی راہ میں رکاوٹ بن گیا کہ کون کسی اور دفتر میں جا کر اجلاس میں شریک ہو، بالآخر طے پایا کہ غیر جانبدار کی حیثیت سے رفیق احمد باجوہ کے مکان پر اجلاس بلایا جائے۔ اجلاس کے آغاز ہی میں مولانا شاہ احمد نورانی نے مطالبہ کیا کہ انہیں اور ایئر مارشل اصغر خان کو ساٹھ فی صد نشستیں دی جائیں۔ اِس طرح پہلے ہی روز جب قومی اتحاد کی تشکیل کے لیے اجلاس منعقد ہو رہا تھا سیٹوں کی تقسیم کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہو گیا۔ جب جمیعت علمائے پاکستان اور تحریکِ استقلال کے لیے ساٹھ فی صد نشستوں کا مطالبہ کیا گیا تو دوسرے سربراہ حیران رہ گئے کہ یہ مطالبہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مختلف رہنماؤں نے ایئر مارشل اصغر خان اور مولانا شاہ احمد نورانی کو سمجھایا کہ یہ امر قرین انصاف نہیں کہ اتنی زیادہ سیٹوں پر ضد کریں۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے اتحاد کی تشکیل کے اعلان کے منتظر رہنماؤں اور کارکنوں نے بھی نورانی میاں اور اصغر خان کو سمجھانے اور اتحاد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عبدالستار نیازی بھی آئے اور رفیق احمد باجوہ نے بھی خود آکر سمجھانے کی کوشش کی اور دوستوں نے اپنے طور پر اتحاد کے قیام کے لیے اپنی رائے دی اور چلے گئے۔

اِس مرحلے پر جب میں نے محسوس کیا کہ محض سیٹوں کے مسئلے پر اختلاف کی وجہ سے شاید اتحاد قائم نہ ہو سکے اور اجلاس اسی طرح ختم ہو جائے تو میں نے جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائمقام صدر سردار سکندر حیات سے کہا کہ اجلاس لاحاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر ناکامی کی صورت میں رہنما اپس اُٹھ کر جانے لگیں تو انہیں باہر جانے سے روکنے کے لیے کمرے کے ایک دروازے پر آپ اور دوسرے پر میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ ہم انہیں باہر جانے نہیں دیں گے اور مجبور کریں گے کہ اتحاد کر کے ہی اُٹھیں۔ بہرحال دوسروں کے سمجھانے بجھانے اور کچھ اپنی جماعتوں کے نائبین کے مشورے پر مولانا نورانی اور ایئر مارشل اصغر خان آخر کار چھتیس فیصد کوٹے پر مان گئے۔ جب یہ فیصلہ ہو گیا تو ایئر مارشل اصغر خان پھر بھی مطمئن نہیں تھے۔

راس پر مولانا شاہ احمد نورانی نے ایئر مارشل اصغر خان سے کہا کہ بیس فی صد سیٹیں آپ لے لیں۔ اور سولہ فیصد ہم لے لیں گے۔ انہوں نے یہ سب کچھ باہمی طور پر دوسروں کے مشورے کے بغیر طے کر لیا۔ سیٹوں کی تقسیم کے فیصلے کے ساتھ ہی قومی اتحاد کی تشکیل کا اعلان کر دیا گیا۔

قومی اتحاد کی تشکیل کے اعلان سے اگلے روز رات کے وقت ہم مسلم لیگ ہاؤس میں پہنچ رہے تھے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے فوری طور پر ایئر مارشل اصغر خان کو اشارہ کیا کہ کرسیٔ صدارت پر تشریف لائیں۔ وہ ہچکچائے کہ ابھی تو کوئی فیصلہ نہیں ہُوا اور انتخاب بھی نہیں ہُوا اس صورت میں کرسیٔ صدارت پر بیٹھنا مناسب بھی ہے یا نہیں، اس وقت دیگر رہنما بھی مولانا شاہ احمد نورانی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے ایئر مارشل اصغر خان سے دو تین بار اصرار کیا کہ "آیئے خان صاحب! آیئے کرسیٔ صدارت سنبھالیے" اور پھر اصغر خان کرسیٔ صدارت پر بیٹھ گئے۔ اس طرح ان کی صدارت میں قومی اتحاد کی تشکیل کے مسودے پر غور ہُوا اور دیگر تنظیمی امور زیرِ غور آئے۔ اِس اجلاس کی صدارت کے پیشِ نظر پریس کانفرنس میں بھی اصغر خان نے یہ مسودہ لے کر پڑھنا شروع کر دیا اور کسی حد تک یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ قومی اتحاد کے صدر ایئر مارشل اصغر خان ہی ہوں گے تاہم پریس کانفرنس کے بعد یہ پروگرام دیا گیا کہ رات کو پھر اجلاس ہو گا جس میں قومی اتحاد کے انتخابات بھی ہوں گے اور عہدیدار چُنے جائیں گے۔ مَیں ذاتی طور پر قومی اتحاد کی صدارت کے لیے مولانا مفتی محمود کو موزوں سمجھتا تھا اِس کی کئی وجوہ تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہم اسلام کے نام پر اتحاد قائم کر رہے تھے اور اسلام کے نام پر لوگوں سے تعاون کی اپیل کر رہے تھے اِس لیے اس جدّ و جہد میں ایسی قیادت کو قیادت کرنا چاہیے جو خود بھی اسلامی کردار کی حامل ہو ان سے ملنا ہر ایک کے لیے آسان تھا اور ان سے مشورہ کیا جا سکتا تھا ہم لوگ ان سے کھُل کر اور بخوبی بات کر سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے، بعض رہنماؤں نے سردار سکندر حیات سے کہا کہ آپ نے دیکھا کہ کل کس طرح مولانا شاہ احمد نورانی نے بچگانہ حرکت کی ہے کہ کسی سے مشورہ کیے بغیر اصغر خان کو صدارت کی کرسی پیش کر دی اِس لیے ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم ان کی طرف سے نام پیش ہونے سے قبل آج اپنی طرف سے صدارت کے لیے نام پیش کر دیں۔ مَیں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ مَیں مفتی محمود کو دوسروں پر

ترجیح دیتا ہوں۔ انہوں نے میری تائید کی۔ مقررہ وقت پر ہم اجلاس کے لیے کمرے میں پہنچے اور ابھی گفتگو کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اپنی طرف سے فوری طور پر کہا کہ چونکہ اجلاس انتخاب کے سلسلے میں ہے اس لیے میں اپنی طرف سے مولانا مفتی محمود کا نام صدارت کے لیے پیش کرتا ہوں۔ میری اس بات پر کچھ لوگوں نے میری طرف حیرت سے دیکھا۔ سکندر حیات نے فوراً میری تائید کر دی۔ پھر نواب زادہ نصراللہ خان اور سردار شیر باز مزاری نے بھی تائید کی اور بعد ازاں پیر پگاڑو نے مفتی محمود کو صدر بنانے سے اتفاق کیا۔ اس طرح مفتی محمود کے اپنے ووٹ سمیت ان کے حق میں چھ ووٹ آ چکے تھے مگر اس کے باوجود مولانا شاہ احمد نورانی نے ایئر مارشل اصغر خان کا نام صدارت کے لیے پیش کر دیا تھا اور ساتھ ہی دلائل بھی دینے شروع کر دیئے۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ مولانا مفتی محمود پاکستان کی مخالف جماعت کے رہنما ہیں اس لیے مخالفین کو کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا۔ میاں طفیل محمد نے فوری طور پر مولانا شاہ احمد نورانی کی اس بات کی تائید کر دی کہ یہ خدشہ درست ہے۔ اس بات پر سب نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ مفتی صاحب کچھ زیادہ ہی جلال میں آ گئے۔ اس دن پہلی بار میں نے انہیں کچھ غصے میں دیکھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو خیال کرنا چاہیئے کہ آپ نے تو پاکستان کے لیے کوئی جدّوجہد ہی نہیں کی۔ مولانا نورانی صاحب سے مخاطب ہو کر انہوں نے مزید کہا کہ آپ نے ذاتی طور پر پاکستان کے لیے کوئی جدّوجہد نہیں کی لیکن ہم نے آزادی کے لیے اپنے انداز میں اور اپنے طور پر جدّوجہد کی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی تحریک کی تائید و تعاون نہیں کیا مگر جن لوگوں کو آپ پاکستان کا مخالف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہی لوگ اکثریت میں یہاں بیٹھے ہیں اور پاکستان کو بچانے اور اس کے استحکام کے لیے کام کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں اور بجائے اس کے کہ آپ مخالفین کو یہ جواب دیں کہ انہوں نے کب پاکستان کے لیے کام کیا ہے اُلٹا آپ اپنی طرف سے

اعتراض ہم پر کر رہے ہیں۔ پھر مولانا مفتی محمود نے میاں طفیل محمد سے مخاطب ہو کر کہا یہ جو اعتراض مجھ پر کیا گیا ہے، آپ پر اور آپ کی جماعت پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس وقت پیر پگاڑا صاحب کی جماعت ہی ایسی ہے جس نے پاکستان بنانے کے لیے کام کیا ہے باقی کوئی اور جماعت پاکستان بنانے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔" اِس کے باوجود مولانا شاہ احمد

نورانی خاموش نہ ہوئے اور دلائل پر دلائل دیتے رہے اور کہا کہ ایئر مارشل چونکہ فوج کی طرف سے آئے ہیں اور یہ بڑے مؤثر طور پر قیادت کر سکتے ہیں۔ لوگ بھی ان کے ساتھ زیادہ ہیں ۔ جرأت اور بہادری سے قیادت کریں گے ــــ میں نے مولانا نورانی کی اس ضد کی وجہ یہ سمجھی کہ مفتی محمود کی متفقہ صدارت انہیں منظور نہیں اور چاہتے ہیں کہ کم از کم ووٹنگ ہو جائے کہ بعد میں یہ کہا جا سکے کہ کچھ لوگ مفتی محمود کی صدارت کے خلاف بھی تھے لیکن اگر پہلے ہی روز انتخاب کے موقع پر یہ اختلاف منظرِ عام پر آتا تو قومی اتحاد کے مستقبل کے لیے کسی طرح بھی مفید نہیں تھا۔

سکندر حیات نے مجھ سے پوچھا کہ اس صورت حال کا کوئی حل آپ کے ذہن میں ہے یا نہیں؟ یہ نورانی صاحب تو نہیں بیٹھتے۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس ایک نسخہ ہے میں ایک ایسا نام پیش کرتا ہوں کہ فوراً خاموش ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے پھر استفسار کیا کہ کیا آپ نورانی صاحب کا نام سیکرٹری جنرل کے لیے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ دونوں ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ میں ایک ایسے شخص کا نام پیش کر رہا ہوں جس سے نورانی صاحب بھی خوش ہو جائیں اور نئے پڑھے لکھے طبقہ کی بھی نمائندگی ہو جائے۔ میں نے انہیں رفیق احمد باجوہ کا نام بتایا۔ ان دنوں باجوہ صاحب کو اس قدر اہمیت حاصل نہیں تھی کہ انہیں قومی اتحاد جیسی تنظیم کا سیکرٹری جنرل بنایا جاتا لیکن مولانا نورانی کو خاموش کرانے اور قومی اتحاد کے متفقہ انتخاب کے لیے میں نے مولانا شاہ احمد نورانی سے کہا کہ آپ نے دلائل تو بہت دیئے ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ مفتی صاحب کے حق میں کچھ ووٹ آ چکے ہیں صدارت کا فیصلہ تو ہو چکا ہے اب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ووٹوں کی تقسیم ہو پھر میں نے سیکرٹری جنرل کے لیے رفیق احمد باجوہ کا نام لیا۔ مولانا نورانی جو کہ بھرپور دلائل دے رہے تھے نہ صرف خاموش ہو گئے بلکہ انہوں نے کہا کہ اگر رفیق احمد باجوہ کو سیکرٹری جنرل بنا دیا جائے تو اس میں کیا مضائقہ ہے یہ تو بہت ہی اچھی جوڑی رہے گی، اس دوران انہوں نے اصغر خان کی طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اس طرح صدر اور سیکرٹری جنرل کا انتخاب اتفاق رائے سے ہوا"

پیر پگاڑا کو پارلیمانی بورڈ کا چیئرمین بنایا گیا صرف جائنٹ سیکرٹری کا عہدہ رہ گیا تو سب نے میاں طفیل کی طرف دیکھا کہ میاں صاحب نے انتخاب کے سلسلے میں کوئی رائے نہیں دی خاموش بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے استفسار کیا گیا آپ کونسا عہدہ پسند فرمائیں گے اپنی جماعت کے لیے؟ میاں طفیل محمد یکدم ناراض ہوئے اور کہا کہ ہمارے لیے آپ نے چھوڑا

دی گیا ہے وہ وہاں سے اُٹھ کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں پروفیسر غفور احمد اور چودھری رحمت الٰہی کے پاس چلے گئے۔ مولانا مفتی محمود نے مجھ سے کہا کہ اشرف خان فیصلے تو ہو گئے ہیں لیکن دیکھنا جماعتِ اسلامی والے بزرگ چلے نہ جائیں۔ میں نے کہا، نہیں جائیں گے، واپس آئیں گے انشاء اللہ، انہیں ہم نہیں جانے دیں گے۔ چند منٹ کے مشورے کے بعد میاں طفیل محمد واپس آئے تو ان کی ترجمانی پروفیسر غفور احمد نے کی۔ انہوں نے کہا ہم اس صورت میں آپ کے ساتھ چل نہیں سکتے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں سے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ناراضگی عہدوں کی تقسیم کی وجہ سے تھی۔ قومی اتحاد کے دیگر رہنما پریشان تھے کہ کیا خبر واپس آتے ہیں یا نہیں لیکن میں نے مفتی محمود سے کہا کہ جماعتِ اسلامی والے بڑے سمجھدار لوگ ہیں موجودہ نازک صورت میں جب کہ قوم کی لگا ہیں قومی اتحاد پر ہیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔

چنانچہ دوسرے دن اجلاس میں آ گئے اور کہا کہ ہم آپ سے تعاون کے لیے تیار ہیں اس طرح بظاہر جماعتِ اسلامی والے ان انتخابات کے ساتھ متفق ہو گئے، مگر ان کی ناراضگی کسی حد تک بدستور قائم رہی، جس کا اظہار اشاروں کنایوں سے ہوتا بھی رہا۔ اِس سلسلے میں لاہور کے ایک اخبار نویس مجیب الرحمٰن شامی اور طالب علم رہنما جاوید ہاشمی مجھ سے دفتر آ کر ملے اور کہا کہ آپ سے گِلہ شکوہ ہے کہ آپ نے قومی اتحاد کے عہدوں کے لیے نام تجویز کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں کیا کہ جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لیے پروفیسر غفور احمد موزوں شخصیت تھے، وہ پہلے بھی جنرل سیکرٹری کے طور پر کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی جنرل سیکرٹری کے طور پر انہیں آنا چاہیئے تھا۔ اب بھی کوشش کریں کہ کسی طرح انہیں موزوں عہدہ مِل جائے۔ یہ تھی مختصر روداد قومی اتحاد کے قیام اور اس کے انتخابات کی۔

اِس کے بعد یہ ہُوا کہ چونکہ انتخابات کا فوری اعلان ہو چکا تھا اور قومی اتحاد کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کہ وہ سیٹوں کی تقسیم اور امیدواروں کے اعلان میں مزید تاخیر سے کام لے۔ اِس لیے سیٹوں کے باہمی تعین اور امیدواروں کے انتخاب کے لیے اجلاس شروع ہو گئے لیکن اِس امر کا اندازہ نہیں تھا کہ سیٹوں کی تقسیم کے سلسلے میں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں اختلاف اِس حد تک بڑھیں گے کہ آپس میں ناراضگی کا اظہار ہو گا۔ ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیاں کی گئیں۔ کہا یہ گیا تھا کہ ایر مارشل اصغر خان اور نورانی میاں کی جماعتوں

کے سوا مختلف نشستوں پر کسی جماعتی تخصیص کے بغیر امیدواروں کا انتخاب ہوگا لیکن ہر جماعت اصرار کرتی رہی کہ اس کا امیدوار زیادہ موزوں، فعال اور باصلاحیت ہے۔ اس پر آپس میں بڑے اختلافات ہوئے اور قومی اتحاد کو چھوڑنے تک کی دھمکیاں دی گئیں۔ بالآخر بڑی مشکل سے سیٹوں کی تقسیم کا مرحلہ طے ہوا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ، جمعہ ایڈیشن مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۸۵ء)

کسی نے کیا خوب کہا تھا۔ چراغ کون یہاں آئے گا جلانے کو کہ غسلِ خوں سے فراغت نہیں زمانے کو

بہرحال یہ تھا قومی اتحاد کے متعلق جناب خان محمد اشرف صاحب کا وہ انٹرویو جس کے متعلق پاکستان مسلم لیگ (چٹھہ گروپ) کے سربراہ خواجہ خیرالدین نے کہا تھا کہ:

"نظامِ مصطفےٰ ﷺ کی تحریک میں عوام نے قربانیاں دیں مگر (اس تحریک کی) قیادت مخلص نہ تھی۔" (بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۹ جنوری ۱۹۸۶ء)

۱۹۸۸ء کے انتخاب کے بعد کی حالت

پارٹی بازی کے بل بوتے پر غسل خون کی اگر مزید روئداد معلوم کرنی مقصود ہو تو ۱۹۸۸ء کے عام ملکی انتخابات کے تحت معرضِ وجود میں آنے والی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی باہمی چپقلش کو ایک سبق آموز مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے اور اس کے ثبوت میں سال بھر کے ملکی اخبارات کی ایک ایک سطر خود اپنی گواہ آپ ہے۔ جس کو دیکھنے کے بعد ہر قلبِ حساس یہ سوچنے پر مجبور دکھائی دے گا کہ آزادی کا وہ پودا جو قائد اعظم کی شب و روز کوششوں سے ملتِ اسلامیہ کی سرزمین پر پاکستان کے نام پر لگایا گیا تھا۔ نا معلوم یہ ہماری عناد پرستی باہمی کدورت بدکرداری اور مفاد پرستی سے (خاکم بدہن) کب جڑوں سے اکھڑ جائے اور جس کے نتیجے میں ملتِ پاکستان کے ایک ایک فرد کے گلے میں غلامی کا وہ طوق کس لمحہ دوبارہ پہناہ دیا جائے جس کو اتارنے کے لئے شاہ ولی اللہ سے لے کر قائد اعظم تک کے محسنانِ ملت کا خون جگر شامل ہے۔

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد صرف ایک سال کے عرصہ میں ہماری پارٹی بازی کی سیاست گری نے کیا کیا گل کھلائے اسکی ترجمانی صدر مملکت جناب غلام اسحاق خاں نے دسمبر ۱۹۸۹ء کے سینٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اس طرح کی۔

صدر مملکت کا بیان

"پورا سال معمولی سے معمولی بات پر بھی محاذ آرائی ہوتی رہی اسمبلیوں نے ہر کام کیا سوائے قانون سازی کے مخالف فریق کے شروع کئے گئے ہر کام میں کیڑے نکالے گئے۔"

پنجاب اسمبلی میں گالی گلوچ

اس ایک سال میں نفرت اور عداوت کی آگ کو بھڑکانے کا یہ سلسلہ اس قدر جاری رہا کہ پنجاب اسمبلی کے دسمبر کے اجلاس میں اپوزیشن اور سرکاری بنچوں میں فحش گالیوں کا تبادلہ ہوا اور نوبت مار کٹائی تک جا پہنچی۔ حتیٰ کہ باہمی نفرت کو شعلہ فشاں بنانے کے لئے مرکز اور پنجاب کے مابین ایک دوسرے کے خلاف اخبارات کے صفحہ اوّل پر بڑے بڑے اشتہارات کا وسیع سلسلہ شروع ہوگیا۔ نتیجہ یہ کہ اس افراط و تفریط کے باعث ۱۹۸۹ء کے مالی سال کے ابتدائی پانچ ماہ میں مدیر روزنامہ جنگ کی تحریر کے مطابق مملکت پاکستان کو ۱۲ ارب روپے کا تجارتی خسارہ ہوا۔

وزیر مذہبی امور کا بیان

لیکن اس کے باوجود وفاقی مذہبی امور مولانا منظر ندوی کا روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۷ ار جون ۱۹۸۸ء کے حوالے سے فرمان یہ ہے۔

"سیاسی جماعتوں کے آئینی تحفظ کو برقرار رکھا جائے گا"

سیاسی جماعتوں کے اس آئینی تحفظ سے کس قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں اور پارٹی بازی کی بنا پر متحارب گروپ آپس میں کس طرح دست و گریباں ہوتے ہیں۔ اس کی تصور کشی کی بجائے ہمیں یہاں صرف اور صرف مسلم لیگ کے دو دھڑوں میں صدارت کے انتخاب پر ظہور پذیر ہونے والے منظر کو ہی دیکھ لینا چاہیئے۔

مسلم لیگی قیادت کے انتخاب کا منظر

اسلام آباد (نمائندہ جنگ) مسلم لیگ کی قیادت کا بحران ختم کرنے اور پارٹی کے نئے صدر کا انتخاب کرنے کے لئے پیر پگارا اور سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی سربراہی میں تمام مسلم لیگی گروپوں کی جنرل کونسلوں کا مشترکہ اجلاس ہفتے کو زبردست ہنگامہ آرائی کی نذر ہونے کی وجہ سے غیر معینہ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ تین گھنٹے سے زیادہ دیر تک ہونے والے اس ہنگامے میں متحارب گروپوں کے کارکن اور کونسلر ایک دوسرے کے ساتھ گریباں دے ماریں ہنگامے کے دوران متحارب گروپ سٹیج پر قابض ہوگئے اور صدارت کے امیدواروں محمد خان جونیجو اور فدا محمد خان کے حق میں انہوں نے زبردست نعرے بازی کی اس ہنگامے کی وجہ سے اسلام آباد ہوٹل جہاں یہ اجلاس منعقد کیا گیا تھا کی قیمتی کراکری ٹوٹ پھوٹ گئی ہنگامہ آرائی کی یہ فضا دیکھ کر کئی بزرگ مسلم لیگی رہنما ایک

دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگے اس ہنگامہ آرائی میں کئی کونسلروں اور کارکنوں کے کپڑے پھٹ گئے اور کئی افراد کو چوٹیں آئیں۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳ر اگست ۱۹۸۸ء)

ہمارے نزدیک اس موقع پر کیونکہ پاکستان کی تفصیلی سیاسی تاریخ لکھنا ممکن نہیں اس لئے صرف ایک دو ماہ کے ملکی اخبارات کی چند ایک چیدہ چیدہ سرخیوں پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔ تاکہ آئندہ آنے والی نسلوں کو یہ جاننے کے لئے کوئی دشواری باقی نہ رہے کہ پارٹی بازی کی اس لعنت نے مملکت پاکستان کو تباہی کے کس کنارے تک پہنچا دیا۔

ماہ دسمبر اور جنوری ۸۹-۱۹۹۰ء کے اخبارات کی چند ایک سرخیاں

"قائداعظمؒ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لاہور کارپوریشن کے کونسلروں میں ہاتھا پائی اور گالی گلوچ"
اپوزیشن لیڈر کونسلر ملک اسلم پرویز نے اپنی تقریر میں نواز شریف کا ذکر کیا تو ڈپٹی میئر خواجہ ریاض محمود نے اسے دھکے دے کر سٹیج سے نیچے اتار دیا"

- "قومی اسمبلی میں وزیراعظم کی موجودگی میں ہنگامہ"
- وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں کشیدگی کا مسئلہ اللہ تعالٰی ہی حل کر سکتا ہے۔ (نواز شریف)
- گیارہ ماہ سے جاری مرکز پنجاب لڑائی کے ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں (وزیراعلیٰ نواز شریف)
- وفاقی حکومت کے دہاڑی دار وزراء اپنا منہ بند رکھیں۔ (دریشک صوبائی وزیر قانون)
- ہمارا مقصد ملک کو پیپلز پارٹی سے نجات دلانا ہے۔ (نوابزادہ نصر اللہ خاں)
- پنجاب حکومت نے قومی بجٹ کی تیاری میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔
- ہمارے مخالفوں سے کہیں کہ اب وہ کان پکڑ کر توبہ کریں۔ (بے نظیر)
- صدر مملکت کی طرف سے دعائے خیر کہ

مرکز اور صوبوں کو سمجھا رہا ہوں، اللہ تعالٰی قوم کو سیدھی راہ پر لائے۔ (صدر اسحاق)

- جماعت اسلامی کے امیر قاضی حسین احمد نے مینار پاکستان کے سبزہ زار میں جماعت کے سہ روزہ اجتماع (جس میں تقریباً ۵۰ ہزار کارکنوں نے شرکت کی) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم اس لئے اکٹھے ہوئے ہیں کہ ان لوگوں کو (پیپلز پارٹی کو) اقتدار سے ہٹا دیں۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹ر نومبر ۱۹۸۹ء)

- ضیاء دور میں لطف اٹھانے والوں کا تعاون نہیں چاہیئے۔ (محترمہ بے نظیر)
- بے نظیر اسمبلی میں ۱۱۹ حامی شو کرا دیں ہم تحریک واپس لے لیں گے۔ (نواز شریف)
- ہماری صفوں میں کوئی بے غیرت نہیں مخالفوں کا منہ کالا ہوگا۔ (محترمہ بے نظیر)
- بے نظیر جیت گئیں اپوزیشن کو ۱۰۷ ووٹ ملے۔
- انشاء اللہ بہت جلد حکومت کو نکال باہر کریں گے۔ (میاں نواز شریف)
- نواز شریف اور ولی خاں مل کر ملک توڑنا چاہتے ہیں۔ (بیگم نصرت بھٹو)
- روٹی۔ کپڑا اور مکان دینے والی صرف خدا کی ذات ہے،
خدائی دعوے کرنے والے مشرک ہیں۔
ہم ۱۸ فروری سے پہلے ہی ملک دشمن عناصر کو ملک سے باہر نکال دیں گے۔
(میاں شہباز شریف ایک انتخابی جلسہ سے خطاب)
- مل کر چلیں ورنہ آنے والی نسلیں جوتے ماریں گی۔ (علی اکبر ایم پی اے جنگ فورم ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء)
- حمیدہ کھوڑو اسلامی اتحاد کو جلسے کرانے کے لئے لاکھوں روپے دے رہی ہے (وفاقی وزیر ریلوے)
- پی پی ۲۰ مارچ کے نام پر آنکھیں کیوں چراتی ہے ایک بار دنگل کرے اور جان چھڑائے۔
(متحدہ اپوزیشن کے سربراہ جناب غلام مصطفےٰ جتوئی)
- پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی دونوں جماعتیں گندگی پھیلا رہی ہیں۔
(انتخابی جلسوں سے مولانا نورانی کا خطاب)
- ایم کیو ایم کی اپیل پر ہڑتال کے دوران کراچی میں خون کی ہولی ام را افراد ہلاک
- ہڑتال کی کال دینا ایم کیو ایم کا جمہوری حق ہے (متحدہ حزب اختلاف کے راہنما جناب نوابزادہ نصراللہ خاں)
- مل کر چلیں ورنہ آنے والی نسلیں جوتے ماریں گی۔ (علی اکبر ایم پی اے جنگ فورم ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء)

اپوزیشن نے اسمبلی کے اندر حکومت سے تعاون ختم کر دیا حکومت کو جلد احساس ہو جائے گا کہ اس نے اپنے لئے کیا کیا مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ حکومت نے پارلیمنٹ کا اجلاس اچانک ملتوی کر کے قومی اتحاد اور اتفاق کے لئے جاری کوششوں کو سبوتاژ کر دیا ہے
(متحدہ اپوزیشن)

ایم کیو ایم کے پاس ۵۰ ہزار کلاشنکوفیں ہیں (راجہ صفدر حسین - ایم پی اے)

- مہاجر قومیت کا نعرہ مارشل لاء میں آیا۔ (عبدالقادر - ایم پی اے)
- الطاف حسین ہانگ کانگ کنکشن کے آدمی ہیں (حنیف رامے جنگ فورم میں)
- ایم کیو ایم پر الزام کے جواب میں اپوزیشن کا اسمبلی سے واک آؤٹ۔ (نواز شریف)
- ضیاء دور میں قومی پرچم جلانے پر الطاف حسین اور آفاق شاہد کو سزا مل چکی ہے (مخدوم خلیق رکن قومی اسمبلی)
- قائداعظم کے شہر میں خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ (میاں نواز شریف)

ایک انتخابی حلقہ کے حالات زندگی

پارٹی بازی کی سیاست انتخابی مہم کے دوران کس قسم کی اصول پرستی کا مظاہرہ کرتی ہے اس کے لئے فروری ۱۹۹۰ء میں انتخابی حلقہ ۹۹ لاہور کے حالات زندگی کی چند ایک جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں

- حلقہ ۹۹ (راوئنڈ وغیرہ) میں کروڑوں روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔
- دونوں برسر اقتدار جماعتوں پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی نے اپنے اپنے امیدوار کی کامیابی کے لئے تمام وسائل انتخابی مہم میں جھونک دیئے۔
- وزراء کی نئی چمکتی اور جھنڈے والی گاڑیاں دیہات کی گندی اور تنگ گلیوں میں رات گئے رواں دواں رہی ہیں۔
- انتخابی دفاتر ہوٹلوں میں بدل گئے۔
- لاؤڈ سپیکروں والی ایک ہزار گاڑیاں اعلانات کرتی پھر رہی ہیں۔
- "چوہا سسٹم" (چوری چوری ووٹ خریدنا) کے تحت ووٹ مانگے جا رہے ہیں۔
- قوم کا یہ پیغام ہے کہ حکمرانوں ڈٹ جاؤ ورنہ مٹ جاؤ (میاں نواز شریف)
- الیکشن کے سلسلے میں مرکزی وزراء کی طرح) اسلامی اتحاد بھی صوبائی وزراء کی ڈیوٹیاں لگا دی گئیں۔
- حلقہ ۹۹ لاہور میں اخراجات کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔
- بارہ لاکھ گز کپڑا (تقریباً ایک کروڑ روپے مالیت کا) بینر اور جھنڈیوں پر صرف ہوا۔ (حقانی)
- فی الواقعہ اس حلقے نے پانی پت کے میدان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ (ارشاد احمد حقانی)
- (الیکشن کے متعلق) جنگ کے دفتر میں ملک اور بیرون ملک سے ۵۴ ہزار کالیں وصول ہوئیں۔
- (انتخابی نتائج کے بعد ۲۴ فروری ۱۹۹۰ء کا بیان) پی پی پی ملک دشمن ہے اس کا اب مقابلہ نہ کیا گیا تو بعد میں بہت مشکل ہو جائے گا۔ (میاں نواز شریف)
- آئی جے آئی کی طرف سے جاری ہونے والے تقرر ناموں، چیک اور پلاٹوں کی الاٹمنٹ کے احکامات پر ۱۸ فروری ۱۹۹۰ء کے بعد کی تاریخ درج ہے۔
- وزیر اعلیٰ میاں نواز شریف نے کہا ہے کہ انتخابات میں دھونس اور اسلحہ کی نمائش کو ختم نہ کیا گیا تو ایسا انقلاب

آئے گا جسے روکا نہیں جا سکے گا (بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳)

• ہم اس تمام کی تمام روئداد پر کوئی تبصرہ پیش نہیں کرنا چاہتے صرف ہمیں کہیں گے۔

تم اپنے حسن کی سرمستیوں میں ڈوبے ہو
تمہیں خبر ہے کوئی حالتِ تباہ میں ہے

بہرحال سچ تو یہ ہے کہ اک عمر چاہیئے داستاں کے لئے بقول ایک شاعر کے۔

زیست کے مختصر سے وقفے میں اتنی بھرپور وارداتیں ہیں
تم کو فرصت اگر ہو سننے کی کہنے والی ہزار باتیں ہیں

نوجوان نسل کا مستقبل سیاست کی بھٹی میں

سیاست کے اس میدان کارزار میں ملتِ پاکستان کے سکونِ قلب کو جس بے دردی سے نظرانداز کرتے ہوئے مرغ بسمل کی طرح تڑپنے پھڑکنے پر مجبور کر دیا۔ مندرجہ بالا اخبارات میں اس کا اندازہ دیئے گئے باہمی بیانات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس جگر خراش داستان کو فراموش کرنے سے پیشتر روزنامہ جنگ لاہور (مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۹ء) کی طرف سے شائع ہونے والا اداریہ خانہ جنگی کے حزن کی وضاحت کرنے کے لئے بلا تبصرہ پیش خدمت ہے جناب مدیر کے الفاظ میں:

آئی جے آئی کے سربراہ اور وزیراعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے بیدو شریف میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے سرحد کے عوام سے اپیل کی کہ وہ پی پی کو ووٹوں سے مسترد کر دیں اگر عوام نے ایسا نہ کیا تو ایم ایس ایف (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن) کے ذریعے پی پی کا محاسبہ کریں گے اور یہ فورس اس وقت تک محاسبہ کرتی رہے گی جب تک ان کے دماغ درست نہیں ہو جاتے۔" اس کے بعد جناب مدیر لکھتے ہیں کہ:

پی پی اور آئی جے آئی ملک کی دو بڑی سیاسی حریف قوتیں ہیں ان کے درمیان کم و بیش ایک سال سے جاری محاذ آرائی بھی کوئی پوشیدہ بات نہیں اور اس میں ہر روز جو شدت پیدا ہو رہی ہے وہ بھی کوئی راز نہیں رہا۔ لیکن وزیراعلیٰ پنجاب نے ایک طلبہ تنظیم کو حریف سیاسی قوت اور حکمران جماعت کا دماغ درست کرنے کے لئے استعمال کرنے کے جس عزم کا اظہار کیا وہ ملک میں امن و امان کے لئے قطعی طور پر کوئی خوش آئند بات نہیں، ہر قابل ذکر سیاسی جماعت نے تعلیمی اداروں میں اپنے حامی طلبہ پر مشتمل تنظیمیں قائم کر رکھی ہیں اگر ہر سیاسی جماعت اپنی مخالف سیاسی جماعت کا دماغ اسی طرح درست کرنے کا رویہ اپنائے تو ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ ایک طرف تو طلبہ کو سیاست سے الگ رکھنے پر زور دیا جاتا ہے اور تعلیمی اداروں میں سیاسی مداخلت کو روکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں دوسری طرف طلبا کو بھرپور انداز میں سیاست میں گھسیٹنے بلکہ انہیں نفاق میں حکمران اور دو صوبوں

میں برسرِ اقتدار جماعت سے دست و گریبان کرنے کا عندیہ ظاہر کیا جارہا ہے۔ پی پی کی پالیسیوں اور اس کے طرزِ عمل پر تنقید بجا اور درست صوبوں سے اس کی محاذ آرائی کی پالیسی سے ہزار اختلاف کے باوجود آئی جے آئی کے سربراہ کی سوچ کسی طرح بھی ملک و قوم کے مفاد میں قرار نہیں دی جاسکتی۔ سیاستدانوں کی لڑائی سیاستدانوں تک محدود رہنی چاہیئے۔ طلبہ کو اس میں الجھانا قطعی نامناسب اور غیر دانشمندانہ فعل ہے۔"

قارئین گرامی یہ ہے ہمارے سیاہ نامۂ اعمال کی وہ سیاہ تاریخ جس کو ہم نوجوانوں کے خون سے رقم کرنے کے لئے پینتالیس سال سے برابر مصروف کار ہیں جب کہ علامہ اقبال کی روح شاہی مسجد لاہور کے بلند و بالا میناروں کے سائے میں ہر صاحب اقتدار کے کانوں میں اس کا ناقد تھا۔ یہ آذان دینے میں مصروف ہے کہ :۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

ہم اقتدار کی رسہ کشی اور ذاتی انا کے تحفظ اور اس کی نمود کے جوش میں یہ بھول ہی گئے کہ ہم نے نوع انسان کی حد تک آنسوؤں کو مسکراہٹ میں بدلنے کے لئے اس خطہ پاک میں وہ نظام حیات قائم کرنا تھا جس کا ہر کلمہ گو باسی علامہ اقبال کے اس شعر کی زندہ تصویر بن جائے کہ :

ہو حلقہ یاراں تو ابریشم کی طرح نرم رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

آخر ایسا کیوں نہ ہوا؟

سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں نہ ہوا تو اس کا جواب جاننے کے لئے ہمیں پاکستان کی ایک معتبر اور باشعور ادبی شخصیت جناب عبدالقادر حسن کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ موصوف اپنے مشہور اخباری کالم "غیر سیاسی باتیں" لکھتے ہیں کہ

"ایسا کیوں ہے اس لئے کہ ہمارے رہنماؤں اور حکمرانوں نے بحالی جمہوریت کے عرصہ میں جو بویا ہے وہ اب کاٹ رہے ہیں۔ سفارشوں خوشامدوں اور رشوتوں کے ذریعے قائم رہنے اور چلنے والی حکومتوں میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ نواز شریف ہوں، قائم علی شاہ ہوں، نواب بگٹی ہوں، شیر پاؤ ہوں یا بے نظیر، ہمارے یہ حکمران اور سیاست دان ہماری اخلاقی تباہی کے ذمہ دار ہیں انہوں نے اسمبلی کے ممبروں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ملک کے قانون اور ضابطوں کے خون کی ندیاں بہادیں۔ پہلے پولیس تھانے بیچا کرتی تھی اب وزرائے اعلیٰ نے پولیس سمیت تھانے بیچنے شروع کر دیئے ہیں۔ اسمبلیوں کے اراکین کی سفارش اور خواہش پر تھانے دار لگائے جاتے ہیں اور علاقہ کی پولیس کسی ایم پی اے یا ایم این اے کے سپرد کردی جاتی ہے اسمبلی کے اندر اس رکن کی حمایت کے معاوضے میں تھانہ اور تھانے دار تو کیا ایس پی اور ڈی سی تک بیچ دیئے جاتے ہیں، شاید ہی کوئی ایس پی کوئی ڈی سی کوئی اے سی اور کوئی تھانے دار ایسا ہو جو اپنی اہلیت اور استحقاق کی بنا پر کہیں تعینات ہو۔ میرٹ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی بس سفارش سب سے بڑا میرٹ ہے یا پھر رشوت اگر کسی کے پاس سفارش ہے یا رشوت کے لئے روپیہ ہے تو اس

کے پاس سب سے زیادہ میرٹ ہے۔ کسی امتحان میں حاصل کئے گئے اچھے نمبر اور کسی عرصہ ملازمت میں اعلیٰ کارکردگی یہ سب ماضی کی باتیں ہو چکی ہیں اور ہمارے جمہوری منتخب حکمرانوں کی لغت سے خارج ہیں"

اب فوج کشی کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی

اس تصویر کشی کے بعد جناب عبدالقادر حسن صاحب دلی کے پریس کلب میں بھارت کے مشہور دانشور مسٹر منین (جس نے مشرقی پاکستان کی فتح کا منصوبہ تیار کیا تھا) کا ایک بیان تحریر کرتے ہیں کہ (یہ ہندو دانشور) "ایک پاکستانی سے گفتگو کے دوران کہنے لگا کہ اب ہمیں آپ پر فوج کشی کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ آپ باقی ماندہ پاکستان ہمیں پلیٹ میں رکھ کر پیش کریں گے۔

صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ایک میٹنگ کا حال

ہندو دانشور کے اس بیان کو تحریر کرنے کے بعد جناب عبدالقادر حسن لکھتے ہیں کہ

"اس بھارتی کی ہرزہ سرائی کے جواب میں ایک صوبے کے حاکم اعلیٰ کی ایک میٹنگ کا حال سنئے۔ اراکین اسمبلی کے ساتھ اس میٹنگ میں حاکم اعلیٰ نے کہا کہ اب سفارشوں کا سلسلہ ختم ہونا چاہیے اور تمام ملازمتیں، ترقیاں اور تقرریاں میرٹ کی بنیاد پر ہونی چاہئیں۔ تمام اراکین اسمبلی نے اس کی پرزور تائید کی لیکن ایک بزرگ سامنے والی کرسی کا سہارا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمیں اپنے حلقے کے لوگوں کے کام کرنے ہوتے ہیں اس لئے زیادہ نہیں تو پچیس فیصد تک ہمارا کوٹہ مقرر کر دیجئے باقی سب میرٹ پر رکھ لیں۔ حاکم اعلیٰ کی کیا مجال کہ انکار کرتا۔ اس نے مان لیا جب پچیس فیصد تک سفارش کا کوٹہ مان لیا گیا تو شہ پا کر ایک اور رکن اٹھے اور انہوں نے ذرا زیادہ موثر انداز میں اپنی مجبوریاں پیش کیں اور سفارش کا یہ کوٹہ پچاس فیصد تک پہنچ گیا ایک ہوشیار رکن اسمبلی نے جب حاکم اعلیٰ کی طرف سے مراعات کا یہ پھیلتا ہوا سلسلہ دیکھا تو انہوں نے صاف صاف بات کہہ دی اور بولے کہ جناب والا یہ میرٹ اور استحقاق وغیرہ کی کتابی باتیں چھوڑیئے، آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم اسمبلی میں کسی میرٹ پر آئے ہیں یا ہم اس کے حقدار ہیں کہ ہم اسمبلیوں میں قوم کی نمائندگی کریں ہم جو بھی ہیں وہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں اس لئے جانے دیجئے ان باتوں کو اور جو ہم کہیں بس وہی کیجئے اور اس کے بعد باری باری درخواستیں جیبوں سے برآمد ہونا شروع ہو گئیں اور ان پر دستخط کرتے کرتے اور ضروری احکامات لکھتے لکھتے جب حاکم اعلیٰ کے ہاتھ تھک کر قریب قریب سن ہونے والے ہو گئے تو ان کی جان کی خلاصی ہوئی مگر صرف اس دن تک جب ان کے ساتھ دوسری ملاقات ہوگی فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر۔"

قارئین گرامی یہ کہانی صرف آج کی نہیں بلکہ یہ تماشہ شب و روز پینتالیس سال سے جاری و ساری ہے اور یہ ہمارے اسی "حسنِ عمل" کا نتیجہ ہے ے

بہاریں آ گئیں لیکن کسی بھی پھول کے رخ پر
نہ کوئی رنگ ہی آیا نہ کوئی تازگی آئی

کیا یہ حقیقت نہیں کہ:

رہزن کو ڈھونڈتے ہیں مسافر اِدھر اُدھر
رہبر سے کارواں کی قیادت نہ ہو سکی (فیض کوثر)

قوم زندہ اور تابندہ رہنا چاہتی ہے

بہر حال اس بھری محفل میں بیشریتی کی اس فراخ دلانہ تقسیم کا حال بیان کرنے کے بعد موصوف قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے بلکہ ڈھارس دیتے ہوتے دردمندانہ انداز میں لکھتے ہیں کہ

"اس وقت قوم کی حالت یہ ہے کہ وہ کشمیری بھائیوں کے زخم اپنے اوپر محسوس کر رہی ہے۔ حریت پسندوں کے کلمہ تکبیر کے نعرے اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں اور اپنے بھائیوں کی آزادی کے لئے وہ اپنا کردار ادا کرنے میں بے تاب ہے کیونکہ اس قوم کی عظیم اکثریت میں ان حکمرانوں کے تسلط کے باوجود اتنی جان باقی ہے کہ ایک مسلمان بھائی کے درد کو محسوس کر سکے مگر ہمارے حکمران پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس قوم سے ایمان کی روشنی نکال دیں اور اسے ایک بے جان تابعدار اور بزدل قوم بنا کر اس پر حکومت کرتے رہیں لیکن قوم زندہ اور تابندہ رہنا چاہتی ہے اس کے آمنے سامنے دو محاذ کھلے ہوتے ہیں ایک ملک کے اندر حکمرانوں کے خلاف اور دوسرا ملک سے باہر اس کے دشمنوں کے خلاف اور اس جنگ میں انشاء اللہ فتح اس قوم کی ہوگی اور ملک کے اندر اس کے دشمنوں کو رسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر ستر برس تک وسط ایشیا کے مسلمانوں کو روسی درندے زیر نہیں کر سکے تو ہمارے کمزور حکمرانوں میں اتنی ہمت کہاں کہ اس قوم کو بے حس بنا سکیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ فروری ۱۹۹۰ء)

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

لیکن اس نم کو پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم نئی نسل میں امت واحدہ کے تصور کی آبیاری کریں ورنہ آج تو حالت یہ ہے کہ:

بیرونی جارحیت کا خطرہ اور ہمارے سیاست دان

مقبوضہ کشمیر کی سنگین صورت حال کے پیش نظر بھارت نے افغانستان کے تعاون سے پاکستان کے خلاف ایک نیا محاذ کھولنے

کی سازش شروع کر دی ہے چنانچہ وی پی سنگھ کے ایک پیغام کے جواب میں افغان وزیر خارجہ عبدالوکیل آج نئی دہلی روانہ ہو رہے ہیں۔ بھارت اپنے اندرونی مسائل اور خاص طور پر کشمیر کی صورت حال سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے پاکستان کے خلاف کوئی بھی سازش کر سکتا ہے ان حالات میں ہمیں جس اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے اس کا مکمل فقدان ہے، صدر غلام اسحاق کے مشورے کے باوجود ملک کی دو بڑی سیاسی طاقتوں کے درمیان محاذ آرائی جاری ہے اور ارکان پارلیمنٹ کو بریفنگ کے دوران بھارت کی طرف سے جنگ شروع کرنے کے خدشے کے اظہار کے باوجود حکومت اور اپوزیشن پارٹیاں دست و گریبان نظر آتی ہیں۔ سرحد میں مسلم لیگ کو توڑنے کے نتیجے میں سیاسی جماعتوں کے اندر ایک نیا انتشار پیدا ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور سرحد میں ایک نئی کشمکش شروع ہوتی نظر آ رہی ہے، کراچی کے واقعات پر بھی فریقین ایک دوسرے کو مطعون کرنے میں مصروف ہیں۔ کراچی میں ہنوز امن نہیں ہوا کہ پیر صاحب پگاڑا نے حیدر آباد میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھنے کا خدشہ ظاہر کر دیا ہے اپوزیشن پی پی پی پر سندھ کے فسادات کا الزام لگا رہی ہے جب کہ پی پی کی طرف سے سندھ میں فسادات کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپوزیشن اور خاص کر ایم کیو ایم پر ڈالی جا رہی ہے کہ وہ ملک میں مارشل لاء لگوانا چاہتی ہیں۔ یہ صورت حال ایک عام پاکستانی کے لئے سخت تشویش کا باعث ہے، کیا ہمارے سیاسی رہنماؤں نے بیرونی جارحیت کے خطرات سے آنکھیں بند کر لی ہیں؟ کیا انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے المیہ کو فراموش کر دیا ہے؟ اگر آج بھی سیاسی قوتوں نے قومی مفادات کے پیش نظر رواداری اور افہام و تفہیم کی راہ اختیار نہ کی تو کوئی معجزہ بھی ہمیں کسی نئے المیے سے محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔"

(اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۹۰ء)

ہمارا خیال ہے کہ ان پیش کردہ حقائق سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی ہوگی کہ:-

کیوں دن کی تجلی پنہاں ہے کیوں روشن رات نہیں
پھولوں کے سہانے برابط پر کیوں نغموں کی برسات نہیں

قصہ پاکستان عوامی تحریک کے نام کا

امت واحدہ کے تصور کے فقدان اور سیاسی فرقہ بندی کے انتشار نے مسلمانوں کا جو حشر کر رکھا ہے اس کے لئے سابقہ صفحات کی ایک ایک سطر اپنی گواہ آپ ہے لیکن حیرت ہے کہ چاروں طرف سے اس قدر ذلت آمیز عذاب میں گرفتار ہونے کے باوجود ہم نے اپنی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہ کیا بلکہ اس کے برعکس نت نئی پارٹیوں کو جنم دینے کے لئے ہم ہر لحظہ کوشاں ہیں حتیٰ کہ اپنے محدود تصورات کی تکمیل کی خاطر اس ذات اقدس اعظم کا نام کچھ اس طرح استعمال کیا کہ جیسا کہ معاذ اللہ انسانیت کے امام اعظم نبی آخر زماں ﷺ نے ہمیں یہ اجازت دے دی ہے کہ ہم امت واحدہ کے بلند و بالا تصور کی کشتی کو اخوت کے سمندر سے نکال کر سیاسی فرقہ بندی کے جوہڑ میں لا کھڑا کریں۔

قارئین سے میری التماس ہے کہ وہ میرے ان الفاظ کو کسی کی ذات پر حملہ تصور نہ کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے مندرجہ ذیل اقتباس کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیں جو ماہنامہ ادارہ منہاج القرآن مئی جون جولائی ۱۹۸۹ء سے لیا گیا ہے اور جس میں جناب پروفیسر طاہر القادری کی سیاسی جماعت (پاکستان عوامی تحریک) کے نام کرنے اور اس کا نام تجویز کرنے کی روئداد بیان کی گئی ہے اس روئداد کے پیش نظر اگر کوئی غیر مسلم ہم سے یہ سوال پوچھ لے کہ

ڈیڑھ ہزار سال کے بعد پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۸۹ء میں سیاسی فرقہ بندی کی اجازت دربار نبوی سے کس طرح حاصل ہوئی تو نہ جانے اس کا ہم کیا جواب دیں گے۔ اب آپ ماہنامہ منہاج القرآن کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں لکھا ہے کہ

اس سلسلہ میں ادارے کی مجلس عاملہ اور مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی رو سے ملکی حالات کے پیش نظر مختلف سروے کروائے گئے جن کی رو سے ۹۰-۹۵ فیصد عوام نے سیاسی جماعت بنانے کے حق میں رائے دی اس کے بعد بعض دوستوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے اذن حاصل کرنے کے لئے استخارے بھی کئے جس کے نتیجے میں انہیں بھرپور رہنمائی اور کامیابی کی خوشخبری تک نصیب ہوئی۔ جب یہ بات طے ہوئی تو بانی تحریک نے کہا کہ سیاسی میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے آقا و مولا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو کر آپ سے نظر کرم کی بھیک مانگیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مقدس کے سائے میں سابقہ مرحلوں کی طرح اس مرحلے کی کامیابی کی بھی ضمانت میسر آجائے یہ بات ان کی زبان سے نکلنے کی دیر تھی تمام مرکزی قائدین نے اس پہ لبیک کہا اور یہ طے ہو گیا کہ ہم اپنے سیاسی پروگرام کا اعلان بارگاہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری بیت اللہ جل شانہ کے بعد کریں گے ؛ لہٰذا طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ قافلہ قائد تحریک کی سربراہی میں ۳۰ مارچ ۸۹ء کو لاہور سے روانہ ہوا تقریباً پچاس افراد پر مشتمل اس قافلے میں ادارے کی نمایاں شخصیات شامل تھیں۔

گنبد خضرا کے سائے میں سیاسی جماعت کا نام

مدینہ طیبہ کے قیام کے دوران ہی یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ انقلابی مرحلے کے آغاز کے سلسلے میں جس سیاسی جماعت کے قیام کا اعلان کیا جانا ہے اس کا نام بھی گنبد خضرا کے سائے میں ہی طے ہونا چاہیئے۔ تمام دوستوں کو اطلاع کر دی گئی کہ رات نماز تراویح کے بعد مسجد نبوی کے صحن میں (جہاں سے گنبد خضرا نظر آتا ہے) جماعت کے نام کے سلسلے میں میٹنگ ہوگی۔ تمام ساتھی نماز کے بعد اکٹھے ہو گئے حضرت قائد کے حکم کے مطابق نشست کی غرض و غایت اور اہمیت بیان کی اس کے بعد محترم محمد خلیل الرحمٰن قادری نے نام کے سلسلے میں چند اصولی باتیں بیان کیں مختلف نام پیش ہوئے لیکن ان میں سے دو نام منتخب ہوئے کہ ان میں سے کوئی ایک رکھ لیا جائے جناب محمد انور قریشی نے دونوں نام قائد محترم کی خدمت میں پیش کئے اس کے بعد ریاض الجنت میں نوافل ادا کئے گئے۔ مبارک قدموں میں حاضری دی گئی نوافل ادا کئے گئے اس کے بعد اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھ کر مختصر گفتگو ہوئی۔ قائد محترم باربار کہہ رہے تھے کہ گنبد خضرا کے سایہ میں نام طے کرنے جا رہے ہیں کیونکہ جو کمی ہماری کوتاہیوں کی بنا پر رہ جائے گی سبز گنبد کے سایہ کی برکت سے پوری ہو جائے گی اس سلسلہ کی اگلی نشست حضور علیہ السلام کی عیدگاہ مسجد غمامہ کے سامنے فرش پر شروع ہوئی۔ سامنے گنبد خضرا کے جلوے تھے اور آپ کی عیدگاہ تھی حضور علیہ السلام کی توجہات کی برکت سے مختصراً تبادلہ خیال کے نتیجے میں تمام ساتھی ایک نام پر متفق ہو گئے۔

صبح یہ نام آقا کی بارگاہ میں پیش کریں گے

نام طے ہونے کے بعد قائد محترم نے فرمایا کہ یہ نام ہم صبح آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں پیش کر کے کرم کی بھیک مانگیں گے جب

پروفیسر صاحب صبح ہوٹل سے مسجد نبوی حاضری کے لیے روانہ ہونے لگے تو آپ نے فرمایا پہلے میری فون پر پاکستان میں حضور پیر صاحب سے بات کراؤ کیونکہ پہلے ان کی بارگاہ میں نام پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اسے آپ کے واسطے سے حضور علیہ السلام کی بارگاہ اقدس میں پیش کریں گے آپ نے فون پر حضور پیر صاحب کی خدمت عالیہ میں نام پیش کیا اور سفارش کے لئے بھی عرض کیا۔ آپ نے فی الفور منظور فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انشاء اللہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پسند فرمائیں گے۔

جماعت کا نام پیش کیا گیا

قائد محترم نے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں نام پیش کرتے ہوئے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے بھی آپ ہی کا لطف و کرم ہے ہم کچھ بھی نہیں اب بھی آپ ہی کی رحمت کے بھروسے پر قدم اٹھا رہے ہیں ہمیں اپنے نعلین پاک کا سایہ عطا فرماویں مزید کرم یہ فرمائیں کہ قیام مدینہ کے دوران ہی کوئی ایسی علامت کا اظہار فرمائیں جس سے ہمیں اس بات پر اطمینان قلب نصیب ہو کہ آئندہ پروگرام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کا سایہ نصیب ہو گیا ہے اور آپ نے اسے اپنی بارگاہ میں قبول فرما لیا ہے۔ اسی روز آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام کی آرزو کی تکمیل بھی فرما دی جو بعد میں آپ نے مسجد نبوی میں تمام اہل قافلہ کو خوشخبری کی صورت میں سنائی۔ ۱۱ر اپریل ۸۹ء تین بجے صبح بذریعہ پی آئی اے کراچی پہنچے تو ادارہ کے احباب نے پرجوش استقبال کیا۔ پروفیسر صاحب اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سیدھے خواجہ ہاؤس پہنچے جہاں سحری کا کھانا کھایا اور بعد نماز فجر آرام کیا۔

رفیق ادارہ محترمہ مسز مہاجر کا خواب

اسی روز منہاج القرآن ویمن لیگ کی بعض سرکردہ بہنیں پروفیسر صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لائیں جن میں مسز مہاجر بھی شامل تھیں۔ انہوں نے ایک نہایت روح پرور اور ایمان افروز خواب سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم ایک قافلے کی صورت میں سرکار دو عالم کے درِ اقدس پر حاضر ہیں اور اصحاب صفہ کے چبوترے پر بیٹھے ہیں مسجد نبوی کو سجایا جا رہا ہے۔ مسجد نبوی کے خدام سیڑھیاں لئے چلے آ رہے ہیں اور بعدازاں ایک خادم سیڑھی پر چڑھ کر جلتا ہوا بلب اتارتا ہے اور اس کی جگہ نیا بلب لگا دیتا ہے ہمارے پوچھنے پر وہ بتلاتا ہے کہ پروفیسر صاحب آئے ہوئے ہیں اس لئے مسجد کو سجایا جا رہا ہے۔ میں دل ہی میں خوش ہو رہی ہوں اور اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ معمر خاتون مسز مہاجر نے جب یہ خواب اپنے بہن بھائیوں کی موجودگی میں قائد تحریک کو سنایا تو فرطِ مسرت سے ہر ایک کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بعدازاں حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی گئی جو خواب کی خوشی میں وہ اپنے ہمراہ لائی تھیں۔" یہاں یہ امر قابل ذکر ہے اسی رسالے کے مطابق پروفیسر قادری صاحب کا نام بھی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی رکھا تھا۔

امریکی قونصل جنرل کا خراج تحسین

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کی اس عوامی تحریک کے منظم ہونے کا تعلق ہے تو امریکی قونصلیٹ جنرل مسٹر رچرڈ میکی اور کی پولیٹیکل افسر نے تحریک کے مرکزی دفتر کا معائنہ کرتے ہوئے کہا کہ (ہم نے) "پاکستان عوامی تحریک جیسی منظم پارٹی امریکہ میں بھی نہیں دیکھی"

(بحوالہ روزنامہ خبریں مورخہ ۱۹۹۰-۴-۱۷)

آپ اس تمام روداد کی تہہ میں پوشیدہ جذبہ محرکہ پر غور کرنے کے علاوہ جناب پروفیسر مجیب کے یہ الفاظ بھی سامنے لائیے کہ "گمنام رہنا بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔" چنانچہ اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب محمد سعید صاحب (سول اینڈ ملٹری گزٹ کے سابق ڈپٹی ایڈیٹر) اپنی کتاب آہنگِ بازگشت میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"اس جملے پر زندگی میں جیسے جیسے غور کیا ہے بڑی بڑی غریب پروریاں، طبل وحشم کی تہی سامانیاں، اور جُبّہ و دستار کی فیض باریوں کے بھرم کھلتے گئے ہیں۔ ابدی شہرت پانے کے لیے انسان نے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ تاریخ عالم اس ضمن میں بڑی لرزہ خیز داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مضحکہ خیز یا عبرت انگیز داستان مشرقی یورپ کے ایک نواب سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ مرض الموت میں جب اس پر نزع کا عالم طاری ہوا تو آخری دعاؤں کے لیے لاٹ پادری صاحب کو بلایا گیا۔ پادری صاحب نے آتے ہی بڑے ادب سے پوچھا: "حضور کوئی ایسی تمنا جو اس حسرت کدۂ عالم میں ناتمام رہ گئی ہو؟" نواب صاحب نے سرد آہ بھری اور کہا: "مقدس باپ، خداوند خدا کا دیا بہت کچھ تھا۔ کوئی نعمت ایسی نہیں تھی جس کی خواہش کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ البتہ ایک حسرت ایسی ہے جو گوشۂ لحد میں بھی چین نہیں لینے دے گی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ چند برس گزرے، پاپائے روم اور شہنشاہِ جرمنی بیک وقت میرے ہاں مقیم تھے اور میں انہیں قلعے کی سیر کراتے ہوئے اس بُرج کی جانب بھی لے گیا جو سب سے زیادہ خطرناک ہے ان دونوں نے منڈیر پر سے جھک کر نیچے گہری گھاٹی میں جھانکا۔ میں بپاسِ ادب اُن کے پیچھے کھڑا تھا۔ مجھے یہ حسرت آج تک کھائے جا رہی ہے کہ میں نے انہیں پیچھے سے دھکا کیوں نہ دے دیا۔ اور یوں اپنے لیے بقائے دوام کے دربار میں نشست محفوظ کیوں نہ کرالی۔"

نہ معلوم انسان کی خود نمائی کی یہ حسرت کتنی نسلوں کا خون کر دیتی ہے۔ کاش انسان کو اس خونِ ناحق کا احساس ہو جائے۔

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کے وجود کو برقرار رکھنے کی خاطر سیاسی لیڈروں کے بیانات میں ایک جواز یہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس مملکت کا وجود بذاتِ خود ایک سیاسی پارٹی کا رہینِ منت ہے اور اگر خدانخواستہ مسلم لیگ کا وجود نہ ہوتا تو پاکستان کا خواب بھی کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا لہٰذا سیاسی پارٹیوں

کا ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ مفید تر ہے[1]۔ راقم کا خیال ہے کہ اس دلیل کا جواب اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے جو طلوعِ اسلام نے قائدِ اعظم کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے مجلہ مئی ۱۹۴۸ء میں لکھا تھا:

"مسلمانوں کی اکثریت کے علاقہ میں ان کی آزاد مملکت قائم کی جائے۔ ان کے مقابلہ میں ہندو اور انگریز نے خود مسلمانوں کی کچھ ایسی پارٹیاں کھڑی کر دیں، جو کہتی تھیں، کہ قائدِ اعظم رح کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ آزاد مملکت کا مطالبہ مسلمانانِ ہند کا مطالبہ ہے۔ قائدِ اعظم رح ان کے نمائندہ نہیں ہیں۔ اس کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ یہ ثابت کیا جائے، کہ مسلمانوں کی اکثریت کا یہی مطالبہ ہے، اور قائدِ اعظم رح ان کے واحد نمائندہ ہیں۔ یہ ثبوت مسلم لیگ بہم پہنچاتی تھی" طلوعِ اسلام نے متحدہ ہندوستان میں مسلم لیگ کی وجۂ جواز بیان کرنے کے بعد کہا کہ حصولِ پاکستان کے بعد وہ وجۂ جواز ختم ہو گئی ہے۔ لہٰذا ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ مسلم لیگ کو بطور پارٹی ختم کر دیا جائے۔ قیامِ پاکستان تک تو اس کی ضرورت تھی لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔ کسی پارٹی کی بھی ضرورت نہیں ہے" اور جب "قائدِ اعظم نے اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ملک کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں صرف ایک پارٹی رہے اور وہ مسلم لیگ ہو، اس لیے:-

آپ متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ رہیئے کیونکہ اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔"

تو قائدِ اعظم رح کی عقیدت و احترام کے باوجود طلوعِ اسلام نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ۱۹۴۸ء میں ہی تحریر کیا تھا کہ:-

"ہمارے اربابِ حل و عقد کا ارشاد ہے کہ مختلف پارٹیوں کا وجود مملکتِ پاکستان کے لیے سخت خطرناک ہوگا ـــ بالکل بجا اور درست ـــ لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے ـ اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کونسی آسمانی سند ہے کہ اس کا وجود ضرور رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجیے کہ

---

[1] اور یہی دلیل روزنامہ نوائے وقت نے اپنے اداریہ مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۶ء میں دہرائی تھی۔

دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضرور رہے لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مدِمقابل نہ آئے۔ اِس کی دلیل یہ دیتی ہے کہ مَیں حق پر ہوں اور کوئی دوسری پارٹی حق پر نہیں لیکن آپ سوچیے تو بعینہٖ یہی دلیل اس پارٹی کے مدِمقابل دوسری پارٹی دے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح بیسیوں پارٹیاں وجود میں آ جاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد سے قائم رہتی ہیں۔ غور کیجئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا یہ طریق نہیں کہ آپ اپنی پارٹی کو برسرِحق قرار دے کر اس کے وجود کو قائم رکھیں اور باقی پارٹیوں کو باطل ٹھہرا کر ان کا استحصال کرنے لگیں۔ اس طرح سے پارٹیوں کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کے ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ وہی طریق ہے، جسے قرآن نے تجویز کیا ہے — کہ کسی پارٹی کا وجود ہی نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو ملّت باقی رہ جائے گی، جس طرح جب فرقے ختم ہو جائیں گے تو باقی مسلمان رہ جائیں گے۔ آگے بڑھیے تو جب قومیں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی یہی قرآن کا مقصود ہے۔" (طلوعِ اسلام - جون ۱۹۷۸ء)

۱۹۶۹ء کے آخر میں مؤقر ماہنامہ "نصرت" (لاہور) کے مدیر اور پنجاب کے سابق وزیرِاعلیٰ جناب حنیف رامے[1] صاحب نے جناب پرویز صاحب کے ایک طویل انٹرویو کے دوران سیاسی پارٹیوں اور بنیادی جمہوریت کے متعلق ایک اہم سوال کیا تھا۔ موضوع کی مناسبت سے جناب حنیف صاحب کا یہ اٹھایا گیا سوال اور پرویز صاحب کا جواب درج ذیل کیا جا رہا ہے۔

"حنیف صاحب! پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اسی مشورے کی ایک کوشش ہے جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رُو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لیے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اِس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ اِس سوال کا دوسرا حصّہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی

جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروّجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز صاحب: جب میں نے ۱۹۶۲ء کے دستور میں دیکھا کہ اُمت میں سیاسی پارٹیوں یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اِس لیے کہ میرے نزدیک قرنِ اوّل کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی معیّن کردہ منزل کی طرف اُٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ اُوپر تک اُٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہو سکتا تھا لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدّت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی۔ اِس لیے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اُس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصّے کو مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اِس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصّے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔ بالکل نہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اِس دنیا کی زندگی میں بھی ذلّت و خواری نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کے جو اچھے نتائج متوقع ہو سکتے تھے وہ "پارٹی ساز جمہوریت" کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں، حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں، یعنی وہ نظام جس کے لیے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا — تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمّت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھُلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہیے تاکہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی —— منکر مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن کا انداز —— تو عذابِ الیم ہے۔ قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرزِ زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ نتائج بڑے

نا پائدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے لیکن منافقت کو، جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو، اس نے بدترین زندگی قرار دیا ہے۔ اسی لیے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر متعین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔" (بحوالہ ماہنامہ نصرت اور طلوع اسلام جنوری ۱۹۶۶ء)

ع " دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو "

سچ ہے کہ طلوع آفتاب کے باوجود اگر کوئی انسان اپنی آنکھیں خود ہی بند کر لے تو اسے کچھ بھی تو نظر نہیں آتا اور یہاں تو کسی ایک آدھ کی بات نہیں اگر جذبات سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو ہم سب کے سب انفرادیت کے اسی مرض میں مبتلا دکھائی دیں گے اور یہ حالت صرف پاکستان کی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام کی ہے۔ آج بنگلہ دیش جو کل کا مشرقی پاکستان تھا، وہاں بھی سیاسی پارٹیوں کی تعداد ۷۰ کے قریب ہے۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵ جولائی ۱۹۸۳ء)

پروفیسر محمد منور صاحب کا مضمون

اس انتخابی داستان کے بعد جناب پروفیسر محمد منور صاحب (گورنمنٹ کالج لاہور) جنہوں نے علامہ اقبال پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، کے مضمون "دل صاحبِ اخلاص ہے انصاف طلب ہے" کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موضوع کے نیچے یہ لکھا تھا کہ "کوئی بلند شخصیت فرقوں کی تنگنائی میں نہیں سما سکتی" لیکن اس مضمون کے آخر پر یہ بھی تحریر تھا کہ "خدا پاکستان کو استحکام اور اسلامی سنی رنگ میں استحکام عطا کرے۔" کاش صاحبِ مضمون اہلِ پاکستان کے لیے شیعہ سنی فرقوں کی ان تنگنائیوں سے بلند ہو کر قرآنی رنگ میں امت واحدہ کے رنگ کے استحکام کی خاطر دعا گو ہوتے۔

نظامِ مصطفےٰ اور کفر کے فتوے

فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی یہ تباہ کن روش انسان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر کس قدر تنگ نظر اور خود پسندی میں مبتلا کر دیتی ہے، اِس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے لگایا جا سکتا ہے مثلاً ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفےٰ ﷺ کے نام پر متحدہ محاذ کی طرف[۱] سے چلائی گئی تحریک سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اِس اتحاد میں جماعتِ اسلامی، پاکستان مسلم لیگ، پاکستان جمہوری پارٹی، تحریک استقلال، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، جمعیت العلمائے پاکستان، جمعیت العلمائے اسلام، آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس اور خاکسار تحریک شامل تھیں۔ مولانا مفتی محمود اس تنظیم کے صدر اور رفیق احمد باجوہ اس کے جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ لیکن اگر اس تحریک کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو ان ۹ ستاروں میں سوائے نظامِ مصطفےٰ ﷺ کی اصطلاح کے کوئی چیز مشترک نظر نہیں آئے گی۔ کیونکہ یہ حضرات ذہنی طور پر باہم اس قدر متشدد واقع ہوئے تھے کہ مفتی محمود صاحب مرحوم نے مودودی صاحب مرحوم کے ایک بیان پر حیدر آباد پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مودودی صاحب کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں جو مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اِس پریس کانفرنس میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے اِس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اِس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے وہ امریکہ کا اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے۔ اب وہ موت کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔ (بحوالہ روزنامہ زندگی لاہور مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۹ء)

فرقہ بندی اور افطاری

اِس کے علاوہ ایک اور قابلِ افسوس مثال یہ ہے کہ ۲۵ر اگست ۱۹۷۷ء کی شام متحدہ محاذ (قومی اتحاد) کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے گئے تو اسلامی اخوت اور نظامِ اسلام کے قیام کے دعویدار

۱؎ ۔ جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے۔

کے درمیان ایک عجیب منظر دیکھنے میں آیا۔ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی محمود صاحب اور نواب زادہ نصر اللہ خان دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے اور ان نمازیوں کی امامت مفتی صاحب نے کی جبکہ مولانا نورانی صاحب اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں شاہ احمد نورانی صاحب نے جماعت کرائی اور تحریکِ استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے ساتھ نماز پڑھی۔

(بحوالہ روزنامہ مساوات ۲۶ اراگست ۱۹۷۷ء)

اور یہ سب کچھ چوہدری ظہور الٰہی صاحب مرحوم کی قیام گاہ واقع مین گلبرگ لاہور پر رونما ہوا۔

صدرِ مملکت کو غلط فہمی ہوئی ہے

اس کے بعد ایک اور مثال جو مولانا نورانی صاحب کے حوالے سے ہفت روزہ ایشیا کی ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں مل سکے گی۔ اور جو اُوپر دی گئی مثالوں سے بھی زیادہ قابلِ افسوس اور تعجب انگیز ہے اور وہ یہ کہ :

" ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں (شاہ احمد نورانی[1]) اور مولانا عبدالستار نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب یہ ابھی تین چار روز پہلے ۱۳ اراکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاء الحق سے ملاقات کے لیے گئے تاکہ دار العلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد ان سے رکھوایا جائے تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں انہوں نے یہ فرمایا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں، آپ میں بڑی رواداری ہے آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے (مارشل لاء کے لگنے کے فوراً بعد) قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک صاحب کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے یہ رپورٹ

ملی ہے۔ میں سنتا رہا۔ جب ان کی بات ختم ہو گئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب بڑا افسوس ہے آپ کو غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔ ہم میں الحمد للہ بڑی وسعت قلبی ہے لیکن گستاخِ رسول کے لیے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پُر نور کی شان میں تنقیص کرنے والے کے

---

[1] نورانی صاحب ورلڈ اسلامک مشن کے چیئرمین ہیں۔

لیے کوئی رواداری نہیں ۔ اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مولانا احمد رضا خاں کا لکھا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتوے موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے ہم الحمد للہ اس فتوے پر عمل کرتے ہیں۔ کوئی بھی شخص خواہ ڈیرہ اسماعیل خاں[1] کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ[2] کا ہو کسی شاتم رسول کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے ۔ اور میں نے کہا جناب والا یہ چار ٹکے کے لوگ ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہمارے میں ایسی رواداری، فراخدلی اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلب میں شاتم رسول کے لیے کوئی وسعت نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی اور اس کے لیے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہوں گے ۔ قومی اسمبلی میں ہی اذان ہوتی تھی۔ علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رخ ان سے دوسری طرف اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں بے شمار لوگ ہیں" ایک طرف تو یہ مولانا نورانی اس قومی اتحاد میں شامل ہیں اور دوسری طرف مفتی محمود کے متعلق ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قومی اتحاد کے سربراہ (مولانا مفتی محمود) نے ابھی تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا اور وہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ مملکت مستحکم ہو۔ مفتی صاحب نے تحریک نظام مصطفےٰ کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے ۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز ۲۱ جولائی ۱۹۷۸ء)

سو اس فرقہ بندی کے خود ساختہ مسلک کے متعلق زیادہ سے زیادہ اور کیا کہا جائے گا کہ ؎

تیرا دل تو ہے صنم آشنا مجھے کیا ملے گا نماز میں

لہٰذا ان تصریحات کی روشنی میں انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے حضرات جو ایک دوسرے کے نزدیک شاتم رسول اور گستاخ رسول ہوں تو ان کے ہاتھوں کس قسم کا نظام مصطفےٰ نافذ ہوگا اور اس کی شکل و صورت کیا ہوگی ۔ جب کہ خدائے علیم نے نظام خداوندی نافذ کرنے والوں کی پہچان یہ بتائی تھی کہ :- ؎ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کس قدر خوبصورت ہے یہ قول کہ "فساد کا اولین جرثومہ نفرت سے پیدا ہوتا ہے" جبکہ پارٹی بازی اور فرقہ بندی کی بنیاد ہی نفرت پر ہوتی ہے۔

---

[1] اس سے مراد مفتی محمود صاحب ہیں۔

[2] اس سے مراد مودودی صاحب ہیں۔

امام کسے بناؤں

قائدِ اعظم کی دُور رس نگاہ اِس قسم کی فرقہ واریت کی نمازوں کے خطرناک نتائج سے کس قدر واقف تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ سن ۱۹۴۳ء میں ایک تبلیغی وفد نے جس میں مقتدر حضرات شامل تھے، قائدِ اعظم سے ملاقات کی۔ ان حضرات نے دورانِ گفتگو قائدِ اعظم سے کہا کہ آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے لیے اس قدر وسیع و عریض پنڈال کھڑے کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع کرتے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ قائدِ اعظم نے فرمایا:

" علاوہ دیگر امور کے اِس سے غیر مسلموں کے دل پر ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور ہیئتِ اجتماعیہ کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔"

اِس پر علماء حضرات نے قائدِ اعظم سے کہا کہ اس کے لیے ہم آپ کو اس سے زیادہ مؤثر طریق بتاتے ہیں کہ آپ نماز کے وقت اِس پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

" نماز کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن آپ کی تجویز میں مجھے ایک خطرہ نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ نماز باجماعت میں ایک امام کا ہونا ضروری ہے۔ اگر مَیں خود امامت کے لیے کھڑا ہو جاؤں تو شاید یہ تمام حاضرین میرے پیچھے نماز پڑھ لیں۔ لیکن مَیں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا اِس کے بعد سوال یہ پیدا ہو گا کہ امام کسے بنایا جائے۔ اگر امام دیوبندی ہو گا تو بریلوی حضرات اِس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے اور یہی صورت بریلوی کی بجائے دوسرے امام کے پیچھے پڑھنے میں پیدا ہو گی۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں یہ ہو گا کہ ایک پنڈال میں مختلف جماعتیں کھڑی ہو جائیں گی۔ اِس سے غیر مسلموں کے سامنے امتِ مسلمہ کے اختلاف نمایاں ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ جو قوم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتی وہ ایک متفقہ علیہ اسلامی ریاست کیسے قائم کرے گی اس وقت تو آپ مجھے معاف فرمائیں۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔"

(بحوالہ " تعمیرِ پاکستان اور علماء")

جنگ فورم میں اجتماعی نماز سے انکار

قائدِ اعظم نے تو اِس قدر انتشار و خلفشار کے باوجود پاکستان قائم کر دیا لیکن قرآن حکیم کی موجودگی

کے باوجود ہمارے قلب و نظر میں یک رنگی اور یک نگہی آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۸۵ء میں پوری دنیا کے سامنے نگاہوں کو جھکا دینے والا منظر اس وقت پیش آیا جب روزنامہ جنگ لاہور کے پلیٹ فارم پر جنگ فورم کے تحت " اتحاد ملت کیسے قائم ہوسکتا ہے " کے موضوع پر اظہارِ خیال کرنے کے لیے مختلف علماء کرام تشریف لائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مورخہ ۲۴ر نومبر ۱۹۸۵ء کو مذکورہ اخبار کے سرورق پر جو خبر شائع ہوئی وہ یہ تھی کہ :

" جنگ فورم میں اتحاد امت مسلمہ کے موضوع پر طویل اور فکر انگیز تقریروں کے بعد مختلف مکاتبِ فکر کے علماء نے اکٹھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ "

روزنامہ جنگ کے مطابق جنگ فورم میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء جن میں علامہ محمود احمد رضوی علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا گلزار احمد مظاہری، مولانا موسیٰ بیگ (جامعہ المنتظر)، مفتی محمد صدیق ہزاروی اور مولانا اختر کاشمیری، شامل تھے۔ اتحاد امت کے موضوع پر اس فورم کے دوران نماز عشاء کے وقت انہیں اکٹھے نماز کے لیے کہا گیا تو علامہ احسان الٰہی ظہیر اور علامہ محمود احمد رضوی نے کہا کہ یہ ممکن نہیں۔ مولانا موسیٰ بیگ نے کہا کہ وہ باقی علماء کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے تیار ہیں لیکن وہ مغربین پڑھ چکے ہیں۔ مولانا صدیق ہزاروی بھی ان علماء کے ساتھ فورم ہال سے چلے گئے اور کہا کہ وہ اپنے گھر جا کر نماز ادا کریں گے۔ جبکہ مولانا گلزار احمد مظاہری اور مولانا اختر کاشمیری ایک دوسرے کی امامت میں نماز ادا کرنے پر رضامند ہو گئے لیکن بعد میں انہوں نے اپنے اپنے گھر جا کر نماز ادا کی۔ اس موقع پر مختلف علماء نے کچھ آراء اور تجاویز بھی پیش کیں۔ چنانچہ علامہ محمود احمد رضوی نے فرمایا کہ " فقہ اور مسلک کا اختلاف ختم کرنا ممکن نہیں۔ " علامہ احسان الٰہی ظہیر نے فرمایا " مستند علماء کا بورڈ قائم کیا جائے۔ " مولانا موسیٰ بیگ نے کہا کہ " ضروریات پر اتفاق رائے ہوسکتا ہے۔ " گلزار مظاہری نے ارشاد فرمایا کہ " بورڈ کی تجویز قابلِ عمل نہیں، اختلافات صدیوں پرانے ہیں۔ " لیکن اس کے باوجود مولانا اختر کاشمیری نے کہا میرے نزدیک اتحاد امت کا سوال ہی غلط ہے یہ سوال نہیں الزام ہے۔ امت میں ہمیشہ اتحاد تھا، اتحاد ہے اور رہے گا۔ اگر یہ سوال کسی درجے میں موجود ہے تو مسلم ریاستوں کے سربراہوں سے کیا جانا چاہیے۔ اس اختلاف کے ذمہ دار علماء نہیں۔ "

اس موقع پر علامہ احسان الٰہی ظہیر نے مولانا مظاہری سے بعض سوالات کیے۔ جن کی تفصیل یہ ہے

علامہ احسان الٰہی ظہیر: آپ چاہتے ہیں یہ سارے اختلافات ہوتے ہوئے بھی متحد ہونا چاہیے۔ کیا یہ اتحاد دائمی ہوگا؟

مولانا گلزار مظاہری : مقاصد متعین ہوں گے جدّ وجہد مشترک ہو گی تو کامیابیاں ہوں گی۔ ابھی آپ اسلام کے آنے تک عارضی اتحاد کرلیں۔

علامہ احسان الٰہی ظہیر ”کون سے اسلام کی آپ بات کر رہے ہیں؟

مولانا مظاہری : کتاب وسنّت والا اسلام۔“

علامہ احسان الٰہی : ”تمام طبقوں کی تعبیر مختلف ہے۔ قانون والوں اور صحافیوں کے لیے ضابطے ہو سکتے ہیں۔ ان کا معیار مقرر ہو سکتا ہے تو علماء کے لیے کیوں نہیں۔ کیا یہ معیار نہیں ہو سکتا کہ کون عالم ہے اور کون نہیں ہے؟ ۱۹۵۲ء میں ۳۱ علماء نے اکٹھے ہو کر جو ۲۲ نکات تشکیل دیئے تھے، اس طرح کی بات اب بھی ہو سکتی ہے۔“

علامہ محمود احمد رضوی نے کہا ”وحدتِ ملّت کا جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہی ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمان متفق ہیں اور متفق ہو جائیں جہاں تک وحدتِ امّت کے لفظ کی خوبصورتی اور حسن کا تعلق ہے اِس کا تو اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ فکری طور پر ہر مسلمان دلی طور پر صمیم قلب کے ساتھ یہ چاہتا ہے کہ وحدتِ امّت کی کوئی شکل یا کوئی صورت پیدا ہو جائے کیونکہ یہ بالکل واضح اور ظاہر بات ہے کہ اسلام دشمن طاقتوں کے مقابلے کرنے کے لیے جب تک ملّتِ اسلامیہ متفق اور متحد ہو کر قدم نہیں اُٹھاتی اس وقت تک وہ اپنی منزل کو نہیں پا سکتی۔“

مولانا گلزار احمد مظاہری نے کہا کہ ”علامہ احسان الٰہی ظہیر اور علامہ محمود احمد رضوی نے اچھی باتیں کی ہیں۔ پہلی بات ”جنگ“ سے عرض کروں گا کہ اگر آپ نے اِس مسئلے کو چھیڑا ہے تو اسے کم از کم ایک سال تو چلایئے اِس پر ایک مذاکرے کی بجائے اِس کے بارے میں تمام شعبوں کے نمائندہ لوگوں سے کچھ لکھوایئے انہوں نے کہا کہ ہمارے اختلافات اتنے شدید نہیں کہ ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھ ہی نہ سکیں۔ اقوام متحدہ میں بھی تو ہم اتنے اختلافات کے باوجود اکٹھے بیٹھے ہی ہیں بلکہ جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا اور علماء اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں جتنی بار علماء جمع ہو جاتے ہیں اتنی بار اور کوئی طبقہ جمع نہیں ہوا۔ سب سے بڑی مثال ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء کی ہے۔ ایک طرف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تھے اور دوسری طرف مولانا ابو الحسنات تھے اور ایک سٹیج پر مہینوں نہیں سالوں اکٹھے رہے۔ ملّت کے مسائل پر سب سے زیادہ فکرمند طبقہ علماء کا ہے۔ اگر کل کی غلامیوں سے آزاد کرانے کے لیے محمد مصطفیٰ آئے تھے تو آج روس وامریکہ کی غلامیوں سے آزاد کرانے کے لیے ہمیں اُٹھنا چاہیئے۔“

جنگ فورم کی اُس افسوسناک روئیداد کے پیشِ نظر دوسرے روز مختلف حضرات نے جو ردِّ عمل ظاہر کیا

اس کے تحت کالعدم مسلم لیگ پنجاب کے سیکرٹری جنرل افتخار علی شیخ نے فرمایا "علماء کے ایک ساتھ نماز نہ پڑھنے پر دُکھ ہوا ہے وہ دوسروں کو کیا راہ دکھائیں گے۔" اور بزرگ سیاستدان ممتاز دولتانہ نے فرمایا کہ " (اگر) ایسا ہو تو میں ضرور ان کے پیچھے نماز کے لیے جاؤں گا۔" خاکسار تحریک کے رہنما خان اشرف صاحب نے فرمایا کہ " علماء کا ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا نہ کرنا ہی ملتِ اسلامیہ کے اتحاد میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔" اور کالعدم مساوات پارٹی کے سربراہ جناب محمد حنیف رامے نے کہا کہ "یہ سوال تو کسی فرقے والے سے پوچھیں۔ میں تو غیر فرقہ واریت کا قائل ہوں اور اس معاشرے کی بنیاد رکھنے کا حامی ہوں جو سیکولر ہو۔"

جبکہ کالعدم جمعیت علماء اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) پنجاب کے صدر سید امیر حسین گیلانی نے کہا ہے "روزنامہ جنگ نے یہ خبر شائع کر کے انتہائی زیادتی کی ہے کہ مختلف مکاتبِ فکر کے علماء ایک ساتھ نماز پڑھنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ اگر کسی نے کسی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا تو یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔ اگر ملک میں دینی طرز کی حکومت قائم ہو عوام کی اکثریت کی فقہ متعین کر کے ڈپٹی کمشنر اور گورنر نماز کی امامت کریں تو تمام مسالک کو ایک ساتھ نماز پڑھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

سید امیر حسین گیلانی صاحب سے کون عرض کرے کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں :(اب تو)

؎ زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

لہٰذا نئی نسل اب اِس قسم کے دبیز پردوں کو اُلٹ کر خود دیکھ لے گی کہ امن و سکون کے راستے میں کون لوگ حائل ہیں اور یک جہتی کے فقدان کی وجہ جواز کیا ہے ؟

آئندہ صفحات پر انہی وجوہات کا تفصیلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

لہ نماز باجماعت کے اس خلفشار کے سلسلہ میں اس دلخراش داستان کا ذکر جناب محمد علی فاروق نے اپنے ایک مضمون "اتحادِ اُمت کے لیے علماءِ کرام کی جدوجہد !" کے عنوان کے تحت ماہنامہ تعمیرِ انسانیت لاہور جنوری ۱۹۸۶ء میں بڑی دلسوزی کے ساتھ کیا ہے۔

دوسرا باب

مقام فقہ

اجتہاد کی اہمیت اور ہماری چشم پوشی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس قدر اختلافات، انتشار اور عناد کی وجہ کیا ہے۔ علامہ اقبال نے تو کہا تھا

؎ کیا تُو نے صحرانشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں

لیکن اب صدیوں سے حالت یہ ہے کہ نہ ہماری خبر ایک ہے نہ نظر اور نہ ہی اذان ایک۔ تو ہمارا خیال ہے اس کا جواب اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اس کی تمام تر وجہ ہماری تقلیدی اور غیر تحقیقی فقہیں، متضاد اور وضعی روایات، فرقہ واریت سے بھری ہوئی عجمی تاریخ کتاب و سنّت کا غلط مفہوم ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام چیزوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں پرکھا جائے جو اس کسوٹی پر پوری اترے، اسے تسلیم کرلیا جائے اور جو اس کے خلاف جائے اسے رد کر دیا جائے۔ کیونکہ قرآنِ حکیم تو نازل ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ انسان اپنے متنازعہ معاملات کے فیصلے اس کی روشنی میں کرے۔ بصورت دیگر قرآن حکیم کو مرکزی اتھارٹی تسلیم نہ کرنے والی قوم کی حالت ایسی ہوجاتی ہے جس کی مثال آج ہم خود ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں آج تک متفق علیہ اسلامی نظام نافذ نہیں ہوسکا۔

مجلس شوریٰ کے صدر کی حق گوئی

اور یہی وہ وجہ جواز ہے جس کا اعتراف پچھلے دنوں مجلس شوریٰ کے صدر محترم خواجہ صفدر صاحب نے اپنی تقریر میں ان الفاظ میں کیا تھا :

" ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کیے بغیر ملک میں اسلامی نظام

کا نفاذ حماقت ہوگی۔ . . .“ انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ بچار کے بعد ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کردے۔“ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ر مئی ۱۹۸۳ء)

جناب چیف جسٹس انوار الحق کا بیان

اور یہ لائحہ عمل قرآن حکیم کے علاوہ اور کوئی ہو نہیں سکتا جو پہلے سے ہی متفقہ علیہ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ بہرحال اسی فقہی اختلاف کے متعلق پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمایا کہ:

”یہ بدقسمتی کی انتہا ہے کہ آج تک اِس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اسلام کی رو سے سیاسی نظام کا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے اور آج ہم ڈھانچوں میں مبتلا ہیں کہ ایک ڈھانچا بنتا ہے ایک بگڑتا ہے۔ اِس طرح سے اسلام کا اقتصادی نظام، سماجی عدل و انصاف کا نظام، اسلامی قوانین، سب پر اس قدر فقہی اختلافات ہیں۔ پھر ایک ہی فقہ کے لوگوں کے اندر آپس کے اختلافات ہیں۔ کچھ لوگ اس قدر تعصب اور تنگ نظری سے کام لینا چاہتے ہیں کہ نئی نسل میں اسلام سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔“ پھر فرمایا: ”پاکستان میں یہ غلطی کی جا رہی ہے کہ اصولوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی روح کو نافذ کرنے کی بجائے کوشش یہ ہو رہی ہے کہ چودہ سو سال پہلے کی چیزوں کو اسی طرح اس دور میں بھی نافذ کیا جائے۔“ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ر جون ۱۹۸۳ء)

چنانچہ اس کا حل پیش کرتے ہوئے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں فرمایا کہ ”صرف اکثریت کی بنیاد پر کوئی فقہ نافذ نہیں کی جا سکتی۔ (اس لیے) اجتہاد کی بنیاد پر تمام فقہوں کو ملا کر مشترکہ فقہ تشکیل دی جائے۔“

لیکن ہمارے ہاں ___ یہ کوشش کس شکل میں اور کس جوش و جذبے سے کی جا رہی ہے اس کا اندازہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵ اگست ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والی اس خبر سے لگایا جا سکتا ہے۔

”راولپنڈی (نمائندہ جنگ) پاکستان متحدہ سنی محاذ کے زیرِ اہتمام یہاں پاکستان سنی کونشن سے خطاب کرتے ہوئے ملک بھر کے علماء نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کو مکمل سنی سٹیٹ قرار دیا جائے جبکہ اقلیتوں کو قرآن و سنت کے مطابق وہ حقوق دیئے جائیں جو دیگر اسلامی ممالک میں انہیں حاصل ہیں۔ کونشن کے پہلے اجلاس کی صدارت قومی اسمبلی

کے رکن مولانا عبدالحق نے کی۔ جبکہ دوسرے اجلاس کی صدارت متحدہ سنی محاذ پاکستان کے کنوینز مولانا محمد عباس عبدالستار تونسوی نے کی۔ بعد ازاں جامعہ حنفیہ انوار العلوم پر ایک جلسہ عام ہوا جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ کنونشن نے مشترکہ طور پر قرارداد منظور کی کہ سنیوں کے تمام مکاتب فکر اپنے فروعی اور جزوی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ سنیوں کے مطالبات کے لیے جدوجہد کرنے پر مرکوز کر دیں۔ نیز کنونشن میں ان مطالبات کے علاوہ یہ بھی کہا گیا کہ اگر یہ مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو (ہم) سڑکوں پر آنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

اور اس سے قبل روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۶ راگست ۱۹۸۵ء کے مطابق

"سنی مجلسِ عمل کے زیرِ اہتمام منعقدہ خلافتِ راشدہ کانفرنس نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ماتمی جلوسوں پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے اور اذان و کلمہ طیبہ میں کمی بیشی کو فوراً خلافِ قانون قرار دیا جائے۔ نیز یہ کہ مرتد کی شرعی سزا (قتل) نافذ کی جائے۔"

اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد مجلس عمل کے چیف آرگنائزر علامہ عبدالمجید ندیم نے کہا کہ:

"فرقہ وارانہ نفرتوں کا سیلاب ہماری قومی زندگی کے لیے عظیم خطرہ ہے۔" نیز آپ نے فرمایا کہ:

"پاکستان میں واقع اکثریت کے عقائد پر مبنی پبلک لا کے نفاذ سے کوئی بحران پیدا نہیں ہوگا۔"

اور روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۸۵ء کے حوالے سے یہ خبر بھی ملاحظہ فرمائیں کہ:

"کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی کنونشن میں جو جامعہ نعیمیہ لاہور میں پیر سید برکات احمد کی صدارت میں منعقد ہوا ایک قرارداد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں اہلِ سنت کی حکومت ہونی چاہیے نیز اوقاف کا انتظام بھی اہلسنت کے سپرد کیا جائے۔"

لیکن پرویز صاحب کے الفاظ میں:

"جب تک آپ اس تلخ حقیقت کو گوارا نہیں کر لیتے کہ فرقہ بندی کی زندگی قطعاً اسلامی زندگی نہیں۔ آپ قرآن کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر نہیں آسکتے تو اس کی رُو سے صراطِ مستقیم ایک ہی ہے جب اُمت مختلف راستوں پر چل نکلے تو پھر وہ صراطِ مستقیم کسی کے سامنے کبھی نہیں رہتا۔" $\frac{۹}{۵۴}$

"دین تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن جب فرقہ بندی میں اس کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو انہیں مذاہب کہا جاتا ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" جنوری ۱۹۸۶ء)

(اور اسی طرح) جب دین مذہب میں تبدیل ہو جائے تو انسانی آزادی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ (۹/۳۱)

مفتی جعفر حسین صاحب کا انٹرویو

ان فقہی اختلافات کو (جن کی بنا پر ملت کا شیرازہ بکھر چکا ہے) ہم نے کس قدر اہمیت دے رکھی ہے اس کے لیے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے قائد جناب مفتی جعفر حسین کا وہ خصوصی انٹرویو دیکھنا ضروری ہے جو روز نامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء کے اداریہ میں شائع کیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"شیعہ سنی اختلافات طبعی ہیں ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ مخصوص چیزوں پر عائد ہوتی ہے جبکہ دوسری فقہ میں ایسا نہیں۔ زکوٰۃ کے طریق کار پر بھی ہمیں اختلاف ہے ہمارے اور اہل سنت والجماعت کے ہاں اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ اموال ظاہرہ پر لی جاتی ہے اموال باطنہ پر نہیں۔ روپیہ چونکہ اموال باطنہ میں شامل ہے لہٰذا حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر زکوٰۃ لے۔"

اور بقول اداریہ نگار روز نامہ نوائے وقت مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء جناب مفتی صاحب ہی کے ایما پر جنرل ضیاء صاحب کی حکومت نے شیعہ حضرات کو فقہ جعفریہ کے مطابق زکوٰۃ اور عشر سے مستثنیٰ قرار دیا۔ عشر کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی جعفر حسین نے کہا کہ "حکومت صرف سرکاری زمین پر عشر لے سکتی ہے۔ نجی ملکیت کی زمین پر حکومت کو عشر لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔" سکول میں اسلامیات کے نصاب کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "یہ الگ ہونا چاہیئے شیعوں کی شیعہ دینیات اور سنیوں کے لیے سنی دینیات۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو وہ کبھی دینیات نہیں رہے گی نہ سنی رہے گی نہ شیعہ رہے گی کچھ بھی نہیں رہے گی۔"

جب ان سے کہا گیا کہ آیا اس سے پاکستانی بچوں کے اندر شروع ہی سے فرقہ وارانہ احساسات پیدا نہیں ہو جائیں گے تو انہوں نے کہا "شیعہ بچہ شیعہ ہے اور شیعہ ہی رہے گا۔ سنی بچہ سنی ہے اور وہ سنی ہی رہے گا۔"

لے یاد رہے کہ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی تھے اور بقول اداریہ نگار جنگ آپ نے تبلیغ و اشاعت دین کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۸۳ء)

انہیں بتایا گیا کہ ایک تجویز یہ ہے کہ ایک متفق علیہ فقہ مرتب کیا جائے۔ جسے فقہ پاکستان کہا جاسکتا ہے۔ اِس پر آپ کی رائے کیا ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کوئی نئی فقہ مرتب نہیں کی جاسکتی اور ایسا کرنا نادانی ہوگی۔ یہ بے معنی تجویز ہے۔ عالم اجتہاد تو کرسکتے ہیں لیکن بالکل نئی فقہ مرتب نہیں کی جاسکتی"

انہوں نے مطالبہ کیا کہ "مذہبی اداروں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، شریعت بینکنگ وغیرہ میں جہاں اسلام کا کام ہوتا ہے اور قوانین کے لیے سفارش ہوتی ہے وہاں ہم اپنا حصہ مانگتے ہیں۔"

اور پاکستان شیعہ کانفرنس کے صدر جناب سید ہادی علی شاہ صاحب نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "پاکستان کے تمام مذہبی فرقے اپنے فقہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے تشخص کو برقرار رکھیں اور ملک کی سالمیت اور تحفظ کے لیے متحد ہوجائیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ ۶ رجولائی ۱۹۸۳ء)

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ

اور دوسری طرف روزنامہ جنگ مورخہ ۱۹ رفروری ۱۹۸۵ء کے مطابق:

"لاہور (پ ر) تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے وفاقی حکومت کی نامزد کردہ ۱۶ رکنی کمیٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔ تحریک کی سیاسی کمیٹی کے ایک اخباری بیان میں کہا گیا ہے کہ ایسی کمیٹی کی تشکیل کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اہلِ تشیع کے مطالبات بالکل واضح ہیں اور ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی سیاسی کمیٹی نے کہا ہے کہ ملتِ جعفریہ کا مطالبہ ہے کہ حکومت ۶ رجولائی ۱۹۸۰ء کے معاہدہ اسلام آباد پر عمل کرے اور پولیس ایکٹ دفعہ ۳۰ (۳) کی ترمیم فوری طور پر واپس لے۔ دریں اثنا تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان نے کوئٹہ کی صورتِ حال سے مؤثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے فوری طور پر ایک ایکشن کمیٹی تشکیل دے دی ہے۔ ایکشن کمیٹی کے ایک ترجمان نے اسلامیانِ پاکستان سے اپیل کی ہے کہ وہ ۱۹ جولائی کو ملک بھر میں منعقد ہونے والی تعزیتی اور احتجاجی مجالس میں بھاری تعداد میں شریک ہوکر شہدائے کوئٹہ کو عملاً خراجِ تحسین پیش کریں۔ تحریک کی لاہور شاخ کے پریس ریلیز کے مطابق آج سہ پہر چار بجے کربلا گامے شاہ میں ایک تعزیتی و احتجاجی تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔"

اور اس کے بعد اخبارات میں آنے والی خبروں کے مطابق کوئٹہ کے حالیہ واقعات میں ملوث ۲۳۱ کے لگ بھگ ایسے افراد کی نشاندہی ہوتی ہے جن کا تعلق ایران سے ہے۔ ضلعی انتظامیہ نے انہیں گرفتار کرکے حکومت

ایران کے حوالے کرنے کے لیے آئی۔جی جیل خانہ جات بلوچستان کی نگرانی میں تفتان پہنچا دیا۔

وزاق قریبو لاہور کے جناب مقبول احمد خاں صاحب نے سچ کہا ہے کہ" فرقہ داریت ختم نہ ہوئی تو ملک میں اندلس کی تاریخ دہرائی جائے گی"۔ (بحوالہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۶ رجولائی ۱۹۸۵ء)

.. مقبول احمد خاں صاحب کے اس خیال کی تصدیق ستمبر ۱۹۸۶ء میں ماہِ محرم کے دوران ملک میں ہونے والے ان واقعات سے ہوتی ہے جنہوں نے پورے ملک کو خوف و حزن کی سیاہ چادر میں لپیٹ لیا تھا اور جس کی مختصر تفصیل روزنامہ جنگ لاہور کے مدیر نے اپنے ہاں بیان کرتے ہوئے لکھا تھا:

"پھونک ڈالے گی چمن کو آتش پیکاریہ"

عاشورہ محرم اور اس کے اگلے روز لاہور، ڈیرہ اسماعیل خاں، اور خیبر پورٹ میوالی میں انتہائی ناخوشگوار واقعات کے بعد لاہور کے متاثرہ علاقوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں کرفیو نافذ کر دیا گیا اور لاہور کے متاثرہ علاقوں میں فوج طلب کر لی گئی ہے۔صوبائی وزیر اوقاف ملک خدا بخش ٹوانہ کی ایک پریس بریفنگ کے مطابق ان ہنگاموں میں چند افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔"

اِن حالات میں جہاں تک پاکستان میں ناجائز اسلحہ کی بھرمار کا تعلق ہے تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۵ء کے اداریہ کے مطابق:

"ناجائز اسلحہ کی بھرمار

وزیرِ داخلہ محمد اسلم خٹک نے اگلے روز قومی اسمبلی میں بتایا کہ ایک اندازے کے مطابق قبائلی اور دیگر علاقوں میں تقریباً ۳ لاکھ روسی اور چینی ساخت کی کلاشنکوف رائفلیں پہنچ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ راکٹ، لانچرز، ٹینک اور طیارہ شکن راکٹ گنوں اور ٹائم بموں سمیت سینکڑوں اقسام کے خودکار ہتھیار بھی یہاں پہنچے ہیں اور اس امر کی تصدیق بھی ہو گئی ہے کہ قبائلی سردار ملک ولی خان کوکی خیل کارمل انتظامیہ سے ہتھیار وصول کرتا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ قبائلی علاقوں پر حکومت کا مکمل اختیار نہیں اور اس علاقے میں ہتھیاروں کی آمد کی وجہ بھی یہی ہے۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تجویز

ان حالات میں جہاں تک قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تعلق ہے تو آپ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

"پاکستان میں نفاذِ شریعت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے فقہی اختلافات کا ایک ہی حل ممکن ہے کہ دستوری طور پر پاکستان کو سنّی اسلامی ریاست قرار دیا جائے۔ کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اہلِ سنّت والجماعت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ اسلام کا معیار و مطلوب تو یہی ہے کہ مسلمان ایک متحد اور مربوط اُمّت بن کر رہیں، لیکن عملی اعتبار سے، سُنّی اور شیعہ اختلافات کی نوعیت اتنی حقیقی اور تاریخی ہے کہ ان کو دستوری اور قانونی سطح پر تسلیم کیے بغیر نفاذِ شریعت کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔" انہوں نے ہمسایہ ملک ایران کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایران نے جعفریہ فقہ کو ملکی قانون قرار دے دیا ہے، پاکستان میں حنفی فقہ کو ملکی قانون قرار دیا جائے۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۲؍جولائی ۱۹۸۶ء)

یعنی کسی دوسرے کی طرف سے نہیں بلکہ قرآن اکیڈمی کی طرف سے قرآنی فقہ کے نفاذ کی بجائے تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔

نوائے وقت میں دیئے گئے اِس بیان کے علاوہ روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین مورخہ ۱۴ تا ۲۰؍نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جنگ فورم کی طرف سے جب یہ سوال کیا گیا کہ:

س: مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہیں۔ آپ سب فرقوں کی فقہ کے لیے مشترکہ فارمولا کیا بنائیں گے۔

تو اس پر آپ نے جواب دیا بنیادی طور پر قانون تو سنّی فقہ کا ہوگا کیونکہ یہاں سُنّیوں کی اکثریت ہے باقی سب فرقوں کو ان کے پرسنل لاء کے حوالے سے یہ اجازت ہوگی کہ وہ اس پر عمل کریں۔ لیکن پبلک لاء سُنّی فقہ کے مطابق چلے گا۔ میں تو کہتا ہوں تمام فرقوں کی رجسٹریشن کرانی چاہیئے۔ اور ہر فرقہ کا اپنا بورڈ بن جانا چاہیئے۔

مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب کا بیان

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے علاوہ مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب نے روزنامہ نوائے وقت

لاہور مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۶ء کے حوالے سے فرمایا تھا کہ "ملک میں فقہ حنفی کے سوا کسی فقہ کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔"

اور جہاں تک جمعیت علماء پاکستان کا تعلق ہے تو ان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خاں نیازی کے علاوہ اس جماعت کے نائب صدر پروفیسر شاہ فرید الحق نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ملک میں حنفی فقہ کو پبلک لا قرار دیا جائے۔

(روزنامہ نوائے وقت ۱۷ جون ۱۹۸۸ء)

محترمہ بے نظیر بھٹو کا پروگرام

وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو ۹ جولائی ۱۹۸۸ء کو یہ اعلان کر دیا تھا کہ

"ہمارا دور آنے دیں ہر فقہ کو مکمل آزادی ملے گی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ جولائی ۱۹۸۸ء)

حنفی فقہ کی حقیقت

لیکن اگر آپ یہ جاننا مقصود ہو کہ فقہ حنفی کی حقیقت کیا ہے؟ تو ماہنامہ طلوع اسلام (بابت ستمبر ۱۹۸۶ء) کے مطابق:

"امام ابو حنیفہؒ نے اپنی فقہ قرآن مجید کے حوالے سے مرتب کی تھی اس سے چونکہ مفاد پرستوں کے مفاد پر ضرب پڑتی تھی، اس لیے اس طبقے نے ان کی مدون کردہ فقہ کو بعد کے مسلمانوں تک پہنچنے نہ دیا۔ علامہ شبلی کی تو یہی تحقیق ہے کہ ان کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ اور عقائد کی کتاب "الفقہ الاکبر" جو امام صاحب کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ان کی تصنیف نہیں ہے۔ آج کل جو فقہ، فقہ حنفی کے نام سے مشہور ہے وہ امام صاحب کے شاگردوں قاضی ابو یوسف صاحبؒ اور امام محمدؒ کی مرتب کردہ ہے۔ اس فقہ میں بلاشبہ کہیں کہیں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے اقوال موجود ہیں۔ لیکن ان کے جن فتاویٰ سے مفاد پرست طبقے پر زد پڑتی تھی، ان میں سے کسی ایک کا ذکر حنفی فقہ میں تو موجود نہیں لیکن دوسرے فقہی مذاہب کی کتابوں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔"

جناب مودودی کا اعتراف

یہی وجہ ہے کہ مودودی مرحوم نے فقہ حنفی کے متعلق یہ فرمایا کہ:

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہب میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا رکھا ہے۔"[لہ] (بحوالہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان حقائق کا اس طرح روز روشن کی طرح واضح ہو جانے اور انہیں تسلیم کرنے کے باوجود انہی حضرات کی طرف سے پھر بھی یہی مطالبہ کیا گیا کہ کیونکہ ملک کی اکثریت فقہ حنفی کی

لہ یہ الگ بات ہے کہ مودودی صاحب مرحوم نے اس کے باوجود اکثریت کی بنا پر ملک میں فقہ حنفی کو ہی نافذ کرنے کا مشورہ دیا تھا حالانکہ انہیں کے نزدیک یہ فقہ "منجمد شاستر" بھی تھی۔

پیرو ہے اس لیے اس فقہ کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا جائے اور اس کی اطاعت ہر فرقے پر لازم ہو (بحوالہ "پاکستان میں سیکولر اسلام" شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام لاہور)

مودودی صاحب مرحوم کے اس بیان اور تجویز پر اہلِ حدیث نے جس قدر مخالفت کی تھی، اس وقت کے اخبارات اس پر شاہد ہیں۔

قارئین حضرات جناب مودودی صاحب مرحوم کے اوپر والے بیان کو بھی پیشِ نظر رکھیں اور اور اسی جماعت کے سیکرٹری جنرل اور سینیٹر قاضی حسین احمد کی طرف سے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والے بیان کو بھی ملاحظہ فرمائیں کہ: "۳۱ علماء (جن میں خود مودودی صاحب بھی شامل تھے) کے ۲۲ نکات دینی جماعتوں کے اتحاد کی بنیاد بن سکتے ہیں۔" یعنی وہ ۲۲ نکات جو مختلف فرقوں اور فقہوں کو برقرار رکھنے کے لیے مرتب کیے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی ۲۶ مارچ ۱۹۸۶ء کو موچی گیٹ کے جلسۂ عام میں آپ کا یہ فرمان کہ، "پوری اُمت کو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے لیکن ہم مسلمانوں کو ایک امت بنانا چاہتے ہیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳/۲۷/۸۶)

نہ معلوم وہ کون سا نسخۂ کیمیا ہے کہ جس کے تحت "مسلمہ اسلامی فرقوں" کی آبیاری کا سامان بھی مہیا ہوتا رہے اور پھر اُمتِ واحدہ بھی تشکیل پا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب مودودی صاحب مرحوم اس امکانی صورت سے بخوبی واقف تھے کہ کوئی فرقہ اپنے اُوپر کسی دوسری فقہ کو مسلط نہیں ہونے دے گا۔ اور اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کسی گزرے ہوئے زمانہ کی مرتب کردہ جزئیات کو ہمیشہ کے لیے نافذ العمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لہٰذا انہوں نے اِس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا کہ:

"مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں رہ سکتا اور نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال میں تمام حالات کے مطابق ہے"

(بحوالہ تفہیمات، حصہ دوم ایڈیشن ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۴۶)

مودودی صاحب کا نقطۂ نظر بسلسلہ اکثریت

جہاں تک اکثریت کے بل بوتے پر فقہ حنفی کے نفاذ کا تعلق ہے اور اکثریت کی حقیقت کو کسی حد تک قابلِ اعتماد اور قابلِ قبول سمجھا جاسکتا ہے تو اس سلسلہ میں مودودی صاحب کی یہ تحریر پیشِ خدمت ہے:

"اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ

ایک شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں۔" (بحوالہ: اسلام کا نظریہ سیاسی ص ۵۴/۴۴)

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

یہی چیز اور یہی عوامل خود امام ابو حنیفہ کے پیش نظر تھے جس کو خطیب بغدادی صاحب نے اپنی تاریخ جلد ۱۴ صفحہ ۲۵۰ پر تحریر کیا ہے۔ امام نقل فرماتے ہیں کہ ہم امام ابو حنیفہ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے۔ ایک دن امام صاحب نے امام یوسف سے فرمایا کہ تیرا ستیاناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہ کو ابو یوسف سے فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔" یہی وجہ ہے کہ فقہا کے سرخیل جناب امام ابو حنیفہ نے فقہ حنفی کے نام پر کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ بزرگ آنے والی نسلوں کو اپنے فہم کا پابند نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تدبر فی القرآن اور مشاورت کی تعلیم کسی خاص دور کے لیے مختص نہیں ہو سکتی۔

علامہ اقبال کی تعلیم

امام ابو حنیفہ کے اس مسلک پر علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "امام اعظم ابو حنیفہ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے ہیں اپنی فقہ میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا" اور پھر مزید فرمایا "ان حالات کی روشنی میں میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے مطابق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہ کا طرز عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لیے من و عن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرز عمل امام ابو حنیفہ کے طرز عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔"

پروفیسر عثمان

اجتہاد کے بارے میں پروفیسر عثمان صاحب نے اپنے ایک مضمون میں دیت کی مثال دیتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی یقیناً غور و فکر کا متقاضی ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ:

"بلاشبہ حقیقی نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے دیت ادا کرنے کا حکم دیا مگر مقدارِ دیت بیان نہیں کی۔ سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ قرآن نے مقدارِ دیت کیوں مقرر نہیں کی؟ اس ضمن میں سکوت کیوں فرمایا؟ کیا یہ سکوت سکوت حکیمانہ نہیں؟ کیا قرآن قرآن حکیم نہیں؟ واضح لفظوں میں حکم ہوا کہ دیت ادا کرو مگر یہ نہ بتایا کہ کتنی! اس سوال پر پوری اسلامی تاریخ میں دو واضح، دو ٹوک راستے نکلتے ہیں۔ ایک راستہ حضرت عمر فاروق رضؓ امام ابوحنیفہؒ، شاہ ولی اللہ، سرسید اور اقبال کا ہے اور دوسرا جمہور علماء کا۔ پہلا مکتبہ فکر لگی لپٹی رکھے بغیر یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ عبادات و اخلاق و عقائد کے سوا جہاں تک قانون اور قانون سازی کا تعلق ہے۔ قرآن نے جو چھوٹ، اجازت، رعایت اور استحقاق مسلمانوں کو بخشا ہے اس کا دروازہ قیامت تک آنے والی مسلمان نسلوں کے لیے کھلا ہے جس طرح قرآن ہمیشہ کے لیے ہے اسی طرح اس کی اجازتیں اور رعایتیں اس کے بخشے ہوئے حقوق و اختیارات بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر ایک نسل ان سے اپنی عقل و دانش اور اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق فائدہ اٹھاتی ہے تو وہ اس رعایت و اجازت اور بخشش و کرم کو آنے والی نسلوں کے لیے بند نہیں کر سکتی۔ آنے والی ہر نسل اپنی عقل و دانش اور عصری تقاضوں کے مطابق خود ان اجازتوں سے فائدہ اٹھانے کا ناقابلِ انتقال حق رکھتی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۳ جون ۱۹۸۴ء)

فقہی اختلاف کی چند ایک مثالیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان فقہی اختلافات کے سلسلہ میں ایک دو مثالوں کا ذکر کر دیا جائے تاکہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے مثلاً ۱۹۸۰ء میں مملکت پاکستان کی طرف سے پبلک لاء کی حیثیت سے جب زکوٰۃ اور عشر کا قانون رائج کیا گیا تو شیعہ حضرات کے احتجاج کے علاوہ اہلحدیث کی مرکزی جمعیت کی طرف سے جو صدائے احتجاج بلند ہوئی اسے روزنامہ مساوات اپنے ہاں شائع کیا تھا اور وہ یہ کہ:

"مرکزی جمعیت اہلحدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو تقریباً

ایک کروڑ اہلحدیث، اہلِ تشیع کی طرح بنکوں سے رقم نکلواتے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج پریس کانفرنس سے استفسار کیا کہ آیا صدرِ مملکت اِس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ عشر اور زکوٰۃ کی شرائط، نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جس طرح اہلِ تشیع کو اہلِ سنّت سے اختلاف ہے اسی طرح زکوٰۃ عشر کے بیسیوں مسائل جن میں اہلحدیث اور فقہی ماہرین کے ساتھ شیعہ، بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہلحدیث کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، حنفی علماء چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی، فقہ حنفی سے ہی راہنمائی حاصل کرتے ہیں اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے، لیکن اہلحدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف اور صرف قرآن و حدیث ہی واجب العمل ہے۔ ان حالات میں کونسلروں کے طے کردہ قواعد اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ کسی اہمیت کے حامل ہوں گے نہ کسی اعتماد کے قابل۔"

چنانچہ ان فقہی اختلافات کی بنا پر حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ اور عشر دے سکتا ہے۔ (زکوٰۃ اور عشر کے متعلق تفصیلی گفتگو اپنے مقام پر آئے گی)

فقہی اختلافات کا نتیجہ

صد افسوس کہ ان فقہی اختلافات کی بنا پر آج تک یہ بھی متعین نہیں ہو سکا کہ قانون وراثت کی صحیح صورت کیا ہے، چوری کرنے والے کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیئے۔ وضو کا صحیح طریق کیا ہے۔ شراب کی متفقہ علیہ تعریف کیا ہے؟۔ جَو کا پانی شراب ہے یا انگور کا؟ زکوٰۃ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا رجم کی سزا درست ہے یا صرف کوڑوں کی؟۔ ربٰوا کے سلسلے میں صرف محنت کا ماحصل ہی جائز ہے یا روپیہ کا؟ کیا اسلام میں مضاربت کی اجازت ہے یا نہیں؟ کونسی اذان درست ہے اور کونسی نہیں؟ نماز میں ہاتھ چھاتی پر ہونے چاہئیں یا زیرِ ناف؟ آمین اونچی آواز میں کہنی چاہیئے یا آہستہ۔ وصیت کتنے مال کی کی جاسکتی ہے اور پھر اس کی صورت کیا ہو گی۔ گیارہویں شریف کا ختم حلال ہے یا حرام؟ کیا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے؟ یتیم پوتے کا وراثت میں حصّہ ہوتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ بقول علامہ محمد اسلم جیراج پوری (مرحوم)

" اگر اجتماعی مرکز فقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھتا تو ساری ملّت کی ایک ہی فقہ ہوتی اور شخصی فقہوں

میں پڑ کر وہ فرقوں میں تقسیم نہ ہو جاتی اور اس مرکزیت کی وجہ سے حدیثوں کی بھی یہ حالت نہ ہوتی۔" ۶۶
(بحوالہ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۳ء)

شریعت بل کے نمایاں پہلو

ہمارے ہاں فقہ کے اس جمود کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا کوششیں ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اس شریعت بل کے مطالعہ سے ہو سکے گا جو اِن دنوں پاکستان میں پورے زور و شور سے زیرِ بحث ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے جناب اصغر علی گھرال کے مضمون کا ایک اقتباس پیش کرنا ہوگا جو روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت مورخہ ۵/۹/۸۶ کو شائع ہوا:

"نفاذِ شریعت بل رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا ہے۔ بعض مذہبی حلقے اس پر نازاں ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ اسلام یا شریعت کا نفاذ اس ملک میں کبھی بھی متنازعہ فیہ نہیں رہا، اس لیے اس بل کو جوں کا توں منظور کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اب وہ اس بل کی حمایت میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے زبردست مہم چلا رہے ہیں۔ البتہ خواتین کی بعض تنظیموں نے اس کے خلاف ضرور صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کو "سیکولرازم" اور "مغرب زدگی" کا طعنہ دیا گیا۔ اب کچھ دیگر مسالک کے علماء نے جن میں فقہ جعفریہ کے علماء پیش پیش ہیں، اس کی بیشتر دفعات کو قابلِ اعتراض قرار دے کر تنبیہہ کی ہے کہ اگر اس بل کو منظور کیا گیا تو اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن کی جائے گی۔

بل کے نمایاں پہلو

اِس پر مفصل بحث سے قبل بل کے نمایاں پہلو ملاحظہ کریں۔

(۱) وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت و فیصلہ بلا استثناء تمام امور و مقدمات پر حاوی ہوگا۔

(۲) مقننہ کوئی ایسا قانون یا قرارداد منظور نہیں کر سکے گی جو شریعت کے احکام کے خلاف ہو۔ اگر کوئی قانون یا قرارداد منظور کر لی گئی تو اسے وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کیا جا سکے گا۔

(۳) ملک کی عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند رہیں گی۔

(۴) تمام عدالتوں میں حسبِ ضرورت تجربہ کار، جید اور مستند علماءِ دین کا بحیثیت جج و معاونین عدالت تقرر کیا جائے گا۔

(۵) شریعت سے مراد دین کا وہ خاص طریقہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیا ہے اور شریعت کا اصل ماخذ قرآن پاک اور سنّتِ رسول ہ قرار دے کر ان احکام کو شرعی تصور کیا گیا ہے جو امّت کے مسلّم اور مستند فقہاء نے اجماعِ امّت کے قیاس و اجتہاد کے ذریعے مستنبط کر کے مدوّن کیے ہیں۔

(۶) قرآن و سنّت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جو اہلِ بیت عظام، صحابہ کرام رضا اور مستند مجتہدین کے علمِ اصولِ تفسیر اور علمِ اصول حدیث کے مسلّم قواعد و ضوابط کے مطابق ہو"

اس کے بعد تحریر ہے کہ:

" ان دفعات کے سرسری مطالعہ سے ظاہر ہے کہ مطمحِ نظر پاکستان کے اندر قرآن و سنّۃ کی بالادستی نہیں ہے بلکہ قرآن و سنّۃ کی مخصوص آڑ میں ایک مخصوص گروہ کی مذہبی پیشوائیت کی بالادستی قائم کرنا ہے۔ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے جہاں پہلے ہی مقننّہ کوئی قانون قرآن و سنّۃ کے خلاف منظور کرنے کی مجاز ہی نہیں۔ قرار داد مقاصد آئین کا حصّہ بنا دی گئی ہے اور تمام موجودہ قوانین کو قرآن و سنّۃ کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے۔

مگر یہ قرار دینا کہ صرف انہی احکام کو شرعی تصوّر کیا جائے گا جو کسی مخصوص دَور کے فقہاء نے مدوّن کیے تھے، اجتہاد کے دروازے عملاً مستقل طور پر مقفّل کر دینے کے مترادف ہے جس کے بغیر پاکستان ایک ماڈرن اسلامی جمہوری ریاست کی بجائے تھیوکریسی پر مبنی قرونِ وسطیٰ کی ایک ایسی ریاست میں تبدیل ہو جائے گا جہاں عوام یا ان کے منتخب نمائندوں کی بجائے اقتدار عملاً مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

جناب پیر پگاڑا کا اظہارِ خیال

یہی وہ خدشات تھے جن کے پیشِ نظر مسلم لیگ کے مقتدر لیڈر جناب پیر پگاڑا صاحب نے کہا کہ:

"شریعت بِل کی منظوری پاکستان میں ایک سے زیادہ شریعتوں کی راہ ہموار کرنے کا حرفِ آغاز ہوگا۔ ہم ہر قیمت پر اس کی مذمت کریں گے اور فرقوں کے نام پر پاکستان کو تقسیم کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

پیر پگاڑا نے انتہائی دُکھ بھرے لہجہ میں کہا کہ برائے خدا پاکستان میں دین کے نام پر اتنی تقسیم مت کی جائے جس کے نتیجہ میں اب کی بار ملک کے دین کے نام پر ٹوٹنے کا خدشہ پیدا ہو جائے۔"

لیکن پگاڑا صاحب کے اس بیان پر جماعتِ اسلامی کی طرف سے شدید ردِ عمل ہُوا۔ چنانچہ ۲ جولائی ۱۹۸۶ء کو اسلام آباد میں ایک جلوس میں پیر پگاڑا صاحب کا پُتلا جلایا گیا اور اس کے جواب میں مسلم سٹوڈنٹس اور حُر جماعت کی جانب سے شدید احتجاجی مظاہرے کیے گئے۔ جماعتِ اسلامی کے خلاف نعرے لگائے گئے اُسے سامراج کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ صوبہ سندھ کے متعدد شہروں مثلاً سانگھڑ، شہداد پور، کھندو کھپرو، ٹنڈو آدم خاں وغیرہ میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ جلوس نکالے گئے اور جوابی کارروائی کے طور پر جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد کے پُتلے نذرِ آتش کیے گئے۔ (بحوالہ "طلوعِ اسلام" ستمبر ۱۹۸۶ء)

جماعتِ اسلامی کے سیکرٹری جنرل قاضی حسین احمد صاحب نے جمعیّت اہلحدیث کے سیکرٹری جنرل علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب سے اُن کی رہائش گاہ پر ملاقات کے دوران جب شریعت بِل کی منظوری کے لیے مذہبی جماعتوں کو مل جُل کر کام کرنے کے لیے کہا تو علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب[1] نے بھی انہیں یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ وہ اس کے لیے تیار ہیں لیکن موجودہ حکومت سے خیر کی کوئی توقع نہیں۔"
(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ر ستمبر ۱۹۸۶ء)

---

[1] یاد رہے کہ متحدہ شریعت محاذ کے راہنما جناب چنیوٹی صاحب کے کہنے کے مطابق احسان الٰہی ظہیر صاحب نے مولانا عبداللہ درخواستی کو خط بھی تحریر کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "میں شریعت بل سے پوری طرح متفق ہوں اور اس بل کے لیے ایک سپاہی کی طرح کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸۶/۱۱/۱)
جبکہ اس کے برعکس روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جناب احسان الٰہی ظہیر صاحب کا یہ بیان بھی شائع ہُوا کہ اہلحدیث شریعت بِل کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ (نیز یہ کہ) آئندہ اس ملک پر اہلحدیثوں کا جھنڈا لہرائے گا" اور اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر باقی تمام فرقوں والے بڑے شریفانہ طریقے سے اپنے اپنے جھنڈے سمیٹ کر گھروں کو چلے جائیں گے۔ قارئین خود ہی یہ فیصلہ کریں کہ ان مختلف بیانات کے پیشِ نظر ہم کس کو مجرم قرار دیں اپنے آپ کو یا نوجوان نسل کو۔

لیکن دوسری طرف اسی اخبار کے حوالے سے قومی اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر خواتین کے مظاہرے کے علاوہ ویمنز ایکشن فورم (خواتین محاذِ عمل) لاہور کے اجلاس میں خواتین محاذِ عمل (راولپنڈی) کی طرف سے شریعت بِل اور نویں ترمیمی بِل کے خلاف اپیل کی تائید کی اور کہا کہ: "میاں طفیل مسلمانوں کے عقیدہ اور ضمیر کے واحد محافظ نہیں۔"

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۸۶ء کے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت کے مطابق جماعتِ اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ عاملہ نے اپنی ایک قرارداد میں یہ مطالبہ کیا کہ: "شریعت بل پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں منظور کیا جائے۔"

مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین احمد صاحب کا بیان

لیکن شریعت بل کے ہی متعلق مورخہ ۲۴ ۶/۸۶ کو روزنامہ جنگ لاہور کی وساطت سے جناب مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) بشیر الدین احمد صاحب کا بیان جاری ہوا کہ:

"جن لوگوں کو شریعت کا بخار چڑھا ہوا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ شریعت بل آئے لیکن موجودہ آئین کی موجودگی میں شاید مزید کسی ایسے بل کی ضرورت نہیں۔ ایسے بِل کے آنے سے جھگڑے اور اختلافات کا امکان ہے۔"

انہوں نے مزید فرمایا کہ: "میرے خیال میں اسلام ایسا مذہب ہے جو ہمیں آگے لے جانا چاہتا ہے لیکن ہم ہیں کہ پیچھے کی طرف جا رہے ہیں۔"

مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب کا بیان

روزنامہ جنگ لاہور مورخہ یکم نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں مولانا عبدالستّار خان نیازی صاحب نے فرمایا کہ: "قیامِ پاکستان کے مخالفین اب شریعت بِل کے نام پر اودھم مچا رہے ہیں۔"

مصطفےٰ اعوان صاحب کا کھُلا خط

شروع میں جناب اصغر علی گھرال صاحب کے مضمون کے دیئے گئے اقتباس کے علاوہ جناب مصطفےٰ اعوان ایڈووکیٹ کے اس کھُلے خط کا کچھ حصہ یہاں ضرور پیش کر دینا چاہیئے جو آپ نے معزز اراکین سینیٹ کے نام تحریر کیا تھا۔ آپ کا یہ خط ہر بہی خواہ کے لیے قابلِ غور و فکر ہے۔

نفاذِ شریعت بل کی مختلف دفعات

بل میں دفعہ ۲ کی کلاز (سی) "اجماعِ اُمّہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں مگر یہ واضح نہیں کیا گیا کہ اجماع سے کیا مراد ہے؟ اور اُمّہ کا مفہوم کیا ہے؟ اُمّہ سے مراد آج کی اُمّتِ مسلمہ ہے؟ یا آج سے ہزار سال پہلے دَورِ عباسیہ کی اُمّتِ مسلمہ یا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کی اُمّتِ مسلمہ! اور اسی طرح اجماع سے مراد آج کے اسلامی قانون کے ماہرین اور سکالر ہیں؟ یا ہزار سال پہلے دورِ عباسیہ کے اسلامی قانون کے ماہرین اور سکالر یا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اور خلفائے راشدین کے زمانے کے وہ فیصلے جو اجماع کے طور پر صادر ہوئے اور وہ کہاں درج ہیں؟ کیا ان میں سے کسی دور کے اجماع کے فیصلوں کو منضبط اور مدوّن کیا گیا ہے؟ قانون کی زبان کبھی مبہم نہیں ہوتی اور اس میں ہر لفظ اور اصطلاح کا ایک متعیّن مفہوم دیا جاتا ہے۔ تاکہ قانون دان اور عدالتیں اس کے مطابق متنازعہ امور میں کوئی موقف اختیار کر سکیں۔

اس کے بعد اسی دفعہ ۲ کی کلاز (ڈی) میں کہا گیا ہے کہ تسلیم شدہ اُمّت کے مجتہدین کے قیاس اور اجتہاد کی رُو سے مُرتّب شدہ احکام، شریعت کہلائیں گے۔ اس میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ اُمّت کے تسلیم شدہ مجتہدین کون ہیں؟ آج کی اُمّتِ مسلمہ کے مجتہدین، یا ہزار سال پہلے کی اُمّتِ مسلمہ کے مجتہدین یا حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے کے مجتہدین، مجتہدین تو ہر زمانے میں رہے ہیں اور رہیں گے۔ جو اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور موجودہ واقعات کے بارے میں اپنے اجتہاد سے کام لے کر احکام صادر کرتے رہے ہیں۔ اگر ہزار سال پہلے مجتہدین اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور موجودہ مسائل کے بارے میں اجتہاد کر کے احکام وضع کر سکتے تھے تو آج کے مجتہدین بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے لیے اجتہاد کیوں نہیں کر سکتے؟ اس لیے اجتہاد کو موجودہ زمانے کے قانونی ماہرین اور اسکالرز کے لیے کھلا رکھنا پڑے گا جس میں وہ سابقہ مجتہدین کے فیصلوں کو بھی نظائر کے طور پر پیش نظر رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اجتہاد کے دروازے بند کر کے اس پر اصرار کریں گے کہ آج سے ہزار سال پہلے فقہاء نے اجتہادی فیصلوں سے جو

احکام مدوّن کر دیے ہیں انہیں من و عن نافذ کر دیا جائے تو اس سے بڑی زیادتی اس قوم کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر ہزار سال پہلے کی مدوّن شدہ فقہ میں بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کے مطابق ضروری ردّ و بدل کی اجازت موجودہ دور کے قانونی ماہرین کو نہ دی گئی تو اس سے سوسائٹی میں خلفشار پیدا ہو جائے گا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں شریعت کے ماخذ چار ہیں۔ یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ مگر میری قرآنی بصیرت میری راہنمائی کرتی ہے کہ اسلام میں قانون کا ماخذ صرف قرآنِ حکیم ہے۔ باقی تین صورتیں صرف قانون کی تدوین یا ان کے نفاذ کے طریقے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے انسان کو وحی کے ذریعے جو راہنمائی دی ہے اس کی آخری اور مکمل شکل صرف قرآن کے اندر محفوظ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے آنے والے ہر دور میں روشنی اور ہدایت فراہم کرتی رہے گی۔ قرآن میں صرف چند احکام کے علاوہ اسلامی نہج زندگی کے اصول بتائے گئے ہیں تاکہ ہر دور کے انسان اپنے اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعیّن کرتے رہیں۔ ان جزئیات کو متعیّن کرنے کا طریقہ بھی اللہ تعالےٰ نے خود ہی بتایا ہے۔ کہ اُمّت باہمی مشورہ سے اس فریضہ کو انجام دے۔ اس پر سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے عمل فرمایا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاءؓ نے ایسا ہی کیا۔ غور فرمائیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن کے اصولوں کے تحت ایک حکومت قائم کی تھی۔ آپؐ کے بعد یہی حکومت ان کے جانشینوں کو منتقل ہوئی اور چونکہ کوئی حکومت اپنے پیشرو حکومتوں کے فیصلوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتی اور ایک ہی انداز کی حکومت اگر مسلسل قائم رہے تو اس میں سابقہ حکومتوں کے فیصلوں کو قائم رکھا جاتا ہے اور سابقہ حکومتوں کے فیصلوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ یہی انداز رسول اللہؐ کے خلفاء کے زمانے میں نظر آتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ میں سنّتِ رسولؐ کی اتباع کروں گا۔ اور جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ میں سنّتِ رسولؐ اور سنّتِ ابو بکرؓ کا اتباع کروں گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد انہوںؓ نے سابقہ دور کے بعض فیصلوں میں تبدیلی کی۔ تاریخ میں ہمیں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے سابقہ دور کے بعض فیصلوں میں حالات کے مطابق ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے بھی وابستہ رہا اور حال کے

تقاضوں کا بھی ساتھ دیتا رہا۔ اگر اس انداز کی حکومت خلفائے راشدین کے بعد بھی قائم رہتی اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ آج تک قائم رہتا تو آج ہم جس اُلجھن میں گرفتار ہیں وہ بالکل نہ ہوتی۔ مگر یہ تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ ایسا نہ ہو سکا۔ دین مخصوص تصورات، مخصوص طرزِ عبادات اور چند عقائد کا نام نہیں۔ دین تو عملی زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنے کے لیے آیا تھا۔ ایک متحرک اور زندہ قوم جو تسلسلِ حیات چاہتی ہے وہ اپنے ماضی سے وابستہ ضرور رہنا چاہتی ہے۔ مگر ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ماضی سے وابستگی سے مراد یہ ہے ہم حضورؐ کے طرزِ عمل کو راہنما بنائیں۔ خلفائے راشدین کے تجربوں سے مستفید ہوں۔ اُمت کے مجتہدین کے اجتہاد کو بطورِ نظیر سامنے رکھیں۔ سابقہ دور کے فقہاء کے استدلال اور آراء کو پیشِ نظر رکھیں اور ان کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل دریافت کریں مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ غیر متبدل صرف خدا کی ذات ہے اور اس کی کتاب ہے اور اس کی روشنی میں حضور رسالتمآبؐ نے جس طرح عمل کیا، اُسی کو سُنت کہتے ہیں اور حضورؐ کی اسی سُنت کی اتباع خلفائے راشدینؓ کرتے رہے حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا۔ دوسری قوموں سے ربط و ضبط بڑھا تو کئی نئے فیصلے کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات کی گئیں۔ اس انداز کی حکومت میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس اپنے اپنے مقام پر رہتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی اُلجھن پیش آتی ہے اور نہ فرقہ بندی کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ سب کی راہنمائی کے لیے کتاب اللہ اور اس کے نفاذ کی نظیریں سنت، اجماع و قیاس۔ اور یہی مفہوم حضرت عمرؓ کے اس اعلان کا ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ۔

دفعہ نمبر ۱۲: بل کی دفعہ نمبر ۱۲ میں کہا گیا ہے کہ قرآن و سنت کی وہ تعبیر قابلِ قبول ہوگی جو اہلِ بیت عظام، حضورؐ کے صحابہؓ، مسلّم فقہائے اُمت اور شریعت کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دفعہ کے ذریعے اسلام کو ایک جامد مذہب بنانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے بڑی زیادتی اسلام کے ساتھ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ یہ دفعہ تقلید اور فرقہ پرستی کی اصل رُوح ہے اور قرآن و سنت کے مزاج کے منافی ہے۔ جن بلند ہستیوں سے منسوب قرآن و سنت کی تعبیر کو ہمیشہ کے لیے حرفِ آخر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خود ان بزرگانِ

دین نے کبھی اپنی بات کو حرفِ آخر نہیں کہا۔ قرآن خدا کا کلام اور خدا کا علم ہے۔ جس حد تک اس نے انسانوں کے لیے دیا ہے۔ نبی کے بغیر کوئی شخص اس علم کا مکمل احاطہ کر لینے کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں کچھ متعین قوانین ہیں جو بالکل واضح اور بیّن ہیں ان کی کوئی دوسری تعبیر ممکن ہی نہیں۔ اور ان پر کسی کا کوئی اختلاف بھی نہیں۔ اس کے علاوہ نظامِ زندگی کے اصول بتائے گئے ہیں۔ ان کے مطابق سب سے پہلے رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں عمل فرمایا۔ اسی کو سنتِ رسولؐ کہتے ہیں۔ انؐ کے بعد انؐ کے خلفاءؓ نے اس پر عمل کیا۔ مگر یہ سلسلہ ایک خاص دور کے بعد آگے نہ بڑھ سکا۔ چنانچہ ملت کی گاڑی اصلی سمت سے ہٹ کر دوسری سمت روانہ ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملت زوال اور انحطاط کا شکار ہو گئی — اور اس انحطاط اور زوال کے زمانے میں اسلام پر کیا گزری؟ یہ ایک داستان ہے الم انگیز اور حدیث ہے جگر خراش۔ جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ صرف اتنا بتا دوں کہ: اِیَّاکَ نَعْبُدُ (اے اللہ ہم تیرے ہی احکام کی پابندی کرتے ہیں) کے معنے ہو گئے "(اے اللہ ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں) ــ"

اس کے بعد موصوف لکھتے ہیں کہ:

"اسلامی نظام کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم متعین طور پر سمجھیں کہ اسلام کیا ہے! اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو اسلامی نظام۔ اسلامی مملکت۔ اسلامی قوانین اور اسلامی شریعت سب کچھ بآسانی سمجھ میں آجائیں گے۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ اسلام کیا ہے؟ تو اس کا جواب تو خدا نے اپنی کتاب میں چار لفظوں میں دے دیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ

یعنی جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

شریعت بل کے سلسلہ میں جناب اصغر علی گھرال کے مضمون کے بعد اس موقع پر اگر جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے مضمون کا ایک اقتباس درج کر دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ چنانچہ حقانی صاحب اپنے ہاں بل کی مختلف دفعات کو درج کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ:

"..... یہ ہے شریعت کی تعریف جو اس بل میں اختیار کی گئی ہے ظاہر ہے کہ اس میں کتاب سنت کے ساتھ ساتھ اجماع اور قیاس کو بھی شریعت کے مسلّم ماخذ قرار دے دیا گیا ہے اور بعد ازاں

مقننہ دونوں کو پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ ان چاروں ماخذوں کی پابندی کریں۔ یہ سمجھنے کے لیے کسی علمی چوٹی شرعی واقفیت کی ضرورت نہیں کہ اجماع اور قیاس کو بھی شریعت کے مسلّمہ ماخذ قرار دینے سے اختلافات کا ایک پنڈورا بکس کھل جائے گا۔ اجماع اور قیاس کی اپنی تعریف اور حدود ہی متنازعہ ہیں اور مختلف فقہوں میں اجماع اور قیاس کے اپنے اپنے اصول اور نظائر ہیں۔ شیعہ سنی اختلافات تو ایک حقیقت ہیں ہی اور ان کی وجہ سے جو پیچیدگیاں شریعت کی اس تعریف کی موجودگی میں پیدا ہونا ناگزیر ہیں۔ ان سے تو کوئی مفر نہیں ہوگا۔ لیکن خود اہلِ سنت والجماعت کے اندر اجماع اور قیاس کے حوالہ سے ان گنت اختلافات ہیں۔ حنفی فقہ کے داخلی اختلافات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے دو ممتاز ترین شاگردوں امام ابویوسف اور امام محمدؒ کے متعدد اجتہادات اور فتوے مختلف ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ تقلید کے اختلافات اجماع اور قیاس کے حوالہ سے اظہر من الشمس ہیں۔ گویا شریعت بل میں دی گئی تعریف شریعت اختلافات کا ایک نیا دروازہ کھولنے کے ہم معنی ہے۔ اور وفاقی شرعی عدالت اور دوسری عدالتوں کو شریعت کی اس تعریف کا پابند بنانے کے بعد یہ توقع کرنا کہ اختلافات اور نزاعات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا، سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔[1]"

قارئین شریعت بل کے سلسلہ میں دی گئی مختلف دفعات کے علاوہ مندرجہ بالا دیئے گئے تبصروں کے ایک ایک لفظ پر غور کریں اور اس کے بعد اس بل کی منظوری کے لیے کی جانے والی تمام تر تگ و تاز کے علاوہ مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ بھی کریں جو شریعت بل اور علماء و مشائخ کنونشن کے حوالے سے تحریر کی گئی ہیں:

شریعت بل اور علماء و مشائخ کنونشن

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو جامعہ نعیمیہ لاہور میں شریعت بل کو بلا تاخیر منظور کروانے کے لیے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب کی زیرِ صدارت علماء و مشائخ کی ایک کنونشن بھی منعقد ہوئی۔ جس میں سینیٹر قاضی عبداللطیف صاحب نے کہا کہ:

"حکومت کہتی ہے کہ شریعت بل نیا لایا جائے گا مگر وہ کون لائے گا۔ شریعت بل علماء کرام ہی مرتب کر سکتے ہیں۔" مولانا منظور احمد چنیوٹی صاحب نے فرمایا کہ:

---

[1] ان تمام حضرات کے پیش کردہ خیالات کے علاوہ قارئین اگر اس سلسلہ میں جناب عابد حسن منٹو ایڈووکیٹ اور جناب ڈاکٹر یوسف گورایہ صاحب کے قابلِ قدر خیالات سے آگاہ ہونا چاہیں تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جنگ فورم کی نشست کا ضرور مطالعہ کریں۔

"ہم شریعت بِل منظور کرانے کے لیئے آرام سے نہیں بیٹھیں گے ۔ اگر ضرورت پڑی تو اسمبلی کا گھیراؤ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جائے گا۔"

مولانا گوہر الرحمٰن مدنی نے فرمایا کہ "حکومت نے شریعت بِل منظور نہ کیا تو نئی اسمبلی بنائی جائے گی۔"

مولانا محمد اجمل خان نے کہا کہ "متحدہ شریعت محاذ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرے گا۔"

مولانا عبد الستار تونسوی نے کہا کہ متحدہ شریعت محاذ کی جانب سے شریعت بِل کے نفاذ کی جدوجہد میں کمی نہیں آنے دی جائے گی۔"

مولانا معین الدین لکھوی نے کہا کہ "شریعت بِل کی حکومتی مخالفت کا کوئی جواز نہیں اور ۱۹۷۳ء کا آئین نہ جمہوری ہے نہ اسلامی۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمایا کہ :

"آج کا اتحاد اتحاد کا منظر ہے جس میں تمام مکتبِ فکر کے علماءِ کرام موجود ہیں۔" انہوں نے کہا کہ "۴۰ سال بعد ملک میں شریعت کی طرف پہلی پیش قدمی ہوئی ہے۔"

اور اس کے بعد میاں طفیل صاحب امیر جماعتِ اسلامی نے بھی تقریر کی۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۸۶ء کی اِس کنونشن کے علاوہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ایک پریس کانفرنس بھی طلب کی گئی جس میں مفتی محمد حسین نعیمی صاحب، مولانا حافظ عبد القادر صاحب روپڑی، مولانا محمد اجمل صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، حافظ عبد الرحمان صاحب مدنی، اسماعیل قریشی ایڈووکیٹ صاحب، میاں شیر عالم ایڈووکیٹ صاحب، مولانا اشرف حکیم صاحب، اور میاں نعیم الرحمان وغیرہ نے شرکت کی۔ اس پریس کانفرنس کے دوران قاضی حسین احمد صاحب نے کہا کہ "بعض حلقوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ شریعت بِل کی دفعہ ۸ جو اجتہاد کے بارے میں ہے، اختلافی ہے۔ انہوں نے کہا کہ علمائے کرام کے بائیس نکات (ان پر پہلے تبصرہ کیا جا چکا ہے) میں دفعہ بھی وہی ہے جو شریعت بِل میں آٹھویں دفعہ رکھی گئی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۸/۱۰/۸۶)

علاوہ ازیں متحدہ شریعت محاذ کے رہنما اور رکن پنجاب اسمبلی مولانا منظور احمد چنیوٹی نے بھی روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۳/۱۱/۸۶ کو فرمایا کہ: "متحدہ شریعت محاذ نے ۲۲ نکات کو مدِنظر رکھتے ہوئے شریعت بِل مرتب کیا ہے۔"

یعنی وہی لڑ یل شق جس میں فرقہ پرستی کے زہر کو تریاق بنا کر ملت کے دسترخوان پر سجایا گیا ہے العجب۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس مذکورہ شریعت بِل کے سلسلہ میں لاہور کی در و دیوار پر لگائے جانے والے اشتہارات کے درمیان قرآن حکیم کی وہ آیت مبارکہ بھی درج تھی کہ جس کا مفہوم یہ تھا کہ آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو

خبر یہ کہ

اِس شریعت کنونشن میں سینیٹر مولانا سمیع الحق صاحب نے شریعت بل کو پیش کرنے اور منظور کروانے کی اس تمام تگ و تاز کے ماحصل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"انتخابات کے مروجہ طریقوں سے علمائے کرام اکثریت حاصل نہیں کر سکتے۔ (لہٰذا) موجودہ نظام کو بدلنے کے لیے شریعت بل پیش کیا گیا ہے۔[1]" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۷/۸)

اجتہاد کی ضرورت نہیں

ظاہر ہے کہ پچھلے بیان کردہ مسائل کو صرف نظری مسائل نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ تو زندگی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور یہ معاملات زندگی ہیں جنہوں نے صدیوں سے ملّتِ اسلامیہ پر ایک جمود طاری کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی ہمارا یہی کہنا ہے کہ:

"یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو آئمہ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور صحیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمّت محمدیہ کا اجماع ہے۔"

(بحوالہ "ایشیا" ۱۴ اگست ۱۹۷۸ء)

یہ بیان جامعہ اشرفیہ لاہور کے مفتی جمیل احمد تھانوی صاحب کا ہے جو آپ نے ایک سوال کے جواب میں دیا تھا۔

وارث میر صاحب کی بلند نگہی

جناب پروفیسر وارث میر صاحب نے شاید اسی قسم کے خیالات اور فتوؤں کے پیشِ نظر فرمایا تھا کہ:۔

---

[1] روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۸۶ء کے مطابق شریعت محاذ کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ: شریعت بل کے حق میں ملک گیر تحریک چلائی جائے گی۔

" علم وفن اور سائنس کا جب کبھی نیا جھونکا آتا ہے (تو) ہمارے علمائے دین کسمساتے ہوئے اپنے ذہنوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرلیتے ہیں لیکن زیادہ وقت نہیں گزر پاتا کہ انہیں حبس محسوس ہوتا ہے اور جوں جوں دم گھٹنے لگتا ہے تو کھڑکیاں اور دروازے توڑ دیتے ہیں اور پھر آنکھیں جھکائے یا آنکھوں پر ہاتھ رکھے بغیر وہ سب کچھ کرتے ہیں جسے چند سال پہلے کفر اور گناہ قرار دے چکے ہوتے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۸۵ء)

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی تجویز

مجمع الفقہ الاسلامی (فقہ اکیڈمی) کی تاسیس کا فیصلہ تیسری اسلامی سربراہ کانفرنس منعقدہ جنوری ۱۹۸۱ء طائف میں کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس اسلامی فقہ اکیڈمی کا ایک اجلاس ۷ تا ۹ جون ۱۹۸۱ء مکہ مکرمہ میں منعقد ہوا۔ جس کا افتتاح شاہ فہد بن عبدالعزیز نے فرمایا۔ اس اجلاس میں ۳۹ اسلامی ممالک نے شرکت کی۔ اس موقع پر پاکستانی مندوب کی حیثیت سے فقہ اکیڈمی کے لیے جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب نے جو تجاویز پیش کیں ان میں سے دیگر تجاویز کے یہ تجویز بھی شامل تھی کہ:

" یہ اکیڈمی عبادات کے متعلق کسی سوال کو اپنے ہاں زیرِ بحث نہ لائے کیونکہ عبادات کا تعلق عقائد سے ہے اور عقیدہ میں اجتہاد درست نہیں۔ چنانچہ اکیڈمی کو چاہیے کہ اپنے فتاویٰ کو معاملات تک محدود رکھے۔" نیز آئندہ لائحہ عمل کی خاطر آپ نے تجویز فرمایا کہ " اکیڈمی کو جدید زندگی کے لیے نئے انکشافات کی روشنی میں بعض مسائل مثلاً انسانی اعضا کی پیوندکاری، ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش اور وراثت کا مسئلہ، تمثیل کاری، سینما اور تصویر کشی کے مسائل وغیرہ پر رائے دینا ہوگی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

اجتہاد کے اس قدر جمود کے علاوہ یہ ہیں وہ " اہم ترین سوالات اور مسائل" جن میں ملتِ اسلامیہ صدیوں سے الجھی چلی آرہی ہے۔

صدر ایوب خاں مرحوم کی ایک یادگار تقریر

ہمارا یہی وہ انحطاط تھا جس کی بنا پر صدر ایوب خاں مرحوم کو ۹ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جامعہ اسلامیہ

بہاولپور کی افتتاحی تقریر کے دوران کہنا پڑا کہ :

"ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں ۔"

اور اس سے پیشتر مئی ۱۹۵۹ء میں دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں علماء کے ایک اجتماع سے انہوں نے جو خطاب کیا وہ ہر صاحب بصیرت کے لیے غور و فکر کا متقاضی ہے یعنی یہ کہ :

"کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ مذہب نہیں تھا بلکہ ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے ۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر اس کی جد و جہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی ۔" (پاکستان ٹائمز ۔ ۳ مئی ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد انہوں نے کہا :

"جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی ، اس کے متبعین دنیائے سائنس اور علمی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گزرنے کے بعد مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کر دینے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج حائل ہو گئی ۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کیے جا رہی ہے ۔ اسلام اس تفریق یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت کو مٹانے کے لیے آیا تھا لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے ۔" (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ :

"جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی بہرحال کسی نہ کسی سمت چلتی رہتی ہے ۔ لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے ، نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت ۔ یہ جامد اور متحجر مذہب زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا ۔ انسانیت سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہے لیکن ہمارا مذہب ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے ۔ اسلام کا معجزہ

یہ تھا کہ اس نے بُت پرستی کا خاتمہ کر دیا لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بُت بنا دیا۔" (ایضاً . . . . .)

اِس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"مذہب کو یوں بُت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملّی ذہنیت اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصرِ حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اُٹھایا ان پر "دنیادار مسلمان" کی مہر ثبت کر دی گئی اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ پکے اور سچے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئے اقدام، ہر نئی ایجاد، ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شور برپا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔ (ایضاً . . . . .)

اور آخر پر اپنے اِس دعوے کی شہادتیں پیش کرتے ہوئے صدرِ مملکت نے علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی کہ:

"میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے صرف اِس لیے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اِس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن علم و بصیرت کا حریف بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔" (ایضاً . . . .)

اس کے بعد اپنے استفہامیہ انداز میں ان چند ایک وجوہات کا ذکر کیا جن کی وجہ سے اسلام الیا ترقی پسند اور زندہ دین جامد بن کر رہ گیا۔ آپ نے سوال کیا:

"۱۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے اور الیا معاشرتی

اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ہے۔

۲- یا ہم نے اپنے دین کو جنوں فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

۳- یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے۔

۴- یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔" (ایضاً......)

چنانچہ ان سوالات کے پیشِ نظر انہوں نے علماء حضرات کو ایک مشورہ دیا اور فرمایا کہ:

"یہ سوالات بہت اہم ہیں اور ہمارے لیے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کا سراغ لگائیں جنہوں نے اسلام کی برق آسا شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقینِ محکم کے ساتھ بے باکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔"

پرویز صاحب سے حنیف رامے کا انٹرویو

قبل اس کے کہ ہم زیرِ نظر کتاب کے کسی دوسرے باب کا مطالعہ کریں۔ اس موقع پر آج سے ۱۲ سال قبل کے ایک انٹرویو[1] کا ذکر کر دینا ضروری خیال کیا گیا ہے جو حنیف رامے صاحب (سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب) نے جناب غلام احمد پرویز صاحب (مرحوم) سے لیا تھا۔ چنانچہ جناب رامے صاحب نے آپ سے سوال کیا کہ:

---

[1] اس انٹرویو کا ذکر دوسرے مقام پر بھی آ چکا ہے۔

قرآن عظیم کے ایک ورق گردان کے طور پر میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اسلام کی تعلیم سیاست، معاشرت اور معیشت کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے سے ایسی ہی قاصر ہے کہ اس پر ہمارا ایمان جمتا ہی نہیں اور ہم کبھی اس چیز کی اور کبھی اس چیز کی بھیک مانگتے پائے جاتے ہیں؟ اور کیا قرآن کے بے بدل الفاظ، ہمہ وسعت معانی، اس کے محکمات و متشابہات اس امر کی کفایت نہیں کرتے کہ ہمیں بنیادی باتوں پر متفق کر کے ہمارے لیے خدا کی وحدت آفریں رسی اور عروۃ الوثقیٰ بن جائیں۔ وہ علامات بن جائیں جو زمین پر خدا کے بندوں کو امید سے ہم کنار رکھتی ہیں۔

پرویز صاحب: حنیف صاحب! آپ نے جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے اور تفصیلی جواب کا متقاضی۔ اس کا تعلق کسی ہنگامی تحریک یا دورِ حاضر کے تقاضوں سے نہیں۔ اس کا تعلق ہماری ہزار سالہ تاریخ سے ہے۔ ہمارے قرنِ اوّل میں جب اسلام کا لفظ بولا جاتا تھا تو ہر ایک کے ذہن میں اس کا ایک ہی تصور ہوتا تھا اور عملی زندگی میں اس سے ایک ہی مفہوم لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام مسلمان ایک امت تھے۔ ان کا ایک نظام تھا۔ سب کے لیے ایک قانون تھا۔ اس کے بعد جب (بدقسمتی سے) ہماری گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو امت کی وحدت ختم ہو گئی۔ اس میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ (حالانکہ فرقہ بندی کو قرآن کریم نے بالفاظِ دیگر شرک قرار دیا ہے) ہر فرقے نے اپنی فقہ الگ مرتب کر لی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک قانون مرتب ہونا ناممکن تھا۔ یعنی ایک ایسا ضابطۂ قوانین جس کا اطلاق تمام فرقوں کے مسلمانوں پر یکساں ہو۔ اس مشکل کے حل کے لیے سوچا یہ گیا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا جائے (یعنی فرقہ بندی کے شرک کی پیدا کردہ خرابی کے حل کے لیے ایسا علاج سوچا گیا جو اسلام کے نقطۂ نگاہ سے صریح کفر ہے)۔ سیاست سے متعلق قوانین اربابِ حکومت کے حوالے کر دیئے گئے اور پرسنل لاز (شخصی قوانین) اربابِ مذہب کی تفویض میں دے دیئے گئے اور ہر فرقے کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق اپنے شخصی معاملات (نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق

معاملات کے فیصلے کر لیا کریں۔ اِس سے اربابِ حکومت بھی خوش ہو گئے کہ ان پر کسی قسم کا کنٹرول نہ رہا اور اربابِ مذہب بھی راضی کہ ایک دائرے کے اندر ان کا اقتدار قائم رہا۔ نقصان صرف اتنا ہُوا کہ اس سے وہ اسلام باقی نہ رہا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں تھا۔ ہر ایک کا "اسلام" الگ الگ ہو گیا۔ ذرا سے غور کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ انسانی ہئیتِ اجتماعیہ کی یہ وہی شکل ہے جسے آج کل کی اصطلاح میں سیکولر فارم (SECULAR FORM) کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام کی اس شکل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے اور اسے بعینہٖ قائم رکھنے کے مطالبے کو اقامتِ دین قرار دے دیا جائے تو پھر ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ جن کی طرف آپ نے اپنے سوال میں اشارہ کیا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کے لیے فی الواقعہ کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو سکے۔

لیکن ان اعتراضات کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ان میں مروجہ اسلام کو حقیقی اسلام تصور کر لیا گیا ہے جسے کا نتیجہ یہ ہے کہ جو اعتراضات موجودہ (غیر اسلامی) اسلام کے خلاف ہونے چاہئیں وہ (حقیقی) اسلام پر عائد کر دیئے گئے ہیں ایک عامی کی طرف سے اس قسم کی غلط نگہی کا مظاہرہ قابلِ فہم ہو سکتا ہے لیکن جب اِس قسم کی باتیں قوم کے دانش مند طبقے کی طرف سے سامنے آئیں تو اس سے افسوس ہی نہیں، صدمہ ہوتا ہے۔ جب علامہ اقبال نے ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا تو انہوں نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> "مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوستان اور اسلام دونوں کے لیے منفعت بخش ہوگا۔ ہندوستان کو اس سے اس حقیقی امن اور سلامتی کی ضمانت مل جائے گی جو قوتوں کے توازن کا فطری نتیجہ ہو گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپے کو مٹا سکے جو عرب ملوکیت نے اس پر زبردستی لگا رکھا ہے اور یہ اس قابل ہو سکے گا کہ یہ اپنے قوانین تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر آنے کے قابل بنا سکے۔" ۔۔۔ اس کے بعد فرمایا:

"ہمارا مروجہ اسلام وہی ہے جس پر عرب ملوکیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لہٰذا پاکستان کی تشکیل سے مقصود یہ تھا کہ اس میں مروجہ اسلام کی جگہ نبی اکرمؐ کے عطا فرمودہ اور عملاً قائم کردہ اسلام کو از سرِ نو زندگی اور حرکت عطا کی جاسکے۔ سطح بین نگاہوں، اور تقلیدی جمود میں جکڑے ہوئے قلوب و اذہان کے لیے یہ سمجھنا واقعی مشکل ہے کہ مروجہ اسلام کی خاردار وادیوں سے نکل کر صحیح اسلام کی طرف آنا کیسے ممکن ہے، لیکن جو حضرات اس سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں ان کے سامنے کوئی دقت نہیں رہتی سابقہ اقوام کے زمانے میں ایسے وقت میں خدا کی طرف سے ایک نیا نبی آجایا کرتا تھا۔ جو خدا کی طرف سے عطا کردہ دینِ خالص میں ملے ہوئے انسانی نظریات و تصورات کو الگ کر کے، دینِ خالص کو پھر سے قوم کے سامنے لے آتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد خدا کی طرف سے اس کا انتظام یہ ہوا کہ اس نے اپنی کتاب (قرآن کریم) کو جس میں دینِ خالص اپنی حقیقی منزہ اور مکمل شکل میں دیا گیا ہے، محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ چنانچہ یہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ خالص اسلام کو پھر سے نظامِ حیات بنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہم اپنی حیاتِ اجتماعیہ کو قرآن کریم میں عطا کردہ خطوط پر متشکل کر لیں۔ قرآن کریم پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے یہی ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس لیے اگر خدا کی اس کتابِ عظیم کو اساس تسلیم کر لیا جائے تو اُمت میں پھر سے وہی وحدت پیدا ہو سکتی ہے جو عہدِ نبی اکرمؐ میں وجہ سرفرازیٔ اُمت تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا تھا کہ "مسلمانوں کو موجودہ الجھاؤ سے نکالنے کے لیے ایک ایسے جرأت مند قلب کی ضرورت ہے جو عمرؓ کی روح کو لیے ہوئے اُٹھے اور اس کا اعلان کر دے کہ: "حسبنا کتاب اللہ" ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔"

(بحوالہ "طلوع اسلام"، جنوری ۱۹۶۶ء)

"سچ تو یہ ہے کہ ہم نے اشخاص کی تعمیر کی لیکن قوم سے غفلت برتی ہم نے شہر تعمیر کیے لیکن ملک سے غفلت برتی۔ بالفاظِ دیگر" ہم نے سمجھا کہ ایک اچھا ملک اچھے شہروں کا مجموعہ ہوتا ہے اور اچھے شہر عمدہ عمارات کا مجموعہ اور عمدہ عمارات عمدہ سنگ و خشت کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ پورا ملک سنگ و خشت کا

ایک حسین ڈھیر (تو) بنتا چلا گیا" (لیکن شکوہِ دین کی طرف توجہ نہ دی)۔"

جبکہ شکوہِ دین کی یہ حسین و جمیل عمارت ہمارے لیے اس وقت تک فردوسِ نگاہ بن نہیں سکتی جس وقت تک رانشڈل کے الفاظ میں ہم اس بنیادی اصول کو تسلیم نہ کریں کہ:

"جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے جس میں کیریکٹر ہی نہیں۔"

بریڈ نے تو کیا خوب کہا ہے کہ: "جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے، سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاودان کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا۔"

انسانی عقل کے ان کوہ پیماؤں کے بعد جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے تو اس نے تو چودہ سو سال پیشتر تقلید پسندوں کی نفسیات کے پیشِ نظر فرما دیا تھا کہ:

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحیِ خداوندی کا اتباع کریں تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے۔"

جیسا کہ آپ سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک مطالبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں (اکثریت کے باعث) فقہ حنفی کی بنا پرستی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی جائے لہٰذا فقہ کے اس باب کا اختتام ہم اسی نکتہ پر علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت سے استفادہ کے ساتھ کرتے ہیں جس کا ذکر جناب ارشد میم صاحب نے (جولائی ۱۹۸۶ء میں روزنامہ جنگ کی وساطت سے) اقساط پر پھیلے ہوئے اپنے ایک فکر انگیز مضمون "نویں آئینی ترمیم اور شریعت بل" کے عنوان کے تحت کیا ہے۔

علامہ اقبال در اصل فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر اُسے مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کرنے کے حق میں تھے اور یہی وجہ ہے کہ آپ مسلمانوں کو خالص سُنّی مملکت کے قیام کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

"اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانے کے جدید تقاضوں اور اقوامِ مغرب کے سیاسی تجربے سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان ممالک کی روح جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالس قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ امت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہب فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حقِ اجتہاد چھین کر اسے مسلمانوں کی مجلس قانون کو تفویض کر دیا جائے۔"

اسمبلی کے ذریعے اجتہاد کی تجویز کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کی مجالس قوانین ساز بنائی جائیں گی۔ ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانون شریعت کی تعبیرات کی غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدِ باب یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں ایران نے اپنے ۱۹۰۶ء کے دستور مملکت کی رو سے ایسے علماء کی جو "امورِ دنیا سے باخبر ہوں" ایک کمیٹی قائم کی تھی تاکہ وہ مجلس قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی"۔

چنانچہ ایرانیوں کے تصورِ امام غائب کی مجبوریاں بیان کرنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں: "بہرحال ایران کا نظریہ دستور کچھ ہی ہو یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں۔ اگر کوئی سُنّی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے، تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو مجالس قانون ساز کا رکن بنا دیا جائے تاکہ وہ قوانینِ شریعت پر آزادانہ بحث وتمحیص میں دوسروں کی معاونت اور راہنمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدِ باب کا مؤثر طریقہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصول قانون سازی کو طلبہ کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔"

جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب اپنے ایک قسط وار مضمون "پاکستان، اقبال اور اجتہاد" میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ

علامہ اقبال کے نزدیک نامزد ادارے کی مخالفت کی وجہ جواز

"علامہ اقبال نے قوم کے منتخب قانون ساز ادارے کی بالادستی کے پیش نظر کسی بھی نامزد ادارے کی مخالفت کی ہے اس مخالفت کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نامزد ہونے والے اپنے نامزد کرنے والے کی منشا اور مرضی کے خلاف نہیں جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ نامزد کرنے والے کے اپنے افکار اور نظریات ہوتے ہیں نامزدگی سے قبل وہ اپنا پورا اطمینان کر لیتا ہے کہ ایسے افراد نامزد ہوں جو اس کے افکار اور تصورات کی ترجمانی کریں اور اگر وہ اس کے خلاف عمل کریں تو انہیں بدلا جا سکے۔ جیسا کہ وفاقی شرعی عدالت کے ایک سابق چیف جسٹس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ایسا

انتظام بھی ممکن ہے کہ تبادلے کی نوبت ہی نہ آئے۔ لہٰذا نامزد ادارے کے افراد اپنے نامزد کرنے والے کے تابع بن کر رہ جاتے ہیں یہ عمل قوم کے مجموعی مفاد اور دینی مقاصد کے خلاف ہے بالخصوص اگر شریعت کی تعبیر کا اختیار نامزد افراد کو دے دیا جائے تو دین اور شریعت ان کی سوچ کے تابع بن کر رہ جاتے ہیں ایسے نامزد اداروں کی سوچ و فکر میں سوائے چند نامزد افراد کے قوم بحیثیت مجموعی شریک نہیں ہو سکتی جیسے وہ پارلیمنٹ کے "بلوں" کی بحثوں میں شریک ہوتی ہے یہ لوگ اپنے آپ کو خدا کے خود ساختہ نمائندے تصور کرنے لگ جاتے ہیں اسی کا نام تھیوکریسی ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اس پس منظر میں دیکھا جائے تو علامہ اقبال کا اجتہاد مبنی بر صحت معلوم ہوتا ہے جس میں انہوں نے قوم کی منتخب پارلیمنٹ پر نامزد مذہبی مشاورتی کونسل کی بالادستی کی مخالفت کی ہے اسی طرح اگر علامہ اقبال" آج زندہ ہوتے تو وہ یقیناً پارلیمنٹ پر وفاقی شرعی عدالت کی بالادستی کی بھی مخالفت کرتے کیونکہ یہ بھی نامزد ادارہ ہے"۔

لہٰذا علامہ اقبال کی تعلیمات کے پیش نظر وفاقی شرعی عدالت کو یہ اختیار نہیں دیا جانا چاہیئے کہ وہ کسی قانون کے متعلق فیصلہ دے کہ وہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں۔ یہ اختیار قوم کی نمائندہ پارلیمنٹ کو حاصل ہے یا کسی خاص مسئلے پر ایسا اختیار سپریم کورٹ کو دیا جا سکتا ہے جو ایک باقاعدہ عدالت ہے جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کی تشریح کرتی ہے۔ قوم کے نمائندہ ادارے کو خود مختار رہنا چاہیئے اس پر کسی نامزد ادارے کی بالادستی درست نہیں۔

یہ کچھ تحریر کرنے کے بعد جناب یوسف گورایہ صاحب اسی مضمون میں رقمطراز ہیں کہ:

"جب تعبیر شریعت کا اختیار قوم کی منتخب پارلیمنٹ کے سپرد ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں صرف ارکان پارلیمنٹ غور و فکر کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ قوم کو درپیش مسائل قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتے ہیں کتاب و سنت کی تعلیمات کے مطابق صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے غور و فکر اور عقل و تدبر سے کام لیتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے باہر پوری قوم اپنے نمائندوں کی بحثوں اور حجتوں کو دیکھتی اور پرکھتی ہے۔ اپنے علم اور تجربے سے نمائندوں کی مدد کرتی ہے ہر طبقے کے فقہاء، علماء، اساتذہ، وکلاء، قضاۃ، حکام، عمال اور اہل علم و دانش اپنی تحقیق کے ساتھ اس عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ منتخب نمائندوں اور قوم کی مجموعی فکر ایک خاص اسلوب میں ڈھل کر قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہے اس پورے عمل کا نام پارلیمنٹ کا اختیار تعبیر شریعت ہے اگر خدانخواستہ پوری قوم اپنے منتخب نمائندوں اور خود اپنی مجموعی

اجتہادی صلاحیت سمیت گمراہ رہتی ہے تو ایسی قوم کے وجود کا سرے سے کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔"

آپ مندرجہ بالا حقائق پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں عام انتخابات کے سلسلہ میں " اسلامی جمہوری اتحاد " کی طرف سے اخبارات میں جو منشور شائع ہوا اس کی صرف ایک شق ملاحظہ فرمائیں کہ

وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ کار میں وسعت پیدا کی جائے گی ، اس وسعت پذیری سے کس قسم کا نظام معرض وجود میں آئے گا اس کا اندازہ ہر کوئی اپنی اپنی دانست کے مطابق لگا سکتا ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور - مورخہ ۸۸ - ۱۱ - ۱۵)

فقہ اسلامی کی تشکیل جدید پر علامہ کا اجتہاد

بہر حال فقہ کی تشکیل جدید کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے شدید احساس نے علامہ اقبال کو پریشان کر رکھا تھا اگر قارئین کو علامہ اقبال کی اس فکرمندی کا کچھ اندازہ کرنا مقصود ہو تو ہماری التماس ہے کہ وہ جناب گردایہ صاحب کے مضمون پاکستان ، اقبال اور اجتہاد کا مندرجہ ذیل اقتباس کا بغور مطالعہ فرمائیں ۔

فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلہ میں اقبال کا قلب حساس

" آخری عمر میں علامہ اقبال - فقہ کی تشکیل جدید کے شدید احساس میں مبتلا تھے ۔ وہ اسلام کی نئی فقہ مرتب کرنے کے شدید طور پر آرزومند تھے ۔ انہوں نے " تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ " بزبان انگریزی میں جو کتاب لکھی تھی اس میں دور جدید میں اجتہاد کے اصول بیان کر دیئے تھے ۔ یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں مکمل ہو گئی تھی اس کے دو سال بعد ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ایک جدید اسلامی ریاست ..... پاکستان کے قیام پر مبنی اجتہاد پیش کیا ۔ ان کا یہ اجتہاد اتنا مقبول ہوا کہ برصغیر کے مسلمان اسے عملی شکل دینے کے لئے بے تاب و بے قرار ہو گئے ۔ اس سے علامہ اقبالؒ کو یقین ہو گیا کہ پاکستان معرض وجود میں آکر رہے گا ۔ اس یقین نے انہیں مزید بے چین کر دیا ۔ انہیں احساس تھا کہ جب پاکستان بن جائے گا تو اسے نئی فقہ کی ضرورت ہو گی ۔ نئی فقہ نئے اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں ، نیا اجتہاد ، اجتہاد کے باعث نئے اصول چاہتا ہے قدیم فقہ اور اس کے اصول فقہ نئے اجتہاد کے لئے کارآمد نہیں رہے تھے ۔ انہی احساسات کے انہوں نے نئے اجتہاد پر مبنی نئی فقہ مرتب کرنے کے لئے عملی اقدامات کئے چونکہ اس وقت اسلامی ریاست قائم نہ تھی اور نہ ہی اسلامی پارلیمنٹ موجود تھی ۔

علامہ اقبال کا تیار کردہ اجتہادی منصوبہ

اس لئے انہوں نے آئندہ قائم ہونے والی جدید اسلامی ریاست میں کئے جانے والے اجتہاد کے رہنما اصول وضع

کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ انہوں نے اس منصوبے کا خاکہ خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا جو انہوں نے جناب میاں محمد شفیع (م۔ش) کے سپرد کیا تاکہ اس کی تفصیلات انہیں املا کروا سکیں۔ علامہ اقبال کا یہ اجتہادی منصوبہ جناب بی اے ڈار کی محنت اور کوشش سے اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL میں چھپ چکا ہے اس کی تفصیل جناب میاں محمد شفیع کی انگریزی تحریر کے اردو ترجمے کی صورت میں پڑھیئے وہ لکھتے ہیں "۱۹۳۷ء میں مجھے علامہ اقبال کے منشی کی حیثیت سے کام کرنے کی سعادت حاصل تھی، انہوں نے مجھے کچھ کاغذات مرحمت فرمائے جو خود ان کے قلم سے لکھے ہوئے تھے۔ یہ اس منصوبے کا خاکہ تھا جس پر وہ ایک کتاب "مقدمہ مطالعہ اسلام بحوالہ خصوصی فقہ اسلامی" کے نام سے لکھنا چاہتے تھے چونکہ ان کی بینائی دن بدن کمزور ہو رہی تھی اس لئے ان کا ارادہ یہ تھا کہ اپنی زیر نظر کتاب کو مجھے املا کرا دیں۔ یہ انگریزی کتاب اسلامی سیاست اور اسلامی فقہ کے متعلق ایک عہد ساز اور مستند کتاب ہوتی لیکن افسوس کہ ان کی صحت اس تیزی سے خراب ہوتی گئی کہ وہ اپنے اس منصوبے کو مکمل نہ کر سکے حتیٰ کہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ان کی شمع حیات بجھ گئی۔ یہ منصوبہ ابتداءً والی بھوپال نے حضرت علامہؒ کے سپرد کیا تھا اس وقت سے علامہ کے نوٹس پر مبنی یہ منصوبہ میرے پاس قومی امانت کے طور پر تھا۔ ایک دفعہ یہ منصوبہ قائداعظم کے علم میں آیا انہوں نے ۴ مارچ ۱۹۴۳ء کو مجھے لکھا کہ "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید THE RECONSTRUCTION OF ISLAMIC JURISPRUDENCE کے متعلق اقبال" جو کتاب لکھنا چاہتے تھے میں اس کے متعلق ان کے منصوبے کے نوٹس دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ اس کے بعد میں اس پر غور کر سکوں کہ کون سی قابل شخصیت ایسی ہے جو اس کام کی تکمیل کر سکے گی۔ چونکہ موضوع کا تعلق فقہ اسلامی سے ہے اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی قانون دان اس کا حق ادا کر سکے گا" چونکہ حضرت علامہ کا یہ منصوبہ پنسل سے لکھے ہوئے نوٹس پر مشتمل تھا اس لئے مرورِ زمانہ سے ان کے نقوش مدہم پڑتے چلے جا رہے تھے ۱۹۴۷ء میں جب میں سنٹرل جیل ملتان میں نظربند تھا تو میں نے ان کے نوٹس کو اپنے قلم سے الگ لکھا تھا۔ اب میں یہ نوٹس بغیر کسی رد و بدل کے قوم کے سپرد کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ جو حضرات اس کی استعداد رکھتے ہوں وہ حکیم الامت کی منشا کے مطابق ایک ایسی کتاب تصنیف کر سکیں جو ہماری حیات ملی میں ایک زندہ عنصر کی حیثیت رکھتی ہو۔" اجتہاد کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کی مجوزہ کتاب پر جناب میاں محمد شفیع کی تعارفی تمہید یہاں ختم ہوتی ہے اس کے بعد پوری کتاب کا مفصل اور جامع خاکہ درج کیا گیا ہے یہ پوری کتاب اہم ترین ملی سرمایہ ہے مگر افسوس ہے کہ اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اگر علامہ اقبالؒ کے وضع کردہ خطوط پر یہ کتاب مکمل ہو جاتی تو آج پاکستان کی بہت سی دستوری، قانونی، فقہی اور عدالتی مشکلات آسان ہو جاتیں۔ اس کتاب کے خاکہ مضامین میں تین باتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ اول اسلام کیا ہے؟ اس سے شریعت کی تعریف متعین ہوتی ہے۔ دوم ابتداء میں رومی اور ایرانی تہذیبوں نے اور بعد میں دوسری تہذیبوں نے اسلام پر کیا اثرات مرتب کئے۔ مسلمانوں نے رومی اور ایرانی سلطنتوں کو تو تباہ کیا مگر خود ایک عرب سلطنت قائم کر لی۔

اس طرح ملوکیت کے زیر اثر جو اسلامی فقہ معرض وجود میں آئی وہ اصل اسلام سے مختلف اور اس پر اضافے کی تہہ ہے جسے ہٹائے بغیر اصل اسلام سامنے نہیں آ سکتا۔ سوم داخلی اور خارجی اثرات کی تہہ سے اسلام کو نجات دلانے کے لئے منہاجِ تحقیق اور اصولِ اجتہاد و استنباط کا طریق کار بیان کیا گیا۔

میں نے محترم میاں محمد شفیع صاحب سے علامہ اقبالؒ کی کتاب پر تفصیلی گفتگو کی۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہ بقیدِ حیات اور خوب چاک و چوبند ہیں۔ انھوں نے فقہ اسلامی کی تشکیل جدید پر جو مزید معلومات فراہم کیں وہ انتہائی بصیرت افروز ہیں۔ ان کی بنیاد پر اس نظریئے کو کلی طور پر تقویت پہنچتی ہے کہ علامہ اقبالؒ اجتہاد کے لئے نئی فقہ مرتب کرنے پر پوری مستعدی سے عمل پیرا تھے۔ علامہ اقبال کی نثری اور شعری تعلیمات کی روشنی میں اس خاکے کی تکمیل ممکن ہے کیونکہ بنیادی بات اصول و قواعد فقہ کی ترتیب اور توضیح ہوتی ہے۔ ایک مجتہد جب اپنے اجتہاد کے اصول اور استنباط کے قواعد و ضوابط بیان کر دے تو اس کا اساسی اور اصولی کارنامہ مکمل ہو جاتا ہے۔ علامہؒ نے اصول و قواعد کی حد تک اپنی مطبوعہ کتاب اور زیر نظر کتاب میں اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ ان اصولوں کی رہنمائی میں ایک مفصل اور جامع کام مکمل کر لینا مشکل نہیں۔

فقہ کی تشکیل جدید کے متعلق قائد اعظم کی خواہش

ان اصولوں کی رہنمائی میں ایک مفصل اور جامع کام مکمل کر لینا مشکل نہیں اسی لئے قائد اعظم نے علامہ کی کتاب "فقہ اسلامی کی تشکیل جدید" کے اصولوں پر مبنی خاکہ طلب کر کے اسے مکمل کروانے کا ارادہ کیا تھا مگر تحریک پاکستان کی بے پناہ مصروفیت کے سبب وہ اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ قیام پاکستان کے بعد علامہؒ کے اجتہادات کے مطابق دستور سازی اور قانون سازی کا کام انجام پانا تھا مگر قائد اعظم کی جلد وفات کے سبب ایسا نہ ہو سکا اب فوری طور پر اسے مکمل کیا جانا چاہیئے۔

تعبیرِ شریعت کا اختیار اسمبلی کو کیوں؟

پاکستان کی مشہور اور علمی شخصیت جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ سابق ڈائریکٹر محکمہ اوقاف نے اپنے ایک فکر انگیز مضمون "جدید اسلامی ریاست میں تعبیرِ شریعت کا اختیار" کے عنوان سے علامہؒ کے حوالہ سے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ تعبیرِ شریعت کا اختیار اسمبلی کو کیوں؟ چنانچہ جناب گورایہ صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اس سلسلہ میں علامہ اقبال کا جواب یہ ہے:

"اب وقت آ گیا ہے کہ فقہی مسلکوں کے غیر منتخب نمائندوں سے اختیار اجتہاد لے کر اسے قوم کی منتخب اور نمائندہ اور قانون ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فقہ نے دور ملوکیت اور استعمار کی پیداوار ہیں۔ اب جمہوریت کا دور ہے۔ چوتھے خلیفہ راشد کی وفات کے بعد عہد بنو امیہ اور بعد میں بنو عباس میں تعبیرِ شریعت کا اختیار امت سے فقہی مسلکوں اور فرقوں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تعبیرِ شریعت کا اختیار فقہی مسلکوں کے افراد سے لے کر قوم کو منتقل کر دیا جائے۔ جو اس کی اصل اور جائز حقدار ہے وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے اس کا

استعمال کرے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ متحارب فرقوں کی موجودگی میں عہدِ جدید میں یہی واحد شکل ممکن ہے جو اجتہاد اختیار کر سکتا ہے اور صرف اسی طریقے سے قانون سازی میں عوام کی شرکت کو یقینی بنایا جا سکتا ہے کیونکہ عوام ریاست و معاشرت کے معاملات میں گہری بصیرت کے مالک ہوتے ہیں اور ان کی شرکت کے بغیر قانون سازی بے جان اور بے نتیجہ رہتی ہے۔" ؎

اس اقتباس کے بعد جناب وارث میر صاحب علامہ اقبال کی اس مومنانہ فراست کو بیان کرنے کے بعد اپنے مضمون کو جن الفاظ میں ختم کرتے ہیں امتِ واحدہ کی تشکیل کی خاطر اُن پر ہم سب کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے اور وہ یہ کہ :

"کاش نظریاتی کونسل یا شریعت بل کے مجوزین کی طرف سے اس قسم کی تجویز بھی پیش کی جاتی کہ پاکستان میں دینی اور دنیوی تعلیم کی ثنویت ختم کر کے یکساں نظامِ تعلیم رائج کر دیا جائے تاکہ ہماری درس گاہوں سے ایسے "علماء" بھی پیدا ہونے لگیں جو دینی حکمتوں کا علم رکھنے کے ساتھ جدید سائنٹفک ذہن بھی رکھتے ہوں۔ اور جو قوم کی تخلیقی و اجتہادی قوتوں کے لیے واقعی مہمیز ثابت ہوں اور ہماری فکری اور عملی زندگی میں تضادات کو ہوا دینے کی بجائے تضادات کو ختم کرنے کا باعث ثابت ہوں۔"

فرمودۂ اقبالؒ

" تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطرتی مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہُوا ہے اور ہم بوڑھوں کے لیے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ پھر نئی آرزوؤں اور نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔"

کس قدر خوب ہیں یہ الفاظ ملک کے مشہور شاعر جناب احمد فراز صاحب کے کہ " انسان اُجڑے شہر بسا سکتا ہے (لیکن) تباہ حال نسل سنوارنا مشکل ہے۔" اور یہ مشکل کام صرف اور صرف کتاب اللہ کی راہنمائی سے ہی آسان ہو سکتا ہے فقیہوں کے نفاذ سے نہیں۔

مقامِ فقہ کی اس داستان کے بعد اب ہمیں مقامِ حدیث کی طرف رجوع کرنا ہوگا تاکہ دیکھ لیا جائے کہ ہم اس میدان میں کہاں کھڑے ہیں۔

؎ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ نومبر ۱۹۸۶ء

تیسرا باب

کتاب و سُنّت

فقہ کے تذکرہ کے بعد اب اگر ہم سُنّت کی وادی میں قدم رکھیں تو یہاں بھی ہمیں ہر فرقہ اسی قدر اختلافات میں مبتلا دکھائی دیتا ہے جس قدر فقہ اور حدیث میں۔ حقیقت یہ ہے کہ کتاب و سنّت کے الفاظ جس عقیدت مندی کے ساتھ ہمارے ہاں زبان زدِ عام ہیں شاید ہی کوئی دوسرا لفظ تواتر کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہو۔

ملکی قانون

آپ کو ہر محراب و منبر سے یہی آواز سُنائی دے گی کہ پاکستان کا قانون کتاب و سنّت کے مطابق بنایا جائے گا۔ حتیٰ کہ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دونوں آئینوں میں یہ شق موجود ہے کہ ملک کا قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا اور اس کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور ۱۹۷۳ء کی شق (آرٹیکل) (۱) ۲۲۷ میں بھی کہا گیا ہے کہ :

"تمام موجودہ قوانین کو اِن اسلامی احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن و سنّت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو اِن احکام کے خلاف ہو۔"

مختلف منشوروں میں کتاب و سنّت کا ذکر

علاوہ ازیں ۱۹۶۹ء کے انتخابات کے سلسلہ میں سیاسی جماعتوں کے منشوروں کو اگر دیکھا جائے تو کالعدم جماعتِ اسلامی اور کل پاکستان جمعیۃ علمائے اسلام کے اسلامی منشور میں بھی یہی الفاظ نظر آئیں گے کہ قرآن سنّت کو بہ الفاظ صریح قانون کا ماخذ اوّل تسلیم کیا جائے بلکہ ۳۱ علماء کے بائیس نکات (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) میں تو بار بار قانونی حیثیت سے کتاب و سنّت کے الفاظ کو پیش کیا گیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس چیز کو قانون کا ماخذ قرار پانا ہو وہ تحریر متفق علیہ شکل میں موجود ہونی چاہیئے لیکن اِس قدر تکرار اور اہمیت کے بیان کرنے کے باوجود حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ جہاں تک کتاب کا تعلق ہے (یعنی قرآن) وہ تو ہر فرقہ کے لیے پوری ملّتِ اسلامیہ کے پاس تحریری طور پر

دنیا کے کونے کونے میں بغیر کسی ردو بدل کے محفوظ اور مکمل شکل میں متفق علیہ حیثیت سے موجود ہے لیکن جہاں تک سنّت کا تعلق ہے وہ پورے کرۂ ارض پر کہیں بھی ان خصوصیات کے ساتھ بغیر کسی ردو بدل کے محفوظ، مکمل اور متفق علیہ کتابی شکل میں موجود نہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف بالآخر مودودی صاحب (مرحوم) کو بھی کرنا پڑا کہ:

مودودی صاحب کا اعتراف

"کتاب وسنّت کی کوئی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے نزدیک متفق علیہ ہو۔" (بحوالہ ایشیا - مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

اس اعتراف کے باوجود

لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس حقیقت کو سمجھنے، سوچنے اور اعتراف کرتے ہوئے بھی خود مودودی صاحب تادمِ زندگی اور ان کی پوری جماعت کے علاوہ ہر کس و ناکس کا حرفِ زباں یہی ٹھہرا اور ٹھہرا چلا آرہا ہے کہ ہم اپنے قانون کی بنیاد کتاب و سنّت پر رکھیں گے۔ جبکہ متفق علیہ کتابی شکل میں سنّت کا کوئی مجموعہ تک ہمارے پاس نہیں۔

صدارتی حکم

یہی وجہ تھی کہ اس سلسلہ میں "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے دستور ۱۹۷۳ء جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کے اس آرٹیکل کی ترمیم و وضاحت صدارتی حکم ۱۹۸۰ء / ۱۴ مجریہ ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رُو سے ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "جب ان قوانین کا اطلاق (یعنی زکوٰۃ اور عشر وغیرہ) مسلمانوں کے کسی فرقہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن و سنّت سے مراد اس فرقہ کی تعبیر ہوگی۔"

ایک اہم سوال نامہ

آج سے ۲۰ سال پیشتر فروری ۱۹۵۶ء میں ادارہ طلوعِ اسلام نے ماہرینِ قانون کی توجہ ایک سوالنامہ کی شکل میں مندرجہ ذیل امور کی طرف دلائی تھی۔ یہ سوالات کس حد تک قابلِ غور ہیں، اس کا اندازہ ہمیں خود کرنا ہوگا۔ لیکن یہ تو ایک مسلّم حقیقت ہے کہ تاوقتیکہ آئینی طور پر یہ فیصلہ نہ کر لیا جائے کہ متفق علیہ شکل میں اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا معیار کیا ہے اس وقت تک نہ تو افکارِ تازہ پیدا ہونگے اور نہ ہی ملّتِ اسلامیہ ان مسائل کے گرداب سے نکل سکے گی جنہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر

رکھا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم کفر کے فتوؤں سے گریز کرتے ہوئے بڑے ٹھنڈے دل سے اجذباتیت کے بغیر خالص فکری انداز میں فرقہ بندی کے تصورات کے گرد و غبار سے پرفشاں ہو کر تلاشِ حقیقت کی جستجو کی غرض کے لیے تعمیرِ ملت کی خاطر ان سوالات کا جواب تلاش کریں۔ کیونکہ اگر ہم نے متعین طور پر ان سوالات کا جواب پا لیا —— تو ہم ایک بار پھر عہدِ رفتہ کو آواز دینے کے قابل ہو جائیں گے ورنہ خاکِ بدہن، ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں —— کیونکہ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جس قوم میں غور و فکر کی صلاحیت مفقود ہو جائے تو خدا اس کی جگہ دوسری قوم کو لے آتا ہے جو اس جیسی نہیں ہوتی۔

فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے تب کسی قوم کی شوکت پر زوال آتا ہے۔

لہٰذا پہلا سوال یہ ہے کہ:

۱۔ سنتِ رسولؐ سے کیا مراد ہے ؟

۲۔ کیا حدیث اور سنت میں کوئی فرق ہے اگر فرق ہے تو کیا ؟

۳۔ کیا رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں تھیں ایک ذاتی حیثیت اور دوسری رسالت کی یا آپؐ نے ساری عمر جو کچھ کیا یا کہا وہ رسول اللہؐ کی ہی حیثیت سے تھا ؟

۴۔ اگر رسول اللہؐ کی ذات اور رسالت کی حیثیتیں الگ الگ تھیں تو کیا سنت میں صرف وہ باتیں شامل ہوں گی جو آپؐ نے بحیثیتِ رسولؐ کیں یا وہ بھی جو اپنی ذاتی حیثیت سے کیں مثلاً رہنے سہنے کا طریق، کھانے پینے اور وضع قطع کا انداز وغیرہ۔

۵۔ اگر سنت میں صرف وہی امور شامل ہیں جو حضورؐ نے بحیثیتِ رسول کیے تھے تو کیا یہ تفریق کہیں پہلے سے موجود ہے کہ آپؐ نے فلاں بات بحیثیتِ رسولؐ کی تھی اور فلاں بات ذاتی حیثیت سے۔

۶۔ اگر سوال نمبر ۵ کا جواب نفی میں ہے تو اب اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپؐ نے کون سی بات بحیثیتِ رسولؐ کی تھی اور کون سی ذاتی حیثیت میں ؟

۷۔ جن امور کو آپ رسول اللہؐ کی سنت قرار دیتے ہیں:

(الف) وہ کس کتاب میں درج ہیں ؟

(ب) کیا اس کتاب کو خود رسولِ خدا یا آپؐ کے خلفائے راشدین میں سے کسی نے مرتب کیا تھا!

(ج) اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو اس کتاب کو کس نے مرتب کیا اور کب ؟

(د) کیا اس کتاب میں جو کچھ درج ہے وہ ایسا ہے کہ اسے آیاتِ قرآنی کی طرح من و عن تسلیم کر لیا جائے یا اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن پر تنقید کی جا سکتی ہے ؟

(ہ) تنقید کرنے کا حق کسے حاصل ہوگا ؟

۸- پیرہ (۷- الف) میں جس کتاب کا نام آپ نے لکھا ہے کیا اسے مسلمانوں کے سب فرقے تسلیم کرتے ہیں۔ یا ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک وہ مستند قرار نہیں پاتی؟

۹- جن امور کو آپ سنت رسول اللہؐ سمجھتے ہیں کیا ان میں ایسے امور بھی ہیں جنہیں اور لوگ جو سنت رسول اللہؐ کے قائل ہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے؟

۱۰- اگر پیرہ ۹ کا جواب اثبات میں ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپ دونوں میں سے کس کی بات صحیح ہے؟

۱۱- جس بات کو آپ سنت رسول اللہ سمجھتے ہیں اگر کوئی شخص اس کے خلاف کسی بات کو سنت رسول اللہ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو تو آپ کے نزدیک وہ شخص متبع سنت ہو گا یا نہیں؟- اور آخر پر یہ کہ

۱۲- جس بات کو آپ سنت رسول اللہ سمجھتے ہیں کیا آپ کے نزدیک کسی کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے اس کا حق حاصل ہے کہ اس میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے؟"

اور اس کے بعد یہی بازگشت ایک دوسری نوعیت کے ساتھ اسی ادارہ کی طرف سے مئی ۱۹۸۱ء کو مندرجہ ذیل سوالات کی شکل میں بلند ہوئی اور وہ یہ کہ:

۱- آئینِ پاکستان کی رو سے مملکت میں کوئی قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔

۲- وفاقی شرعی عدالت کا فریضہ ہے کہ جو قانون قرآن و سنت کے خلاف ہو اسے کالعدم قرار دے دیا جائے۔

۳- سوال غور طلب یہ ہے کہ اگر کسی قانون کے متعلق ثابت ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف ہے تو کیا اس کے بعد یہ دیکھنے کی ضرورت باقی رہے گی کہ وہ سنت کے بھی خلاف ہے یا نہیں (اس کی ضرورت نہیں ہو گی کیونکہ کسی چیز کا قرآن کے خلاف ہونا خلاف اسلام ہوتا ہے۔ مثلاً رجم کی سزا، وراثت کے سلسلہ میں وصیت وغیرہ اور زکوٰۃ اور عشر کا نفاذ)

۴- اگر کوئی قانون قرآن کے خلاف ہو اور سنت کے مطابق تو اس کی کیا پوزیشن ہو گی؟ کیا وہ اسلام کے مطابق تصور کیا جائے گا یا اس کے خلاف۔

۵- آئینِ پاکستان کی ایک ترمیم کی رو سے ہر فرقہ اس کا مجاز ہے کہ پرسنل لاز کی تعبیر اپنی اپنی فقہ کے مطابق کرے۔ کیا مذہبی فرقوں کی ایسی فہرست دی گئی ہے جسے اس مقصد کے لیے قانون تسلیم کرتا ہو اگر نہیں تو پھر یہ کیسے طے ہو گا کہ یہ فرقہ کون سا ہے اور اس کی فقہ کون سی؟

یہ ہے کتاب و سنت کی متفقہ تعبیر کی حقیقت اور اس کے نفاذ کی راہ میں حائل مشکلات، جن پر غور و فکر کرنا ہر شخص کا فرض قرار پاتا ہے۔

چوتھا باب

مقامِ احادیث

احادیث کس طرح جمع ہوئیں؟

فقہ اور کتابِ سنت کے تذکرہ کے بعد جہاں تک احادیث کا تعلق ہے، اگر پہلا معاملہ نازک تھا، تو یہ نازک تر دکھائی دے گا۔ جب کہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے انسان کا خالی الذہن ہونا ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔

ہمارے ہاں جامعین احادیث میں سے امام بخاری اور امام مسلم کا نام زیادہ معتبر تصور کیا جاتا ہے جنہوں نے بتدریج ۶ لاکھ اور ۴ لاکھ احادیث جمع کیں اور پھر امام بخاری رحنے ۶ لاکھ احادیث میں سے (مکررات نکال کر) صرف ۷۲۶۲ روایات کو اپنے مجموعہ میں شامل کیا۔ جب کہ امام مسلم نے چار لاکھ احادیث میں سے ۴۳۴۸ کو صحیح قرار دیتے ہوئے مسلم شریف میں جگہ دی۔ علاوہ ازیں امام ابوداؤد نے ۵ لاکھ میں سے ۴۸۰۰۔ امام ترمذی نے ۳ لاکھ میں سے ۳۱۱۵۔ امام ابنِ ماجہ نے ۴ لاکھ میں سے ۴۰۰۰ اور امام نسائی نے دو لاکھ میں سے ۴۳۲۱۔ احادیث کو معتبر قرار دے کر اپنے مجموعوں میں درج کیا ہے۔

اہلِ حدیث کا نظریہ

ان تمام مجموعوں میں سے بخاری اور مسلم کی احادیث کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی صحت پر امت متفق ہے۔ نیز ان احادیث کی صحت قطعی ہے اور ان کا انکار کفر اور ملت سے خروج کے مترادف ہے۔ (ملاحظہ ہو، جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث صفحہ ۴۸۔ ۵۵ شائع کردہ صدر جمعیت اہلِ حدیث مولانا محمد اسماعیل (مرحوم) لیکن اس سلسلہ میں مرحوم مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ :

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچی ہوئی آئی ہیں جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ گمان صحت ہے نہ کہ علم یقین (بحوالہ رسائل و مسائل حصہ اول ستمبر ۱۹۵۱ ایڈیشن صفحہ ۲۹۰)

اور دوسری جگہ فرمایا "قولِ رسول اور روایات جو حدیث کی کتابوں میں ملتی ہیں لازماً ایک ہی چیز نہیں ہیں اور نہ ان روایات کے لحاظ سے آیات قرآنی کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آیات قرآنی کے نزول من اللہ ہونے میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے بخلاف اس کے کہ روایات میں شک کی گنجائش موجود ہے کہ جس قول یا فعل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے یا نہیں۔" (رسائل و مسائل حصہ اول نمبر ۱۹۵۱ء صفحہ ۲۹۰)
ایک اور جگہ فرمایا "یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہیئے۔" (بحوالہ ترجمان القرآن۔ اکتوبر و نومبر ۵۲ ۱۹ء)

کفر کا فتویٰ

مودودی صاحب (مرحوم) کے ان خیالات کی بنا پر "جمعیت علمائے اسلام پاکستان" کے سابق صدر اور دارالعلوم ٹنڈو الہ یار کے سابق شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی (مرحوم) نے اپنے ایک فتویٰ مورخہ ۲۱ رجب ۱۳۷۲ھ میں تحریر کیا " یہ شخص (یعنی مودودی صاحب) منکر حدیث ہے گمراہ ہے اور مبتدع ہے۔ جاہل اجہل ہے، پاگل ہے۔" (بحوالہ مقام حدیث جلد دوم صفحہ ۱۰۴)

ہم نے یہاں شیعہ حضرات کے مجموعہ احادیث کا ذکر نہیں کیا ان حضرات کی حدیثوں کے مجموعے اپنی فقہ کی طرح بالکل الگ ہیں جو دوسرے اہلِ فقہ کو قابلِ قبول نہیں۔ بہرحال جہاں تک بخاری شریف اور مسلم شریف وغیرہ کے مجموعوں کا تعلق ہے یہ ۲۰۰ سال بعد بغیر کسی تحریری ریکارڈ کے مرتب ہوئے۔ ان حدیثوں کے مجموعوں میں جہاں کئی حدیثیں قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں وہاں بے شمار ایسی بھی ہیں جو رسول اللہ کی شان کے شایان ہی نہیں اس سلسلہ میں بخاری شریف کا صرف باب حیض اور باب غسل ملاحظہ کیا جا سکتا ہے

اس کے بعد یہ کہ ان ذخیروں میں سے فرقہ وارانہ اعتقادات کے مطابق اپنے اپنے مجموعے مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجہ میں رسولِ خدا کی ذات جن کے قول و فعل میں کوئی تضاد تک نہ تھا، کہیں وہ بریلویوں کے گروہ میں کھڑی دکھائی دی تو کہیں شافعیوں کے گروہ میں۔ کہیں دیوبندیوں کے گروہ میں اور کہیں نقشبندیوں کے گروہ میں۔ اس سلسلہ میں مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ ۱۴۸ علامہ پرویز صاحب کی تصنیف کا مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جو نہایت غور طلب ہے۔

"سُنیّوں کے متعلق سمجھا یہ جاتا ہے کہ ان کے فرقوں کی احادیث کے مجموعے الگ الگ نہیں لیکن حقیقت یہ نہیں۔ ان کی قابلِ اعتماد احادیث (ان کے اپنے خیال کے مطابق) بھی الگ الگ ہیں اور یہی الگ الگ حدیثیں ہمارے ہاں الگ الگ فرقوں کی بنیاد ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعے پر غور فرمایئے۔ مشکوٰۃ المصابیح احادیث کا قابلِ اعتماد مجموعہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس میں سُنیّوں کی معتبر ترین مجموعہ کی منتخب احادیث درج ہیں۔ کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے کہ احادیث کا ایک مجموعہ (زجاجۃ المصابیح) کے نام سے شائع ہوا تو اس پر مولانا عبدالماجد دریا آبادی (مدیرِ "صدق جدید" لکھنؤ) نے حسب ذیل تبصرہ کیا۔

حنفی حدیثیں

"محمد بن عبداللہ الخطیب کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبوی کا یہ مستند کارآمد اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آرہا ہے اور عوام و خواص سب کے لیے شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے لیکن صاحب مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالۃ القدر بہرحال حنفی المذہب نہ تھے شافعی مذہب تھے۔ اس لیے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتابوں میں جا بجا آجانا قدرتی تھا۔ جس میں رعایت ان کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصے میں آئی ہے۔" (بحوالہ "صدقِ جدید لکھنؤ" ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء بحوالہ مقام حدیث)

اسی سلسلہ میں ایک اور مثال — شافعی اور حنفی تو اہلِ فقہ کے دو فرقے ہیں۔ اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں کس قدر بُعد ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے۔ مولانا مفتی محمد حسن (مرحوم) مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے خلیفہ اور مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی تھے۔ مولانا محمد اجمل خان نے ان کا حسب ذیل واقعہ ہفتہ دار اخبار "خدام الدین" لاہور کی ۱۴ جون ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں لکھا تھا " حدیث کسی حنفی سے پڑھو "

"حضرت مفتی صاحب نے اپنے قیام (امرتسر کے دوران) حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی (نوراللہ مرقدہٗ) سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ چونکہ تم نے احادیثِ مبارکہ اہلِ حدیث صاحبان سے پڑھی ہیں اور میں حنفی ہوں، جوڑ پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا آپ پہلے کسی حنفی عالم سے حدیث پڑھیں پھر درخواست بیعت کریں۔ اس پر حضرت مفتی صاحب نے تین سال دیوبند میں تعلیم میں صرف کیے اس کے بعد حضرت نے بیعت فرمایا۔"

(بحوالہ "مطالب الفرقان" جلد چہارم صفحہ ۱۴۹)

قرآن کا حنفی ترجمہ

ہم نے دین کی یہ خدمت صرف احادیث کی صورت میں ہی نہیں کی بلکہ اپنے مخصوص نظریات کے بتوں کی پوجا کے لیے قرآن حکیم کے تراجم اور تفاسیر بھی اسی نہج پر مرتب کیں۔ تاکہ ہمارے اپنے نفس کی تسکین ہو سکے۔ ''...کچھ عرصہ پیشتر جب تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ شائع ہوا تو دارالعلوم دیوبند کے ایک ممتاز مدرس سید

اسنظر شاہ صاحب نے اس کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

"صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث وتفسیر گروہی عصبیت کا تختہ مشق ہے یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے کوئی بُری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقے سے بھی ہو خوش آئند ہے۔ جس جماعت کی طرف سے ہو قابل پذیرائی ہے۔ مگر افسوس علم جیسے لازوال ابدیت نشان سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث کی طویل کتابیں بھی بن گئیں۔ بہرحال جو کچھ ہُوا ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خالص حنفی نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔"

(بحوالہ پارہ اوّل۔ جلد اوّل صفحہ ۳ مطالب الفرقان صفحہ ۱۴۹)

فرقہ اہلسنت والجماعت کے لیے تفسیر

اس قسم کا افتتاحیہ دہلی کے ماہنامہ "برہان" میں مئی ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے قرآن حکیم کے انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر شائع ہونے پر سپرد قلم کیا تھا کہ:

"انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمے کی ضرورت تھی جس کو اہلِ سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ وخیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کام کیا گیا ہو۔ الحمدللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔"

بہرحال ان گروہ بندانہ نظریات کے تحت قرآن حکیم کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ قرآن حکیم کو ہم نے چیستان بنا رکھا ہے ورنہ اقبال کے الفاظ میں سے

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے!

قرآن حکیم نے کہا تھا کہ "جو قرآن میں نہیں اسے شریعت بنا دینے والے خدا کے شریک ہیں" ۴۲/۲۱
قبل اس کے کہ کتاب وسنت کی اصطلاح کی طرف آئیں ان متضاد تراجم و تفاسیر، مختلف فقہوں اور وضعی روایات نے ہمارے درمیان کس قدر الجھاؤ پیدا کر رکھا ہے اس کی ایک اور محسوس مثال کا پیش کرنا زیادہ

مناسب ہوگا تاکہ حقیقت مزید نکھر کر سامنے آجائے۔

رجم کی سزا

ہمارے ہاں جُرم زنا کے سلسلہ میں اکثر کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اس جرم کا ارتکاب کرے تو انہیں سنگسار کر دیا جائے اور اس کے برعکس اگر غیر شادی شدہ مرد اور غیر شادی شدہ عورت زنا کے مرتکب ہوں تو انہیں ۱۰۰ کوڑے لگائے جائیں لیکن اس سلسلہ میں جہاں تک قرآن حکیم کی سورۃ نُور کی آیت دو کا تعلق ہے، وہاں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تخصیص کیے بغیر ہر ایک کے لیے ۱۰۰،۱۰۰ کوڑوں کی سزا ہی متعین کی گئی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ کچھ کہنے والوں کے خلاف ایک شور برپا کر دیا جاتا ہے اور جب ان حضرات سے پوچھا جائے کہ آخر سنگساری کی یہ سزا آئی کہاں سے۔ اور دوسرا یہ کہ قرآنی تعلیم تو یہ ہے کہ کسی کے جرم کی سزا اس کی علمی سطح اور اس کی تربیت کے مطابق ہونی چاہیئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوڑوں کی شکل میں تو کمی بیشی ہو سکتی ہے لیکن سنگساری کی بنا پر اس میں کمی کی کیا صورت ہوگی ہے سو بجائے اس کے کہ ہم قرآن کے بیان کردہ ۱۰۰ کوڑوں والے اصول کو تسلیم کریں، وضعی روایات اور خود ساختہ فقہوں کو ہمارے درمیان حائل کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں بخاری کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ کہ:

"حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی تھے) کہ زمانہ جاہلیت میں مَیں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا اور مَیں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔" (بحوالہ صحیح بخاری۔ ایام الجاہلیہ)

اور اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابن حجر رح عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے:

"حضرت عمرو بن میمونؓ فرماتے ہیں کہ مَیں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور مَیں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لیے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پچھلے بندر کے مقابلے میں نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔ اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے مَیں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اُٹھا۔ اس نے (محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے) چنانچہ اس نے

بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کر دی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر اُدھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کر دیا" (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے)۔ (فتح الباری۔ شرح بخاری۔ جلد ہفتم۔ صـ ۱۲۱)

اور تفسیر کبیر امام رازی جلد نمبر ۳۲ صفحہ ۱۳۴ کے مطابق رجم کی آیت رسولِ خدا کے ہاں کی پالتو بکری کی نظر ہو گئی جب حضرت عائشہؓ نبی اکرمؐ کی وفات کے سلسلہ میں تجہیز و تکفین میں مشغول تھیں۔ یعنی اب حالت یہ ہے کہ وہ آیت تو موجود نہیں لیکن عمل اس کے مطابق کروایا جاتا ہے۔

سنگساری کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ کا اداریہ

تصریحات کے بیان کرنے کے بعد اب قارئین کی خدمت میں روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۴ مئی ۱۹۸۹ء کا ایک اداریہ جو بدکاری کے ایک جرم پر ایک عدالت کی طرف سے سنگساری کا حکم صادر ہونے پر لکھا گیا تھا پیشِ خدمت ہے جناب مدیر لکھتے ہیں۔

بدکاری کے جرم میں سنگساری کا حکم

"بدکاری ایک ایسا مکروہ ترین معاشرتی جرم ہے جس کے تباہ کن اثرات کئی نسلوں اور خاندانوں تک کو متاثر کرتے ہیں اس قبیح جرم کی اس سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اسلام میں اس کی سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے اور جن ممالک میں یہ اسلامی سزائیں نافذ ہیں وہاں ایسے جرائم کی تعداد انتہائی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے وطن عزیز میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا غلغلہ تو ایک عرصے سے سننے میں آرہا ہے لیکن عملی طور پر اس کے نفاذ کی سمت میں بہت کم پیش رفت ہوئی ہے لیکن لگتا ہے کہ اب اس جانب قدم بڑھانے کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور نظر آتی ہے ایک اطلاع کے مطابق مہر محمد نواز خاں ڈسٹرکٹ سیشن جج بہاولنگر نے اگلے روز چک ۷۹ فورآر کے ایک شریعت کیس کا فیصلہ سناتے ہوئے ایک شادی شدہ مرد اور عورت کو بدکاری کے جرم میں سنگساری کی سزا کا حکم سنایا ہے، اسلام میں حدود کے قیام کے سلسلہ میں یہ ہدایت ہے کہ شبہات کا تاحدامکان فائدہ دے کر اس سے ملزم کو بچانا چاہیئے لیکن اگر جرم ثابت ہو جائے تو پھر ان سزاؤں کے نفاذ میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں کرنی چاہیئے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مذکورہ بالا فیصلہ ملک سے اس نوع کے جرائم کے خاتمے اور نفاذ شریعت کی جانب ایک اہم پیش قدمی ثابت ہوگا۔"

وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ [1]

اب اس کے بعد اس سلسلہ میں وفاقی شرعی عدالت کا وہ فیصلہ بھی ملاحظہ فرمائیں جو ۱۰ اپریل ۱۹۸۱ء کو پاکستان ٹائمز کی اشاعت میں شائع ہوا۔ یعنی:

"قرآن کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے اور یہی قول فیصل ہے۔ رجم کی سزا خلاف قرآن ہے اس لیے اس قانون کو منسوخ کردینا چاہیے۔ جس کی رو سے اسے حد (سزا) قرار دیا گیا ہے۔" اور اس کے بعد تحریر ہے کہ "اس بحث کا ملخص یہ ہے کہ ایک طرف سورہ نور کی آیت نمبر ۲ میں قرآن مجید کا صاف، واضح اور غیر مبہم اور دو ٹوک حکم موجود ہے اس کے ساتھ ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کوئی حدیث نہ قرآن میں تبدیلی کرسکتی ہے، نہ منسوخ کرسکتی ہے۔ اس کے برعکس رجم کی سزا کے حق میں کچھ احادیث ہیں جو مبہم، غیر متعین اور باہمدگر متضاد ہیں بلکہ بعض ایسی جن کا حدیث ہونا بھی مشکوک ہے۔ فقہا کے اقوال بھی غیر یقینی اور متضاد ہیں۔ اندریں حالات نیز ان حقائق کے پیش نظر جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں اور اس باب میں قطعاً تامل محسوس نہیں کرتا کہ میں سورہ نور کی آیت ۲ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوا قرآنی فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ زانی کی سزا خواہ وہ شادی شدہ ہو اور خواہ غیر شادی شدہ، پبلک کے سامنے کوڑے مارنا ہے۔"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے خلاف وفاقی حکومت پاکستان نے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کردی تھی جس کا فیصلہ شاید ابھی تک نہیں ہوا۔

---

[1] شرعی عدالت کا یہ فیصلہ غیر اسلامی ہے حالانکہ یہ سزا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ (علامہ احسان الٰہی ظہیر، بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۸۱ء۔ جمعہ میگزین)

پانچواں باب

قرأت کا اختلاف

فقہ، کتاب وسنّت اور مقامِ حدیث کے تذکرہ کے بعد اب ہم قرأت کے اختلاف کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآن حکیم کی تفاسیر وتراجم میں ہی اختلاف نہیں بلکہ اس کتابِ محفوظ کی لفظی عبارت میں بھی اختلاف ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ:۔

قرأت سے مراد قرآن حکیم کے الفاظ کو مختلف طریق سے ادائیگی کے فرق کا نام ہی نہیں بلکہ یہ اختلاف بذاتِ خود الفاظ کی تبدیلی کا نام ہے۔

مودودی صاحب (مرحوم) کا مؤقف

چنانچہ مودودی صاحب مرحوم اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں کہ: "یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ قرآن مجید آج اصلی صورت میں موجود ہے جس میں وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اور اس میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ لیکن یہ بات بھی اس کے ساتھ قطعی صحیح ہے کہ قرآن میں قرأتوں کا اختلاف تھا اور ہے۔ جن لوگوں نے اس مسئلے کا باقاعدہ علمی طریقہ پر مطالعہ نہیں کیا ہے وہ محض سطحی نظر سے دیکھ کر بے تکلف فیصلے کر دیتے ہیں کہ دونوں باتیں باہم متضاد ہیں اور ان میں لازماً کوئی ایک ہی بات صحیح ہے۔" (بحوالہ طلوعِ اسلام۔ نومبر ۱۹۵۹ء)

تمنّا عمادی

اس تحریر کی روشنی میں جناب علامہ تمنّا عمادی مدظلہٗ (ڈھاکہ) کی اتباع میں اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ" باقاعدہ علمی طریقہ کون سا ہے جس کا مطالعہ کرنے سے دو متضاد چیزیں باہم متفق بلکہ متحد نظر آتی ہیں وہ باقاعدہ علمی طریقہ تو مجھ کو معلوم نہیں" البتہ مجھے اس موقع پر ان پریشان کن عقائد کا ہی ذکر کرنا ہوگا جن کی بنا پر قرآنِ حکیم کے الفاظ بدلے نظر آتے ہیں۔

عربی یا اردو زبان میں زبان دانی کے اصول کے پیشِ نظر یہ تو ظاہر ہے کہ الفاظ کا اختلاف اعراب اور نقاط کی شکل بدلنے پر ہی موقوف ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے بانی نے اٹھائیس حرفوں میں سے بائیس حروف جو باہم متشابہ تھے ان کے مابین مختلف نقاط کے ذریعے فرق پیدا کیا ورنہ عربی یا اردو کے ایک لفظ "ب"

کے متعلق یہ بھی فیصلہ نہ کیا جا سکے کہ یہ ب ہے یا ٹ، ث ہے، ٹ ہے یا پ۔

اس کے باوجود

لیکن اس حقیقت کے باوجود قرآن حکیم کے سلسلہ میں مودودی صاحب مرحوم اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" بابت جون ۱۹۵۹ء میں تحریر کرتے ہیں کہ :

" یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکر رض نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمان رض نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی۔ اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی : کىاں الحكمىـ الله له فصلىـ مں لدں حكـ حـمد اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال بامعنی بنا کر ہی پڑھتے تھے لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہلِ زبان کو بکثرت التباسات پیش آجاتے تھے۔ اور یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے۔ مثلاً ایک فقرہ یوں لکھا گیا ہو کہ رىىا ىاعد ىىں اسعار ىا تو اس کو رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا بھی پڑھا جا سکتا تھا اور رَبُّنَا بَعَّدَ بَيْنَ اَسْفَارِنَا بھی"۔ (اسی طرح کی ایک دوسری مثال بھی دی ہے) ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں :

" یہ اختلافات تو اس رسم الخط کو پڑھنے میں اہلِ زبان کے درمیان ہو سکتے تھے۔ لیکن ایک عربی تحریر اگر اس رسم الخط میں غیر اہلِ زبان کو پڑھنی پڑ جاتی تو وہ اس میں ایسی سخت غلطیاں کر جاتے جو قبائل کے منشا کے بالکل برعکس معنی دیتی تھیں۔"

یہ اعراب اور نقاط کس نے لگائے؟

اب سوال یہ ہے کہ پھر آخر ان نقاط اور اعراب کی ضرورت کب محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں مولانا مودودی صاحب (مرحوم) کا ارشاد ہے :

" پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرے کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو ۴۵ھ سے ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے

ابوالاسود دئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لیے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان ۶۵ھ تا ۸۶ھ کے عہدِ حکومت میں حجاج بن یوسف والیٔ عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا۔ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں منقوط اور بعض کو غیر منقوط کر کے اور منقوط کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین نقطے لگا کر فرق پیدا کیا۔ اور ابوالاسود کے طریقے کو بدل کر اعراب کے لیے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔"

ہم دنیا بھر کے مسلمانوں کو ان دو گمنام علماء کا ممنون احسان ہونا چاہیئے کہ جنہوں نے حجاج بن یوسف والیٔ عراق کے حکم پر ۶۵ھ تا ۸۶ھ میں نقاط اور اعراب کا یہ اہم کام سرانجام دیا کہ جن کے بغیر "یہ تعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے" اور جن نقاط اور اعراب کے نہ ہونے کی وجہ سے "اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھا کرتے تھے۔"

اعراب کا فائدہ

اس کے علاوہ اور کیا فائدہ ہوا وہ بھی مودودی صاحب مرحوم کے الفاظ میں سن لیجیے۔ فرماتے ہیں "ان کی بدولت قرأتوں کے اختلافات امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند متواتر یا مشہور اختلافات تک محدود رہ گئے ہیں۔"

شکر ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ فریضہ ہمارے دور کے علماء کے سپرد کر دیا جاتا تو نہ معلوم آج قرآن مبین کے ان محسوس الفاظ نے کیا شکل و صورت اختیار کی ہوتی اور نوعِ انسانی جن کے لیے یہ آخری ضابطۂ حیات تھا آخر العمر اپنی رہنمائی کے لیے کس چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتی۔ افسوس! ایک طرف تو ہمارا ایمان ہے کہ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل کتاب ہے اور دوسری طرف اس "تاریخی حقیقت" کو بھی تسلیم کیے آرہے ہیں کہ یہ کتاب عظیم اعراب اور نقاط تک کے بغیر آرہی تھی۔ بالعجب۔

لہ مودودی صاحب مرحوم کے نزدیک وضو کے دوران پاؤں دھونے کے متعلق سُنّی اور شیعہ حضرات کا اختلاف دو مختلف قرأتوں کی ہی بدولت ہے۔

اعراب وغیرہ کے بغیر نقصان

اعراب اور نقاط کے بغیر یہ کتاب کن کن خامیوں سے دوچار ہوتی، اس کی وضاحت خود مودودی صاحب مرحوم کے الفاظ سے ہی لگائیے۔ ارشاد ہے:

"اگر قرآن کی اشاعت کا دارومدار صرف تحریر پر ہوتا تو جس رسمِ خط میں امت کو یہ کتاب ملی تھی، اس کو پڑھنے میں تلفظ اور اعراب ہی کے نہیں، متشابہ حروف کے بھی کتنے بے شمار اختلافات ہو گئے ہوتے۔ محض زبان اور قواعد کی بنا پر خود اہلِ زبان بھی اگر نقطے اور اعراب لگانے بیٹھتے تو قرآن کی ایک ایک سطر میں بیسیوں اختلافات کی گنجائش نکل سکتی تھی اور کسی ذریعے سے یہ فیصلہ نہ کیا جا سکتا تھا کہ اصل عبارت جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی وہ کیا تھی؟ اس کا اندازہ آپ خود اس طرح کر سکتے ہیں کہ اردو زبان کی کوئی عبارت بے نقط لکھ کر دس ہم زبان اصحاب کے سامنے رکھ دیں گے کہ ان میں کسی کی قرأت بھی کسی دوسرے کے مطابق نہ ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن میں نقطے اور اعراب لگانے کا کام محض لغت اور قواعد اور زبان کی مہارت کے بل بوتے پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس طرح ایک مصحف نہیں بے شمار مصحف[1] تیار ہو جاتے جن میں الفاظ اور اعرابوں کے ان گنت اختلافات ہوتے اور کسی نسخے کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہ کیا جا سکتا کہ ٹھیک اسی تنزیل کے مطابق ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔"

---

[1] اس کی کوشش تو بہت کی گئی سات قاریوں کے سات اسکول قائم کیے گئے۔ مصحف ابی بن کعب اور مصحف عبد اللہ بن مسعود اور مصحف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کے نام سے مصاحف مشہور کر کے ترتیب سور میں الٹ پلٹ تو کی ہی گئی۔ آیات کے الفاظ میں کمی بیشی اور الفاظ کے نقاط و اعراب میں بھی فرق قائم کیا گیا۔ مگر ان کے پاس نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کا کوئی علاج نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے خود ساختہ سارے اختلافات کو ان کی تصنیف کردہ کتابوں اور روایات کے دفاتر تک ہی رہنے دیا۔ کسی ایک اختلاف کو بھی قرآن مجید میں داخل نہ ہونے دیا۔ اس نے خود فرمایا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ط جو لوگ ہماری آیتوں میں کجی کریں گے وہ ہم سے کچھ چھپے نہیں رہیں گے۔

(تمنا عمادی غفرلہ)

اعراب اور نقاط کی اس قدر اہمیت کے باوجود کہ جن کو بغیر اردو یا عربی کی کوئی کتاب مکمل قرار دی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآنِ حکیم جیسے نسخہ کیمیا کو اس خامی کے ساتھ نازل کر دیا گیا اور پھر یہ کہ اس خامی کا احساس نہ جبریل امین کو ہوا نہ اصحابؓ کو، نہ کاتبین وحی کو نہ رسولِ اکرم ؐ کو حتیٰ کہ نہ ذاتِ خداوندی کو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں" مودودی صاحب مرحومؒ کا کہنا ہے:

"(۱) ۶۵ھ تک قرآن کے حروف بلکہ پورے اہلِ عرب ہی عام حروفِ عربی کے لیے اعراب کے نام سے آشنا نہ تھے ابوالاسود دولی نے زیاد کے حکم سے پہلے پہل نقطوں کی شکل میں حروف کے اوپر نیچے اور بیچ میں ایک ایک نقطہ رکھ کر زیر زبر پیش سے مسلم اہلِ عرب کو ۴۵ھ سے ۵۳ھ کے اندر کسی دن آشنا کیا۔

(۲) اہلِ عرب "حروف کے لیے نقطے بھی ہونے چاہئیں" اس کو کبھی محسوس نہ کر سکے تھے بلکہ اسلامی عہد میں ہی صحابہؓ رسول ؐ جبریلؑ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بھی نقطوں کی ضرورت عربی حروفِ تہجی کے لیے محسوس نہیں کی تھی۔ پہلی مرتبہ عبدالملک کے حکم سے حجاج بن یوسف نے دو گمنام عالموں کے ذریعے یہ ضرورت ایجاد کر کے دنیائے عرب کو اس کی ضرورت سے آشنا کر دیا۔ بس اسی وقت سے عربی حروف کے لیے نقطوں کی ضرورت دنیا کو محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس سے پہلے یہ بالکل بے ضرورت ہی تھے ورنہ اگلوں میں سے کسی کو تو اس کی فکر ہوتی۔"

خدا تعالیٰ کو بھی احساس نہ تھا

یعنی بالفاظ دیگر یہ ان دو گمنام عالموں کی مہربانی تھی جنہوں نے حجاج بن یوسف والئی عراق کے حکم پر اس ضابطہ خداوندی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اعراب اور نقاط کی خامیوں سے پاک کر دیا ورنہ ذاتِ خداوندی تک کو اس چیز کا خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ اگر کہیں کسی جگہ دو حفاظ میں کسی لفظ پر تکرار ہو جائے تو بغیر اعراب اور نقاط کے وہ کس طرح فیصلہ کریں گے کہ کون سا لفظ صحیح ہے اور کون سا غلط اور یا اگر کسی آبادی میں جہاں کوئی حافظ بھی موجود نہ ہو تو وہاں کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں آج کی طرح یعنی بغیر سوچے سمجھے صرف ثواب حاصل کرنے کی خاطر ناظرہ کی شکل میں قرآن حکیم کو پڑھنا چاہیں تو وہ اس عبارت کو سوائے اٹکل کے "اٹکل" سے پڑھیں، اور کیا کریں گے۔

افسوس تو یہ ہے کہ یہ مفروضے جنہیں تاریخی حقیقتیں کہہ کر پکارا جاتا ہے اور یہ غلط تصورات صرف "مودودی صاحب مرحوم" تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہزار سال سے ہمارے ہاں ہر مسجد و محراب میں پیش کیے جاتے ہیں اور پھر ستم ظریفی یہ کہ ان غیر قرآنی حقیقتوں کو ہم نے اپنے تعلیمی نصاب میں داخل کر رکھا ہے۔ (تفصیل آگے آئے گی۔) یہ تو خدائے علیم و خبیر کا شکر ہے کہ ہمارے ان مروجہ افسانوں کے برعکس خدا کے ہاتھ سے اس نازل کردہ قندیل آسمانی کی ایک ایک کرن اپنی اصلی، مکمل اور آخری شکل میں بغیر کسی انسانی ذہن کی

آمیزش کے پہلے دن سے ہی یقینی طور پر لاریب، مبین، واضح، روشن اور بغیر کسی خامی کے قلب نبی پر اتاری گئی اور پھر اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا تاکہ نوعِ انسانی جب چاہے اپنے ناکام تجارب سے تنگ آکر اپنا سفر حیات از سر نو شروع کر سکے تو اس کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ متشکل کرنے کے قابل بن سکے جس میں نہ خوف ہو نہ حزن۔ ورنہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اگر ان اعراب اور نقاط کا فریضہ کہیں ہمارے سپرد کر دیا جاتا تو پھر نہ معلوم اس نسخہ کیمیا کے الفاظ کی محسوس شکل وصورت کیا حیثیت اختیار کر جاتی۔ اور اس کے بعد نوعِ انسانی اپنے الجھے ہوئے مسائل کے حل کی خاطر زمانہ حال کی طرح تاقیامت کس کس کے در پر سجدہ ریز ہوتی دکھائی دیتی لیکن اگر یہ دیکھنا ہو (خود تو ڈوبے ہی صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے) کے مصداق کہ نئی نسل کو یہ تعلیمی زہر کس طرح پلایا جا رہا ہے تو اس کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس قابلِ غور ہے جو جماعت نہم و دہم میں پڑھائی جانے والی اسلامیات لازمی (سنی طلباء کے لیے) سے حاصل کیا گیا ہے جسے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور نے تیار کیا ہے۔

ہمارا نصابِ تعلیم

قرآنِ حکیم کی تدوین

مذہبی خدمات میں آپ (حضرت عثمان رض) کا سب سے اہم کارنامہ مسلمانوں کو قرآن کریم کی ایک قرأت پر متحد کرنا ہے۔ قرآن حکیم اگرچہ حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں مدون ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔ کلام اللہ کے بعض الفاظ کا تلفظ کئی طرح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اصحابؓ ان کا تلفظ مختلف طریقوں سے کرتے تھے۔ عرب میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی بعد والوں کے لیے مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت عثمان نے وہ نسخہ منگوایا جو حضرت ابوبکرؓ نے مدون کیا تھا اور جو ام المومنین حضرت حفصہ رض کے پاس محفوظ تھا۔ آپؓ نے اس کی مختلف نقلیں کرا کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ اس طرح ساری دنیا کے مسلمان قرآن حکیم کی ایک ہی قرأت اور ایک ہی تلفظ پر متفق ہو گئے۔ ایک مدت تک وحی کی خدمت آپ کے سپرد رہی۔

صاحبِ نصاب حضرات

اس اقتباس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے۔ یاد رہے اس کی تیاری کے لیے جن مختلف حضرات کی خدمت حاصل کی گئی ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں: مولانا محمد بخش مسلم، مولانا عبدالقادر آزاد، مولانا

محمد حنیف ندوی، مولانا ضیاء القاسمی، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا، ڈاکٹر مجیب الرحمان قاضی، پروفیسر محمد احمد قاضی، پروفیسر محمد علی سانگی اور سید نور الحسن بخاری۔

چند ایک اہم سوالات

بہرحال اس تحریر کی روشنی میں اگر کوئی طالب علم ان حضرات سے پوچھ لے کہ جناب عالی (۱) کیا رسول خدا کی ذات اقدس و اعظم نے اس ضرورت کو بھی محسوس نہ کیا کہ اِس آخری ضابطہ حیات کو کتابی شکل میں اپنی زیر نگرانی مدون کرانا کس قدر ضروری ہے۔ جب کہ آپؐ کے بعد کسی نبی نے بھی نہیں آنا تھا؟ (۲) اور جو اندیشہ صحابہ کرامؓ کو درپیش ہُوا کیا رسولِ خدا اس قسم کے سطحی اندیشے کا بھی احساس نہ کر سکے۔ معاذ اللہ۔ (۳) خدا نے اپنے کلام کے شروع میں جب یہ فرمایا کہ اس کتاب میں کوئی تضاد نہیں یہ لاریب ہے تو کیا یہ کتاب بکھرے ہوئے اوراق کا نام تھا اور ہے؟ کیا کبھی بکھرے ہوئے اوراق کو جن کی ابھی شیرازہ بندی نہ کی گئی ہو کیا وہ کتاب کہلا سکتی ہے؟ کتاب تو وہ کہلاتی ہی تب ہے جب وہ کتابی شکل میں ہر لحاظ سے مکمل اور مدون ہو کر سامنے آجائے۔ (۵) کیا یہ عجیب بات نہیں کہ صحابہ کرامؓ جیسی شخصیات قرآن حکیم جیسی کتاب کی املا اور تلفظ مختلف طریقوں سے لکھیں اور پڑھیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اس غلطی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیں؟ اور (۵) کیا یہ بات صحابہ کرامؓ کے شایان شان قرار دی جا سکتی ہے؟ (۶) اور آخر بہ یہ کہ کیا کسی قانون کی کتاب کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں اس قدر قرأت کا اختلاف ہو اور اس کے باوجود اسے مکمل کتاب ہی گردانا جائے۔

اگر ان تمام باتوں کا جواب نفی میں ہے (اور یقیناً ہے) تو پھر اس تحریر اور نصابِ تعلیم کے کیا معنی جو ہمارے ذہنوں کی سفید اور صاف تختی پر کالی سیاہی سے لکھی جا رہی ہے۔ نوجوان نسل ہم سے پوچھتی ہے کہ کیا اس تمام بحث کا ماحصل اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ نبی اکرمؐ کی ذات پر جو قرآن حکیم نازل ہُوا اس پر نہ اعراب تھے نہ نقاط بلکہ یہ آپؐ کی زندگی مبارک کے بعد ۶۵ھ تا ۸۶ھ میں دو علماء نے اپنی دانست کے مطابق لگائے۔ ان اعراب و نقاط کے بغیر صحابہ کرامؓ قرآن حکیم مشکل سے پڑھا کرتے تھے۔ اور آخر کار ان علامات کا فائدہ یہ ہُوا کہ قرأت کا اختلاف امکانی وسعتوں تک پھیلنے کی بجائے صرف چند متواتر اور مشہور اختلافات تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اور جہاں تک اس کتاب کی تدوین کا تعلق ہے وہ بھی رسولِ خدا کی زندگی میں مکمل نہ ہوئی تھی بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور میں یہ "نامکمل کتاب" بغیر اعراب و نقاط کے مدون ہوئی جس کا ایک ہی نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس محفوظ تھا جبکہ نبی اکرمؐ کے دور میں دس لاکھ مربع میل تک کا علاقہ آپ کے کنٹرول

میں آچکا تھا اور پھر حضرت عمر رضؓ کے دور میں اس کی وسعت ۲۲ لاکھ مربع میل تک پھیل چکی تھی اور پھر جس کے استحکام کی خاطر آپؓ نے زندگی کے ہر شعبہ کے لیے بڑی دُور رس اصلاحات نافذ کیں۔ لیکن (ان بیان کردہ افسانوں کی روشنی میں) کچھ اگر کیا تو وہ یہ کہ اس ایک نسخہ کے علاوہ (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) قرآن حکیم کی نشر واشاعت کا کوئی انتظام نہ کیا۔ البتہ حضرت عثمان رضؓ کے دور میں اس خامی کو محسوس کیا گیا اور پھر آپؓ نے اس ایک نسخہ سے مزید نسخے لکھوائے اور اس طرح دنیا بھر کے مسلمانوں کو قرآن حکیم کے ایک ہی تلفظ اور ایک ہی قرأت پر متفق کرنے کا سامان فراہم کردیا۔ نیز بقول مودودی صاحب مرحوم کے "آئندہ کی خاطر" آپؓ نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے عربی والے قرآن کو باقی رکھا اور باقی چھ[1] زبانوں والے قرآن جلا دیے تاکہ مسلمانوں میں انتشار پیدا نہ ہو۔ جبکہ ان کو جلانے کا حکم نہ خدا نے آپؓ کو دیا تھا اور نہ رسولؐ خدا نے" اور اس طرح مسلمان اس انتشار سے بچ گئے جن کا ان حضرات کو خطرہ تھا۔

ایک گذارش

ان مروجہ عقائد کے اس خلاصہ پر ہمارے خیال میں کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ سوائے اس کے، کہ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق یہ کہا جائے کہ "سوچا کرو" لیکن سوچے گا تو وہی جو عقل وبصیرت سے کام لے گا۔ قرآن حکیم کی تحریر اور تدوین کے سلسلہ میں قبل اس کے کہ ہم اِس وادیٔ پرخار سے باہر قدم رکھیں اس کا ابھی ایک گوشہ باقی ہے۔ جس کا ذکر کیے بغیر ہمارا یہ سفر نا تمام سا معلوم ہوتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے سے پہلے پہلے یہ ایک بار پھر یہ عرض کردینا مناسب ہے کہ جو کچھ راقم نے لکھا ہے یا آئندہ لکھا جائے گا اس سے قطعی طور پر کسی شخصیت کی تذلیل مقصود نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر دین ودنیا کے معاملات میں اس ذہنیت کو زادِ راہ بنا لیا جائے تو پھر نہ ادب ادب رہتا ہے اور نہ علم علم۔ بلکہ اس عمل سے انسان کی اپنی شخصیت صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور عقل وشعور کی بارگاہ سے سوائے ذلت ورسوائی کے اس کے کچھ حصے نہیں آتا لہٰذا میری التماس یہ ہے کہ ان گذارشات کو خالصتاً علمی سطح پر پرکھا اور دیکھا جائے۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہیں تو پھر سوچا جائے کہ ملّتِ اسلامیہ جو اس قسم کے غیر آئینی گردابوں میں متواتر اُلجھی چلی آرہی ہے اُسے اس سے کس طرح نکالا جاسکتا ہے۔ میری اس دلسوزی کا صرف اور صرف یہی مقصد ہے اور کچھ نہیں ؎

یئں اس آس پہ سُلگا رہا ہوں دل کی چنگاری ‌ ‌ کبھی تو آگ بھڑکے گی کبھی تو روشنی ہوگی

اس کے بعد اس گوشہ کی طرف آئیے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے ناسخ ومنسوخ کا گوشہ۔

---

[1] قرآن مجید سات زبانوں میں کس طرح نازل ہوا، اس کی تفصیل ماہنامہ "البلاغ" کراچی کے شمارہ مئی ۱۹۷۶ء میں بھی پیش کی گئی ہے۔

چھٹا باب

ناسخ و منسوخ

ناسخ و منسوخ کے سلسلے میں تمہیداً یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ کسی بھی نظام کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے یا پہنچانے کے لیے یہ لازم ہے کہ اس نظام میں ان تمام تدریجی مراحل کی نشاندہی موجود ہو جو اس کے لیے ضروری ہیں تاکہ وہ قوم جو اپنے آپ کو اس نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہے وہ بآسانی اپنے سفر کا آغاز اس مقام سے کر سکے جس مقام پر وہ کھڑی ہے۔ کیونکہ اگر کسی نظام کے خد و خال میں صرف کسی ایک ہی مرحلہ کی نشاندہی کی گئی ہو تو اس معاشرہ کے لیے کبھی یہ ممکن نہ ہو سکے گا کہ وہ قوم ان مطلوبہ نتائج کو حاصل کر سکے جو ایک خوبصورت معاشرہ کا خاصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان تدریجی نشاندہیوں کے بغیر اس معاشرہ کو جمود کے اس گڑھے سے نکالنے کا کوئی اور طریق ممکن ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا نبی ہر لحاظ سے ایک مکمل نظامِ حیات کا داعی تھا تاکہ وہ نوعِ انسانی کو بتدریج اس منزل کی طرف کشاں کشاں لے جائے جو مقصودِ مہیا تمہ ہے لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایک مرحلہ کے لیے دیئے گئے اصول و قوانین بھی اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں جتنے کہ دوسرے مرحلے کے۔

تدریجی مراحل کے مطابق راہنمائی

قرآن حکیم نے اپنے ہاں اسی انداز کو اپنایا ہے۔ نزولِ قرآن کے دور میں عرب جیسی مخاطب قوم کو شراب کی ممانعت کے لیے جو ۱۵ سال کا عرصہ دیا گیا تھا، اس میں یہی حکمت پوشیدہ تھی یا مثلاً اگر آج ہم بھی قرآن کے معاشی نظام کو اپنے ہاں اپنانا چاہیں تو رزق کے تمام سرچشمے جو اصولاً مملکت کی تحویل میں ہونے چاہئیں، اُن کے لیے فوری طور پر کوئی انتہائی قانون نافذ نہیں کر سکیں گے۔ ایسا کرنے سے پورے کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور وہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوں گے جن کے لیے یہ انقلابی قدم اٹھایا گیا ہو۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ایسا بتدریج ہی ہو سکے گا اور اس نظام کی اتباع کے لیے پوری ملت کو ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا تاکہ وہ اس نظام کے ثمرات اور طریق کار سے پوری طرح آگاہ ہو سکے جو اس منزل کی ابتداء اور انتہا کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ

اگر یہ دونوں عوامل (تدریجی مراحل اور ذہنی آبیاری) میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے نتیجہ میں جو کچھ بھی حاصل ہوگا اسے بدنظمی اور ہنگامہ آرائی کا نام تو دیا جا سکتا ہے ایک خوش آئند انقلاب کا پیش خیمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قرآنی احکام منسوخ نہیں ہوا کرتے

ان تصریحات سے واضح ہے کہ تدریجی مراحل یا ہنگامی حالات کے لیے دیئے گئے اصول و قوانین اگر کسی مملکت کے لیے اس کے اپنے حالات کے مطابق قابلِ عمل نہ ہوں تو اصول و قوانین منسوخ نہیں ہو سکتے۔

بلکہ ان پر تو وہاں عمل ہو رہا ہوتا ہے جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ چنانچہ

قرآن حکیم کا کوئی حکم بھی منسوخ نہیں کیا گیا ورنہ عام تصور کے مطابق اگر قرآن حکیم کی ۵۰۰ آیات منسوخ ہو چکی ہیں تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آیات منسوخ ہونے کی وجہ سے قابلِ عمل ہی نہیں رہیں۔ تو کیا انہیں صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے محفوظ رکھا گیا ہے؟ العجب۔

مثلاً تیمم کا حکم وہاں ساقط سمجھا جائے گا جہاں اس کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ چنانچہ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قرآنِ حکیم کا کوئی حکم مستقل طور پر ساقط بھی نہیں رہتا چہ جائیکہ اسے منسوخ قرار دے دیا جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ قدرت نے بعض احکام و اقدار جو سابقہ اقوام کے لیے متعین کی گئی تھیں انہیں ہمارے لیے منسوخ کر دیا ہو اور اس کی جگہ کوئی بہتر یا مزید ارتقا یافتہ شکل میں اور اقدار دے دی ہوں۔ لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ جو قانون اور اقدار قرآن حکیم کی دفتین میں محفوظ ہیں اُن میں سے کوئی حکم منسوخ قرار دیا گیا ہو۔ منسوخ شدہ قانون کو محفوظ کرنے کا کوئی مقصد ہی نہیں رہتا۔

پرویز صاحب کا ارشاد

ناسخ و منسوخ کے متعلق جناب پرویز صاحب نے اپنی کتاب "تبویب القرآن" میں جو کچھ تحریر فرمایا، قارئین کے استفادہ کے لیے اسے یہاں درج ذیل کیا جا رہا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس کے بعد موضوع زیرِ نظر کے سلسلہ میں مزید کسی قسم کی کوئی تشنگی باقی نہیں رہے گی۔

"قرآن نے بتایا ہے کہ آسمانی رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع سے جاری رہا ہے لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ رسول کے دنیا سے چلے جانے کے بعد اس کی وحی میں انسانی خیالات کی آمیزش کر دی جاتی۔ اس کے بعض حصے فراموش ہو جاتے۔ بعض حوادث ارضی و سماوی کی وجہ سے بالکل مٹ جاتے اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا۔ وہ خدا کی وحی کی رُو سے؛

(i) ان احکام کو پھر سے جاری کر دیتا جن کا جاری رکھنا منشائے خداوندی تھا۔

(ii) جو احکام وقتی طور پر دیئے گئے تھے، انہیں یا تو منسوخ کر دیتا۔ اور یا ان کی جگہ ان سے بہتر احکام دے دیتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ خدا کا آخری رسولؐ آیا۔ اس نے خدا کی وحی کے مطابق، جو دین عطا کیا اس میں :۔

(i) ایسے احکام علیٰ حالہٖ موجود رکھے گئے جو انبیاءِ سابقہ کی وساطت سے دیئے گئے تھے اور ابدی طور پر جاری رکھے جانے والے تھے اور اپنی اصلی شکل میں موجود تھے۔

(ii) جو احکام ایسے تھے جن کا ابدی طور پر جاری رکھنا مقصود تھا لیکن جن میں یا تو انسانی خیالات کی آمیزش ہو گئی تھی اور یا وہ محو ہی ہو گئے تھے۔ انہیں از سرِ نو منزہ شکل میں دیا گیا۔

(iii) سابقہ انبیاء کی وحی میں جو احکام ایسے تھے جن کا باقی رکھا جانا مقصود نہیں تھا انہیں شاملِ وحی نہ کیا گیا۔ اور

(iv) جن مزید احکام کی ضرورت تھی، ان کا اضافہ کر دیا گیا۔

اِس طرح دین کو مکمل کر دیا اور اسے غیر متبدل قرار دے کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔
(۱۵ : ۹ — ۶ : ۱۱۶)

لہٰذا، قرآن میں کوئی حکم ایسا نہیں جو منسوخ ہو۔ یہ ابدی ضابطۂ حیات ہر طرح سے مکمل اور غیر متبدل ہے۔ قرآن کریم کی آیت (۲ : ۱۰۶) میں جس نسخ کا ذکر ہے، اس کا تعلق، سابقہ انبیاء کی وحی سے ہے قرآن کریم سے نہیں۔ اسی کی تائید (۱۶ : ۱۰۱ — ۱۰۲) سے ہوتی ہے اور (۲۲ : ۵۲ - ۵۳) سے بھی۔"

کسی ملک و قوم کے لیے آئین کی تدوین کس قدر ضروری اور اہم ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں آئندہ صفحات میں ہم آئین کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر گفتگو کریں گے۔

ساتواں باب

اِسلامی آئین کی تدوین اور علمائے کرام

قانون کی اہمیت

قوموں کے چہروں کی شادابی و پژمردگی اور اس کے عروج و زوال کی داستان اس نظام سے وابستہ ہوتی ہے، جسے اس نے اپنے ہاں وضع اور قائم کر رکھا ہو اور جہاں تک نظام کا تعلق ہے تو یہ دراصل اجتماعی طور پر سفرِ زندگی کے طریق کا ہی دوسرا نام ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر قانون اور نظامِ زندگی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں — اور یہی وجہ ہے کہ قوموں کی تقدیر نظام کی رہینِ منت ہوتی ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، یہ خطۂ زمین اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں حکمِ خداوندی کے مطابق قانون نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۲۸ سال کے طویل عرصہ سے ہمارے ہاں ہر مسجد و محراب سے اعلان کیا جا رہا ہے کہ یہاں کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نافذ نہیں ہو گا۔

پیر محمد اشرف صاحب کا انٹرویو

لیکن کسی قانون کا نفاذ تو تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب وہ مدوّن شکل میں موجود ہو۔ چنانچہ ہمارے درمیان غور طلب سوال یہ ہے کہ یہاں علماء دین نے قانون کی تدوین میں کیا کردار ادا کیا۔ سو یہ جاننے کے لیے سب سے پہلے ہمیں کالعدم جماعتِ اسلامی کے سابقہ قائمقام امیر جناب پیر محمد اشرف صاحب کا وہ انٹرویو دیکھنا ہو گا جو ۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کو روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین میں جناب جاذب سہیل صاحب کی طرف سے شائع ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ :

"میاں یاسین وٹو اور کئی دوسرے کالعدم پیپلز پارٹی کے رہنما میرے دوست تھے۔ یہ غالباً اپریل ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ "مولانا مودودی صاحب بھٹو سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس طرح کوئی تصفیہ کی راہ نکل آئے اور آگ اور خون کا یہ کھیل بند ہو سکے۔" میری اس بات پر توجہ دی گئی اور میرے کہنے پر مولانا مودودی اور بھٹو

کی اچھرہ میں مشہورِ زمانہ ملاقات ہوئی۔ ہماری حکمتِ عملی یہ تھی کہ مولانا سے بھٹو کی ملاقات بھی کرا دیں اور بھٹو کی کسی پیشکش کو مسترد بھی کر دیا جائے۔ اس میں ہم سو فی صدی کامیاب ہوئے" اور اس کے علاوہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ " میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنہوں نے مارشل لاء لگنے کی خوشی میں دیگیں پکائی تھیں۔" قائمقام امیر جماعت اسلامی اور یہ فلسفۂ حیات !!

صدر ایوب کی کوشش

انٹرویو کے دوران جب آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ایوب خان کے دَور کو کیسا پایا تو جناب اشرف صاحب نے فرمایا کہ :

" مَیں سمجھتا ہوں کہ صنعتی ترقی اور کاروباری لحاظ سے وہ سنہری دَور تھا۔ مَیں پہلی بار انکشاف کر رہا ہوں کہ ایوب خان نے مارشل لاء لگانے کے بعد آئین کو اسلامی بنانے کے لیے تمام دستاویزات مولانا مودودی کے پاس بھجوا دیں اور کہا " آپ مجھے اسلامی آئین بنا کر دے دیں مَیں اسے ملک میں نافذ کر دوں گا۔" مولانا مودودی (مرحوم) نے چودھری غلام محمد مرحوم کو کراچی سے ، مجھے ساہیوال سے ، نوابزادہ نصراللہ اور میاں طفیل محمد کے ساتھ ایک نشست رکھی جس میں اس مسئلے پر غور کیا گیا۔ مَیں نے اس میٹنگ میں کہا " جماعت کو یہ پیشکش قبول کر لینی چاہیئے ورنہ قادیانی اس کے گرد گھیرا ڈال لیں گے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اسلامی دستور بنا کر دے دینا چاہیئے تاکہ ملک میں اسلام نافذ ہو سکے۔"

اس انکار کی تہہ میں کیا جذبہ پوشیدہ تھا جناب اشرف صاحب کے ہی الفاظ میں سُنیئے۔ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ " آپ کے خیال میں ایوب خان کی بات مان لینی چاہیئے تھی ؟ " تو اس پر آپ نے فرمایا :

" جی ہاں ! اگر اس وقت اسلامی دستور بنا کر اسے دے دیا جاتا ، اس کے ساتھ تعاون کیا جاتا تو بلا مبالغہ اس میں جماعت اسلامی کا فائدہ بھی تھا کہ اس ملک میں نظامِ اسلام کی یہ واحد نمائندہ جماعت ہے اور پھر اس کا دیا ہُوا اسلامی دستور نافذ ہو جاتا تو اس کی نیک نامی توقیر میں اضافہ ہوتا۔ یہ سمجھا گیا کہ ایوب خان کو ہٹا کر خود اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔ مگر یہ تجربہ غلط ثابت ہُوا۔ دس سال گذر گئے ، پھر یحییٰ خاں اور بھٹو کے دور میں کالعدم جماعت اسلامی کے کہیں پاؤں نہ جم سکے۔"

جناب اشرف صاحب کے یہ الفاظ کہ

" یہ سمجھا گیا کہ ایوب خان کو ہٹا کر خود اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا۔" قابلِ غور ہیں۔

صدر ایوب کی پیش کش

صدر ایوب نے ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

" اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کیے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔" صدر نے کہا " یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسولؐ کی منشا تھی تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔" صدر نے کہا " میں نے ہمیشہ علماء سے کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں۔ اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں، اور اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دوں گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۸ء)

چنانچہ صدر ایوب کی اس اپیل پر جناب مودودی صاحب نے فرمایا :

" سب سے پہلے تو انہوں نے (صدر نے) مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہی چیز اسلامی قانون کے نفاذ میں مانع ہے۔ حالانکہ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لاز (یعنی ان کی اپنی فقہ) کے مطابق کیے جائیں گے۔ اس لیے شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر کوئی رکاوٹ عائد ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دُور کی جا چکی ہے اور اب ان اختلافات کو نفاذِ شریعت میں مانع قرار دینے کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۲ر جنوری ۱۹۶۹ء)

نہ معلوم ان ۲۲ نکات میں وہ کون سی شق ہے جس کی رو سے یہ طے پایا ہے کہ " ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔ علاوہ ازیں مودودی صاحب

کے نزدیک قرآن کریم جیسی لاریب اور محفوظ کتاب کے مقابلے میں سنّت کی وہ کون سی لاریب اور محفوظ کتاب ہے جس کے مطابق ایک متفقہ علیہ قانون بنایا جا سکے گا۔ جبکہ مرحوم کو ۱۹۷۰ء میں اس چیز کا خود اعتراف کرنا پڑا کہ کتاب و سنّت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق ہو۔" (بحوالہ ایشیا ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

لیکن اس کے باوجود مطالبہ پھر بھی یہی ہے کہ پاکستان کا قانون کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

آئین کی تدوین کے سلسلہ میں صدر ضیاء الحق کا بیان

صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے سندھ مدرسۃ الاسلام کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"قائدِ اعظم محمد علی جناح پاکستان میں قرآنی آئین نافذ کرنا چاہتے تھے (اور اس مقصد کے لیے) ان کی ہدایات پر پہلی آئین اسمبلی کی راہنمائی کے لیے قرارداد مقاصد بھی منظور کی لیکن افسوس اس قرارداد کے مطابق پاکستان میں کوئی آئین نہیں بنایا جا سکا۔ وہ بھی جو منسوخ ہو گئے اور وہ بھی جس کی مکمل بحالی کے لیے تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہے مملکتِ پاکستان کے لیے اسلامی آئین کی تدوین کا مسئلہ ۳۹ سال سے لاینحل پڑا ہے لہٰذا جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر یہاں اسلامی نظام کا نفاذ کیسا اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل کیسی۔

جناب چیف جسٹس کی اپیل

اس قسم کی ایک اور عملی مثال وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب آفتاب حسین صاحب کی وہ اپیل ہے جو انہوں نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علماء اور دانشوروں سے کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ آپ نے فرمایا کہ:

" انہوں نے بار بار اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے لیکن ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں وکلاء اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔" انہوں

نے کہا" علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا۔" انہوں نے بتایا کہ" وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلہ میں اپنی آراء پیش کی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا اس لیے یہ آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں ۔" انہوں نے کہا" وکلاء بغیر فیس کے مشورہ نہیں دیتے اس لیے وکلاء نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابلِ ذکر تعاون نہیں کیا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۹، نومبر ۱۹۸۲ء)

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس صاحب کے اس بیان کے بعد اسی قانون سازی کے سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے سردار عبدالقیوم صاحب (سابقہ صدر آزاد کشمیر) کے انٹرویو کے حوالہ سے اس طرح پردہ کشائی کی ہے کہ

سردار عبدالقیوم کا انٹرویو

" آزاد کشمیر کے سابق صدر سردار عبدالقیوم صاحب پچھلے دنوں " جنگ فورم میں تشریف لائے تو انہوں نے بتایا کہ جب وہ آزاد کشمیر کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ وہ جس اسلام کا نام ساری عمر لیتے رہے ہیں، اب وہ اسے نافذ کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو انہوں نے راہنمائی کے لیے دو سو کے قریب ملک کے ممتاز ترین علماء کو خطوط لکھے اور علماء سے درخواست کی کہ وہ انہیں بتائیں کہ وہ اسلام کس طرح نافذ کریں ۔ سردار صاحب کہتے ہیں کہ دو سو علماء میں سے صرف دو تین علماء نے انہیں جواب دیا۔ گویا باقی کے پاس بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں ورنہ جب ایک بااختیار شخص اسلام کو نافذ کرنے کے لیے خود راہنمائی طلب کرتا ہے تو ان کا خاموش رہنا قابلِ فہم نہیں ہو سکتا ۔"

علماء کے بائیس نکات اور فرقہ بندی

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کے لیے ۴۰ سال کے طویل عرصہ میں علماء حضرات نے کوئی قابلِ ذکر خدمت انجام نہیں دی ۔ البتہ سنہ ۱۹۵۱ء میں ۲۲ نکات کے تحت یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا (جن کا مختصر ذکر پہلے بھی آ چکا ہے)، کہ

۱۔ اسلامی مملکت کا فرض ہوگا کہ کتاب وسنت کے بتائے ہوئے معروضات کو قائم کرے منکرات کو مٹائے اور شعار اسلام کے احیا اور متعلقہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ ان کے قاضی یہ فیصلے کریں

یعنی بالفاظ دیگر فرقہ بندی کو قائم رکھنے کے لیے مخصوص نظریات کے تحت علیحدہ علیحدہ دارالعلوم قائم رکھے جائیں گے تاکہ ایسے افراد تیار ہوں کہ جن کے نہ تو عمر بھر آپس میں دل جڑ سکیں نہ سر اور ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ قاضی قانون فرقہ بندی کے ماہر قرار پائیں۔ اور ۹ سال کے طویل عرصہ میں یہاں طالب علموں کو نفسیاتی طور پر جذباتیت کے مہلک مرض میں اس قدر مبتلا کر دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے فقہی انحصار کے باعث سرسید کی یہ پکار سُن ہی نہ سکیں کہ "اسلام صرف قرآن حکیم میں ہے۔"

نظر و فکر (جامعہ نعیمیہ) گڑھی شاہو لاہور

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ لفظ بہ لفظ حقیقت پر مبنی ہے اور ہمارے موجودہ دارالعلوم اس کی شہادت خود آپ ہیں۔ اس وقت میرے سامنے جامعہ نعیمیہ رجسٹرڈ گڑھی شاہو لاہور کا تعارفی پمفلٹ ہے۔ جس میں اس دارالعلوم کے اغراض و مقاصد، سالہ تعلیمی نصاب، مدرسین کے ضوابط اساتذہ اور طلبا کے لیے شرائط درج ہیں۔ جہاں تک اس کی عمارت کا تعلق ہے، اس پر دیگر مذہبی دارالعلوموں کی طرح لاکھوں روپے صرف ہو چکے ہیں۔ اس پمفلٹ کے صفحہ ۳۵ پر اغراض و مقاصد کے عنوان کے تحت مسلک بیان کرتے ہوئے تحریر ہے :

(۱۰) اس جامعہ کا مسلک خاص اہلسنت و جماعت کے مطابق فقہ حنفی ہوگا۔

(۱۱) جمعیت عالیہ کے ہر رکن کا مسلک قرآن وسنت کی تشریحات (قرآن حکیم کے مطابق تہیں بلکہ) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مسلک، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی رح اور حضرت صدر الافاضل مولانا حافظ

ے راقم

محمد نعیم صاحب فاضل مراد آبادی قدس سرہٗ کے مطابق ہونا لازم ہو گا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے"
اور جو شخص ان بزرگوں کی کسی تحریر یا مسلک سے اختلاف کرے گا اس کے متعلق تحریر ہے کہ

وہ شخص رکنیت سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے (جو)

(۱۷) خدانخواستہ جامعہ کے مسلک کی دفعہ ۱۲ کے انحراف کرے (صفحہ ۳۶)

اس کے صفحہ ۳۸ پر مدرسین کے لیے ضوابط فارم کی شق اوّل یہ ہے کہ

"مسلک اہلِ سنّت وجماعت بمطابق فقہ حنفی کا پابند رہوں گا اور (۲) یہ کہ حضرت صدرالافاضل السید الحافظ محمد نعیم الدّین صاحب قدس سرہٗ فاضل مراد آبادی کے ہم عقیدہ رہوں گا جو ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔"

یعنی جو شخص یہ کہے قول فیصل صرف قرآن حکیم ہے اور اس کے علاوہ کسی بزرگ کی تعلیم اور اس کا کوئی خاص مسلک اس کے لیے سند قرار نہیں پا سکتا تو وہ شخص ان حضرات کی سوسائٹی کا نہ ممبر بن سکتا ہے نہ ہی اس دارالعلوم کا طالب علم۔ کیونکہ ان کے اپنے الفاظ میں طالب علموں کو جن امور کا پابند ہونا ضروری ہے اس کے مطابق ہر طالب علم کو یہ تحریری طور پر لکھ کر دینا پڑتا ہے کہ:

"جامعہ نعیمیہ کی کتب چارپائی اور دیگر سامان کی حفاظت کروں گا اور مسلک بریلوی اہلسنّت وجماعت کی ترویج و اشاعت کروں گا۔" (بحوالہ تعارف جامعہ نعیمیہ لاہور صفحہ ۳۹)

جہاں تک ان دارالعلوموں میں قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کی دعوت کا تعلّق ہے تو یہ چیز ان طلباء کے کورس میں ہی شامل نہیں۔ البتہ عربی بول چال سکھا دی جاتی ہے ــــ اور اسی قسم کے حقائق جامعہ اشرفیہ لاہور کے علاوہ ملک کی باقی مذہبی یونیورسٹیوں کے متعلق ہیں۔

قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ہر آنے والی نسل اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے پیشِ نظر تعریفِ لآیات کے تحت اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہوئے اپنے لیے راہنمائی طلب کرے۔ کیونکہ تعلیماتِ قرآنی تو وہ بحرِ زخار ہے، کہ آپ جوں جوں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں اس کی وسعتیں مزید آگے پھیلتی جائیں گی۔ قرآن حکیم تو خارجی کائنات کی مانند ایک نہ ختم ہونے والا خزینہ ہے لیکن جس قوم نے اس کی تعلیم کو کسی خاص دور کے من پسند افراد کی سوچ تک ہی محدود کر رکھا ہو وہ اس سے کیا حاصل کرے گی؟۔ اس لیے ان حالات میں یہ توقع کرنا کہ فرقہ بندی اور فرقہ بازی کی موجودگی میں قرآن خالص کو بنیاد تسلیم کیے بغیر ہم کسی متفق علیہ اسلامی آئین کو ترتیب دے لیں گے نہ صرف یہ کہ یہ امر محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

یورپ کی اسلامی کونسل

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ۱۹۸۳ء میں یورپ کی اسلامی کونسل کا مرتب کردہ اسلامی دستور کا مسودہ (یا خاکہ) پاکستان آیا اور اس کی دفعہ (۱) الف میں کہا گیا تھا کہ:

"حاکمیت بلاشرکت غیرے اللہ تعالیٰ کی ہے اور مقتدرِ اعلیٰ شریعت ہے۔"

اور شق 'ب' میں تحریر تھا کہ "شریعت قرآن و سنت سے عبارت ہے اور قانون سازی اور طرزِ حکمرانی کا ماخذ ہے۔"

جبکہ حالت یہ ہے کہ سنت ہر فرقے کی علیحدہ علیحدہ ہے۔

علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت

سو یہ ہے باہمی نفاق و انتشار کی وہ سنگلاخ اور خاردار وادی جس میں ملتِ پاکستان ۳۸ سال سے خیمہ زن چلی آرہی ہے اور ایک صحیح اسلامی آئین کی تدوین کے سلسلہ میں اس قدر تذبذب کی شکار ہے کہ ہر کوئی بے بسی و بے کسی کے عالم میں ایک تصویر بنا بیٹھا ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں اس جہنم سے نکلنا چاہیے اور آئندہ نسلیں بھی ہمیں مجرم قرار نہ دیں تو پھر ہم پر لازم ہے کہ ہم اقبال جیسے مفکرِ قرآن اور دیدہ ور کی یہ آواز بغیر کسی تعصب کے سُن لیں۔ جسے، انہوں نے اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں کچھ اس طرح بلند کیا ہے:

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیّر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیّر پذیر عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لیے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے کے اندر تغیّر کا امکان ہی نہیں تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ

ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

طلوع اسلام کا تبصرہ

علامہ اقبال کا یہی وہ ارشاد تھا جس کی روشنی میں ادارہ طلوع اسلام لاہور نے تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ:

"قرآن کریم کے ان غیر متبدل اصولوں کی جزئیات سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب فرمائیں۔ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رکھا جانا نہ مقصود دین تھا نہ منشائے رسالت۔ یہ وجہ تھی جو حضورؐ نے ان جزئیات کو مدون کر کے ان کا (اپنی احادیث کا) مجموعہ امت کو نہ دیا اور نہ ہی خلفائے راشدین نے ایسا کیا۔ اس کے برعکس ہمیں تاریخ میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں خلفائے راشدین کے زمانے میں ان جزئیات میں ردو بدل کیا گیا۔"

اور اسی سلسلہ میں دوسری جگہ تحریر کیا تھا کہ "جزئیات غیر متبدل نہیں ہوتیں۔"

مزید وضاحت

"اگر اللہ تعالیٰ نے اصولوں کی جزئیات و تفصیلات خود نہیں بتائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان امور کی تفصیلات کو محدود نہیں کرنا چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے۔ خدا کی آخری کتاب کے لیے جسے اقوام عالم کے لیے ہر ملک اور ہر زمانے میں ابدی ضابطہ حیات بننا تھا، ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اسے زندگی کے لیے اصول دینے چاہئیں تھے جو ہر زمانے میں نوع انسان کے لیے راہ نمائی کا کام دے سکیں۔ اور ان کی جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دینا چاہیئے تھا تاکہ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق انہیں خود مرتب کریں۔ یہ اصول غیر متبدل رہتے اور ان کی چار دیواری کے اندر مرتب کردہ جزئیات میں حسب ضرورت تبدیلی ہوتی رہتی۔ اسی طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے کاروان انسانیت زندگی کے ارتقائی منازل طے کرتا آگے بڑھتا چلا جاتا۔"

ملوکیت کا علاج

یہی وہ ثبات و تغیر کا حسین امتزاج ہے کہ جس کے بغیر معاشرہ خلافت کی بجائے ملوکیت میں بدل جاتا ہے۔ جس سے محفوظ رہنے کے لیے علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ سے کہا تھا ؎

خلافت برمقام ماگواہی است　　حرام است آنچہ برما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکراست و نیرنگ　　خلافت حفظ ناموس الٰہی است

یعنی امتِ مسلم کا صحیح مقام حکومتِ خداوندی ہے۔ انسانوں کی ہر قسم کی حکومت اس کے نزدیک حرام ہے۔ انسانوں کی حکومت خواہ اس کی شکل کچھ ہی کیوں نہ ہو مکر و فریب کا جال اور شعبدہ بازی کا سراب ہوتی ہے ناموس الٰہی کی حفاظت صرف قرآنی حکومت میں ممکن ہے۔

وَتُوبُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ ٱلْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥

اور اے مومنوں سب کے سب اللہ کی طرف رجوع کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔
(سورہ النور۔ آیت ۳۱)

آٹھواں باب

عُلما کی علمی سطح، دانشوروں کی نظر میں

جناب فاروقی صاحب سے انٹرویو

سابقہ صفحات میں کی گئی تمام تر گذارشات کی روشنی میں اگر اس چیز کا جائزہ لینا مقصود ہو کہ یہ ماحول ہمارے ہاں کس قسم کے علماء پیدا کرتا ہے تو اس کا اندازہ جناب فاروقی صاحب چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ کے انٹرویو سے لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے لندن ویک اینڈ ٹیلی ویژن کے نمائندہ کو دیا تھا۔ اور جو ۸ فروری ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد سے شائع ہونے والے اخبار "مسلم" میں شائع ہوا۔ انٹرویو کے مطالعے سے ہی یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکے گی کہ اقبال کے مردِ مومن حضرت قائدِ اعظم نے جو مذہبی پیشوائیت کی اس قدر مخالفت کی اس کی وجہ جواز کیا تھی؟

علماء کا پیش کردہ نظریہ:

سوال نمبر ۱: تشکیلِ مملکت (پاکستان بننے کے بعد) جو مذہبی نظریہ ان علماء نے پیش کیا وہ کس قسم کا تھا اور یہ کیسے لوگ تھے؟

جواب: جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ یہ قدامت پرست طبقہ تھا جس کا موقف اسلام کی اس تعبیر کا مظہر تھا جو پہلی یا دوسری صدی ہجری کے فقہائے اسلام نے مرتب کیا تھا۔ علاوہ ازیں پاکستان میں سنی اور شیعہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں۔ سُنیوں کے نزدیک فقہ کے چار امام ہیں جن کے وضع کردہ قوانین حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں ان کے برعکس شیعہ حضرات کے نزدیک یہ حیثیت ان کے بارہ اماموں کو حاصل ہے۔ بنیادی مشکل یہ ہے کہ ان حضرات کا مسلک اپنے اپنے فقہا کے پیش کردہ اسلام کی اندھی تقلید تھا۔ جیسا کہ ظاہر ہے کہ ان فقہاء کا زمانہ پہلی یا دوسری صدی ہجری تھا اور جو مسائل اس وقت ان کے پیشِ نظر تھے وہ ہمارے زمانے کے مسائل سے مختلف تھے۔ عرب معاشرہ بنیادی طور پر قبائلی تھا۔ ان کی معیشت گلہ بانی تھی۔ جب اسلام بیرونِ عرب ممالک پہنچا جن کی معیشت زرعی تھی تو ان کے معاشرہ کے مسائل زیادہ پیچیدہ تھے۔ جب مسلم فقہا کو ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا، تو انہیں اسلام کی ایسی تعبیر تو کرنی پڑی جو اس جدید معاشرہ کے حسبِ حال ہو۔ ہم اس نظریہ کو آگے بڑھا کر دورِ حاضرہ میں پہنچتے ہیں جہاں کی معیشت صنعتی ہے۔ جس طرح سابقہ دور کے مسلم فقہا نے زرعی معیشت کے سلسلہ میں اسلام کی ایسی تعبیر تو کی تھی جو اس سے ماقبل معاشرہ میں پیش کردہ تعبیر سے مختلف تھی، اب اسی

طرح یہ لازمی ہے کہ دورِ حاضرہ میں صنعتی معیشت کے پیشِ نظر اسلام کی تعبیرِ نو کی جائے۔ کیونکہ زمانے کے مسائل سابقہ دور کے مسائل سے مختلف ہیں لیکن ہمارے علماء کا جمود اور قدامت پرستی کسی تعبیرِ نو کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ وجہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں جو اسلام علماء پیش کرتے ہیں وہ ان کے لیے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

کیا تقاضوں کو پورا کیا جا سکے گا

سوال نمبر ۲: کیا یہاں کے علماء اپنے ملک میں تبدیلی کر کے اسلام کا ایسا قالب پیش کریں گے جو لوگوں کے تقاضوں اور ضروریات کو پورا کر سکے؟

جواب: مشکل یہ ہے کہ علماء کی تعلیم قدیم روایات کے تحت ہوئی ہے ضروری ہوگا کہ وہ اپنے اندر عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے سینے میں کشادگی پیدا کریں۔ یہ سب سے پہلی ضرورت ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کتنے علماء ہیں، جنہوں نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کے لیے اپنی نگاہ میں وسعت اور سینے میں کشادگی پیدا کی ہے!!!

لہٰذا اس ضمن میں پہلا سوال ہی یہ ہے کہ کیا علماء اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔

فرقہ وارانہ اختلافات کی پیدا کردہ رکاوٹ

سوال نمبر ۳: کیا آپ بتائیں گے کہ ۱۹۴۷ء کے لگ بھگ علماء کا یہ جمود اور فرقہ وارانہ اختلاف اسلامی مملکت کے قیام کے لیے ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے راستے میں ان کے لیے کس طرح رکاوٹ بنا رہا؟

جواب: اصل سوال تو ذہنیت اور نقطۂ نظر کا ہے۔ یہ ان علماء کا جمود اور قدامت پرستی ہے جو انہیں سیدھی فرقہ وارانہ سطح پر پہنچا دیتی ہے۔ ایک فرقہ کے علماء کی اسلامی تعبیر دوسرے فرقے کی تعبیر سے مختلف تھی۔ اختلافات دور کرنے کے لیے عملی تخلیق کی ضرورت ہوتی ہے اور جمود اور قدامت پرستی عملی تخلیق کو فنا کر دیتی ہے۔ یہی ایک وجہ ہے جو یہ علماء کبھی ایک محاذ پر متفق نہیں ہو سکے۔ وہ گاہے گاہے کسی ہنگامی مقصد کی خاطر یکجا بھی ہو جاتے ہیں لیکن جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۷۷ء کا قومی اتحاد ہمارے سامنے ایک زندہ شہادت ہے۔ (بحوالہ "طلوعِ اسلام" مارچ سنہ ۱۹۸۰ء)

علامہ اقبال کی سوچ

اس زبوں حالی کو محسوس کرتے ہوئے بہت عرصہ پہلے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

"ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام یعنی خدا کے عطا کردہ دین کے ساتھ اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں اس کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں اس

مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کردوں جس کی اشاعت رسولِ اکرم صلعم سے ہوئی۔"

(بحوالہ منشی سراج دین کے نام خط ۱۹۱۵ء)

اور اس سے پیشتر علامہ اقبال کا وہ بیان جو پہلے بھی دیا جا چکا ہے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی یہ کہ:

"ہمارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے .... روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لیے تو شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائیں۔"

(۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء)

آغا شورش کاشمیری اور علماء کرام

آغا شورش کاشمیری کی شعلہ بیانی سے کون واقف نہیں۔ مرحوم نے علماء کرام کی اس ذہنی کیفیت اور علمی قابلیت کے پیشِ نظر اپنے مؤقر جریدہ "چٹان" کا ایک اداریہ ۲۳، اپریل ۱۹۶۹ء کو سپردِ قلم کیا جو لاہور میں ہونے والی سیرت کانفرنسوں کے سلسلہ میں تھا۔ آپ نے لکھا تھا:

سیرت کی محفلیں علما اور سامعین

"ابھی پچھلے دنوں لاہور میں دو تین کانفرنسیں ہوئی ہیں ان میں بعض قابلِ احترام اور جید علماء شریک ہوئے۔ سب نے اپنے موضوع پر نہایت مرصع تقریریں کیں۔ ان کانفرنسوں میں ہم نے تین باتیں پائیں۔

۱- پہلی بات شرکاء اجلاس (سامعین) کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کے موروثی پیروکار ہیں اور تذکرہ سیرت کی ان محفلوں کو ثوابِ دارین پر محمول کرتے ہیں لیکن اسلام کا معاشرہ سے مطالبہ کیا ہے اس سے قطعاً واقف نہیں ہیں۔

۲- دوسری بات اکثر تقریریں وعظ کی حیثیت رکھتی تھیں ان کا عصرِ حاضر اور اسلام دعوتِ رسالت اور عصری سیاست کے مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عام خیال یہ ہے اور ہے بھی بڑی حد تک

قرینِ صداقت کہ ہمارے یہ علماء "قرآن ہر زمانے میں بولتا ہے" کی سچائی سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ یہ علماء سے کہیں بڑھ کر اسلام کے داستان گر ہیں ان کا بلکہ کسی بھی روائتی عالمِ دین کا مسلمانوں پر کوئی اجتماعی اثر نہیں۔

۳۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ شخصی احترام کے باوجود ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان علماء کی ننانوے فیصد اکثریت ایسی ہے کہ ہمارے دل میں ان کے لیے ذہنی احترام مفقود ہے۔ ہم اسلام سے براہِ راست آگاہ نہ ہوتے تو ان بزرگوں کا وجود ہی اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ نئی نسلیں اسلام سے کٹ رہی ہیں۔ ان کی وجہ خود ہمارے علماء (وارثانِ منبر و محراب) کا وجود ہے اور وہ نسل جو پچھلے دس پندرہ برس میں جوان ہوئی ہے اس کی ایک خاصی تعداد بے زار ہے اور اور ایک غالب تعداد ہے کہ تاریخِ اسلام میں ان بزرگوں کا وجود گورکن سے زیادہ کوئی مرتبہ یا معنی نہیں رکھتا۔"

ارشاد احمد حقانی صاحب اور علماء کرام

جناب ارشاد احمد حقانی صاحب مشہور کالم نویس جنگ لاہور کے کہنے کے مطابق:

"ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر اہلِ مذہب جدید رجحانات سے آگاہ نہیں۔ ان کی دلچسپیاں خاص قسم کے مسائل اور مباحث تک محدود ہیں۔"

پھر مزید فرمایا: "یہ چیز تعلیم یافتہ لوگوں میں مذہب کے بارے میں ایک منفی ردِعمل اُبھار رہی ہے۔ جس کے تدارک کی فکر کی جانی چاہیے۔ المیہ یہ ہے کہ چیزوں کے اسلامی اور غیر اسلامی ہونے کا فتویٰ جاری کرنے والوں کی غالب اکثریت روحِ اسلام سے آگاہ ہے نہ روحِ عصر سے۔"

(بحوالہ جنگ ۷، جولائی ۱۹۸۳ء)

۱۹۸۳ء کے بعد ۱۹۸۴ء میں اسی حقیقت کو جناب حقانی صاحب نے اس انداز سے فرمایا کہ:

"ایک زمانہ تھا کہ پورے برِصغیر میں ایک دو افراد کو علامہ کہا جاتا تھا جیسے علامہ مشرقی اور علامہ اقبال۔ لیکن آج ہر دوسرا مولوی علامہ ہے۔ جس نے چند شعر یاد کر لیے اور تاریخ اسلام کے دو چار واقعات ان کی صحیح معنویت سمجھے بغیر رٹ لیے وہ علامہ بن جاتا ہے۔ اس کی جلسہ گاہ میں آمد پر نعرے لگتے ہیں۔ اس کے تقریر کے لیے کھڑے ہونے پر نعرے گونجتے ہیں۔ اس کی تقریر کے دوران داد ملتی ہے۔ اور بات جس قدر احمقانہ کی جائے اسی قدر زیادہ پُرجوش پذیرائی

ہوتی ہے۔ دین کا ایک مضحکہ خیز اور انتہائی مسخ شدہ تصور ایسے جاہل علاموں کے ذریعہ نیم خواندہ عوام میں پھیلایا جارہا ہے اور یہ کاروبار ایک جگہ نہیں سارے ملک میں ہو رہا ہے۔ "

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۴ء)

مسٹر جسٹس قدیرالدین احمد کا بیان

جناب وارث میر صاحب جو ہمارے ہاں ایک نامور صحافی اور پروفیسر ہیں اپنے ایک قسط وار مضمون "عورت اور پردہ" میں جناب مسٹر جسٹس قدیرالدین کے حوالے سے روزنامہ جنگ لاہور میں مورخہ ۲۸ جولائی ۱۹۸۳ء کو تحریر کرتے ہیں کہ :

" جسٹس قدیرالدین نے نہایت قابلِ اعتراض" اور" تکلیف دہ " باتیں کی ہیں ذرا سن ہی لیجئے۔ " اب علوم اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ ان (مذہبی) علماء کا علم وفضل بہت ہی محدود اور نامکمل نظر آرہا ہے۔ وہ علم اقتصادیات کے ماہر نہیں کہ معاشی مسائل پر حکم لگا سکیں۔ فنِ حرب کے ماہر نہیں کہ جنگ اور صلح کے متعلق رائے دے سکیں۔ علمِ سیاسیات کے ماہر نہیں کہ طرزِ حکومت اور طریقۂ انتظام ملکی میں دخل دے سکیں۔ تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، عمرانیات، بشریات، تاریخ ادیان عالم، جدید فلسفہ، جدید منطق، جدید سائنس اور فلکیات ان کے نصاب میں داخل نہیں بلکہ تاریخ تفسیر اور تاریخ فقہ بھی ان کے نصاب میں شامل نہیں ہے۔ ان علوم اور مسائل کو وہ تعلیم یافتہ اصحاب جن کی گنتی علماء میں نہیں ہے، اکثر علماء سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس لیے جب علمائے دین تحکمانہ انداز سے اپنے فیصلے صادر کرتے ہیں تو ان کو سن کر جدید تعلیم یافتہ لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور وہ سارے مسائل جن پر صحیح اجتہاد درکار ہے، مسلمانی در کتاب کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ پھر جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر خفگی اور غصہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو مغرب زدہ، راحت طلب، نفس کا غلام اور بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ملک میں قدیم طرز تعلیم کی خصوصیت یہی رہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو اس پر غصہ کیا جائے۔ تکلیف دہ سوالات کرنے والے کا منہ بند کر دیا جائے۔ ایسے سوالات کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ ان کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ نہ سکے۔ "

(دورِ حاضر اور اجتہاد)

علماء کی علمی سطح کے متعلق اس حقیقتِ حال کو جاننے کے بعد مندرجہ ذیل خبر ملاحظہ فرمائیں :

"علماء کا مطالبہ اور ان کا الٹی میٹم

ایک پریس ریلیز کے مطابق مجلس عمل تحفظ حقوق علماء کرام و ملازمین اوقاف پنجاب کے صدر قاضی محمد زمان خان کی اپیل پر ایک ہزار سے زائد مساجد میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں (جن کے تحت) صدر، وزیر اعظم، وفاقی وزیر خزانہ اور صوبائی وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا گیا کہ آئندہ بجٹ میں محکمہ اوقاف کے علماء کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ علمائے دین کی کم از کم تنخواہ ڈھائی ہزار کی جائے۔ رہائشی مسائل حل کیے جائیں، موٹر سائیکل ایڈوانس اور مکان ایڈوانس کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ قرارداد میں کہا گیا کہ اگر علماء کے ساتھ زیادتیاں جاری رہیں تو وہ عید کے بعد نماز جنازہ نہیں پڑھائیں گے اور بچہ پیدا ہونے پر کان میں اذان نہیں دیں گے اور نہ ہی کسی کا نکاح پڑھائیں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ امروز لاہور مورخہ ۷ مئی ۱۹۸۶ء)

ہمارا خیال ہے کہ اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر ہمیں آگے چلنا چاہیے۔

عدالت کی تحقیقاتی رپورٹ

فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء کے سلسلہ میں تحقیقاتی عدالت کی طرف سے شائع کردہ رپورٹ کے مطابق دورانِ تفتیش عدالت نے پاکستان کے نو جید علماء کرام جن میں (۱) مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان (۲) مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان (۳) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی۔ (۴) غازی سراج الدین منیر صاحب (۵) مفتی محمد ادریس صاحب جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد (۶) حافظ کفایت حسین صاحب ادارہ تحفظ حقوق شیعہ (۷) مولانا عبدالماجد بدایونی صدر جمعیت العلمائے پاکستان (۸) مولانا محمد علی کاندھلوی دارالشہابیہ سیالکوٹ (۹) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے پوچھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟

چنانچہ ان تمام حضرات کی طرف سے جوابات سننے پر عدالتِ عالیہ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ "ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں، پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی کوئی ضرورت ہے بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلمان" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالمِ دین کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی کی

تعریف کو اختیار کریں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔"
(بحوالہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء)

"مسلمان کی تعریف" کے ہی سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کالم روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ فروری ۱۹۸۴ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"مجھے یاد ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی نے علماء سے مسلمان کی تعریف دریافت کی تو علماء نے آپس میں مشورہ کے بعد کہا تھا کہ "ہمیں اس کے لیے کچھ مہلت دیجئے۔" (تو جسٹس موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ) آپ کو ڈیڑھ ہزار سال کی مہلت مل چکی ہے اس سے زیادہ کی مہلت دینا اس عدالت کے اختیار میں نہیں۔"

اگر دیکھا جائے تو جو کچھ اس ایک فقرہ میں کہہ دیا گیا ہے، اسے ضخیم سے ضخیم کتاب میں بھی اس خوب صورتی سے نہیں کہا جا سکتا۔

ملیچھوں کے سے سلوک پر بھی اعتراض نہیں

اسی عدالت نے جناب مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صدر جمعیت العلمائے پاکستان سے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ "اگر ہندو اپنے نظامِ حکومت میں منوشاستر کے تحت مسلمانوں سے ملیچھوں یا شودروں کا سا سلوک کرے تو کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا؟" تو ان کا جواب تھا "جی نہیں۔"

اور یہی سوال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا "یقیناً" مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ حکومت کے اس نظام میں مسلمانوں سے ملیچھوں اور شودروں کا سا سلوک کیا جائے ان پر منو کے قوانین کا اطلاق کیا جائے اور انہیں حکومت میں حصّہ اور شہریت کے حقوق قطعاً نہ دیے جائیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے۔" (ایضاً)

اور یہی جواب میاں طفیل صاحب کا لعدم جماعت اسلامی کے امیر کا تھا۔ (ایضاً صفحہ ۲۴۶)

شاید اسی صورت حال کو قائم رکھنے کے لیے جناب مودودی صاحب نے فرمایا تھا کہ "مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد ہے وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔"

(بحوالہ "سیاسی کشمکش" حصّہ سوم۔ صفحہ ۹۳)

میرا خیال ہے کہ عدالتِ عالیہ میں دیئے گئے اس بیان کے بعد یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی کہ ہماری زبوں حالی فرقہ بندی اور پارٹی بازی کی اصل وجہ کیا ہے اور ملّتِ اسلامیہ کی یکجہتی میں کون لوگ حائل ہیں۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا کِس طرح تیرا جوہرِ ادراک
کِس طرح ہُوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم تیرے کیوں
کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک

اب تک ہے رواں گرچہ لہُو تیری رگوں میں
نے گرمیٔ افکار نے اندیشۂ بے باک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

مذہب اور دین میں فرق

یہ دیکھنے کے لیے کہ رہبانیت (مذہبی پیشوائیت) کا تراشیدہ مذہب دینِ خداوندی کے مقابلے میں انسان کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیتا ہے، اس کا اندازہ اس تقابل سے لگایا جا سکتا ہے جو ماہنامہ "طلوعِ اسلام" لاہور نے جون ۱۹۷۹ء کے شمارہ میں پیش کیا تھا اور وہ یہ کہ:

تقابلی جائزہ

مذہب	دین
۱۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔	۱۔ دین اجتماعی نظامِ زندگی و خارجی حقیقت ہے۔
۲۔ مذہب میں ہر فرد اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے	۲۔ دین میں معاشرہ کا انداز و آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانین خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔
۳۔ مذہب میں ہر فرد کا منتہا اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔	۳۔ دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔
۴۔ مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔	۴۔ دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔
۵۔ مذہب علم کا دشمن اور عقل کا حریف ہے۔	۵۔ دین انسان کو علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب ہے۔
۶۔ مذہب عقل کے دیے گل کرتا ہے کہ اس کا چراغ نہ جلے۔	۶۔ دین عقل کے دیے میں روغن ڈالتا ہے کہ زندگی کے راستے جگمگائیں۔
۷۔ مذہب اپنے آپ کو اندھی عقیدت کی بنا پر منواتا ہے۔	۷۔ دین اپنے ہر دعوے کو دلیل اور برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

۸- مذہب لوگوں کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف لے جاتا ہے۔	۸- دین انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔
۹- مذہب کی تلقین یہ ہوتی ہے کہ تم بھیڑ بکریوں کی طرح سر جھکائے آنکھیں بند کیے پامال راستوں پر چلتے رہو۔	۹- دین کا پیغام یہ ہوتا ہے کہ ؎ تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن حرام است
۱۰- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کیے چلا جاتا ہے اسی لیے مذہب ہر زمانے میں نئے نئے بُت تراشتا رہتا ہے تاکہ عوام کو بہلائے رکھے۔	۱۱- دین اپنی حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی سطح کو بلند کرتا ہے۔ دین تیشۂ ابراہیمی سے ہر قدیم اور جدید بُت کے ٹکڑے کر دیتا ہے۔
۱۱- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے	۱۱- دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت و بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔
۱۲- مذہب انسان کو ہر بڑی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونا سکھاتا ہے۔	۱۲- دین اسے ایک خدا کے قوانین کا اطاعت گزار بنا کر دنیا کے ہر آستانے سے سرفرازانہ مستانہ وار گزر جانے کی تلقین کرتا ہے۔
۱۳- مذہب مادی کائنات کو قابلِ نفرت قرار دے کر اسے تیاگ دینے کی تلقین کرتا ہے۔	۱۳- دین مادہ کی تسخیر سے انسان کو حدود فراموش بلندیوں تک لے جاتا ہے۔
۱۴- مذہب اس دنیا کو ترک کر دینے سے آخرت کی جنت کا وعدہ دیتا ہے	۱۴- اور دین اس دنیا کو سنوارنے سے یہاں بھی جنت حاصل کراتا ہے اور وہاں بھی۔
۱۵- مذہب کمزوروں، ناتوانوں، مظلوموں کو یہ تعلیم دے کر مطمئن رکھتا ہے کہ یہاں سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور راضی برضا رہنا خدا کے مقرب بندوں کی نشانی ہے۔ اس سے مستبد، ظالم اور غاصب قوتیں بے لگام چھوڑ دی جاتی ہیں کہ وہ جو جی میں آئے کریں۔	۱۵- دین ظلم و استبداد، سلب و نہب کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔ وہ کمزور انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ قوانین خداوندی کے اتباع سے ایسا نظام قائم کریں جس میں ہر ظالم اور مستبد حق اور انصاف کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائے
۱۶- مذہب ہر خوشی میں غم کا پہلو دکھاتا ہے اور انسان	۱۶- دین ہر غم کو خوشی کا پیش خیمہ سمجھتا ہے اور انسان

ایسی مایوس ساز ذہنیت پیدا کر دیتا ہے جس میں اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ؎

آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

۱۷- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

۱۸- مذہب کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور تیوریاں چڑھانا سکھاتا ہے

۱۹- مذہب موت کی سسکیاں ہیں

۲۰- مذہب انسانی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کرتا ہے۔

۲۱- مذہب انسان کی موت ہے۔

نگاہ میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی انتہائی تاریکیوں میں بھی روشنی کی کرن دیکھتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

۱۷- دین اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کی عبادت کو غایت بتاتا ہے

۱۸- دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ (۷/۳۲)

۱۹- دین زندگی کے قہقہے ہیں۔

۲۰- دین قبرستانوں میں صورِ اسرافیل پھونک کر مردوں کو حیاتِ تازہ عطا کر دیتا ہے۔

۲۱- دین ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مذہب کا مدار لالچ اور خوف پر ہوتا ہے

مذہب اور دین کے سلسلہ میں اس پیش کیے جانے والے تقابل پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ ہمارے ہاں اکثر (کتاب و حکمت کے بلند فلسفہ کے تحت) دین خداوندی کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار کی اہمیت و افادیت کو علیٰ وجہ بصیرت دل کی گہرائیوں میں جاگزیں کرایا ہی نہیں جاتا بلکہ اس کے برعکس مذہبی دنیا کا تمام کاروبارِ حیات یا تو لالچ پر ہوتا ہے یا خوف پر اور پھر یہ کہ مذہبی دنیا کے کسی شعبہ میں بھی بچوں کی نفسیات کے نام کی کوئی شے ہوتی ہی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ ملت کے ان شاہین بچوں کے خوبصورت عزائم کے چراغ زندگی بھر روشن نہیں ہوتے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر دین کی پُرنور وادیوں پر گامزن ہونے کی بجائے مذہب کے تاریک راستوں پر ہی ٹھوکریں کھاتے گود سے لحد تک جا پہنچتے ہیں۔

راقم ان بیان کردہ حقائق کی مزید وضاحت کے لیے اپنے ایک محسن جناب --- کلاغ کے چند ایک اوراق (ان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ) پیش کر رہا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ قارئین اِن دو چار صفحات پر پھیلی ہوئی اِس سچی اور سچی آپ بیتی کے چھوٹے فقرات کے ایک ایک لفظ کی گہرائی پر غور کریں گے اور وہ اِس لیے کہ شاید اس طرح حقیقت تک پہنچنے کے لیے یہ اقتباسات ہماری کوئی مدد کر سکیں۔ اور ہم علّتِ مرض کو جان لیں۔

ایک سبق آموز حقیقی داستان

چنانچہ تحریر ہے کہ :

- دادا جی چونکہ مذہبی پیشوا تھے اور والد بھی قاضی ہوتے تھے، اِس حوالے سے مجھے بھی انہوں نے ابتدا ہی سے مذہبی تعلیم دینا اور دلوانا شروع کی۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے لیے مجھے ... کی قصائیوں والی مسجد میں ایک نابینے حافظ جی کے سپرد کر دیا۔ یہ ایک درسگاہ تھی اور اِس درس گاہ میں لڑکے اور لڑکیاں، بڑے اور چھوٹے، اکٹھے قرآن پڑھا کرتے، ان میں سے اکثر حفظ کرتے۔ صبح سویرے طلوعِ آفتاب سے لے کر شام کی اذان تک پڑھائی ہوتی۔ چُھٹی یا فرصت کا یہاں کوئی تصور نہ تھا۔۔ جہاں حافظ جی تندہی اور محنت سے پڑھانا جانتے وہاں پٹائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ایک کو بلا امتیاز و درجہ و عمر بلا ناغہ روزانہ مارتے اور اِس قدر مارتے کہ الامان الحفیظ۔ چیخ و پکار دُور دُور تک سُنائی دیتی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اُن کے من میں ایک جوش سا اُبھرتا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور قطار در قطار، یکے بعد دیگرے، قدم بہ قدم، سب کو پیٹتے چلے جاتے۔ کہرام مچ جاتا۔ کوئی پُرسانِ حال نہ ہوتا۔ صحت مند ہاتھوں کے علاوہ کیکر کے ڈنڈے استعمال کرتے جو روزانہ بن کر آتے اور ٹُوٹتے چلے جاتے۔ میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ داخل ہوئی تھی لیکن تاب نہ لا سکی اور چند ہی ماہ بعد گھر پر آ گئی۔ میرا چار سال کا عرصہ اس درس گاہ میں گزرا۔ لیکن ایک دن بھی ایسا نہ تھا جو میرے لیے قیامت سے کم ہو۔ جسم کا کوئی حصّہ بچا نہیں تھا جو چھلنی نہ ہُوا ہو۔ کوئی جگہ نہ تھی جہاں ورم نہ آیا ہو۔ اِدھر گھر پر والد کی سخت گیری اور مار کٹائی میرے لیے اور بھی اذیت ناک عذاب تھی۔ میری ذہانت تسلیم شدہ تھی اور مجھ میں محنت کی کمی بھی نہ تھی لیکن اس سے کیا

فائدہ: حافظ جی کے درس کی یہ خصوصیت تھی، یہ رائج تھا، اغلباً ان کے عقائد میں سے تھا، کہ ایک ایک حرف پر اور ایک ایک لفظ پر مارا جائے اور مارا بھی جائے اس زور اور گرمجوشی سے کہ طالب علم میں سکت باقی نہ رہے۔ اذیّت رسانی میں یہ درس گاہ مشہور تھی اور یہ بھی مشہور تھا کہ یہاں کے پڑھے ہوئے حافظ "پکّے" حافظ ہوتے ہیں۔ "پکّے" اور "کچّے" کا معیار کیا تھا اور اس سعادت اور محنت کے آئندہ زندگی پر کیا منفی اثرات مرتب ہوتے تھے، نہ ہی لکھوں تو بہتر رہے گا۔ وہ گھڑیاں، وہ لمحات آج بھی اس عمر میں جب یاد آتے ہیں تو میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھتا ہے۔ یہی نہیں تھا، ان کے اس تشدّد اور ان کے اِس جذبۂ انتقام سے جو حافظ جی نے روا رکھا، مجھے اور کِن دشوارگذار مراحل سے گذرنا پڑا، اس کی رُوداد بڑی ہی المناک اور رِقّت آمیز ہے، اس مذہبی تعلیم، جس کا میرے اپنے خیال میں، کتابِ حکمت کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، کے دوران مَیں دو دفعہ گھر سے بھاگا، کیا ہوگی عمر میری؟ صرف ۷، اور ۸ سال۔ یہ سنہ ۱۹۳۵ء اور سنہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔

(چنانچہ) ایک دن درسگاہ جانے کی بجائے باہر کی طرف مَیں بھاگ کھڑا ہُوا۔ برہنہ پاؤں بھاگتا ہی چلا گیا۔ پھُلروان جانے والی کچّی سڑک تھی۔ چھ سات میل گیا ہوں گا کہ والد پیچھے سے بائیسیکل لیے پہنچ گیا۔ والد جو غصّے سے مدہوش تھا میری دہائی کیا سُنتا؟ مجھے پکڑ لیا اور سائیکل کے آگے گھر کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ ایک چچا، جسے مَیں ماموں کہا کرتا تھا، میری ماں کے کہنے پر بھاگتے ہُوئے آملا۔ جان بچ گئی اور میرا والد پھر مجھے اُسی درس گاہ میں اسی روز چھوڑ آیا۔ گھر والوں نے اور حافظ جی نے مزید پابندیاں عائد کر دیں اور حرکت و آزادی کے تمام ذرائع میرے لیے محدود کر دیے۔ خوب اندازِ ستم تھا۔

اِس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مَیں دوبارہ گھر سے چلا گیا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ بے چینی کے عالم میں، بُجھے ہُوئے دل کے ساتھ، چلا جا رہا تھا۔ کبھی پیدل، کبھی ریل گاڑی میں، کبھی اِس طرف اور کبھی اُس رُخ، حیران و سرگرداں، ایک دن تو چلتے چلتے مَیں نڈھال ہوگیا۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ جا رہا تھا کہ شام ہونے کو آئی، بھُوک اور پیاس سے بُری حالت تھی۔ ایک پھاٹک والے حمیدہ اوصاف شخص اور اس کی بیوی نے مجھے سہارا دیا۔ دال پکی تھی۔ اپنے دو بچّوں کے ساتھ مجھے بھی کھانے کو روٹی دی۔ جان میں میرے جان آئی۔ چاندرات بھی گذر گئی۔ صبح تنہائی میں پھر چل دیا۔ وہ نیک خاتون مجھے اپنے پاس رکھتی۔ کھانے

کو بھی دیتی اور کفالت بھی کرتی، لیکن وہ مجبور تھی، اسی معاشرے کے ہاتھوں جس کا کہ میں ایک فرد تھا۔ اُس کھانے کا ذائقہ آج بھی میرے منہ میں اُسی طرح ہے جس طرح ۴۹ سال پہلے تھا۔ سمندر کا کنارا گواہ ہے کہ مَیں پھر کہاں پہنچا؟ کتنا لمبا سفر طے کیا؟ کس طرح کیا؟ ایک بدبخت نے تو سمندر کے پانی میں مجھے غوطے تک دیئے۔ مَیں ڈوب گیا ہوتا اگر میرا خالق معاونت کے اسباب پیدا نہ کرتا۔ بہر حال گاڑیوں کی لاتعداد اور ان گنت پٹڑیوں کے ساتھ ایک مسجد تھی جو میرے لیے پناہ گاہ بنی۔ مَیں اُس کے سائبان میں وہاں رہا۔ املی کا درخت لگا تھا اُس مسجد کے صحن میں۔ ڈیڑھ سپارہ قرآن کا مَیں نے از خود حفظ کر لیا۔ کوئی غلط چیز یہاں متصادم نہ تھی۔ جبر نہ تھا، شفیق تھے سارے لوگ۔ اچھی سیرت اور اچھی خصلت کے سبھی دکھائی دیتے۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح رکھا۔ دل میرا ابھلا رہا ——
پھر ایک دن بے قراری کے عالم میں اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ ریل گاڑی میں بیٹھا جا رہا تھا کہ ایک صاحبِ دل نے پوچھا کہ لڑکے کدھر جا رہے ہو؟ مَیں نے بتایا کہ گھر کو، بھیرہ کی طرف۔ اُس نے کہا کہ یہ اور گاڑی ہے، تم اگلے سٹیشن اُتر جاؤ اور دوسری گاڑی میں بیٹھو —— سفر کرتا رہا کہ ایک وقت آیا مَیں لاہور پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن پر ہی ایک شخص نے مجھے پکڑ لیا اور یتیم خانہ میں جا کر داخل کروا دیا۔ اچھا دور تھا کہ یتیم خانہ پہنچ گیا ورنہ آج کا وقت ہوتا تو مَیں یہاں نہ ہوتا اب تک میری ہڈیاں بھی کوئی چبا گیا ہوتا۔ یتیم خانہ کی زندگی کا کیا عرض کروں۔ ایک ماتم خانہ تھا۔ لال پیلی آنکھیں ہر کوئی دکھاتا دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر گلی گلی مَیں مانگتا پھرا۔ کچھ اس طرح کی صدا تھی جو ہم کم سن بچے لگاتے:

"ماواں والیو مائیو سُن لو ساڈی فریاد۔ ماں پیو مر گئے ساڈے رہیا کوئی نہ کول..."

اور ہماری اس پُرسوز صدا پر غریب اور نادار عورتیں تھیں جو ترس کھا کر کچھ نہ کچھ بخشش کر دیتیں۔ لنگر خانے سے روٹی نصیب ہو جایا کرتی۔ فرسودہ اور گندا ماحول تو تھا ہی۔ لیکن محفوظ تھے۔ بہبودِ اطفال ہی کا شاید نتیجہ تھا کہ انتظامیہ نے چند ہفتوں کے اندر ہی میرے گھر والوں کو اطلاع دی اور میرا والد مجھے لے گیا۔ میری عدم موجودگی میں میرے گھر والوں پر جو کچھ بیتی مجھے اُس کا علم نہیں۔ اتنا ضرور پتہ ہے کہ جب مَیں اُن سے ملا تو وہ بھی روتے تھے۔ میرا والد اپنے عزم کا راسخ نکلا اور اُس نے مجھے اُسی درسگاہ

میں اُسی حافظ جی کے پاس پھر جا بٹھا دیا۔"

" آخر ایک دن سحر طلوع ہوئی اور میرے والد کی تمنائیں برآئیں اور میں حافظِ قرآن ہو گیا ـــــ گیارہ سال کی عمر تھی کہ میں نے تراویح پڑھائی۔ اور اس کے بعد متعدد بار دوسری مساجد میں بطور سامع بھی گیا۔ اُن دِنوں حافظوں کی نفری کچھ اس طرح کی تھی کہ اگر نمازیوں یا مقتدیوں کی تین صفیں ہوتیں تو ایک صف حافظوں کی لازمی ہوتی۔ اتنے حافظ کرتے کیا؟ تراویح پڑھانے والے حافظ کو ٹوکتے، متشابہ میں ڈالتے اور اس طرح کے حربے استعمال کرتے کہ وہ مشتعل ہو اور پڑھتے پڑھتے رُک جائے۔ ناک میں اُس کے دَم آ جائے اور وہ اپنا مصلّےٰ بالآخر چھوڑ دے۔ فی الواقع یہ ہمیں ثابت کرنا ہوتا تھا کہ اس حافظ کو قرآن زبانی پڑھنا نہیں آتا۔ اسی ضمن میں آئے دن فسادات اور جھگڑے ہوتے اور رمضان ختم ہونے تک بدستور رہتے۔"

" جہاں لڑکپن کی اور باتیں مجھے یاد ہیں، وہاں یہ بات بھی مجھ سے چھُپی نہیں کہ میرے رفقا، میرے استاد بھائی، جو رات کو تراویح کی نماز پڑھاتے وہ روزہ نہیں رکھتے تھے۔ گیارہ سال میں نے مختلف مساجد میں قرآن سنایا ہے اور اس عرصے میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے۔ بھیرہ کی ہی بات نہیں فیصل آباد، ساہیوال، امرتسر اور لاہور ہر جگہ یہی کیفیت تھی کیونکہ میں تراویح پڑھانے کے سلسلے میں ان اصحاب میں رہتا اور دن رات حجروں اور مسجدوں میں گذارتا رہا ہوں۔ عمر رسیدہ اور شریف النفس لوگ یہ جانتے بھی ہوتے مگر مذہبی عقیدت کے پیشِ نظر وہ ان تمام باتوں کی پردہ پوشی کرتے۔"

" پیسوں کے ملنے کا لالچ، اچھا کھانے کی توقعات، کپڑے ملنے کی اُمید، وقتی عزّت، سہل انگاری، یہ تھیں وہ راہیں جن پر یہ لوگ گامزن تھے۔ عظمت ان سے بہت دُور تھی۔"

" میں اپنے ہمجولی حافظوں کی رفاقت میں اپنے استاد حافظ جی کی زیرِ نگرانی، ایک ماہ میں کئی کئی بار لوگوں کے گھروں میں قرآن کا ختم کرنے جاتا۔۔۔ میں بھی دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح سپارہ ہاتھ میں کھُلا رکھتا۔ کچھ آیات ہم اونچا پڑھتے پھر چُپ سادھ کر ورق اُلٹ دیتے اور اس طرح جلدی جلدی اپنے حصّے کی تلاوت ختم کر دیتے۔ عام طور پر ایک گھنٹے میں ختمِ قرآن ہونے کے ساتھ تمام مذہبی رسومات پوری ہو جاتیں ـــــ حافظ جی کو عوضانے کے طور پر پیسے مل جاتے اور ہم بغیر نقدی واپس اُن کے ساتھ آ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ختم

کرانے والے ہمیں کھانا کھلا دیتے۔ چائے تو اتنی چلی نہیں تھی۔ مرنے والوں کی قبروں پر بھی ہم پڑھنے جاتے اور مزاروں اور خانقاہوں کے سرہانے بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتے اور رقم وصول کرنے کے ساتھ ثواب کماتے۔ جتنے پیسے ملتے، حافظ جی ہی لے جاتے۔ یہی کام بعد میں دوسرے ملاؤں کی ہمنوائی میں، مَیں نے اپنے والد کے ساتھ بھی کئی دفعہ کیا۔ مرنے والوں کو ثواب بھی پہنچایا اور رقم بھی لی۔ قرآن مجید کا نزول کس واسطے ہُوا؟ کیا لکھا تھا؟ احکاماتِ خداوندی پر کس طرح عملاً کاربند ہونا تھا؟ — کوئی نہیں جانتا تھا۔ اور اگر کوئی جانتا تھا تو وہ سچی بات بتاتا نہیں تھا۔ بتاتا تو اس کی اپنی روزی اور اس کے کاروبار کا بھانڈہ پھُوٹ جاتا۔

قبروں اور مزاروں سے ہٹ کر قُل پڑھے جاتے اور اس میں پوری بستی کے ملاؤں اور پیش اماموں کو مدعو کیا جاتا۔ یہ اپنے ساتھ اپنی اپنی مسجدوں کے شاگردوں کو لے آتے۔ خوب گہما گہمی میں قرآن کی تلاوت ہوتی۔ مَیں ایسی مجالس اور ختموں اور قلوں میں ہمیشہ شمولیت کرتا۔ مجھے خود تو کیا جانا ہوتا، لے جایا جاتا تھا۔ کبھی اپنے معزز استاد جی کی طرف سے اور کبھی والد کے کہنے پر۔ پڑھتے تو اللہ کا کلام، لیکن ہم پیسے کے متمنی پڑھنے والوں کی حیثیت ہوتی بالکل بھکاریوں جیسی۔ منگتے تو حوصلہ کر کے مانگ لیتے ہوں گے مگر ہم میں اتنی جرأت بھی نہیں تھی کہ کاسہ آگے کر دیں۔ ختم ہو چکتا تو ہماری نگاہیں جو ظاہراً جھکی ہوئی ہوتیں، شعوری طور پر پیسے بانٹنے والوں کی طرف اُٹھ جاتیں۔ جتنا بڑا سرمایہ دار، غریبوں کا خون چُوسنے والا ہوتا، اتنا ہی بڑا ختم اُس کا کرایا جاتا۔ پیسے تقسیم کرنے والے بڑی تمکنت سے اُٹھتے۔ دو یا تین کی ٹولی ہوتی۔ ایک سکّوں اور روپوں کا بھرا ہُوا رومال اُٹھائے ہوئے ہوتا اور دُوسرا نکال نکال کر دیے جاتا۔ جوں جوں وہ پاس آتے دکھائی دیتے، ہماری نظریں، اپنی ہی گود میں، زمین کی طرف گڑتی چلی جاتیں اور دونوں ہاتھ جھولی میں اندر ہی کی طرف بندھے رہتے۔ مجال نہیں ہوتی تھی کہ نظر اوپر کی طرف اُٹھ جائے۔ اُوپر دیکھنے میں حرج تو کوئی نہیں تھا، لیکن دینے والے کی نظر میں بدنمائی ہوتی اور وہ بُرا مانتے، بداخلاقی تصور ہوتی قرآن اُٹھانے والے اور یہ پستی؟ قرآن پڑھا گیا ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔ وہ دو پیسے یا ایک آنہ جھولی کے اندر ہی، میرے جیسے اور حافظِ قرآن بچّوں کے ساتھ، میرے ہاتھ میں تھما دیتے اُن کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ہی مَیں دیکھ پاتا کہ کیا دے گئے۔ ممبروں کے مدّعی اور مسند نشین پیش امام جو مسجدوں کے خطیب اور واعظ ہوتے کو ایک روپیہ فی مسجد

مِل جاتا۔ اِس ایک روپے کا ذکر مذہبی محفلوں میں ہوتا کہ اب کے بڑی عزّت افزائی ہوئی اور کمال کر دیا فلاں خواجہ صاحب نے یا فلاں شیخ نے یا فلاں ملک نے۔ وہ دو پیسے یا ایک آنہ جو مجھے مِلتا، بڑی احتیاط سے مَیں گھر لاتا اور ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ جتنے زیادہ مرتے، جتنے زیادہ ختم ہوتے، اتنے ہی زیادہ سکوں کی فراوانی ہمارے گھر بھی ہوتی۔ ہمارے گھر کا ماحول بھی خوشگوار ہو جاتا اور خرچنے کو بھی ایک آدھ پیسہ زیادہ مِل جاتا۔"

اس کے بعد جناب حافظ صاحب اپنی کتابِ زندگی کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ میرا والد مدرسے کی ملازمت کے علاوہ مسجد کی امامت کرتا تھا، اور اس طرح امامت کے عوضانے میں اسے ہر گھر سے شام کو روٹی ملتی، اُسی طرح جس طرح اُس وقت کے سبھی ملّاؤں کو ملتی۔"

"مَیں نے بھی جب سے ہوش سنبھالا اور جب تک بھیرہ رہا مقتدیوں کے ہاں سے ایک وقت کی روٹی لاتا رہا۔ تمام مسجدوں کے تمام ملّاجی ٹوکری اُٹھا کر گھر گھر مانگنے جاتے لیکن مَیں بڑا اسا رومال لے کر جایا کرتا۔ اس طرح کی روٹی لے آنا معیوب تو تھا لیکن معیوب سمجھا نہیں جاتا تھا۔ لینے والے بھی اور دینے والے بھی اسے باعزت خیال کرتے۔ حالانکہ عزّت اور شرف کی قطعاً کوئی بات نہ تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن دینے والے اصحاب کے مرے ہوئے عزیزوں اور رشتہ داروں کو، اُن کے اعتقادات کے مطابق یہ روٹی مِل جاتی اور اس کے دینے والے کو کثیر ثواب بھی مِل جاتا۔ لینے والے اصحاب کا تو پیٹ اُسی سے پلتا۔"

روٹی کی یہ محتاجی اور پھر اس قسم کی دستگیری شعوری اور غیر شعوری طور پر معصوم ذہنوں پر کس قسم کے اثرات مرتب کرتی ہے اور پھر اس محرومی اور اس عمل سے —— اندر کا انسان چہروں کی شگفتگی —— جرأت و بے باکی کی نعمت سے کس حد تک محروم ہو جاتا ہے، اس کا اندازہ اسی سوانح حیات کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے۔ تحریر ہے کہ:

"شام کی اذان کے ساتھ ہی دس بارہ سال کی ایک لڑکی بڑی خاموشی سے، بڑی سہمی ہوئی ہمارے گھر کے صحن میں آکھڑی ہوتی اور اپنی دھیمی آواز میں ڈوڈی روڑہ اخیل نت خیر یہ اس کم آبادی والے چھوٹے سے محلّے کے ملّاں جی کی بیٹی تھی جو روزانہ آتی اور ایک روٹی

لے جاتی۔ مجھے اِس لڑکی کو دیکھ کر اپنا سارا کا سارا وقت یاد آ جاتا اور وہ لڑکی مجھے یوں لگتی جیسے میری ہی بہن ہو اور غلط ذہنیت کے ہاتھوں مجبور کر دی گئی ہو کہ دَر دَر پھرے اور روٹی کی بھیک مانگے۔ ڈیڑھ سال میں اِس لڑکی کو روزانہ اسی طرح دیکھتا رہا اور اپنے دل میں کسک محسوس کرتا رہا۔"

"گھر گھر سے ایک ایک دروازے پر جا کر روٹی کا مانگنا اور لے آنا جہاں احساسِ ندامت پیدا کرتا وہاں اِس بات کا کھلا اعتراف ہوتا کہ یہ سب محنت نہ کرنے کی وجہ سے تنگی تھی۔"

اِس تمام درد انگیز اور بصیرت افروز داستان بیان کرنے کا مقصد کیا تھا، یہ جاننے کے لیے آخر پر ہمیں پھر اسی سوانح حیات کا ایک اقتباس پیش کرنا ہو گا،

"یہ جو میں نے اپنی عمر کی باتیں بتائی ہیں اور دکھوں اور بے آرامیوں کا ذکر کیا ہے تو اِس کا مطلب اپنی تاریخ کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ ان مصائب کی بنیادی وجہ کیا تھی۔ ناسازگار حالات اور بنیادی خرابیاں جو انسان کے ہاتھوں پیدا کی ہوئی تھیں وہ نہ ہوتیں یا ان کو ہٹا دیا جاتا تو ہمارے اعصاب نہ ٹوٹتے اور ہم اپنی منزل کو اس طرح نہ بھول جاتے۔ اپنی دشواریوں پر مثبت پہلوؤں سے قابو پا لینے سے ہماری سیرت بنتی اور تعمیری طور پر زیادہ پھلتے پھولتے۔ غور کرنے سے اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تنگی، علالت اور بدنصیبی کی وجہ ——

- انسانی عقائد کی پرستاری تھی، رسوم کی پیروی تھی، اور استبداد تھا جو مذہب کے نام پر روا رکھا گیا۔
- دوسرے انسانوں کی غفلت اور اعمال تھے جو قدرتی اسباب کے نام پر اذیت کوش ہوئے۔
- غلط نظام تھا جس کے تحت چلنے پر مجبور کیا گیا۔
- نادانی تھی، فروگذاشتیں تھیں اور وہ غلط قدم تھے جو روشنی اور ضیاء کے ہوتے ہوئے اندھیروں کی طرف اُٹھتے رہے۔"

(یہ عبرتناک داستان حافظ محمد یعقوب صاحب تاجیک کی ہے جو بعد میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز رہے۔)

آج کا پاکستان

دنیائے اسلام آج پاکستان کو اسلام کے قلعہ کے نام سے پکارتی ہے لیکن اس طویل اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اِس ملک کی شہری آبادی کے علاوہ اس کے ۴۵۰۰۰ ہزار دیہات میں آپ کو کم و بیش

اِسی قسم کا مذہب رائج دکھائی دے گا۔

علامہ اقبال نے سچ کہا تھا کہ ؎

کسے خبر کہ کتنے سفینے ڈبو چکی
فقیہہ و صوفی و مُلّا کی ناخوش اندیشی

مذہبی ماحول کے پروردہ نوجوانوں کی نفسیاتی حالت

بہر حال اس قسم کے مذہبی ماحول میں پرورش پانے والے نونہالانِ ملّت کس قدر احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ نیز ان میں کس کس قسم کے نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں اور پھر مذہب کے ہاتھوں یہ کٹا ہُوا نوجوان کس کسمپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کے دِن پورے کرتا ہے اس کی وضاحت ادارہ طلوعِ اسلام لاہور نے اپنے ہاں جون ۱۹۷۵ء میں کچھ اس طرح کی تھی کہ :

(اس ماحول)" سے نکلنے کے بعد، یہ نوجوان بالعموم مساجد کے امام یا خطیب بن جاتے ہیں اور وہاں بھی ان کی معاش کا دار و مدار، بالواسطہ یا بلا واسطہ، خیرات ہی پر ہوتا ہے۔ جسے کہ جسے اب محکمۂ اوقاف کہا جاتا ہے، وہ بھی خیرات کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ "وقف" کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے کچھ جائیداد خیراتی کاموں میں صرف کرنے کے لیے وقف کر دی ہو۔ جس شخص کا ذریعہ معاش تخلیقی (CREATIVE) ہو۔۔ خواہ وہ جُوتے گانٹھنے والا موچی ہو اور خواہ ذہنوں کو جلا دینے والا معلّم و مفکّر۔۔۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، لیکن غیر تخلیقی کاموں، (جیسے امامت وغیرہ) کے معاوضہ میں جو کچھ ملتا ہے وہ خیرات ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے انسانی شخصیت (PERSONALITY) کے جوہرِ شرف و اعتماد مر جاتے ہیں اور اس میں گھٹن پیدا ہو جاتی ہے۔ طالب علمی کے زمانے کی وہی للچائی ہوئی نظریں، جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، ان میں اب مستقل محرومی کا احساس بیدار کر دیتی ہیں جس سے ان کے سینے میں حسد اور انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لیے ان میں ایک ذہنیت اُبھرتی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں (SADISM) کہا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے لیے ابھی ہماری زبان میں کوئی موزوں لفظ وضع نہیں کر سکا، مطلب اس سے ہوتا ہے دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذّت حاصل کرنا اس کی بہت سی اقسام ہیں۔ لیکن سب سے گھناؤنی شکل وہ ہے جو مذہب کے مقدس نقاب میں نمودار ہوتی ہے۔ آپ اِن حضرات کے

وعظوں کو سُنیئے۔ ان کا توے فیصد سے زیادہ حصّہ، دوسروں پرطعن وتشنیع کے کچوکوں، طنز و تنقید کے تیروں اور تحقیر وتضحیک کے نشتروں اور توہین وتذلیل کے سوفاروں پرمشتمل ہوگا۔ وہ جس طرح اُچھل اُچھل کر دوسروں کو" مقدس گالیاں" دے رہے ہوں گے۔ اس سے صاف نظر آجائے گا کہ وہ انہیں ذلیل کر کے کس قدر خوش ہو رہے ہیں۔ وہ اس اذیت رسائی سے کس درجہ لذت حاصل کر رہے ہیں اس کو (SADISM) کہا جاتا ہے جو احساسِ کمتری ومحرومی کا پیدا کردہ مرض ہوتا ہے۔"

خوف کے پیدا کردہ امراض

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ مذہبی دنیا کا تمام کاروبارِ حیات لالچ پر منحصر ہوتا ہے ہے یا خوف پر جبکہ دین ایک ایسا معاشرہ متشکل کرتا ہے جس کے باعث یہ خباثت باقی ہی نہیں رہتی کیونکہ دین کے نزدیک خوف تو وہ عذاب ہے کہ جس کے باعث رگِ زندگی کی شریانوں میں دوڑتا ہُوا خون منجمد ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے خوف وحزن کو" ام الخبائث اور قاطع حیات و توحید" قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"اسلام نظامِ فطرت میں کرب واذیت، گناہ اور کشمکش کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ انسان کے اخلاقی ارتقاء کے راستے میں یہ موانعات حائل نہیں۔ یہ درحقیقت خوف ہے جس کا یہ شکار ہوتا ہے۔ انسان اپنے سلسلۂ ارتقاء کی بلند ترین سطح پر اس وقت پہنچتا ہے جب وہ خوف اور حزن سے یکسر آزاد ہو جائے۔ اسلام کا اخلاقی نصب العین یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف وحزن سے آزاد کر کے اسے اس کی ذات کی ممکنات اور مضمر قوتوں کا سرچشمہ عطا کرے" (آگے چل کر اقبال رح کہتا ہے) اسے پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا میں ہر بُرائی (EVIL) کی جڑ خوف ہے۔"

اور اس کے بعد دوسری جگہ رموزِ بیخودی میں فرمایا کہ:

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست   اصلِ او بیم است اگر بینی درست
لابہ و مکاری و کین و دروغ   ایں ہمہ از خوف می گیرد فروغ

پردۂ زُور و ریا، پیراہنش!
فتنہ را آغوشِ مادر دامنش!

"تمہارے قلب میں جو شر بھی پوشیدہ ہے، اگر غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ اس کی اصل، خوف ہے، چاپلوسی، مکاری، کینہ، جھوٹ۔ یہ تمام خباثتیں، خوف سے پرورش پاتی ہیں۔ منافقت اور فریب اسی کے پردہ پوش ہوتے ہیں، اور ہر قسم کا فتنہ اسی کے دامن میں یوں پرورش پاتا ہے جس طرح طفلِ نو زائیدہ آغوشِ مادر میں۔"

ظہورِ اسلام کے وقت انسانیت کی حالت

اور پھر ظہورِ اسلام کے وقت انسان کے خود ساختہ مذہب کے ہاتھوں انسانیت کی کیا حالت ہو چکی تھی اس کو بیان کرتے ہوئے علامہ بیان تے ہیں کہ:

بود انساں، در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش — بندھا در دست و پاؤ گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر، صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیر کنشت — باجے بر کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اسقفِ رضواں فروش — بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گل از خیابانش ببرد — خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

("انسانوں کا ایک گروہ دوسرے انسانوں کی پرستش کرتے کرتے، اس درجہ پامال اور خستہ حال ہو چکا تھا کہ اس کی اپنی ہستی ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ایک طرف تو ملوکیت کے استبداد نے اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ رکھے تھے۔ دوسری طرف مذہبی پیشوائیت کے ہامان اور نظامِ سرمایہ داری کے قارون گدھوں کی طرح صاحبِ تاج و تخت کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے — ایک شکار اور سینکڑوں شکاری — صاحبِ تاج و تخت (بادشاہ) اور مذہبی پیشوائیت کے استحصال کا یہ عالم تھا کہ اس کی کھیتی، خواہ وہ برباد اور ویران ہی کیوں نہ ہو چکی ہو، وہ اپنا ٹیکس وصول کر کے رہیں گے۔ پادری، اس کی محنت کے پسینے کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر، جنت کا پروانہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ برہمن اس کی پھلواری کا آخری پھول تک نوچ کر لے جاتا تھا اور آتش کدوں کے مغ اس کے کھلیان کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔")

ہم نے یہ باور ہی نہ ہونے دیا

بہرحال مذہب اور دین کے مابین بیان کردہ تقابل کی روشنی میں ہمارے کرنے کا کام تو یہ تھا کہ ہم اپنی علتِ مرض کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور نوجوان نسل کو اس گرداب سے نکالنے کا کوئی حل پیش کرتے لیکن ہم نے اس کے برعکس ان نونہالوں کو یہی باور کرائے رکھا کہ جن راستوں پر ہم مصروفِ سفر ہیں، یہی راستے جانبِ منزل ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں صدیوں سے اپنے محاسبہ کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آہستہ آہستہ حالت یہ ہو گئی کہ ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اور پھر احساسِ زیاں کے فقدان کے باعث ہوا یہ کہ ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

چنانچہ اس ناخوب کو خوب تر کرنے اور اس باطل کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی خاطر ملّت کو پھر یہ بھی باور نہ ہونے دیا کہ یہ اختیار کردہ نہج زندگی نہ اسلامی ہے نہ جمہوری اور یہ شاید اس لیے نہ ہونے دیا کہ ہم کہیں سنگسار ہی نہ کر دیئے جائیں۔ اصل تو یہ ہے کہ تھیا کریسی اور ملوکیت کی موجودگی میں شکوہِ ملک و دین کے آثار پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

یہ عظیم مقصد صرف اُس وقت حاصل ہو گا جب بقول علامہ اقبال کے :

"اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے گی وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ :

"حسبنا کتاب اللہ" یعنی ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔"

(خطباتِ اقبال ۔

خارجی کائنات میں قانون کی حکمرانی

قرآنِ حکیم کی یہی وہ عظمت ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے خدا تعالٰے نے فرمایا کہ :

"اس قرآن میں انسان کی راہنمائی کے لیے ویسے ہی اٹل قانون ہیں جیسے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں اور جن کی رُو سے (مثلاً) سورج اور چاند جیسے عظیم کرّے

ایک مقررہ حساب اور اندازے کے مطابق چل رہے ہیں۔" (۵۵/۴)

"اور زمین پر بڑے بڑے تناور درخت ہوں یا چھوٹے چھوٹے پودے سب اس کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اس قانون کے سامنے جس کی رُو سے اس نے تمام اجرامِ فلکی کو فضا کی پنہائیوں میں اس اندازے سے رکھا ہے کہ ان کے باہمی ربط و ضبط کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے اس میں ذرہ برابر فرق پیدا نہیں ہونے پاتا۔" (۵۵/۷)

"یہ قرآن انسانوں کو بھی اسی غرض کے لیے دیا گیا ہے کہ ان کے معاشرہ میں باہمی ربط و ضبط کے لیے جس توازن کی ضرورت ہے وہ بگڑنے نہ پائے۔" (۵۵/۸)

اِس زبوں حالی کا علاج

کاش ملتِ اسلامیہ قرآنی ضابطۂ حیات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اس کے بیان کردہ حسین ثمرات سے ہمیشہ بہرہ ور رہتی۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد مسلمانوں کے درمیان قرآن حکیم کی غیر متبدل اقدار کو باہمی مشاورت سے نافذ کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کے درمیان کوئی مرکزی اتھارٹی باقی نہ رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یہی اُمت جو اُمت واحدہ تھی کئی فرقوں اور پارٹیوں میں بٹ گئی اور قرآنی تعلیم کی بجائے انسانوں کی مُرتب کردہ مختلف فقہیں رواج پا گئیں اور دین و دنیا کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں کچھ اس طرح قائم ہو گئیں کہ احساس زیاں تک باقی نہ رہا۔

اس ہزار سال سے زائد عرصہ پر پھیلی ہوئی زبوں حالی کے بعد برصغیر میں پاکستان کا حصول اس مقصد کے لیے تھا کہ یہاں اُمت محمدیہ کے اِن بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک بار پھر خدا کی رسی میں پرونے کی مثال کو عملاً قائم کیا جا سکے جس میں نہ دین و دنیا کی ثنویت ہو نہ ہی مذہبی اور سیاسی پارٹیوں کا وجود باقی رہے۔ چنانچہ قائد اعظم کے اِس احسان کا بدلہ وہی نسل چکا سکے گی جو اس خطۂ زمین پر حقیقی قرآنی نظام (دینِ خدا) کی حکمرانی قائم کر کے مذہبی تصورات کو حرفِ غلط کی طرح ذہنوں سے صاف کر دے۔ اس داستان کے تواتر میں آئندہ باب شروع کرنے سے پیشتر میں جناب مرزا فیض کوثر صاحب کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

کیوں ابھی ذہن کا دروازہ مقفل کر دوں
میں ترے غم کا فسانہ تو مکمل کر دوں
لیکن
آپ بیتی بھی سُناتے ہوئے آتا ہے خیال
آنسوؤں سے تری پلکوں کو نہ بوجھل کر دوں

دسواں باب

ہماری مساجد

لاؤڈ سپیکر کا استعمال

سوال یہ ہے کہ کیا آج پاکستان کی، لاکھ مسجدیں سابقہ صفحات میں پیش کردہ حقائق کی منہ بولتی تصویریں نہیں؟ اور کیا اس گروہ بندانہ تصورات کو دن رات عام کرنے کے لیے مسجدوں میں لاؤڈ سپیکروں کے استعمال کی یہ حالت نہیں کہ بقول جناب عبدالقادر حسن :

" علمائے کرام پہلے لاؤڈ سپیکر کا ایک آدھ بھونپو لگاتے تھے۔ اب منارہ کے ساتھ چاند چار لگائے ہیں، اور دن رات سامنے موجود نمازیوں کے علاوہ سارے کے سارے محلّے کو بھی گرم رکھتے ہیں۔ خود تھک جائیں تو تازہ دم ہونے کے لیے ٹیپ لگا کر تھوڑی دیر آرام کر لینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔"

اور جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ :

" پاکستان میں اس وقت یہ مساجد جس طرح شور و غل اور ہنگامہ و نزاع اور فرقہ دارانہ کشیدگی کے مراکز بن گئی ہیں، پہلے کبھی نہ بنی تھیں۔" (روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ، جولائی ۱۹۹۳ء)

لاؤڈ سپیکر کی جگہ مائیک

مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے اس قدر غلط استعمال کو روکنے کے لئے جناب پروفیسر ڈاکٹر سید صدیق حسین صاحب نے بجا طور پر کہا ہے کہ ملک میں لاؤڈ سپیکر آرڈی ننس موجود ہے جس کی رو سے یہ صرف اذان اور جمعہ کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے اس کی پابندی کیوں نہیں کراتے؟ ہمارے ہاں تعلیمی اداروں کے آڈیٹوریم، یا ہالوں اور الفلاح سنٹر، جہاں حاضرین کی تعداد چند ہزار تک ہو سکتی ہے مقرر اپنی آواز سامعین تک مائیک کے ذریعے بخوبی پہنچا سکتے ہیں پھر ان مساجد میں جہاں سامعین کی تعداد اس سے بھی کم ہوتی ہے موجودہ لاؤڈ سپیکر کی جگہ مائیک کے استعمال کا قانون کیوں نہیں بنایا جا سکتا۔

جہاں تک ہمارے ان معلمین مساجد کی علمی سطح کا تعلق ہے، تو بقول صدر ضیاء الحق صاحب کے ہماری ان مساجد میں گیارہ[1] ہزار پیش امام اَن پڑھ ہیں۔

---

[1] اس سلسلہ میں راقم کا خیال یہ ہے کہ اَن پڑھوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔

مساجد کی قراردادیں

ہماری ان مساجد میں کس قسم کی علمی قراردادیں منظور کی جاتی ہیں، اس کا اندازہ اس خبر سے لگایا جاسکتا ہے جو روزنامہ جنگ لاہور کے صفحہ ۲ پر ستو بھائی کے کالم میں مورخہ ۵ نومبر ۱۹۸۳ء کو شائع ہوئی اور وہ یہ کہ :

"اسلام آباد کی تیس مساجد میں بیک وقت منظور ہونے والی ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ تمام سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں سے ہر قسم کی تصویریں، فوٹوگراف اور مصوری کے نمونے اتار پھینکے جائیں۔ جن تصویروں کو اتار پھینکنے کا مطالبہ کیا گیا ہے' ان میں قائدِاعظم کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قرارداد میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ کرنسی نوٹوں سے بھی قائدِ اعظم کی تصویر کو غائب کر دیا جائے۔ مسلمان چونکہ بت پرستی کے خلاف ہیں، اس لیے نماز پڑھتے وقت ان کی جیبوں میں ایسے نوٹ نہیں ہونے چاہئیں جن پر انسانی تصویریں چھپی ہوئی ہوں۔"

کاش ہمارے یہ علماء دین انسانی تصویروں کو ختم کرانے کے اس علاج کی بجائے مذہبی فرقہ بندی کے دیو ہیکل بت کو ختم کرنے کا کوئی علاج بتا سکتے جس نے مسجد کی عظمت اور تقدس کو پامال کر رکھا ہے اور اس کے باعث یہ ملّت اسلامیہ ڈیڑھ ہزار سال سے اپنی عظمتِ رفتہ کی گم کردہ شان و شوکت اور یکجہتی کی قوت سے محروم چلی آرہی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ حضرات جنہوں نے خود مساجد کی پیشانیوں کو فرقہ بندی کے "سنہری" حروف سے مزین کر رکھا ہو، وہ اس کا علاج کیا تجویز کریں گے ؟

تھیاکریسی کی تعریف

یہی وہ تھیاکریسی ہے جس کی وضاحت کرتے ہوئے ادارہ "طلوعِ اسلام" نے تحریر کیا کہ :

"ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ "تھیاکریسی" کی اصطلاح تو عام طور پر استعمال کرتے ہیں لیکن کسی مثال سے متعین طور پر بتایا نہیں کہ تھیاکریسی ہوتی کیا ہے ؟ سُن لیجیے !

"پچھلے دنوں فلمی دنیا کے نمائندوں کی ایک تقریب صدرِ مملکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ اس کی روئداد کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۶ جولائی کی اشاعت میں کہا گیا ہے۔

"اجلاس میں مسعود پرویز نے فلم (مسیح) کا ذکر کیا اور کہا کہ اس فلم کے ذریعے تبلیغ ہوئی ہے۔ اور افریقہ میں بے شمار لوگ یہ فلم دیکھ کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ فلم پاکستان میں کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ صدرِ مملکت نے مسعود پرویز کے خیالات سے اتفاق کیا اور بتایا کہ انہوں نے بھی یہ فلم دیکھی ہے اور پاکستان کو یہ فلم دکھانا بھی چاہتے ہیں مگر وہ علماء کرام کو راضی نہیں کر سکے۔ انہوں نے بتایا کہ اردن کے علمائے کرام نے بھی اس فلم کی نمائش کی اجازت دے دی تھی۔ اور دیگر

بہت سے مسلمان ملکوں میں بھی یہ فلم دکھائی جا چکی ہے لیکن پاکستان کے علمائے کرام اس کی اجازت نہیں دیتے لہٰذا ہم مجبور ہیں۔"

یعنی

(۱) سربراہِ مملکت نے ایک فلم دیکھی ہے جس سے ان کے اندازے کے مطابق اسلام کی تبلیغ ہو سکتی ہے۔

(۲) وہ اس مقصد کے لیے اسے پاکستان میں دکھانا چاہتے ہیں۔

(۳) لیکن یہاں علمائے کرام اس کی اجازت نہیں دیتے۔

(۴) لہٰذا وہ مجبور ہیں۔

کون مجبور ہے؟ سربراہِ مملکت مجبور ہے۔ صدرِ پاکستان مجبور ہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مجبور ہے۔ یعنی حکومتِ پاکستان مجبور ہے؟ اس لیے کہ علمائے کرام اجازت نہیں دیتے۔

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی جس میں حکم مذہبی پیشوائیت کا چلتا ہے۔ حکومت ان کے فیصلوں کے نافذ کرنے کا فقط ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرزِ حکومت کو ختم کرنے کے لیے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ طرزِ حکومت نہ اسلام کو باقی چھوڑتا ہے نہ مملکت کو۔

ممکن ہے اب یہ مسئلہ علمائے کرام کے زیرِ غور ہو کہ صدرِ پاکستان ایک ایسی فلم دیکھ چکے ہیں، کہ جس کا دیکھنا ان کے نزدیک جائز نہیں انہیں اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔"

مساجد میں ہاتھا پائی

جب انسانی ذہن مذہبی طور پر فرقہ بندی کے بُت کا پُجاری بن جائے تو اس کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو چار خبروں سے لگایا جا سکتا ہے۔

" مدرسہ جامعہ حنفیہ قاسمیہ گلبرگ میں آج کالعدم جمعیت علمائے اسلام کے دو دھڑوں کے درمیان اس وقت تصادم ہو گیا جب وہاں ایک روز سیرت النبی کانفرنس کی کارروائی جاری تھی۔ اس موقع پر وہاں زبردست ہنگامہ آرائی ہوئی اور ایک گروپ نے مخالف فریق پر چیزیں اُٹھا اُٹھا کر ماریں۔ اس کارروائی کے دوران علامہ اختر کاشمیری کو بُری طرح زدوکوب کیا گیا جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گئے۔ اس صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے مسلح پولیس کی بھاری جمعیت وہاں پہنچ گئی اور انہوں نے مدرسہ کو گھیرے میں لے لیا۔ گلبرگ پولیس نے مولانا احسان اللہ فاروقی، ان کے بیٹے، برادرِ نسبتی عنایت، مسجد کے امام اور دیگر نامعلوم افراد کے خلاف "قاتلانہ حملہ، قتل کر دینے کی دھمکیاں دینے، ہنگامہ آرائی کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کر لیا ہے۔ علامہ اختر کاشمیری نے (جن کی رپورٹ پر مقدمہ

درج کیا گیا ہے) کہا کہ مولانا فاروقی نے مجھ پر کلہاڑی سے وار کیا۔ مگر میرے ساتھیوں نے کلہاڑی کا دستہ پکڑ لیا۔ اس دوران ان افراد نے مجھے ٹانگوں اور مکّوں سے بُری طرح زدوکوب کیا۔ اس دوران میری جناح کیپ، گھڑی، پین اور نقدی جس کی مالیت تقریباً پانچ ہزار ہے، اٹھائی گئی اور میری آنکھوں کا چشمہ بھی ٹوٹ گیا۔" (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء)

اس خبر پر کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ

"کارِ ملّا فی سبیل اللہ فساد۔"

"فی سبیل اللہ فساد" کی اس سے بہتر تفسیر اور کیا ہو سکتی ہے کہ

دارالعلوم — علمائے کرام — سیرت کانفرنس اور فساد۔

ختمِ نبوّت پر ہنگامہ

یہ دوسری خبر بادشاہی مسجد کی ہے جہاں مسئلہ ختمِ نبوت پر ایک عظیم اجتماع ہُوا۔ جس میں مختلف الخیال علماء حضرات ایک سٹیج پر جمع تھے۔ اس اجتماع کی روئداد ہفتہ وار لیل و نہار کے ۸ تا ۱۴ ستمبر ۱۹۷۰ء کے پرچہ میں پیش کی گئی ہے۔

"مولانا مودودی کی تقریر شروع ہوئے چند منٹ گزرے تھے کہ سٹیج کے عین سامنے ڈیوڑھی میں نعرے بلند ہوئے۔ وہ تقریر کرتے رہے اور نعرے لگاتے ہوئے چند درجن آدمی آگے بڑھتے آئے۔ وہ ڈیوڑھی سے سیدھے مجمع کو چیرتے ہوئے سٹیج کی طرف آ رہے تھے۔ ڈیڑھ دو لاکھ انسان اس طرح بیٹھے تھے کہ کوئی فرد درمیان سے نہیں گزر سکتا تھا۔ ڈیوڑھی سے برآمدوں کی طرف سے ہو کر بھی سٹیج تک آیا جا سکتا تھا مگر معلوم نہیں کیوں آنے والے بیٹھے ہوئے سامعین کے درمیان سے آ رہے تھے۔ ان کی وجہ سے سامعین میں ہل چل بچ گئی۔ لیکن مولانا تقریر کرتے رہے پاس آئے تو معلوم ہُوا قومی اسمبلی کے رکن اور جمعیت العلمائے اسلام کے رہنما مولانا مفتی محمود ہیں۔ وہ مجمع کو چیرتے ہوئے سیدھے سٹیج کی طرف آئے۔ ان کے ساتھ نعرے لگانے والے بھی سامنے سے سٹیج پر چڑھے۔ جہاں مولانا مودودی تقریر کر رہے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے کارکن مولانا کو اٹھا کر پیچھے لے گئے۔ ان کے ساتھ ہی پروفیسر عبدالغفور، چوہدری غلام جیلانی، خلیل حامدی، بارک اللہ خاں، اور جماعت کے دیگر تمام کارکن چلے گئے۔ مفتی محمود کے ساتھ آنے والے سٹیج پر مفتیٔ اعظم زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے جن میں نیشنل سٹوڈنٹس فیڈریشن کے چند معروف

کارکن بھی تھے جنہوں نے جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں کے بیچ لگا رکھے تھے۔ اب سٹیج پر مفتی محمود کے ساتھ آنے والوں کا قبضہ تھا۔ ایک گروہ سید مودودی زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہا تھا۔ لاہور مجلس عمل کا کوئی عہدیدار سٹیج پر موجود نہیں تھا۔

" اس کے بعد مفتی صاحب تقریر کے لیے اُٹھے، بعض جوشیلے چودہ پندرہ لڑکے نعرے لگانے لگے۔ تمام سامعین اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جمعیت العلمائے اسلام کے کارکنوں نے بھی مفتی محمود زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آدھ گھنٹے تک ہنگامہ جاری رہا۔"

یارسول اللہ اور رسول اللہ کانفرنسیں

جہاں تک نبی اکرمؐ کی ذات کا تعلق ہے ہم سب مسلمانوں کا ایمان ہے کہ خالقِ کائنات کے بعد اس ارض وسما میں نبی اکرمؐ کی ذات اقدس سب سے زیادہ عظیم اور افضل ہی نہیں بلکہ اس قدر مقدم ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن افسوس ہماری اس فرقہ بندی کی تنگ نظری نے آپؐ کی ذاتِ اقدس کو بھی متنازعہ فیہ بنا کر رکھ دیا، حتیٰ کہ بریلوی حضرات کا "یا محمدؐ" کہنا اور دوسری طرف دیوبندی فرقے کا صرف "محمد رسول اللہ" کہنا ایک دوسرے کے لیے جرم ہی نہیں بلکہ کفر قرار پایا۔ یہی وہ کینہ پروری ہے جس کی بنا پر مئی ۱۹۸۴ء میں بادشاہی مسجد میں جناب مولانا عبدالقادر آزاد خطیب مسجد (جن کا تعلق دیوبندی فرقہ سے ہے) کی تقریر کے دوران معاذاللہ مردہ باد کا نعرہ بلند کرنے پر ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ اس معاملہ کو قانون کے سپرد کر دیا جاتا ہر دو فریقین کے سربراہان نے علیحدہ علیحدہ بڑے بڑے پوسٹروں کے ذریعے یہ اعلان جاری کیا کہ وہ ۲۱، ۲۰ مئی ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد میں اپنی اپنی کانفرنسوں کا انعقاد کریں گے جہاں یہ حضرات اس "میدان کارزار میں" اپنے اپنے مسلک کو بیچ کر دکھائیں گے۔ چنانچہ لاہور ۱ مئی ۱۹۸۴ء کو صدر مجلس علمائے اہلِ سنّت علامہ محمود احمد رضوی جو مجلس شوریٰ کے اہم رکن اور رؤیت ہلال کمیٹی کے صدر بھی ہیں، ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ۲۱ مئی ۱۹۸۴ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں ہونے والی کل پاکستان "یارسول اللہ کانفرنس" کے انتظامات کو آخری شکل دے دی گئی ہے۔ اس پریس کانفرنس میں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی۔ مفتی عبدالقیوم (ہزاروی) اور مسٹر رفیق احمد باجوہ بھی موجود تھے۔ علامہ سید محمود احمد رضوی صاحب نے پریس کانفرنس سے کہا کہ وہ اس کانفرنس میں عظمتِ مصطفیٰ کے تحفظ کی خاطر شرکت کریں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ حکومت اس خالصتاً مذہبی کانفرنس کے انعقاد میں رکاوٹ نہیں ڈالے گی

اور جس طرح دوسرے مسلک کے افراد کو بادشاہی مسجد میں اجتماعات منعقد کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح اہلسنت کو بھی "یارسول اللہ" کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دی جائے گی۔

اوقاف کا شعبہ الگ کردیں

اس پریس کانفرنس میں علامہ محمود احمد رضوی صاحب نے یہ مطالبہ کیا کہ اہلِ سنت کے لیے اوقاف کا شعبہ الگ کر دیا جائے اور اہلِ سنت کے اوقاف پر کسی دوسرے مسلک کا کوئی فرد تعینات نہ کیا جائے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۵ر مئی ۱۹۸۲ء۔)

یالفاظ دیگر مسلمانوں کی قبروں کو بھی تقسیم کر دیا جائے۔ کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ مسلمان مرنے کے بعد بھی اکٹھے رہ سکیں۔

مطالبات

ان مطالبات کے علاوہ ان حضرات کی طرف سے بذریعہ اشتہارات یہ مطالبات بھی کیے گئے کہ:

۱۔ محکمہ اوقاف اہلِ سنت کو علیحدہ کیا جائے کیونکہ محکمہ اوقاف وقف جائدادوں کی شرائط کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور درباروں کی زمینوں کو ایل۔ ڈی۔ اے کے ہاتھ سستے داموں فروخت کر رہا ہے جس سے درباروں کی آمدنی متاثر ہوتی ہے اور اوقاف کی جائیداد اس طرح ختم ہو جائے گی۔

۲۔ بادشاہی مسجد کے خطیب مولوی عبدالقادر آزاد کو فوراً علیحدہ کر کے سنی خطیب کا تقرر کیا جائے۔ مولوی عبدالقادر آزاد ایک متعصب دیوبندی اور نجدی عقیدے کا حامل ہے جیسا کہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں اُنہوں نے اعلان کیا تھا کہ بریلوی فرقہ دنیائے کفر کی پیداوار ہے اولیاء اللہ کے مزاروں پر عرس اور میلوں کا انعقاد شرک و بدعت ہے اور وہ یارسول اللہ پکارنے کے حق میں نہیں ہیں۔

۳۔ نعرۂ رسالت کے جواب میں بادشاہی مسجد میں مردہ باد کہنے والے بدنصیب شخص کو تلاش کر کے گرفتار کیا جائے اور نعرۂ رسالت لگانے والوں کو زدوکوب کرنے والے دیوبندی افراد کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

منجانب: (۱) غزالی دوراں علامہ احمد سعید کاظمی
(۲) مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی
(۳) مفتی محمد حسین نعیمی
(۴) ساقی ملت محمد اکبر ساقی
(۵) مفتی عبدالقیوم ہزاروی

بہرحال بات ہر دو کانفرنسوں کی ہو رہی تھی اور ظاہر ہے ان کانفرنسوں سے سوائے اس کے مزید انارکی اور بدنظمی پیدا ہو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے اسی خیال کے پیشِ نظر بادشاہی مسجد میں ان کانفرنسوں کی ممانعت کردی تاکہ مسجد کے تقدس کو بحال رکھا جا سکے۔

پابندی کے باوجود

لیکن اس کے باوجود روزنامہ جنگ لاہور کے اداریہ بابت ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء کے مطابق ۲۱ مئی کی شام کو شاہی مسجد میں بیس ہزار کے لگ بھگ بریلوی حضرات (یعنی یارسول اللہ کہنے والے) جمع ہو گئے۔ جس کے بعد دیوبندی مسلک کے کچھ حضرات بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بچ بچا کر مسجد میں پہنچ گئے جہاں تصادم کی نوبت آگئی۔ لیکن موقع پر موجود پولیس نے انہیں الگ کر دیا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسی دن دوسری طرف مسجد شیر انوالہ لاہور میں جمعیت اہلِ سنت (دیوبندی) حضرات نے محمد رسول اللہ کانفرنس کا انعقاد کر رکھا تھا۔ چنانچہ اسی صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار نے لکھا کہ:

" اس قسم کا تصادم کیا دنیا میں ہمارے لیے تضحیک کا سامان پیدا نہیں کرے گا۔ بیرونی دنیا اور خاص طور پر غیر مسلم دنیا نفاذ اسلام کے لیے ہماری کوششوں سے کیا تاثر لے گی۔"

جناب م۔ش

اس اداریہ کے علاوہ جناب میاں محمد شفیع (م ش) نے کہا کہ

" شہر میں فرقہ واریت کی جنگ دراصل گریڈ ۱۹ کے عہدے کے حصول کی جنگ ہے۔"

آپ نے مزید فرمایا: " یہ افراد پاکستان میں سیکولرازم اور الحاد کی راہیں ہموار کر رہے ہیں۔"

وارث میر صاحب

اور جناب وارث میر صاحب نے فرمایا کہ:

" ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شہادت پانے والے علماء کرام کے ورثاء پاکستان کو ایک دوسرے کے لیے کالا پانی بنانے پر تُلے ہوئے ہیں اور پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں۔"

آپ نے مزید فرمایا: " فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم پر تمام یورپ چیخ اُٹھا ہے لیکن ہمارے

علمائے کرام نے کوئی قرار داد منظور کی نہ ہی عصر حاضر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے کاوشیں کی گئیں"۔
(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۸۴ء)

ارشاد احمد حقانی صاحب

جناب میاں محمد شفیع (م ش) اور جناب وارث میر صاحب کے علاوہ جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء کو ایک کالم بعنوان "مذہبی اختلافات، بات آخر کہاں رُکے گی" سپردِ قلم کرتے ہوئے فرمایا کہ (اپنے اپنے مسلک کی بناپر) مساجد پر قبضوں کے جھگڑے تو پہلے ہی چل رہے ہیں۔ ابھی اگلے روز ایک مسجد میں سنگین واقعہ ہوا۔ ۶۵ افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور ڈپٹی کمشنر نے مسجد کو سیل کر دیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا منفرد واقعہ نہیں۔ بدقسمتی سے ایسے واقعات معمول کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان میں سے بیشتر واقعات ان لوگوں کے درمیان ہو رہے ہیں جو کتابی اور فقہی طور پر ایک ہی مسلک کے پیروکار ہیں لیکن ان کے درمیان دوسرے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اور اب وہ ایک دوسرے سے اس قدر دُور ہیں کہ انہیں ایک ہی امام اور ایک ہی فقہ کا پیروکار کہنا ہی کچھ عجیب سالگتا ہے۔ مختلف مسلم فرقوں کے درمیان اختلافات پہلے ہی طرح طرح کی اُلجھنیں پیدا کر چکے ہیں۔ سکولوں میں اسلامیات کی کتابوں میں نصاب کے الگ الگ حصے مقرر ہو چکے ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کے قوانین علیحدہ علیحدہ ہیں۔ دوسرے بہت سے فرقہ وارانہ مطالبات بھی رات دن کیے جا رہے ہیں"۔

جنرل ضیاء الحق صاحب کی اپیل

پاکستان میں دوسری علماء کانفرنس کے سلسلہ میں ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو خود صدر مملکت جناب جنرل ضیاء الحق صاحب نے علماء سے اپیل کرتے ہوئے فرمایا کہ:

—— "وہ مساجد کو گروہ بندیوں کے مراکز نہ بنائیں۔" انہوں نے کہا "مجھے اس بات سے دُکھ ہوا ہے کہ بعض مکتبۂ فکر کے لوگوں نے دوسروں کی مساجد پر عملی طور پر قبضہ کر لیا"، صدر نے مزید کہا کہ "اختلافات کی وجہ سے اسلام آباد میں ایک مسجد بند پڑی ہے"۔ صدر نے علماء سے کہا "وہ خود اس بات کا فیصلہ کر کے حکومت کو آگاہ کریں کہ اذان کی ادائیگی اور دیگر معاملات میں مطابقت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے۔ اسلام آباد کی مساجد میں اذان کے لیے مختلف اوقات ہیں .... میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایک جگہ پر تمام مساجد میں ایک ہی وقت پر اذان کیوں نہیں دی جاتی۔" صدر نے کہا کہ "وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ حکومت سرکاری طور پر اس طرح کے احکامات جاری کرے۔ اس کے لیے خود علماء کو خصوصی تجاویز دینی چاہئیں تاکہ قوم نظم و ضبط کے ساتھ

یش رفت کرے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور۔ مورخہ ۵ رجنوری ۱۹۸۴ء)

راجہ ظفر الحق (سابق) وزیر اطلاعات

راجہ ظفر الحق نے علماء سے اپیل کی کہ جو مساجد اور مدرسوں پر قبضے کے بارے میں تنازعات ہیں تو انہیں ان تنازعات کو مشترکہ کمیٹیوں کے ذریعے باہمی طور پر طے کرنا چاہیئے۔ اور انتظامیہ اور پولیس کو اپنے معاملات میں مداخلت کا موقع نہیں دینا چاہیئے۔[1]

(روزنامہ جنگ ۱۷ رجون ۱۹۸۴ء)

ہمیں ڈر ہے کہ کوئی غیر مسلم ہماری مساجد کی یہ حالت دیکھ کر کہیں یہ نہ کہہ دے کہ:۔

چلئے تو ہو اُسے ملنے حرم کی جنت میں — کریگے کیا جو حرم بھی خدا کا گھر نہ ہوا

ہم اپنی حالت سے کس قدر مایوس ہو چکے ہیں، اس کا اندازہ اسلام آباد میں ہونے والی علماء کنونشن کے موقع پر قائم کردہ کمیٹی کی ایک سفارش سے کیا جا سکتا ہے۔

علماء کمیٹی کا تجویز کردہ علاج

"کمیٹیوں نے رائے ظاہر کی ہے کہ تمام فرقوں کو ایک مسلک پر اکٹھا کرنا ممکن نہیں۔ تاہم کوشش کرنی چاہیئے کہ علماء ایک دوسرے کے مسلک کے خلاف جذبات نہ ابھاریں۔ غیر اسلامی پراپیگنڈا کرنے والوں اور اس بنیاد پر منافرت پھیلانے والوں کو سخت سزا دی جائے۔ علماء کے ۲۲ نکات پر عمل درآمد کیا جائے جو مساجد جن فرقوں کے پاس ہیں، ان کے پاس ہی رہنے دی جائیں البتہ متنازعہ مساجد ان فرقوں کے حوالے کر دی جائیں جن کی اس علاقے میں اکثریت ہے۔"[2]

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸ رجنوری ۱۹۸۳ء)

حافظ زبیر احمد ظہیر صاحب کا اعتراف

ہم سمجھتے ہیں کہ اس اقتباس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں سوائے اس کے کہ یہاں جماعت اہل حدیث پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا حافظ زبیر احمد ظہیر کا وہ حقیقت کشا اعتراف نقل کر دیا جائے جو ۱۲ رجنوری ۱۹۸ء کو روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت میں نظروں سے گذرا۔ یعنی آپ نے فرمایا:

"۳۵ سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے باوجود ابھی تک ہم اسلامی نظام سے محروم ہیں اور سیکولر

---

[1] یہ کہنے والے اس قرآن حکیم کے حامل ہیں کہ جس نے کہہ رکھا ہے کہ میں آیا ہی اس لیے ہوں کہ تمہارے باہمی اختلافات کو ختم کر دوں۔

[2] اسی کا نام سیکولر اسٹیٹ ہے جس کے تصور کو ختم کرنے کے لیے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔

ملک کی سلامتی اور استحکام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔" انہوں نے کہا کہ " حکمرانوں کی غفلت اور کوتاہیوں کے علاوہ دینی جماعتوں کا انتشار اور فرقہ بندی اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔ اور جب تک تمام دینی جماعتیں فرقہ بندی سے توبہ کرکے اپنے الگ منشور اور الگ الگ وجود ختم کرکے قرآن و سنت کی بنیاد پر ایک نہیں ہو جاتیں اسلامی نظام کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔"

لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اس اعتراف کے باوجود مطالبہ پھر انہیں ۲۲ نکات کے نفاذ کا کیا جاتا ہے جس کی بنیاد ہی فرقہ بندی کو مستحکم کرنے پر مبنی ہے۔ اور پھر اس اعتراف کے باوجود یہ صاحب اِن فرقوں میں سے ایک فرقے کی جماعت کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز ہیں۔

بیرونِ ملک کی مساجد میں ہنگامے

فرقہ بندی کی بنا پر یہ حال تو پاکستان کا ہے ۔۔۔ جہاں تک بیرونِ ملک کی مسجدوں کا تعلق ہے، تو وہاں کی صورتِ حال کوئی مختلف نہیں۔ ملّتِ اسلامیہ کے ماتھے پر " کلنک کا ٹیکہ " ہر جگہ موجود ہے۔

" راتھرہام (انگلینڈ) میں پولیس نے ایک مسجد بند کردی۔ حکام نے بتایا کہ دو فرقوں کے مابین اس مسجد میں نماز ادا کرنے کے سلسلہ میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ چند روز بعد جھگڑے نے مسلح تصادم کی شکل اختیار کرلی جس میں چھ افراد زخمی ہو گئے اور پولیس نے آٹھ افراد کو گرفتار کر لیا۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء)

مندرجہ بالا خبر کے علاوہ روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء نے اپنے اداریہ میں "مسجد کی ملکیت پر جھگڑا" کے عنوان کے تحت تحریر کیا کہ:

" وارسٹر (انگلینڈ) کی مسجد کی ملکیت پر دو فرقوں کا جھگڑا اندوہناک ہے۔ تین برس کے فساد کے بعد حکومت نے مسجد پر تالا ڈال دیا ہے۔ کیونکہ مقامی مسلمان لیڈران کے وکلاء اور پولیس کی یہ متفقہ رائے ہے کہ دو متحارب فرقے ایک مسجد میں گذارہ نہیں کرسکتے۔ چنانچہ متعلقہ چیریٹی کمشنر سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ مسجد کی قیمت لگائیں اور ایک فرقے سے کہیں کہ وہ دوسرے کا حصّہ خرید لے۔"

چنانچہ خانۂ خدا کی اس "نیلامی" پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اداریہ نگار نے لکھا:

" دلِ مسلم اس افسوسناک صورتِ حالات پر شرم سے پانی پانی ہے۔ مسجد کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے"

اور اللہ کسی فرقے کا حامی نہیں۔ وہ رب العالمین ہے۔ اس کے حضور میں سب برابر ہیں۔ اللہ کے گھر کو بازار میں رکھنا اور اس کی قیمت لگانا، خریدنا اور بیچنا کسی بھی فرقے کے لیے روا نہیں مگر مسلمان خدا پرستی کو چھوڑ کر فرقہ پرستی کے شکار ہو گئے اور عملی زندگی میں ضعفِ اسلام کی بڑی وجہ بنے۔ انگلستان ایک غیر ملک ہے۔ مسلمانوں کو کم سے کم یہاں اسلام کو تماشا بنانے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ مسجد محض عبادت گاہ ہی کا مقام نہیں رکھتی، مسلمانوں کا ایک تہذیبی مرکز بھی ہوتی ہے۔ یہ جھگڑے چکانے کی جگہ ہے نہ آپس کی سر پھٹول کی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں فرقوں کے امام صاحبان روحِ اسلام سے بہرہ ور نہیں۔ اور اسلام کے نام پر نفاق بین المسلمین کو ہوا دیتے ہیں۔ کیونکہ امامت کا تعلق ان کی روٹی روزگار سے ہے۔ مادہ پرستی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہے۔ مگر فرقہ پرستی کا رجحان کچھ انگلستان سے ہی مخصوص نہیں۔ پاکستان میں بھی رسول اللہ کانفرنس اور یا رسول اللہ کانفرنس میں ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچی جاتی ہیں اور تصاویر اخبارات کے دفتروں میں موجود ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی اور اہلِ حدیث اور اہلسنت ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ عام مسلمانوں کو مذہبی جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں مگر اکابرین اور علمائے کرام زخم تازہ رکھتے ہیں۔ اسلام جو خدا اور رسول کے نام پر ملت کی وحدت کی ضمانت تھا، انہوں نے انتشار اور افتراق کا باعث بنا ڈالا اور مختلف فرقے برسرِ پیکار ہو گئے۔ وارسسٹر کی مسجد کا جھگڑا پاکستان میں فرقہ پرستی کے عروج کی علامت ہے۔ اب اس پر عیسائی چیرٹی کمشنر قاضی ہیں تو مسلمان کس کو منہ دکھائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کو جسے اللہ پاک نے دینِ مبین کہا فقہی اور مذہبی پیچیدگیوں سے پاک کیا جائے اور فرقہ پرستی پر ضرب لگائی جائے۔ یہ کام اسلام کی صحیح اور بنیادی تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے اور یہ دینی مدرسوں کی ذمہ داری ہے۔ وہ اپنے نصابات پر نظرِ ثانی کریں۔ تفسیر اور تشریح میں سادگی اختیار کریں اور جزئی اختلافات پر زور نہ دیں ورنہ احیائے اسلام کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔"

ایک صاحبِ دردِ دل کی پکار

"اب ہم ایسے زخم بلکہ زخموں کو کریدنا چاہتے ہیں جنہوں نے قوم کے جسم کو ہی نہیں اس کی روح تک کو غلیظ اور داغدار کر دیا ہے۔ ان جرائم کی نوعیت ہی نرالی ہے جس کی مثال نہ برطانیہ میں مل سکتی ہے نہ امریکہ میں!

وہ ہیں فرقہ پرستی کے نام پر ہونے والے فسادات کے عقائد کی جنگ۔ جو لوگ اپنے کو مسلمان قرار دیتے ہیں انہیں مُرتد قرار دے کر قتل کے فتوے صادر کرنا ایک محدود گروہ کا یہ دعوٰے کہ شریعت کی ترجمانی کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ جو اس حق کو تسلیم نہیں کرتا وہ نہ صرف فاسق و فاجر بلکہ کافر بھی ہے اور اس قسم کے کافروں کو ملک بدر کر دینا چاہیئے۔ قائدِ اعظم کی ذات پر برکوچک کی پوری اُمتِ مسلمہ کا اجماع تھا۔ برکوچک کے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں اس سے بڑا مسلمان لیڈر کوئی پیدا نہیں ہُوا۔ وہ روشن خیالی، ترقی پسندی اور اتحاد بین المسلمین کی اس کہکشاں کی سب سے زیادہ درخشاں ستارے تھے جسے سرسید، حالی، ظفر علی خان، اقبال وغیرہ نے فروزاں کیا تھا۔ قائدِ اعظم کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے تمام مسلمانوں کے فرقوں کو ایک مرکزِ عمل پر جمع کر دیا تھا۔ اور قیامِ پاکستان کے وقت وعدہ کیا تھا کہ اس ملک میں تھیا کریسی یعنی مذہبی پیشواؤں کی حکومت قائم نہیں ہوگی بلکہ ایک ماڈرن اسلامی مملکت کو وجود میں لایا جائے گا اور اسلام کے اعلیٰ اصول، سماجی عدل، انسانی اخوت، اسلامی مساوات، آزادیٔ رائے اور باہمی مشورے پر مبنی نظامِ حیات قائم کیا جائے گا۔ لیکن قائدِ اعظم کے بعد ہر چیز ان کے تصورات کے برعکس ہوئی۔ پاکستان کی تاریخ میں تنگ نظری، تعصب، رجعت پسندی، کفر سازی اور فرقہ پرستی کے غیر اسلامی رجحانات، کبھی اس شدت و شقاوت کے ساتھ نہ ابھرے تھے جن کا تجربہ آج قدم قدم پر ہو رہا ہے۔

اور نتیجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ ترکی میں مذہبی پیشوائیت کا زور (جس کا اسلام میں کوئی جواز نہیں) جب حد سے گذر گیا تو مصطفےٰ کمال نے سرے سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہی کر دیا۔ ہم جس دَور سے گزر رہے ہیں اور اسلام و شریعت کی اجارہ داری کا دعویٰ کرنے والے بعض گروہ جس شدت سے سرگرمِ عمل ہیں اس کا رَدِّ عمل کتنا شدید ہوگا، اس کا تصور ہی لرزہ انگیز ہے۔ یہ کہنا کہ پندرہویں صدی اسلامی نشاۃ ثانیہ (مسلمانوں کی عام بیداری اور عظمت) کی صدی ہوگی۔ اپنے کو فریب دینا اور دوسروں کو بیوقوف بنانا ہے۔ جب تک ہر مسلمان ملک میں قائدِ اعظم کے پائے کا رہنما پیدا نہ ہو یہ خواب، خوابِ پریشاں ہی رہے گا تو جناب یہ فرق ہے ہماری اور انگلینڈ کی اخلاقی حالت میں۔ البتہ وہاں جو مسلمان جا کر آباد ہو گئے ہیں وہ آپس میں اسی طرح دست و گریباں ہیں جس کا نظارہ ہم پاکستان میں کرتے ہیں۔ (جہاں جہاں بھی گئے تنگِ دو جہاں ٹھہرے)"

سو یہ ہے حالت ہماری ان مساجد کی جن میں قرونِ اولیٰ کے مسلمان بغیر کسی تفریق و انتشار کے بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونے کے بعد باہمی مشاورت سے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کے لیے عملی پروگرام مرتب

کیا کرتے تھے۔

قبل اس کے کہ ہم سب سے بڑی مسجد (خانہ کعبہ) کے اجتماع کی طرف آئیں، ہماری ان مساجد میں جہاں تک عید کے اجتماع کا تعلق ہے، تو اس کی کیفیت کو جاننے کے لیے علامہ اقبال کا یہ شعر ہی کافی ہوگا ؎

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنیں

حج کا فلسفہ

اہلِ ایمان کے لیے قرآنی نظامِ حیات کو متشکل کرنا کس قدر ضروری اور اجتماعی طور پر نوعِ انسانی کے لیے کس قدر منفعت بخش تھا نیز اس سلسلہ میں قریہ قریہ میں واقع ہماری یہ مساجد کس قسم کا مرکزی کردار ادا کرسکتی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں سب سے بڑی مسجد خانہ کعبہ میں سب سے بڑے اجتماع "حج" کی غرض و غایت کو جاننا ہوگا جس سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ملّتِ اسلامیہ آج کس قدر خسارے میں ہے اور علامہ اقبال نے جو یہ کہا تھا کہ ؎ "رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی" کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کو جاننے کے لیے ہمیں پرویز صاحب کے ایک درس کا ممنون احسان ہونا ہوگا جو طلوعِ اسلام کے ماہانہ شمارہ مورخہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

"آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سُنے ہوں گے اور بار بار سُنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بار بار سُنے ہوں گے لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کرسکتی ہو، اس کے لیے اسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو، وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کرسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کرلو اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا۔

تمدّنی زندگی کی ابتدا

نوعِ انسان کی تمدّنی یا معاشرتی زندگی کی ابتدا کب اور کہاں سے شروع ہوئی۔ مغرب کے علماء علم الانسان نے اس باب میں خاص تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے

پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآن کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے، کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) نوعِ انسان شروع میں ایک اُمت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلافات پیدا کیے۔ ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور قبیلوں میں بٹ گئے —— اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلک زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسانی کو محیط ہے۔ اس سے نہ کرۂ ارض کرہ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے۔ اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبال کے الفاظ میں ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں یا مغرب کے ہوں سیّار

انبیاء کی بعثت کا مقصد

قرآن کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی، اس سے نجات دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ...

(۲ / ۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سُناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا

ضابطہ لاتے" تاکہ وہ اس کی رو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔ یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا اس کے لیے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک امت کے افراد ہیں جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے اور سیاسی اصطلاح میں اسے دو قومی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ انہوں نے ماں، باپ، برادری، قوم اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمت کی تشکیل کی اور اس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لیے ایک محسوس مرکز کا وجود لاینفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحی خداوندی کی راہ نمائی میں مکّہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۳/۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لیے وجود میں لایا گیا تھا۔ مکّہ کی مبارک وادی میں خانہ کعبہ تھا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کے لیے نشانِ راہ تھا۔ اسے تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لیے اللہ تعالےٰ نے" اپنا گھر" (بیتی ۲/۱۲۵) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر" اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

للنّاس کا مقصد

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو الناس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآن کریم میں آئی ہیں، ان میں ہر جگہ الناس ہی کہا گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب

نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لیے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "للناس" ہی کہا جانا چاہیے تھا۔ اور یہی قرآن نے کہا:

اب دیکھئے کہ نوعِ انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ .... (۵/۹۷)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس کی مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوسکے۔

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوسکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سُپر نیشنز —— یعنی مہیب قوتوں کی مالک قومیں اور دوسری کمزور اور غیر نشوونما یافتہ (UN DEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سُپر پاورز اپنی قوت کے لیے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں وہ اتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد دیا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں۔ لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان امت واحدہ بن جائے تو اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قِيٰمًا لِّلنَّاسِ۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

جائے امن

اب آگے بڑھیئے۔ اس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی۔ سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے، تو افراد خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گزارتے ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع کرہ ارض

پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا خطہ ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبہ کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ط ..... (۲/۱۲۵)

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسانی کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔ دوسری جگہ ہے: وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا ط .... (۳/۹۷)

جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اسے امن کی ضمانت مل جائے گی۔

بات واضح ہے۔ دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے جب ان کی جگہ ایک ایسی امت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفرقہ نہیں ہو گی تو وہ بھائیوں کی امن و سلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہو گا نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنم زار بن رہا ہے کیسا امن و سلامتی کی جنت بن جائے گا۔

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ دوسرے ملک میں قدم نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ نہ حاصل کرلے۔ کعبہ کے متعلق کہا:

جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ط (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے۔ اس گھر کے دروازے سب کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں۔ کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (رب الناس) کا گھر ہے اس لیے اس کے دروازے ہر انسان کے لیے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد دعا یہ مانگی تھی۔ کہ اس خطۂ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے لیے وجہ کشش ہو سکے۔ بارالہا تُو ایسا کر دے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج ادھر آنے لگیں۔ (۱۴/۳۷)

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لیے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے طے کیا ہے، تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح کعبہ سے مراد وہ نظام خداوندی، وہ قرآنی مملکت ہے جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔
حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آج صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو الٹ کر چھٹی صدی عیسوی میں آجائیے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لیے سب سے پہلے ایک اُمت تشکیل کی گئی جو رنگ نسل خون وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمت کے وجود کا مقصد کیا تھا اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا جب کہا کہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نوع انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔" غور کیجئے۔ جس طرح کعبہ کا مقصد نوع انسان کی فلاح و بہبود تھا، اسی طرح اس اُمت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (الناس) کی خیر طلبی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس اُمت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رو سے اس اُمت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ ...... (۲/۱۴۳)

"اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمت بنایا جو تمام نوع انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تمام نوع انسانی پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسول) کی نگاہ رہے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

یہاں پھر شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کہا گیا ہے یعنی تمام نوع انسان پر نگران۔ ان خصوصیات کی حامل اُمت کو ملتِ ابراہیمی (۶/۱۶۲) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمت۔

نوعِ انسانی کی امامت

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ...... (۲/۱۲۴)

نوع انسان کی امامت (LEADER SHIP) اب ہمارے حصے میں آئے گی اور اسی بنا پر اس اُمت سے کہا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ ... (۲/۱۲۵) تم منصب و مقام ابراہیمی کو کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولان گاہ بناؤ۔" یعنی جس طرح حضرت ابراہیم کو نوع انسان کی امامت کا سزاوار

قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے جس کا مرکز کعبہ ہے، عالمگیر انسانیت کی لیڈر شپ حاصل کرو۔

مشاورت اور صلوٰۃ کا باہمی ربط

اس امت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی۔ (۴۲/۳۸)
اس مشاورت کی روزمرہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے۔۔۔ آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامت صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے۔ (۴۲/۳۸) لیکن پوری ملّت کے مسائل کے لیے مشاورت کے اجتماعات اس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ امّت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا۔۔۔ اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کیے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماع عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا۔ جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .... (۲۲/۲۷) "تم اعلان کر دو تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لیے آئیں"۔ اس اسوۂ ابراہیمی کے اتباع میں اس امّت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ ان اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو امّت کی باہمی مشاورت کے لیے ہوں گے لیکن ان میں شرکت کے لیے تمام انسانوں (الناس) کو دعوت دی گئی ہے۔ یہ بحیثیت مبصر شریک ہوں گے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ جس طرح حضرت ابراہیم سے کہا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .... (۲۲/۲۷) "حج کے لیے تمام لوگوں کو دعوت دو"۔ اسی طرح امّتِ مسلمہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا .... (۳/۹۶)
"جو لوگ بھی (الناس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں انہیں چاہیئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے، (للناس) حج کے اجتماع میں شرکت کریں"۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی الناس کہا ہے۔ اسے مومنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

حج النّاس کے لیے ہے

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس

میں شرکت کی دعوت دی۔ لیکن جس طرح جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماعات نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی اور حج ابراہیمی کے مناسک اور شعائر مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے کہ یہ تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا۔ اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور روک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں علاوہ دیگر امور کے باہمی جھگڑے نمٹائے جاتے تھے اور زیادتیاں کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا۔ دلائل و براہین کی رو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی دلیل کے ہیں۔ اس جہت سے قرآنی دلائل کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ...... (۶/۱۴۹) کہا گیا ہے۔ اس لفظ کے ان بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

حج اسلام

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکّہ سے پہلے (سن ۷ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا۔ اس لیے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکّہ کے بعد، سن ۸ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن ۹ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اس میں حضورؐ خود تو تشریف نہیں لے گئے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ کو نمائندہ مملکت قرآنیہ کی حیثیت سے قافلہ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا۔ لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اس پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف، غیر مسلموں (بالخصوص) قریش کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورہ توبہ میں مذکور ہے۔ ۱۰ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لیے صحیفہ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نکتہ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگ و نسل، خون، زبان، وطن،

قومیت، ذات پات برادری قبائل ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل، خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع انہیں مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی، جنہیں ارکان و عمال حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دُور دراز مقامات سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لیے میدان عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا ان کا نمائندہ اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لیے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ نمائندگانِ مملکت منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ امور مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجت کی رو سے کیا جاتا۔ دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر یہ نمائندگان اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

اس کے بعد حج کے اس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دین کے مقاصد محض فطری تصورات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے۔ وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں، جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآن کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا۔ سورہ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ...... (۲۲/۲۸)

"تم لوگوں میں اعلان کر دو کہ وہ حج کے لیے یہاں آیا کریں۔ دنیا کے دُور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے پاپیادہ یا ایسی سواریوں پر جو مشقت سے تھک کر چُور چُور ہو جائیں۔

وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوع انسان کی) منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے"

نوعِ انسان کی منفعت

اس میں لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ...... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے متقاضی

ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طریقے سے سامنے آجائے۔ یہ دعوت "الناس" کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مُسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اس امّت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کرلیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لیے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے حسنِ عمل اور کارِ خیر کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے اور وہ یہ کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ...... (۱۳/۱۷) دنیا میں بقا اسی عمل کے لیے ہے جو تمام نوعِ انسان (الناس) کے لیے نفع بخش ہو۔ دین اور اس کے ارکان و شعائر کی غرض و غایت یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لیے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا اور اسی کے لیے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ .....

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا لیکن بعض فنی اور ٹکنیکی معاملات میں ان سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام ابو یوسف بحوالہ شبلی نعمانی) غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مبصر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص ایسی حرکت نہیں کرے گا جو اِن مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۲۵) اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۲، ۹/۲۸)

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد — اس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا۔ لیکن جب مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس کے مقاصد نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے اور

ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدت مندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو ان کے اپنے دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کیے جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لیے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا — بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے)، اسے پھر سے ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لیے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ [1] چالیس پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لیے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لیے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس پچاس ہزار حاجیوں کے لیے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ اس میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے۔ ان افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے۔ اس قسم کا اطمینان تو تمام اہلِ عرب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے ہیں اور کر لیتے ہیں۔

آج کا مسلمان

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح

---

[1] ۱۹۸۵ء میں یہ تعداد ۶۰ ہزار کے قریب تھی۔

غیرمسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افرادِ حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حریم کعبہ میں بھی امام کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت اس اجتماع کی۔ جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسانی کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ دین جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیلی مملکت کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ سالہا سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے "مذہب" کے حج کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی۔ اب یہ اُمت غیرمسلموں کی چھوٹی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی مغضوب علیہ قوم ہیں اس لیے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز روزہ حج زکوٰۃ ارکان اسلام کی سطحی طور پر پابندی کرتے رہیں۔ اور ان کی غرض و غایت اور مطلوب و مقصود کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد سمجھتی اور دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا ؎

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائے گی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ ۔ (۴۷/۳۸)

" اور اگر یہ اسی طرح روگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی اور وہ ان جیسی نہیں ہو گی " خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں۔ اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام "

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ اگر کسی چیز کے بلند مقصد کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے صرف یہی نقصان نہیں ہوتا کہ انسان اس کے خوشگوار نتائج سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اس سلسلہ میں اس کی ظاہری حرکات و سکنات جن کے ساتھ وہ بڑی شدت کے ساتھ متمسک ہوتا ہے ان میں بھی کوئی نظم و ضبط باقی نہیں رہتا۔ مجھے اس حقیقت کی وضاحت کے لیے جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے (قسط وار مضمون سے) ایک دو اقتباسات پیش کرنے ہوں گے جو آپ نے روزنامہ جنگ لاہور کے لیے ماہ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں سپردِ قلم کیا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ :

جناب حقانی صاحب کا سفرِ حج

" ہجوم کی کثرت کا ایک ناپسندیدہ اور تکلیف دہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حرم شریف میں سکون اور یکسوئی سے عبادت کا امکان قریب قریب یکسر ختم ہو گیا ہے۔ طواف تو خیر مشکل تر ہو ہی گیا ہے دو نفل پڑھنا بھی اب جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ عین ممکن ہے کہ آپ دعا و عبادت میں انہماک پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں اور آپ پر چاروں طرف سے انسانی ریلوں کے تابڑ توڑ حملے ہو رہے ہوں۔ ہاں رات اور دن کے بعض اوقات ایسے ہیں جب نسبتاً سکون ہوتا ہے لیکن عام طور پر اب بیت اللہ میں دعا اور عبادت کی لذت کا حصول انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ "

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۳؍ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

معلمین کی ہوسِ زر

اس کے بعد مورخہ ۸؍ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی سفرِ حج کی قسط میں حقانی صاحب رقم طراز ہیں۔

" ایک ذمہ دار سرکاری افسر نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی شخص کو عربوں سے متنفر کرنا چاہیں تو اسے حج کے لیے بھیج دیں۔ معلمین کی ہوسِ زر اور حج پر کاروباری غلبہ نے اتنے مسائل پیدا کر دیئے ہیں

کہ کوئی حساس انتظامیہ ان کا نوٹس لیے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا معلّمین یا مطوفین کی لابی اس قدر طاقت ور ہے کہ ابھی تک اس کا کما حقہٗ توڑ کرنا ممکن نہیں ہوا۔"

زور آور حاجی

اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی قسط میں تحریر کیا :

" عرفات کے میدان میں پانی تو بافراط ہے لیکن بیت الخلاء کا انتظام انتہائی ناقص ... اور تکلیف دہ ہے۔ اس وقت یہاں مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بیت الخلا نہیں ہیں۔ زمین میں گڑھے کھود کر اور لکڑی کے چوکھٹے رکھ کر عارضی انتظام کیا جاتا ہے۔ چونکہ دروازے نہیں ہوتے صرف پردے لٹک رہے ہوتے ہیں اس لیے مردوں اور عورتوں کے ایک ہی جگہ ہجوم کی وجہ سے نہایت تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ بالخصوص خواتین کے لیے اس سہولت کو استعمال کرنا ایک آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ انہیں اندر سے پردہ پکڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے — اس کے باوجود کئی زور آور حاجی صاحبان پردوں کو جھٹکے دینے سے باز نہیں آتے۔"

ہمارا خیال ہے کہ ان اقتباسات کے بعد مزید کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں سوائے علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہہ دیا جائے کہ :

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

آخر پر میری دعا ہے —

بڑا غبار بڑی دُھول سی ہے راہوں میں
کوئی چراغ جلا دے مری نگاہوں میں

(نفیس کرشن)

اور اسکے بعد قبل اس کے کہ ہم عورت کی حالتِ زار، معاشی نظام، ہماری تاریخ، سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم، قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے تعلقات، سیاسی فرقہ بندی اور دنیا کی حالتِ زار پہ گفتگو کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کی وادی کے نشیب و فراز کا جائزہ لے لیا جائے۔

گیارھواں باب

تصوّف

جمالیات سے رغبت نہیں جسے کوثرؔ
کچھ اور چیز اُسے کہیئے وہ بشر نہ ہُوا

ایک ضروری گذارش

قبل اس کے کہ ہم تصوف کی وادی میں خیمہ زن ہوں راقم یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا جائے گا۔ اس سے مقصود صرف اور صرف تصوف کے متعلق چند ایک حقائق کا بیان کرنا ہے۔ کسی شخصیت یا کسی بزرگ کے عقائد اور نظریات پر تنقید کرنا نہیں۔ میرے نزدیک تو ہر فرد قابلِ احترام ہے۔ خواہ وہ عمر کے کسی حصّے میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ چھوٹے کے لیے شفقت اور بڑے کے لیے احترام کا لفظ چھوٹے اور بڑے میں امتیاز پیدا کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق تو خدا تعالےٰ نے عمر کی تفریق کیے بغیر ہر بنی آدم کو واجب التکریم کے الفاظ سے نوازا ہے۔ لہذا جس شخص کے نزدیک چھوٹوں کے لیے شفقت کی بجائے اصل لفظ احترام ہی ہو تو وہ اپنے اکابرین اور گزرے ہوئے بزرگوں کے احترام سے کیونکر منحرف ہو سکتا ہے۔ اِس لیے میری خواہش یہ ہے کہ آپ ان گزارشات کو ذاتی انا کا مسئلہ بنانے کی بجائے ان کا جائزہ خالص علمی و عملی سطح پر لیں۔

باقی جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مَیں نہ کوئی عالم ہوں نہ صوفی۔ قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں اور اس کی روشنی میں حقیقت تک پہنچنے کے لیے سعی و کاوش میرا مشن ہے اور یہی میری صدا ہے — اور بس

وحی کی راہنمائی

خدائے علیم و خبیر نے جب اس کائنات کو پیدا کیا تو اس نے اس عالمِ خلق کے لیے اپنے عالمِ امر میں قانون اور اقدار بھی وضع کیں تاکہ نظامِ کائنات میں کسی قسم کا کوئی خلل پیدا نہ ہونے پائے۔ جہاں تک انسانوں کے لیے راہنمائی کا تعلق ہے، یہ راہنمائی انبیاء کرام کی وساطت سے دوسرے انسانوں تک پہنچا دی گئی اور اسے قرآن حکیم کی دفتین میں مکمل غیر متبدل شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ یہ وہ راہنمائی تھی جسے کوئی انسان بھی اپنی خلوت گاہوں، ریاضتوں، مراقبوں، مکاشفات، اوراد و وظائف یا تجربات و مشاہدات سے حاصل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور تو اور خود خدا کا نبیؐ بھی اس حقیقت وحی سے آگاہ نہ تھا۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں:

"اور اے محمدؐ! اسی طرح ہم نے (اپنے قانونِ مشیت کے مطابق) تیری طرف اپنے حکم سے ایک

کتاب بطور وحی نازل کی (جس نے تجھ پر حقیقت کو منکشف کر دیا ورنہ) اس سے پہلے تجھے قطعاً معلوم نہ تھا کہ کتاب (الہٰی) کیا ہوتی ہے اور ایمان کس چیز کا نام ہے۔ لیکن (وحی کے ذریعے) ہم نے اس کتاب کو تیرے لیے ایک (عظیم القدر) روشنی بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق اپنے بندوں میں سے کسی ایک یعنی نبی کو حقیقت کا راستہ دکھا دیتے ہیں اور (اے پیغمبر!) یہ ہماری اس عطا کردہ روشنی ہی کا صدقہ ہے کہ) تو (گم کردہ راہ لوگوں کی) سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کر رہا ہے۔" (۴۲/۵۲)

"اور اے پیغمبر! خدا نے تمہیں وہ باتیں سکھا دیں جو تجھے پہلے معلوم نہ تھیں" (۴/۱۱۳)

نبوّت کا فریضہ

لہٰذا اب خدا کی طرف سے وحی خداوندی کے مل جانے کے بعد نبی کا فریضہ یہ تھا کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچا دے چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ:

"اے رسول! تیرے رب کی طرف سے جو کچھ تجھ پر نازل ہوا ہے، اسے دوسرے لوگوں تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں قاصر رہ جاؤ گے۔" (۵/۶۷)

چنانچہ نبی اکرمؐ نے وحی کی اس تعلیم کے ایک ایک لفظ کو بڑے واضح انداز میں اُمّت تک پہنچا دیا اور گواہی کے طور پر حجۃ الوداع کے دوران ایک لاکھ فرزندانِ توحید سے اس کی گواہی طلب کی اور اس گواہی کو تسلیم کرتے ہوئے خدا تعالےٰ نے فرمایا:

"وہ انہیں احکامِ خداوندی کی تعلیم دیتا ہے اور ان کی غرض و غایت ان کے ذہن نشین کراتا اور اس طرح ان کے قلب و دماغ کی صلاحیتوں کی نشو و نما کرتا ہے۔" (۶۲/۲)

اس عطا کردہ وحی کی روشنی میں علم بالحواس کی وساطت سے حقائق تک پہنچنے کے لیے کس قدر تاکید کی گئی ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے لگایا جا سکتا ہے جب فرمایا:

"اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگو تم اپنی سماعت، بصارت کے ذریعے معلومات حاصل کرو اور پھر ان معلومات کی بنا پر اپنے ذہن سے فیصلہ کرو اور اس طرح صحیح نتیجے پر پہنچو یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جو تم پر عائد کی گئی ہے اس کی بابت تم سے باز پرس ہوگی کہ تم اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہوئے تھے یا نہیں۔" (۱۷/۳۶)

دوسری جگہ فرمایا کہ:

" تم شکمِ مادر سے دنیا میں آتے ہو تو اس حالت میں کہ تمہیں کسی بات کا علم نہیں ہوتا خدا تمہیں سماعت وبصارت (ذرائع معلومات اور پھر ان معلومات کی بنا پر نتائج اخذ کرنے کا ملکہ عطا کرتا ہے تاکہ تمہاری کوششیں صحیح نتائج مرتب کر سکیں ۔" (۱۶/۷۸)

مقامِ بصیرت

لیکن اس کے برعکس جو لوگ عقل وفکر سے کام نہ لیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

" ان کے سامنے کوئی بات واضح طور پر نہیں آتی وہ ہمیشہ اُلجھاؤ میں رہتے ہیں ۔" (۱۰/۱۰۰)

یہ غور وفکر کس قسم کا ہونا چاہیئے ارشاد ہے کہ :

" ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہارے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو اس طرح گویا تمہاری باتیں بڑے غور وخوض سے سُن رہے ہیں حالانکہ وہ محض سُن ہی رہے ہوتے ہیں ان کا خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ تم سوچو کہ تم ایسے بہروں کو کس طرح سُنا سکتے ہو جو عقل وفکر سے کام ہی نہ لیں ۔" ۱۰/۴۲)

" اور وہ لوگ بھی ہیں جو تمہاری مجلس میں آکر بیٹھتے ہیں اور تمہاری طرف تکتے رہتے ہیں گویا وہ ہمہ تن متوجہ ہیں لیکن وہ صرف تک ہی رہے ہوتے ہیں دھیان ان کا بھی کہیں اور ہوتا ہے ۔ سوچو کہ تم ایسے اندھوں کو کیسے راستہ دکھا سکتے ہو جو عقل وبصیرت سے کام نہ لیں ۔" (۱۰/۴۳)

اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ :

" خدا وہ ہے جس نے تمہیں سماعت اور بصارت اور قوّتِ فیصلہ (یعنی ذرائع علم) عطا کیے ۔" (۲۳/۷۸) لہٰذا حکم ہُوا کہ " تم سوچا کرو ۔" (۳۴/۴۶)

قرآن کریم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ :

" مومن وہ ہیں کہ اور تو اور جب ان کے سامنے خدا کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے سامنے بھی اندھے بہرے بن کر نہیں جھک پڑتے ۔" (۲۵/۷۳)

کتاب وحکمت

حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم نے کتاب کے ساتھ جو حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد یہی قلب ودماغ کی صلاحیتوں کی نشو ونما ہے کیونکہ عقل وشعور، فہم وادراک یا علم بالحواس کے تقاضے پورے کیے بغیر علیٰ وجہ بصیرت ایمان پیدا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی وہ حقائق ہیں جس کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ :

" قرآنی حقائق کے دماغ کی راہ سے سمجھ میں آنے کا مطلب ہے حقائق کا ادراک علم اور فکر، تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں حقائق کا ادراک ہمیشہ سے جاری تھا کبھی ایک حقیقت سمجھ میں آئی کبھی دوسری کبھی جزواً کبھی تماماً اور اب اگر انسان وہ سب حقائق جو اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں حاصل کیے ہیں یا جن تک عقل اور فکر کے ذریعے اس کی رسائی ہوئی باہم فراہم کرے اور ایک مربوط و منظم شکل میں پیش کرے تو ان سے قرآن پاک ہی کے ارشادات کی تصدیق اور ترجمانی ہوگی۔

حقائق کا ادراک ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید ان سب حقائق کا جامع ہے جو ہمارے ادراک میں آچکے ہیں اور ان کا بھی جن کا ادراک باقی ہے۔ خواہ یہ حقائق سنوسی کی زبان سے ادا ہوں خواہ لینن کی۔ حقائق بہر حال حقائق ہیں۔ ان کو سمجھنے کی جس طرح بھی کوشش کی جائے اپنی جگہ ٹھیک ہے مقصد ان کا سمجھنا ہے اور قبول کرنا ہے لہٰذا انہیں جس طرح بھی سمجھیں یہ قرآن پاک ہی کا سمجھنا ہوگا۔ اس کی تعلیم سے بہرہ ور ہونا ہوگا۔"

آپ عقل کے اس مقام بلند کو سامنے رکھیے جس کی معرفت سے انسان خدا تعالیٰ کی راہ نمائی سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ انسانی دنیا میں ایک اجتماعی نظام کو متشکل کر سکے اور دوسری طرف تصوف کے اس بنیادی عقیدہ کا جائزہ لیجیے کہ جس کے تحت یہ باور کرایا جاتا ہے کہ علم بالحواس کے ذریعے حاصل کردہ معلومات یقینی ہی نہیں بلکہ یقینی علم وہ ہے جو کشف و الہام کی وساطت سے حاصل ہو جسے اہلِ تصوف باطنی علم یا علم معرفت سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی کا تو بیشتر حصہ انہیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :

مولانا روم

لا ابالی عشق باشد نے خرد　　　عقل آں جوید کزاں سودے برد
نے خدارا امتحانے می کند　　　نے درِ سود و زیانے می زند

مولانا روم کے ان اشعار سے کون واقف نہیں جن میں ان کا کہنا ہے کہ قرآن کا مغز ہم نے نکال لیا ہے اور ہڈیاں کتوں کے آگے ڈال دی ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں :

مغز قرآن اور ہڈیاں

ما دل اندر راہ جاں انداختیم　　　غلغلہ اندر جہاں انداختیم !
ما ز قرآں بر گزیدہ مغز را　　　پوست را پیشِ سگاں انداختیم

جبہ و دستار و علم و قیل و قال — جملہ در آبِ رواں انداختیم
از کمانِ شوق تیرِ معرفت — راست کردہ برنشاں انداختیم

جناب پرویز صاحب کا ان اشعار کے سلسلہ میں کہنا یہ ہے کہ:

"یہ جو جبّہ و دستار اور علم و فضل کو دریا برد کرنے کا کہا گیا ہے تو یہ خود ان کی آپ بیتی ہے۔"

(بحوالہ تصوّف[1] کی حقیقت۔ ص ۸۶)

شیخ اکبر

عقل و فکر کی اس رسوائی کے بعد، قبل اس کے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس باطنی علم کی حقیقت کیا ہے، پہلے یہ جان لیا جائے کہ یہ علم ملتا کہاں ہے اور دوسرا یہ کہ کس طرح ملتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں سرخیل صوفیا محی الدین ابن عربی رح جنہیں شیخ اکبر کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جنہیں تصوّف کی دنیا میں سند کی حیثیت حاصل ہے، اپنی مشہور کتاب "فصوص الحکم" میں رقمطراز ہیں کہ:

"جس مقام سے نبی لیتے ہیں اسی مقام سے انسان کامل صاحب الزماں، غوث، قطب لیتے ہیں۔"

اور اس کے بعد آپ تحریر کرتے ہیں کہ:

"اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مصرح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وحی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں اس کے برعکس ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعے خود اللہ تعالیٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکم شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں بس ایک طور پر مادہ کشف و الہام اور مادہ وحی رسول ایک ہے۔ صاحبِ کشف اللہ تعالےٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین کے موافق ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ سے لینا عین رسول اللہ کا لینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہؐ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معیّن طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امّت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالےٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے۔ پس خلقِ خدا میں

---

[1] یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پرویز صاحب کی اسی کتاب یعنی "تصوّف کی حقیقت" کو جناب رئیس امروہوی صاحب نے روزنامہ جنگ کراچی مورخہ ۱۹ ار فروری ۱۹۸۲ء میں ایک فکر انگیز، پُر از معلومات اور دلچسپ تصنیف قرار دیا۔

خلیفۃ اللہ وہ ہیں جو معدن خاتم الانبیین و مادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لیے تھے۔ اللہ تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وحی احکام شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کر کے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔"

یعنی ابنِ عربی کے کہنے کے مطابق جس مقام سے نبی اور رسول لیتے تھے اسی مقام سے ہم غوث و ابدال لیتے ہیں۔

مولانا رومی

لیکن مولانا رومی صاحب اس سے بھی دو قدم آگے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں کے الفاظ میں سُنیئے کہ:

فکر کن در راہِ نیکو خدمتے　　تا نبوت یابی اندر اُمتے

یعنی ان کے نزدیک نبوت تک پہنچنا بھی ناممکن نہیں۔ (استغفر اللہ)

علامہ اقبال

علامہ اقبال نے اسی کشف و الہام کے متعلق حافظ شیرازی صاحب کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

"دیکھنا یہ ہے کہ سکر کی حالت (کشف وغیرہ) اسلامی تعلیم کا منشا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام کی زندگی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ ایک مسلمان قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ خواب یا سکر۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں میں تو کوئی مجذوب نظر نہیں آتا بلکہ ابتدائی اسلامی لٹریچر میں مجذوب کی اصلاح بھی مثل دیگر اصطلاحات صوفیہ کے نہیں ملتی۔ اصطلاحات صوفیہ کے متعلق آگاہی حاصل کرنی ہو تو علامہ ثعالبی نے لغت میں جو کتاب لکھی ہے اسے دیکھنا چاہیئے۔ نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔"

اس کے بعد علامہ اقبال تحریر کرتے ہیں کہ:

"دوسرا سوال جو حالتِ سکر کے متعلق پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا یہ حالت زندگی کے اغراض سے منافی ہے یا ممد۔ کسی روز فرصت میں یہ ثابت کروں گا کہ علم الحیات کے اعتبار سے یہ حالت زندگی کے لیے نہایت ہی مضر ہے۔ اور جو اس حالت کو مستقل بنا لیتے ہیں وہ کشمکشِ حیات کے بالکل قابل نہیں رہتے۔"

انسان اس علمِ الحیات میں اُلجھ کر کس قدر ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے اس کی مثال بھی علامہ اقبال کے الفاظ میں سُنیئے رقم طراز ہیں کہ:

" وحید خاں ایک پنجابی شاعر تھا جو کسی ہندو جوگی کا مرید ہو کر فلسفہ ویدانت (وحدت الوجود) کا قائل ہو گیا۔ اس تبدیلی خیال و عقیدہ نے اس پر جو اثر کیا اسے وہ خود بیان کرتا ہے :

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ شرن بنے رگناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

یعنی میں پٹھان تھا اور فوجوں کے منہ موڑ سکتا تھا مگر جب سے رگناتھ جی کے قدم پکڑے ہیں یا بالفاظ دیگر یہ معلوم ہوا ہے کہ ہر چیز میں خدا کا وجود جاری و ساری ہے میں ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتا کیونکہ توڑنے میں تنکے کو دکھ پہنچنے کا احتمال ہے۔" (بحوالہ تصوف کی حقیقت)

باطنی علم کے خلاف

اب جہاں تک کشف و الہام کے تحت احکام خداوندی کے باطنی معنی کا سوال ہے تو اس کی وضاحت کے لیے ہمیں پھر علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت سے استفادہ کرنا ہوگا چنانچہ آپ اخبار "وکیل" امرتسر کی اشاعت بابت ۲۸ ، جون ۱۹۱۶ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

" اس وقت صرف اس قدر یاد رکھنا کافی ہے کہ صوفیا ء کرام کے اس گروہ کے خیالات کی عمارت کا بنیادی پتھر علم ظاہر اور علم معارف کا امتیاز ہے۔ بعض صوفیاء اس امتیاز کو علم حصول اور علم حضوری کے امتیاز سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ یہ امتیاز نتائج کے اعتبار سے نہایت خطرناک تھا اور جو اثر اس نے مسلمانوں کے علوم، ان کے ادبیات اور ان کے تمدن و معاشرت اور سب سے بڑھ کر ان کے شعار ملیہ پر کیا وہ ایک محنت افسردہ کرنے والی داستان ہے جو اپنے موقع پر مفصل بیان کی جائے مگر اتنی بات ظاہر ہے کہ یہ امتیاز اور معرفت کو علم پر ترجیح دینا مذہبی اعتبار سے ہر قسم کی رہبانیت کی جڑ ہے اور علمی اعتبار سے ان تمام علوم حسیہ و عقلیہ کی نارنج ہے جن کی وساطت سے انسان نظام عالم کی قوتوں کو مسخر کر کے اس زمان و مکان کی دنیا پر حکومت کرنا سیکھتا ہے۔ یہی اعتبار عیسوی رہبانیت کی جڑ ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے قرآن شریف (۲۷/۵۷) میں فرمایا :

" وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا "

یعنی وہ رہبانیت جس کو عیسائیوں نے ایجاد کیا، مگر ہر قوم کی دماغی اور روحانی تاریخ میں ایک مماثلت ہوتی ہے۔ مسلمان بھی اس رہبانیت سے بچ نہ سکے جس کی حقیقت سے قرآن نے انہیں آگاہ کر دیا تھا اور آج وہ آیت جو عیسائی راہبوں کے متعلق نازل ہوئی تھی، خود مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔"

(بحوالہ "انوار اقبال" صفحہ ۲۷۰ - ۲۶۹)

اس حقیقت کشائی کے بعد مزید ارشاد فرمایا کہ :

" احادیثِ صحیحہ میں کوئی ایسی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری جس سے یہ معلوم ہو کہ نبی اکرم نے علوم رسالت میں سے کوئی خاص علم بعض صحابہ کو سکھایا اور بعض سے اسے چھپایا۔ بادی النظر میں بھی یہ بات خلاف شانِ رسالت معلوم ہوتی ہے۔ یہ آخری رسالت تمام جہانوں کے لیے رحمت ہے اور ایسا عقیدہ رکھنا حقیقت میں بعض جلیل القدر صحابہ کی توہین ہے۔ علاوہ اس کے ممکن نہیں کہ نص صریح کے ہوتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے علوم رسالت میں سے بعض کو بعض سے چھپایا ہو۔ اللہ تعالٰے فرماتا ہے : اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى (۲/۱۵۹) اس آیہ کریمہ سے ظاہر ہے کہ اگر علم باطن کا تعلق بینات اور ہدایت سے ہے، تو معاذ اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گروہ صوفیہ کے عقیدے کے مطابق آیت مذکورہ کی خلاف ورزی کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں۔"

(بحوالہ "انوار اقبال" صفحہ ۲۷۳-۲۷۲)

علامہ اقبال اپنے ایک خط میں جو انہوں نے سراج دین پال (مرحوم) کے نام مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا تھا ان باطنی معانی یا باطنی علم کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

" حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل وشعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دیتا ہے یہ ایک (SUBTLE) طریق تنسیخ ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کرتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی (یعنی گرگٹ کی صفات کی حامل) ہو۔

تصوّف کا دوسرا بنیادی ستون یعنی

(وحدت الوجود)

کشف والہام کی اس وضاحت کے بعد اب ہمارے سامنے تصوّف کا دوسرا بنیادی ستون آتا ہے، جسے وحدت الوجود کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس وحدت الوجود کی بھی پھر دو شاخیں ہیں۔ جہاں تک اس پہلی شاخ کا تعلق ہے تو اس کی رو سے اس پوری کائنات میں کوئی شے اپنا الگ وجود نہیں رکھتی بلکہ وجود صرف خدا کا ہی ہے اور اس لیے اسے "ہمہ اوست" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر نیکی وبدی، خیر وشر کی تفریق، مومن اور کافر کا ذاتی کردار، مکافاتِ عمل انفرادی زندگی سے لے کر قوموں کی اجتماعی زندگی تک دوسروں پر ان کا ظلم وستم اور اس کے تحت جزا وسزا انسانوں کو ایک عالمگیر ضابطہ حیات کے تحت ایک عالمگیر نظامِ حیات قائم کرنے کی تلقین یہ سب چیزیں

بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جبکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ :

"کائنات میں اقتدار اور اختیار خدا ہی کا کارفرما ہے۔ یہ سلسلہ کائنات اس لیے سرگرم عمل ہے کہ ہر ایک کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب ہوتا رہے۔" (۳/۱۸۸)

ابنِ عربی کا عقیدہ

لیکن اس قدر وضاحت کے باوجود اہلِ تصوّف میں سے ابنِ عربی نے تو یہاں تک کہہ رکھا تھا کہ :

"فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلیٰ" کیونکہ فرعون ذاتِ حق سے جُدا نہ تھا اگرچہ اس کی صورت فرعون کی سی تھی۔" (بحوالہ "فصوص الحکم")

اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ :

"اللہ تعالےٰ جب کسی بندہ کی ذات میں داخل ہوجاتا ہے تو ظاہر میں تو وہ بندہ بندہ ہی رہتا ہے لیکن باطن میں خود خدا ہوتا ہے اور یہ دخول بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے انسان میں بصارت، سماعت، حرکت اور سکون داخل ہوتا ہے۔ اس کی واضح مثال حضرت ابراہیمؑ کی ذات اقدس ہے جس میں اللہ تعالیٰ داخل ہوگیا تھا یا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کی ذات میں حضرت ابراہیمؑ خود داخل ہوگئے تھے"

(بحوالہ "تصوف کی حقیقت")

مولانا روم کا فرمان

ابنِ عربی کے بعد اگر مولانا روم کو دیکھا جائے تو آپ کی ذات بھی ابنِ عربی کی طرح وحدت الوجود کی قائل ہے لہٰذا اس سلسلہ میں ان کی ایک غزل "تصوف کی حقیقت" کے حوالے سے درج ذیل ہے :

ہر لحظہ بشکلِ بتِ عیّار برآمد دل برد و نہاں شد
ہر دم بلباسِ دگر، آں یار برآمد، گہ پیر و جواں شد
خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ، خود رند و سبو کش
خود بر سرِ آں کوزہ خریدار برآمد بشکست و رواں شد
خود گشت صراحی و مے ساغر و ساقی خود بزم نشیں شد
خورد آں مے و سرمست ببازار برآمد، شورِ دل و جاں شد

وحدت الوجود کے اس تصوّرِ خود کو عام کرنے کے لیے ابنِ عربی اور مولانا رومی کے علاوہ پنجابی صوفی شعراء نے اپنے ہاں

ں کس قسم کے اشعار کہے ہیں اس کے لیے ان میں سے چند ایک کا کلام پیش کیا جاسکتا ہے جس کو پرویز صاحب نے اپنی کتاب "تصوف کی حقیقت" میں مفہوم کے ساتھ اس طرح درج کیا ہے :

بلھے شاہ

"بلھے شاہ ہوریں کہندے نیں (بلھے شاہ فرماتے ہیں)

(۱) واہ سوہنیا تیری چال عجائب
لٹکاں نال چلیندے ہو
آپے ظاہر، آپے باطن، آپے لُک لُک بہندے ہو
آپے ملّاں، آپے قاضی، آپے علم پڑھیندے ہو
ہن کس تھیں آپ چھپائیدا !

ترجمہ (پیارے محبوب! تمہارے انداز بھی عجیب ہیں خود ہی ظاہر ہو خود ہی باطن خود ہی چھپ چھپ کر بیٹھتے ہو۔ خود ہی ملاّ ہو خود ہی قاضی۔ اور خود ہی تعلیم دینے والے عالم۔ اس کے بعد کہو کہ تم اپنے آپ کو چھپاتے ہو، تو کس سے چھپاتے ہو!)

(۲) کِتے مُلّاں ہو بُلیندے او — کِتے سُنّت فرض دسیندے او
کِتے متھے تِلک لگائیدا — ہُن کس تھیں آپ چھپائیدا

(کبھی تم ملّاں بن کر اذانیں دیتے ہو۔ کہیں سنتوں اور فرضوں کے احکام سُناتے ہو۔ کہیں ماتھے پر تلک لگا کر دھونی رماتے ہو۔ یہ تو بتاؤ کہ تم جو اس قدر نئے نئے رُوپ بدلتے ہو آخر اپنے آپ کو چھپاتے کس سے ہو؟)

(۳) اربع عناصر محل بنائیو، وچ وڑ بیٹھا آپے
آپے کُڑیاں، آپے منگر آپے بنیائیں ماپے
آپے مریں تے آپے جیویں، آپے کریں سیاپے
بُلھیا جو کجھ قدرت رب دی، آپے آپ نجاپے

ترجمہ اس نے خود ہی مادی کائنات کو پیدا اور خود ہی اس کے اندر آکر بیٹھ گیا۔ وہ خود ہی لڑکا ہوتا ہے خود ہی لڑکی اور خود ہی ماں باپ۔ وہ خود ہی زندہ ہوتا ہے اور خود ہی مرتا ہے! اور اپنے مرنے پر آپ ہی سیاپے کرتا ہے۔ یہ وہ بھید ہیں جو کسی کی سمجھ میں اپنے آپ نہیں آسکتے)

(۴) کِتے رام داس کِتے فتح محمد ، ایہو قدیمی شور
مٹ گیا دوہاں دا جھگڑا ، نکل پیا کجھ ہور

(رام داس اور فتح محمد کی تفریق ہی سے سب جھگڑے پیدا ہوئے۔ فقر کی ریت میں آ کر تمام جھگڑے ختم ہو گئے کیونکہ اندر سے کچھ اور ہی نکل آیا۔

(۵) بید پراناں پڑھ پڑھ تھکے سجدے کردیاں گھس گئے متھے
ناں رب تیرتھ ناں رب مکے جس پایا اس نور انوار
عشق دی نویں نویں بہار

ترجمہ (لوگ وید اور قرآن پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہیں۔ مسجدوں میں سجدے کر کرکے خواہ مخواہ اپنے ماتھے گھسا لیے۔ خدا نہ مکے میں ہے نہ تیرتھ میں۔ عشق کی اپنی بہار ہے اس میں پہنچ کر سب نور الانوار میں گم ہو جاتے ہیں۔)

خواجہ غلام فرید

خواجہ غلام فرید فرماتے ہیں :

(۱) نہ کوئی آدم نہ کوئی شیطان بن گئی کل کوڑ کہانی

(درحقیقت نہ کوئی آدم ہے نہ شیطان۔ یہ سب افسانے ہیں۔ حقیقت میں سب وہی ہے)

(۲) ہک جا رب سنگھار دکھاوے ہک جا عاشق بن بن آوے
ہر مظہر وچ آپ سماوے اپنا آپ کرے دیدار
کتھے شاہانہ حکم چلاوے کتھے گدا مسکین سڈاوے
اوسدا بھید کوئی نہ پاوے سب مست پھرن سرشار

(کہیں وہ معشوق کی شکل میں آ کر اپنے حسن سے مسحور کرتا ہے۔ کہیں خود ہی عاشق بن جاتا ہے کائنات کے تمام مظاہر میں وہ خود ہی سمایا ہوا ہے اور اس طرح وہ اپنا دیدار آپ کرتا ہے کبھی وہ شاہنشاہ بن کر اپنا حکم نافذ کرتا ہے۔ کبھی گدا اور مسکین کی شکل میں بھیک مانگتا نظر آتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس کا بھید کوئی نہیں پا سکتا۔ ہر ایک اپنے اپنے نشہ میں سرشار ہے)

شاہ حسین

اور شاہ حسین اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی
سدھو نی مینوں دھیدو رانجھا ہیر نہ آکھو کوئی
رانجھا میں وچ میں رانجھے وچ، ہور خیال نہ کوئی
میں نئیں، او آپے ہے، اپنی آپ کرے دلجوئی

ترجمہ (میں محبوب محبوب پکارتے خود ہی محبوب بن گئی۔ اب مجھے ہیر عاشق کوئی نہ کہے۔ مجھے (رانجھا) محبوب کہو میں جس محبوب کو ڈھونڈ رہی تھی وہ مجھے مل گیا ہے۔ محبوب مجھ میں ہے میں محبوب میں ہوں اور کوئی خیال نہیں۔ اصل یہ ہے کہ میں ہوں ہی نہیں۔ سب کچھ وہ آپ ہی ہے۔ وہ خود ہی ہجر کے آزار میں مبتلا ہوتا ہے اور خود ہی اپنی دلجوئی کرتا ہے)

غالب

غالب نے اس تمام ماجرے کو اپنے ہاں ایک اور اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے اور وہ یہ کہ:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد　　عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ وحدت الوجود کے یہ تصورات اسلام کی پیداوار ہی نہیں بلکہ باہر سے درآمد کردہ ہیں جس کا اظہار علامہ نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۔ جولائی ۱۹۱۶ء کو سید فصیح اللہ کاظمی کے نام ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

وجودی مذہب آیا کہاں سے

"میرے نزدیک تصوف وجودی مذہب اسلام کا کوئی جزو نہیں بلکہ مذہب اسلام کے خلاف ہے اور یہ تعلیم غیر مسلم اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے۔"

(بحوالہ "خطوط اقبال" مرتبہ رفیع الدین ہاشمی، شائع کردہ مکتبہ خیابان ادب، لاہور صہ ۱۲۷)

چنانچہ وحدت الوجود کا یہ عقیدہ ہندوؤں میں "ویدانت" کے نام سے مشہور ہے اور بھگتی تحریک اسی وحدت الوجود کے عقیدہ کو عام کرنے کے لیے چلائی گئی تھی تاکہ رام اور رحیم میں کوئی فرق محسوس نہ ہو اور بتدریج ہندو دھرم اور اسلام کا باہمی امتیاز ختم ہوجائے۔ بقول پرویز صاحب کے، بھگت کبیر، میراں بائی اور گورونانک وغیرہ اسی تحریک کے پرچارک تھے۔ چنانچہ بھگت کبیر کے الفاظ میں:

گہری سازش

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے　　کہت کبیر عقل کے پھیرے

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو وحدت الوجود کی طرف مزید راغب کرنے کے لیے ہندوؤں کی طرف سے گہری سازش تھی جو خاص طور پر پنجاب اور سندھ میں کامیاب ہوئی۔

شعرائے عجم

جہاں تک اس سلسلہ میں عجمی سازشوں کا تعلق ہے تو علامہ اقبال نے مورخہ ۱۰۔۱۔۱۹۱۶ء کو سراج الدین پال (مرحوم) کے نام جو خط تحریر کیا تھا اس میں لکھتے ہیں :

" شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی (وحدت الوجود) فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا۔ اور اگر چہ اسلام نے ہر عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنیاد وحدت الوجود تھی۔ ان شعرائے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے۔ "

(بحوالہ " اقبال نامہ " جلد اوّل صفحہ ۳۵)

حافظ شیرازی کی مخالفت

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے جناب سید فصیح اللہ کاظمی صاحب کے نام ایک خط میں مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۱۶ء کو تحریر کیا تھا کہ :

" میرے نزدیک حافظ شیرازی کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا ہے اس واسطے مَیں نے ان کے خلاف لکھا ہے مجھے امید تھی کہ لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے لیکن میرا ایمان گوارہ نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں۔ شاعری میرے لیے ذریعہ معاش نہیں کہ مَیں لوگوں کے اعتراضات سے ڈروں۔ آخر مَیں انسان ہوں اور مجھ سے غلطی ممکن کیا یقینی ہے۔ نہ ہمہ دانی کا دعویٰ ہے نہ زبان دانی کا۔ "

(بحوالہ " خطباتِ اقبال " رفیع الدین ہاشمی صفحہ ۱۲۸)

وجودی مذہب کی حقیقت

اس کے علاوہ امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار " وکیل " کی ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں آپ نے

یسی دبودی شاعری کے متعلق تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :

" میرا مذہب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نظامِ عالم میں جاری و ساری نہیں بلکہ نظامِ عالم کا خالق ہے۔ اور اس کی ربوبیت کی وجہ سے یہ نظام قائم ہے۔ جب وہ چاہے گا، اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حکماء کا مذہب تو جو کچھ ہے، اس سے بحث نہیں۔ رونا اس بات کا ہے کہ یہ مسئلہ اسلامی لٹریچر کا ایک منفک عنصر بن گیا ہے اور اس کے ذمہ دار زیادہ تر صوفی شعراء ہیں۔ "

صوفی شعراء کا عمل

علامہ اقبال کے علاوہ جناب پرویز صاحب نے تصوف کے شعراء کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ یہ ہیں : " اس طرح وحدت الوجود ان شاعروں کے رگ رگ میں سمو گیا۔ بلھے شاہ، شاہ حسین، خواجہ غلام فرید سلطان باہو، علی حیدر شاہ وغیرہ پنجابی شاعروں اور شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست، شہباز قلندر، سندھی صوفیاء وغیرہ نے وہ دھمال رچائی کہ اسلام کا نام و نشان تک اس غبار میں گم ہو کر رہ گیا۔ اسلام کا نام ہی نہیں جب بات ملامتیہ اور قلندریہ تک پہنچی تو ہر قسم کی شرعی پابندیاں اُٹھ گئیں اور جس قدر کوئی بزرگ فواحش و منکرات کا مرتکب ہو، وہ اتنا ہی پہنچا ہوا قرار پا گیا۔ ملتان کے جلالیہ، شاہ مدار کے مداری، لال شہباز قلندر کے ملنگ، گوگا پیر کے الف شاہی، شاہ بو علی قلندر کے مست ملنگ، مولانا روم کے رقاص درویش، غرضیکہ کس کس کا نام لیجئے اور کس کس کا رونا روئیے یہ سب مقربین بارگاہِ خداوندی قرار پا گئے۔ " (بحوالہ " تصوف کی حقیقت " صفحہ ۹۰)

تصوف اور انسانی رُوح (وحدت الوجود کی دوسری شاخ)

وحدت الوجود کی اس شاخ کے بعد اب ہم اس کی دوسری شاخ کی طرف آتے ہیں جس کے تحت یہ باور کیا جاتا ہے کہ انسانی رُوح دراصل خدا تعالیٰ کی روح کا ہی ایک حصہ ہے اور انسانی ذات کا یہ حصہ زندگی کے بعد اپنے کُل کے ساتھ جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں صوفیاء اور اولیاء اللہ کی فوتیدگی کو " وفات کی بجائے " وصال " کہہ کر پکارا جاتا ہے اور ان کے یومِ وفات کے سلسلہ میں منائی جانے والی تقریب کو عرس[1] کہا جاتا ہے یعنی تقریب عروسی جس کے معنی شادی کی تقریب ہوتی ہے اور جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، یہاں یہ رُوح انسانی پیکر میں متشکل ہو کر مادہ کی دلدل میں اسیر ہے۔ اور اب انسانی زندگی کا مقصود منتہی یہ ہے کہ یہ چیز اپنے کُل کے ساتھ جا ملے اور یہ ملاپ اور یہ وصال تصوف کی خلوت گاہوں میں مختلف انداز کی ریاضتوں اور چلوں سے ہو سکتا ہے جس کے لیے ناگفتہ بہ صعوبات تک،

---

[1] ضمناً جہاں تک پاکستان میں قریہ قریہ ہونے والے عرسوں کی تعداد کا تعلق ہے اس کی کیفیت کچھ آج اس طرح کی ہے کہ ؎

ستّ دن تے اٹھ میلے
گھر توں جاواں کیہڑے ویلے

بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر (۱) خدائی ذات کے حصے بخرے بھی ہو سکتے ہیں (۲) انسان کی تمام نیک اعمالیوں اور قربانیوں کا ماحصل صرف یہ ہے۔ انسانی ذات جیسے پہلے تھی ویسی ہی کی ویسی دوبارہ ہو جائے (۳) یہ کہ انسانی ذات کے لیے قرآن حکیم کا بیان کردہ ارتقائی تصور بے معنی ہے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں لیکن اس کے برعکس حقیقتِ حال یہ ہے کہ:

زندگی کی اصل حقیقت

" زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، پیکرِ انسانیت تک پہنچی ہے۔ اس کے بعد اس نے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے ہیں۔ اب یہ ارتقاء انسانی ذات کا ہوگا۔ جس شخص کی ذات اس قدر نشوونما حاصل کر چکی ہوگی کہ وہ اس زندگی سے اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل قرار پائے، اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ جنّت میں داخل ہو گیا۔ جس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ رک جائے گا (قرآن حکیم) اسے جہنّم کی زندگی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ رُکنے والے تو ایک مقام پر رُک جاتے ہیں لیکن آگے بڑھنے والوں کے لیے میدان وسیع ہوگا۔ اس لیے اہلِ جنّت کے لیے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے مواقع ہوں گے۔ یہ وجہ ہے کہ اہلِ جنّت کے مختلف مدارج بتائے گئے ہیں ــــ کہ اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ (۵۶/۱۰-۱۱) سب سے آگے سب سے زیادہ مقرّب۔ ان کے اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ (۵۶/۲۷) اربابِ یمین و سعادت صفِ دوم میں۔

پھر اہلِ جنّت کے متعلق کہا گیا کہ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا (۶۶/۸) نیز (۵۷/۱۹) ان کی پیشانی کا نور تکمیل تک پہنچ جائے۔ انہیں خدا کی طرف سے جنّات کی خوشخبری دی جائے گی (۵۷/۱۲) یہاں جنّت (واحد) کی جنّات (جمع) کا لفظ آیا ہے۔ اہلِ جنّت کے حسنِ عمل کا نور ان کے راستے روشن کرتا جائے گا اور اس طرح وہ ایک جنّت سے آگے بڑھ کر دوسری جنّت میں پہنچ جائیں گے۔ سورہ زمر میں ہے لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَعْدَ اللّٰهِ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ۔ (۳۹/۲۰) ان کے لیے غرف بالائے غرف ہوگا۔ غرف کا لفظ بڑا وسیع المعنی ہے۔ اس میں رفتار کی تیزی، ندی میں پانی کی کثرت اور روانی اور بالاخانہ کے اوپر بالاخانہ کی بلندی سب آجاتی ہے۔ لہٰذا اہلِ جنّت کے متعلق کہا کہ ان کے لیے زندگی کی کشادگیاں اور فراوانیاں سربلندیاں اور سرفرازیاں اور مدارج بالائے مدارج ہیں جوں جوں ارتقائی منازل طے کرتے جائیں گے ان کا مقام

بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا۔ لہٰذا جنت کی زندگی جمود اور تعطل کی زندگی نہیں۔ وہ خود ایک میدانِ عمل ہے اس فرق کے ساتھ کہ اس دنیا کی جہنم کی زندگی میں انسان کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں جسم کے لیے سامان پرورش کے حصول کی نذر ہو جاتی ہیں۔ جنت کی زندگی میں انسان اس طرف سے یکسر مطمئن اور مامون ہوگا۔ اس لیے اس کی ساری صلاحیتیں انسانی زندگی کے ارتقاء کی کوششوں میں صرف ہوں گی۔ اس کارگہ حیات کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ:

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ (۷۴/۳۷)

یہ جہان عمل ہے جس میں انسان کو مختلف صلاحیتیں دے کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے آگے بڑھ جائے جس کا جی چاہے پیچھے رہ جائے۔

اور جنت اخروی کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ:

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (۸۳/۲۶)

جس کے دل میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہے وہ اس میں آگے بڑھے

یوں انسانی زندگی آگے بڑھتی اور طبقاً طبقاً بلند ہوتی چلی جائے گی (۸۴/۱۹) لیکن اس ارتقاء کا منتہا کیا ہوگا ہم نہیں کہہ سکتے۔ نہ شعور کی موجودہ سطح پر ہم اس کا ادراک ہی کر سکتے ہیں"

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات نکھر کر سامنے آچکی ہوگی کہ انسانی ذات بذاتِ خود ایک عمل ہے نہ کہ خدا کی ذات کا جزو اور اس کی نشو و نما کا ایک اپنا اصول ہے اور اس اصول کو نظر انداز کرنے سے اس گوہر تابدار کی وہ تمام خوابیدہ صلاحیتیں سلب ہو کر رہ جاتی ہیں جس کے نقصان کا آج ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اسی نقصان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء کو اکبر الہ آبادی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں تحریر کیا تھا کہ:

"ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک وہ جو (لیرک پوئٹری) کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم سے ہے جو افیون اور شراب کا نتیجہ ہے۔

(۲) دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیہ اسلامیہ اور ہندو جوگیوں کے نزدیک ذات انسانی کو ذاتِ خداوندی میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذاتِ خداوندی میں ہے نہ احکام خداوندی میں"

اس کے بعد علامہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم تمام مذہبوں و اخلاق کے خلاف جڑ کاٹنے والی ہے۔ میں ان دو قسموں کی بے خودی پر معترض ہوں اور بس۔ حقیقی اسلامی بے خودی میرے

نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالےٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔"

(بحوالہ "اقبال نامہ" جلد دوم صفحہ ۶۰)

مادیت تصوّف کی نظر میں

انسانی ذات کی اس اہمیت اور خدا کی ذات کے ساتھ اس کے اس فرق کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ تصوّف کی نظر میں مادیت کا کیا مقام ہے اور وہ اسے اپنے ہاں کیا اہمیت دیتا ہے چنانچہ اس مقصد کے لیے ہمیں اہلِ تصوّف کے صرف ایک دو اقوال پیش کرنا ہوں گے۔ لہٰذا ان کا کہنا یہ ہے کہ:

(۱) "دنیا ایک بیمارستان ہے اور لوگ اس میں دیوانوں کی مانند ہیں اور دیوانوں کے لیے بیمارستان میں قید زنجیر ہوتی ہے۔" (حضرت فضیل بن عیاض وفات ۱۸۷ھ)

(۲) آپ کا دوسرا قول یہ ہے کہ، "اگر دنیا اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ مجھے دے دی جائے اور اس پر کسی محاسبہ کا اندیشہ بھی نہ ہو تب بھی میں ایسا ہی ناپاک سمجھوں گا جیسے تم مردار کو ناپاک سمجھتے ہو۔"

(۳) "تمام انبیاء نے اور تمام اولیاء نے دنیا کو ترک کیا ہے اور اس سے بیزاری ظاہر کی ہے پھر جو شخص ان کی خلاف ورزی کرے وہ کیونکر مسلمان ہو سکتا ہے۔" (حضرت سلطان باہو۔ وفات ۱۱۰۲ھ)

لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ قدرت کی طرف سے یہ پیدا کردہ کائنات ایک بہت بڑا "جن" ہے جسے انسان کے لیے تابع و تسخیر کر دیا ہے لیکن اس کو مسخر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان قدم قدم پر اس کی ساخت پر غور و فکر کرے۔ چنانچہ اقبال نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس آدم خاکی سے کہا تھا کہ ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ ۔۔۔ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اور دوسری جگہ فرمایا ؎

فطرت کو خرد کے رو برو کر! ۔۔۔ تسخیر مقام رنگ و بو کر!

کیونکہ ؎ وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے ۔۔۔ جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

لیکن تصوّف کی دنیا اس سے کہیں بعید ہے کہ وہ تخلیقی حقائق پر غور کرتے ہوئے اس کے پردوں میں چھپے ہوئے جلوؤں کو ذوقِ نظر کے قابل بنا سکے اور کائنات کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارنے کی طرف کوئی ترغیب دے۔ تصوّف کی پیدا کردہ تاریک دنیا اور نبوّت کے جہانِ نو میں کس قدر بعد ہوتا ہے، اقبال نے اسے بڑے دلنشیں انداز کے اندر اپنے خطبات میں اس طرح بیان کیا ہے۔ فرمایا:

"محمد عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

یہ الفاظ ایک بہت بڑے مسلمان صوفی بزرگ (حضرت عبدالقدوس گنگوہی) کے ہیں۔ تصوف کے لٹریچر میں ان جیسے الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے۔ جو ایک فقرہ کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ گاہ سے واپس آتا بھی ہے (اس لیے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پاکر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ گاہ کی تجرد گاہ آخری مقام ہوتی ہے لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس کی آنکھ نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک صاحبِ وحی کے "تجربہ" کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے، وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔" (خطبات - صفحہ ۱۱۸)

اور اس سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:

"اے رسولؐ! ان سے کہو کہ وہ کون ہے کہ جو ان چیزوں کو جنہیں خدا نے انسانوں کے لیے باعثِ زینت بنایا ہے اور اس ذوق کو جسے اس نے خوشگوار پیدا کیا ہے، حرام قرار دے سکے۔ اس دنیا میں ان چیزوں کے لیے جو بھی کوشش کرے گا اس کو مل جائیں گی لیکن آخرت میں یہ مومنین کے لیے مختص ہوگی۔ اس طرح خدا ان لوگوں کے لیے جو علم و بصیرت سے کام لیں اپنی آیات کو نکھار کر بیان کر دیتا ہے۔" (۷/۳۲)

اور جو لوگ ان احکام سے رو گردانی برتیں انہیں کہہ دیا گیا کہ "جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور ہم اسے قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔" (۲۰/۱۲۴)

صدائے اقبال

یہ تھے تصوف کے لوازم و خصائص جن کے اثرات سے علامہ اقبال آنے والی نسلوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کے دردِ دل سے ایک صدا بلند ہوئی جس کا ایک ایک لفظ ہماری قوتِ سماع کے لیے قابلِ صد توجہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میں صرف یہ بات مسلمانوں پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عجمی تصوف (عجمی اس لیے کہ اس کی تدوین کرنے والوں میں بیشتر عجمی تھے) جزوِ اسلام نہیں۔ یہ ایک قسم کی رہبانیت ہے جس سے اسلام کو قطعاً تعلق نہیں اور جس کے اثر سے اسلامی اقوام میں قوتِ عمل مفقود ہو گئی ہے۔ تصوف کا تو لفظ ہی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود نہ تھا۔ سنہ ۲۰۵ھ میں یہ لفظ پہلے پہل استعمال میں آیا اور رفتہ رفتہ تصوف کے عجمی حامیوں نے ایک اخلاقی اور معاشرتی نصب العین پیدا کر دیا جو آخر مسلمانوں کی بربادی کا باعث ہوا یا کم از کم اور لواعث میں ایک باعث یہ بھی تھا۔ اسلام نے ابتدا ہی سے اس کی مخالفت کی اور مسئلہ وحدت الوجود کے متعلق تو علمائے امت کا اجماع ہے کہ یہ قطعاً غیر اسلامی تعلیم ہے، میں یہ سب باتیں انشاء اللہ ثابت کروں گا۔"

(بحوالہ اخبار "وکیل" امرتسر۔ ۹، فروری سنہ ۱۹۱۶ء)

المختصر یہ کہ تصوف کے وہ سنگ و خشت جن سے نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی یہ عمارت تعمیر ہوتی ہے اور پھر جس کے سربستہ یخ بستہ تہہ خانوں میں انسانیت کی رگوں میں دوڑنے والے گرم خون کو ٹھنڈا کرنے اور رکھنے کے لیے اسے ہر قسم کے علم و فن اور "نگارخانہ" کے سامان سے آراستہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

(۱) قارئین تصوف کے ان تمام لوازمات اور تصورات کو ایک بار پھر سامنے لائیں اور غور کریں کہ ختمِ نبوت کے بعد خدا سے براہِ راست علم کا حصول کیونکر ممکن ہے۔

(۲) کشف و الہام کے علاوہ وحدت الوجود کا تصور ذاتِ خداوندی کی کبریائی کو کس مقام پر لاکھڑا کرتا ہے۔

(۳) اور اس کے بعد یہ کہ انسانی ذات دراصل اللہ تعالیٰ کی ذات کا ہی ایک جزو ہے جبکہ (معاذ اللہ) خدا کی ذات کا یہ جزو اس کرۂ ارض پر جس قسم کے کارنامے سرانجام دیتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ادارہ منہاج القرآن اور تصوف

جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے اسے آپ ذہن نشین رکھیں اور اس کے بعد روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۲۶ ۱/۸۹ کے حوالے سے یہ خبر (بغیر کسی تبصرہ کے) ملاحظہ فرمائیں جو ادارہ منہاج القرآن لاہور کے متعلق ہے اور جس کے بانی و سرپرستِ اعلیٰ پروفیسر محمد طاہر القادری ہیں۔

"ادارہ منہاج القرآن کی دعوت پر آئے ہوئے عالم اسلام کے علماء و مشائخ کے اعزاز میں ادارہ کی طرف سے دیئے گئے ایک استقبالیے میں مقررین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام کے فروغ اور سربلندی کے لیے تصوف نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے اور تصوف کے راستے کو اپنائے بغیر دنیا میں اسلام کا غلبہ ممکن نہیں۔ تقریب سے ابوظہبی کے شیخ زید بن سلطان کے خصوصی مشیر الشیخ السید علی الہاشمی کویت کے سابق وزیر اوقاف الشیخ السید یوسف الرفاعی ابوظہبی کی وزارت اوقاف و مذہبی امور کے خطیب اوّل الشیخ السید محمد سلیمان خنج، لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس غلام مجدد مرزا اور پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے خطاب کیا۔ جبکہ تقریب میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس بشیر الدین خاں، جنرل کے ایم اظہر صاحب کے علاوہ معروف شخصیات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔"

رسولِ خدا نے مجھے بشارت دی ہے

جہاں تک ادارہ منہاج القرآن کے مقاصد اور اس کے بانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خود پروفیسر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ:

"مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی اور فرمایا کہ تم اللہ کے دین کی سربلندی، میری سنت کی خدمت اور میری اُمت کی نصرت کا کام کرو۔ میں یہ کام تمہارے سپرد کرتا ہوں۔"

یہ بات ادارہ منہاج القرآن کے سرپرستِ اعلیٰ پروفیسر طاہر القادری نے قومی ڈائجسٹ کو دیئے گئے انٹرویو میں کہی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نااہل اور ناتواں انسان ہوں اور خطاکار ہوں اور اس لائق نہیں کہ یہ کام کرسکوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم شروع کرو، اللہ تمہیں توفیق اور وسائل دے گا۔ منہاج القرآن کا ادارہ بناؤ۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں لاہور میں تمہارے ادارے میں آؤں گا۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ:

"میرے والد کو رسولِ اکرم ﷺ نے میری صورت میں بیٹے کی بشارت دی اور بارہ سال بعد رسول اللہ ﷺ نے میرے والد سے کہا کہ طاہر اب سنِ شعور کو پہنچ چکا ہے اپنا وعدہ پورا کرو۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ ۱۱/۸۶)

ذکر کچھ مخلص لوگوں کا

۱۹۳۷ء میں تبلیغی جماعت کوئی قابلِ ذکر جماعت نہ تھی۔ اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں رائے ونڈ میں سالانہ اجتماع کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک ہوگئی اور اس سال ۱۹۸۶ء میں یہ تعداد ۶-۷ لاکھ تک پہنچ گئی۔ لیکن اس جماعت کی تنظیم، عمل، ایثار اور تگ و تاز کا ماحصل سوائے اس کے اور کیا ہے کہ اس قدر قربانیوں کے باوجود یہ برِ عظیم دنیا میں اپنے آپ کو سوائے کلمہ سیدھا کرانے والوں کے سوا کسی دوسرے نام سے متعارف نہیں کرواسکا۔

بقول ایک مفکر کے کسی قوم کی یہی بدقسمتی نہیں ہوتی کہ اس میں ایسے لوگوں کا فقدان ہو۔ جن میں خلوص، ایثار، دیانت، جذبہ عمل اور جوشِ کردار ہو۔ اس کی اس سے بھی بڑی بدقسمتی یہ ہوتی ہے کہ جن لوگوں میں یہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود ہوں وہ کسی غلط فہمی یا خود فریبی کی بنا پر انہیں ایسے کاموں میں صرف کریں جن کا کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہ ہو۔" قرآن کریم نے غالباً ہمارے لیے ہی یہ کہا تھا کہ:

"تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے زیادہ خسارے میں کون لوگ ہیں وہ لوگ جن کے اعمال رائگاں جائیں گے۔"
یعنی عمل تو کیا جارہا ہوتا ہے لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

روزنامہ جنگ لاہور جمعہ میگزین مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جناب ساجد فاروق شیخ صاحب کا ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں کا عظیم اجتماع خاموش انقلاب" شائع ہوا جس میں اس عظیم اجتماع کی روئیداد بیان کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ:

"ہر فرد بس ایک ہی دُھن میں گرفتار ہو کر ادھر کا رُخ کرتا ہے اور وہ دُھن یہ ہے کہ اللہ کی وسیع و عریض سرزمین میں اللہ ہی کا پیغام عام کرے۔ کچھ دن دنیاوی بکھیڑوں سے دُور رہ کر اس ذاتِ حق کی یاد اور اسی کے نام پاک کی تبلیغ میں گزارے۔ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور تعریفیں اسی کے

لیے آئی ہیں۔ اب مسلسل تین شب و روز رائے ونڈ کی یہ سرزمین درود و سلام کی آوازوں سے گونجے گی۔
اولیائے کرام اور صوفیائے عظام اپنی بصیرت افروز اور دلوں میں اُتر جانے والی تقریروں سے لاکھوں سامعین کے قلب و جگر گرمائیں گے۔ ہر طرف اللہ اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہوگا۔ ذکر و فکر کی محفلیں سجیں گی۔ اعمالِ حسنہ کی دعائیں کی جائیں گی اور اپنے گناہوں پر گریہ زاری سے بارگاہِ قدوسی میں درخواستیں پیش ہوں گی۔"

مضمون نگار کے کہنے کے مطابق جہاں تک تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا الیاس کاندھلوی صاحب کا تعلق ہے آپ حضرت امام غزالی رح، شیخ عبدالقادر جیلانی رح، حضرت امام بخاری رح اور حضرت سفیان ثوری رح کی لڑی سے ہیں اور آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ارشاد ہُوا تھا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ اس مضمون کے علاوہ روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۶ ۱۱/۸۶ کی اشاعت کے سرورق پر "تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع" کے زیرِ عنوان جو مضمون شائع ہوا اس کی ابتدا ان الفاظ سے کی گئی تھی کہ:

"برِ صغیر پاکستان و بھارت میں جن حضرات کی کوششوں اور تبلیغی جد و جہد سے اسلام کا نور پھیلا ان کی ذات "مدرسہ اور خانقاہ کے کمالات کی جامع تھی۔"

جبکہ اسی مدرسہ و خانقاہ کے کمالات کے متعلق علامہ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ

میرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادہ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

اور اپنے کدو کو اس لیے غنیمت گردانا کہ

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکر مدرسہ و خانقاہ سے ہو آزاد

علامہ کی صحت اور تصوف

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ علامہ کی طرف سے نظریہ تصوف کے ہر پہلو کی اس قدر مخالفت کے باوجود جو کہیں کہیں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے تو بقول پرویز صاحب کے اس کی ایک دو وجوہات ہیں اور وہ یہ کہ آپ کا بچپن تصوف کی وادیوں میں گذرا۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود کسی ایک جگہ کیا ہے اور علماء علم النفس کی تحقیق (یا کم از کم نظریہ) یہ ہے کہ "بچپن کی فضا کے تاثرات انسان کے لاشعور کی گہرائیوں میں جاگزیں رہتے ہیں اور وہ عمر کے کسی حصے میں بھی سر اُبھار سکتے ہیں۔"

(بحوالہ "تصوف کی حقیقت" صفحہ ۲۵۸)

اور دوسری وجہ پرویز صاحب کے نزدیک علامہ کی صحت کی خرابی تھی جس کا ذکر جناب نیازی صاحب نے اپنی ۲۲ فروری ۱۹۳۶ء کی ڈائری میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ،

"بلند فکر موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی تو حضرت علامہ نے کروٹ بدلی اور جو شال اوڑھ رکھی اس کا دامن سمیٹتے ہوئے فرمایا "نیازی صاحب! یہ سب کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، یہ سب ہیچ ہے" اور یہ کہتے کہتے خاموشی اختیار کرلی۔ میں پہلے ہی پریشان بیٹھا تھا۔ حضرت علامہ نے یہ الفاظ کہے اور ضیق کی تکلیف ہونے لگی تو میری پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ میں سوچ رہا تھا کہ فلسفہ و حکمت کی

گفتگو ہو اور حضرت علامہ فرمائیں یہ سب کیا ہے یہ کچھ نہیں۔ حالانکہ فلسفہ و حکمت تو وہ موضوع ہے جس پر ان کی گفتگو کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ یوں بھی حضرت علامہ کا ذوقِ حیات کبھی اتنا مضمحل نہیں ہُوا تھا کہ انہیں فلسفہ و حکمت ہیچ نظر آنے لگیں۔ لہٰذا انہوں نے جو فرمایا کہ یہ سب ہیچ ہے تو اس سے ان کا مطلب کیا ہے۔ پھر خیال آیا ممکن ہے کہ ان کا اشارہ کسی خاص حقیقت کی طرف ہو لہٰذا دم کشی کی تکلیف دُور ہوئی اور حضرت علامہ پھر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تو میں نے عرض کیا "آپ کا اشارہ شوپن ہاور کی طرف ہے۔ اس کی یاس اور بے دلی کی طرف کی زندگی ہیچ ہے سرتاسر ہیچ" ارشاد ہُوا ہرگز نہیں زندگی نعمت ہے بہت بڑی نعمت لیکن اس کے ساتھ صحت کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔ میرا اشارہ انکار نعمت کی طرف نہیں بلکہ زوال نعمت کی طرف ہے۔ علم کی لذت بڑی چیز ہے مگر اس میں کچھ مزہ ہے تو جب ہی کہ زندگی کے ساتھ صحت ہو۔ انسان کچھ کہے، کچھ کر سکے یہ نہیں تو کیا ہے؟ زندگی ہیچ! فلسفہ و حکمت ہیچ۔"

(بحوالہ "اقبال کے حضور" صفحہ ۲۲۸ — "تصوف کی حقیقت" صفحہ ۳۱۶)

ان دو وجوہات کے علاوہ پرویز صاحب کی نظر میں گاہے گاہے علامہ کا تصوف کی طرف مائل ہونے کی تیسری وجہ ان کی تنہائی تھی اور پھر ایسے لوگوں کی تنہائی کس قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی تعریف ڈاکٹر جنگ کے حوالے سے اس طرح کی گئی ہے کہ "تنہائی سے یہ مراد نہیں کہ جو باتیں اس کے نزدیک نہایت اہم ہوتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہوتا جسے وہ انہیں بتا سکے یا تنہا وہ ہے جس کے بعض خیالات ایسے ہوں جنہیں دوسرے لوگ قابل قبول (یا جائز) نہ سمجھتے ہوں۔ ...... اصل یہ ہے کہ جب کسی شخص کا علم دوسروں سے بڑھ جائے تو وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ (بحوالہ "تصوف کی حقیقت" صفحہ ۳۱۶)

ڈاکٹر جنگ دوسری جگہ اس مشکل کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے کہ:

"ایک صاحبِ تخلیق انسان کو اپنی زندگی پر قابو نہیں رہتا وہ آزاد نہیں ہوتا۔ اس کی باگ اس کے (DAIMON) کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" (تصوف کی حقیقت" صہ ۳۱۷)

لہٰذا پرویز صاحب لکھتے ہیں کہ:

"اربابِ فکر کے احساسِ تنہائی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں سے تنگ آ کر خلوت گاہوں کی تلاش میں چل نکلتے ہیں جہاں انہیں سکون (یا فریب سکون) میسر آ سکے۔ پنجابی فقیر (بلھے شاہ) کے الفاظ میں:

چل بلھیا چل اوتھے چلیئے جتھے وسدے سارے انّھے
نہ کوئی ساڈی ذات پچھانے نہ کوئی سانوں منّے

(بلھے شاہ چلو کسی ایسی جگہ جا کر ڈیرہ جمائیں جہاں سب اندھے بستے ہوں۔ وہاں نہ کوئی یہ پہچانے کہ ہم کون ہیں اور نہ ہی کوئی ہمارا عقیدت مند ہو۔)

اور غالب کے الفاظ میں: ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مرجایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(بحوالہ "تصوف کی حقیقت" صفحہ ۳۱۸/۳۱۷)

یہ تھیں وہ تین وجوہات یعنی بچپن کے تصورات، صحت کی خرابی اور تنہائی کا احساس جن کی وجہ سے علامہ اقبال کے کلام میں کہیں کہیں مولانا روم کی اتباع میں تصوف کی جھلک نظر آتی ہے اور آپ یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ :

" عرب اور عجم دونوں ہمارے ماضی کا تار و پود ہیں۔ ہم عرب کو نظر انداز کر سکتے ہیں نہ عجم کو۔"

(اقبال کے حضور" صفحہ ۵۰)

اور اس کے بعد الہام کا عقیدہ جس کی آپ نے بڑی شدت کے ساتھ مخالفت کی تھی، ایک موقع پر اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ :

" میرے عقیدے کی رو سے بعد وحی محمدیؐ کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ تو الہام کا جاری ہے مگر الہام بعد وحی محمدی حجت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ہر اس شخص کے لیے جس کو الہام ہُوا ہو۔"

(بحوالہ "انوارِ اقبال" صفحہ ۴۸)

اقبال کا قلبی جہاد

بہرحال ہم کہہ رہے تھے کہ علامہ اقبال جیسی علمی شخصیت نے تصوف کی ان تاریک وادیوں سے جو چھٹکارا حاصل کیا تو اس کے لیے انہیں زبردست قلبی اور ذہنی جہاد کرنا پڑا تھا جس کا ذکر وہ خود ایک مکتوب میں کرتے ہیں، جو انہوں نے خواجہ حسن نظامی (مرحوم) کے نام ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو تحریر کیا تھا۔ لکھتے ہیں کہ :

" میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے۔ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا تھا کیونکہ فلسفہ یورپ بحیثیت مجموع وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لیے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔"

(بحوالہ "خطوط اقبال" مرتبہ : رفیع الدین ہاشمی)

اور یہ تو ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ دماغی اور قلبی جہاد بڑا ہی اذیت ناک ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے ان رجحانات کے ساتھ قلبی اور دماغی جہاد ہی نہیں کیا بلکہ واضح انداز میں قندیل آسمانی کی روشنی میں جو کچھ ان کی آنکھ نے دیکھا، اسے بغیر کسی لگی لپٹی کے نہایت واضح انداز میں دوسروں کے سامنے بیان بھی کر دیا اس امید کے ساتھ کہ :

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تیری خاک میں ہے

لہ یہاں علامہ اقبال کی زندگی کے اس پہلو کو واضح کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم تصوف کی غیر قرآنی وادی میں خیمہ زن ہونے کے لیے علامہ اقبال کی ذات کو بطور ڈھال استعمال نہ کریں ... (راقم)

علامہ کی اس نوائے سحر گاہی میں کسی قسم کی ریاکاری اور منافقت نہ تھی اور اس چیز کا اظہار انہوں نے ان الفاظ میں بھی کیا کہ:

"لوگ ریاکاری سے عقیدت رکھتے ہیں اور اسی کا احترام کرتے ہیں۔ میں ایک بے ریا زندگی بسر کرتا ہوں اور منافقت سے کوسوں دور ہوں۔ اگر ریاکاری اور منافقت میں میرے لیے وجہ حصولِ احترام و عقیدت ہو سکتی ہے تو خدا کرے میں اس دنیا سے ایسا بے تعلق اور بے گانہ ہو جاؤں کہ میرے لیے ایک آنکھ بھی اشکبار اور ایک زبان بھی نوحہ خواں نہ ہو۔ پبلک کے احترام اور عقیدت کا خراج ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو عوام کے غلط نظریات اخلاق و مذہب کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھے عوام کے احترام کی خاطر ان کے نظریات کو قبول کر کے اپنے آپ کو گرانا اور رُوحِ انسانی کی فطری آزادی کو دبانا نہیں آتا۔" (بحوالہ "اقبال نامہ" جلد دوم صفحہ ۲۴۲)

حصولِ پاکستان کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نئی نسل کی تعلیم و تربیت شروع سے ہی اس طریق پر کی جائے کہ وہ

تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بتانِ عرب کے پجاری تمام

کے خطرناک جراثیم سے محفوظ رہے لیکن ایسا نہ ہوا۔ علامہ اقبال کا کہنا یہ تھا

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوشِ فردا
جسے آگئی میسر میری شوخیٔ نظارہ

ابلیس کی مجلس شوریٰ

نئی نسل کو یہ شوخیٔ نظارہ کیوں میسر نہ ہوئی۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ جواز کیا تھی یہ جاننے کے لیے راقم کو یہاں علامہ اقبال کی مشہور اور طویل نظم کا صرف آخری شعر درج کرنا ہو گا جو ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی مجلس شوریٰ کے نام سے متعارف ہے۔ جس میں علامہ کی زبانی ابلیس اپنے مشیروں کو ملّتِ اسلامیہ کی مکمل تباہی و بربادی کی خاطر مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے — پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

قرآن حکیم نے ایک مقام پر کہا ہے کہ اس کی روشنی وہ روشنی ہے جسے مومن دنیا میں لے کر پھرتا ہے۔ لہٰذا یہ قرآن حکیم کی تعلیم ہی تھی جس نے اقبال کو اقبال بنا دیا ورنہ ان کے اپنے الفاظ میں

حلقۂ صوفی میں ذکر نَم و بے سوز و ساز — میں بھی رہا تشنہ کام تُو بھی رہا تشنہ کام

علامہ اقبال کی طرف سے اس حقیقت کشائی کے بعد تصوف کے متعلق جناب پرویز صاحب کے یہ الفاظ ہر فرد کو ذہن نشین کرنے چاہئیں کہ

"تصوف کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنی فکری کاوشوں (یعنی انسانی ذرائع علم) کے بغیر براہِ راست

خدا سے علم حاصل کر سکتا ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے قرآن کریم نے وحی کہہ کر پکارا اور ختمِ نبوت سے جس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا تھا۔ اربابِ تصوف نے اس علم کا نام وحی کی بجائے کشف الہام یا باطنی علم رکھ لیا۔ لیکن یہ صرف نام کا فرق ہے۔ اصل کے اعتبار سے اس میں اور وحی میں کوئی فرق نہیں۔ چونکہ ان کے دعووں کے مطابق اس علم کے حصول میں علم و عقلِ انسانی کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس لیے انہوں نے اپنے باطنی علم کی اہمیت کے اثبات کے لیے علم و عقل کو ناقابلِ اعتماد، فریب کار، حیلہ جو، غرضیکہ ہر اعتبار سے قابلِ نفرت قرار دے دیا۔" (بحوالہ: تصوف کی حقیقت" صفحہ ۳۱۲)

اور پرویز صاحب کے ہی الفاظ میں " علم بالحواس اور صوفیاء کا باطنی علم اسلام اور تصوف میں کشمکش کا نقطۂ ماسکہ ہے " اور اس امر کی مزید وضاحت انہوں نے ان الفاظ میں یوں فرمائی کہ:

" اسلام نام تھا اس اجتماعی نظام کا جس میں قرآنی احکام و اقدار عملاً نافذ ہوں۔ تصوف نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ " دین کا مغز" (اسلام کی غایت اور منتہیٰ) وہ نام نہاد رہبانیت ہے جو تصوف کی خلوت گاہوں میں مختلف قسم کی ریاضتوں اور اوراد و وظائف سے حاصل ہوتی ہے اس سے دین اجتماعی نظام کے بجائے یکسر انفرادی بن کر رہ گیا۔

مروّجہ اسلام اور تصوّف

مؤقر ماہنامہ " نصرت " (لاہور) کے مدیر اور سابق پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ جناب حنیف رامے صاحب نے ۱۹۶۶ء میں پرویز صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو کے دوران تصوف کے متعلق بھی ایک اہم سوال کیا تھا۔ بہتر ہے کہ موضوع کی مناسبت سے یہ متعلقہ سوال اور پرویز صاحب کا جواب درج کر دیا جائے:

حنیف صاحب: ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاءِ کرام کی مرہونِ منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے، بلکہ اہلِ تصوف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالی رح، شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ رح اور بعض کے نزدیک اقبال رح کا بلند پایہ مجتہد بن ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز صاحب: حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لیے اس قدر کاوش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔ باقی رہی شخصیتیں تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (۲/۱۳۴)

"یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے، جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لیے ہے اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لیے ہو گا اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔"

لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین، ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابل ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لیے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل (بحوالہ نصرت لاہور۔ طلوعِ اسلام لاہور جنوری ۱۹۶۶ء)

اس کے اثرات

قرآن کریم نے بتایا کہ اسلامی نظام کا مطلوب و مقصود یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لیے صرف کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ فطرت کی قوتوں کو علم و بصیرت کی رو سے مسخر کیا جا سکتا تھا مگر جب علم و عقل کو قابلِ نفرت سمجھ لیا جائے تو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تصوف کی وجہ سے "بساطِ زندگی پر مسلمانوں کے سب مہرے مات ہو گئے۔ نہ نظام رہا نہ اس کی غرض و غایت کا کوئی خیال رہا" (بحوالہ "تصوف کی حقیقت" صفحہ ۳۸۴)

بساطِ زندگی میں مسلمانوں کے سب مہرے اس لیے مات ہو گئے تھے کہ تصوف نے ان کی روح کو پوری طرح متاثر کر دیا۔ تصوف کے جراثیم تو ویسے بھی مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ شریعت کے جراثیموں سے کہیں زیادہ مہلک اور سخت جان ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم انسان کو قلبی اور ذہنی طور پر اس قدر مفلوج، جذباتی، تقلیدی اور شخصیت پرست بنا دیتے ہیں کہ اگر آپ تصوف پسند کے سامنے کسی بزرگ یا صوفی کے کسی قول کو غلط قرار دیں اور خواہ آپ کا اس قول کو غلط قرار دینا قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہی ہو،

کیوں نہ ہو۔ تو اس پر بھی غور و فکر کرنے کی بجائے ان کے ارادت مندوں کے جذبات مشتعل ہوئے بغیر نہیں رہتے اور اس کے علاوہ یہ کہ تصوّف کی ان وادیوں میں اُترے ہوئے انسان کے لیے واپس میدانِ عمل میں آنا مذہبی پیشوائیت کے تصوّرات سے چھٹکارا حاصل کرنے سے کہیں زیادہ کٹھن، ہمّت طلب اور مشکل ترین ہوتا ہے۔ کیونکہ تصوّف کی تسبیح کے دھاگوں کے بنے ہوئے جال میں سادہ لوح عوام ہی نہیں بڑے بڑے صاحبِ علم اور فہم و فراست حضرات اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن حکیم کا اعجاز تھا کہ علامہ اقبال جیسی علمی شخصیت نے تصوّف کی تاریک اور سنگلاخ وادیوں سے اپنا دامن بچا لیا اور اس کی بھر پور مخالفت بھی کی۔

ہندو اور تصوّف

تقسیم ہند سے پہلے ہندو کی دُور رس نگاہ نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اگر مسلمانوں میں تصوّف کے جراثیم کو عام کر دیا جائے تو پھر ان کے قومی تشخص کو مجروح کرنا آسان ہو جائے گا۔ لہٰذا کوشش یہ کی گئی کہ مسلمان تصوّف کو مفروضِ دین کی حد تک تسلیم کر لیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں دیوان لال چند ناول رائے نے ۱۹۳۹ء میں ایک نشری تقریر میں تصوّف کی طرف ترغیب دیتے ہوئے کہا تھا کہ:

"تصوّف ہی وہ ذریعہ ہے جس کی رو سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ تمام اہلِ ہند قومیت واحدہ کے رشتے میں پروئے جائیں گے اور یہی چیز ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے صحیح حل کی طرف راہ نمائی کر سکتی ہے۔" (بحوالہ "نیشنل کال" ۲۶ مارچ ۱۹۳۹ء)

جی ایم سیّد

یہی وہ تصوّف ہے جس کی تشہیر جی ایم سیّد صاحب نے اپنی کتاب جس کا اردو ترجمہ "جیسا میں نے دیکھا" شائع ہو چکا ہے، میں لکھتے ہیں:

"صحیح ترین تصوّرِ حیات تصوّف ہے جس کا اسم اصول وحدتِ مذاہب۔ تصوّف عدم تشدد یا اہنسا کا حامی ہے وہ حق و صداقت پر کسی مخصوص گروہ کی اجارہ داری تصوّر نہیں کرتا۔ وہ کسی بھی مذہبی اقتصادی اور سیاسی نظریہ کو حرفِ آخر جان کر اندھی تقلید سے گریز کرتا ہے۔" (صفحہ ۲۰۵/۲۰۶)

اور اس کتاب کے آخر پر آپ تحریر کرتے ہیں کہ:

"صوفی مذاہب و عقیدہ کی بنیاد پر قومیت استوار کرنے کے خلاف ہے اور مذاہب کے موجودہ تعصبات کو درست نہیں سمجھتا۔ وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھنے کا حامی ہے۔" (صفحہ ۲۰۷)

جی ایم سید کے ان خیالات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سندھ میں نخلِ تصوف کی جو اس قدر آبیاری کی جا رہی ہے اس کی بنیادی وجہ کیا ہے۔

لیکن اگر دیکھا جائے تو بات صرف سندھ تک ہی محدود نہیں بلکہ آج پاکستان کی نئی پود کی ذہنی صلاحیتوں کو مفلوج کرنے کی خاطر ایک خاص سکیم کے تحت گاؤں گاؤں شہر شہر کوچہ کوچہ اُجڑی ہوئی قبروں کو مزین کرتے ہوئے وحدت الوجود کے پردوں کے پیچھے زندہ بدست مردہ کی تعلیم کو جس سرعت کے ساتھ پختہ سے پختہ تر کیا جا رہا ہے شاید ہی اس سے پیشتر کیا گیا ہو۔

اس باب کے آخر پر یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ تصوف کے سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، وہ کسی مایوسی کی بنا پر نہیں۔ مایوس تو وہ ہوتا ہے جو چاروں طرف سے ذلّت و خواری کے باعث اپنی اُلجھنوں کے حل کے لیے کوئی متوازن، سیدھا اور اُبھرا ہموار راستہ (صراطِ مستقیم) اپنے سامنے نہ پائے۔ لیکن جس کے پاس اپنی علّت مرض کو جاننے اور سمجھنے کے لیے خدائے علیم و خبیر کی دی گئی کسوٹی، سورج اور چاند کی طرح روشن چراغ اور ہمیشہ کے لیے ایک محفوظ نسخۂ کیمیا موجود ہو وہ کیونکر مایوس ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی طرف اس طریق سے رجوع کیا جائے جو طریق اس نے تصریف الآیات کی رُو سے خود تجویز کیا ہے۔ یہی وہ آخری سہارا ہے جو نوعِ انسانی کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد کی طرف لے جائے گا۔

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

تصوف کی اس وادی سے گزر کر اب ہم اپنی تاریخ کی منزل میں داخل ہوتے ہیں اس احساس کے ساتھ ؎

مَیں ترے سامنے آتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں
اس ترے حسن کے سونے کو نہ پیتل کر دوں

بارھواں باب

ہماری تاریخ

اس تمام سابقہ روداد کے بعد اب اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو یہاں بھی اسلام جیسے نور آفتاب کو ہمارے حسد، عناد اور خودسری کی کالی گھٹاؤں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے:

تصوف، طریقت، شریعت، کلام ۔۔۔ بتانِ عجم کے پجاری تمام

تاریخ کی اہمیت

حقیقت یہ ہے کہ قوم کی تاریخ ایک لازوال سرمایہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صحیح حالت میں اس کے پاس موجود ہو۔ بصورت دیگر وہی تاریخ اس کے لیے زہرِ قاتل بن جاتی ہے اور پھر یہ زہر صدیوں تک اس پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔

قوموں کے لیے تاریخ کی حیثیت تو حافظہ کی سی ہوتی ہے اور اگر حافظہ ہی صحیح نہ رہے تو ملّت کا شیرازہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جاتا ہے۔ آج کرۂ ارض پر ملّتِ اسلامیہ میں جو لیگانگت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملّت کا تاریخی حافظہ صحت مند نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں حدیثوں میں معتبر ترین کتاب بخاری شریف تصور کی جاتی ہے اسی طرح تاریخ میں سب سے زیادہ اوّلیت امام طبری کی لکھی گئی تاریخ۔ تاریخ طبری کو حاصل ہے اور پھر جس طرح حدیثوں کا مجموعہ ۲۰۰/۵۰ سال بعد بغیر کسی تحریری ریکارڈ کے جابجا پہنچ کر جمع کرنا پڑا اسی طرح یہ مجموعہ بھی ۳۰۰ سال بعد بغیر کسی تحریری ریکارڈ کے اکٹھا کیا گیا اور یہ تو ظاہر ہے کہ رسولِ خدا کے اقوال تک جب اپنی اصلی شکل میں من وعن موجود نہ تھے تو ملوکیت کے دَور کی وضع کردہ تاریخی واقعات کہاں سے صحیح شکل میں تحریر کیے جاسکتے تھے۔ اس لیے ضروری تو یہ تھا کہ ان حالات میں مرتب کردہ تاریخ کے ایک ایک لفظ کا تجزیہ قرآن حکیم کی روشنی میں کیا جاتا تاکہ ہر وہ واقع غلط قرار پاجاتا جس سے رسولِ خدا اور آپؐ کے صحابہ رضٰ کرام کی ذات داغدار ہوتی دکھائی دیتی۔ لیکن ہم نے قرآن حکیم کی شہادت کے باوجود ان عظیم الشان شخصیات بلکہ محسنِ انسانیت تک کے سلسلہ میں بھی ایسا نہ کیا بلکہ

اس کے برعکس خود ساختہ تاریخی واقعات کو ہی اوّلیت دی اور اس کی بنیاد پر ہی باہمی عناد اور بغض کی عمارت کو بلند سے بلند تر کرتے چلے گئے۔ ظاہر ہے کہ ان کمزور بنیادوں پر کھڑی کی ہوئی عمارت کب تک اپنا بوجھ برداشت کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ملّتِ اسلامیہ خود ہی اس کے ملبے کے نیچے دب کر رہ گئی اور اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ خواہ وہ سیاسی ہو یا تمدّنی، عائلی ہو یا معاشرتی، ٹوٹ گیا اور جگہ جگہ سے خون کے بہہ جانے کے باعث اس کے تندرست اور توانا جسم میں نقاہت پیدا ہوگئی اور اس کا پُر رونق چہرہ کمزور اور زرد پڑ گیا۔ بالآخر اس میں انفرادی اور اجتماعی طور پر نہ وہ جذبہ رہا، نہ وہ جوش اور نہ وہ شان باقی رہی اور نہ ہی وہ شوکت بلکہ اس کے برعکس اس کی حالت "شکوہ ملک و دین" کی بجائے "ہجوم مومنین" کی سی ہو کر رہ گئی اور اب علاّمہ اقبال کے الفاظ میں اس امّتِ مرحوم کی حالت صدیوں سے یہ ہو چکی ہے کہ ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے　　مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

تاریخ کو صحیح طور پر محفوظ رکھنے کی یہی وہ اہمیت تھی کہ جس کے پیشِ نظر علاّمہ اقبال نے فرمایا تھا ؎

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو　　از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

یعنی "تمہیں چاہیئے کہ اپنی تاریخ کو محفوظ رکھو اور اس طرح دنیا میں محکم اور پایندہ ہو جاؤ جیسے انسانی زندگی کا راز آنے والے سانس میں ہوتا ہے اسی طرح جسدِ ملّت کی زندگی کا دار و مدار ان سانسوں پر ہے جو ماضی میں لیے جا چکے ہیں۔"

صحابہؓ کا مقام

اس لیے قبل اس کے کہ تاریخ کے سلسلہ میں کی گئی گہری سازش کا ذکر کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی طرف سے اس پیش کردہ شہادت کو سامنے لایا جائے جو اس نے صحابہ کرام رضہ کے سلسلہ میں اپنی دفتین میں محفوظ کر رکھی ہے اور وہ اس لیے کہ اس پیش کی جانے والی شہادت کا تعلق صحابہ کرام رضہ کی سیرت و کردار سے ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

"اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی یہ سب سچے اور پکے حقیقی مومن ہیں ان کے لیے ہر قسم کی حفاظت اور عزّت کا رزق ہے۔"
(۸/۷۴)

دوسرے مقام پر فرمایا:

" اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی تھی اور یہ وہ نعمت ہے جو ساری دنیا کی دولت خرچ کر لینے پر بھی نہیں مل سکتی تھی۔" (۸/۸۳)

قرآن کریم نے ان مومن اولیاء کے متعلق کس طرح جھوم جھوم کر تعریف کے نغمے گائے ہیں۔ اس کا اندازہ اس کی اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے۔ فرمایا:

" محمد رسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد۔ تُو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے جُھک جاتے ہیں اور قوانین خداوندی کے سامنے پیکر تسلیم و رضا بن جاتے ہیں لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں وہ خدا کے قانون کے مطابق سامان زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے اور زندگی کے معاملات میں قوانین الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائص۔ تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔ انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظام خداوندی کو قائم کیا اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہے تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی نالوں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار اپنی محنت کو یوں ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے۔ اس طرح اللہ ہر اس جماعت سے جو اس کے نظام کے ان دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو۔ اس کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کی کوشش کا تقاضا یہ تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہو گی۔" (۲۹/۱۴)

یہ تھی قرآن حکیم کی وہ شہادت صحابہ کرام کے سلسلہ میں ان کی قرآن فہمی کی، ان کے کیریکٹر کی، عظمت، حوصلہ، بردباری کی اور باہمی ایثار کی۔ لیکن افسوس ہماری قرون اولیٰ کی تاریخ ان حقائق کے برعکس اور متضاد رُخ پیش کرتی ہے لیکن ہم ہیں کہ اس کے باوجود اسے صدیوں سے اپنے سینوں کے ساتھ چمٹائے ہوئے پھرتے ہیں۔ یہ تاریخ کس قسم کی ہولناکیاں اور الزام تراشیاں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر یہ جان لینا ضروری ہے کہ خدا نے ہر انسانی بچہ کو محض انسان ہونے کی بنا پر

صاحب الخُلقِ کریم پیدا کیا ہے اور جہاں تک معاشرتی مدارج کا تعلق ہے تو وہ انسان کو یہ مدارج اس کے اپنے اعمال اور سیرت و کردار کی بنیاد پر مہیا کرتا ہے نہ کہ خاندان کی نسبت اور ذات برادری، گوت اور مالی حالت کی بنیادوں پر۔ چنانچہ خود رسولِ خدا نے اپنی حیاتِ طیبہ میں کئی غلام زادوں کو امارت اور امامت کے منصب عطا کرتے ہوئے اس درخشندہ اصول کو عملی شکل میں پیش فرمایا اور اسی اصول کو حج الوداع کے خطبہ میں ایک لاکھ سے زائد افراد کی موجودگی میں بیان بھی کیا۔ باقی جہاں تک ملکی نظم و نسق کا تعلق ہے خود رسولِ خدا کو یہ حکم دیا گیا کہ تم پر لازم ہے کہ ملکی معاملات میں اپنے رفقاء کار سے باہمی مشاورت کے اصول کو پیشِ نظر رکھو۔ لہٰذا نبی اکرم ؐ نے قرآن حکیم کے مطابق ایک قرآنی معاشرہ تشکیل فرمایا اور یہ معاشرہ نام تھا اس امت واحدہ کا جسے خدائے علیم نے (مہاجرین اور انصار پر مشتمل صحابہ کبار) بہترین امت کہہ کر پکارا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ دیکھنے کے لیے کہ تاریخ اس امت واحدہ کے متعلق کس قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اس کے متعلق مجھے نہایت سنگدلی کے ساتھ عرض کرنا ہو گا اور وہ صرف اس لیے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہمارے انتشار اور خلفشار کی وجہ کیا ہے اور اس سے یہ بھی اندازہ ہو گا کہ آج نہیں بلکہ ہزار سال سے جو کچھ ہمارے دار العلوموں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے کس قسم کے ذہن پرورش پاتے ہیں اور ہماری یہ تعلیم کس حد تک بغض و عناد کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ جس وقت تک ہم ان حقائق کا علم حاصل نہیں کر لیتے علت مرض کا علاج ممکن نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ان تاریخی اقتباسات کے پیش کرنے کا یہی مقصد ہے۔

ہماری تاریخ کی حالت

چنانچہ جانشینیٔ رسول ؐ کے سلسلہ میں زیرِ نظر مثال اس وقت کی ہے جبکہ آپ کے جسمِ مبارک کو ابھی تجہیز و تکفین بھی کرنا باقی تھا بلکہ اس سے بھی پیشتر کی جب ابھی آپ کی ذاتِ مبارک بسترِ علالت پر صاحبِ فراش تھی۔ اس سلسلہ میں تاریخ کے بیان سے معاذ اللہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے رسولِ خدا اور قرآنِ کریم کے یہ پروانے اس ابتدائی تعلیم سے بھی واقف نہ تھے کہ خلافت جیسے اہم ملکی معاملہ کو کس طرح باہمی مشاورت اور حسن و خوبی سے طے کرنا چاہیئے بلکہ تاریخ تو اس سلسلہ میں ایسا نقشہ پیش کرتی ہے کہ رحمۃ للعالمین کے یہ شیدائی اور قرآن کے یہ مردِ مومن آپ کی وفات کے فوراً بعد اقتدار حاصل کرنے کی خاطر آپس میں تلواریں نکال باہر نکل آئے۔ اور ایک دوسرے کے گھرانوں پر حملے کیے گئے۔ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچی گئیں۔ حتیٰ کہ حضرت فاطمہ رض کو اپنے سر کے بال نوچنے کی دھمکی دینی پڑی۔

مودودی صاحب کا بیان

صاحب نے فرمایا: جانشینیٔ رسول کے سلسلہ میں یہی وہ وضعی روایات اور وضعی تاریخ ہے جس کی بنا

"اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپؐ نے ہدایت دی کہ" الائمۃ من القریش" امام قریش میں سے ہوں" اور پھر مزید کہا کہ " ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول سے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا" (رسائل و مسائل حصہ چہارم ص ۲۳۰)

معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ۔ جب اس قسم کا اسوۂ حسنہ" عقیدہ کی شکل اختیار کر جائے تو یہ جاننے کے لیے کہ ملتِ اسلامیہ پر زوال کیوں شروع ہوا کسی کمیشن کے بٹھلانے کی کوئی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ علاوہ ازیں اس سلسلہ میں امام بخاری کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے کہ:

حضرت عباسؓ کا بیان

" اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی علی ابن طالب رسول اللہؐ کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہؐ نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی تو عباس بن عبد المطلبؓ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہؐ کے پاس چلیں۔ اور آپؐ سے دریافت کر لیں کہ آپؐ کے بعد حکومت کن لوگوں کے پاس ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے۔ (اس[1] پر حضرت علیؓ نے فرمایا کیا اس بات کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہوگا) اس پر علی رضؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم مَیں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔"

(بحوالہ صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اِس روایت کا ایک ایک لفظ ان شخصیات کے متعلق جس جس قسم کی غمازی کر رہا ہے اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت حبابؓ کی تقریر

ہجرت کے بعد اہلِ مدینہ نے اہلِ مکہ کے ساتھ جس قسم کا بے لوث فدائیانہ ایثار کا مظاہرہ کیا قرآن اس کی خود شہادت ہے جسے پہلے پیش کیا جا چکا ہے لیکن خلافت کے معاملہ میں تاریخ مہاجرین اور انصار کے درمیان جس قسم کے بٹوارے کا منظر پیش کرتی ہے وہ میدانِ کارزار سے کم دکھائی نہیں دیتا۔ انصار کی طرف سے حضرت حباب بن منذر اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

" اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں میں رکھو کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہلِ عزت و ثروت ہو تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو رعایت ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

(بحوالہ محمد حسنین ہیکل کی کتاب " ابوبکر صدیق اکبر" صفحہ ۱۰۷)[1]

حضرت عمرؓ کا بیان

اب انصار کی طرف سے تاریخ حضرت عمرؓ کو پیش کرتی ہے کہ آپ نے فرمایا:

" ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے جب رسول اللہ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے

---

[1] تاریخ طبری۔

جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپؐ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ[1] ہیں۔ اس معاملے میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ، ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے تیار ہو۔"

(بحوالہ "حضرت ابوبکر صدیق" از ہیکل صفحہ ۱۰۸)

حضرت حبابؓ کا جواب

حضرت عمر فاروق رضؓ کی اس تقریر کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے جس لہجہ میں بات کی وہ یہ ہے کہ :

"اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمر اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں تمہارا حصّہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کردو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم سب سے زیادہ حقدار تم ہو، تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کی شان و شوکت قائم ہوئی ہے اس لیے اس کی قدرومنزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔"

(بحوالہ "حضرت ابوبکر صدیق" از ہیکل صفحہ ۱۰۸)

پھر آپس کی تکرار

اس پر حضرت عمر رضؓ نے پکار کر کہا کہ :

"اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔"

(بحوالہ "حضرت ابوبکر صدیق" از ہیکل صفحہ ۱۰۹)

تاریخ صحابہ کبار کا معاذاللہ اس قسم کا اخلاق سوز کیریکٹر پیش کرنے کے بعد مزید آگے بڑھتی ہوئی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

---

[1] اہلِ خاندان۔

کو سامنے لاتی ہے اور وہ اس طرح کہ معاملہ کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ اُٹھے اور کہا کہ "اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہ نے فیصلہ کر دیا ہُوا ہے کہ "الائمہ من القریش" یعنی "خلافت قریش میں رہے گی۔" اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔[1]

یعنی بالآخر امامت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے اس نسل پرستی پر جسے اسلام مٹانے کے لیے آیا تھا۔ اور پھر اسے منسوب کر دیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس کی طرف جنہوں نے رنگ نسل خون اور وطن کی بنیادوں سے ہٹ کر حکم خداوندی کے تحت قرآنی تعلیم کے مطابق صحابہ کرام کی ذہنی آبیاری کی اور اس کے بعد عملاً ایک قرآنی معاشرہ تشکیل بھی فرما دیا۔

انصار اور مہاجرین کے باہمی تعلقات

امامت کا یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد انصار و مہاجرین کے باہمی تعلقات کا جو نقشہ تاریخ طبری پیش کرتی ہے، وہ کچھ اس قسم کا ہے کہ:

"اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعد کو بچاؤ ان کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا "اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے۔ سعد نے عمر کی داڑھی پکڑ لی۔ عمر نے کہا چھوڑ دو اس کا ایک بال بھی بیکا ہُوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ سعد نے کہا کہ مجھ میں اُٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اُٹھا لے چلو۔ ان کے

---

[1] تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت اسامہ کی امارت کے مسئلہ میں ان حضرات کے مابین اختلاف رائے ہُوا تو ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے، غصے سے اُچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا اے ابن خطاب! اللہ تیری ماں کا بُرا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہؐ نے فائز کیا ہے تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔"

معاذ اللہ! یہ ان حضرات کا کیریکٹر بتایا جا رہا ہے جو رسول اللہؐ کے روضۂ اقدس کے پہلو بہ پہلو دفن ہیں۔

آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعد نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ میں تمہارے مقابلے میں اپنا ترکش خالی نہ کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں، تم سے لڑ نہ لوں ہرگز بیعت نہ کروں گا۔"

(تاریخ طبری جلد اول حصہ چہارم اردو ترجمہ شائع کردہ جامعہ عثمانیہ۔ ص ۷)

عہدِ جاہلیت کا منظر

تاریخ ہمارے سامنے حباب بن المنذر اور حضرت عمر رض کے مابین دوران انتخاب مڈبھیڑ ہونے کا جو نقشہ پیش کرتی ہے اسے دیکھ کر تو ہمیں کم از کم اپنی بے حسی کا احساس ہو جانا چاہیئے تھا لیکن افسوس ایسا نہ ہوا بلکہ ہم ان وضعی افسانوں کو سچ ثابت کرانے کے لیے تاریخ کے ذریعے نسل در نسل انہیں آگے سے آگے بڑھاتے رہے اور وہ یہ کہ

"امارت کے انتخابات کے موقع پر حباب بن المنذر نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمر نے اس پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی۔ عمر نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعد پر جھپٹے اور لوگ بھی سعد پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آ کر بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ ابو بکر اس سے دُور رہے جس وقت سعد پر لوگ چڑھ گئے۔ کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعد کو مار ڈالا ہے۔ عمر نے کہا اللہ اسے ہلاک کر دے وہ منافق ہے۔ عمر کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔ لہٰذا حضرت سعد جو خلافت کے دوسرے امیدوار تھے حضرت ابو بکر کے خلیفہ منتخب ہونے پر نہ آپ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے اور ابو بکر کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(بحوالہ تاریخ طبری صفحہ ۸۔ انتخاب خلافت کے سلسلہ میں)

مقام اہل بیت تاریخ کی نظر میں

جہاں تک حضرت علی رض کے کردار کا تعلق ہے، تاریخ کی رو سے (معاذ اللہ) وہ اس سے بھی اذیت ناک صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اور پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وساطت سے حضرت فاطمہ رض جیسی قابلِ صد احترام ہستی کو

کو بھی تاریخ نے میدانِ کارزار میں لا کھڑا کیا ہے۔ محمد حسین ہیکل (مصری) اس افسانے کو بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی کتاب میں اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت ابوبکر رضہ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علی ابن طالب کی طرف تھا۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علی کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃ الزہرا رضہ بنتِ رسول اللہ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعید بھی تھے۔ خالد نے حضرت علی سے کہا "اللہ کی قسم رسول اللہ کی جانشینی کے لیے آپ سے بہتر اور کوئی نہیں اس لیے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔"

اور اس کے بعد ہے کہ:

"جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہ رضہ کے گھر پہنچے اور ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمر رضہ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہ رضہ گھر سے باہر آئیں اور کہا یا تو تم میرے گھر سے باہر نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی"۔ حضرت فاطمہ رضہ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"حضرت عمر رضہ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہ رضہ کے گھر خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔" (ایضاً صفحہ ۱۲۰)

"حضرت علیؓ حضرت فاطمہ رضہ کو خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہ رضہ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا کہ "اے بنت رسول ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔" یہ سن کر حضرت علی رضہ غصہ میں آ کر جواب دیتے کہ کیا میں رسولِ خدا کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپکی جانشینی کے متعلق رنا جھگڑتا پھرتا۔"

(ایضاً)

حضرت علی رضہ کا انکار

تاریخ کے مطابق حضرت علی رضہ حضرت ابوبکر رضہ کی بیعت اس لے نہیں کرنا چاہتے تھے کہ وہ سمجھتے تھے کہ

رسولِ خدا کے داماد ہونے کی نسبت سے خلافت کے وہ زیادہ حقدار ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ہیکل لکھتا ہے کہ:

"حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اسی اصول کے مطابق تمہیں چاہیئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہلِ بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ اس لیے ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔"

(ایضاً صفحہ ۱۲۲)

ہماری حالتِ زار

یعنی تاریخ کی رو سے خلافت کا بٹوارا کبھی عزیزداری کی بنیاد پر ہوتا ہے اور کبھی اہلِ قریش ہونے کے ناطے سے اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم صدیوں سے اسی تاریخ کو سچ جانتے ہوئے آپس میں مختلف گروہوں میں بٹے چلے آرہے ہیں اور کیا سُنّی اور کیا شیعہ سب حضرات اپنی اپنی جگہ ان کتابوں کے نت نئے ایڈیشن چھاپ چھاپ کر صدیوں سے ہر آنے والی نئی نسل کے حوالے کرنے میں مصروف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ میں بخاری[1] شریف کی یہ روایت آج بھی مذہبی دارالعلوموں کے کورس میں شامل ہے کہ:

"حضرت فاطمہ رضؓ نبی صلعم کے چھ ماہ بعد تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہُوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکر رضؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی اور جب تک حضرت فاطمہ زندہ رہیں لوگوں (یعنی صحابہ کرام رضؓ) کی نگاہوں میں حضرت علی رضؓ کا ایک خاص وقار رہا لیکن حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوگیا تو حضرت علی رضؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا۔ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علی رضؓ کو یہ بات گوارا نہ تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمر رضؓ نے کہا تم کیا سمجھتے ہو وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔[2] چنانچہ صدیق اکبر رضؓ تشریف لے گئے تو حضرت علی رضؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا! "ہم آپؓ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا

---

[1] صحیح بخاری کتاب المغازی

[2] نیز دیکھئے ابن جریر جلد اوّل حصہ سوم اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ صہ ۵۹۶

نے آپؐ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالےٰ آپؐ کو فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے اس خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت داری کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔"

اس روایت میں حضرت علی رضؓ کی ذات پر جس قدر طعن پڑتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ آپ نے یہ بیعت مصلحت آمیزی کی بنا پر کی نہ کہ دلی طور پر۔ اور آپؓ کو یہ مجبوری حضرت فاطمہؓ کی فوتیدگی کی بنا پر پیش آئی۔ اور اگر "جنگِ جمل کے تاریخی واقعے" کو پیش کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف حضرت علیؓ جیسا مردِ مومن تو دوسری طرف حضرت عائشہؓ جیسی قابلِ احترام شخصیت جنہیں تمام مومنین کی ماں کا درجہ حاصل تھا، کس طرح ایک دوسرے کے خلاف گلی کوچوں میں نبرد آزما نظر آتی ہیں۔ (معاذ اللہ)

آخری علاج

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بخوبی اندازہ ہوچکا ہوگا کہ شروع میں جو یہ کہا گیا تھا کہ "قوموں کے لیے تاریخ کی حیثیت حافظہ کی سی ہوتی ہے۔ اور اگر حافظہ ہی صحیح نہ رہے تو ملت کا شیرازہ تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جاتا ہے" کس قدر صحیح ہے۔

کیا ملتِ اسلامیہ کی ہزار سالہ تاریخ ہمارے اسی حافظہ کی کمزوری کا نتیجہ نہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخی روایات کو قرآنِ حکیم کی روشنی میں پرکھیں تاکہ جو واقعہ رسولؐ خدا اور صحابہؓ کبار پر تعن بن کر سامنے آئے اُسے یک قلم غلط قرار دے دیا جائے کیونکہ اسی میں ملت کی شیرازہ بندی کا راز مضمر ہے۔

یہ تھا وہ تھکا دینے والا تاریخی سفر جس سے گزر کر ہم اب صنفِ نازک کی حالتِ زار کا ذکر چھیڑتے ہیں باوجود اس کے کہ

سی لیے ہونٹ ترے حکم سے لیکن یہ بتا
کیا میں احساس کے چشمے بھی معطل کر دوں

تیرھواں باب
عورت کی حالتِ زار اور ہم

سرکارِ دو عالم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :
"پوری دنیا متاع ہے اور بہترین متاع نیک عورت ہے۔" (مسلم)
لہٰذا اس ارشادِ نبوی کی روشنی میں اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ
اے ماؤ! بہنو! بیٹیو ـــ پوری انسانیت کی عظمت تمہارے ہی دم سے ہے"
علامہ اقبال نے عورت کی عزت و حرمت کو بیان کرتے ہوئے اسی لیے فرمایا تھا

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد !

علامہ اقبال کی نظر میں ان کی یہ کہی ہوئی بات کتنی اہم ، دُور رس نتائج کی حامل اور سچّی تھی اس کی اہمیت کو خود ہی انہوں نے ان الفاظ میں واضح کر دیا کہ ـ

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہُوا زرد

لیکن افسوس انسان نے اس زندہ حقیقت کو نہ پہچانا اور بقول جناب پرویز صاحب کے کہ " حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کسی جانور نے بھی اپنے جوڑے کے ساتھ وہ کچھ نہیں کیا جو مرد نے اپنے رفیقِ حیات کے ساتھ کیا ہے۔"

آج ترقی یافتہ ممالک میں امریکہ کا مقام سب سے زیادہ بلند تصور کیا جاتا ہے لیکن بقول پرویز صاحب کے وہاں بھی عورت کو مردوں کے ہمدوش تصور نہیں کیا جاتا اور اس امر کی تصدیق خود ان کی حکومت کے ترجمان رسالہ (DIALOGUE) جلد ۳ شمارہ ۴ بابت سنہ ۱۹۷۰ء سے ہوتی ہے۔

" نیروبی (افریقہ) میں ۱۰ ہزار عورتیں اپنی حالتِ زار کی دادرسی کی خاطر جولائی ۱۹۸۵ء میں جمع ہوئی تھیں اور وہاں کی ایک پیش کردہ رپورٹ کے مطابق " گذشتہ سال دنیا بھر میں پیدا ہونے والی نصف خوراک عورتوں نے مہیا کی تھی۔ افریقہ کی عورتیں دو تہائی زرعی کام کرتی ہیں مگر کوئی زرعی زمین ان کی ملکیت نہیں اور نہ ہی انہیں منافع ملتا ہے اور نہ ہی انہیں قرض یا فنی ترقی کی سہولت حاصل ہے اور ایک یورپی خاتون جسے کام کے لیے گھر سے باہر جانا پڑتا ہے، اسے اوسطاً اپنے شوہر کے مقابلے میں فرصت کا دوگنا کم وقت ملتا ہے " رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ روایتی طور پر عورتیں گھر کی مالک ہوتی ہیں مگر ایک عورت کو دوہرا کام کرنا پڑتا ہے۔"

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے، تو وہاں عورت، عورت کی حیثیت سے جنت میں نہیں جاسکے گی اس لیے

حضرت مریمؑ کو بھی مرد کی حیثیت سے ہی جنت میں داخل کیا جائے گا — اور اس کے بعد اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو احمد امین مصری "ضحی الاسلام" میں لکھتے ہیں کہ :

"بغداد میں غلام اور لونڈیوں کی تجارت عام تھی۔ ایک بازار کا نام ہی شارع دار الرقیق (غلاموں کا بازار) تھا۔ اس تجارت کرنے والوں کو نخاس کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ دراصل مویشیوں کی تجارت کرنے والوں کے لیے تھا۔ بعد میں غلام اور لونڈیوں کے تاجروں کے لیے بولا جانے لگا۔ حکومت کی طرف سے ان پر انسپکٹر مقرر ہوتا تھا جسے قیم الرقیق کہتے تھے۔"

ہماری اس سابقہ تاریخ (جو دورِ ملوکیت سے متعلق ہے) کے ایک اقتباس کے بعد اگر یہ جاننا ہو کہ آج ہمارے ہاں عورت کو کس حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے تو اس کے لیے ہمیں زیرِ نظر باب کے باقی ماندہ اوراق کی ورق گردانی کرنا پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

قرآن حکیم کا پہلا سبق ہی احترامِ آدمیت ہے چنانچہ اس نے جنگ کے سلسلہ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں کے متعلق یہ حکم دے رکھا ہے کہ "اہلِ کفار کو (مرد اور عورت دونوں کو) یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یا تبادلہ کرلو اور یا پھر انہیں احساناً آزاد کردو" —— کیونکہ —— کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے رکھے۔ قرآنی تعلیم تو ہر نوعِ غلامی کے لیے پیغامِ موت ہے۔

لیکن افسوس اس قدر واضح احکامات کے باوجود ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا یہ ہے کہ :

"قرآن میں اس کے خاتمے کی کوئی آیت نہیں لیکن اسلام کے نزدیک غلام بنانا شرک ہے۔ لیکن لونڈیوں کے معاملے میں تمتع کی اجازت ہے۔ نکاح ضروری نہیں لیکن اگر انہیں آزاد کر کے نکاح کر لیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ لونڈیوں سے ہونے والی اولاد کے وہی حقوق ہوں گے جو دوسری بیویوں کے ہونے والی اولاد کو حاصل ہوں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور۔ مورخہ ۱۲ فروری ۱۹۹۲ء)

یعنی قرآن نے تو غلاموں اور لونڈیوں کو حکماً ختم نہیں کیا۔ لیکن اسلام میں غلام بنانا شرک ہے۔ بالفاظِ دیگر قرآن اور اسلام دو علیحدہ علیحدہ تصورات ہیں اور پھر یہ کہ اسلام کے نزدیک تو غلام بنانا شرک ہے لیکن لونڈیوں کے معاملہ میں ان کے ساتھ تمتع (بغیر نکاح جنسی اختلاط) عین مطابق اسلام ہے

ڈاکٹر صاحب قرآن حکیم کی بیان کردہ اس کھلی حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے اس کی وجہ شاید ان کا یہ مسلک ہے کہ :

" میرا تعلق اسلاف کے ساتھ ہے اور اسلاف سے خود کو کاٹ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ یہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف خواہ وہ کسی ایک مسئلہ میں ہی کیوں نہ ہو، انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔"

(میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء)

لیکن یہی تو وہ اسلاف پرستی تھی جس کے متعلق قرآن حکیم نے فرمایا تھا کہ :

" خواہ وہ بات عقل کے بھی خلاف ہو اور قرآن کے بھی خلاف (کیا) آپ پھر بھی اسی پر جمے رہیں گے۔" (۲/۱۷۰)

ضمناً محترم ڈاکٹر صاحب نے لونڈی، غلام اور یتیم پوتے کی وراثت کے سلسلہ میں جناب پرویز صاحب کی مخالفت کرتے ہوئے[۱] میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح بھی کیا تھا کہ :

" پھر ہمارے دور میں غلام احمد پرویز اپی جانی نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ اٹھا دیا۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ تعدد ازدواج کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرن اول سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں۔ اہل سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا حساس (TOUCHY) ہے۔ اس نے بڑے (PATHETIC) انداز میں اس مسئلہ میں رقت آمیزی (PATHOS) پیدا کی اور اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں۔"

(میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء صفحہ ۳۸)

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی اس تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے "طلوعِ اسلام" نے اپنے ہاں نومبر ۱۹۸۴ء میں لکھا تھا کہ :

" آپ نے پرویز کا جرم ملاحظہ فرمالیا؛ اس نے رقت آمیز انداز سے اپنے زورِ قلم کے ذریعے یتیموں کے حق میں ہمدردیاں حاصل کیں! معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب خود خدا کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے جس نے اپنی کتاب میں جا بجا نہایت "رقت آمیز اور پُر زور" انداز سے یتیموں کے حقوق کی یاد دلائی ہے۔"

---

[۱] مندرجہ ذیل چند سطور کا تعلق گو دو شخصیات کے درمیان ہے لیکن کیونکہ بات یہاں بھی عورت کے ہی سلسلہ میں ہے، اس لیے نشر و نشاندہی کر دی گیا ہے۔

مولانا نعمت اللہ صاحب

ڈاکٹر صاحب کے بعد جمعیت العلمائے اسلام کے رکن اسمبلی مولانا نعمت اللہ صاحب نے تو بھٹو صاحب کے دور میں مجلس دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ پیش کیا تھا کہ :

"غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے۔ اس لیے جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو ایسا انتظام کیا جائے کہ کم از کم ایک لونڈی رکھ سکے۔"

(بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ یکم مارچ ۱۹۷۳ء)

"طلوعِ اسلام" کا تبصرہ

چنانچہ مولانا نعمت اللہ صاحب کی اس تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے "طلوعِ اسلام" نے لکھا تھا کہ :

"معلوم نہیں کہ ایوان میں کسی نے مولانا صاحب سے یہ دریافت کیا یا نہیں کہ ان کے ذہن میں وہ کون سی تجویز ہے جس کی رُو سے حکومت اس طرح لونڈیاں مہیا کرنے کا انتظام کر سکے گی۔ مودودی صاحب کی تجویز تو یہ ہے کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا لیکن ایک تو یہ لونڈیاں سپاہیوں میں تقسیم کی جائیں گی اور دوسرے ان کی تعداد اس قدر نہیں ہوگی کہ انہیں ملک کی عام آبادی کو بھی مہیا کیا جا سکے۔ کیا کوئی صاحب مولانا نعمت اللہ صاحب سے دریافت فرمائیں گے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ لونڈیاں سپلائی کرنے کا کیا انتظام فرمائیں گے۔"

جناب مودودی صاحب (مرحوم)

مودودی صاحب مرحوم نے تو اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں لونڈیوں کے متعلق یہاں تک تحریر کیا ہے کہ :

"جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کر لے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔"

(جلد دوم۔ مطبوعہ ۵۱، صفحہ ۴۰۳)

"جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لیے (جبکہ ان کا تبادلہ ہو اور نہ فدیہ وصول کیا جا سکے) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو عورت حکومت کی طرف سے جس شخص کی ملکیت میں دے دی جائے اس کے ساتھ اس شخص کو جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔"

(جلد دوم۔ مطبوعہ اگست ۱۹۵۱ء صفحہ ۳۲۳)

لونڈیوں کو فروخت کرنے کی اجازت ہے

" اس قسم کی لونڈی اور غلاموں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول کرنے اور فدیہ وصول نہ ہونے تک ان سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے اس کو معاوضہ لے کر دوسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اگر کسی شخص کے لیے یہ گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآنہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت کسی دوسرے کی طرف منتقل کر دے تو یہ لوگ جس کے بھی حوالے کیے جاتے اس کے حق میں بلائے جان بن جاتے۔"

(جلد دوم، مطبوعہ اگست - صفحہ ۳۲۳)

لونڈیوں کی تعداد پر بھی کوئی پابندی نہیں

" لونڈیوں سے تمتع کے لیے تعداد کی قید اس لیے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آسکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو معاشرہ میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے۔ جبکہ لونڈیوں کے تمتع کے لیے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا گیا ہو"۔

(جلد دوم مطبوعہ اگست ۱۹۵۱ء - صفحہ ۳۲۴)

کوئی غلام مرد یا لونڈی اسلام قبول کرنے کے بعد... آزاد نہیں ہو سکتی

جنسی بدنہادی کی اس 'اجازت' کے علاوہ جناب مودودی صاحب مرحوم کے نزدیک کوئی غلام مرد ہو یا لونڈی اسلام قبول کرنے کے بعد آزاد نہیں ہو سکتی۔ جناب مودودی صاحب "بیسویں صدی کے دور جدید میں غلامی کے (یہ) انکار" سورہ محمدؐ کی تفسیر لکھتے ہوئے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

" اس سلسلہ میں یہ بات جان لینی چاہیئے کہ جو شخص قید میں آنے سے پہلے اسلام قبول کر چکا ہو اور پھر کسی طرح گرفتار ہو جائے وہ تو آزاد کر دیا جائے گا مگر... جو شخص قید ہونے کے بعد اسلام قبول کرے یا کسی شخص کی ملکیت میں دے دیئے جانے کے بعد مسلمان ہو تو یہ اسلام اس کے لئے آزادی کا سبب نہیں بن سکتا۔"

(بحوالہ کتابچہ سورہ محمدؐ کی تفسیر ناشر سید حسین فاروق مودودی اچھرہ لاہور نومبر ۱۹۸۲ء)

اس کے بعد مزید تحریر ہے کہ :

" اس بنا پر فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ قید ہونے کے بعد مسلمان ہونے والا (شخص) غلامی

سے نہیں بچ سکتا اور یہ بات سراسر معقول بھی ہے۔"

ڈاکٹر اقبال جیسا قرآنی مفکر ہماری اسی قسم کی غیر قرآنی سوچ کو دیکھ کر پکار اٹھا تھا۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کی طریق

جنت کی حوریں کون ؟

مودودی صاحب مرحوم اپنے درس قرآن و حدیث کے بعد سامعین کے استفسارات کا جواب دیتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ سے سوال کیا گیا کہ کفار کی لڑکیاں جو کم سنی میں وفات پا گئی ہوں انہیں جنت میں کیا بنایا جائے گا، تو آپ نے جواب دیا کہ :

" مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا البتہ میرا خیال ہے کہ جنت میں جو حوریں ہوں گی وہ یہی کفار کی لڑکیاں ہوں گی ۔" (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم ص ۲۸۷ ۔ بحوالہ ایشیا ۱۴، جون ۶۹)

" یہ حوریں، بیویوں کے علاوہ ہوں گی۔ بیویاں جنتی مردوں کے ساتھ محلات میں رہیں گی لیکن جب وہ پکنک منانے کے لیے باہر جائیں گے تو ان کی سیرگاہوں میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوں گے جن میں حوریں ان کے لیے لطف و لذت کا سامان فراہم کریں گی۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد پنجم ص ۳۵)

یعنی زندگی میں کفار کی ان بچیوں کو اپنی "تسکین" کی خاطر لونڈیاں بنایا جائے اور مرنے کے بعد اپنی حوریں۔ کیا اس سے بڑی زیادتی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے جو کسی سے کی جا سکے؟ اور پھر اس طرح سے روا رکھے گئے مظالم کو منسوب کر دیا جائے احکاماتِ خداوندی کی طرف ؟۔

مودودی صاحب مرحوم کا نوٹس

جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اُسے آپ ایک بار پھر سامنے لائیں اور دیکھیں کہ کیا اس پیش کردہ تعلیم کو کسی صورت میں بھی مہذب کہا جا سکتا ہے لیکن افسوس تو یہ ہے جو شخص اس قسم کی انسانیت کُش "شریعت" کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اس کے لیے مودودی صاحب مرحوم کا کہنا ہے کہ :

"مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً منحرف ہو چکے ہیں اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں وہ تاریخ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد ان سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے مسلمان سمجھا جائے گا۔ تمام قوانین اسلامی ان پر نافذ کیے جائیں گے۔ فرائض و واجبات دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا اور پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائے کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے۔ پھر جو کسی طرح نہ بچائے جاسکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔"

بحوالہ مرتد کی سزا قتل صفحہ ۸۱-۸۰ از جناب مودودی

لونڈی کے بعد بیوی

لونڈیوں کے ساتھ اس "حسنِ سلوک" کے بعد جہاں تک اپنی بیویوں کا تعلق ہے، جامعہ نعیمیہ لاہور کے شیخ الحدیث مولانا غلام رسول سعیدی کا فرمان ہے کہ:

"شوہر اپنی بیوی کو اس حد تک پیٹ سکتا ہے کہ وہ زخمی نہ ہو . . . . لیکن اگر وہ اس حد سے تجاوز کر کے پیٹے گا تو اسے تاوان دینا ہوگا یعنی اگر دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ اس کے پیٹنے سے ضائع ہو جائے تو اسے ۱۸ کلوگرام چاندی بطور تاوان ادا کرنا پڑے گی . . . . اور اگر دونوں آنکھیں ضائع ہو جائیں تو پھر یہ تاوان ۳۶ کلوگرام ہو جائے گا اور اگر ایک آنکھ اور ناک ضائع ہو جائے تو اسے دوہرا تاوان دینا پڑے گا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۳ جنوری ۱۹۸۲ء)

بالفاظ دیگر عورت کی ایک آنکھ کی قیمت ۱۸ کلوگرام چاندی قرار پائے گی۔

جناب ظفر احمد انصاری صاحب کا بیان

نظامِ حکومت تجویز کرنے کی غرض سے قائم کیے گئے "انصاری کمیشن" کے سربراہ جناب ظفر احمد انصاری صاحب نے ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے حکومتی نظام میں شرکت کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

" اسلام کی رُو سے کیونکہ خواتین نفلی عبادت بھی خاوند کی مرضی سے نہیں کر سکتیں اس لیے ہم نے

تجویز کیا ہے کہ وہ (نظامِ حکومت میں شرکت کے بارے میں) خاوند سے اجازت لیں۔"

اس کے علاوہ آپ نے مزید فرمایا کہ :

"اسلامی حلقوں کی روشنی میں عورتوں کے مخلوط اجتماع میں شرکت کی کوئی گنجائش نہ تھی اور اسلام کی رو سے دشواری بھی تھی لیکن ہم نے ان دشواریوں کو کم از کم کر کے خواتین کو حقوق دیئے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۳ راگست ۱۹۸۳ء)

قائدِ اعظم نے فرمایا تھا کہ :

"قرآن حکیم ہی ہماری آزادی اور پابندی کی حدود متعین کرتا ہے"

اور یہ تو ظاہر ہے کہ یہ حق کسی انسان کو بھی حاصل نہیں کہ وہ ان حدود میں کسی قسم کی کوئی کمی بیشی کرے لیکن جناب انصاری صاحب کا کہنا ہے کہ ہم نے (قرآن) کی منشا کے علی الرغم آسانی پیدا کرتے ہوئے خواتین کو یہ حقوق دیئے ہیں کہ وہ نظامِ حکومت میں شریک ہو سکیں۔ راقم کا خیال ہے کہ خواتین کو خدا کی بجائے جناب انصاری صاحب کا ممنونِ احسان ہونا چاہیئے ورنہ عورت کی آزادی کی یہ حالت تھی کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر نفلی عبادت بھی نہیں کر سکتی۔ بہر حال جہاں تک خواتین کا امورِ مملکت میں حصہ لینے کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ہے :

"(دوسرا گروہ) مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ہے۔ یہ سب نصب العین کے مشترک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں ضابطہ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ (ضابطہ خداوندی) ناپسند قرار دیتا ہے۔ یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں اور نوعِ انسان کے لیے نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر معاملہ میں خدا اور اس کے رسول (نظامِ خداوندی) کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے عطا کردہ سامانِ نشوونما سے فیض یاب ہوں گے اور دنیا دیکھ لے گی کہ خدا کا قانون کس طرح قوت و حکمت پر مبنی ہے۔" (۹/۷۱ - ۹/۱۱۲)

عورت کے متعلق حضرت داتا گنج بخشؒ صاحب کا فرمان ہے کہ :

"بہشت میں پہلا فتنہ جو آدم پر مقدر ہوا یعنی ہابیل اور قابیل کی لڑائی۔ اس کا سبب بھی عورت تھی۔ اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج دینی اور دنیاوی تمام فتنوں کے جملہ اسباب کا موجب بھی عورت ہی ہے۔"

(بحوالہ الاعتصام ۱۷/۲۱ ستمبر ۱۹۵۸ء)

یہ سب کچھ اس عورت کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔

آہ بے چاری عورت......

چار چار بیویوں کے لئے مفتی محمود مرحوم کا فتویٰ

لونڈیوں کے علاوہ چار چار شادیوں کی غیر مشروط اجازت صرف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب وغیرہ کی طرف سے ہی نہیں بلکہ اس کا فتویٰ جناب مفتی محمود صاحب نے اس وقت دیا جب آپ ۱۹۶۳ء کے قومی اسمبلی کے ایک اجلاس میں تنسیخ عائلی قوانین کے بل پر اظہار خیال کر رہے تھے آپ کا کہنا تھا کہ

"تعداد ازدواج کا مسئلہ بلاوجہ کھڑا کیا جا رہا ہے حالانکہ تعداد ازدواج کوئی نفرت کی چیز نہیں ہے نہ عیب کی بات ہے اور نہ ہی بُری رسم ہے البتہ اس کو اس طرح روکنا مداخلت فی الدین ضرور ہے۔ صرف ایک ہی بیوی تک رکھنے کی پابندی لگانا یورپ والوں کی نقالی ہے۔ اس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

یہ سب کچھ کہتے ہوئے آپ نے بخاری کی ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا کہ:۔

"تم نکاح کرو۔ اس لئے کہ اس امت میں بہتر شخص وہ ہے جس کی بیویاں زیادہ ہوں۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے فرمایا کہ:۔

"جناب والا۔ مرد پر ایک بیوی کی پابندی لگا کر یہ لوگ ملک میں زنا کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ نکاح پر پابندیاں لگا کر اس ملک کو زنا کا اڈا بنایا جا رہا ہے یہ نہیں چاہتے کہ اس ملک میں شرم و حیا کا معاشرہ قائم ہو۔"

پھر مزید فرمایا کہ:۔

جناب والا میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خوش حال گھرانے کے لوگ ہی تعداد ازدواج کے خلاف ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی مخالفت کر کے وہ زنا کو فروغ دیں اور اپنی خواہشات کو دوسرے ناجائز طریقوں سے پورا کریں۔ زنا کے لئے شریعت نے جو سزا مقرر کی ہے اگر وہ یہاں نافذ ہو جائے اور زنا کے تصور کو اس ملک سے ختم کر دیا جائے۔ تو یہی لوگ مظاہرے کریں گے اور مطالبہ کریں گے کہ ایک بیوی سے ہمارا گزارہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لئے تعداد ازدواج کی اجازت دیں۔

اور آخر پر مفتی صاحب نے جو کچھ فرمایا اسے بھی درج ذیل کیا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ:۔

یہ قانون جس کے تحت تعداد ازدواج پر ایک سال کی سزا مقرر کی گئی ہے یا پانچ ہزار روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں مقرر ہوئی ہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ صحابہ کرامؓ۔ تابعین عظامؒ۔ علماء اولیاء کرام وغیرہ سلف صالحین میں شاید ہی کوئی

ایسا ہو کہ جس کی متعدد بیویاں نہ ہوں تو کیا یہ سب مجرم ہیں ؟ ۔ (لہٰذا تعدادِ ازدواج کی) یہ دفعہ سراسر غیر اسلامی ہے۔
(بحوالہ اسمبلیوں کے اندر مجاہدانہ تقریریں ص۱۹ تا ۲۵) شائع کردہ ۔ دفتر جمعیت علمائے اسلام مغربی پاکستان لاہور۔

قبل اس کے کہ ہم عورت کے متعلق کسی دوسرے حوالے سے مزید گفتگو کریں کیونکہ یہاں ذکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے حوالے سے بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب کا بھی تفصیلی جائزہ لے لیا جائے جو آپ نے عورت اور عائلی قوانین کے موضوع پر جنگ فورم کے دوران کیا اور پھر بعد ازاں جس کی تفصیل روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ فروری ۱۹۸۶ء کے علاوہ جمعہ میگزین کی فروری ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوئی۔ سو ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ فرمایا اس کے چیدہ چیدہ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

مرد ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا

"ڈاکٹر اسرار احمد : میرے نزدیک مرد ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا کیونکہ مرد میں جنسی تقاضا مسلسل جاری رہتا ہے جبکہ عورتوں میں ایسا نہیں ہے۔ اُن میں یہ تقاضا محدود ہے اگر ایک شخص کی ایسی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو جائز راستہ بند کرنے سے ناجائز راستہ اختیار کرے گا۔ اگر ایسا ہوا تو پھر معاشرہ خراب ہو گا۔" پھر فرمایا " ایک سے زائد شادی روکنے کا تصور اسلام میں نہیں ہے۔ اسلام میں چار شادیوں[۱] تک کھلی اجازت دی گئی ہے۔ البتہ بیویوں میں عدل کرنا ضروری ہے۔ جو عدل نہیں کرے گا وہ ناانصافی کی سزا بھی بھگتے گا۔ عدالت میں یہ معاملہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہ پابندی اسلام میں نہیں مغرب میں ہے۔ حضور اکرمؐ نے شادیاں کی ہیں۔ خلفائے راشدہ اور ائمہ دین نے کئی شادیاں کی ہیں۔ ہماری تاریخ کے اندر یہ عمل موجود ہے۔ اگر بحث چلی تو میں فزیالوجی کے طالب علم ہونے کے ناطے یہ بات سائنس سے ثابت کروں گا کہ چار شادیاں مرد کی ضرورت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان مسائل پر اتنی گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن اگر آپ چاہیں تو میں کھل کر بھی بات کروں گا۔"

---

[۱] چار شادیوں کے متعلق "اجازت" کی حقیقت اپنے مقام پر آئے گی۔

ایک غریب اپنی جسمانی ضرورت کس طرح پوری کرے گا؟

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر مسز غلام جیلانی نے کہا "کیا ہمارے ملک میں اسی فیصد مرد دوسری شادیاں برداشت کرسکتے ہیں؟"۔

ڈاکٹر اسرار احمد: اگر مالی طور پر برداشت نہیں کرسکتا تو کرے گا کیوں جو برداشت کرسکتے ہیں وہ اب بھی کر رہے ہیں اور قوانین ان کا راستہ بھی نہیں روک سکتے؟

مسز غلام جیلانی: ۸۰ فیصد مرد دوسری شادیوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے" اپنی یہ جسمانی ضرورت کیسے پوری کریں گے؟

ڈاکٹر اسرار احمد: وہ اپنا معیارِ زندگی کم کرے گا اور اگر عورت تیار ہوگی تو شادی کرے گا کوئی قانون عورت کو مجبور نہیں کرسکتا۔

یہ غلط فہمی پر مبنی ہے

مسز غلام جیلانی: جب ۸۰ فیصد مرد دوسری شادیاں نہیں کریں گے تو ایسے جرائم بڑھیں گے؟

ڈاکٹر اسرار احمد: میرے خیال میں وہ دوسری شادیاں کرسکتے ہیں یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ نہیں کرسکتے۔

مسز غلام جیلانی: یہاں تو فرد کو روٹی نہیں ملتی۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ہمارے لیے حد قرآن نے رکھ دی ہے۔

صغیرہ اسلام کی حق گوئی

صغیرہ اسلام: آپ نے فرمایا کہ آدمی ایک وقت میں چار شادیاں کرسکتا ہے۔ اُس زمانے میں شادی کی اجازت جنگ سے بے سہارا ہونے والیوں کے تحفظ کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

اب اگر مرد چار شادیاں کرے گا تو اِن سے اگر چار چار بچے بھی پیدا ہوں گے تو کیا معاشی طور پر سولہ بچوں کی کفالت آسان بات ہے؟ اور کیا یہ بچے ملک کے لیے ناسور ثابت نہیں ہوں گے؟ وہ سڑکوں پر آوارہ گردی نہیں کریں گے؟۔

صغیرہ اسلام کے اس سوال کا جواب ڈاکٹر صاحب کی بجائے میزبان نے دیا اور وہ یہ کہ:

"یہ تو فیملی پلاننگ کے خلاف ہے۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس قسم کے خیالات پر دوسرے روزنامہ اخبارات میں طبی ماہرین اور ماہرین نفسیات نے جن خیالات کا اظہار کیا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ بھی درج کر دیئے جائیں۔

چنانچہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کے پرنسپل، پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر نصراللہ رانا۔ ڈاکٹر اشفاق صاحب اور ماہر نفسیات حمیرہ ہاشمی نے جو کچھ کہا وہ حسب ذیل ہے :

ماہرین کی رائے

ڈاکٹر اسرار احمد کے اس بیان کو ڈاکٹر افتخار احمد نے غلط قرار دیا کہ جس میں انہوں نے کہا ہے کہ مرد کو جسمانی طور پر ایک سے زائد شادیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جو پہلے نفسیاتی طور پر ظاہر ہوتی ہیں اور پھر انسانی جسم پر بھی اس کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نصراللہ رانا نے کہا کہ مرد کو ایک سے زائد عورت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہوں نے کہا کہ جدید میڈیکل سائنس یہ ثابت کرتی ہے کہ جتنے بہتر نتائج ایک مرد اور ایک ہی عورت کے درمیان ہم آہنگی سے ہوتے ہیں وہ دوسری صورت نہیں ہوتے انہوں نے کہا جب ایک مرد ایک سے زائد عورتوں سے شادی کرتا ہے یا تعلق بناتا ہے تو اس کے لاشعور میں ایک دوسرے کو مطمئن کرنا سوار رہتا ہے جس کے طبّی نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر اشفاق صاحب نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔

حمیرہ ہاشمی

حمیرہ ہاشمی نے کہا کہ "کسی مرد کے سر پر جنسی جنون سوار ہو جائے تو وہ اس کا نام ضرورت بھی رکھ لیتا ہے اور ہمارے معاشرے میں مرد نفسیاتی طور پر زیادہ سے زیادہ عورتوں کو نشانہ بنانے کے جنون میں مبتلا رہتا ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ فروری ۱۹۸۶ء)

ملکی اخبارات میں اس قسم کے ردِ عمل کے شائع ہونے کے باوجود ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کو روزنامہ جنگ لاہور کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے مزید ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ: " جنسی اعتبار سے پُرکشش چیزوں کی موجودگی میں زنا کی سزا کا نفاذ ظلم ہے۔" ضمناً آپ نے شادی کے معاملہ میں فرمایا کہ " لڑکا شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھ سکتا ہے لڑکے کا والد نہیں۔" بہرحال

باہمی نوک جھونک

جنگ فورم کی اس مخصوص نشست کے اختتام پر کچھ باریش حضرات نے نعرۂ تکبیر بھی بلند کیا جس پر خواتین نے انہیں ان الفاظ میں جواب دینے شروع کیے " اللہ کرے تمہاری بیٹوں کو طلاقیں ہوں"

ان پر سوکنیں پڑیں۔ ان کے گھر اجڑیں۔ تم کو یتیم بچوں کی حفاظت کرنے کو کہا گیا تم نے انہیں گھر میں ڈال لیا۔ یہ سارے قوانین (۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین کی جگہ) اس لیے بنوا رہے ہو کہ تمہاری ہوس پوری ہوتی رہے۔

اس نوک جھونک کے دوران ڈاکٹر صاحب نے عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اگر مستقبل میں زیادہ مولوی پارلیمنٹ میں آگئے تو آپ کہاں جائیں گی۔" تو اس پر دوسری طرف سے جواب آیا "نامی میں کامیاب ہوئے ہیں نہ آئندہ ہوں گے۔"

پروگرام کے اختتام پر جب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خواتین سے کہا کہ اگر کسی عورت کے پاس سواری نہ ہو تو میں لفٹ دے سکتا ہوں۔" اخبار میں لکھا ہے کہ ان کی اس پیش کش کو کسی نے قبول نہ کیا۔

ڈاکٹر انون کی ریسرچ

ملکی طبی ماہرین اور دانش وروں کی ان آرا کے علاوہ کیمبرج یونیورسٹی کا ڈاکٹر (J.D. UNWIN) انون جس نے دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے ۸۰ (اسی) غیر مہذب قدیمی قبائل کے علاوہ جدید مہذب اقوام کی زندگی کا مطالعہ صرف یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ انہوں نے اپنے ہاں جنسیات کے کیا کیا ضوابط اختیار کر رکھے ہیں۔ اور پھر ان ضوابط کی عمل پذیرائی سے وہاں کی سوسائٹی پر کیا اثرات مرتب ہوئے اور پھر موصوف نے اس کے بعد اپنی عمر بھر کی اس تحقیق کے ماحصل کو اپنی کتاب (SEX AND CULTURE) میں اس لیے محفوظ کر دیا کہ ہم جیسی دیدہ کور قومیں ان مرتب کردہ نتائج سے کوئی سبق حاصل کر سکیں۔ لہٰذا وہ اپنی کتاب کے متن میں لکھتا ہے

"دنیا کی مہذب اقوام ہوں یا غیر مہذب قبائل۔ سب کے ہاں جنسی مواقع اور قوم کی تمدنی حالت میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس مسئلہ پر تفصیلی تحقیق کی جائے میری اس تحقیق کا ماحصل اور اس سے مستنبط نتائج اس کتاب میں پیش کیے گئے ہیں۔"

اس کے بعد دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

"اپنی تحقیقات کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی گروہ ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار دو چیزوں پر ہے، ایک ان لوگوں کا نظام اور دوسرے وہ توانائی جو ان حدود و قیود کی بنا پر حاصل ہوتی ہے جو اس گروہ نے جنسی تعلقات پر عائد کر رکھی ہوں۔" (۱۷ X)

چنانچہ وہ لکھتا ہے

کوئی گروہ کیسے ہی جغرافیائی ماحول میں رہتا ہو، اس کی تمدنی سطح کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ اس نے اپنے ماضی اور حال میں جنسی تعلقات کے لیے کس قسم کے ضوابط مرتب کر رکھے تھے۔" (ص ۳۲)

با الفاظِ دیگر جنسی تعلقات محض ایک جبلی جذبہ کی تسکین کا نام نہیں بلکہ قوموں کی تہذیب و تمدن کا دار و مدار اس جذبہ کی تحدید و تادیب پر ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر الون کے الفاظ ہیں:

"اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہو گا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔" (ص ۳۰۲)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ:

"جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔"

ڈاکٹر الون کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ جنسی جذبات پر پابندیاں عائد کرنے سے اعصابی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں بے لگام چھوڑ دینے سے ایسا ہوتا ہے۔ (دیباچہ ص xii)

بنا بریں "کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود کر دیں۔ اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع قلیل ترین حد تک محدود کر دیئے جائیں) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل رہے گی۔" (ص ۱۴)

چنانچہ ڈاکٹر الون کہتا ہے کہ:

"نفسیاتی تحقیقات سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات پر حدود اور پابندیاں عائد کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قوم میں قوتِ فکر و عمل بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیز محاسبۂ خویش کی صلاحیت بھی۔" (ص ۳۱۷)

لیکن اس کے برعکس

"جو قوم اپنے مردوں اور عورتوں کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جنسی خواہشات کی تسکین جس طرح جی چاہیں کر لیں، ان میں فکر و عمل کی قوتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رومیوں نے ایسا

ہی گیا۔ وہ حیوانوں کی طرح بلا قیود جنسی جذبات کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ اُن کے پاس کسی اور کام کے لیے توانائی باقی نہ رہی۔" (ص ۳۹۸)

فرائڈ کی تحقیق

ڈاکٹر انون کی اِس تحقیق کے تائید فرائڈ نے کچھ اس طرح کی ہے کہ:

"کیونکہ ہر فرد اپنے جذبات کو انسانیت کی مشترکہ مفاد کی خاطر قربان کرتا رہتا ہے۔ ان جذبات میں جنسی جذبات کو خاص اہمیت حاصل ہے (جب ان پر کچھ پابندیاں عائد کر دی جائیں تو) یہ اپنا رُخ دوسری طرف منتقل کر لیتے (جسے SUBLIMATION کہتے ہیں) اور اس طرح افراد کی فالتو توانائی، جنسی گوشوں کی طرف سے ہٹ کر اِن گوشوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جو تمدنی طور پر بہت زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔"

S. FREUD INTRODUCTORY LECTURES ON PSYCHO-ANALYSIS, TRANSLATED BY J. RIVIERE. P. 17

جناب پرویز صاحب کی قرآنی بصیرت

"جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اس جذبہ کی تسکین نہ کی جائے تو اس سے اعصابی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، تو یہ بھی غلط ہے۔ اسی سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سائیکالوجی کی تحقیقات اِس سے بالکل مختلف نتیجہ پر پہنچاتی ہیں۔ ان تحقیقات کی رو سے نہ صرف یہ کہ اس جذبہ پر کنٹرول رکھنے سے کوئی عارضہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ اس سے انسان کی تخلیقی صلاحیتیں (CREATIVE POTENTIALITIES) اِس قدر تقویت حاصل کر لیتی ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارا مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ جو لوگ پاکیزگی قلب و نگاہ کی زندگی بطیب خاطر بسر کرتے ہیں ان کی انسانی صلاحیتیں جگمگا اٹھتی ہیں۔ اعصابی عوارض اس وقت لاحق ہوتے ہیں جب انسان اپنے جنسی جذبات کو اُکساتا اور ان میں ہیجان برپا کرتا رہتا ہے اور پھر ان کی تسکین کا طریقہ فطری طور پر اختیار نہ کرے۔ اگر انہیں بیدار ہی نہ کیا جائے تو پھر کسی قسم کا عارضہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ انسان کی فکر و عمل کی صلاحیتیں نت نئی توانائیاں حاصل کرتی چلی جاتی ہیں۔"

(سلیم کے نام خطوط۔ از پرویز)

تین گروہ

ڈاکٹر اون قدیم غیر مہذب قبائل کی تمدنی سطح کو تین حصوں میں کچھ اس طرح تقسیم کرتا ہے۔

(۱) جس گروہ نے کنوارپن (PRE_NUPTEAL) کے زمانے میں جنسی تعلقات کی کھلی آزادی دے رکھی تھی وہ تمدن کی پست ترین سطح پر تھا۔

(۲) جن قبائل میں زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلقات پر تھوڑی بہت پابندیاں عائد تھیں وہ تمدنی سطح کے درمیانے درجے پر تھے اور

(۳) تمدن کی بلند ترین سطح پر صرف وہ قبائل تھے جو شادی کے وقت عفت و بکارت (CHASTITY) کا شدت سے تقاضا کرتے اور زمانۂ قبل از نکاح میں جنسی تعلق کو معاشرتی جرم قرار دیتے تھے۔" (ص ۳۰-۳۲۵)

ڈاکٹر اون کا کہنا یہ ہے کہ:

"شادی کے بعد کے ضوابط کبھی تعمیری نتائج پیدا نہیں کر سکتے جب تک شادی سے پہلے کی زندگی میں عفت و عصمت پر زور نہ دیا جائے۔" (ص ۳۴۴)

ان تعمیری نتائج کے پیش نظر ڈاکٹر اون کے نزدیک شادی کی مندرجہ ذیل چار قسمیں ہیں:

(۱) عورت اپنی زندگی میں ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے اور مرد ساری زندگی ایک عورت کا خاوند رہے۔ ان کے رشتۂ نکاح کے منقطع ہونے کی کوئی شکل نہ ہو۔ بجز اس کے کہ عورت ناجائز فعل کی مرتکب ہو جائے، اس کا نام اس کے نزدیک مطلق وحدتِ زوج (ABSOLUTE MONEGAMY) ہے۔

(۲) رشتۂ نکاح عمر بھر کے لیے نہ ہو بلکہ فریقین کی رضامندی سے منقطع بھی ہو سکتا ہو، اسے وہ ترمیم شدہ وحدتِ زوج (MODIFIED MONAGAMY) کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) عورت تو صرف ایک خاوند کی بیوی بن کر رہے لیکن مرد کو اجازت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ عورتیں رکھ سکے۔ اس کا نام اس کے نزدیک تعدد ازدواج (ABSOLUTE POLYGAMY) ہے۔ اور

(۴) اگر مرد دوسری عورتوں سے جنسی تعلق قائم کرے (یعنی ایک سے زیادہ بیویاں کرلے)

تو عورت بھی آزاد ہو کہ وہ اسے چھوڑ کر کسی اور کے ہاں چلی جائے۔ اسے وہ ترمیم شدہ تعدد ازدواج (MODIFIED MONAGEMY) کہتا ہے۔

ڈاکٹر انون کا کہنا ہے کہ

(افسوس) آج تک کوئی قوم شق دا کے "مطلق وحدتِ زوج" کے مسلک کو زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رکھ سکی۔" (صـ ۳۴۴)

چنانچہ اس کے بعد اس محقق کا کہنا ہے کہ:

"کسی معاشرہ میں ایسی صورت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ عورت کی طرف سے اس کا ردِ عمل اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ پھر معاشرہ کے تمام جنسی قیود کو توڑ کر "کامل آزادی" کا مطالبہ کر دیتی ہے اور اس کامل آزادی کے معنی ہوتے ہیں جنسی فوضویت (SEXUAL ANARCHY) جس کا نتیجہ تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔" (صـ ۳۴۵)

جنسی بدنہادی کے نتائج

یہ تباہی کس قسم کی گمبھیر صورت اختیار کر جاتی ہے اور پھر اس کے نتائج کس قدر دُور رس ہوتے ہیں اس سلسلہ میں ڈاکٹر انون کے مندرجہ ذیل الفاظ ہر صاحبِ فکر کے لیے غور و فکر کے متقاضی ہوں گے۔

"اِس قوم میں علم و بصیرت کی قوت تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنے معاملات میں اس سے راہنمائی حاصل نہیں کرتی۔ وہ واقعات کے اسباب و علل کے متعلق کبھی تحقیق نہیں کرتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اسے اسی طرح تسلیم کرتی چلی جاتی ہے۔ زندگی سے متعلق تمام معاملات کے بارے میں ان کی بندھی بندھائی رائے ہوتی ہے (جس کے مطابق وہ چلتے چلے جاتے ہیں) وہ ہر غیر معمولی واقعہ کو جو ان کی سمجھ میں نہ آئے کسی عجیب و غریب قوت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس قوت کا مظہر کبھی پتھروں کو سمجھا جاتا ہے اور کبھی درختوں کو۔ کبھی ایسے حیوانات کو جو انہیں محیر العقول نظر آئیں اور کبھی دیگر ایسی اشیاء کو جن کی ماہیت ان کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس شخص کی پیدائش یا زندگی میں انہیں کوئی غیر معمولی بات نظر آئے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ اس قوت کا مالک ہے۔ حتیٰ کہ اس کی موت کے بعد بھی اسے اس قوت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔" اس کے بعد ڈاکٹر انون نے ان تمام توہم پرستیوں کی تفصیل

بتائی ہے جو نذر نیاز، گنڈہ تعویذ اور ———— قبر پرستی کی صورت میں ایسی قوم سے ظہور میں آتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے) اس قسم کے معتقدات اس قوم میں نسلاً بعد نسلاً متوارث چلے آتے ہیں۔ زمانہ کا امتداد ان پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس معاشرہ میں انسان پیدا ہوتے ہیں، اپنی خواہشات کو پورا کرتے ہیں اور مرجاتے ہیں۔ اور جب ان کی لاشوں کو تہِ خاک دبا دیا جاتا ہے تو وہ نسیاً منسیاً ہوجاتے ہیں۔ یہ انسان نہیں ہوتے بلکہ حیوان ہوتے ہیں۔[1] ص ۴۶-۳۴۵)

پرویز صاحب کا تبصرہ

چنانچہ جناب پرویز صاحب مرحوم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آپ نے دیکھ لیا نقشہ اس سوسائٹی کا جس میں جنسی اختلاط کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی صدیوں سے یہی حالت نہیں چلی آرہی اور کیا آج بھی ہماری یہی حالت نہیں؟ کیا یہ نتیجہ نہیں جنسی اختلاط کے مواقع کی ان وسعتوں کا جو ہمارے خود ساختہ مذہبی تصورات نے عطا کر رکھی ہیں؟

جب ہماری قوم کی جنسی زندگی قرآنی سواحل میں گھری ہوئی تھی تو یہ ساری دنیا پر چھاگئی تھی اور جب ملوکیت نے اسے بدلگام کردیا اور شریعت کے نام پر وہ سب کچھ ہونے لگا" جسے قرآن روکنے کے لیے آیا تھا تو اُن کی ساری توانائیاں ضائع ہوگئیں۔ ان میں پھر نہ فکر کی صلاحیت رہی نہ عمل کی۔ اور یہی حالت اس وقت چلی جارہی ہے۔"

آخر پر ڈاکٹر انون ایک مثالی تمدن کی حامل قوم کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے جس کو قرآن حکیم نے آج سے چودہ سو سال پہلے بیان کردیا تھا۔

مثالی تمدن کی حامل قوم

"انسانیت کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی اس قسم کی نہیں مل سکتی کہ کوئی ایسی سوسائٹی تمدن کی بلندی تک پہنچ گئی ہو جس کی لڑکیوں کی پرورش و تربیت "مطلق وحدت زوج" کی روایات میں نہ ہوئی ہو۔ نہ ہی تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال ملتی ہے کہ کسی قوم میں جنسی اختلاط پر حدود و قیود کی روایات ڈھیلی پڑ گئی ہوں اور اس کے باوجود وہ قوم اپنی

تمدنی بلندی کو قائم رکھ سکی ہو۔ جب عقدِ نکاح ، مساوی حیثیت کے فریقین کا عمر بھر کی رفاقت کا عہد ہو اور نہ میاں اپنی بیوی کے علاوہ کسی اور عورت سے آشنا ہو اور نہ ہی بیوی اپنے میاں کے علاوہ کسی مرد کی شناسا۔ تو اس صورت میں جنسی مواقع اپنی کم از کم حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ "

(لہٰذا یہی وجہ ہے کہ) "جن اقوام نے جنسی اختلاط کے حدود و قیود کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قائم رکھا تھا ، وہی اقوام تہذیب و تمدن کی اس بلندی تک پہنچ سکی تھیں جہاں انسانیت اس وقت تک پہنچ سکی ہے۔" (ص ۲۲۴)

اب سوال آخر یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اس حیوانی جذبہ کو (جو "مرد میں مسلسل جاری رہتا ہے" اور جس کی وجہ سے "ایک مرد ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا۔") کس طرح پابندِ سلاسل کیا جائے چنانچہ پرویز صاحب اِس سلسلہ میں تحریر کرتے ہیں :

کیا ضبطِ نفس ممکن ہے

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں " قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جنسی جذبات کی تسکین کا ایک ہی طریق جائز اور صحیح ہے اور وہ ہے عقدِ نکاح۔ سوال یہ ہے کہ اگر نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں تو پھر کیا کیا جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا... (۲۴/۳۳) ۔ جنہیں ، جب تک ، نکاح کے مواقع میسر نہ ہوں ، وہ ضبطِ نفس (SELF CONTROL) سے کام لیں۔ اور یہی ہے اس موضوع کا نکتہ ماسکہ۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک نوجوان (لڑکی یا لڑکا) ، بلوغت کی عمر تک پہنچ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے لیے ضبطِ نفس ممکن ہے؟

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ کھانے پینے کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک طبیعی تقاضا ہے ، اور دیگر طبیعی تقاضوں کی طرح اس کا پورا کرنا بھی ضروری۔ لہٰذا ضبطِ نفس ایک غیر طبیعی یا غیر فطری تقاضا ہے — اور یہی وہ بنیادی غلطی یا غلط فہمی ہے جس کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بھوک اور پیاس کی طرح جنسی جذبہ بھی ایک فطری جذبہ (NATURAL INSTINCT) ہے لیکن اس میں اور بھوک ، پیاس وغیرہ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو ایک مثال (بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدہ) سے سمجھئے۔ آپ کسی کام میں منہمک بیٹھے ہیں۔ آپ کو پیاس لگتی ہے۔ شروع میں آپ کو اس کا

خیال نہیں آتا۔ وہ بڑھتی ہے تو اس کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ پانی لیتے ہیں تو فبہا۔ ورنہ اس کی شدت بڑھتی جاتی ہے اور اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ آپ کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اور اگر آپ کو کچھ دنوں کے لیے پانی نہ ملے تو اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہی کیفیت بھوک کی ہے۔ اس سے ہم نے دیکھ لیا کہ :-

(۱) بھوک پیاس وغیرہ کا تقاضا از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس میں کسی کے خیال اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور

(۲) اگر ان تقاضوں کی تسکین نہ کی جائے تو کچھ وقت کے بعد اس سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کو اضطراری حالت کہتے ہیں۔ اس حالت میں جان بچانے کی خاطر قرآن کریم میں ان چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی ہے جو عام حالات میں حرام ہیں۔

خیال کا دخل

لیکن جنسی تقاضا کی کیفیت ان سے بالکل جدا ہے۔ جنسی تقاضا کبھی نہیں ابھرتا تاوقتیکہ ہم اس کا خیال نہ کریں۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جنسی تقاضا کی بیداری اور نمو دیکسر ہمارے خیالات سے وابستہ ہے۔ اگر ہمارا خیال اس طرف منتقل نہ ہو تو یہ تقاضا بیدار ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اگر جنسی تقاضا کی تسکین نہ کی جائے، تو اس سے موت واقع نہیں ہو جاتی۔

ضبطِ نفس کا قرآنی حکم

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی اضطراری حالت کے لیے حرام کو حلال قرار نہیں دیا بلکہ کہا ہے کہ جس کے لیے نکاح ممکن نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے۔ ($\frac{24}{33}$) اور یہ ضبطِ نفس کچھ بھی مشکل نہیں۔ اس لیے کہ جس تقاضا کی بیداری کا مدار انسان کے اپنے خیالات پر ہو، اس پر کنٹرول رکھنا انسان کے لیے اپنے بس کی بات ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے خیالات کو طیور آوارہ نہ بنائے اور اس طرف توجہ منعطف نہ کرے تو جنسی جذبہ بیدار ہی نہیں ہوتا۔"

(بحوالہ "سلیم کے نام خطوط")

لیکن مودودی صاحب کی تعلیم

ضبطِ نفس کی اس قرآنی تعلیم کے برعکس ہمارے ہاں مودودی صاحب مرحوم کی تعلیم کچھ اور ہے جسے وہ ترجمان القرآن اگست ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں تحریر کرتے ہیں اور وہ یہ کہ:

"فرض کیجئے کہ ایک جہاز سمندر میں ٹوٹ جاتا ہے اور ایک مرد اور عورت کسی تختے پر بہتے ہوئے کسی ایسے سنسان جزیرے میں جا پہنچتے ہیں جہاں کوئی آبادی موجود نہ ہو۔ وہ ایک ساتھ رہنے پر بھی مجبور رہیں اور شرعی شرائط کے تحت ان کے درمیان نکاح بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں ان کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ باہم خود ہی ایجاب و قبول کر کے اس وقت تک کے لیے عارضی نکاح کر لیں، جب تک وہ آبادی میں نہ پہنچ جائیں یا آبادی اُن تک نہ پہنچ جائے۔ کم و بیش ایسی ہی اضطراری صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔ متعہ اسی طرح کی اضطراری حالت کے لیے ہے۔" (بحوالہ ترجمان القرآن۔ اگست ۱۹۵۵ء)

جناب مودودی صاحب مرحوم کی طرف سے اس عارضی نکاح اور متعہ کی اس اجازت کے پیشِ نظر علامہ اقبال کے الفاظ میں اور کیا کہا جائے ؎

عقل حیلہ تراشں ہے

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ اگر انسان قرآنی تعلیم کے مطابق جنیاتی حدود و قیود کی منفعت بخشیوں کو پیشِ نظر رکھے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکے گا کہ:

(۱) ایک مرد ایک عورت پر قناعت نہیں کر سکتا۔

(۲) مرد میں جنسی تقاضا مسلسل جاری رہتا ہے۔

(۳) مرد اپنے اس جنسی تقاضوں کی تکمیل کے لیے اپنا معیارِ زندگی کم کرے۔

(۴) یا پھر یہ کہ اسلام نے ۴،۴ شادیوں کی کھلی اجازت دے رکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک چار چار شادیوں کی اس "کھلی اجازت" کا تعلق ہے، اس پر ہمیں گفتگو کرنا ابھی باقی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس کے متعلق بھی ہمیں قرآن حکیم کی چوکھٹ پر ہی دستک دے لینی چاہیئے اور وہاں سے جو بھی جواب ملے اسے بغیر کسی تعصب کے اور اَنا کا مسئلہ بنائے بغیر قبول کرنا چاہیئے۔ کیونکہ

سی میں انسانیت کی منفعت بخشی کا راز مضمر ہے۔ نیز یہ وضاحت ویسے بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ راقم کا خیال ہے کہ اس سے نبی اکرمؐ اور صحابہ رضؓ کبار کی ذات پر جو طعن پڑتی ہے اس کا بھی یقیناً ازالہ ہو جائے گا اور آج ہمارا معاشرہ جو "شریعت حقہ" کے عتاب کی نظر ہو رہا ہے اس سے بھی اُسے چھٹکارا مل جائے گا لیکن قبل اس کے کہ ہم قرآن حکیم کی بارگاہ میں حاضر ہوں اس سلسلہ میں اہل یورپ کے ایک دو غیر مسلم مورخوں کے خیالات پیش کر دیئے جائیں جن سے بخوبی یہ اندازہ ہو سکے گا کہ رسولِ خدا نے جو شادیاں کیں اس سے معاذ اللہ کسی جسمانی ضرورت کی تکمیل ہرگز ہرگز مقصود نہ تھی بلکہ اس سے صرف اور صرف بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا ہی مقصود تھا۔

شادیوں کے سلسلہ میں رسول اکرمؐ کی شخصیت غیر مسلموں کی نظر میں

(BOSWORTH SMITH) کے الفاظ میں :

" محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح اور مقاصد کے ماتحت کی جا سکتی ہے اسی طرح اس مقصد کے ماتحت بھی کہ اس سے کس مپرس بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں بلکہ صورتِ حالات اس کے برعکس تھی۔"

(MOHAMAD AND MOHAMMADAN ISM)

کارلائل اس سلسلہ میں تحریر کرتا ہے کہ :

" محمدؐ کے متعلق سب کچھ کہہ چکنے کے بعد بھی یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ وہ نفس پرست انسان نہ تھا۔ یہ بہت بڑی گمراہی ہو گی اگر ہم اس شخص کو ایک عام بندۂ ہوس تصور کریں جو اپنے آپ کو لذائذ میں مشغول رکھے۔ نہیں! یہ شخص حظ و کیف پر گرنے والا نہ تھا۔ اس کے گھر کا ساز و سامان نہایت غریبانہ تھا۔ اس کی خوراک جو کا آٹا اور پانی اور اکثر اوقات ایسا بھی ہوا کہ مہینوں تک اس کے گھر آگ نہیں جلی، وہ اپنے جوتے آپ گانٹھ لیتا تھا۔ اپنے کپڑوں میں خود پیوند لگاتا تھا۔ ایک غریب۔ محنتی۔ مستغنی انسان ان تمام رجحانات سے بے نیاز جن کی خاطر عام سطح کے انسان مرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کا انسان ہوس پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے جذبات ہوس سے بلند ہوتے ہیں۔ اگر وہ ایسا ہوتا تو وہ وحشی عرب جو تیئس سال تک اس کے اشاروں پر جان پر کھیلتے رہے اور عمر بھر اسے اتنا قریب سے دیکھتے رہے کبھی اس کی تعظیم نہ کرتے۔

وہ بات بات پر کٹ مرنے والے تھے۔ منافقت سے دُور۔ ایسے لوگوں سے اپنی اطاعت کرانا کسی عام انسان کا کام نہ تھا۔ وہ اسے رسولؐ کہتے تھے اس لیے کہ اس کی ساری زندگی اُن کے سامنے بے نقاب تھی۔ اس میں کوئی راز نہ تھا۔ سیدھی سادی زندگی۔ کبھی وہ ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہے، کبھی مجلس مشاورت میں۔ کہیں ان میں کھڑا ان سے احکامات کی اطاعت کرا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ کس قسم کا انسان ہے اسی لیے وہ اس کو پیغمبرؐ کہتے تھے (وہ یونہی پیغمبرؐ مان لینے والے لوگ نہ تھے) کوئی شہنشاہ اپنی خلعت فاخرہ میں ملبوس لوگوں سے اس قسم کی اطاعت کرا سکا جو اس انسان نے کرائی جو اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگایا کرتا تھا اور یہ سب کچھ تیئیس سال کی عملی جانچ پرکھ کے بعد ہوا۔" (ص ۹۲)

قرآنی راہ نمائی

قرآن کریم ایک وقت میں ایک بیوی (MONOGAMY) کو اصول قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نکاح کا مقصد باہمی محبت، مودت، سکون اور رحمت ہے (۳۰/۲۱) وہ ایسے گھر کو جنت سے تعبیر کرتا ہے (۴/۲۱) اس مقصد کے لیے وہ کہتا ہے کہ نکاح اچھی طرح دیکھ بھال کر کرو۔ لیکن اس کے باوجود وہ اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ ایسی صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ نکاح کے بعد متاہل زندگی کا تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں ہوا۔ ایسی صورت میں تم اس معاہدے کو قاعدے کے مطابق) فسخ کر کے اس بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کر سکتے ہو۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو تو اس کے لیے یوں کرو۔ ." یہ آیت اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے کہ قرآن کا اصول ایک وقت میں ایک بیوی کا ہے۔ . .

ہنگامی حالات

. . . لیکن قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر اس اصولی قانون میں استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات اسلام کے ابتدائی دور میں مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہؐ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے اِس مختصر سی جماعت میں نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے۔ اِس کے علاوہ مسلمان عورتیں مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اِس مقصد کے پیشِ نظر قرآن نے کہا کہ: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً .... (۴/۳)

اِس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے:

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی ....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے۔

عربی زبان میں "یتامیٰ" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآن کریم میں یَتٰمَی النِّسَآءِ انہی معنوں میں آیا ہے ۴/۱۲۷) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں تم دیکھو کہ یتیم بچے اور بے شوہر عورتیں معاشرہ میں زیادہ ہو گئی ہیں اور "ایک مرد — ایک عورت" کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان عورتوں میں سے اپنی پسند کے مطابق نکاح کر لو۔ دو دو۔ تین تین۔ چار چار تک۔ جیسا ملّی ضرورت کا تقاضا ہو۔

(۳) اِس کے لیے بھی ایک شرط ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر وہی "ایک بیوی کا اصول" برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآن نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک خدمات کا تعلق ہے،

ان میں انسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ ایک بیوی کی طرف اتنا نہ جُھک جاؤ کہ دوسری اُدھر لٹکی رہ جائے۔ (۴/۱۲۹)

قرآن کریم میں ایک بیوی کی موجودگی میں، دوسری بیوی کے سلسلے میں یہی ایک آیت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور آیت نہیں۔ اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ان عورتوں اور جوان لڑکیوں کی تعداد بہت بڑھ جائے جو شادی کے قابل ہوں لیکن انہیں شوہر میسر نہ آسکیں تو اس صورت میں، اس اجتماعی مشکل کا یہ حل تجویز کیا گیا ہے عام حالات میں اس کی اجازت نہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مکہ کی زندگی میں جب اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا نہیں ہوئے تھے، حضور نے "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) کے اصول کی پابندی کی۔ لیکن مدینہ میں آکر جب وہ ہنگامی حالات پیدا ہو گئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس اہم اجتماعی مسئلہ کے حل کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قرآن کریم نے یہ تو نہیں بتایا کہ حرمِ نبویؐ میں، ایک وقت میں ازواجِ مطہرات رضہ کی تعداد کتنی تھی۔ لیکن کتب سیر و تاریخ میں، جن ازواجِ مطہرات رضہ کا ذکر آیا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ وہ (ایک کے سوا) ایسی خواتین تھیں جو لاوارث رہ گئی تھیں اور ان کے لیے حفاظت اور باعزت چھت "مہیا کرنا نہایت ضروری تھا۔ ان میں سے بعض، نہایت بلند خاندانوں کی خواتین تھیں۔ انہیں، ان کی عزت و احترام کے پیشِ نظر، حضور نے خود اپنے دامنِ عاطفت میں پناہ دی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان معزز خواتین اور ان کے یتیم بچوں کو اس قسم کی باعزت پناہ اسی صورت میں مل سکتی تھی کہ انہیں جزوِ خاندان بنا لیا جاتا۔ اگر ان کی پوزیشن، آستاں افتادہ لاوارثوں کی سی رہتی تو اس سے جو نفسیاتی خرابیاں اُبھرتیں وہ بالکل واضح ہیں۔"

بیویوں کو اجازت

"یہ شادیاں سنہ ۸ھ تک ہو چکی تھیں۔ اِس کے بعد مسلمانوں پر فراغت اور مرفہ الحالی کا زمانہ آگیا۔ لیکن اس دور میں وہ گھر جسے سب سے زیادہ امیر ہونا چاہیئے تھا سب سے زیادہ غریب تھا اور وہ گھر تھا خود صدرِ مملکت نبی اکرمؐ کا کاشانۂ مبارک۔ اس لیے کہ حضورؐ نے اپنے مصارف سب سے قلیل رکھے تھے۔ اِس تبدیلیٔ احوال پر ازواجِ مطہرات کو اجازت دے

دی گئی کہ چونکہ وہ مجبوری کا زمانہ گذر چکا ہے اس لیے ان میں سے جو نبی اکرمؐ کے گھر کے معیارِ زندگی پر مطمئن ہوں وہ حضورؐ کے ساتھ رہیں، اور جو اس سے بہتر معیارِ زیست چاہیں تو ان کے لیے رخصت ہے۔

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ (۲۸ ۳۳/ ۲۹)

"اے رسول! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر دنیوی زندگانی (کا عیش) اور اس کی خوش نمائی چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو کچھ (دنیوی) ساز و سامان دے دوں اور تمہیں خوبی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو چاہتی ہو اور عالمِ آخرت (کی بھلائیوں) کو اپنے لیے پسند کرتی ہو، (تو جان رکھو کہ) اللہ نے تم میں سے نیک کرداروں کے لیے بہت بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔"

یہ اذنِ خداوندی ازواجِ مطہرات تک پہنچا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی کاشانۂ نبویؐ سے علیحدگی کا خیال تک نہ کیا۔ اِس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ

(۱) یہ شادیاں کن حالات کے ماتحت عمل میں آئی تھیں۔

(۲) حضورؐ کا حسنِ سلوک کس انداز کا تھا اور

(۳) حالات کی تبدیلی کے بعد قرآن کریم نے انہیں خود اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو کسی اور مسکن میں چلی جائیں۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی جانا نہ چاہا۔ نہ ہی کوئی گئی۔

اِس کے بعد نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا کہ اب آپؐ نہ اور کوئی نکاح کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان بیویوں کی جگہ اور بیویاں لا سکتے ہیں۔"

یہ تھی "اسلام میں چار چار شادیوں کی اِس کھُلی اجازت" کی وہ حقیقت جس کو جناب پرویز صاحب مرحوم نے اپنی کتاب (معراجِ انسانیت) میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لیکن افسوس قرآن حکیم کی اِس واضح تعلیم کے باوجود انسان اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کی خاطر رسولِ خداؐ اور صحابۂ کبار رضؓ کی شادیوں تک کو بھی بطورِ مثال پیش کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ خدا کرے کہ ہم اِس قسم کا انسانیت سوز سودا کرنے سے رُک جائیں جس میں ہماری اپنی ہی رسوائی

اور بربادی کا راز مضمر ہے۔ لیکن افسوس ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا پھر بھی یہی ہے کہ "یہ درست نہیں کہ دوسری شادی کی اجازت صرف اس لیے دی گئی تھی کہ جنگ کے دوران یا باہر سے آئی ہوئی عورتوں کا مسئلہ درپیش تھا بلکہ یہ ایک ایسی اجازت ہے کہ جو ہمیشہ کے لیے دی گئی ہے اور ہر دور میں موجود رہی ہے"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۸۶ء)

عائلی قوانین کی بحث

اب آگے چلیے! مذکورہ جنگ فورم پروگرام کے دوران موجودہ عائلی قوانین کے سلسلہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "یہ سارا قانون غلام احمد پرویز کا بنایا ہوا ہے" اور جب عورتوں نے کہا کہ "سٹریٹ پاور میں ہم دکھا دیں گی کہ موجودہ عائلی قوانین کو کوئی ختم نہیں کر سکتا" (تو) اس پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کہا "وقت آنے پر دیکھ لیں گے کہ ہم بھی سڑکوں پر فیصلہ ہونے سے نہیں ڈرتے"

۱۴ مارچ ۱۹۸۶ء کو موچی گیٹ لاہور میں جماعتِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ہونے والے جلسۂ عام (جس میں امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد صاحب۔ نائب امیر چوہدری رحمت الٰہی۔ مولانا فتح محمد، لیاقت بلوچ، سید اسعد گیلانی، پروفیسر غفور احمد، مولانا جان محمد عباسی۔ قاضی حسین احمد۔ اور جناب حافظ سلمان بٹ صاحب نے شرکت کی) میں بھی ایک قرارداد میں اربابِ اقتدار سے مطالبہ کیا گیا کہ:

"اکثریتی پارٹی پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی میں شریعت کی بالادستی کے لیے نواں ترمیمی بل اور سینٹ میں پیش کردہ نفاذِ شریعت بل[1] بلا تاخیر پارلیمنٹ سے منظور کرائیں۔ اور صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم پاکستان قوم سے اپنا وہ وعدہ پورا کریں جو انہوں نے آٹھویں ترمیمی بل کے موقع پر کیا تھا۔" قرارداد میں کہا گیا کہ "قومی اسمبلی میں قرآن و سنت کی بالاتری تسلیم و قائم کرنے کی قرارداد کی منظوری اور نویں آئینی ترمیم کے ذریعہ فیملی لاز آرڈی ننس کو وفاقی شرعی عدالت میں شامل کرنے کے اعلان کے بعد سے مٹھی بھر مغربی تہذیب و ثقافت سے متاثر خواتین اور ان کے بعض ہم نواؤں نے عائلی قوانین کو شرعی عدالت کے دائرہ کار سے خارج کرانے کی مہم شروع کر رکھی ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکامات کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لے رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کا علم رکھنے والے تمام علماء

---

[1] نفاذِ شریعت بل پر گفتگو مقام فقہ میں آ چکی ہے

اور عوام اِس آرڈی ننس کو قرآن و سنّت کے صریحاً منافی سمجھتے ہیں اور اِس میں ۲۵ سال سے ترامیم کرنے کا مسلسل مطالبہ کر رہے ہیں اب اس بات کے واضح اشارے مل رہے ہیں کہ حکومت اپنے وعدے کے باوجود ان دین بے زار عناصر کے دباؤ میں آ کر اپنے اعلان کردہ موقف سے پیچھے ہٹ رہی ہے اور قومی اسمبلی کی متفقہ قرارداد سے روگردانی کر رہی ہے۔"

لیکن اس قرارداد کے برعکس "طلوعِ اسلام" کا کہنا یہ ہے کہ:

"جماعتِ اسلامی اور عائلی قوانین

جماعتِ اسلامی نے ابتدا ہی سے عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کی مخالفت کر کے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حالیہ مارشل لاء کے دوران جماعت کی مارشل لاء حکومت سے مفاہمت ہو گئی تھی، اس لیے اِس دوران اس نے ان قوانین کی مخالفت ترک کر دی۔ اب مارشل لاء کے اُٹھتے ہی اس نے دوبارہ عائلی قوانین کی منسوخی کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ جماعت کے جن اہلِ علم نے مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عائلی قوانین اسلام کے خلاف نہیں لیکن چونکہ ان کی مخالفت سے سیاسی مفاد حاصل ہوتے ہیں اس لیے وہ ان کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش ہیں۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" شمارہ ۵ مارچ ۱۹۸۶ء)

اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جو عائلی قوانین میں جماعتِ اسلامی سے بھی سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بھی جب جماعتِ اسلامی میں شامل تھے، مودودی صاحب کی یہ کتاب پڑھتے رہے۔ اُس وقت اُنہیں اِس میں کوئی سفارش خلافِ اسلام نظر نہ آئی، لیکن جب اُنہیں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کی صورت میں نافذ کیا گیا تو وہ یکایک خلافِ اسلام ہو گئیں۔ کیا وہ اپنے اس دوغلے طرزِ عمل کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ نہ ہوں گے۔"

عائلی قوانین کے سلسلہ میں اِس قسم کی شدید چپقلش اور باہمی مخالفت کے پیشِ نظر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ عائلی قوانین ہیں کیا؟ چنانچہ یہ جاننے کے لیے ہمیں دیگر ذرائع کے علاوہ ملک کی جانی پہچانی شخصیت اور ملک کے نامور صحافی جناب پروفیسر وارث میر صاحب کا وہ مضمون دیکھنا

— ہوگا جو آپ نے ۱۱ فروری ۱۹۸۶ء کو روزنامہ جنگ کے لیے "زیرِ ترمیم اور عائلی قوانین کا آرڈی ننس کے زیرِ عنوان تحریر کیا۔ موصوف لکھتے ہیں کہ،

عائلی قوانین وارث میر کی نظر میں

"اب مسلم فیملی لاز آرڈی ننس کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے کہ آخر اس کی ایسی کونسی خطرناک شقیں ہیں جن کی مخالفت میں ایک مخصوص طبقہ اتنا پیش پیش ہے۔ اس آرڈی ننس کی رُو سے

(۱) یتیم پوتے کو وراثت میں حصہ دیا گیا ہے۔

(۲) شادی کی رجسٹریشن کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔

(۳) ایک سے زائد شادی کرنے والے کو پابند کرتے ہوئے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ نکاح سے پیشتر پہلی بیوی یا بیویوں کی رضامندی یا مصالحتی کونسل کی اجازت حاصل کی جائے۔ عورت کی ذہنی یا جسمانی صحت کی خرابی یا اس کے بانجھ ہونے کی صورت میں کونسل مرد کی ضرورت یا نقطۂ نظر کے مطابق اس کو دوسری شادی کی اجازت دے سکتی ہے۔

(۴) طلاق کا طریقِ کار طے کیا گیا ہے۔ خاوند طلاق کا نوٹس بیوی کے علاوہ مصالحتی کونسل کو بھی بھیجتا ہے۔ ۹۰ روز تک طلاق نافذ العمل نہیں ہوسکتی اور اگر اس دوران کونسل مصالحت کرانے کی کوشش میں کامیاب ہو جائے تو حلالہ کے بغیر میاں بیوی ایک دوسرے سے رجوع کر سکتے ہیں۔ حلالہ بہر صورت ایک ناپسندیدہ رسم تھی، فقہ اسلامی میں حلالہ کرنے والوں کے بارے میں نہایت سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ بعض مولوی حضرات بھولی بھالی اور ناخواندہ مطلقہ عورتوں سے خود حلالہ نکاح کر لینے کے بعد، انہیں طلاق دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

(۵) نان نفقہ کی وصولی میں مشکلات پیش آئیں تو عورت مصالحتی کونسل سے رجوع کر سکتی ہے اور کونسل مالیہ وصول کرنے کے سخت طریقِ کار پر عمل کرتے ہوئے نان نفقہ وصول کر سکتی ہے۔

(۶) اگر نکاح نامہ میں حق مہر کی ادائیگی کے طریقِ کار کا کوئی ذکر نہیں تو بیوی کسی بھی وقت

حق مہر معجل وصول کر سکتی ہے ۔"

اس کے بعد وارث میر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :

" فیملی لاز آرڈی ننس کی ان شقوں کو ایک بار پھر پڑھیں اور دل میں خوفِ خدا رکھتے ہوئے فیصلہ دیں کہ کون سی شق خدا اور خدا کے رسول ؐ کی منشا یا تعلیمات کے خلاف ہے اس آرڈی ننس کے نفاذ سے پہلے بھی متعدد مستند علماء کی یہ رائے رہی ہے کہ قرآن نے ایک سے زائد شادی کرنے پر اتنی کڑی شرائط عائد کی ہیں کہ ہر کس و ناکس انہیں پورا نہیں کر سکتا۔ بلکہ نکاح و طلاق میں حقوقِ نسواں کے تحفظ کی خاطر ایک معروف عالمِ دین نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ نکاح نامے پر حق مہر کی مالیت کے مطابق ٹکٹیں چسپاں کر دی جانی چاہئیں تاکہ خاوند بیوی کا حق غضب نہ کر سکے ۔ ۱۹۶۱ء کے فیملی آرڈی ننس نے اتنا کیا ہے کہ نکاح، طلاق، حق مہر اور دوسری شادی کی شرائط کو ملکی قانون کی زبان میں ڈھال کر مؤثر بنا دیا ہے ۔ اس آرڈی ننس کی مخالفت کرنے والے محض اپنے صنفی احساس برتری اور سفلی خواہشات کی تکمیل کی خاطر ان مناسب اور معقول شرائط کو غیر مؤثر بنانا چاہتے ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس آرڈی ننس کی بعض شقوں کی تنسیخ سے اسلام کی کونسی خدمت بجا لائی جائے گی ؟ اُلٹا ملک کی تعلیم یافتہ اور باشعور عورتوں کے ذہنوں میں دین کے بارے میں احتجاجی جذبات بھڑکنے کے امکانات زیادہ ہیں ۔ پاکستان کے ہر باضمیر اور سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ لویں ترمیم کے ذریعے خواتین کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی غیر اسلامی، بلا جواز، جاہلانہ اور غیر دانشمندانہ کوششوں کی حوصلے، ہمت اور دلیل کے ساتھ مزاحمت کرے اور دل میں یقین رکھے کہ اس مخالفت کے ذریعے وہ پاکستان اور اسلام کی خدمت بجا لا رہا ہے ۔"

اسمبلی میں پیش کردہ تحریک

وارث میر صاحب کے علاوہ جہاں تک ادارہ طلوعِ اسلام کا تعلق ہے وہ ان قوانین پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد لکھتا ہے :

" تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ عائلی قوانین میں جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سے کوئی شق بھی قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ۔ بعض شقوں کو قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق

کرنے کے لیے کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے لیکن اصولی طور پر ان میں کوئی بات قرآن کریم کے خلاف نہیں۔"

ان قوانین کی رُو سے، عورتوں اور یتیم اولاد کو وہ حقوق دلانے کی طرف پہلا قدم اُٹھایا گیا ہے جو قرآن کریم نے انہیں عطا کیے تھے لیکن جن سے انہیں بدقسمتی سے محروم کر دیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن قوم کی بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون۔جولائی ۹۲ء) میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ کر دیا جائے اور ان کی بجائے وہی پرانے قوانین رائج کر دیئے جائیں جن کی رُو سے :

(۱) والدین (یا دیگر سرپرست) نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی جس جگہ جی چاہے کر دیں۔

(۲) مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب جی چاہے، طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو الگ کر دے لیکن اگر بیوی کسی ظالم خاوند کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنا چاہے، تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔

(۳) مرد کو حق حاصل ہو کہ وہ جب چاہے دو[۲]۔ تین[۳]۔ چار[۴] تک بیویاں کر لے۔ اور

(۴) اور یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم رکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ چاروں شقیں قرآن کریم کے احکام کے خلاف ہیں اور ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اب اصرار ہے کہ قانون یہی رائج ہونا چاہیئے۔ غنیمت ہے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی تحریک کا فیصلہ پہلے سیشن میں ہی نہیں ہو گیا۔ طے یہ پایا ہے کہ اسے پہلے "اسلامی مشاورتی کونسل" کی طرف بھیجا جائے۔

بدقسمتی سے ملک میں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے، اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے اور اس طرح دین و دانش، سب اس سیلاب کی رَو میں بہہ جاتے ہیں۔ اِس کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اِس لیے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اسے کوئی نہیں دیکھتا کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے وہ قرآن مجید کے بھی مطابق ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ دلیل کسی صورت میں بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ صحیح مسلک

یہ ہے کہ ہمارے لیے صحیح اور غلط کا اولین اور بنیادی معیار، خدا کی کتاب ہے، ہمیں تمام جذبات اور رجحانات سے الگ ہو کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں وہ کتاب ہمیں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ہم مرکزی مجلس قانون ساز اور مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کے اراکین سے بالخصوص، اور ملک کے دوسرے سمجھنے سوچنے والے طبقہ سے بالعموم درخواست کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر از خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی سے متعلق کون سے قوانین، اسلام کے مطابق ہیں۔ اس ضمن میں اس بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھیئے (اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کا اس پر ایمان ہوگا) کہ:۔

جو چیز قرآن کے خلاف ہوگی وہ کبھی اسلام کے مطابق نہیں بن سکتی۔ "

یہ کچھ طلوعِ اسلام نے اپنے ہاں ۱۹۶۲ء میں تحریر کیا تھا اور جسے بعد میں مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع کرتے ہوئے لکھا کہ:

" یہ (عائلی) قوانین اب تک رائج ہیں لیکن اب بڑی شدت کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں منسوخ کر دیا جائے۔ آہ بیچاری حوّا کی بیٹی! ؎

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی"

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اقبال کے الفاظ میں ہی اس سے بہتر آرزو اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم سب مل کر پکار اٹھیں کہ ؎

لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی

قصہ عورت کی سربراہی کا

علماء کنونشن کا احتجاج

نومبر ۱۹۸۸ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے وزیر اعظم بننے پر مذہبی دنیا میں جس قدر شور وغل برپا ہوا پاکستان کا پورا پریس اس پر شاہد ہے ان حضرات کی سوچ کے مطابق "شریعت حقہ" اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتی کہ کوئی عورت مسلمان مملکت کی سربراہی کے فرائض سرانجام دے چنانچہ ان حضرات کی طرف سے جاری ہونے والے فتویٰ پر ۱۵۰۰ بریلوی، دیوبندی اور اہلحدیث علمائے دستخط کئے اور ۱۰ مارچ ۱۹۸۹ء کو یوم احتجاج منانے کے علاوہ وفاقی حکومت کی تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ ہوا یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اس روز خطبات جمعہ میں قانون کی حکمرانی اور انفاذ اسلام کے سلسلہ میں تمام مکاتب فکر کی طرف سے متحدہ علماء کونسل کے موقف سے عوام کو آگاہ کیا جائے۔ نیز صوبائی اور ضلعی کونسل کی تنظیمیں قائم کی جائیں۔ ملک بھر میں ضلعی سطح پر علماء کے مشترکہ کنونشن منعقد کئے جائیں اور اس کے علاوہ مینار پاکستان پارک لاہور پر ایک عوامی اجتماع طلب کیا جائے۔ اس سلسلہ میں جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ میں اسی منعقد ہونے والی کنونشن سے جو جناب معین الدین لکھوی کی زیر صدارت ہوئی مندرجہ ذیل علماء نے خطاب کیا۔ مولانا سمیع الحق، مولانا محمد اجمل خان، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا قاضی عبداللطیف، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا محمد اعظم، مولانا حبیب الرحمٰن بخاری، مولانا میاں محمد اجمل قادری، مولانا اسفندیار خان۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۸۹-۲-۲۸)

ڈاکٹر اسرار احمد اور ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا ارشاد

جناب محمد علی فارق (ایم اے ، بی۔ ایم اے سیاسیات) کا ایک مفصل مضمون "قرآن اور عورت کی سربراہی" کے زیر عنوان ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا جس میں فارق صاحب ڈاکٹر اسرار صاحب اور ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :۔

"عورت کی سربراہی کے مسئلہ پر مختلف علمائے کرام کی طرف سے مارشل لا کے دور میں خاص طور پر عوام کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ قدامت پسند علماء کے علاوہ قدیم وجدید کے امتزاج سے نئے افکار پیش کرنے کے دعویدار جناب پروفیسر محمد طاہر القادری

اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جن کا دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگیاں قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ انھوں نے بھی قرآن حکیم کی تعلیم کے برعکس عورت کے سربراہ مملکت ہونے کے خلاف مختلف اوقات میں بیانات دیئے بلکہ محترم طاہر القادری صاحب نے تو روزنامہ جنگ لاہور کے شمارہ ۲۶ فروری ۱۹۸۷ء میں فرمایا تھا کہ "عورت خواتین کی کسی تنظیم کی قیادت تو کر سکتی ہے مگر سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ جب وقت آئے گا میں عورت کے سربراہ ہونے کی مخالفت کروں گا۔ پھر موصوف نے ایک انٹرویو میں جو ہفت روزہ حرمت اسلام آباد میں چھپا۔ فرمایا تھا کہ "میرے نزدیک اس مسئلے پر دوسری رائے کی کوئی گنجائش نہیں۔ (شمارہ نمبر ۹، ۲۸ فروری تا ۵ مارچ ۱۹۸۸ء)

عورت کی سربراہی کی مخالفت صرف پاکستان کی حد تک ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی تائید کے لئے دنیائے عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز بن باز کا فتویٰ بھی حاصل کیا گیا اور وہ یہ کہ

مفتی اعظم سعودی عرب کا فتویٰ

"کسی خاتون کا ملک کا وزیر اعظم بننا یا بنایا جانا یا کسی اور بڑے منصب پر تعین اسلام میں جائز نہیں اس سلسلہ میں قرآن حکیم میں اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے [الرجال قوامون علی النساء ۔۔۔ اس آیت میں حکم عام شامل ہے کہ مرد کو اللہ تعالےٰ نے "قوام"[1] (حاکم، داروغہ) بنایا ہے۔ خاندان میں بھی ریاست میں بھی۔ اس آیت سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مرد کو عورت پر افضلیت عطا فرمائی ہے۔"

---

[1] ۔ حالانکہ قوامؔ کے معنی حاکم اور داروغہ کے نہیں بلکہ معاشی کفیل کے ہیں (تاج العروس میں ہے۔ قَامَ الرَّجُلُ المرأۃَ وَقَامَ عَلَیْهَا کے معنی ہیں مرد نے عورت کی کفالت کی اور اس کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا، اس کے لئے سامان رسد لایا۔ قَوَّامؔ۔ سامانِ رزق مہیا کرنے والا کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے۔ یعنی تقسیم کار کی رو سے مردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریات زندگی کے کفیل ہوں۔

وبما فضل اللہ بعضھم علی بعض: میں یہ نہیں کہا گیا کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے بلکہ کہا یہ گیا ہے کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے مردوں کو عورتوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے جیسا کہ بعض خصوصیات کے لحاظ سے عورتوں کو مردوں سے زیادہ فضیلت ہوتی ہے۔

وبما انفقوا من اموالھم: میں بتایا گیا ہے کہ وہ قوام اس لئے ہیں) کہ وہ اپنے اموال میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ معاشی کفیل ہیں حاکم یا داروغہ نہیں ہیں (بحوالہ تعمیر انسانیت جنوری ۱۹۸۹ء)

اس کے بعد فتویٰ میں وہ حدیث بھی درج کی گئی جس کی اسلامی جمہوری اتحاد کی طرف سے وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی۔

وہ قوم تباہ و برباد ہوئی جس نے عورت کو اپنا حاکم اور سربراہ بنایا" چنانچہ اس حدیث کو لکھنے کے بعد فتویٰ میں تحریر ہے کہ

"جانتے بوجھتے سنت رسول کا بطلان کفر کی حدوں تک پہنچتا ہے۔" اور آخر پر مفتی اعظم فتویٰ میں لکھتے ہیں کہ

"مزید برآں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کی روشنی میں بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی عقل، فہم، حسن تدبیر اور دیگر سارے قوائے جسمانی زیادہ بہتر ہیں۔ لہٰذا ملک کے متذکرہ بالا اعلیٰ مناصب کے لئے مرد ہی زیادہ مناسب ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین حنیف اور سنتِ رسولؐ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔"

جامعہ الازہر کے علماء کا فتویٰ

مملکت پاکستان کے علماء کرام اور مفتی اعظم سعودی عرب کے علاوہ اس سلسلہ میں جامعہ الازہر کے چار ممتاز علماء کرام۔

۱۔ الاکتور رؤف شبلی، وکیل جامعۃ الازہر

۲۔ الاستاذ الدکتور حسن الشاذلی، رئیس قسم الفقہ المقارن وعمید کلیۃ الشریعۃ بجامعۃ الکویت سابقاً

۳۔ الاستاذ الدکتور عبدالمعطی، وکیل کلیۃ اصول الدین فی جامعۃ الازہر۔

۴۔ الاستاذ الدکتور فواد النضاری استاذ القانون العام والمستشار القانونی فی جامعۃ الازہر

کی طرف سے بھی عورت کی سربراہی کے خلاف ایک فتویٰ صادر ہوا جس کی تفصیل ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" لاہور جنوری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

راقم یہاں یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہے کہ ان سطور کے لکھنے جانے کا مقصد صرف یہ سوال زیر غور لانا ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی کے باوجود انسان کی اس جنس کا حکمرانی کے عہدہ پر فائز ہونا یا کرنا ہمارے علماء کرام کے نزدیک کس قدر زیادتی پر مبنی ہے۔

عورت کی سربراہی پر احمد ندیم قاسمی صاحب کا تبصرہ

علماء کی اس قدر غلط فہمی بلکہ زیادتی کا ازالہ کرتے ہوئے پاکستان کی مشہور ادبی شخصیت جناب احمد ندیم قاسمی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ

• نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات کی ایک اور خصوصیت ایسی ہے جس کے اعتراف سے پوری دنیا گونج رہی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کسی مسلمان ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم ہیں۔ وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لئے ان کی نامزدگی سے جہاں پاکستان کے جمہوری معیاروں کو دنیا کے ہر ملک میں سراہا گیا ہے وہاں اس کا یہ پہلو بھی بطور خاص توجہ کا مستحق ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی وزارت عظمیٰ کے دم سے پورے کرۂ ارض پر اسلامی اصولوں کی ہمہ گیری کا اعتراف کیا گیا ہے اور اسلام نے عورت کو مرد کے مساوی جو حقوق دے رکھے ہیں ان پر جرأت مندانہ عملدرآمد کی یہ پہلی روشن مثال ہے یقین ہے کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلے کو کسی نزاع کی بنیاد نہیں بنایا جائے گا اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے گا کہ ہم سب ماؤں کی اولاد ہیں اور مائیں عورتیں ہوتی ہیں۔ ہم سب بہنوں کے بھائی ہیں اور بہنیں بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ ہم سب بیٹیوں کے باپ ہیں اور بیٹیاں بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ کیا عورت کی مذمت کر کے ہم ماؤں اور بہنوں اور بیٹیوں کی مذمت کے مرتکب نہیں ہوں گے؟ ہمیں تو اس امر پر فخر کرنا چاہیئے کہ ہم نے اسلام کی مساوات کے ایک اور پہلو کو پوری دنیا میں سربلند کیا ہے۔

صدر غلام اسحٰق کا بیان

عورت کی سربراہی کے مسئلہ سے ہٹ کر جہاں تک بے نظیر کی ذات کا تعلق ہے تو جناب صدر غلام اسحٰق خان صاحب نے سینٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں فرمایا کہ

" وہ ایک نوجوان تعلیم یافتہ، نفیس اور قابل خاتون ہیں ان میں لیڈرشپ کی اعلیٰ صفات اور سیاسی بصیرت کی خوبیاں موجود ہیں۔ وہ حب الوطنی اور خدمت عوام کے جذبے سے سرشار ہیں اور ان سب سے بڑھ کر وہ قوم کی منتخب نمائندہ ہیں۔"

جناب ارشاد احمد حقانی کا تبصرہ

جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے جس انداز سے عورت کی سربراہی پر قلم اٹھایا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے آپ اپنے کالم میں لکھتے ہیں کہ

قاضی حسین احمد امیر جماعت اسلامی نے پیپلز پارٹی پر یہ الزام بھی کیا ہے کہ اس نے وزارت عظمیٰ کے لئے ایک خاتون کا نام دے کر شریعت کے مسلمہ اصولوں سے انحراف کیا ہے۔ کاش قاضی صاحب یہ اعتراض کرتے وقت اپنی جماعت اور اس کے محترم بانی و قائد سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور ان دوسرے علماء و زعماء کے طرز عمل کو پیش نظر رکھ لیتے جو انہوں نے ۱۹۶۴ء میں صدر ایوب خان کے خلاف محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کرتے وقت اختیار کیا تھا۔ جماعت اسلامی نے پوری انتخابی مہم کے دوران تو عورت کی سربراہی کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت نہ دی جس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اسے اپنے قائد اور بانی کے فتوے اور عمل کا علم تھا۔ لیکن اب جب کہ ملکی آئین کے تحت محترمہ بے نظیر وزیر اعظم بن چکی ہیں اور متعدد اہل علم عورت کی حکومت کے بارے میں بعض علماء کی رائے سے علمی اور وزنی اختلاف کر چکے ہیں۔ قاضی صاحب نے پی پی پی کے جرائم کی فہرست میں یہ الزام بھی شامل کرنا مناسب سمجھا ہے کہ اس نے وزارت عظمیٰ کے لئے ایک خاتون کو نامزد کر دیا۔ کیا آئی جے آئی محترمہ عابدہ حسین کو ڈپٹی لیڈر آف دی اپوزیشن بنانے کا ارادہ نہیں کر رہا اور کیا آئی جے آئی کے ٹکٹ پر کسی عورت نے عام نشستوں پر انتخاب نہیں لڑا؟ جماعت اسلامی نے محترمہ عفیفہ ممدوٹ کو ٹکٹ دیئے جانے پر کیوں خاموشی اختیار کی۔ کیا آئی جے آئی نے خواتین کی مخصوص نشستوں کا انتخاب نہیں لڑا اور کیا نظریاتی طور پر یہ ممکن نہیں کہ آئی جے آئی کی کسی صوبائی یا مرکزی حکومت میں کوئی عورت وزیر بن جائے۔ وزیر بننا بھی تو امور کا والی بننا ہی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کا دائرہ نسبتاً محدود ہوتا ہے اور وزیر اعظم کے فرائض کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ دونوں حالتوں میں شرعاً اور عقلاً کوئی فرق نہیں۔ اب آپ بات کو اپنے لئے تو جائز قرار دیتے ہیں اور خود ان فیصلوں میں شریک ہوتے ہیں یا کم از کم ان پر آپ کا کوئی احتجاج ریکارڈ پر نہیں لیکن وہی فیصلہ دوسرے کریں تو آپ اسے شریعت

کے مسلم اصولوں سے انحراف قرار دے کر ایک ارج شیٹ کا درجہ دے دیتے ہیں یہ وہ عملی نرم سے نرم لفظوں میں حیران کن ہی قرار دی جا سکتی ہے۔"

مندرجہ بالا کالم کے اندر جس تضاد حکمتِ عملی اور مصلحت آمیز اسلام کا جوڑ کر کیا گیا ہے اس کی مزید وضاحت اس خط سے بخوبی ہو سکے گی۔ جو مولانا کوثر نیازی صاحب (جو ۲ سال تک جماعت اسلامی سے منسلک رہے) نے جماعت سے مستعفی ہونے سے قبل مولانا مودودی مرحوم کو تحریر کیا تھا ان کے اس خط کے مطالعہ سے جہاں کئی ایک متضاد نظریات کی وضاحت ہو گی وہاں قارئین کو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ان حضرات کا قرآن فہمی کے سلسلہ میں کیا مقام تھا نیز یہ کہ خود مولانا کوثر نیازی صاحب عورت کے اس مسئلہ پر کس قدر کشمکش واقعہ ہوئے ہیں اور نیز یہ کہ پارٹی بازی انسان کی رائے کو کس قدر متاثر کرتی ہے اور آخر کار پارٹی بازی کے اندھیروں میں آزادی رائے کے اس طرح گم ہو جانے سے انسان کو قدم قدم پر ایک ہی چہرے پر کتنے چہرے سجانے پڑتے ہیں اب آپ وہ خط ملاحظہ فرمائیں جس میں مولانا کوثر نیازی صاحب مودودی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

مولانا کوثر نیازی صاحب کا خط مودودی صاحب کے نام

ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے

"محترم مولانا: اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ دوسری بہت سی اصولی غلطیوں کے علاوہ ہم نے عورت کی صدارت کے مسئلہ میں جو روش اختیار کی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی جو سزا ملے گی اس کا مسئلہ تو الگ ہے، اس دنیا میں بھی اندرون و بیرون ملک ہماری دینی حیثیت ختم ہو چکی ہے اگر ہمیں صدر ایوب کی مخالفت کرنی ہی تھی اور محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینا ہی تھا تو سیاسی اور جمہوری ضرورتوں کا اظہار کر کے ایسا کیا جا سکتا تھا مگر اس کے لئے ہم نے غریب اسلام پر جو نوازش کی ہے اور حرمتوں کی ابدی اور غیر ابدی تقسیم کا جو نیا نظریہ پیش کیا ہے اس کے بعد دینی حلقے تو ایک طرف رہے دوسرے غیر جانبدار عناصر حتیٰ کہ اپوزیشن تک کے بعض نمایاں افراد ہمیں ابن الوقت اور سیاست کی خاطر دین میں ترمیم و تحریف کرنے والا گروہ تصور کرنے لگے ہیں۔ آپ عالم اسلام کی صفِ اول کے ممتاز عالم دین ہیں اور میں ایک معمولی طالب علم، میں نے کچھ سیکھا

بھی ہے تو آپ کے طفیل، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی کی یہ تقسیم مان لینے کے بعد ہمارا مؤقف منکرین حدیث کے گمراہ کن نظریہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ منکرین حدیث کا نظریہ یہی تو ہے کہ وہ فقط قرآن میں بیان کردہ حرمتوں کو ابدی مانتے ہیں۔ حدیث کی حرمتیں ان کے نزدیک غیر ابدی ہیں مگر ہم یہ کہہ کر ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں کہ نہیں ساری حرمتیں قرآن کی بھی ابدی نہیں، حرمتیں قرآن کی ہوں یا حدیث کی سب کی سب ابدی اور غیر ابدی کے خانوں میں تقسیم ہیں۔

"سو حرمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا"

محترم مولانا یقین فرمایئے کہ اس نظریہ کی تاویل میں اب تک آپ نے یا دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا یا کہا ہے وہ میری نظر میں ہے (اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جماعتی پالیسی کی جبریت کے تحت میں خود آپ کے اس نئے نظریہ کا دفاع کرنے والوں میں شامل رہا ہوں) مگر اس کے باوجود اس نظریہ کی صحت مجھ پر واضح نہیں ہو سکی اور آج جب کہ یہ سطور لکھتے وقت میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ میں آپ کا بدترین بدخواہ ہوتا اگر اس مہلک نظریہ کے متعلق میں اپنے دل کی بات آپ کے سامنے بیان نہ کرتا قرآن اور حدیث میں حرمتوں کے متعلق "اہون" اور "غیر اہون" کا تصور ضرور پایا جاتا ہے مگر "ابدی" اور "غیر ابدی" کا نہیں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ دروازہ کھول کر ہم نے تجدد پسندوں کو دین کی پامالی کا اذنِ عام دے دیا ہے۔ غیر ابدی حرمتوں کی لکھی لکھائی فہرست تو کہیں درج نہیں ہوگا یہی کہ جو شخص یا گروہ اپنی ضرورتوں اور مصلحتوں کے تحت چاہے گا کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرا لے گا۔ آخر کسی حرمت کو غیر ابدی ٹھہرا لینے کا حق ہمیں ہی تو ارزانی نہیں ہوا۔ دوسرے بھی تو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم تو یہ کہہ سکیں گے کہ جن ضرورتوں اور مصلحتوں کی خاطر تم ایک حرمت کو جائز قرار دے رہے ہو یہ ضرورتیں اور مصلحتیں معتبر نہیں مگر اس کا کیا جواب ہوگا جب پلٹ کر کسی نے یہ کہہ دیا کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے۔ آپ کے نزدیک یہ مصلحتیں غیر معتبر ہیں۔ ہمارے نزدیک معتبر اور جہاں تک نظریہ کا سوال ہے وہ خود آپ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس لئے ہم نے اپنے غلط اجتہاد پر عمل کرتے ہوئے بھی۔

"سو حرمتوں کو علم دیا ہے جواز کا"

تو ہم اس لئے ثواب کے اُمیدوار ہیں کیونکہ مجتہد کے نامہ اعمال میں غلط اجتہاد پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے۔ مجھے اس سے پیشتر آپ کے نظریۂ حکمتِ عملی کے ان خطرناک پہلوؤں کا اندازہ نہ تھا۔ جماعت سے نکلنے والے بعض اکابر اس پر گرفت کرتے تھے تو میں اسے مخالفت اور تعصب پر محمول کرتا تھا مگر صدارتی انتخاب میں پیش ہونے والے اس نئے نظریہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میں یہاں تک سوچنے لگا ہوں کہ کیا آپ کا پہلا نظریہ حکمت عملی انہی مضمرات کا حامل تو نہ تھا؟

کوثر نیازی صاحب کا خود اپنے بارے میں اظہار خیال

میں آپ کے سامنے انتہائی ندامت کے ساتھ خود اپنے بارے میں بھی یہ اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے حقیر سے علم اور مطالعہ کی بنا پر میری رائے یہی تھی کہ موجودہ سیاسی اور جمہوری روایات کی بات تو دوسری ہے۔ لیکن شرعاً عورت کسی بھی صورت میں صدر مملکت نہیں بنائی جاسکتی اور اس کا میں کوئی تصور اپنے ذہن میں نہیں رکھتا تھا کہ کبھی ہم بھی اسلام کے نام پر ایک خاتون کی حمایت میں ایسی تحریک چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی مسجد میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے سینکڑوں افراد کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل سے اپنے اس عقیدے کی وضاحت کی اور بعد میں بعض اخباری نمائندوں کی خواہش پر اس خطبہ کا خلاصہ اخبارات کو بھی بھجوا دیا مگر اسی دوران مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ جماعت اس سے الگ نقطۂ نظر پر سوچ رہی ہے اور امکان غالب اس کا ہے کہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اس انکشاف پر سراسیمگی کا شکار ہو کر رہ گیا اور جماعت کے فیصلے کے انتظار میں اس بیان کو واپس لے لیا۔

مجھے بعد میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے جیل سے مرکز جماعت کو یہ ہدایت بھجوائی ہے کہ اس مسئلہ پر ہرگز متحدہ حزب اختلاف کا مناقشہ نہ دیا جائے۔ آپ کی گزشتہ تحریروں کی روشنی میں امید بھی اس بات کی تھی، لیکن جب مجلس مشاورت میں جیل سے آئی ہوئی آپ کی وہ تحریر پڑھ کر سنائی گئی (جسے بعد ازاں لفظ بلفظ مجلس مشاورت کی قرارداد کی صورت میں اخبارات کو ارسال کر دیا گیا) تو میرے حسن ظن کو انتہائی ٹھیس پہنچی۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو

میں یہاں بھی وضاحت کردوں کہ مجلس مشاورت کے جس اجلاس میں محترمہ کی حمایت کا فیصلہ کرتے ہوئے اس قرارداد کو منظور کیا گیا میں اس میں اپنی غلط فہمی (یا وقت کے بارے میں غلط اطلاع) کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا، جب میں پہنچا تو یہ قرارداد اخبارات کو بھجوائی جا چکی تھی۔ کاش! میں اس وقت موجود ہوتا اور اس غلط نظریہ پر اہل مجلس کو متنبہ کر کے کم سے کم قرارداد کے الفاظ تو تبدیل کرا دیتا۔ ظاہر ہے اس کے بعد تیر از کمان رفت والا معاملہ تھا۔

ایک چہرے پر کئی چہرے

اب جماعتی دستور کی رو سے میں اس فیصلہ کی تائید پر مجبور تھا اور جس رائے کو میں دلائل کی بنا پر مرجوح بلکہ غلط سمجھتا تھا اب صرف اس لئے کہ وہ بطور قرارداد منظور ہو چکی ہے۔ جماعت اور مجلس مشاورت کا رکن ہونے کی وجہ سے میں تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی تائید و توثیق کرنے لگا۔

مولانا، میں بہت گنہگار ہوں مگر میری پوری زندگی کے گناہ ایک طرف اور یہ اکیلا گناہ دوسری طرف کہ میں نے جس بات کو شرعاً درست نہیں سمجھا تھا صرف جماعتی قواعد و ضوابط کی وجہ سے اس معصیت پر مجبور ہو گیا کہ اب اس کی نمائندگی کروں۔ اللہ میرے اس جرم کو معاف فرمائے۔ ورنہ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس جرم کی وجہ سے میرا دل رہے سہے ایمان ہی سے محروم نہ ہو جائے۔

نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا

مولانا! میری رائے یہ ہے کہ اب ہماری یہ محبوب جماعتِ اسلامی ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہے۔

۱۔ اس جماعت کی ابتداء کے وقت نظام حکومت کی اصلاح کا جو تصور آپ نے پیش کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ افراد میں ایمان و اسلام اور احسان کا صحیح شعور پیدا کر کے انہیں انفرادی زندگی میں متقی بنایا جائے اور ان افراد کے ذاتی عمل اور شہادت حق کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی جائے۔ اس طریقے سے نظام حکومت کی اصلاح یوں ہو گی جیسے سنگترے کے بیج سے سنگترے کا درخت اور پھر اُس درخت سے سنگترے

کا پھل پیدا ہوتا ہے، اس طبعی عمل کے طور پر اسلامی حکومت اسی اصلاح یافتہ معاشرے سے ظہور پذیر ہوگی ۔ یہ تصور اگر جماعت کی نگاہوں سے اوجھل ہوتا تو کسی اہم مرحلے پر اسے اجاگر کرنے کے بعد پھر سے زیر عمل لایا جا سکتا ہے لیکن دوسرے بہت سے اصحابِ قلم کے علاوہ خود آپ نے پچھلے آٹھ دس برس میں جماعت کو جو فکری غذا دی ہے اور جس طرح پہلے، دوسرے اور تیسرے مرحلے کا تصور دے کر جماعت کے کارکنوں کو یہ باور کرایا ہے کہ جماعت جو بھی پالیسی اختیار کر رہی ہے، وہ اسی تصور اقامتِ دین ہی کا نتیجہ ہے جو آپ نے شروع میں پیش فرمایا تھا، اس کے بعد جماعت کے کارکنوں کو پھر سے اصلاحِ ذات اور اصلاحِ معاشرہ کے کاموں پر لگا دینے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ مزید براں ہم نے پچھلے چند سالوں میں بالعموم اور صدارتی انتخاب میں بالخصوص جس قسم کی اپوزیشن کا کردار ادا کیا ہے۔ ارباب اقتدار کو اپنا حریف بنایا اور خود جس طرح ان کے حریف بنے ہیں۔ اس کے بعد داعی دین کی حیثیت سے ہمارے لئے ملک میں کام کرنے کی کوئی صورت موجود نہیں ۔

ہماری دینی اور اصلاحی دعوت پر کوئی اعتماد نہیں کر سکتا

اس پہلو سے میری مایوسی اس وجہ سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ہم نے ۵۱ء کی انتخابی پالیسی سے لے کر عورت کے مسئلہ صدارت تک ہر متضاد بات کے لئے جس طرح نصوص قرآن و حدیث کو پیش کیا ہے اس کے بعد اس ملک میں کوئی ذی فہم آدمی ہماری پیش کردہ دینی اور اصلاحی دعوت پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ۔

تضاد عملی کے چند پہلو

تضادات کا شکار ہوتے جانے کے سارے ادوار آپ سے بڑھ کر کس پر روشن ہوں گے۔ پہلے ہم نے امیدواری کو حرام قرار دیا۔ اس کے لئے صحابہؓ تک کسی جلیل القدر شخصیت میں امیدواری کا کوئی پہلو ہمارے سامنے پیش کیا گیا تو ہم نے اپنی اجتہادی رائے کو نص کا درجہ دے کر اس پر تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا مگر اب ہم اپوزیشن سے مل کر

امیدواروں سے خود درخواستیں طلب کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا کہ صالح نمائندہ پنچایتی سسٹم سے آئے جس جماعت یا گروہ سے بھی تعلق رکھتا ہو، پھر ہم نے صالح نمائندوں کو جماعت کے دائرے میں مخصوص کر دیا۔ پہلے ہم پارٹی ٹکٹ کو لعنت کہتے تھے، اب محاذ کے ساتھ شریک ہو کر "غیر صالحین" کو بھی ٹکٹ بانٹ رہے ہیں۔ ہم نوٹ پر قائداعظم کی تصویر چھاپنے پر سخت برہم تھے، صدارتی انتخاب میں ہمارے کارکنوں نے ان کی بہن کے تصویری ڈھیر گلی گلی فروخت کئے۔ پہلے ہم نے صدارتی سے بھی بڑھ کر امارتی تصور خلافت پیش کیا تھا۔ اب ہم پارلیمانی نظام جمہوریت کو اسلامی قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم اسمبلیوں میں اراکین کی الگ پارٹیاں بنانے کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے بعد میں ہم نے خود اس پر عمل کیا۔ پہلے ہم مخلوط جلسوں میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اب مخلوط جلسوں کی صدارت کرتے اور ان میں تقریریں کرتے ہیں پہلے ہم علماء کے اتحاد کی کوشش کرتے اور موجودہ پارٹیوں کو ساتھ ملانا غلط سمجھتے تھے۔ اب علماء کے اتحاد سے بے نیاز اور سیاسی پارٹیوں کے محاذ کو مضبوط کرنا تقاضائے اسلام سمجھتے ہیں۔ پہلے ہم خواتین کو ووٹ کا حق دینے میں راضی نہ تھے۔ اب ان کی صدارت تک کے لئے کوشش کرتے ہیں پہلے ہم اپوا کے زبردست ناقد تھے اب انہی کا ایک حصہ متحدہ حزب اختلاف کی خواتین کمیٹی کی صورت میں منظم ہوا ہے تو ہمارے اکابرین کی بیگمات ان کے جلسوں سے خطاب فرماتی ہیں۔ پہلے ہم طلباء کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روکتے تھے اب ان سے عملی سیاست میں شریک ہونے کی اپیلیں کرتے ہیں۔ پہلے ہم جلسوں اور نعروں کو غیر اسلامی کہتے تھے اب غلاف کعبہ تک کے جلوس نکالتے اور اپنے رہنماؤں کے لئے زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں پہلے ہم ان انسانی (غیر اسلامی) قوانین پر چلنے والی عدالتوں میں مقدمات لے جانا بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے اب انہی عدالتوں کو ہم عدل و انصاف کا محافظ قرار دیتے ہیں۔ پہلے ہم وکیلوں کو شیطانی برادری کا رکن سمجھتے تھے اب انہی کو جمہوریت کا سرپرست کہتے ہیں۔ میں یہ عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ہماری ان باتوں سے کون سی بات صحیح تھی اور کون سی غلط، یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہے اور یقین مانئے انتہائی دکھ کے ساتھ میں نے جماعتی تاریخ کی طرف یہ اشارے کئے ہیں۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے واضح تضادات کو وقت کی گردش کے ساتھ ساتھ ہم اسلامی اور دینی سمجھ کر چھوڑتے اور اختیار کرتے رہے ہیں تو اب ترک و اختیار" کے ان مظاہروں کے بعد اپنے ارکان کے سوا، کون ہمارے دینی

اس حقیقت حال کے پیش نظر جناب محمد علی خارق تحریر کرتے ہیں کہ

محمد علی خارق کی قرآن فہمی

" جن لوگوں کے گفتار و کردار میں تضادات کا یہ عالم ہو واقعی ان کے دینی فکر پر کون بھروسہ کرے گا! حیرت ہے کہ جن لوگوں نے عورتوں کو اسمبلی کے ٹکٹ دیئے وہ عوام کو یہ تاثر دیں کہ عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ سوال یہ ہے کہ جو عورت اسمبلی کی ممبر بن سکتی ہے وہ سربراہ کیوں نہیں بن سکتی۔ اس کے سربراہ بننے میں کونسا عقلی، منطقی اور قانونی امر مانع ہے؟ کہا جاتا ہے کہ بخاری شریف میں چونکہ یہ حدیث ہے کہ عورت کو سربراہ بنانے والی قوم فلاح پائے گی۔ اس لئے اسے سربراہ نہیں بنایا جاسکتا اصولی طور پر تو ہر مسلمان کو سب سے پہلے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہی ایک لاریب، محفوظ اور بے مثل کتاب ہے جس میں

کسی قسم کے شک و ریب کی گنجائش نہیں۔ باقی کتابوں کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ تاہم عورت کی سربراہی کے متعلق حدیث پر اصرار کرنے والوں سے گزارش ہے کہ کیا انہوں نے تصویر کے متعلق بخاری شریف میں کوئی حدیث نہیں دیکھی، اگر نہیں دیکھی تو اس کا اعلان کر دیں اگر دیکھی ہے تو اس سے بھی عوام کو آگاہ کرنا چاہیئے تھا تاکہ عوام کو معلوم ہو جاتا کہ آپ بخاری شریف کی کتنی حدیثوں کو تسلیم کرتے اور ان پر خود بھی عامل ہیں۔ نمونہ کے طور پر بخاری شریف کی چند احادیث تصویر کے متعلق ملاحظہ ہوں۔

بخاری شریف میں تصویر بنانے سے بھی منع کیا گیا ہے

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اہل کتاب میں دستور تھا جب ان میں کوئی نیک بخت آدمی مرجاتا تو اس کی قبر پر مسجد تیار کرتے پھر اس میں ان کی صورتیں بناتے تھے۔ یہ لوگ (تصویریں بنانے والے) اللہ تعالےٰ کے ہاں بد ترین مخلوق ہیں (بخاری)

۲۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ میں نے آنحضرت سے سنا ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالےٰ کے ہاں سب سے زیادہ عذاب کے مستحق تصویریں کھینچنے والے

ہیں (بخاری)

۳۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے فرمایا۔ میں نے آنحضرتؐ سے سُنا ہے۔ فرمایا ہر مصور دوزخ میں ہو گا۔ ہر ایک تصویر کے عوض اسے دوزخ میں عذاب دیا جائے گا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اگر تمہیں یہ کام ضروری کرنا ہو درخت کی تصویر بنا لو اور ان چیزوں کی تصویریں بناؤ جن میں روح نہیں (بخاری)

بخاری شریف میں اس کے علاوہ اور بھی کئی احادیث ہیں جن کو مولانا احمد علی لاہوری مرحوم نے بھی "فوٹو کا شرعی فیصلہ" نامی اپنے کتابچہ میں جمع کیا ہے اور جسے انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔

تو پھر عورت کی سربراہی والی اور تصویر والی حدیث میں فرق کیوں

قارئین خود فیصلہ کریں کہ کیا عورت کی سربراہی والی حدیث اور تصویر کے متعلق احادیث کو ایک ہی مقام دیا جاتا ہے وہ کون سا امیدوار ہے جس نے اپنی انتخابی مہم کے دوران تصویر والی احادیث پر عمل کیا ہے۔ اخبارات میں چھپنے والی تصاویر کے علاوہ پوسٹروں اور ہر چوک میں ہزاروں روپے سے ایک ایک تصویر بنوا کر بجانے والوں کو صرف عورت کی سربراہی والی حدیث کیوں یاد رہی ہے؟

قرآن حکیم اس مسئلہ میں کیا کہتا ہے اس سے قبل ایک اصولی بات ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ سنی اور شیعہ دونوں کی کتابوں میں ایسی روائتیں نقل ہوئی ہیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ حدیث کو قرآن پر پیش کرو۔ جو روایت مطابق قرآن ہو اس کو لے لو اور جو مخالف ہو اس کو چھوڑ دو۔ اس سلسلہ میں صرف ایک روایت پیش کی جاتی ہے دیگر روائتیں اور ان کے حوالہ جات کے لئے ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور کے شمارہ اگست ۸۸ ۱۹ء صفحات ۶۱-۶۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

تکثر لکم الاحادیث بعدی فاذا روی لکم عنی حدیث فاعرضوہ علی کتب اللہ فما وافق کتب اللہ فاقبلوہ ما خالف فردوہ

(رسولؐ اللہ نے فرمایا) میرے بعد تمہارے سامنے بہت سی حدیثیں آئیں گی، اگر مجھ سے کوئی روایت کرے تو اس کو کتاب اللہ پر پرکھو اگر موافق کتاب ہو تو لے لو ورنہ چھوڑ دو۔

قرآن نے تو انسانوں پر انسانوں کی حاکمیت کی بجائے اصولوں کی حاکمیت کا تصور دیا ہے۔ سورۃ آل عمران نمبر ۷۹، میں کہا گیا ہے کہ "کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے ضابطہ، قوانین حکومت حتیٰ کہ نبوت تک بھی دے دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے تم قانون خداوندی کی نہیں میری محکومی اختیار کرو۔ بلکہ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی ہو جیساکہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے۔ جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔"

لہٰذا جب کسی بڑے سے بڑے انسان کو بھی دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کی اجازت نہیں تو مرد یا عورت کی سربراہی کے مسئلہ کی کیا وہ نوعیت باقی رہ جاتی ہے جس کی بنیاد پر پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے ؟

قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر" (سورۃ الحج آیت نمبر ۴۱)

" یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دے دیں تو صلوٰۃ (کے نظام) کو قائم کریں گے (لوگوں کو) زکوٰۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے

یہاں واضح طور پر اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تمکن فی الارض یعنی بااختیار اور صاحبِ اقتدار لوگوں کا فریضہ بتایا گیا ہے وہ قانونی طور پر لوگوں کو معروف کا حکم دیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ حکومتی اتھارٹی کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ امر یعنی حکم وہی ہوتا ہے جس کی تعمیل ہو یا عدل تعمیل کی صورت میں سزا دی جا سکے۔ ورنہ محض وعظ یا تلقین سے لوگوں کو نہ معروف کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی منکر سے باز رکھا جا سکتا ہے اوپر آیت میں اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام اہلِ ایمان (مردوں اور عورتوں دونوں) کا وصف قرار دیا گیا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ امر بالمعروف یا اقامتِ صلوٰۃ صرف مردوں کے لئے ہے عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں، اگر نہیں تو پھر کس طرح اس فریضہ کو صرف مردوں کے لئے مخصوص سمجھا جائے گا جس کے بغیر عورتیں اپنا فریضہ امر بالمعروف اور نہی المنکر وغیرہ ادا

نہیں کر سکتیں۔

اس کے بعد سورۃ توبہ کی درج ذیل آیت پر غور کریں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ ویطیعون اللّٰہ ورسولہ و اولئک سیرحمھم اللّٰہ ان اللّٰہ عزیز حکیم ۹/۷۱

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ وہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے منع کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی یقیناً اللہ سب پر غالب اور حکیم ہے۔"

اس آیت میں مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا رفیق قرار دیا گیا ہے۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر، اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکاۃ یعنی افراد معاشرہ کو سامان نشوونما پہنچانا بھی مردوں اور عورتوں دونوں کا مساوی فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت بھی دونوں کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن حکومتی معاملات میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی شامل کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی سورۃ نمل میں ملکہ سبا بلقیس کو صاحب اقتدار و اختیار سربراہ مملکت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے"۔

ہمارا خیال ہے کہ مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں قارئین یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہوں گے کہ بقول محترم محمد عمر دراز صاحب کے کہ:

"کون کہتا ہے کہ عورت سربراہِ مملکت نہیں بن سکتی؟ خدا تو ایسا نہیں کہتا۔"

سچ تو یہ ہے کہ

کہاں کہاں نہیں سورج کی روشنی پہنچی یہ اور بات کہ اندازۂ سحر نہ ہوا

لہٰذا میرے بزرگ دوست حافظ محمد یعقوب خان تاجک صاحب کے الفاظ میں انداز سحر کا احساس دلانے کے عمل کے لئے ضروری ہے کہ ہم

"عورت کی نفسیاتی کیفیات اور اس کی تربیت اور اس کے ماحول کو جاننے کی کوشش میں اس بات کو سامنے رکھیں کہ مسلم قوم کی ماں مجہول اور باندی کیسے رہ گئی عورت نے مرد کو تو جو کچھ دیا، دیا، خود اس نے عورت کو کیا دیا؟ صدیوں کی جہالت اور رسم پرستی عورت میں کیوں قائم رہی۔

سوچنے کی بہت سی باتیں ہیں آپ بھی سوچیں اور آزادانہ طور پر سوچیں اور سوچنے کے بعد ایسے طریقے

اختیار کریں جن سے عورت کے ذہن میں تبدیلی آئے

یہ تبدیلی سامنے سے آئے گی اور نہ عقب سے آئے گی۔ عورت خود اسے اپنے اندر پیدا کرے گی۔"
کیونکہ ارشاد خداوندی ہے کہ انسان کے لئے صرف وہی کچھ ہے جس کے لئے وہ خود کوشش کرتا ہے۔"

حاصلِ کلام لہٰذا

۱۔ "عورت رنگا رنگ پھول اسی وقت تربیت دے سکتی ہے جب وہ دیدۂ بیدار ہے۔
نسائم شفا بخش ہیں رتی پھر نوخاستہ گلوں کے رنگ بو اسی وقت رکھ سکتی ہے جب۔

۲۔ سہاگ کی نگہبانی وہ خود کرے۔

۳۔ گود میں پلنے والی بیٹی اور پرورش پانے والے بیٹے کے ذہن کی صحت اور ان کے فکر کی اصلاح پر یقین خود رکھے۔

۴۔ روایتی اور وراثتی چیزوں کا تجزیہ اللہ کے عطا کئے ہوئے علم سے خود کرے۔

۵۔ معاش کے قومی ذرائع پر مساوات کا حق تسلیم خود کرائے۔

۶۔ عورت اور مرد کی برابری کے حقوق آئینی طور پر حاصل خود کرے۔

۷۔ جاہلیت کے قاعدوں، رسموں، رواجوں کو ختم خود کرے۔

۸۔ نسلِ انسانی کی تربیت انسانی مساوات پر خود کرے۔

۹۔ عزتِ نفس کو خود پہچانے۔

۱۰۔ قوتِ مشاورت میں برابر کا حصہ خود لے۔

۱۱۔ تنگ دائروں سے نکل کر تعمیری کاموں کی طرف خود آئے۔

۱۲۔ مضبوط، امین اور فصیح خود بنے۔

۱۳۔ ذاتی اہلیت اور ذاتی قابلیت کو خود بڑھائے۔

۱۴۔ (تاکہ اس کے نتیجہ میں) ماں کی مساعی جمیلہ سے بیٹی بیٹے کی زندگی پروان پھر ایسے چڑھے کہ پھولوں تک خوشبو محدود نہ رہے، آدمیت و مردانگی مشرف بہ اسلام ہو جائے۔

(بحوالہ عورت کے پھول عورت کی جھولی میں)

اگر عورت نے یہ سب کچھ کر لیا جیسا کہ ہوا کا رخ بتا رہا ہے تو صدیوں سے اپنے حقوق کی بازیابی پر عورت کو مرد کا شکر گزار نہیں ہونا پڑے گا کیونکہ بقول میری بیٹی ادیبہ اشرف کے، "کوئی فاتح اپنے مفتوح کا کبھی اس لئے شکر گزار نہیں ہوا کہ اس نے اس سے شکست کھائی ہے۔"

عورت اور پردہ

سرحد اسمبلی کی قرارداد

سابقہ صفحات میں اس گفتگو کے بعد عورت کے سلسلہ میں دوسرا اہم مسئلہ پردہ ہے چنانچہ مارچ ۱۹۸۶ء میں پاکستان کی سرحد اسمبلی نے جو قرارداد منظور کی وہ اسی کے متعلق تھی اور وہ یہ کہ "مسلمان عورتوں پر پابندی لگادی جائے کہ وہ اپنے چہرے اور سینے ڈھانپ کر گھروں سے باہر نکلا کریں۔" جبکہ اخبارات کی رپورٹ کے مطابق اس قرارداد کی منظوری پر اسمبلی کی خواتین ارکان نے احتجاجی واک آؤٹ کر دیا۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۸۶-۳-۵)

ہمارا خیال ہے کہ اسمبلی کی ان خواتین ارکان کو احتجاجی واک آؤٹ کرنے کی بجائے قرارداد پاس کرنے والے حضرات سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے تھا کہ وہ برائے کرم سب سے پہلے پردہ کے قرآنی احکام کا مفہوم واضح کریں تاکہ پردہ کی متعین تعریف کے پیشِ نظر اس مسئلہ کو جذباتی رنگ دینے کی بجائے اس کی افادیت سے استفادہ کیا جاسکے۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوا البتہ ۱۰ مارچ ۱۹۸۶ء کو روزنامہ جنگ کے حوالے سے بعض خواتین نے جن خیالات کا اظہار کیا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہاں درج کر دیا جائے۔
صوبائی وزیرہ ساجدہ نیّر عابدی نے کہا کہ "میں سمجھتی ہوں خواتین برقع پہن کر ہی پردہ میں آسکتی ہیں۔ اس کی کوئی مثال اسلام میں نہیں ملتی۔ اگر برقع ضروری ہوتا تو حج کے موقع پر اس کو لازمی کیوں نہیں قرار دیا گیا۔ حالانکہ اس وقت بہت سے نامحرم بھی موجود ہوتے ہیں۔

انہوں نے کہا کہ آج تک جتنی بھی بڑی بڑی اسلامی خواتین پیدا ہوئی ہیں انہوں نے برقع نہیں پہنا تھا مگر انہوں نے پردہ کیا تھا۔ انہوں نے شریعت کے مطابق اپنا جسم ڈھانپا تھا۔ جن خواتین نے محاذِ جنگ پر نمایاں خدمات انجام دیں وہ بھی برقع پہن کر نہیں لڑیں۔ سرحد والوں نے جو قرارداد منظور کی ہے، اس کے پیچھے بھی کوئی ہاتھ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے گھروں کا سکون برباد کرنا چاہتے ہیں۔"

ہوں نے مزید کہا " جو لوگ خواتین کو پابند کرنے کے لیے شور کر رہے ہیں وہ دراصل ان کی صلاحیتوں سے خائف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر عورتیں ان کے مقابلے پر آگئیں تو وہ ان سے اچھا کام کر سکتی ہیں" اور پھر کہا " اسلام میں آنکھ، کان، زبان وغیرہ کا پردہ ہے۔ ہر چیز کو قیامت کے دن حساب دینا ہوگا آنکھ، زبان، کان وغیرہ گواہی دیں گے کہ کوئی برائی کی ہے یا نہیں اس لیے مرد اور عورت پر لازم ہے کہ وہ انہیں نیک کاموں کے لیے استعمال کرے " انہوں نے کہا کہ " عورتوں کے مردوں کے شانہ بشانہ کام کے بغیر یہ ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ صنعتی سیاسی اور معاشرتی ترقی میں دوسری ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کر سکیں تو پھر ہمیں بھی عورتوں کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا ہوگا ورنہ گاڑی نہیں چل سکے گی۔"

صوبائی اسمبلی کی رکن اور ممتاز دانشور بشریٰ رحمٰن سے جب پوچھا گیا کہ اسلام میں پردے کا حقیقی تصور کیا ہے کیونکہ بعض حلقوں کے مطابق عورتوں کا گھروں سے نکلنا بھی بے پردگی کی علامت ہے اور پھر اسی طرح مردوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ وہ نظریں نیچی رکھا کریں۔ انہوں نے کہا :

" پاکستان ایک زرعی ملک ہے جس کی ۸۵ فیصد کے قریب آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ جن کی خواتین زراعت اور معاشی ترقی میں ہاتھ بٹاتی ہیں اس لیے ملک کی نصف آبادی پر نافذ ہونے والے اس مجوزہ قانون پر ریفرنڈم کے ذریعے توثیق حاصل کی جائے۔"

طاہرہ نعیم نے کہا کہ :

" مرد اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں اور یہی بات ان کی کمزوری کی واضح دلیل ہے۔ اگر وہ خواتین کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس طرح کی پابندیاں لگائیں۔ اسلام میں ایسی نماز کی اہمیت ہے جس میں انسان کا ذہن خدا کے علاوہ کہیں اور نہ ہو۔ میں حیران ہوں کہ پاکستان جیسے ملک میں اس قسم کی فرسودہ باتیں جنم لے رہی ہیں۔ اور عورت جو کہ معاشرہ کا ایک اہم حصہ ہے اس کو چاروں طرف سے دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے اس کے لیے ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ کبھی عائلی قوانین اور کبھی آدھی گواہی کا مسئلہ انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ وہ خواتین جو ہمارے حقوق کی حفاظت کے لیے اسمبلیوں میں گئی ہیں ان کو چاہیے کہ وہ اپنی کرسیاں سنبھالنے کے بجائے خواتین کے حقوق کے لیے لڑیں۔"

کونسلر راحت عزیز نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ :

"قانون یا قرارداد پاس کرنے والوں کو پہلے پردہ کی نوعیت واضح کرنی چاہیئے۔ اگر وہ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق پردہ چاہتے ہیں تو اس کو بھی واضح کریں۔ اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ خواتین برقع پہن لیں تو ایسے پردہ کا کیا فائدہ جس میں منہ تو چھپا ہوا ہو لیکن جسم نظر آرہا ہو اور فیشن کے مطابق برقعہ ڈھلتا جا رہا ہو۔ ہمارے معاشرے میں ہر خاتون کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ بے پردگی نہ کرے اور شرم و حیاء کے دائرے میں رہے۔ لیکن اگر بے پردہ خواتین کے لیے سزا مقرر ہو رہی ہے تو ان مردوں کے لیے بھی سزا مقرر ہونی چاہیئے جو لنگا ہیں اٹھا اٹھا کر خواتین کو دیکھتے ہیں۔"

کونسلر نسیم لودھی نے کہا کہ:

"خواتین کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے اور فی الوقت ملک کی ترقی کے لیے خواتین کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا ہے اور اگر پابندیوں کی آڑ میں خواتین کو مفلوج کرنا ہے تو ہم موجودہ زمانے کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ مرد خواتین کی قابلیت سے خائف ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کو پیچھے رکھ کر مکمل طور پر اپنی اجارہ داری قائم کریں۔ ۱۴ سو سال پہلے بھی اسلامی ریاستوں میں خواتین کام کرتی تھیں۔ گو اس وقت بھی بے پردہ خواتین کو سزا دینے کا تصور نہیں تھا۔"

پردہ کے سلسلہ میں منظور ہونے والی قرارداد کے متعلق مذکورہ بالا خواتین نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور لگائی جانے والی بے جا قسم کی پابندیوں پر جس قسم کے خیالات اور خدشات کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ سوچنے والے ذہن خواہ عورتوں کے ہوں یا مردوں کے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔—— چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۸۶ء کو پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت اور نامور صحافی جناب پروفیسر وارث میر صاحب نے ان عوامل کی نشاندہی اپنے اس مضمون میں بھی کی تھی جو "حقوقِ نسواں کی اسلامی تحریک" کے زیرِ عنوان روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت میں شائع ہوا۔ آپ نے لکھا تھا:

"پاکستان بننے کے بعد اسلامی سیاست کے متعدد علمبرداروں نے مسلمانوں کی غلبۂ اسلام کی دیرینہ آرزو کو اپنی جماعتوں کے ملی فیسٹو[لہ] کے طور پر استعمال کیا لیکن ان کی اسلام پسندی... جسے وہ اساس پسندی کہنے پر اصرار کرتے ہیں... غیر ملکی مفادات کی کشمکش میں ایک فریق اور دھڑے کی سیاست کی علامت بن کر رہ گئی اور اپنے نتائج کے طور پر اسلام کے حرکی اور انقلابی پہلوؤں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت

لہ منشور

ہوئی - یہ ایک ایسے عقل دشمن، پُر اسرار اور عجیب و غریب اسلام کی تحریک ہے، جس نے عورت کو عملی زندگی کے ہر دائرے سے خارج کرنا اپنا مقصدِ خاص قرار دے رکھا ہے۔ یہ تحریک پاکستان اور دوسرے مسلمان ملکوں میں کسی عورت کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں جس کی گود میں کوئی بڑا سائنس دان، کوئی انقلابی فلسفی یا کوئی بڑا فنکار اور سیاستدان پروان چڑھ سکے یا جو خود سیاست میں رہنمائی کرسکے - اس تحریک کو ایسی عورتوں کی ضرورت ہے جو خود بھی بند ذہن کی ہوں اور اپنی اولاد کو بھی ایسا متشدد اور بند ذہن بخشیں جو اغیار کے مفادات کی جنگ میں اپنے جسم و جاں اور جذبوں کو ایندھن کے طور پر جھونکتے رہنے کو جہادِ زندگانی تصور کرے - اس تحریک کے پروگرام کا اولین اور اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ عورت کو مغلوب رکھو کیونکہ عورت کو آزاد کیا گیا تو ایک اسلامی معاشرے پر عورت . . . یعنی فتنہ و فساد کو غلبہ حاصل ہو جائے گا اور اسلام کی عظمت کا جھنڈا تو اسی صورت میں بلند رہ سکتا ہے اگر عورت کی ذات میں کارفرما " ابلیسی " قوتوں کو گھر کی چار دیواری میں جکڑ کر رکھا جائے۔" اس تحریک کے مذہب پرست فلسفیوں کو یہ دھڑکا بھی ہے کہ مسلمان عورت نے انجینئر، وکیل، ڈاکٹر، ماہر نفسیات، سائنس دان، فلسفی، استاد یا پائلٹ بننا شروع کر دیا تو کل کلاں یہ عورت قرآن فہمی کا دعویٰ بھی کرنے لگے گی اور اگر یہ ہو گیا تو پھر مرد کے مقابلے میں عورت کی "کمتری" کو اسلامی جواز مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر مرد کی پاک دامنی کی تان عورت کے چہرے پر نقاب ڈالنے پر ہی ٹوٹتی ہے لیکن اس کے برعکس جہاں تک اس کی اپنی نگاہوں کی خیانت اور دل میں گذرنے والے خیالات کا تعلق ہے، اس کے متعلق بہت کم غور کیا جاتا ہے جبکہ علامہ اقبال نے بہت پہلے کہہ دیا تھا ؎

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہبان ہے فقط مرد!

پردہ اور قرآن حکیم

جہاں تک پردہ کے سلسلہ میں عورت کے لیے قرآنی احکام کا تعلق ہے تو ہمارے ملک کی جانی پہچانی شخصیت اور قرآن حکیم کی طالبہ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ اپنے ایک مضمون "عورت کی حفاظت" میں رقم طراز ہیں کہ:

• قبل اس کے کہ پردہ کے متعلق قرآنی تعلیم سے رہنمائی لی جائے۔ ہمارے لیے یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں رسولِ اکرم ؐ کی اوّلین مخاطب قوم کا تمدن کیا تھا اور ان کی معاشرت کس سطح پر تھی۔ قرآنِ کریم سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ اُجڈ اور جاہل و سرکش قوم تھی جسے تہذیب و شائستگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں آدابِ معاشرت کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک سمجھانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وحی کے ذریعے یہ احکام بھی نازل ہوئے کہ چیخ چیخ کر باتیں نہ کرو۔ اکڑ اکڑ کر نہ چلو۔ دوسروں کے ہاں اجازت لے کر جاؤ۔ دوسروں کے ہاں سے کوئی چیز لینی ہو تو دروازے سے باہر آواز دے کر مانگو وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح انہیں مہذب افراد معاشرہ بنانے کے لیے تدریجی تعلیم و تربیت دی گئی۔ لیکن ان لوگوں میں بہت سے منافقین بھی تھے جو مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے شرانگیزی پھیلاتے تھے۔ خاص طور پر عورتوں کے معاملے میں وہ بہت فتنہ خیز واقع ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ ایسا طرزِ عمل آسان بھی ہوتا ہے اور مہلک بھی۔ اس موقع پر سورہ احزاب میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ؐ سے فرمایا کہ" اپنی بیویوں۔ بیٹیوں اور مومنین کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے کپڑوں کے اوپر جلباب پہن لیا کریں۔" اور اس حکم کی توجیہہ بھی ساتھ ہی کر دی۔ ارشاد ہوتا ہے ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۔ بات یہ تھی کہ جب خواتین باہر نکلتیں تو منافقین ان کو تنگ کرتے جب ان سے کہا جاتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو وہ یہ جواب دیتے کہ ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا نہیں۔ ان کی اس حجت کو پورا کرنے کے لیے مومن خواتین سے کہا گیا کہ تم جلباب پہن کر باہر نکلو اس سے تم پہچانی جاؤ گی کہ تم شریف عورتیں ہو اور وہ تمہیں ستائیں گے نہیں اور اس سے اگلی ہی آیت میں ہے کہ اگر تمہاری اس احتیاطی تدبیر کے بعد بھی یہ لوگ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے مجرموں جیسا برتاؤ کرو۔ قرآنِ کریم کی بیان کردہ روشِ منافقین سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عورتوں کے گھروں سے باہر نکلتے وقت خاص احتیاط برتنے کی تلقین و تاکید اس معاشرے کے خصوصی حالات کا تقاضا تھا اور ہر دور میں ایسے ہی خصوصی حالات میں اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

اصل چیز قرآنی تعلیم کی روح اور بنیاد ہے جو ہمیشہ غیر متبدل رہے گی بس اس پر عمل پیرا ہونے کے ذرائع حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کی روشنی میں پردہ کے قرآنی مفہوم سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ اس کے تعلق سے سورہ نور میں پہلے مردوں کو غضِ بصر (نگاہیں نیچی رکھنا) اور تحفظِ عصمت کا حکم دیا گیا ہے اور بعد میں عورتوں کو۔ نگاہیں

نیچی رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی نگاہوں کو آوارہ اور بے باک نہ ہونے دیا جائے ۔ انہیں بے حیائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ اسی لیے عورتوں سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنی زینت و آرائش کی نمائش نہ کریں۔ بجز ان مقامات کے کہ جن کا ظاہر ہونا ناگزیر ہو۔ جیساکہ فرمانِ ربی ہے یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ۔ اسی مقصد کے لیے سورہ احزاب میں خمار اور جلباب کے استعمال کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس زمانے میں عرب میں ان کا رواج تھا۔ جلباب ایسا کپڑا ہوتا تھا جسے دوسری جگہ جاتے وقت اوپر سے پہن لیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ خواہ خمار یعنی سر کی چادر سینے پر ڈال لی جائے اور خواہ اوپر سے جلباب پہن لی جائے اس میں منہ چھپانے کا کوئی قرینہ نہیں۔ اگر منہ چھپانا ہی مقصود ہوتا تو مردوں کو تو غضِ بصر کا حکم نہ دیا جاتا۔ اگر معترضین کے نزدیک چہرہ ہی سب سے نمایاں مقامِ زینت ہے تو قرآن نے پہلے یہ کہا ہے کہ جو مقامات کھلے رہتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں اور چہرہ ہی کھلے رہتے ہیں اور ان کا کھلا رہنا ناگزیر ہے۔ اور پھر اس نے خمار اور جلباب کو پہننے کا جو طریق بتایا ہے اس سے چہرہ کھلا رہے گا چھپے گا نہیں۔ اس سے یہ حق بات سامنے آتی ہے کہ چہرہ چھپانا منشائے قرآن نہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بعینہٖ اسی زمانے کے جلباب اور خمار کے مطابق ہی چادر یا اوڑھنیاں پہنی جائیں۔ قرآن کا مقصد تو یہ ہے کہ باہر نکلتے وقت نمودِ زینت مقصود نہ ہو۔ اور اس کے لیے جس قسم کا کپڑا بھی موزوں رہے پہنا جائے۔ لباس کی وضع اور تراش خراش اندازِ معاشرت کے مطابق ہوتی ہے اور اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ مگر قرآنی اصول ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ یعنی حیا اور شائستگی کا دامن چھٹنے نہ پائے۔ قرآن کریم نے زیب و زینت کو حرام قرار نہیں دیا۔ اس لیے کہ زیب و زینت سے اپنے جذبۂ تحسین و حسن کو تسکین ملتی ہے اور حسن و جمال کو پسند کرنا ہر باذوق انسان کا وصف ہے لیکن زینت و آرائش کے تعلق سے قرآن یہ بھی تاکید کرتا ہے اور ہدایت دیتا ہے کہ اسے عہدِ جاہلیہ کے جذبۂ تبرج کا آلۂ کار نہ بنا لیا جائے۔ تبرج اس نمود و نمائش زینت کو کہتے ہیں جس سے قلب و نگاہ آلودہ رکھنے والے افراد کے جذباتِ نفسانی بے قابو ہونے لگتے ہیں۔

قرآنِ حکیم مومن مردوں اور مومن عورتوں کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ۔ یعنی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں یہ ہے آن کا فیصلہ لیکن قرآن پر بظاہر ایمان رکھنے والوں کا فیصلہ یہ ہے کہ تحفظِ عصمت کا مطالبہ صرف

عورت سے کیا جائے گا۔ مرد سے نہیں۔ اور اسی کو عورت کی حفاظت کہا جاتا ہے اسی لیے عصمت کے لفظ کو عورت کے ساتھ ہی چسپاں کر دیا گیا ہے۔ باعصمت یا اس کے برعکس عصمت فروش عورت ہوتی ہے مرد نہیں ہوتا۔ چنانچہ عورت یا عورتوں کے تحفظِ عصمت کا تو پرچار ہوتا ہے لیکن مردوں سے تحفظِ عصمت کا مطالبہ کرنے کی نہ کسی میں توفیق ہوتی ہے نہ اس کے لیے کوئی تحریک چلائی جاتی ہے۔ جبکہ قرآن میں تحفظِ عصمت کا حکم کسی جگہ بھی صرف عورتوں کے لیے نہیں آیا نہ ہی غضِ بصر کا قانون صرف عورتوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس لیے کہ معاشرے کی اصلاح یا بگاڑ کا دارومدار ہمیشہ مرد و عورت دونوں پر ہوتا ہے۔ لیکن جہاں مردانہ معاشرہ کی کلیتًہ عملداری ہو وہاں دن رات یہی پروپیگنڈا جاری و ساری رہتا ہے کہ اس معاشرہ کو عورتوں کی بداخلاقی و بے راہروی نے تباہ کر دیا ہے۔ بجائے اس کے بدکرداری کا جو عملی ارتکاب مردوں کی طرف سے ہوتا ہے اسے مرد کیونکر تسلیم کرلے۔ اس نے تو یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ عورتیں معاشرے میں بدنہادی پھیلا رہی ہیں۔ یہ معاشرے کے لیے دیمک ثابت ہو رہی ہیں۔ اس لیے انہیں گھروں کے اندر بند کر دو کہ چادر اور چار دیواری کے تحفظ کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ یعنی عورت کی حفاظت ہو نہ ہو اسے تحفظ ملے نہ ملے چادر اور چاردیواری محفوظ ہو جائے۔ کوئی پوچھے جب عورتوں کے گھروں سے باہر نکلنے پر اس مردانہ معاشرہ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو پھر گھروں کے اندر رہتے ہوئے انہی کے وجود سے مردوں کے یہ گھر کیونکر سلامت رہ سکتے ہیں یا رہ چلتے ہیں؟ آیئے! اپنی سوچ کا رُخ بدلیں مرد کے ساتھ عورت کو بھی انسان سمجھیں تاکہ وہ بھی محفوظ زندگی بسر کر سکے۔"

ڈاکٹر خالدہ ترین کا تجزیہ

مملکتِ پاکستان کی ممتاز ماہرِ نفسیات ڈاکٹر خالدہ ترین سے

ایک انٹرویو کے دوران جب سوال کیا گیا کہ:

"ہمارے معاشرے میں خواتین کی نفسیاتی بیماریوں کی وجہ کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا:

جواب: "سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عورت کو وہ مقام اب تک نہیں ملا، جو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا تھا یعنی کہ برابری۔ عورت اور مرد کے ذہن میں کوئی فرق نہیں ہے عورت بھی ہر چیز کو اتنا ہی محسوس کر سکتی ہے جتنا کہ ایک مرد۔ لیکن ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں سمجھا جاتا یہاں مرد تو اپنی زندگی اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق گزار سکتا

ہے لیکن عورت کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کی آزادی کا حق نہیں دیا جاتا۔ جب آپ کسی جذبے کو دباتے ہیں تو اس کی وجہ سے نفسیاتی بیماریاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔"

اور اس تفاوت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج عورت سب سے زیادہ نفسیاتی مریض ہے لہٰذا گھروں کی خاموش، پُرسکون اور مدھم رفتار زندگی ایک خواب پریشان بن گئی ہے۔

عورت کی دیت

اس کے بعد جہاں تک عورت کی دیت کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

اہلِ عرب کے اساتذہ

دمشق یونیورسٹی کے شعبہ "فقہ اسلامی و ادیانِ عالم" کے ڈین اور شامی پارلیمنٹ کے ڈپٹی سپیکر اور اردن کے نامور فقیہہ احمد الحضری نے اپنے ہاں عورت کی دیت کو مرد کی دیت کا نصف قرار دیا ہے اور اس کے علاوہ سعودی عرب کی سپریم جوڈیشری کونسل نے اپنے ایک اجلاس میں جس میں ریاض اور مکہ مکرمہ کے کورٹ آف اپیل کے دونوں چیف جج مدینہ منورہ اور دمام کے شرعی ہائیکورٹوں کے سربراہ اور دیگر قانون دان شریک ہوئے، اپنے ایک اجلاس میں پورے غور و خوض کے بعد ۶ ذوالقعدہ ۱۳۹۰ھ کو یہ متفقہ فیصلہ جاری کیا تھا کہ:

"قتلِ خطا دیت کی مقدار ۲۴ ہزار ریال اور قتلِ عمد اور شبہ عمد میں دیت کی مقدار ۲۷ ہزار ریال ہوگی اور مسلمان عورت کی دیت مسلمان مرد کی دیت کا نصف ہوگی۔"

(بحوالہ "النظام القضائی الاسلامی" تالیف ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدالعزیز القاسم طبع اوّل قاہرہ ۱۹۷۳ء — نیز حوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ اگست ۱۹۸۴ء)

اور اس سلسلہ میں امام شافعی رح کا فرمان یہ ہے کہ:

"مجھے قدیم اور جدید دور کے اہلِ علم میں سے ایک عالم ایسا معلوم نہیں ہے جس نے عورت کی نصف دیت کے بارے میں کوئی اختلاف کیا ہو اسی طرح جراحات یعنی زخموں کی دیت بھی نصف ہے"

(بحوالہ "کتاب الام" از امام شافعی۔ طبع بیروت ۱۹۷۳ء جلد ۶ صفحہ ۱۰۶)

اور عالمی شہرت کے حامل فقیہہ اور شام کے سابق وزیر انصاف ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا نے انکشاف کیا ہے کہ دیت اور قصاص کے قانون میں خاطر خواہ تبدیلیوں کے بعد یہ قانون پاکستان میں نفاذ کے لیے بالکل تیار ہو گیا ہے۔ جسے بعض

علماء کے سوا تمام متعلقہ حکام اور فریقوں نے قابلِ قبول قرار دے دیا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ موصوف صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی دعوت پر دیت و قصاص کے قانون کے بارے میں اپنی سفارشات مکمل کرنے کے بعد اردن روانہ ہونے سے قبل اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر محمد صالح ظفر اور اظہار بھٹی پر مشتمل جنگ کے پینل کو خصوصی انٹرویو دے رہے تھے۔ اس انٹرویو میں آپ نے فرمایا کہ:

"عورت کی نصف دیت اس کی سماجی ذمہ داریوں کے حساب سے ہے اور عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہوگی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر اسرار احمد کی تحریر

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے عورت کے بارے میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ "عورت کی شہادت نصف ہے اسی لیے اس کا ووٹ بھی آدھا ہے۔ لہٰذا ملکی معاملات میں اسے کسی قسم کی رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔" (دیکھئے ماہنامہ میثاق، مدیر ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ۵ جولائی ۱۹۸۲ء)

یہ تو ہے عورت کے بارے میں ان کا طریقِ استدلال جبکہ اپنے بارے میں وہ اس طرح استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: "ٹیلی ویژن مطلقاً حرام ہے۔ کیونکہ ٹیلی ویژن میں کیمروں کی مدد سے تصویر دکھائی جاتی ہے اور تصویر با جماع امت حرام ہے لہٰذا ٹیلی ویژن بھی حرام کے دائرے میں ہے۔" اس فتویٰ کے بعد جب ان سے ان کے اپنے پروگرام "الہدیٰ" کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "ٹیلی ویژن ہے تو حرام کے دائرے میں لیکن ہر حرام میں کچھ استثناء بھی ہوتے ہیں۔ "الہدیٰ" اس حرام میں ایک استثناء ہے اسی لیے جائز ہے۔ (تصویر اور حجاب کے اسلامی احکام اور ٹیلی ویژن ڈاکٹر اسرار احمد، ماہنامہ میثاق اگست ۱۹۸۲ء) (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

علاوہ ازیں عورت کی سربراہی کے سلسلہ میں جنگ پینل کو انٹرویو دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کہا کہ: "اسلامی ممالک میں عورت کی سربراہی اسلام کی تعلیمات اور رُوح کے منافی ہے"۔ لیکن اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ: "گو اس بارے میں قرآن مجید میں واضح الفاظ میں ہدایات نہیں ہیں لیکن حدیث میں وضاحت کے ساتھ اس مسئلے کے بارے میں ہدایت موجود ہے کہ "وہ قوم فلاح نہیں پا سکتی جو عورت کو اپنا سربراہ بنائے۔"

یاد رہے کہ قرآن حکیم میں واضح طور پر موجود ہے کہ جس سوسائٹی کا ممبر مرد بن سکتا ہے اس سوسائٹی کی عورت بھی ممبر بن سکتی ہے۔"

علامہ اقبال نے سچ کہا تھا کہ ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت روایات میں کھو گئی!

روزنامہ جنگ لاہور نے مورخہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو جو اداریہ سپردِ قلم کیا اس میں عورت کی دیت کا ذکر کرتے لکھا تھا کہ :

عبدالستار خاں نیازی کی اپیل

" کالعدم جمعیتِ علمائے پاکستان کے ایک ممتاز رہنما اور عالم دین مولانا عبدالستار خان نیازی نے ایک مجلس مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے حکومت پر زور دیا ہے کہ وہ عورت کی دیت کے مسئلہ پر گومگو کی پالیسی ترک کردے اور قطعی فیصلے کے لیے قومی اسمبلی میں ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کرکے وفاقی شرعی عدالت کے ججوں سے قطعی فیصلہ حاصل کیا جائے۔

عورت کی دیت کے مسئلہ نے خاصی پیچیدہ صورت اختیار کرلی ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء نے اس پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے بھی ان کے نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ظاہر ہوتا ہے حکومت نے قاضی عدالتوں کا قیام بھی محض اسی لیے التوا میں ڈال رکھا ہے کہ اس مسئلہ پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا۔ خود خواتین کی بعض تنظیموں کی طرف سے بھی، جو پاکستان میں خواتین کے حقوق کی علمبردار ہیں، اس مسئلہ پر اضطراب کا اظہار کیا گیا اور بعض مقامات پر احتجاجی جلوسوں کی صورت میں انہوں نے اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا۔ ان حالات میں مولانا عبدالستار خاں نیازی کی یہ تجویز یقیناً قابلِ توجہ ہے کہ حکومت کو اس مسئلہ پر گومگو کی پالیسی ترک کردینی چاہیئے اور تمام مکاتبِ فکر کے ممتاز علمائے کرام کو ایک مذاکرے کی صورت میں اظہارِ خیال کی دعوت دینی چاہیئے جو اجتہاد کی ایک صورت ہوگی۔ اس طرح ان علمائے کرام اور وفاقی شرعی عدالت کے جج صاحبان سے رائے حاصل کرکے کسی حتمی فیصلہ پر پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔"

سو جہاں تک اس اداریئے کی روشنی میں علماء کرام کی رائے معلوم کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے تو اس پریس کانفرنس کا مطالعہ ہی کافی ہے جس کی روئیداد روزنامہ جنگ لاہور بابت ۹ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔

علماء کرام کا فتویٰ

لاہور (اسٹاف رپورٹر) قرآن وسنّت اجماع صحابہ وائمہ اور امت کے عمومی عمل کی روشنی میں قتل خطاء کی صورت میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہے اور اس کے خلاف مؤقف امت میں میں انتشار وافتراق کا بیج بونا، نئے مذہب کی بنیاد رکھنا اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی

راہ میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔ ان خیالات کا اظہار چاروں مکاتب فکر کے علماء نے ایک مشترکہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ پریس کانفرنس سے مجلس شوریٰ کے ارکان مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا محمد مالک کاندھلوی، میاں فضل حق، کالعدم جماعت اسلامی کے رہنما مولانا خلیل حامدی، جامعہ نظامیہ کے سربراہ مفتی عبدالقیوم ہزاروی، دیال سنگھ ریسرچ سیل کے ڈائریکٹر مولانا متین ہاشمی، جامعۃ المنتظر کے مولانا موسیٰ بیگ اور محمد عباس نقوی، جماعت اہل حدیث کے رہنما حافظ عبدالقادر روپڑی، دارالعلوم مردان کے مولانا گوہر الرحمان، دارالعلوم منصورہ کے مولانا عبدالمالک، مرکزی زکوٰۃ کونسل کے رکن مفتی غلام سرور قادری نے خطاب کیا جبکہ جماعت اہلِ سنت کے مولانا شبیر ہاشمی، مولانا شمس الزمان، مولانا محمد شبیر نقشبندی، مولانا محمد صدیق ہزاروی، دارالعلوم منصورہ کے پروفیسر عثمان غنی، جامعہ اشرفیہ کے مولانا عبدالرحمان، اور دیگر علماء بھی اس موقع پر موجود تھے۔ پریس کانفرنس میں ایک مشترکہ بیان پڑھ کر سنایا گیا جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کی دیت قرآن و سنت اور اجماع کی روشنی میں نصف ہے اور جو لوگ مرد کے مساوی دیت کے قائل ہیں ان کے پاس کتاب و سنت، صحابہ، تابعین اور آئمہ اربعہ میں سے کوئی دلیل نہیں۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ اس ضمن میں اسلامی نظریاتی کونسل اور مجلس شوریٰ میں پاس کیے گئے مسودہ قانون کے خلاف کوئی سازش برداشت نہیں کی جائے گی۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ عورت کی پوری دیت کے قائل ہیں وہ لادین عناصر کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں جسے ملک کے تمام مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء مسترد کرتے ہیں۔

اس موقع پر مجلس شوریٰ کے رکن مولانا محمد مالک کاندھلوی نے کہا کہ جو باتیں اسلاف نے طے کر دی ہیں ان میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اس طرح کی اجازت دے دی گئی تو پھر عورت کی نصف شہادت اور نصف میراث پر بھی بحث و تنازعہ کا آغاز ہو جائے گا۔ جامعۃ المنتظر کے مولانا موسیٰ بیگ نے بتایا کہ شیعہ کتبِ فکر میں عورت کی نصف دیت نصِ قطعی اور فتویٰ سے ثابت ہے۔ مولانا مالک کاندھلوی نے بتایا کہ شاہ فہد کے مشیر معروف دوالیبی اور کویت کے معروف عالمِ دین مصطفےٰ الزرقا نے بھی ۱۰ اکتوبر کو راجہ ظفر الحق کے سامنے ہمارے دلائل سے اتفاق کیا تھا۔ مفتی محمد حسین نعیمی نے انکشاف کیا کہ کچھ عرصہ قبل پروفیسر طاہر القادری نے انہیں یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہونے کا فتویٰ دے کر پاکستان میں تاریخ ساز کردار ادا کر سکتے ہیں اور آپ کی واہ واہ ہو جائے گی لیکن میں نے ان کا یہ مشورہ خوفِ خدا کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ مولانا گوہر الرحمان نے کہا کہ مخصوص حالات میں جج عورت کی نصف دیت کے علاوہ ورثاء کو بطور جرمانہ مزید رقم بھی دلوا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیوروکریسی ملک میں

اسلامی نظام کا نفاذ نہیں چاہتی۔ مولانا عبدالقادر روپڑی نے کہا کہ اگر عورت کو مرد کے برابر درجہ دے دیا گیا تو مردوں کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے گا۔ مولانا تسین ہاشمی نے کہا کہ عورت کی نصف دیت سے عورتوں کو فائدہ ہوگا کیونکہ مرد کے قتلِ خطا کی صورت میں معاوضہ اس کی بیوہ کو ملے گا جبکہ عورت کی دیت اس کے شوہر کو ملے گی۔ مفتی محمد حسین نعیمی نے واضح کیا کہ حکمران اسلامی نظام کے نفاذ میں مخلص نہیں اور وہ اقتدار کے تحفظ کے لیے اس طرح کے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔"

"انجانو! گویا عورت کی جان کی قیمت مرد کی جان کی قیمت سے نصف ہوگی۔" (العجب)

ارشاد احمد حقانی صاحب کی پکار

عورت کی یہی وہ مظلومیت ہے جس کے تحت جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے روزنامہ جنگ مورخہ ۵ جون ۱۹۸۴ء کو اپنے کالم میں لکھا تھا کہ :

"عورت کی گواہی اور اس کی دیت کے بارے میں احکام اسلام میں جو گنجائش عورت کے مساوی معاشرتی مرتبے کے حوالے سے موجود ہے، اسے نظر انداز کر کے ایسے فقہی فیصلوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے جن سے ان کے اندر احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری بیدار ہو۔ ایسا ان مذہبی حلقوں کے زیرِ اثر ہوا جو ماضی کے فقہی نظائر کو حقیقی اور ناقابلِ تغیر قرار دیتے ہیں۔ نیز جو شعورِ ذات کے اس احساس سے بے خبر ہیں جو جدید تعلیم نے عورت کو دیا ہے۔"

عورت کی دیت کا یہی وہ مسئلہ ہے جس کے سلسلہ میں ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنے شمارہ بابت اکتوبر ۱۹۸۴ء میں تحریر کیا تھا کہ :

"ذرا سوچیے"

جرمِ قتل کی سزا (دیت اور قصاص) کے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی رپورٹ مرتب کر کے ۱۹۸۰ء میں پیش کر دی (وہ رپورٹ کب سے زیرِ ترتیب تھی، اس کا ہمیں علم نہیں)۔ چار سال تک وہ رپورٹ مختلف منتخب کمیٹیوں کے ہاں چکر لگاتی رہی۔ آخر کار مجلس شوریٰ نے اسے منظور کر کے صدرِ مملکت کے پاس بھیج دیا۔ اس میں بھی متنازعہ سوال (یعنی عورت کی دیت کا مسئلہ لاینحل چھوڑ دیا گیا کہ اسے سپریم کورٹ طے کرے گی۔ کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار (سٹار) کی ۱۳ راگست کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ صدرِ مملکت نے صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ دیت اور قصاص کے مسئلہ پر وہ مختلف علماء سے مشورہ کرنا چاہتے ہیں جن میں پاکستان، عرب، یورپ کی بعض نامور شخصیتوں کا نام

لیا گیا ہے۔ گویا اب بھی یہ سوال فیصلہ کن مرحلہ پر نہیں پہنچا۔ ابھی یہ مزید مشورہ اور غور و خوض کا محتاج ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب یہ سطور قارئین کی نظروں سے گذریں اس وقت تک اس باب میں مزید پیش رفت کیا ہوگی لیکن اس وقت تک تو بہرحال واضح ہے کہ پانچ چار سال کے عرصہ میں یہ طے نہیں پا سکا کہ اسلام کی رُو سے جرمِ قتل کی سزا کیا ہوگی؟ یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ اس تمام عرصہ میں یہ شرط لازم تھی کہ قانون کتاب و سنّت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں حقیقت یہ سامنے آئی ہے کہ کتاب و سنّت کی صورت یہ ہے کہ وہ سالہا سال کی کاوشوں کے باوجود ایک قانون کے متعلق بھی کوئی متفق علیہ فیصلہ نہیں دے سکی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قانون کب بنے گا اور جب بنے گا تو حدود کے قوانین جیسا ہی ہوگا جن کے متعلق خود صدرِ مملکت نے فرمایا تھا کہ وہ ناممکن العمل ہیں۔ لیکن اس دوران میں کیا اربابِ فکر و نظر کے لیے یہ سوچنے کا مقام نہیں کہ ہماری قانون سازی کی راہ میں وہ بنیادی سقم کیا ہے جس سے یہ صورت پیدا ہو رہی ہے۔ اس سوال کا جواب اگر قرآن سے پوچھا جاتا تو وہ فقروں میں اس کا حل بتا دیتا اور حل بھی ایسا جس میں کوئی اختلاف نہ ہوتا کیونکہ اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں (۴/۸۲) اور وہ اسلامی قانون ہوتا ہے کیونکہ خود خدا نے فرما دیا کہ اسلامی قانون وہی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ (۵/۴۴)

ایسا ہونے نہیں دیا جائے گا

لیکن مذہبی پیشوائیت قوم کو کبھی اس طرف نہیں آنے دے گی۔ یہ صورتِ حالات اُس وقت تک باقی رہے گی جب تک کوئی قرآنی مملکت وجود میں نہیں آتی۔ یہ مملکت ان تمام اور دیگر مروّجہ قوانین کا جائزہ قرآن کی روشنی میں لے گی اور جو قوانین قرآن کے خلاف ہوں گے انہیں منسوخ کر کے ان کی جگہ قرآنی قوانین نافذ کر دے گی۔ اس نکتہ کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیے کہ جو قانون قرآن کے مطابق ہوگا، وہ از خود کتاب و سنّت کے مطابق ہونے کی شرط پوری کر دے گا اور جو قرآن کے خلاف ہوگا، وہ سنّت کے بھی خلاف ہوگا۔"

عورت کی خرید و فروخت

باب زیرِ نظر کی ابتدا ہوئی تھی غیر مسلم عورتوں کی خرید و فروخت سے جنہیں جنگ کے دوران گرفتار کر کے اپنے قبضے میں لے لیا جاتا ہے اور اب ختم کی جاتی ہے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اس عورت کی خرید و فروخت پر جو آزاد بھی

ہے اور اپنی بھی ۔ اس کے لیے روزنامہ جنگ لاہور بابت ۲۶ جون ۱۹۸۶ء کا اداریہ پیش خدمت ہے۔

(پاکستان میں) عورتوں کا معاشرتی مقام

" (WOMEN) ویمنز فورم لاہور نے ایک قرارداد میں سندھ میں عورتوں کی غلامانہ خرید و فروخت کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حیثیت گھر کے بھانڈے برتنوں کی سی ہے اور بھیڑ بکریوں کی طرح ہماری منڈیاں لگ رہی ہیں۔ اسی قسم کے ایک واقعے پر وزیر اعظم نے انکوائری کا حکم جاری کیا مگر تجربہ شاہد ہے کہ انکوائری اور رپورٹوں سے کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ عورتوں کی حالت کچھ سندھ ہی میں خراب نہیں پورے ملک میں ان کی کوئی معاشرتی حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی۔ وہ دن میں سولہ گھنٹے کام کرتی ہیں جس کا انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا اور کھانے کو بھی انہیں دوسروں کا ہی بچا کھچا ملتا ہے۔ زندگی بھر انہیں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال بھی کوئی نہیں کرتا۔ وہ معاشرے میں دوہرے ظلم کا شکار ہیں۔ ایک وہ اپنے خاندانوں کی تنگ دستی اور قانون کی چکی میں پستی ہیں۔ دوسری طرف خاوندوں اور باپوں اور بھائیوں کے مظالم سہتی ہیں۔ شریعت بھی انہیں ترکے میں حصّہ دیتی ہے مگر رواج نے ان سے سب کچھ چھین لیا ہے پھر ان سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو تیار کریں اور بچوں میں زندگی کی اعلیٰ اقدار پیدا کریں۔ وہ دو بگڑ جائے تو باپ ماؤں کو طعنہ دیتے ہیں۔ ملزم ہاتھ نہ آئے تو پولیس ماؤں بہنوں اور بیویوں کو تھانوں میں بلا کر ذلیل اور بے عزت کرتی ہے۔ لڑکیاں پیدا کریں تو قصور وار وہی ہیں۔ چنانچہ مرد یا تو ان کی تو بین کرتے ہیں یا دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ علمائے کرام بھی ان کی دستگیری نہیں فرماتے۔ ان کی ترقی کے دروازے بند ہیں۔ ان کی تعلیم اور صحت کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ ایمان ان کے مردوں سے زیادہ مضبوط ہیں مگر مردوں کو گمراہ کرنے کے الزامات انہی پر لگائے جاتے ہیں۔ اسراف اور رشوت خوری کی ترغیب بھی انہی سے منسوب کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت ایک کمزور مخلوق ہے مگر اس کی جسمانی اور روحانی قوت برداشت کو دیکھتے ہوئے اسے کمزور نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ماؤں بہنوں کی تکریم کریں۔ انہیں بھانڈے برتن اور بھیڑ بکری کی بجائے انسان سمجھیں اور انہیں وہ تمام حقوق دیں جو انسان ہونے کی رعایت سے انہیں ملنے چاہئیں۔ مگر رویئے تبدیل کرنے کے لیے عورتوں اور روشن خیال مردوں کو مل کر ایک طویل جدوجہد کرنی پڑے گی۔ "

اس اداریے کے بعد ایک مزید خبر اور وہ یہ کہ: " سندھ کے ایک گاؤں میں ایک وڈیرے نے اپنے قرضدار

وہ ان کی بیوی کو بیچ کر پیسے وصول کر لیے۔[۱] (بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۰ جون ۱۹۹۶ء)

اس کے بعد پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت کشور ناہید نے عورت کی موجودہ صورتِ حال کی تصویر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ:

مزید تصویر کشی

"۷۰ فیصد سے زیادہ تنازعات میں سسرال والے یا شوہر جہیز کا سامان خرد برد کر لیتے ہیں۔ جہیز واپس لینے سے متعلق قانونی پیچیدگیاں بھی تاخیر کا باعث بنتی ہیں۔ طلاق کے سلسلے میں ۶۷.۳ فیصد خواتین کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو بیشتر خواتین کے سر پر طلاق کی تلوار کبھی طعنے، کبھی دھمکی، کبھی تنبیہہ، کبھی باقاعدہ حاکمیت کے اعلان کے طور پر لٹکتی رہتی ہے۔ اس سروے کے مطابق بیشتر خواتین طلاق کے خوف سے بھی، ہر قسم کے مظالم سہتیں اور سماجی طور پر "بدنامی" سے بچنے کی خاطر، خاموش سلگتی رہتی ہیں۔ طلاق حاصل کرنے والیوں میں سے ۸۵ فیصد کو جہیز واپس نہیں ملتا۔ ۹۰ فیصد خواتین کو حق مہر نہ شادی کے بعد ملتا ہے اور نہ اس کی واپسی کا کوئی طریقہ وضع کیا جاتا ہے۔ صرف ۲۹.۶ فیصد خواتین نے حق مہر کے لیے دعویٰ کیا اور باقی خواتین نے اسے کارلاحاصل قرار دے دیا۔ دوسری شادی کرنے والے شوہروں میں سے ۷۰ فیصد نے اپنی پہلی بیوی اور بچوں کی کفالت سے منہ موڑ کر، دوسری شادی کی۔ ۶۰ فیصد شادیاں پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر ہوئیں۔ خواتین کو انٹرویو کر کے پتہ چلا کہ ۸۴.۶ فیصد نان و نفقہ، ۴.۶ فیصد بچوں کا خرچہ، ۷۰.۵ فیصد جہیز، ۶۷.۳ فیصد طلاق، ۶۶.۶ فیصد جیب خرچ، ۵۶.۴ فیصد حق مہر، ۴۴.۶ فیصد کمسن بچوں کی تحویل، ۲۵.۳ فیصد شادی فسخ کرنے اور ۲۲.۶ فیصد دوسری شادی کی اجازت سے متعلق معاملات زیرِ سماعت رہتے ہیں۔"

(بحوالہ "عورت، خواب اور خاک کے درمیان" از کشور ناہید)

مغرب میں عورت کی حالت

جہاں تک مغربی عورت کی حالت کا تعلق ہے تو وارث میر صاحب کے کہنے کے مطابق آج مغربی عورت عائلی عدم تحفظ کا شکار ہو کر ایک نہ ختم ہونے والی سرد جنگ میں مبتلا ہے۔ آپ اپنے ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کے جنسی استحصال کو جنم دیا ہے اور

---

[۱] قرض کی وصولی کے لیے عورت ہی فروخت ہوئی ہے۔ مرد نہیں۔

ماہرینِ عمرانیات جانتے ہیں کہ موجودہ مغربی تہذیب میں عورت کی ذلّت ورُسوائی کی داستان کا آغاز مشینی اور صنعتی دور کے بعد ہوتا ہے اور بچی کھچی روایات اور قدروں کا جنازہ دو عالمی جنگوں نے نکال دیا۔ اس کے بعد وارث میر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :

"دیارِ مغرب میں چند سال گزار کر وطن واپس آنے والے ایک صاحب نے راولپنڈی سے بذریعہ خط ہم تک مغرب کے ایک نوعمر دانشور کا ایک فقرہ پہنچایا ہے . . . . " اگر آج آرچ بشپ آف کنٹر بری یہ فتویٰ دے کہ عورت کو راہِ راست پر لانے کے لیے اگر مرد مجبور ہو جائے اور عورت کو قتل کر دے تو ایسا قتل از روئے عیسائیت جائز ہے، تو یقیناً ولایت کے ہر کونے سے انہیں لاکھوں کی تعداد میں شکریہ کے تار اور خطوط موصول ہوں گے۔"

خوف وحزن کی تباہ کاریاں

یہ ہے خوف وحزن کے غیر فطری ماحول کا وہ تانا بانا جسے آج کے مرد نے عورت کے چاروں طرف بُن رکھا ہے۔ کاش اس مردِ باشرف کو اس چیز کا احساس ہوتا کہ (بقول جناب حافظ محمد یعقوب صاحب)

"ڈر یا خوف ایک ایسا منفی جذبہ ہے جس کی وجہ سے لاتعداد منفی جذبے جنم لیتے ہیں۔ جو انسان کو انسانی سطح پر قائم رکھنے میں مخل ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کی ترقی کی رفتار کو کم کر کے روک دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ پھر اس کو اس حالت میں پہنچا دیتے ہیں کہ یہ مکمل گمنامی کی جگہ پر چلا جاتا ہے۔ احساسات اور تخیلات کی دنیا میں ڈر اور ڈر کے جارحانہ اثرات انسانی شخصیت کو مفلوج کر کے رکھ دیتے ہیں اور پسماندگی کے شکار پھر ایسے انسان کو اپنے سفر کی سمت تک دکھائی نہیں دیتی۔

ڈر اور اس کی ان گنت قسمیں انسانی ذہن پر جو نمودار ہو کے افراد کے سوچنے کی صلاحیت کو مجروح کرتی رہتی ہیں وہ انسانوں کو باتدبیر نہیں ہونے دیتیں۔ یہ بدنمائی کی علامت ہوتی ہیں اور ان سے مادی بہتری کے سامان بھی بالآخر تباہ ہو کے رہ جاتے ہیں بدقسمتی اور بے حسی، انسان کی اس مشترکہ تہذیب میں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا گھر کر جاتی ہے۔

ڈر جسے انسان اپنے آپ پر طاری کر لیتا ہے، اس سے یہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ

اپنے آپ کو پست قامت کر لیتا ہے اور کر گزرنے کی صلاحیت سے باوصف نہیں رہتا۔ بلکہ زندگی کے اکثر معاملات میں وہ ہاتھ ڈالنے ہی سے کتراتا ہے۔ اہلیت کے باوجود اوسان اُس کے خطا رہتے ہیں۔ جو کچھ ملا ہوتا ہے اسی پر وہ اکتفا کر کے بیٹھ جاتا ہے اور زندگی کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو جو سرگرم عمل رکھنے میں اُس کا ہاتھ بٹاتی ہیں، چھوڑ دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔

خوف و ہراس ہی کی وجہ ہوتی ہے کہ ایک انسان بروقت کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کس چیز کو اپنائے اور کس چیز کو چھوڑے، یہ کرے یا وہ کرے۔ شک و شبہات طرفین سے اسے گھیرے میں لیے ہوتے ہیں اور وہ بے یقینی اور بے اطمینانی کے عالم میں مختلف جواز پیدا کر کے اپنا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی تنقید کے ڈر سے منہ چھپاتا ہے اور کبھی ناکامی کے اندیشوں سے کسی کام کے کرنے کی ابتدا ہی نہیں کرتا۔ انجانے ڈر سے کبھی ضرورت سے زیادہ محتاط ہوتا ہے اور کبھی مناسب وقت کے انتظار میں سالہا سال گزار دیتا ہے اور ہاتھ تک نہیں لگاتا۔

ذمہ داری کو قبول کرنے سے ڈرنا اور جوش و خروش کے جذبے سے عاری ہونا بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کے اعصاب پر خوف سوار ہوتا ہے۔ تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے پس پردہ ڈر جو کسی نہ کسی شکل میں اپنا قدم جمائے ہوتا ہے، وہی احساسِ کمتری کا موجب بنتا ہے جس سے انسان سر اُٹھا کے چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ بے قصور ہونے کے باوجود از خود بے قرار رہتا ہے اور بے چینیوں کو گلے لگائے پھرتا ہے۔ بلندیٔ افلاک تک اڑان کرنے والا یہی انسان۔ منفی طرزِ عمل سے صعوبتیں اُٹھاتا ہے اور اپنا تشخص تک کھو دیتا ہے۔ زمانے کی گردش میں یہ اپنی اساس بھی بھول جاتا ہے ڈر اور خوف کی کیفیت میں انسان ابن الغرض بن جاتا ہے اور خود پرور اور محوِ بالذات ہو کر رہ جاتا ہے۔

المختصر ڈر اور خوف کی غارت گری سے اعتماد بالذات، تسبیب، استعدادِ تخیل، پروازِ فکر، ولولہ، شریفانہ احساسات، خود انضباطی، غیرت مندی، تسخیر نفس، دل ربائی، ہوشمندی، تقدیس کی تمام صفات پامال ہو جاتی ہیں۔" (بحوالہ تعمیر انسانیت۔ اگست ۱۹۸۶ء)

ضمناً اس حقیقتِ حال کے باوجود کس قدر قابلِ تاسف ہے یہ بات کہ خدا کی ایک صفت۔

نذیر کا ترجمہ ہمارے ہاں ڈرانے والا کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کا مفہوم ڈرانے والا نہیں بلکہ آگاہ کرنے والا ہے۔ یعنی اصل معاملہ خدا سے ڈرنے کا نہیں بلکہ قرآن مجید کے اصول و ضوابط کی فرمانروائی قبول کرنے کا ہے۔

اوپر بیان کردہ جہالت کی ان دُکھ بھری داستانوں کے بعد جہاں تک ہمارے ہاں تعلیم یافتہ گھرانوں میں مقام عورت کا تعلق ہے تو جناب پرویز صاحب (مرحوم) نے اس کی تصویر کشی اپنی تصنیف "کتاب التقدیر" میں کچھ اس طرح کی ہے کہ:

ہمارے مہذب معاشرہ کی حالت

"یہ جو ہمارے نہایت مہذب اور تعلیم یافتہ خاندانوں میں، نہایت خوبصورت، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار منتخب کردہ، لڑکی کو اپنے ہاں بیوی یا بہو بنا کر لانے کے عوض، کوٹھی، موٹر کار، ہزار ہا روپیہ کے جہیز کا مطالبہ ہوتا ہے، یہ (عورت کے متعلق) کس قسم کے "حسنِ خیال" کا غماز ہے، اس سے تو ہم اس دورِ جہالت سے بھی پست سطح پر گر گئے ہیں۔ اُس زمانے میں عورت کو خرید کر لایا جاتا تھا، تو اس کی کچھ قیمت ادا کی جاتی تھی۔ اب ہم عورت کو لاتے ہیں تو اس کے ساتھ لاکھوں روپے کا مطالبہ بھی کرتے ہیں۔ پھر ہمارے مروجہ قوانین کے تحت (جنہیں بدقسمتی سے قوانین شریعت کہہ کر پکارا جاتا ہے)، عورت کی جو حالت ہوتی ہے، اس کی مثالیں ہر دو قدم پر ملیں گی۔ ان قوانین کی رُو سے مرد کو اس کا ہر وقت حق حاصل ہوتا ہے کہ جب جی چاہے، اس کو طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کرے۔ اس کے برعکس، عورت پر ہزار مظالم ہوں، اسے جابر و ظالم خاوند کے استبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑتے ہیں اور وہاں ان بیچاری شریف زادیوں کا جو حشر ہوتا ہے، اس کے احساس سے یہ مظلوم، انصاف حاصل کرنے کے مقابلہ میں، گھروں میں دم گھٹ کر مر جانے کو ترجیح دیتی ہیں۔ اگر یہ کسی طرح ہزار دقتوں کے بعد، چھٹکارا حاصل بھی کر لیتی ہیں تو ان کے لیے بقایا زندگی گزارنے کا سوال اور بھی وجہِ سوہانِ روح ہو جاتا ہے۔

اس میں معاشی مسئلہ ہی وجہ پریشانی نہیں ہوتا، حفاظت اور عزت کا سوال بھی ہزار خوف پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں، عورت کی حفاظت کے لیے مرد کی چھت لاینفک سمجھی جاتی ہے۔ اگر عورت کسی طرح اپنی طبیعی حفاظت کا انتظام کر بھی لے تو بھی اسے اس بات کا احساس ہر وقت بھیلاوے کی طرح ڈراتا رہتا ہے کہ اگر کسی بدمعاش نے کسی وقت بھی ایک بات

اس کے خلاف مشہور کردی تو وہ معاشرہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔ اور بدمعاشوں کی زبان کا روکنا کسی کے بس کی بات بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو پھر بھی دُور کی داستان ہے۔ آج کل ہمارے ہاں یہ عام ہو رہا ہے کہ ایک معصوم، بھولی بھالی بچی اسکول یا کالج جا رہی ہے اور راستے میں اسے غنڈے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس مظلوم و معصوم کو ماں باپ، بہ ہزار دشواری واپس لے بھی آتے ہیں تو وہ کہیں کی نہیں رہتی۔ اس کی بقایا ساری زندگی جہنم میں گزرتی ہے۔"

یہ سب کچھ کیا

عورت کے سلسلہ میں جو کچھ سابقہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے، اس سے قارئین نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے عورت کو کس حال میں رکھا اور کس رتبہ سے اُسے جانا۔ اصل تو یہ ہے کہ مجموعی طور پر مرد نے اس حقیقت کو ہمیشہ نظرانداز کیے رکھا کہ (بقول پرویز صاحب کے) "اگر کوئی راہرو اپنے رفیقِ سفر کے پاؤں میں بیڑی ڈال دے تو پھر اس کی اپنی رفتار میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔" لیکن افسوس باوجود اس ناقابل تردید اصول کے ہم نے عورت کو لونڈی بنا کر اس کے ساتھ تمتع کی اجازت ہی نہ دی بلکہ اسے سربازار فروخت بھی کیا۔ اس کے ساتھ کم سنی کی عمر میں شادی کرنے کا فتویٰ ہی صادر نہ فرمایا بلکہ (بسلسلہ نکاح) اپنی انا کی خاطر اس کی مرضی کے خلاف اسے زندہ درگور بھی کیا۔ رزق کے معاملہ میں عورت کا کفیل (اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ) بننے کی بجائے اسے زندگی بھر اپنا محکوم اور غلام بنائے رکھا اور خود کو اس پر داروغہ متصور کیا۔ مرد کے مقابلے میں اس کی آدھی گواہی کے غلط تصور کو ہی عام نہیں کیا بلکہ اس کی جان تک کی بھی نصف قیمت مقرر کی۔ اسے اپنے گھر میں بسانے کی خاطر جہیز کی شرط بھی رکھی اور اس کے بعد پانچ پانچ، چھ چھ بچوں کے ساتھ دفعتاً اُسے گھر سے نکل جانے پر ایسا مجبور کیا کہ اس کی آہ و فغاں کی بلبلاہٹ اور قلبی اضطراب کی سسکیاں، آئندہ آگے آنے والے نامعلوم حالات کی اندوہناکیاں اور بچوں کی پتھرائی ہوئی معصوم آنکھیں بھی اُسے متاثر نہ کر سکیں۔

اس سے بھی آگے

بات یہاں ہی ختم نہ کی بلکہ دنیا بھر میں گلی گلی، کوچہ کوچہ اور قریہ قریہ سکرین کے پردے پر اُسے اتنا نچایا اتنا نچایا کہ یہ فعل مرد اور عورت کی زندگی کا معمول بن کر رہ گیا۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی جی نہ بھرا تو اس کے ساتھ ایک ایسا بہیمانہ سلوک کیا کہ جو انسانی تاریخ میں شاید ہی کیا گیا ہو۔ چنانچہ زندگی کے اس محسن کو چادر اور چاردیواری سے باہر بالکل برہنہ کرکے سربازار گھسیٹنے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ اور شرم محسوس نہ کی اور پھر اس انسانیت سوز فعل کو کئی ایک جگہ دہرایا۔ یہی وہ الم انگیز واقعات تھے، جن کا تذکرہ روزنامہ جنگ لاہور کے مدیر نے بڑے کرب کے ساتھ مورخہ ۴ جولائی ۱۹۸۵ء کو اپنے اداریہ میں کچھ اس طرح کیا کہ:

عورت کی برہنگی

"نواب پور کے بعد شجاع آباد کے نواح سے خواتین کو برہنہ کر کے سرعام گھسیٹنے کی ایک اور خبر آئی ہے۔ جس کے مطابق بستی لطف پور میں خنجروں اور کلہاڑیوں سے مسلح ایک زمیندار نے جس کے ساتھ تیس افراد کی ایک جمعیت تھی اراضی کے تنازعے پر اپنے مخالف کے گھر پر حملہ کر کے ان کی تین معصوم بیٹیوں اور بیوی کے کپڑے پھاڑے اور انہیں گھسیٹ کر سرعام لے آئے۔ مظلوم خواتین نے جب اپنے ہاتھوں سے اپنی برہنگی چھپانے کی کوشش کی تو انہیں مارا پیٹا گیا۔ دو نوجوانوں نے غنڈوں کو روکنا چاہا تو انہیں گولیاں ماری گئیں اور ان میں سے ایک کی ٹانگ بھی کاٹ دی گئی۔"

جنگ کا اداریہ

مدیر جنگ نے اس کے بعد لکھا کہ:

"نواب پور کے بعد اس قسم کے بعض اور واقعات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں (لیکن) یہاں بھی علمائے کرام اور عورتوں اور مردوں کی فلاحی تنظیمیں جو فحاشی اور عریانی کے خلاف سراپا احتجاج ہیں اس قسم کے واقعات پر چپ رہتی ہیں نواب پور کے واقعے پر اخلاقی قدروں کی علمبردار کسی جماعت یا کسی صاحب الرائے اور نیک نہاد عالم نے کوئی مہم نہ چلائی تھی اخبارات ہی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تھی"

اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"اس قسم کی وارداتیں خانپور، فیصل آباد، اوکاڑہ میں بھی ہوئیں۔ چند روز پہلے اندرون (سندھ) سے بھی ایسی خبر آئی ہے۔ مصلحین معاشرے کی خرابیاں دور کرنے کے سلسلے میں بیانات جاری کرتے نہیں تھکتے اور بگاڑ کی ساری ذمہ داری عورتوں کے محرم اور برقعے کے بغیر گھر سے نکلنے یا کام پر جانے پر ڈالتے ہیں مگر لطف پور کی بدنصیب خواتین تو اپنے گھر کے اندر محرموں کی موجودگی میں ننگی کر کے بازار لائی گئی ہیں۔"

جناب منیر احمد صاحب کا دردِ دل

یہی وہ الم انگیز واقع تھا جس پر جناب منیر احمد صاحب عرف منو بھائی نے اپنے کالم "گریبان" میں تحریر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"ہمارے معاشرے میں نواب پور اور شجاع آباد واقعات سے بھی زیادہ گھناؤنے واقعات اور حادثات ہوتے رہتے ہیں مگر ان کی خبریں چادروں اور چار دیواریوں سے باہر نہیں آتیں کیونکہ ان چار

دیواریں پر مصلحتوں کے تلے پڑے ہوتے ہیں یا یہ چار دیواریاں اتنی اونچی ہوتی ہیں کہ ہم ان کے اندر جھانک ہی نہیں سکتے۔"

قرآن حکیم نے اس قسم کے افعال کے نتیجہ میں جو ذلت آمیز سزا تجویز کی تھی اس کے متعلق فرمایا تھا کہ:

"یہ ایسی ذلت ہوگی جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سیاہ راتوں کی کالک مل دی ہو۔" (۲۷/۱۰)

حرفِ آخر اور علاج

حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں اس کرۂ ارضی کو نوعِ انسانی جیسے عظیم خاندان کے لیے ایک گھر کی حیثیت حاصل ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ (بقول ثریا عندلیب صاحبہ کے) کہ "انسانیت کی تشکیل میں گھر بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور تعلقاتِ انسانی میں خاندان کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ لیکن جو معاشرہ اس اساس و بنیاد کو قائم نہیں رکھتا (جس کی مثال یورپ اور روس ہیں) تو وہ آئندہ نسلوں کو آوارہ و بے مرکز بنا دیتا ہے جبکہ گھر اور خاندان کو بنانے اور سنوارنے میں عورت کی حیثیت مرکزی ہے (اس لیے) عورت ہی (اس) گھر کو جنت بنا سکتی ہے (لہٰذا) آنے والی نسلوں کو باوقار انسان بنانے میں عورت کا بڑا حصہ ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ نپولین نے کہا تھا کہ "اگر تم مجھے بہترین مائیں دو تو میں تم کو بہترین قوم دوں گا۔" اور قرآن حکیم نے تو اس نسخہ کو ۱۴سو سال پیشتر لفظ زوج[1] میں بیان کر دیا تھا۔ بہرحال مندرجہ بالا تصریحات سے قارئین نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ مرد نے اپنے اس رفیقِ سفر کے پاؤں میں کس کس طریق سے کس کس قسم کی آہنی بیڑیاں پہنا رکھی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفرِ زندگی میں اس کی اپنی رفتار بھی وہ نہ رہی جتنی کہ ایک آزاد ساتھی کے ساتھ چلنے میں ہو سکتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کا یہ مرد اس مظلوم عورت کو قرآن حکیم کی طرف سے عطا کردہ آزادی کا حق کب عطا کرتا ہے یا عورت از خود اپنے ان پامال حقوق کی بازیابی کے لیے کب اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جس دن بھی انسان نے اس زندہ حقیقت کو سمجھ لیا یا پالیا وہی دن نوعِ انسانی کے لیے حقیقی آزادی اور سرفرازی کا دن ہوگا اور اسی دن یہ انسان اپنے آپ کو انسان کہلانے کا حق دار ہوگا۔

عظمتوں کو جنم دینے والی "صنفِ نازک" کی اس جگر خراش داستان کے بعد اب ہم معاشی نظام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس نے روزِ اوّل تا ہنوز زندگی کے سوتوں کو اس قدر خشک کر رکھا ہے کہ کرۂ ارض کے کونے کونے کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

پھول پریشاں، غنچے حیراں، کلیاں سوزاں، شبنم گریاں

لہٰذا آئندہ باب میں ہم اسی موضوع کے متعلق قرآنِ حکیم سے استفادہ کریں گے۔

---

[1] یعنی کسی شے کا وہ حصہ جس کے بغیر وہ شے بذاتِ خود مکمل نہ ہو سکتی ہو۔

(تکملہ)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ

(سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۰)

اور ہم نے ساری اولادِ آدم کو معزز و مکرم بنا کر پیدا کیا ہے

THERE IS NO CONCEPT OF انسان IN WHICH WOMAN IS NOT INCLUDED

عورت

ماں
بہن
بیٹی
بیوی

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (سورۃ الاحقاف، آیت ۱۵)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ اس کی ماں نے شدید تکلیف کے ساتھ اسے اٹھائے رکھا اور سخت تکلیف کے ساتھ وضع حمل کیا۔ اس کا پیٹ میں اٹھائے رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے تک جاری رہا۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (سورۃ الروم آیت ۲۱)

اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے خود تمہاری نفسوں میں سے تمہارے جوڑے پیدا کیے ہیں تاکہ تمہیں ان کی طرف سکون و اطمینان حاصل ہو سکے اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ

مرد عورتوں کے معاش کے کفیل ہیں

(سورۃ النساء آیت ۳۴)

NO WOMAN IS INFERIOR TO A MAN —— MOST HONEST WAYS TO DEAL WITH THE WOMAN IS TO RECOGNIZE HER AS HUMANBEING AND GIVE HER PERSONAL FREEDOM

حُورٌ - مرد اور عورت دونوں

زَوْجٌ - ساتھی شریک

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

(سورۃ البقرۃ - آیت ۱۸۷)

وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

عفت و عصمت کی حفاظت — افزائش نسل — باہمی سکون

نکاح کا باہمی معاہدہ

زوج - مرد | زوج - عورت

ازواج مطہرہ ——— پاکیزہ جوڑے

لِّلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ

(سورۃ النساء آیت ۳۲)

مردوں نے جو کمایا اس میں ان کا حصہ ہے اور عورتوں نے جو کمایا اس میں ان کا حصہ ہے

MAN AND WOMAN GO HAND IN HAND
THIS IS RULE OF NATURE

جب ان میں کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم سے سیاہ پڑ جاتا ہے۔ وہ غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے ... کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں

(سورۃ النحل آیت ۵۸)

خدا کے تخلیقی عمل میں نہ مادہ کو اولیت حاصل ہے اور نہ نر کو مادہ پر کوئی فوقیت - امتیازی خصوصیات میں دونوں ایک دوسرے سے کم نہیں

NATURAL DRIVE
SHOULD NOT TAKE UN-NATURAL PROP:RTIONS

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً

(سورۃ النساء، آیت ۳)

اگر کبھی حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور عورتیں زیادہ رہ جائیں اور تمہیں ڈر ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہیں ہو سکے گا تو ان یتیموں اور بیواؤں کی حفاظت اور پرورش کی خاطر دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے نکاح کرو۔ لیکن اگر تم دیکھو کہ اس طرح عدل قائم نہیں رکھ سکو گے تو ایک کافی ہے۔

(REDUCE SUFFERING — NOT SEX PERVERSION)

(انجمن تحقیق و تدریس علوم و ادبیات قرآن)

(حافظ [illegible])

تصویر کا دُوسرا رُخ

وضعی روایات کے تحت نئی نسل کو دی جانے والی تعلیم

نئی نسل کو سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کس قسم کی تعلیم دی جا رہی ہے، اس کا اندازہ آپ لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، گوجرانوالہ، بہاولپور، بلوچستان، کراچی اور آزاد کشمیر بورڈ کے جدید ترین سلیبس کے مطابق شائع ہونے والی درج ذیل کتاب کے اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

نام کتاب : تنویر الاسلام

موضوع : تہذیب و تمدن، سیرتِ رسول ؐ و خلفائے راشدین (برائے ایف اے (علوم اسلامیہ)

از : پروفیسر چوہدری غلام رسول گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائینز لاہور
پروفیسر محمد رفیق صاحب ایم۔ اے گورنمنٹ کالج جہلم
مسز شیریں سلیم ایم۔ اے لاہور کالج برائے خواتین لاہور
پروفیسر صابر حسین

(۴) حسنِ سلوک اور عورت کی پیدائش :

حقوقِ زوجین کے سلسلہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے حسنِ سلوک اور بھلائی کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"تم کو عورتوں سے بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے لہٰذا اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ کے لیے کجی رہ جائے گی اس لیے عورتوں کے متعلق نصیحت قبول کرو" (بخاری) (صہ ۱۲۹)

(۵) "شوہر پر بیوی کے لیے سامانِ طہارت و لطافت کا مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو صاف ستھری رکھ سکے اور خاوند کے دل کو زیادہ لبھا سکے۔" (صہ ۱۳۰)

چودھواں باب

قرآنِ حکیم کا معاشی نظام

ربٰو کی قرآنی تعلیم

قرآن کریم کے معاشی نظام کی بنیاد ربٰو کے خاتمے پر ہے۔ جس کی تعریف اس طرح فرمائی کہ "اگر تم نے کسی کو کچھ دیا تو تم اس سے صرف اپنا اصل زر واپس لے سکتے ہو اس سے زائد کچھ نہیں۔" (۲/۲۷۹)
ظاہر ہے اس سے زائد وصول کرنا خواہ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ ہو ربٰو کہلائے گا۔ لیکن اس قرآنی تعلیم کے برعکس ہم ربٰو کے غلط مفہوم میں کہاں تک آگے نکل چکے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباسات دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

سُود سے بچنے کا حیلہ

ہمارے ہاں مفتی محمد ابوسعید غلام سرور قادری صاحب ایم اے اپنی کتاب "معاشیات نظام مصطفیٰ" میں سُود کے گناہ سے بچنے کے لیے تدابیر درج فرماتے ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) "قرض دینے والا اپنی کوئی چیز ایک سو دس روپے میں قرض لینے والے کے ہاتھ اُدھار بیچ دے۔ قرض لینے والا اس چیز کو کسی اور کے ہاتھ ایک سو روپے میں نقد بیچ دے۔ قرض دینے والا اس چیز کو اس شخص سے سو روپے میں خرید لے۔ اس طرح وہ چیز بھی قرض دینے والے کو واپس مل گئی اور قرض لینے والے کے ذمے ایک سو دس روپے واجب الادا ہو گئے۔

(۲) قرض دینے والا قرض لینے والے کے ہاتھ ایک چیز دو سو روپے میں اُدھار بیچ دے۔ پھر اس چیز کو اس سے ایک سو روپے میں نقد خرید لے۔ قرض لینے والا مقررہ مدت کے بعد اس شے کی قیمت کے طور پر اسے دو سو ادا کر دے گا۔ اس طرح ایک سو روپیہ زائد مل

جائے گا جو بالکل حلال اور طیّب ہوگا۔

امام ابو یوسف کا مسلک

ان تدابیر کو درج کرنے کے بعد جناب مفتی صاحب لکھتے ہیں :

" امام ابو یوسف ایسے کاروبار کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس سے منافع بھی ہوگا اور ثواب بھی ملے گا۔ ثواب اس لیے کہ اسے سود جیسے حرام سے بچنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

(بحوالہ فتاویٰ قاضی خاں مع عالمگیری جلد دوم صفحہ ۲۸۰/۲۷۹)

اور اس کے بعد فاضل مصنف نے ارشاد فرمایا کہ :

" لیکن افسوس کہ مسلمان دینِ فطرت کی ایسی تدابیر سے غافل رہ کر سود جیسی لعنت میں مبتلا ہیں"۔

پروفیسر طاہر القادری اور نظامِ سود

اسے کہتے ہیں حرام سے بچنے کے لیے "شرعی حیلے" جس کا سہارا لیتے ہوئے جناب پروفیسر محمد طاہر القادری صاحب (ایم اے اسلامیات ۔ ایل ایل بی ۔ بانی و سرپرستِ اعلیٰ مرکزی ادارہ منہاج القرآن پاکستان) اپنے تحقیقاتی مضمون "بلا سود بنکاری خاکہ" میں لکھتے ہیں :

" کاروباری لین دین میں فقہائے کرام نے سود سے بچاؤ کے جس قدر شرعی حیلے بیان کیے ہیں ان سب میں بنیادی طور پر یہی اصول کارفرما ہے کہ قرض کو بیع کے معاملے میں بدل دیا جائے تو "احل اللّٰہ البیع وحرم الربوا" کے قرآنی ضابطے کے مطابق کم از کم سود سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بیع کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا پہلو ایک الگ توجہ طلب مسئلہ ہو سکتا ہے مگر بہرحال اسے سودی معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فتاویٰ قاضی خان، البحر الرائق، فتح القدیر، نہر الفائق، درمختار، اور فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں اس قسم کی مثالوں کا ذکر اور مسئلے کی تصریح موجود ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور بابت ۸ جون ۱۹۸۵ء)

احمد رضا خاں بریلوی

کیونکہ جناب پروفیسر صاحب کی ذات نے بقول اُن کے ــــــ "میں نے حضرت شاہ احمد رضا خاں بریلوی کے بنیادی افکار سے راہنمائی حاصل کی ہے۔" لہٰذا آپ اُنہیں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

" مولانا احمد رضا خان بریلوی سال کے وعدے پر دس روپے کے نوٹ کی بارہ روپے میں بیع کی جواز کی وجہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہاں جائز ہے جبکہ دونوں حقیقتِ بیع کا ارادہ

کریں نہ کہ قرض کا۔ اسی لیے کہ بیچنا جائز ہے۔ اصل مال میں زیادتی اور اس میں مدت کا تعین بھی جائز ہے۔" (تفہیم الفقہ۔ الفاہم۔ ۱۱۱ - ۱۱۲)

غالباً انہیں بنیادی انکار سے راہنمائی کا نتیجہ ہے کہ آپ نے اپنے اسی مضمون میں یہ بھی فرمایا کہ "قرض کو اضافے کے ساتھ واپس کرنا اچھی بات ہے۔"

جبکہ اس سے پیشتر آپ یہ بھی فرما چکے ہیں کہ:

"اولاً بنکاری کے سارے نظام کو مکمل طور پر سُود سے اس طرح پاک کرنا ہو گا کہ تمام ذرائع تموّل اور مختلف کھاتے اور سکیمیں من کل الوجود بلا سود بنیادوں پر چلائے جائیں۔ اور بالواسطہ یا بلاواسطہ ربوٰ کا کوئی عنصر۔۔۔ کسی لین دین میں باقی نہ رہے۔"

ایک سبق آموز مثال

ربوٰ ہی کے سلسلہ میں روزنامہ جنگ لاہور میں، جناب عبدالقادر حسن صاحب نے "غیر سیاسی باتیں" کے عنوان سے جو کالم سپردِ قلم کیا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے کہ شاید علّتِ مرض کو جاننے میں کوئی آسانی پیدا ہو۔ اس کالم کا عنوان تھا "ہم دو غلے ہیں" چنانچہ تحریر ہے:

"دو چار روز پہلے اخبار وں میں ایک سانپ کی تصویر چھپی ہے جس کے دو مونہہ ہیں۔ اس دو مونہہ والے سانپ کے بارے میں بتایا گیا کہ اس طرح کے سانپ نہایت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں اور ان کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ یہ جلد ہی مرجاتے ہیں۔ مختصر عمر کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اس کے دو مونہہ اور دو دماغ ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی سوچ دو ہری ہُوا کرتی ہے۔ ایک مونہہ ایک فیصلہ کرتا ہے تو دوسرا کوئی دوسرا فیصلہ کرتا ہے۔ چنانچہ اس کشمکش میں اسے بعض اوقات حادثات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ جلد ہی مرجاتا ہے۔ اس سانپ کو اگر دو دماغ لے ڈُوبتے ہیں تو جس انسان کے دو دماغ ہُوا کرتے ہیں اس کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔ اور دو رُخی اور دوغلا پن جسے منافقت بھی کہا جاتا ہے۔" اس کے بعد تحریر ہے کہ

ؔ جہاں تک احمد رضا خاں بریلوی صاحب کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنے ہاں "معاشی نظام" جیسے اہم مسئلہ کا حل ان چار نکات میں پیش کیا ہے: (۱) ان امور کے علاوہ جن میں حکومت دخل انداز ہے، مسلمان اپنے معاملات باہم فیصل کریں تاکہ مقدمہ بازی میں جو کروڑوں روپے خرچ ہو رہے ہیں پس انداز ہو سکیں (۲) بمبئی، کلکتہ، رنگون، مدراس، حیدر آباد دکن کے تونگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے بینک کھولیں (۳) مسلمان اپنی قوم کے سوا کسی سے کچھ نہ خریدیں (۴) علمِ دین کی ترویج و اشاعت کریں۔ (بحوالہ "فاضل بریلوی کے معاشی نکات"، شائع کردہ مرکزی مجلس رضا لاہور)

"ہمیں اپنے آس پاس اب نہایت واضح ہو کر نظر آ رہا ہے۔ ہمارے بنکوں میں دو کاؤنٹر پہلو بہ پہلو کھلے ہوتے ہیں۔ ان میں ایک پر غیر اسلامی بنکاری ہوتی ہے اور دوسرے پر اسلامی بنکاری، ایک پر سودی کاروبار ہوتا ہے۔ اور دوسرے پر سود سے پاک معیشت سے کاروبار کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ گویا اسلام اور کفر کو ہم ایک ہی گھاٹ کا پانی پلا رہے ہیں۔ کفر و اسلام کے اس اتحاد پر ہم فخر بھی کرتے ہیں اور اسے اسلامی معیشت کی جانب ایک مثبت اور کامیاب کوشش قرار دیتے ہیں۔ ہماری یہ دوغلی اور دو رُخی پالیسی اس وقت تین رُخ اختیار کر جاتی ہے، جب ہمیں بنک کا منیجر یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی کاؤنٹر پر کھلنے والے کھاتے درحقیقت ایک ہی ہیں۔ اور دونوں کے ذریعے جمع کیے جانے والے سرمایہ کی ایک ساتھ سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ ایک کا سود مقرر کر دیا گیا ہے اور دوسرے کا منافع مقرر نہیں ہے۔ سود کے تعین کا پہلے سے فیصلہ کر دیا گیا ہے اور روپیہ جمع کرانے والے کھاتہ دار کو علم ہوتا ہے کہ سال بعد اسے کتنا سود ملے گا لیکن غیر سودی بنکاری کھاتہ دار کو ہم سال بعد بتاتے ہیں کہ اسے کس قدر منافع دیا گیا ہے۔ اب یہ دونوں کھاتے داروں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ اسے سود سمجھیں، یا منافع یا کوئی اور اچھا سا نام دے دیں جو انہیں زیادہ پسند ہو۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۲۱ر جنوری ۱۹۸۶ء)

رفیق احمد باجوہ نے ٹھیک کہا تھا کہ ہماری بغل میں قرآن ہے اور سروں پر گمی لعنت"

سچ تو یہ ہے کہ ؎ بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
تیرے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

متضاد نظریات کا نتیجہ

بہرحال حقیقت کچھ بھی ہو ہماری پژمردہ حالت بتا رہی ہے کہ کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہے — لیکن افسوس کہ اس کے باوجود اُمتِ مسلمہ ہزار سال سے قرآن حکیم کے معاشی نظام کو عملی طور پر نافذ نہیں کر سکی اور شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ربوٰ کا وہ مفہوم متعین نہیں جو خود قرآنِ حکیم نے تصریف الآیات کی رُو سے بیان فرمایا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم پوری دیانتداری کے ساتھ رزق کے سرچشموں پر ذاتی ملکیت کے تصور پر ایمان رکھتے ہوئے محنت کے ماحصل کی بجائے روپے کے ماحصل کو بھی جائز سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سود کو بھی حرام جانتے ہیں۔ لہٰذا عملاً اور قولاً ان متضاد نظریات کے باعث ہم صدیوں سے قرآن کے معاشی نظام کی ثمرباریوں سے محروم حسرت و یاس کے مارے ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اس جہنم سے نکلنے کی کوئی تدبیر بتا سکے۔

طلوعِ اسلام اور ربوٰ

نظام ربوٰ کے سلسلہ میں ادارہ "طلوعِ اسلام" کی طرف سے جو مختصر اور جامع تعریف پیش کی گئی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قارئین کی خدمت میں پیش کر دی جائے اور وہ اس لیے کہ جس مسئلہ کو ہمارے ہاں اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے، اسے سمجھنے میں شاید آسانی پیدا ہو سکے۔ چنانچہ تحریر ہے، کہ:

تجارت کا منافع

"قرآن کریم نے لاگت پر کچھ زیادہ وصول کر لینے کو تجارت قرار دے کر اس منافع کو جائز قرار دیا تھا۔ یہ درحقیقت اس چیز کے فروخت کرنے والے کی محنت کا معاوضہ تھا۔ قدیم زمانہ میں تجارت جان جوکھوں کا کام ہوتا تھا۔ جو قافلہ ترکستان سے سامان لاد کر پہاڑوں دریاؤں، صحراؤں، جنگلوں، پُرخطر راستوں، برفانی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا مہینوں کے بعد ہندوستان پہنچتا تھا وہ جو کچھ اپنے مال پر زائد وصول کرتا تھا، وہ اس محنت کا معاوضہ تھا۔ اسے قرآن نے ربوٰ کی حد سے خارج قرار دیا تھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ ایک شخص ایک کمرہ میں میز کے سامنے بیٹھا ٹیلی فون پر سودے پر سودا کرتا چلا جاتا ہے۔ نہ حقیقتاً کچھ خریدتا ہے نہ بیچتا ہے ـــ اور اس طرح شام کو ہزاروں روپے اس کے بنک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے تجارت قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہزاروں روپے کہاں سے آتے ہیں؟ ان اشیاء کے صارفین کی ... سے۔ کیا یہ صارفین کی گاڑھے پسینے کی کمائی کو غصب کر لینے کے مترادف نہیں! ـــ لیکن مذہبی پیشوائیت کا نظام اسے ربوٰ قرار نہیں دیتا۔ وہ دوسروں کی محنت غصب کر لینے کے ان تمام طریقوں کو حلال و طیب قرار دیتا ہے، اور اس سے جب محنت کش یا صارفین غریب ہو جاتے ہیں تو ان زمینداروں، کارخانہ داروں اور اس قسم کے منافع خوروں، سوداگروں سے اپیل کرتا ہے کہ ان غریبوں کو خدا کے واسطے کچھ دے کر اپنا گھر جنت میں الاٹ کرا لیں۔ یا حج کر کے اپنے سب گناہ بخشوا لیں۔ حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ـ ان محنت کشوں کی محنت کو غصب کر کے اپنی تجوریاں بھرتے چلے جانا ایسا سنگین جرم تھا جسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت قرار دیا گیا تھا۔ غلط نظام کی عدالت چور، ڈاکو، رہزن کو مجرم قرار دے کر مستوجب سزا ٹھہرائے گی۔ لیکن اس قسم کے رہزنوں اور قزاقوں کو کسی جرم کا مرتکب قرار نہیں دے گی۔ علمائے کرام روپیہ کا سودی کاروبار کرنے والے کو جہنم کا ایندھن بتائیں گے لیکن ربوٰ کی ان دوسری شکلوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے رہنے والوں کو پکے اور سچے مومن

قرار دیں گے۔"

ربٰو حرام بھی ہے اور حلال بھی

ہماری مذہبی پیشوائیت ربٰو کو جائز تو نہیں قرار دے سکتی تھی۔ لیکن اس نے ربٰو کی تعریف ایسی کردی جس میں دوسروں کی محنت غصب کر کے لے جانا شیر مادر کی طرح حلال و طیب قرار پاگیا۔ اُن کے نزدیک اگر ایک شخص کسی کو کچھ روپیہ قرض دے تو اس اصل زر سے کچھ زیادہ وصول کرنا ربٰو ہے اور بس۔ یعنی زمیندار کا کاشتکار کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے پیدا کردہ فصل کا آدھا سمیٹ لینا ربٰو نہیں۔ صاحبِ جائداد کا مکانوں کا کرایہ وصول کرنا ربٰو نہیں۔ ایک کارخانہ دار کا ہزار ہا مزدوروں کی محنت کے ماحصل میں سے اُسے کچھ روپے روزانہ دے کر باقی سارا مال ہضم کر لینا ربٰو نہیں۔ دکاندار کا ملازم کو کم از کم اُجرت دے کر باقی سارا مال ہڑپ کر جانا ربٰو نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذہبی پیشوائیت نے ربٰو کی غلط تعریف سے ایک مختصری شکل کو چھوڑ کر ربٰو کے سارے کے سارے کاروبار کو کس طرح حلال و طیب قرار دے دیا ہے۔"[1]

علامہ اقبال اور زمینداری نظام، ڈاکٹر اسرار احمد کی نظر میں

قرآن اکیڈمی کے بانی محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے ماہنامہ "حکمتِ قرآن" کی جون ۱۹۸۵ء کی اشاعت کے صفحات ۴۳ تا ۴۵ پر زمینداری نظام کے بارے میں علامہ اقبال رح کے خیالات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ:

"میری نظر سے جب پہلی بار یہ اشعار گذرے تو یقین کیجئے میں کانپ گیا تھا۔

خدا آں ملتے را سروری داد — کہ تقدیرش بدست خویش بنوشت

باآں قومے سرو کارے ندارد — کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

ذرا دوسرے شعر پر اپنی توجہات مرتکز کیجئے۔ جس قوم کا دہقان دوسروں کے لیے کاشت کاری کر رہا ہو

---

[1] (نوٹ:- کیا مکانوں کا کرایہ سُود ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں وفاقی شرعی عدالت کے روبرو ایک درخواست کی سماعت کے دوران ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب نے فرمایا کہ "قرآن و حدیث میں مکانوں کے کرائے کا کوئی جواز نہیں ملتا" جبکہ اس کے برعکس پروفیسر طاہر القادری صاحب کا کہنا یہ تھا کہ "قرآن و حدیث میں صاف طور پر اس کی ممانعت نہیں۔ حضورِ اکرمؐ کی خاموشی جائز ہونے کی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ دکانوں کو طویل مدت کے لیے کرایہ پر دینا مناسب ہے" اور ان کے علاوہ مولانا سید متین ہاشمی صاحب نے فرمایا کہ "اسلام میں کرایہ داری کا تصور موجود ہے۔" (بحوالہ نوائے وقت لاہور ۲۲ ۔ جنگ ۲۴)

اللہ کا اُسؔ قیؔ ہے کوئی سروکار نہیں۔
یہ ہے پیامِ اقبال رحؒ۔ یہ دونوں سُود، جو ہم پر مسلط ہیں۔ ایک نقد کا سود ہے۔ دوسرا زمین کا سُود ہے۔ جب تک یہ دونوں سُود ختم نہیں ہوں گے اور ان کی جڑیں نہیں کٹیں گی۔ سرمایہ داری حقیقی اسلام کی راہ میں سنگِ گراں بنی رہے گی۔ حرام ذرائع میں امّ الخبائث ہے سُود۔ ہمارا سارا اقتصادی نظام چاہے وہ کاشت کاری کا ہو، درآمد و برآمد کا ہو، صنعت و تجارت کا ہو، بنک کاری کا ہو وہ سب کا سب سُود پر چل رہا ہے۔ علامہ اقبال رحؒ نے اس سُود کے بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

از رِبا آخر چہ مے زاید فتن کس نداند لذّتِ قرضِ حسن

اس ربا (سود) کے باطن سے تو صرف فتنے ہی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں قرضِ حسن کی لذّت سے (افسوس) کہ کوئی واقف نہیں۔ (علامہ نے سُود کے مقابلے میں قرضِ حسن کو متعارف کرایا ہے)

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ آدمی درندہ بے دندان و چنگ

اس سُود کی وجہ سے رُوح میں تاریکی آجاتی ہے اور دل پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ انسان کے اگرچہ چیر پھاڑ والے دانت اور پنجے نہیں ہوتے لیکن سود خوری کی وجہ سے آدمی درندہ صفت بن جاتا ہے۔

جب تک یہ سودی نظام بالکلیہ ختم نہیں ہوگا اس کو بیخ و بن سے اُکھاڑا نہیں جائے گا، پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام کے نفاذ کی اُمید موہوم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ ہمارے یہاں ایسے لوگ موجود ہیں، جن میں یہ ہمت ہے کہ غلط بات کو دلائل کے ساتھ غلط کہیں۔ علمائے کرام کے حلقے میں بھی ایسے بزرگ الحمدللہ موجود ہیں جو خیر خواہی اور نصح کے جذبے کے ساتھ غلط اقدامات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ پھر ہمارے یہاں دینی مزاج رکھنے والے جو اعلیٰ ماہرینِ اقتصادیات ہیں، ان کی آراء سامنے آچکی ہیں کہ موجودہ بنکاری کے نظام میں سرسری اور معمولی تغیّر و تبدّل سے اگر یہ سمجھا جائے کہ سودی نظام بالکل ختم ہو گیا یا قریب الختم ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔

رہا زمینداری کا معاملہ تو اس طرف تو ابھی کوئی توجہ ہے ہی نہیں۔ علامہ اقبال کے محبان کی بھی علامہ کی "انقلاب" والی نظم پر شاید ہی توجہ مرکوز ہوئی ہو جو "زبورِ عجم" میں

شامل ہے۔ اس نظم کا پہلا بند یہ ہے ۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشت ۔ دہقاناں خراب
انقلاب ۔ انقلاب ! اے انقلاب !

ایک بند کے اندر علامہ اقبالؒ نے دونوں شُود جمع کر دیے ہیں۔ جب تک ان کی جڑ نہیں کٹے گی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی ۔ "

طلوعِ اسلامؒ کا تبصرہ

ڈاکٹر اسرار احمد کے ان خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے " طلوعِ اسلامؒ " نے لکھا تھا :

• جس معاملے کو ہمارے علماء حضرات آج سودفتہ اردے رہے ہیں، کاش وہ اسے قیامِ پاکستان کے وقت سے ہی ایسا سمجھ کر اسے ختم کرنے کی کوشش کرتے تو آج ہمارا ملک اسلامی نظام کی برکتوں سے مالا مال ہوتا ۔ " (بحوالہ " طلوعِ اسلامؒ " بابت اگست ۱۹۸۵ء)

ارشاد احمد حقانی، جماعتِ اسلامی اور معاشی نظام

طلوعِ اسلام کا مندرجہ بالا تبصرہ کس حد تک صحیح ہے؟ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہاں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کی طرف سے لکھے گئے کالم بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور بابت ۱۳ اپریل ۱۹۸۵ء (جماعت اسلامی کے دوستوں اور بزرگوں سے) کی چند ایک سطور کا مطالعہ کر لیں جس سے یہ بات مزید نکھر کر سامنے آجائے گی کہ آج ہماری یہ حالت کیوں ہے ؟ ۔ آپ نے تحریر کیا کہ :

" امر واقع یہ ہے کہ اسلام ایک پروگریسو دین ۔ یہ حقوق یافتہ طبقہ کی بالاتر حیثیت کو تسلیم نہیں کرتا ۔ یہ ایک نجات دہندہ قوت ہے ۔ جو کمزور اور محروم طبقات کو اُوپر اٹھاتا اور انہیں یکساں مواقع کا حقدار ٹھہراتا ہے ۔ بد قسمتی سے ایک عام آدمی کی نظر میں جماعتِ اسلامی نے کبھی اسلام کو اس طرح سمجھا ہے نہ سمجھایا ہے ۔ اس کے برعکس اسے حقوق یافتہ طبقات کا محافظ اور ان کی عام طور پر استحصال پر مبنی مراعات کا پشت پناہ سمجھا جاتا ہے ۔ جماعت کے اکابرین بعض اوقات کہتے ہیں کہ ہم تو خود نچلے متوسط یا نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کس طرح حقوق یافتہ طبقات کے حامی یا محافظ یا حلیف ہو سکتے ہیں ۔ ان کی یہ بات تو ٹھیک

ہے کہ جماعت کے اکثر و بیشتر ارکان اور رہنما اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس سے وہ دعویٰ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان کا فلسفہ اور ان کا فہم اسلام ایسا ہے کہ انہیں حقوق یافتہ طبقات کا حامی و مددگار سمجھا جاتا ہے اور ان کا امیج محروم و مظلوم طبقات کے چیمپئن کا نہیں ہے۔ اصل میں جماعت نے شخصی ملکیت کے تقدس پر شروع سے اس قدر زور دیا ہے کہ انہیں نہ صرف جاگیرداری اور سرمایہ داری کا حامی سمجھا گیا بلکہ معاشی و سماجی انصاف کا دشمن بھی قرار دے ڈالا گیا۔ جماعت نے نعروں کی حد تک اب سماجی و معاشی انصاف کے مقصد کو اپنے منشور اور پروگرام میں شامل کرلیا ہے۔ لیکن یہ بات اسی طرح معلوم ہوتی ہے ہے جس طرح بعض دوسری جماعتوں نے اسلام کے نعرہ کو اپنے پروگرام کا حصہ ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔"

اس کے بعد حقانی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :

جماعت کما حقہٗ ادراک نہیں رکھتی

" سماجی و معاشی انصاف کے بارے میں جماعت کا یہ امیج کیوں ہے ؟ ' اس کی وجہ یہ ہے کہ آغاز کار ہی سے اس کی قیادت نے اسلام کو سماجی و معاشی حوالہ سے ایک انقلابی نظریہ کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس مُوقف اختیار کیا۔ مزید ستم یہ ہُوا کہ جماعت میں نئے خیالات اور جماعت کے بانی کی تشریح اسلام سے مختلف تشریح و تعبیر کا کبھی خیر مقدم نہ کیا گیا اور نہ نئے غور و فکر کا اہتمام کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت کے بانی نے اسلام کی معاشی و سماجی تعلیمات کا جو تصور پیش کر دیا، کارکنان اور رہنماؤں نے اسی کو حرفِ آخر سمجھ کر قبول کرلیا۔ اس طرح جو امیج تشکیل پذیر ہُوا اس نے مستقل حیثیت اختیار کرلی۔"

اس تحریر کے بعد جناب حقانی صاحب ایک دوسرے مسئلہ کا ذکر کرتے ہیں :

" دوسرا مسئلہ جس پر جماعت کی سوچ میں بڑی اور نمایاں (MAJOR) تبدیلی کی ضرورت ہے، وہ عالمی استعماریت کے بارے میں اس کا رویہ ہے۔ جماعت کی اولین اور موجودہ قیادت دورِ حاضر کے سنگین ترین مسئلہ یعنی نوآبادیت اور استعماریت کے مفاسد اور مضرات کو کما حقہٗ سمجھنے میں ناکام رہی۔ استعماریت جس طرح دنیا کے اربوں انسانوں کے استحصال کا سبب بن رہی ہے اور جس طرح یہ ظلم اور ظالم کے آلہ کے طور پر کام کر رہی ہے، جماعت اس

کا کما حقہٗ ادراک نہیں کر سکا۔ اس معاملہ میں اس کی سوچ، یکطرفہ، غیر متوازن، اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ وہ روسی سامراج کی تو مخالفت کرتی ہے لیکن جو سامراج عملاً اس سے بہت بھیانک اور زیادہ تباہ کن ہے۔ اس کی نہ صرف کوئی مخالفت کرتی بلکہ ایسی حکمتِ عملیاں اختیار کرتی ہے کہ ایک دنیا اسے اس کی حلیف بلکہ خدمت گذار سمجھتی ہے۔

جس طرح جماعت اسلامی یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ تو اسلام کی انقلابی و سماجی و معاشی تعلیمات کی علمبردار ہے اور اپنی مطبوعات سے ایسے فقرے نکال کر دکھا سکتی ہے کہ وہ معاشی و سماجی انصاف کو بڑی اہمیت دیتی ہے اسی طرح وہ مغربی سامراج کے بارے میں بھی بعض حوالے پیش کر سکتی ہوگی لیکن اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا امیج مغربی بالخصوص امریکی سامراج کی حلیف کا ہے۔ یہ امیج حق بجانب نہیں تو اسے غور کرنا چاہیئے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور اس کے عالمی روابط ایسے کیوں ہیں؟ جو اس کے اس امیج کو پختہ تر کرتے ہیں۔"

جماعت اسلامی اور نظام سرمایہ داری کے اس چولی دامن کا تذکرہ کرنے کے بعد جناب حقانی صاحب اس جماعت کے اکابرین کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

جماعتِ اسلامی اور دنیائے عرب

"جزیرہ نمائے عرب سارے مسلمانوں کے لیے مقدس ہے لیکن جماعتِ اسلامی سعودی عرب کے شاہی خاندان سے جو روابط رکھتی ہے اور خلیج کی بعض ریاستوں کے حکمرانوں سے اُس کے تعلقات کی جو حکایتیں عام ہیں، وہ جماعت کو نہ صرف عالمی استعماریت بلکہ ملوکیت کی ایک شکل کا بھی حلیف و دوست بنا کر پیش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی جب وہ نجی ملکیت کے تصور پر زور دیتی ہے اور سماجی و معاشی اُونچ نیچ کو فطری اور حکمتِ الٰہی قرار دیا جاتا ہے تو اس کا ایک خاص تصور پختہ و راسخ ہو جاتا ہے۔"

وزارتِ مالیات کی رپورٹ

ربوٰ، زکوٰۃ اور عشر جس پر ہمارے ہاں جس قدر اختلافات پائے جاتے ہیں اور جس کے مروجہ مفہوم میں پاکستان ہی نہیں بلکہ صدیوں سے پوری ملّتِ اسلامیہ گرفتار ہے، کی اصل حقیقت کو جاننے کے لیے حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مالیات کی طرف سے مقرر کردہ کمیٹی کی اس رپورٹ کا مطالعہ یقیناً حیرت انگیز اور

بصیرت افروز ہوگا جو اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ " دی مسلم " نے اپنی اشاعت ۶، ۷، ۱۰ور ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۸۰ء میں بالاقساط شائع کی اور جس کے چند ایک اہم اقتباسات ماہنامہ " طلوع اسلام " لاہور جنوری ۱۹۸۱ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ اس رپورٹ کے اثرات اگر آج نہیں تو کل ضرور مرتب ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ اس رپورٹ کے اگر زیادہ نہیں تو صرف دو ایک اقتباس پیش کر دیے جائیں تو اس سے جہاں زکوٰۃ اور ربوٰا کے قرآنی مفہوم کا کچھ اندازہ ہو سکے گا وہاں ذاتی ملکیت کی قرآنی حیثیت بھی واضح ہو جائے گی اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ہماری فرقہ واریت پر مبنی مروجہ تفاسیر اور ان کے عائد کردہ مروجہ قرآنی تراجم نے ہمیں کہاں لا کھڑا کیا ہے۔ رپورٹ کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے :

" ارض و سموات اللہ کی ملکیت ہے۔" (۲/۸۰)

اس کے بعد قرآن کے معاشی نظام کا مقصود و منتہا یہ بتایا گیا ہے کہ " کرہ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" (۱۱/۴) رپورٹ صفحہ ۵

دوسرے مقامات پر اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں دی گئی ہے۔

کیا پرائیویٹ پراپرٹی جائز ہے ؟

" اسلامی نظام معیشت کی امتیازی خصوصیت پرائیویٹ پراپرٹی (ذاتی املاک) کے متعلق اس کے نقطہ نگاہ میں مضمر ہے۔ اس خصوصیت کی رو سے دولت تمام کی تمام خدائی ملکیت ہوتی ہے اور انسان اس کا امین ہوتا ہے نہ مالک۔ یہ اسلام کی منفرد خصوصیت ہے۔ ایک طرف یہ نظام سرمایہ داری سے یکسر متمیز ہے جس میں ذاتی ملکیت کو مقدس قرار دیا جاتا ہے اور اس کے لیے بہر حال تحفظ ضروری ہوتا ہے اور دوسری طرف سوشلزم سے متمیز جس میں دولت کو مملکت کی ملکیت ٹھہرایا جاتا ہے۔" (صفحہ ۳)

اور اس بنا پر کہا گیا ہے کہ :

" معاشی نظام کے اسلامیانے کے پروگرام میں سب سے اہم اور بنیادی سوال ذاتی ملکیت کے انسٹی ٹیوشن کو مسلمان کرنا ہے۔ اس انسٹی ٹیوشن کی بنیاد نظام جاگیر داری اور سرمایہ داری پر ہے۔ اس سلسلہ میں زمین کی انفرادی ملکیت کا سوال سب سے اہم ہے۔ یہ نہ صرف ناہمواریوں کا سرچشمہ ہے بلکہ معاشی فسادات اور اخلاقی انحطاط کا موجب بھی ہے اس لیے ضرورت

اِس امر کی ہے کہ اس کی اصلاح اس طرح کی جائے کہ "ملکیت" کے دائرے سے نکل کر امانت کے احاطہ میں آ جائے۔" (صفحہ ۱۳)

اور اس کے بعد زمین کی ذاتی ملکیت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

" دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے شدید ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں اور زمین کی ذاتی ملکیت اس کا بہت بڑا سبب ہے۔" (صفحہ ۴)

کمیٹی قرآنی تعلیم کی روشنی میں ذاتی ملکیت کا تصور پیش کرنے کے بعد ربٰو اور زکوٰۃ پر بحث ان الفاظ میں کرتی ہے:-

"یہ شیخ چلّی کی باتیں ہیں

نظام سرمایہ داری کو علی حالہ قائم رکھنا اور یہ سمجھنا کہ سود کو ختم کر دینے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ اور ہم اطمینان اور مسرّت کی زندگی بسر کریں گے، شیخ چلّی کی سی باتیں ہیں۔ یہ کمیٹی اس قسم کے مشورہ کو بالکلیہ مسترد کرتی ہے۔ کمیٹی کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام جب ربٰو کو ختم کرتا ہے تو وہ حقیقت میں پورے کے پورے نظام سرمایہ داری کو ختم کرتا ہے۔" (صفحہ ۴)

ربٰو کی اس بحث کے بعد مروجہ زکوٰۃ پر بھی بڑے عالمانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ لکھا ہے:

اڑھائی فیصد زکوٰۃ کا تصور کوئی حل نہیں

" آج کل جس پروگرام کو اسلام کے اقتصادی نظام کے بلند دعوےٰ کے ساتھ عام کیا جا رہا ہے، وہ عوامی سطح پر زکوٰۃ کی ترویج اور سُود کے خاتمہ سے متعلق نہایت مبہم اور غیر واضح خیالات کی نشر و اشاعت سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ اسلامی اقتصادیات کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس قسم کا دعویٰ غلط اور باطل ہے۔ اس لیے کہ کسی اقتصادی نظام بالخصوص اسلام کے اقتصادی نظام کو اس قسم کے دو اجزاء میں سمٹایا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو تو پھر بھی یہ اشد ضروری ہے کہ اسلامی نظام کے ان اہم عناصر کا صحیح مفہوم سمجھا جائے۔ اس حقیقت کو بھی آسانی سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ اسلام جب ربٰو کو مسترد کرتا ہے تو درحقیقت پورے کے پورے سرمایہ دارانہ نظام کو مسترد کرتا ہے۔ وہ

نظام جس کی بنیاد ہی غریبوں کی محنت کے استحصال پر قائم ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے وہ اسلام کے بلند ترین مساویانہ اقتصادی فلسفہ کی ایک علامت ہے۔ یہ کہنا کہ سود مٹ گیا تو سرمایہ داری نظام مٹ جائے گا۔ اور اگر امیروں سے ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ وصول کرلی تو اس سے غریبوں کی احتیاج اور افلاس کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج پٹ جائے گی۔ دور حاضر میں ان معاشی مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگانے کے متعلق اپنی جہالت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ امیروں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کے مزید دروازے کھول دے گا اور اڑھائی فی صد زکوٰۃ اقتصادی ناانصافیوں کے دُور کرنے کے لیے قطعاً ناکافی ہوگی۔ اس کے بعد سوچیے کہ جو اصلاحات اسلام کے نام سے نافذ کی جائیں جب وہ اقتصادی استحصال کو دُور کرنے میں ناکام رہ جائیں اور یہ ناکامی خود ان اصلاحات کی پیدا کردہ ہو تو اس کے بعد اصلاحِ احوال کی کیا صورت ہوگی؟ اس سے حالت بد سے بدتر ہو جائے گی۔“ (صفحہ ۱۰)

ربٰوا کس طرح ختم ہو سکتا ہے؟

”مختصراً جب تک نظام سرمایہ داری قائم ہے ربٰوا کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو نظام سرمایہ داری کے ختم ہونے سے ہی ہو سکتا ہے۔ نہ ہی ربٰوا کا نام منافع رکھنے سے ختم ہو گیا ہے اس قسم کی تجاویز کو یکسر مسترد کر دینا چاہیئے۔“ (صفحہ ۲۷)

بہرحال وزارتِ مالیات کی رپورٹ میں اڑھائی فی صد زکوٰۃ اور سُود کے مرّوجہ عجمی مفہوم کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کس حد تک صحیح ہے۔ لیکن افسوس ہمارے ملکی اخبارات اس ۲½ فی صد کے عجمی تصور کو ہی شرابِ کا فیصلہ تصور کرتے ہیں (حوالہ کے لیے دیکھئے اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۳ء) جبکہ قرآن حکیم کے نزدیک ہر قسم کا سامان نشوونما کا باہم پہنچانا حکومت کا فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کا نام زکوٰۃ کا ادا کرنا کہا گیا ہے۔ کیونکہ جو حکومت بھی خدا کے نام پر قائم ہوگی اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ حدودِ بشریت ان تمام صفات خداوندی کی حامل ہو جن صفات کی حامل خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی عملی تفسیر ہمیں حضرت عمر فاروق رضؓ کے اس قول میں ملتی ہے کہ ”اگر دجلہ کے کنارے کتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمر رضؓ سے اس کی باز پرس ہوگی۔“ اور رسولِ خداؐ نے اس بات کو اس طرح واضح فرمایا کہ ”جس بستی میں رات کو ایک شخص بھی بھوکا سو گیا خدا نے اس بستی سے اپنی حفاظت کا ذمہ اٹھا لیا۔“ بالفاظِ دیگر وہ مملکت اسلامی مملکت نہ رہی۔

اسلامی معاشی اصلاحات کے اصول اور مقرر کردہ کمیٹی کی رپورٹ

مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) کے بعد اسلام آباد میں واقع ایک سرکاری ادارے "پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس" نے انگریزی میں "اسلامی معاشی اصلاحات کے اصول"، کے نام پر ایک رسالہ شائع کیا ہے اور بقول ارشاد احمد حقانی صاحب کے زیر نظر رسالہ اسلام کی معاشی ہدایات کی روشنی میں موجودہ غیر منصفانہ نظام کی تبدیلی کے لیے بڑا فکر انگیز مواد پیش کرتا ہے۔ اسی بنا پر حقانی صاحب کی خواہش ہے کہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ جناب حقانی صاحب نے اس رسالہ کا تفصیلی تعارف روزنامہ جنگ لاہور میں متواتر ۴۔۵ قسطوں میں پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ ایک مخلصانہ، ماہرانہ، بلند پایہ اور علمی کاوش ہے۔ لہٰذا قبل اس کے کہ جناب حقانی صاحب کی طرف سے مذکورہ رسالے کے کچھ اقتباسات درج کیے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے رسالے کے مصنفین کا مختصر سا تعارف پیش کر دیا جائے۔

(۱) سید نواب حیدر نقوی۔ جو اس ادارے کے ڈائریکٹر ہیں اور دنیا کی متعدد مشہور جامعات کے خارجی تحصیل وزیٹنگ پروفیسر ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف اور قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں معاشیات کے پروفیسر رہے ہیں۔)

(۲) جناب ایچ یو بیگ جو گذشتہ پانچ سال سے مرکزی وزارت خزانہ کے سیکرٹری ہیں،

(۳) جناب رفیق احمد جو آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ اور اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے وائس چانسلر ہیں اور معاشیات پر کئی کتابوں کے مصنف۔

(۴) پروفیسر میاں ایم نذیر جو پشاور یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں اور اطلاقی معاشی مطالعے کے مرکز (پشاور) کے ڈائریکٹر ہیں اور غیر ممالک سے معاشیات کی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں

مصنفین کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب وہ اقتباسات ملاحظہ کریں۔

"مصنفین کی رائے میں اسلام کے معاشی مقاصد کے حصول کے لیے پہلی ضروری شرط یہ ہے کہ:

"معاشرہ میں پائی جانے والی معاشی اونچ نیچ اور بے انصافیوں کے تناسب سے حقیقی اور مالی وسائل مالدار طبقات سے محروم طبقات کی طرف منتقل کیے جائیں۔ اس کے لیے نجی ملکیت کے ادارہ کی اصلاح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ضروری ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ملکیت زمین کے موجودہ نظام کو بدلنا ضروری ہے اس کے لیے ناگزیر ہے کہ مطلق

ملکیت کی بجائے امانت کا تصور اپنایا جائے۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ جو زمین اور جائیداد اور وسائل پیداوار کسی مسلمان کے پاس ہیں وہ ان کا مطلق مالک نہیں بلکہ ان کا امین اور نگران ہے۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ریاست کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیئے۔" (۱۰/ اگست ۱۹۸۴ء)

اس کے بعد مصنفین کہتے ہیں کہ:

"اس بات کا حقیقی خطرہ پایا جاتا ہے کہ اگر سود کے خاتمہ اور زکوٰۃ کے نفاذ کو معیشت کے اسلامی بنانے کا ہم معنی سمجھ لیا گیا تو ساری توجہ انہیں پر مرکوز ہو جائے گی اور بنیادی تبدیلیوں کی اہمیت نظر سے اوجھل ہو جائے گی۔ ایسا ہوا تو اس سے یہ ایک غلط احساس پیدا ہوگا کہ معیشت کو اسلامی بنانے کے لیے جو کچھ کرنا ضروری تھا، وہ کر لیا گیا ہے اس سے زیادہ خطرناک بات اور کوئی نہیں ہوگی۔" (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۸۴ء)

مصنفین کی رائے میں:

"ایسی صورت بآسانی پیدا ہو سکتی ہے کہ عدل و احسان کے تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بدترین سماجی بے انصافی موجود ہو اگرچہ زکوٰۃ بھی لی جا رہی ہو اور محدود معنوں میں سود بھی ختم کیا جا چکا ہو۔ نفع نقصان میں شراکت کا جو نظام اب اپنایا جا رہا ہے اور جسے سودی نظام کا نعم البدل ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ امیر کے ہاتھوں بدترین استحصال کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے اور زکوٰۃ کو اگر تھوڑے سے وسائل فراہم کرنے کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ بھی معاشرے سے اقتصادی بے انصافی ختم کرنے میں ناکام ثابت ہوگی۔"

مصنفین تنبیہہ کرتے ہیں کہ:

"اگر اسلام کے نام پر کی جانے والی اصلاحات کے باوجود استحصال کے خاتمے میں ناکامی ہو جائے تو اصلاحِ احوال کے لیے کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں رہے گا بلکہ اس کا اثر یہ ہوگا کہ نفاذِ اسلام کے عمل کو زبردست اور مستقل نقصان پہنچ جائے گا کیونکہ ایک غیر منصفانہ معاشرہ اسلامائزیشن کے دعوؤں کے باوجود موجود ہوگا۔"

(روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۸۴ء)

زکوٰۃ اور سود کے سلسلہ میں مصنفین اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

"ان دونوں احکام کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے ان کے نزدیک سود کی

ممانعت اصل میں پورے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی نفی کے ہم معنی ہے۔ کیونکہ یہ نظام ترقیاتی مقاصد کے لیے امیر کے ہاتھوں غریب کے استحصال کو نظرانداز کردیتا ہے اسی طرح زکوٰۃ اصل میں ایک علامتی نظریہ ہے اسلام کے انتہائی غریب پرور اور مبنی بر انصاف اقتصادی فلسفے کا۔ لیکن اس کے باوجود یہ سمجھنا کہ صرف سُود کے خاتمے سے سرمایہ دارانہ استحصال کے پورے عنصر کی معیشت سے خارج کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ صرف زکوٰۃ سے غربت اور احتیاج کے تمام مسائل حل کیے جاسکتے ہیں اور امیر غریب کے درمیان بڑھتا ہوا فرق ختم کیا جاسکتا ہے۔ معاملے کو ضرورت سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کرنے کے ہم معنی ہے"

(بحوالہ روزنامہ جنگ ۱۷/ اگست ۱۹۸۴ء)

اور جہاں تک مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا تعلق ہے، مصنفین کی اس سلسلے میں رائے یہ ہے کہ:

"زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس وصول کرنے کی حکومت مجاز ہے۔ اسے ایک ہمہ گیر سماجی تحفظ کا نظام ترتیب دینا چاہیے اور زکوٰۃ کو صرف انفرادی غربت کے ازالہ کی محدود کوشش کی شکل اختیار نہیں کرنی چاہیے بلکہ منافع کی شرح ہر سطح پر منظم کی جانی چاہیے اور اسے انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا چاہیے۔ موجودہ شکل میں منافع اور کرایہ کے حصول کا نظام اقتصادی استحصال کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔"

کتابچہ میں واضح کیا گیا ہے کہ:

"اسلام کی تعلیم عدل و احسان کو نظرانداز کیا جاتا رہا اور وسائلِ رزق پر چند افراد اور خاندانوں کی اجارہ داری قائم رہی تو ایسا معاشرہ بُرے انجام سے محفوظ نہ رہ سکےگا۔"

(روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۹/ اگست ۱۹۸۴ء)

ایک خلش کا ازالہ

مصنفین نے موجودہ معاشی نظام کی استحصالی کیفیت کو جس جگر سوزی اور کرب کے ساتھ محسوس کیا ہے وہ یقیناً ہر بہی خواہ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے لیکن اس میں ایک بات جو دل میں کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے مصنفین کا یہ کہنا کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس وصول کرنے کی حکومت مجاز ہے اور زکوٰۃ اصل میں علامتی ذریعہ ہے۔ اسلام کے انتہائی غریب پرور اور مبنی برانصاف اقتصادی فلسفے کا، تو اس اقتباس سے یہ نہ اخذ کرلیا جائے کہ فاضل مصنفین کے نزدیک "عام دنیاوی ٹیکس" کے علاوہ

زکوٰۃ ایک علیحدہ "اسلامی" ٹیکس ہے جو حکومت لوگوں سے ان کی جمع شدہ دولت یا فاضل دولت پر غرباء کی فلاح و بہبود کے لیے وصول کرے گی کیونکہ مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ کے علاوہ فاضل مصنفین کی طرف سے شائع کردہ مذکورہ رسالہ کے تمام مندرجات کے بغور مطالعہ اور قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کی روشنی میں زکوٰۃ کا یہ تصور قطعی طور پر درست نہیں۔

زکوٰۃ لی نہیں جاتی بلکہ دی جاتی ہے

راقم اس سلسلہ میں نہایت ادب کے ساتھ گزارش گذار ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک زکوٰۃ کا یہ تصور قطعی طور پر درست نہیں کیونکہ اس قسم کی زکوٰۃ تو رہینِ منت ہوتی ہے فاضلہ دولت کی جبکہ "قل العفو" کے قرآنی نظام میں فاضلہ دولت کسی کے پاس رہتی ہی نہیں۔ وہاں تو رزق کے تمام سرچشمے ذاتی کنٹرول اور ملکیت کی بجائے ملت کی اجتماعی تحویل میں بطور امانت ہوتے ہیں اور ان سے ہر کسی کو براہِ راست مستفید ہونے کا حق ہوتا ہے۔ یہی وہ نظامِ حیات ہے جس کو عملی شکل دینے کی خاطر ایک اجتماعی نظام متشکل کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ بتدریج تمام افرادِ انسانیہ کے لیے ربوبیت عالمینی کے وہ فرائض سرانجام دیے جا سکیں جو خدا تعالےٰ نے اپنے اوپر لے رکھے ہیں۔ اس ذمہ داری کے سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ہے کہ:

"زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو" (۶/۱۱)

لہٰذا اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے ارشاد ہے کہ:

"یہ (مومنین) وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔" (۴۰/۲۲)

نظامِ ربوبیت کی تکمیل کے لیے قرآنِ حکیم کا ارشاد یہ بھی ہے:

"اور ارض میں جو کچھ ہے سب اس کی سلطنت ہے اس لیے انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔" (۲/۲۲)

اور اس کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی کہ جب سورۃ الانبیاء میں کہا کہ:

"انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاعِ حیات حاصل کرنے کے لیے ملی تھی اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضہ مخالفانہ جما لیا۔ اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہو کر رہے گی۔ یہ ہمیں مغلوب نہیں کر سکیں گے۔" (۲۱/۴۴)

"انسانوں کو یہ حق نہیں کہ وہ وسائلِ ارضی کے مالک بن بیٹھیں" رفیق احمد باجوہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱ ۸/۸۴

ہمارا نصابِ تعلیم اور زکوٰۃ

لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے باوجود زکوٰۃ کا وہی رواجی اڑھائی فی صد تصور شروع سے ہی نصابی طور پر ہمارے ہاں بچوں کے ذہنوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

جماعت نہم و دہم کی اسلامیات کی کتاب جسے لازمی قرار دیا گیا ہے اور جسے ملک کے نامور حضرات (جس میں علماء اور پروفیسر حضرات بھی شامل ہیں) نے مل بیٹھ کر تیار کیا ہے۔ اس میں زکوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے:

زکوٰۃ اور مسائلِ زکوٰۃ

"زکوٰۃ کے لغوی معنی پاکیزگی کے ہیں اور یہ شریعت میں مال کے اس حصّے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اس کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق نادار لوگوں کو دیا جاتا ہے یہ مالی عبادت ہر ایسے عاقل، بالغ اور آزاد مسلمان پر فرض ہے جس کی ملکیت میں ایک سال تک مال بقدر نصاب موجود رہے۔ نصاب سے مراد مال کا وہ کم از کم اندازہ ہے جو زکوٰۃ کے قابلِ وصول ہونے کے لیے شریعت میں مقرر ہے۔ جو مال نصاب میں کم ہو اس میں زکوٰۃ لازم نہیں یعنی جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا یا ساڑھے باون تولے چاندی یا اس کی مالیت کے برابر نقدی یا سامان تجارت اپنی حاجات و ضروریات سے زائد و فارغ ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کا چالیسواں حصّہ یا اڑھائی فی صد بطور زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

اس کے علاوہ زمین کی پیداوار تھوڑی ہو یا بہت، جونہی فصل تیار ہو جائے زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہو جاتی ہے۔ نہری اور چاہی (رہٹی) زمین سے بیسواں اور بارانی زمین سے دسواں حصّہ زکوٰۃ فرض ہے۔ بھیڑ بکریوں کا نصاب کم از کم چالیس، بھینسوں اور گائیوں کا کم از کم تیس اور اونٹوں کا کم از کم پانچ مقرر ہے۔ گھر کے استعمال کی اشیا مثلاً کپڑے، فرنیچر، سواری کے جانور، سائیکل، موٹر، اوزار، ہتھیار، ذاتی کتب خانہ اور رہن شدہ جائیداد میں زکوٰۃ فرض نہیں۔"

مرے کو مارے شاہ مدار

بالفاظِ دیگر جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونے کی بجائے سوا سات تولے سونا ہوگا جس کی مالیت آج کے حساب سے تقریباً -/۱۶۰۰۰ (سولہ ہزار روپے) بنتی ہے، وہ تو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار پائے گا۔ اور جس کے پاس ساڑھے باون تولے چاندی ہوگی جس کی مالیت تقریباً -/۱۸۰۰ (اٹھارہ صد) روپے ہے، وہ زکوٰۃ دینے کا پابند ہوگا۔ یعنی مرے کو مارے شاہ مدار۔ سچ ہے کہ دورِ ملوکیت اور نظام سرمایہ داری کی وضع کردہ زکوٰۃ اسی قسم کی ہوتی ہے۔

انسائیکلو پیڈیا میں زکوٰۃ کا پیش کردہ مفہوم

کسی زبان میں لکھے جانے والے انسائیکلو پیڈیا جیسی حوالہ جاتی کتاب کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں ان دنوں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کی وساطت سے "اردو جامع انسائیکلو پیڈیا کا خاکہ ۱۹۵۹ء میں تیار کیا گیا تھا جس کی تدوین کے لیے جناب جسٹس ایس رحمان کی سربراہی میں ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر رضی الدین، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، گروپ کیپٹن سید فیاض محمود، مولانا عبدالقادر، میاں بشیر احمد اور جناب قدرت اللہ شہاب شامل کیے گئے اور اس کے علاوہ مترجمین و مرتبین کی حیثیت سے ملک کی ۳۳ نامور شخصیات نے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں مولانا غلام رسول مہر نے بھی اس سلسلہ میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ جہاں تک اس انسائیکلو پیڈیا کے دیباچہ کا تعلق ہے، اس میں لکھا ہے" اردو جامع انسائیکلو پیڈیا" میں قرآن حکیم اور اس سے متعلق امور کو بالوضاحت پیش کیا گیا ہے۔" لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس جامع اور اہم کتاب کا وہ اقتباس نقل کر دیا جائے جو زکوٰۃ کے سلسلہ میں ارکان اسلام کے تحت لکھا ہے:

> " دین اسلام کی وہ عبادتیں یا اعمال جنہیں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور وہ خدا کی طرف سے ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ ان کی تعداد عموماً پانچ سمجھی جاتی ہے (۱) توحید ـــــ یعنی کلمہٴ شہادت کے مطابق خدا کے ایک ہونے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا زبان سے اقرار اور دل سے ان دونوں باتوں کی تصدیق کرنا (۲) روزانہ پانچ وقت نماز پڑھنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا اہلِ نصاب پر فرض ہے کہ سال بھر میں مقررہ زکوٰۃ ادا کریں۔ اہل

نصاب سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس اتنا مال یا غلہ یا اتنے جانور ہوں جن پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے (۴) پورے ماہ رمضان کے روزے رکھنا (۵) عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرنا بشرطیکہ عازم حج کے پاس زاد راہ ہو

(بحوالہ جامع انسائیکلوپیڈیا۔ قسط نمبر ۳ صفحہ نمبر ۸۸)

کاش انسائیکلو پیڈیا جیسی اس بین الاقوامی حوالہ جاتی کتاب میں دورِ ملوکیت میں زکوٰۃ کے اس خود ساختہ عجمی تصور کی بجائے قرآنی مفہوم کو بیان کیا جاتا جس کے تحت اسلامی مملکت کا یہ فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر فرد کے لیے صرف روٹی کپڑا اور مکان ہی فراہم نہ کرے بلکہ اس کے علاوہ اس کی ہر قسم کی تعمیری صلاحیتوں کو مکمل نشوونما کے لیے ایسا ماحول بھی پیدا کرے کہ کسی انسان کے جسم کی ہی پرورش نہ ہو بلکہ اسے اپنی ذات کی تکمیل میں بھی کوئی دشواری محسوس نہ ہونے پائے۔ غالباً یہی وہ احساس ہے جس کے تحت جناب رفیق احمد باجوہ صاحب نے اپنے ایک مضمون "کس کی زباں کہے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے" میں تحریر کیا کہ:

"آئین و قوانین میں کہیں "قل العفو" "لیس للانسان الا ما سعیٰ" "قیام صلوٰۃ" "ایتائے زکوٰۃ" کے آفاقی اصولوں کی روح موجود نہیں۔ قوانین زکوٰۃ میں نہ صرف زکوٰۃ کی ملوکانہ شرح نافذ کی ہے آئینی و قانونی نظامِ زکوٰۃ نافذ نہیں ہوا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۸۴ء)

دولت جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں

آج پوری دنیا ایک نئے اقتصادی نظام میں سرگرداں بھی ہے اور بے حد مضطرب بھی۔ یہاں تک کہ اس دور کو دورِ اقتصادیات کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ قرآن جو مکمل ضابطہ حیات ہے تو اس نے اس مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں صدیوں سے کہا جاتا ہے کہ جمع شدہ دولت سے ۲½ فیصد زکوٰۃ (یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ اس کا مصرف بھی الگ الگ بتاتا ہے) اور اگر جمع شدہ دولت کے متعلق سوال کیا جائے کہ یہ دولت کس حد تک جمع کی جاسکتی ہے تو اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ:

"جس طرح اسلام ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار اتنے مویشی اتنی موٹریں اتنی کشتیاں اسی اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسلام اسی طرح یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کھپت کے لحاظ سے کوئی

حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق اور واجبات ادا کیے جاتے رہیں بلا حدود نہایت رکھی جاسکتی ہے۔"

(ملکیت زمین از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم۔ صفحہ ۲۷۔ ۵۲)

مودودی صاحب کے نزدیک زکوٰۃ کا تصور

جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے، اسے وہ جمع بھی کرسکتا ہے اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں۔ جمع کرنے کی صورت میں اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔ کاروبار میں لگانا چاہے تو صرف جائز کاروبار ہی میں لگا سکتا ہے۔ جائز کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ روپئے، زمین یا آلات و اسباب کی صورت میں دے کر نفع و نقصان کا شریک ہوجائے۔ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کرکے اگر کوئی شخص کروڑپتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے بلکہ خدا کا انعام ہے۔ (بحوالہ "اسلام کا نظام حیات" از سید ابوالاعلیٰ مودودی)

مال جمع نہ کرنے پر صحابہ کی تشویش اور اس کا حل

لیکن اگر کہا جائے کہ قرآن تو بلا حدود نہایت دولت جمع کرنے اور سونا چاندی اکٹھا کرنے کو شدید ترین عذاب کا موجب قرار دیتا ہے (۳۵-۳۴/۹) تو پھر دولت کے بل بوتے پر دولت کمانے سے انسان خدا کے عذاب سے کیونکر بچ سکتا ہے اور پھر اس کے علاوہ دولت کے بل بوتے پر دولت کا ماحصل کیونکر جائز قرار پاسکتا ہے تو اس کا جواب یہ بتایا جاتا ہے کہ زکوٰۃ کا حکم اس عذاب سے بچنے اور اپنے مال کو پاک کرنے کے لیے تو آیا ہے ـــ اور اس کے بعد زکوٰۃ کے فرض قرار پانے کے سلسلہ میں یہ روایت بیان کردی جاتی ہے کہ:

(بحوالہ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودی)

> "حضرت ابنِ عباس رضؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت یعنی سونا چاندی کو جمع نہ کرنے والی آیات ۳۵-۳۴/۹ نازل ہوئیں تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمر رضؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کردوں گا اور اس مشکل کو حل کردوں گا۔ پس حضرت عمر رضؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا نبی اللہ یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا خداوند تعالیٰ

ؔ جبکہ دوسری طرف جماعت اسلامی نے ۲ مارچ تا ۹ مارچ ۱۹۹۰ء تک ملک بھر میں کسانوں اور مزدوروں کا ہفتہ منانے کے لئے سیمینار منعقد کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ یکم مارچ ۱۹۹۰ء)

نے زکوٰۃ اس لیے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔"

(بحوالہ ابوداؤد مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ اردو ترجمہ۔ شائع کردہ نور محمد کارخانۂ تجارت کراچی۔ صفحہ ۳۰۹/۳۱۰)

یعنی خدا کا حکم ان صحابہؓ پر گراں گزرا جن کے متعلق خود خدا کی شہادت موجود ہے کہ:

"انہوں نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھ فروخت کر دیئے تھے۔" (۹/۱۱۱)

علامہ اقبال نے سچ کہا تھا ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی!

دیگر ملکی علماء کا تصورِ زکوٰۃ

اس کے بعد جہاں تک ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، عبدالستار نیازی صاحب، مفتی محمد حسین نعیمی صاحب مولانا محمد اجمل صاحب، مولانا محمود احمد رضوی صاحب وغیرہ کا تعلق ہے تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۸۶ء کے مطابق:

ڈاکٹر اسرار احمد نے اس سلسلے میں کہا "اگر کسی صاحبِ نصاب شخص کے پاس غیر ملکی کرنسی کی شکل میں کوئی مال موجود ہے تو اس کی مالیت ملکی کرنسی میں لگا کر اس پر زکوٰۃ کاٹی جا سکتی ہے۔"

جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا کہ "ملکیت خواہ کسی بھی رنگ میں ہو، اسے ملکی کرنسی میں تبدیل کر کے اس پر زکوٰۃ کاٹی جائے" تاہم زکوٰۃ کاٹنے کے لیے اس شخص کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ جس کے اموال پر زکوٰۃ کاٹی جا رہی ہو۔ انہوں نے کہا کہ اسلامی حکومت مسلمانوں کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے یہ فریضہ ادا کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اسے اغنیاء سے لے کر فقراء میں تقسیم کر دو اور یہ نقدی، سونا چاندی، مال مویشی اور دوسرے اموال پر لاگو ہوتی ہے اس لیے غیر ملکی کرنسی کی شکل میں موجود اموال کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

جامعہ نعیمیہ کے مہتمم مفتی محمد حسین نعیمی نے کہا کہ "نقدی، سونا چاندی، مال تجارت اور تجارتی سرمایہ پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے اور غیر ملکی کرنسی کی شکل میں موجود اثاثے زکوٰۃ کی تمام شرائط پوری کرتے ہیں اس لیے انہیں زکوٰۃ کی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دینا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔"

جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ) کے رہنما مولانا محمد اجمل خان نے کہا کہ "جب کوئی شخص اپنے مال کا مالک بن جائے جو زکوٰۃ کے نصاب کی مد میں آتا ہو اور وہ مال ایک سال تک اس کے پاس رہے اس پر زکوٰۃ لازم ہو جاتی ہے جو اسے ادا کرنی پڑے گی اور اگر حکومت اس پر زکوٰۃ نہیں کاٹتی تو نہ کاٹے اس شخص کو خود زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔ کیونکہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مجرم ہوگا" انہوں نے کہا کہ "اگر حکومت کسی بھی مد میں خواہ وہ ملکی اثاثے ہوں یا غیر ملکی زکوٰۃ نہیں کاٹتی تو شرعی اعتبار سے وہ اس سلسلے میں جواب دہ ہے۔"

رویت ہلال کمیٹی کے سابق سربراہ اور زکوٰۃ کمیٹی کے ضلعی چیئرمین مولانا محمود احمد رضوی نے کہا کہ "شرعی اعتبار سے حکومت اموالِ ظاہرہ پر زکوٰۃ وصول کرسکتی ہے مگر اموال باطنہ پر وصول نہیں کرسکتی" انہوں نے کہا کہ "ان کے خیال میں بینکوں میں موجود اثاثے اموال باطنہ ہیں مگر جب حکومت نے زکوٰۃ آرڈیننس جاری کیا تو اس میں بینکوں میں موجود بعض اثاثوں کی بعض مدوں پر زکوٰۃ کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سیونگ اکاؤنٹس پر تو زکوٰۃ کاٹی جارہی ہے مگر کرنٹ اکاؤنٹ کی مدوں میں موجود کروڑوں روپوں کے اثاثوں پر زکوٰۃ نہیں کٹتی ہے" انہوں نے کہا کہ "حکومت کی طرف سے صرف چند مدوں میں زکوٰۃ کاٹی جارہی ہے۔ جبکہ باقی مدوں میں موجود اثاثوں پر مسلمانوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔ مثلاً دکانوں میں موجود مال اور گھروں میں رکھی ہوئی نقدی سونے چاندی اور دوسرے اموال پر حکومت زکوٰۃ نہیں کاٹتی۔ تاہم ان اثاثوں پر لوگوں کو خود زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے" انہوں نے کہا "اس طرح اگر کسی مصلحت کی وجہ سے حکومت غیر ملکی کرنسی کی صورت میں موجود اثاثوں پر زکوٰۃ نہیں کاٹتی تو لوگ رضاکارانہ طور پر خود اس مد میں زکوٰۃ ادا کریں۔"

۱۹۵۰ء میں قائم ہونے والی کمیٹی کی رپورٹ

موضوع کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں یہاں اس کمیٹی کی رپورٹ کا بھی مختصر ساذکر کر دیا جائے جو مارچ ۱۹۵۰ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے ۱۳ ممبران پر مشتمل تھی تاکہ وہ زکوٰۃ کی حیثیت کو متعین کرے لہٰذا اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ جاری کیا اور ملک کے دانشوروں، مفکرین اور ماہرین اقتصادیات اور علماءِ کرام کے علاوہ ایران، مصر اور شام کے مشاہیر سے بھی استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ ارکان کمیٹی نے زکوٰۃ کی جو تعریف کی وہ حسبِ ذیل ہے :

"زکوٰۃ معین حصہ مال ہے جو شارع کے تعین کے موافق اس کے تعین کردہ

مصارف کے لیے خالصتاً للہ - بلامعاوضہ دیا جائے نیز زکوٰۃ کی فرضیت محض ایک مالی عبادت کی حیثیت سے ہوتی ہے جس کا اصل مقصد مسلمانوں کے نفوس و اموال کی تطہیر اور فقراء و مساکین کی حاجت روائی ہے - ضروریات مملکت میں اس کے مفید ثمرات ایک ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ جس طرح کلمۂ شہادت اور نماز اور روزہ اور حج خالص عبادات ہیں اسی طرح زکوٰۃ ایک خالص عبادت ہے - اس کا ادا کرنا مسلمانوں پر فرض ہے - خواہ کوئی مملکت قائم ہو یا نہ ہو اور ان کی ضروریات اس سے پوری ہوں یا نہ ہوں مملکت کی تمام ضروریات پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ جاری کرنے کا تصور قرآن اور حدیث کے منشا اور جمہوریت کے مسلمات کے بالکل خلاف ہے - "

(اس رپورٹ کے لیے ملاحظہ ہو ستمبر ۱۹۵۴ء کا ماہنامہ " طلوع اسلام " لاہور) -

یہ ہے زکوٰۃ کا وہ تصور جو آج پوری ملتِ اسلامیہ میں پایا جاتا ہے -

زکوٰۃ کمیٹیوں کا قیام اور زکوٰۃ فنڈ کا مصرف

اگر یہ جاننا مقصود ہو کہ زکوٰۃ کے اس غلط مفہوم نے آج ہمارے ہاں کیا نتائج پیدا کیے ہیں تو اس کے لیے ۲۴ ستمبر ۱۹۸۴ء کے " نوائے وقت " کے اداریے کا مطالعہ غیر مناسب نہ ہوگا -

" یہ بات باعثِ حیرت و اضطراب بن رہی ہے کہ نظامِ زکوٰۃ و عشر کی بدولت گداگری کا جو سلسلہ بتدریج کم اور ختم ہو جانا چاہیئے تھا وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور بازاروں گلی کوچوں، ریلوے سٹیشنوں اور بس اڈوں کے علاوہ مساجد کے اندر اور باہر حتیٰ کہ ریل گاڑیوں کی طرح مسافر بسوں میں بھی ان کی یلغار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے - "

اداریہ نوائے وقت کے بعد روزنامہ جنگ نے اپنے ہاں مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء کو جو کچھ تحریر کیا وہ مندرجہ بالا حقائق سے بھی کہیں زیادہ تشویشناک ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مروجہ نظام سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ اس سے زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم نظروں سے اوجھل ہو گیا بلکہ اس سے یہ بھی ہوا کہ اس نے مصلحین اور علماءِ کرام کو اپنی جیب گرم کرنے کا خوب موقع ملا - اور بقول جناب مدیر جنگ لاہور کے :

" زکوٰۃ کی رقم سے کاروں اور کوٹھیوں کی خرید

" زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں لاہور کے ایک ہفتہ وار نے ایک تشویشناک رپورٹ شائع

کی ہے جس کے مطابق ابھی تک پنجاب میں بیس کروڑ روپے مستحقین تک پہنچنے کی بجائے بینکوں میں پڑے ہیں اور کہا نہیں جاسکتا کہ آئندہ رمضان شریف میں جب دسویں قسط واجب الادا ہوجائے گی نویں قسط کا حساب بے باک ہوجائے گا۔ اس میں متعلقہ محکموں کا قصور نہیں اس رقم کا بیشتر حصہ دینی مدارس کی امداد کے لیے مختص تھا۔ ہر سال ایک لاکھ سے تین لاکھ روپے کی رقم ملتی تھی مگر حکومت کو پتہ چلا کہ بعض دینی مدارس کے مہتمم زکوٰۃ کی رقم کو خرد برد کر جاتے ہیں، اور طلبہ کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔ اس پر سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ طلبہ کو جعلی رسیدوں پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ پنجاب زکوٰۃ کونسل انتظامیہ کے ایک ذمہ دار افسر نے بتایا کہ بعض علمائے کرام نے غبن کے ذریعے کاریں اور کوٹھیاں خریدی ہیں۔ صوبے میں کل بارہ سو دینی مدارس ہیں مگر ان کی فہرست پر ان کے کردار کی روشنی میں نظر ثانی کے بعد ابھی تک کل ساڑھے تین سو مدارس کو رجسٹر کیا جاسکا ہے۔ ان حالات میں زکوٰۃ کی رقم کا بروقت تقسیم ہوجانے سے رہ جانا ناگزیر تھا۔ یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ اگر علمائے کرام زکوٰۃ کی رقوم کھا جانے سے پرہیز نہیں کرتے تو عام گنہگاروں کا کیا ذکر۔" (بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور مورخہ ۹ اپریل ۱۹۸۵ء)

جس وقت تک نظامِ زکوٰۃ کے مروجہ عجمی تصور پر عمل کرتے رہیں گے حالات زیادہ سے زیادہ مخدوش اور تشویشناک صورت اختیار کرتے چلے جائیں گے لہذا اس کا علاج زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو اپنانے میں ہے نہ کہ عجمی مفہوم کو اپنانے میں۔ اس موقع پر پاکستان میں مروجہ زکوٰۃ اور عشر کے سلسلہ میں کمیٹیوں کے قیام کے متعلق صرف یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ صرف پنجاب میں ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران ان کی تعداد ۲۳۱۹۲ تھی۔ جبکہ تحصیل کی سطح پر ۸۶ اور ضلعی سطح پر ۲۷ کمیٹیاں قائم ہیں اور ان کے لیے مرکزی زکوٰۃ فنڈ سے صوبائی زکوٰۃ فنڈ کو ایک ارب چالیس کروڑ روپے فراہم کیے گئے اور اس رقم میں سے ۶ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی رقم ۱۰۳۳ مذہبی مدارس کو ادا کی گئی۔

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۳ء)

ہماری مذہبی دنیا کی وجہ سے عالمی سطح پر سوچ بچار رکھنے والے صاحب زیرک حضرات بھی مروجہ عجمی اسلام کو ہی حقیقی اسلام تصور کئے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً مذہبی پیشوائیت نے نظام سرمایہ داری کے استحکام کی خاطر زکوٰۃ جیسے آفاقی مفہوم کو اپنی اجارہ داری کے دبیز پردوں میں کچھ اس طرح ڈھانپے رکھا کہ اپنائے زکوٰۃ جس کا مقصد ہی ایک عالمگیر نظام ربوبیت قائم کرنا تھا اسے صرف انفرادی طور پر $2\frac{1}{2}$ ٪ میں محصور کرکے سرمایہ کاری نظام کو دوام بخش دیا۔ حتیٰ کہ اس کے استعمال کو صرف مسلمانوں کے لئے ہی بطور خیرات صرف کرنے کا حکم دیا

نتیجہ یہ کہ نوعِ انسانی قرآن کے عالمگیر معاشی نظام کی ثمرباریوں سے محروم ہو گئی کہ آہستہ آہستہ ربوبیتِ عالمین کا سرسبز و شاداب ورفت مروجہ مذہبی تصورات کی پیدا کردہ خشک سالی کا کچھ اس طرح شکار ہوا کہ پوری انسانیت بھوک، لالچ اور خوف کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو کر رہ گئی۔ زکوٰۃ کے اس مذہبی ٹیکس کی غیر قرآنی تعلیم نے ہمارے ذہنوں کو کس قدر متاثر کر رکھا ہے اس کا اندازہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۹ ستمبر ۸۸ء کے اس اداریہ سے بخوبی ہو سکے گا جو ۱۹۸۸ء کے بدترین سیلاب کے حوالے سے لکھا گیا تھا جناب: یہ لکھتے ہیں کہ

مدیر جنگ کی نظر میں زکوٰۃ کے مفہوم کی ایک جھلک

" حکومت حالیہ سیلاب سے متاثر ہونے والوں کی جو امداد کر رہی ہے۔ متاثرین کے بعض حلقے اسے ناکافی قرار دے رہے ہیں۔ بعض مسیحی حلقوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ حکومت متاثرین کو زکوٰۃ فنڈز سے تین ہزار روپے فی خاندان کے حساب سے جو امداد فراہم کر رہی ہے عیسائی متاثرین اس سے محروم ہیں۔ جہاں تک سیلاب زدگان کی امداد کا تعلق ہے بلا رنگ و نسل اور مذہب تمام متاثرین یکساں امداد کے مستحق ہیں البتہ زکوٰۃ فنڈز سے متاثرین کی اسلام کے حوالے سے مسیحی متاثرین کی امداد کی راہ میں جو شرعی رکاوٹ حائل ہے حکومت کا فرض ہے کہ وہ اسے دور کرے اور مسیحی متاثرین کو کسی دوسرے فنڈز سے امداد فراہم کرے کہ وہ بھی اس ملک کے شہری برابر امداد کے مستحق ہیں۔ انہیں کسی طرح بھی نظر انداز کرنا مناسب نہیں "

زکوٰۃ کے اس مروجہ عجمی تصور کی ایک واضح جھلک روزنامہ جنگ لاہور ۲۱ مارچ ۱۹۹۰ء کے اداریہ سے بھی بخوبی ہو سکے گی۔

اصل یہ ہے کہ قرآن حکیم کے معاشی نظام کے سلسلہ میں جو کچھ اس سے بیشتر کہا جا چکا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن حکیم ربوبیتِ عالمینی کی خاطر رزق کے تمام سرچشموں پر انسان کے قابض ہونے کا تصور ہی پیش نہیں کرتا خواہ یہ بنیادی نوعیت کی صنعتوں کی شکل میں ہوں یا زمین کی شکل میں۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم جیسی قرآنی بصیرت رکھنے والی شخصیت نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ سے ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کو انٹرویو کے دوران بڑے واضح انداز میں یہ کہا تھا کہ

بنیادی صنعتوں کے متعلق قائداعظم کا فرمان

میرا ایمان ہے کہ پاکستان بننے پر موجودہ دور میں ضروری اور بنیادی نوعیت کی صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لینا ہوگا اور یہی عمل عوامی ضروریات کے تحت بعض دوسرے شعبوں میں کرنا ہوگا۔

معاشی نظام کے سلسلہ میں احمد ندیم قاسمی کی قرآنی فکر

کچھ عرصہ پیشتر ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام "اسلامی تہذیب اور پاکستان" کے موضوع پر جناب احمد ندیم قاسمی صاحب نے اپنے خطاب میں پاکستان میں اسلامی تہذیب کی صورت حال کے بارے میں جو چند ایک سوالات پیش کئے ان میں سے ایک دو یہ بھی تھے کہ

۱۔ کیا ہم نے الارض اللہ کے ارشاد کا عملاً احترام کیا ہے؟
۲۔ کیا ہم نے "قل العفو" کا کوئی عملی پیمانہ وضع کیا ہے؟

قرآنی معاشی نظام کی بنیاد "فائدہ" پر نہیں "افادہ" پر ہے

یاد رکھئے کہ قرآن حکیم کے معاشی نظام کی بنیاد "فائدہ" پر نہیں بلکہ "افادہ" پر ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ معاشی طور پر "افادہ" وہ اصطلاح ہے کہ جس کے لئے یہ ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ انسان اپنے خون کے ساتھ دوسروں کی نشوونما کا سامان مہیا کرے نہ کہ دوسروں کا استحصال۔ "افادہ" کے اس عمل سے انسانی ذات کو جس قدر روحانی خوشی اور راحت نصیب ہوتی ہے اسے ماپنے اور تولنے کے لئے تو آج تک معاشیات کا بڑے سے بڑا ماہر بھی کوئی پیمانہ ایجاد نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ نوع انسانی کی ارجمندی اور خودی کی بالیدگی قرآن حکیم کے اسی "افادہ" جیسے سنہری اصول میں ہی مضمر ہے جب کہ موجودہ زرعی، صنعتی اور سرمایہ داری کی بنیاد سراسر دوسروں کے استحصال پر مرکوز اور جس کا نتیجہ علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ؎

احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

افسوس عملی تبدیلی کے لئے کوئی تیار نہ ہوا

حکومتی سطح پر الارض اللہ کے ارشاد کا عملاً احترام کرنے اور کروانے نیز "قل العفو" کے نعرے کو عملی شکل دینے کے لئے ہم نے کیا کیا؟ جناب ارشاد احمد حقانی صاحب اس سلسلہ میں مورخہ ۱۶ رجنوری ۱۹۹۰ء کو روزنامہ جنگ میں لکھے گئے اپنے ایک کالم میں تحریر کرتے ہیں کہ

"اسلامی معاشی اصولوں کی برتری پر فخر کرنا ایک بات ہے اور ان پر عمل پیرا ہونا دوسری چیز ہے صدر اسحٰق نے اسلام کے عدل و احسان کے اصولوں کے مطابق معاشی ارتقاء

کے خطوط طے کرنے کا مشورہ دے کر غالباً اپنا فرض ادا کر دیا ہے لیکن جس طرح وہ اپنے اس دور میں جب خزانے کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں تھیں اور معاشی تنظیم نو کی حالت ایک حد تک انہیں حاصل تھی وہ اسلامی اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی انقلابی قدم نہیں اٹھا سکے یا اس وقت کے حکمرانوں کو اس پر آمادہ نہیں کر سکے۔ اسی طرح آج کے حکمران طبقات بھی ان کی نصیحتوں پر عمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔

عذر جناب غلام اسحٰق خاں اور جنرل ضیاء الحق کے پاس بھی بہت ہوں گے اور عذر موجودہ مقتدر طبقات بھی بہت سے پیش کر سکتے ہیں لیکن اس سے یہ حقیقت بدل نہیں جاتی کہ عملی تبدیلی کے لئے کوئی تیار نہیں۔ ہم اپنے موجودہ معاشی و سماجی ڈھانچے کے ساتھ کس منہ سے اسلامی اقتصادی اصولوں کی برتری کا دعویٰ کرنے کا حق رکھتے ہیں؟ صدر اسحٰق کی زیر نظر تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک معاصر نے بالکل درست کہا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام کا اپنایا جانا پورے اقتصادی ڈھانچے میں تبدیلی کا طالب ہے اور اس کے بغیر اسلام کے عدل و احسان کے احکامات پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔"

رنگِ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعیں جلنے سے سحر ہوتی نہیں

مقتدر طبقات اور قومی وسائل

جہاں تک پاکستان میں نظام سرمایہ داری کے باعث اور نظام جوابدہی کے فقدان کی وجہ سے ملک و قوم کو ہونے والے نقصانات کا تعلق ہے تو ان سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے قارئین کو مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہیئے جس کا احساس جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے اپنے ایک کالم بعنوان "مقتدر طبقات اور قومی وسائل" کے تحت کچھ اس طرح دلانے کی کوشش کی ہے۔ تحریر ہے کہ:

"ایک باخبر وفاقی وزیر نے یہ انکشاف کر کے پورے ملک کو چونکا دیا کہ سرکاری اداروں سے وابستہ عمال ہر سال اس غریب ملک کے عوام کا کم از کم چالیس ارب روپیہ بغیر ڈکار لیے ہضم کر جاتے ہیں۔ ان وزیر صاحب کی جرأت کی داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے نامی گرامی اور خونخوار راشیوں اور شارکوں کو بے نقاب کرنے کی جرأت کی اور واضح کیا کہ غریب عوام کے خون پسینے کی کمائی کس طرح چند ہزار افراد ناجائز طریقہ سے ہڑپ کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس انکشاف کو حکومت کے اعتراف جرم کے ہم معنی قرار دیا۔ ایک مفہوم میں یہ حکومت کا اعترافِ جرم بھی تھا۔ لیکن فی الحقیقت یہ موجودہ نظام معیشت و سیاست کے خلاف چارج شیٹ کا صرف ایک جزو تھا۔ اس نظام نے ان شارکوں کو یہ موقع

دے رکھا ہے کہ وہ اپنی پوزیشنوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عوامی سرمایہ ہڑپ کرتے رہیں اور حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ پڑھتے رہیں۔

ابھی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور ڈاکٹر محبوب الحق کے انکشافات کی گونج سنائی دے ہی رہی تھی اور عام آدمی بے بسی اور تلخی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے کہ قومی اسمبلی اور سینیٹ میں یہ انکشاف ہوا کہ قومیائے گئے بینک پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کو اپنے حسابات پیش کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس کی ایک امکانی وجہ یہ سامنے آئی کہ ان بینکوں اور مالیاتی اداروں نے صرف گذشتہ تین سال کے اندر ۱۳ کروڑ روپیہ بڑی بڑی اور با اثر مقروض پارٹیوں کو معاف کر دیا ہے۔ اور ان کے قرضے" رائٹ آف " کر دیئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گذشتہ نو سال کے دوران قریباً پندرہ ارب روپے کے قرضے با اثر اور صاحب ثروت افراد اور ان کے اداروں کو اسی طرح معاف کیے جا چکے ہیں۔ عوامی نمائندوں نے جب ان افراد اور اداروں کی تفصیل پارلیمنٹ کے اندر دریافت کی تو اسے فراہم کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا گیا کہ قرض دار اور قرض خواہ کے درمیان معاملہ اعتماد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس اعتماد کو مجروح کرنا مناسب نہیں۔" ملاحظہ فرمایئے پیشہ ورانہ اخلاق کے نام پر کس طرح بعض افراد اور اداروں کو تحفظ دینے اور عوام تو کجا ان کے نمائندوں تک کو المناک حقائق اور مبینہ دھاندلیوں سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی گئی۔

جن افراد اور اداروں کو یہ پندرہ ارب معاف کیے گئے ہیں، وہ کون ہیں ؟ کیا وہ پسماندہ طبقات کے غریب صارفین ہیں جنہوں نے یہ قرضے اپنے بچوں کی شادی اور اپنے مکانات کی مرمت یا تعمیر یا اپنے چھوٹے موٹے کاروبار کو سہارا دینے کے لیئے حاصل کیے تھے اور اب ان کے حالات اس قدر دگرگوں ہو چکے تھے کہ ان کے لیے ان معمولی قرضوں کی ادائیگی ممکن نہ رہی تھی ؟ نہیں جناب یہ قرضے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کو معاف کیے گئے، اور اس کے لیے طرح طرح کے مضحکہ خیز جواز فراہم کیے گئے تھے۔ اسی لیے حکومت عوامی نمائندوں کے اصرار کے باوجود تا حال یہ نام فراہم کرنے پر آمادہ نہیں کی جا سکی۔

یہ سب اس سسٹم کی خرابی ہے جس میں جواب دہی کا کوئی نظام نہیں تھا اور ریڈیو کی طرح

ابھی ہے۔ مت فراموش کیجئے کہ ایسا قول و فعل کا تضاد منفی جذبات کا لاوا جمع کرتا رہتا ہے اور آخر کار کسی دن وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا ہے۔ پھر مقتدر طبقات کا یہ گٹھ جوڑ تارِ عنکبوت کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ کسی دھماکے کا انتظار کرنے کی بجائے عوام کے ساتھ انصاف کی راہ اختیار کر لی جائے۔ آخر یہ غیر تو نہیں ہیں اپنے ہی ملک کے عوام ہیں۔ اور اس ملک کے وسائل پر ان کا بھی کچھ حق ہے۔ دولت کا یہ کام تو نہیں کہ بقول قرآن حکیم امیروں کے درمیان ہی پھرتی رہے اور پھرتی بھی ایسے ناجائز اور بھونڈے طریقے سے رہے جس کی کچھ مثالیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔

بہرحال یہ ہے وہ معاشی نظام جس کے متعلق جناب قمر بٹ صاحب ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" میں رقم طراز ہیں کہ :

نظام سرمایہ داری اور ماہنامہ تعمیرِ انسانیت"

"سرمایہ دار اور با اختیار لوگ دنیا کے جس مقام یا خطے میں آباد ہیں اُن کی فکر و سوچ میں یکسانیت ہے خواہ وہ کسی قوم، مذہب، نظام، رنگ اور نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔ دوسرے

تمام تعلق ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی پہچان اور شناخت اُن کا مال و دولت اور ملکی حکمرانی میں اُن کے اختیارات اور پہنچ (RESOURCES) ہوتی ہے۔ اُن کا مذہب مال و دولت میں روز افزوں اضافہ کرنا ہے۔ علوم و فنون اور اعلیٰ تعلیم محض اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ انہیں ایسے کسب و ہنر میں کمائی حاصل ہو جائے تاکہ وہ سرمائے اور اثاثے میں گراں قدر اضافہ حاصل کریں اور اپنے مطلوبہ اہداف تک ان کی رسائی حاصل ہو جائے۔ بظاہر بڑی نرم گفتگو کرتے ہیں جس میں انسانیت نوازی کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ اخوت اور مساواتِ انسانیہ اُن کے موضوعات ہوتے ہیں لیکن علامہ اقبال رح کے بقول ؎

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات"

اس کے بعد جناب قمرث صاحب تحریر کرتے ہیں کہ :

"محنت کا معاوضہ زمیندار اور صنعت کار خود متعین اور مقرر کرتے ہیں جو ہمیشہ محنت کے حاصل سے بہت کم ہوتا ہے۔ بیچارے زرعی غلام اور صنعتی اجرتی غلام (WAGE SLAVE) کم آمدنی کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی امراض کے دائمی مریض ہیں اور کم خوری کی وجہ سے تپدق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس دولت مند لوگ بسیار خوری کے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن بے پناہ دولت کے باعث اپنے ہر مرض کا علاج بڑے بڑے معالجوں سے کرا سکتے ہیں۔ اور انہیں علاج معالجے کی سہولت کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی سرمایہ دار اور متمول لوگ دنیا کی تمام آبادی کا بیس فیصد بھی نہیں لیکن کم آمدنی والے حاجتمند نانِ شبینہ سے محتاج اور غریب لوگ اسّی فیصد سے زیادہ ہیں۔ بیس فیصد لوگ اسّی فیصدی لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اور امیر لوگوں کو اجتماعی طور پر یہ ڈر، خوف اور حزن، کھائے جاتا ہے کہ غریب لوگ یعنی بھوکے ننگے اور مفلس و کنگال ہمارے خلاف کہیں اُٹھ کھڑے نہ ہوں اور ایسا نہ ہو کہ وہ ہم پر ہلہ بول دیں۔ لہٰذا انھوں نے صدیوں سے ہی اپنی حفاظت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ دُنیا بھر کی حکومتیں سرمایہ داروں کے گھر کی لونڈیاں ہیں۔ اُن کی مدد سے بھوکے ننگے لوگوں کا دلی طوفان ٹھنڈا کرنے کے لیے اور اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے پولیس، فوج، قانون ساز ادارے، عدالتیں، جیلیں، پھانسیاں اور بہت سے ایسے ہی اداروں پر ان کا قبضہ ہے۔ استحصال زدہ اور ظلم کی چکی میں پسنے والوں کو خاموش کرنے اور ان کو سزائیں دینے کے لیے ہمیشہ یہ حربے آزمائے جاتے ہیں۔ انسان کو سرکس کے شیر کی طرح بھوکا رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ماسٹر کے اشاروں پر کرتب دکھاتا رہے۔ ریچھ پیٹ کی خاطر گلی کوچوں میں ناچتے رہتے ہیں اور گنجی ساہیوں کے چرخے کاتتے رہتے ہیں اس لیے کہ اُن کی ناک میں نکیل ڈال دی جاتی ہے۔ ڈھیروں سونا چاندی کے مالک اور سینکڑوں میلوں میں پھیلی ہوئی زمینوں کے مالک جاگیردار بے پناہ قوت اور اختیار پر قابض ہوتے ہیں ان کے لیے مفلسوں اور محتاجوں کو مرعوب کرنا اور انہیں آزادی سے محروم رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ــــ

ہوائیں اُن کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا بہانہ ،،

(اقبالؒ)

(اور پھر دوسری طرف)

"مذہبی پیشوائیت اور اس کے حواری عام لوگوں میں یہ عیارانہ اور باطل پر مبنی تعلیم ذہن نشین کرانے میں مصروف ہیں کہ دنیا میں بھوکوں ننگوں اور حاجتمندوں کی موجودگی منشائے خداوندی کی دلیل و بُرہان ہے متمول اور صاحبانِ ثروت اپنے گناہوں کو بخشوانے اور اللہ کی رضا جوئی کے حصول کے لیے مجبوروں، لاچاروں، مفلسوں اور فاقہ کشوں کو بھیک، خیرات، صدقات اور زکوٰۃ کی شکل میں مدد کرتے رہتے ہیں۔"

چنانچہ آخر پر موصوف لکھتے ہیں کہ:

"تاریخ شاہد ہے کہ بادشاہوں نے، دنیا بھر کے غاصبوں، مہذب لیٹروں اور جمہوری حکمرانوں نے مذہبی پیشوائیت سے ساز باز اور گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور ان مذکورہ شخصیتوں سے مالی حصّہ اور معاوضہ بھی لیتے ہیں اور عزت و احترام کے گلدستے بھی نذرانے کے طور پر وصول کرتے ہیں۔ ان کی راہنمائی میں سماوی کتابوں کی عملی اتباع نہیں کی جاتی بلکہ محض گناہ بخشوانے کے لیے زبانی کلامی انہیں پڑھا جاتا ہے۔ گویا کسی نہ کسی طرح اپنی غلط کاریوں اور بداعمالیوں کو بخشش کے آبِ حیات سے دھو ڈالا جائے۔ خدا کی نازل کردہ کتاب میں جو طرزِ زندگی اختیار کرنے کی تعلیم ہوتی ہے، اُسے چھپایا جاتا ہے۔ (افسوس) دنیا کے کسی بھی ملک میں کوئی ایسا قانون منظور نہیں کیا گیا جس کی بنیاد اور اساس پر کوئی حاجتمند اور ضروریاتِ زندگی سے محروم انسان کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکے کہ میرے بال بچے مسلسل فاقے میں مبتلا ہیں میرا اعتراض اور دعویٰ سُنا جائے یا میری شکایت کو قانونی شکل دی جائے کہ جو ہماری محرومیوں اور مایوسیوں کے ذمّہ دار ہیں انہیں عبرتناک سزا دی جائے۔" (بحوالہ "تعمیرِ انسانیت" اگست ۱۹۸۶ء)

سوال یہ ہے:

بقول حقانی صاحب کے کیا ہم نے اپنی نمائندگی کا ٹھیکہ بڑے بڑے زمینداروں اور بڑے بڑے صنعت کاروں اور یا پھر بڑے بڑے سمگلروں اور منشیات فروشوں کو دے رکھا ہے؟

کاش ہمارے سامنے زکوٰۃ کے اس جاگیردارانہ (صاحبِ نصاب) تصور کی بجائے قرآنی زکوٰۃ کا وہ بلند و بالا تصور پیشِ نظر ہوتا جس کے تحت رزق کے تمام سرچشمے پوری نوعِ انسانی کی منفعت بخشی کے لیے اسلامی مملکت کی تحویل میں رہتے ہیں تاکہ ہر ذی حیات ان سے ہر آن بطور متاع استفادہ کرسکے اور اس طرح اقبال کے الفاظ میں پورے انسانی معاشرے کی کیفیت یہ ہو جائے ۔

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

چیف جسٹس سپریم کورٹ مسٹر جسٹس محمد حسین بہشتی مرحوم

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے ہی سلسلہ میں محمد حسین بہشتی (مرحوم) چیف جسٹس سپریم کورٹ ایران لکھتے ہیں:

" اسلام کی رُو سے اس قسم کی ملکیت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

" اور اللہ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے " (سورۃ النجم - آیت ۳۱)

" اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا مخلوقات میں ہر تصرف اس کی رحمت ہے۔ وہ اشیاء کو مفید بنانے اور کمال عطا کرنے کے لیے تصرف کرتا ہے ۔ وہ خود کسی چیز سے فائدہ نہیں اُٹھاتا ۔ اس کی ہستی بے نیاز ہے ۔"

" اسلام کے اقتصادی قوانین کے مطابق دولت کے تمام قدرتی ذرائع چاہے وہ خشکی پر ہوں یا سمندر میں یا فضا میں، عام انسانوں کی ملکیت ہیں اور وہ کسی طرح کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتے ۔ "

اس کے بعد جناب مسٹر جسٹس صاحب مال کے سلسلے میں فرماتے ہیں،

" معاشرے میں مال کا وہی درجہ ہے جو انسان کے بدن میں خون کا۔ جس طرح خون کو ہر وقت بدن میں گردش کرتے رہنا چاہیئے۔ اُسی طرح مال کو بھی معاشرے کے سب طبقوں میں گردش کرتے رہنا چاہیئے تاکہ معاشرے کے سب افراد اس سے طاقت حاصل کرتے رہیں اور ہمیشہ چست اور مستعد رہیں ۔"

" اسلام کے نقطۂ نگاہ سے مال ذریعہ ہے زندگی کی بہبود کا۔ انسانی ضروریات پوری کرنے کا۔ عوام کی حالت سُدھارنے کا ۔ اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ۔ "

(اسلام دینِ حکمت ۔ اُردو ترجمہ ۔ صفحہ ۵۰۸-۵۱۰)

علامہ غلام احمد پرویز (مرحوم) کا ارشاد

قرآن کے معاشی نظام کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ غلام احمد پرویز بانی تحریک طلوعِ اسلام اپنی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں لکھتے ہیں:

• حیاتِ ارضی کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ وہ سامانِ نشوونما جو فطرت کی طرف سے بلامزد و معاوضہ عطا ہوا ہے۔ اس کی تقسیم کس طرح کی جائے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ ایسی نشوونما کا ذریعہ کہ ان کی طبیعی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور ان کی مضمر صلاحیتیں بھی ابھرتی چلی آئیں۔ یہ ہے وہ بنیادی مسئلہ جس کا صحیح حل نہ ملنے کی وجہ سے انسان اس قدر جگر سوز مشقتوں میں مبتلا چلا آتا ہے۔ قرآن کریم نے اس مسئلہ کو تین لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ اس نے جب آدم (یعنی آدمی) سے کہا کہ تم نے زمین پر رہنا ہے تو ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ:

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (البقرہ۔ ۳۶)

تمہارے مفاد میں ٹکراؤ ہوگا، تم میں سے ہر ایک چاہے گا کہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لے۔ خواہ دوسروں کے لیے کچھ نہ بچے، نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ کچھ لوگ اتنا کچھ سمیٹ لیں گے کہ اس کے رکھنے کے لیے جگہ نہ ہوگی اور دوسرے لوگ، زندگی کی بنیادی ضرورتوں تک کے محتاج ہو جائیں گے۔ جو لوگ اس طرح رزق کے سرچشموں پر قابض ہو جائیں گے، وہ دوسروں سے اپنی مرضی منوائیں گے۔ اور ان پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس سے انسانی معاشرے میں فساد برپا ہوگا اور خونریزیاں ہوں گی۔ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

(نظامِ ربوبیت صفحہ ۲۔ ایڈیشن ۱۹۷۸ء)

کاش آج ہمارے سامنے قرآن کی پیش کردہ یہ درخشندہ تعلیم ہوتی کہ

زمین کو ہر ایک کے لیے کھلا رکھو

• اور اس نے اس کے اوپر پہاڑ کھڑے کر دیے (تاکہ زمین کے توازن کو قائم رکھنے کے علاوہ آب رسانی کا سلسلہ ٹھیک کام کرے) اور زمین میں فراوانیٔ رزق کی استعداد پیدا کر دی اور چار موسموں میں اس کی پیداوار کے اندازے مقرر کر دیے۔ اسے

"تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پر کھُلا رہنا چاہیئے۔" (۴۱/۱۰)

اور نبی کریم نے فرمایا:

"خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھُلی رکھو۔"

حقیقت یہ ہے کہ زمین جو رزق کا اوّلین سرچشمہ ہے پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ صرف انسانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات کے لیے بطور عطیہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ کے لیے ہے (۴۱/۱۰-۲۰/۱۶) اور یہ تو ظاہر ہے کہ جو چیز سب کے لیے مشترکہ عطیہ ہو اس میں تو ہر شخص برابر کا شریک ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال کی قرآنی بصیرت نے نوعِ انسانی کے اس قدر اہم اور پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کا حل مختصر ترین الفاظ میں اس طرح بیان فرمایا کہ:

کمیونزم + خدا = اسلام

اور نبی اکرمؐ نے اس عقدہ کو اس طرح وا کیا کہ "خدا کی زمین خدا کے بندوں کے لیے کھُلی رکھو" اور دوسرا یہ کہ "کام صلاحیت کے مطابق دام ضرورت کے مطابق" اور قرآن حکیم نے اس منزلِ مقصود کو حاصل کرنے کے لیے جذبۂ محرکہ حیات بعد الممات کو قرار دیا تاکہ انسان جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل کو دوسروں کے لیے کھُلا رکھے تاکہ اس طرح اس کے جسم کی پرورش کے ساتھ ساتھ اس کی ذات کی بھی نشوونما ہوتی جائے جو انسان کا حقیقی جوہر ہے تاکہ یہ جوہر حقیقی بغیر بیساکھی کے سہارے جہانِ فردا کی حسین دنیا میں چلنے اور اس کے پُر نور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل بن جائے۔

کمیونزم کے پاس کوئی حل نہیں

چونکہ کمیونزم کی بنیاد اس جہانِ فردا۔ کتاب۔ نبوت۔ ملائکہ وغیرہ پر نہ رکھی گئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ آخر ایک شخص دوسروں کے لیے کیونکر محنت کرے گا اور اس کے پاس دوسرے کے لیے محنت کرنے کے لیے جذبہ محرکہ کیا ہے تو اس نے کہا:

"یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ یہ نظام (جو بالحق ہے) کس جذبہ کے تحت قائم ہوگا۔"

(بحوالہ "نظام ربوبیت" شائع کردہ ادارہ "طلوع اسلام" لاہور)

اور یہی وہ بنیادی کمزوری تھی کہ جس وجہ سے کمیونزم کو کوئی محکم چٹان نہ مل سکی اور وہ آج پھر نظام سرمایہ داری کی طرف لوٹ چکا ہے۔

اور اس طرح وجود میں آنے والا قرآنی نظام (ہر فردِ معاشرہ کی) جسم و جاں اور اس کی ذات کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک سامان نشوونما (زکوٰۃ) فراہم کرے گا۔ برعکس اس کے کہ انتظامی مشینری مملکت کے افراد کو پہلے فاضلہ دولت جمع کرنے کی اجازت دے کر بعد میں ان سے غرباء کے لیے اڑھائی فیصد وصول کرے۔ اِس قسم کا مالیاتی نظام عجمی سازشوں کا وضع کردہ ہے اور بدقسمتی سے صدیوں سے اسی کو ہمارے ہاں اسلام کا حقیقی معاشی نظام متصور کیا جا رہا ہے۔

قرآن کا معاشی نظام اور مساواتِ محمدیؐ

مندرجہ بالا تصریحات سے قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کے بنیادی خدوخال تو بخوبی واضح ہو چکے ہوں گے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اِس سلسلہ میں ایک گوشہ ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ معاشی نظام میں اسلامی مساوات سے مفہوم کیا ہے اور پھر یہ کہ جنتِ ارضی کے حصول کی خاطر ایک قرآنی معاشرہ میں یہ "مساواتِ محمدی" کس طرح قائم ہوگی۔ چنانچہ جناب پرویز صاحب نے اِس کے متعلق جو کچھ تحریر کیا ہے، اس کا ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے۔

"روٹی، کپڑا، مکان بلکہ ہر قسم کی حفاظت، جیل خانے میں حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اِس کے باوجود جیل کی زندگی کو بدترین زندگی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اِس لیے کہ وہاں یہ سب کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن شرفِ انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے۔ جس معاشی نظام کی بنیاد ایسے فلسفہ پر ہو۔ جس میں انسانی زندگی کو محض طبیعی سمجھا جائے اِس میں انسانی اقدار کے تحفظ کا سوال ہی پیدا نہیں۔ اِس لیے اگر اس نظام میں روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ مہیا بھی ہو جائے تو بھی انسان حیوانات کی سطح پر رہتا ہے انسانی سطح پر نہیں آسکتا۔ اِس کے برعکس قرآنی نظام میں میسّر آنے والے رزق کو صرف رزق نہیں کہا گیا، اسے رزقِ کریم کہہ کر پکارا گیا ہے۔ "باعزت روٹی" یعنی وہ سامانِ زیست جس میں شرفِ انسانیت برقرار رہے۔ ان دونوں نظاموں میں یہی بنیادی فرق ہے، جسے

علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ: ؎

آں خدا نانے دہد، جانے دہد ایں خدا نانے دہد، جانے برد

اسی بنا پر حضورؐ اکثر فرمایا کرتے تھے الصدقۃ تمیت القلب۔ خیرات سے انسان کا دل مُردہ ہو جاتا ہے۔ قرآنی نظام میں، سامانِ زیست مملکت کی طرف سے ملتا ہے، نہ کہ افراد کے ہاتھوں۔"

کیفیت کی یکسانیت

قرآنی نظام میں مساوات سے مراد کمیت (QUANTITY) کی یکسانیت نہیں۔ اس سے مراد کیفیت (QUALITY) کی یکسانیت ہے۔ طبیعی زندگی کی یکسانیت کے متعلق اقبالؒ نے ایک مصرع میں ساری حقیقت کو یہ کہہ کر سمو دیا ہے کہ:۔ ع
خونِ شہ رنگیں تراز معمار نیست — طبیعی جسم کی ضروریات بادشاہ اور مزدور دونوں کی ایک جیسی ہوتی ہے۔ وہ کون سی طب ہے جو یہ کہتی ہے کہ ایک کروڑ پتی کے بچہ کے ناشتہ میں سیب، بادام، مکھن بالائی، انڈے، طبیعی ضروریات میں سے، اور مزدور کے بچے کی ضرورت سوکھی روٹی، بشرطیکہ وہ بھی میسر آجائے۔ (انفرادی ذوق یا تقاضائے صحت کے لحاظ سے اس میں کچھ تنوع پیدا کرلینا اور بات ہے۔ لیکن معیار سب کا یکساں ہوگا۔) قرآنی نظام میں اس قسم کا تفاوت نہیں ہوتا۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ عہدِ فاروقی میں جب آذربائیجان کا علاقہ فتح ہوا تو جیوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار حضرت عتبہ بن فرقد نے وہاں کی ایک خاص مٹھائی کے دو ٹوکرے، امیرالمومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجے۔ آپ رضؓ نے مٹھائی کو چکھا تو اسے بہت پسند کیا۔ لیکن کھانے سے پہلے قاصد سے پوچھا کہ اسے تمام مجاہدین نے کھایا ہے؟ قاصد نے جواب دیا کہ نہیں! یہ تو صرف آپ رضؓ کے لیے ہے۔ اس پر عتبہ کو جو خط لکھا وہ ہمارے پیشِ نظر نکتہ کی بہترین تفسیر ہے۔ آپ رضؓ نے لکھا:

"اللہ کے بندے، امیرالمومنین کی طرف سے عتبہ بن فرقد کے نام:۔
امّا بعد! فرقد تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو کچھ خدا نے ہمیں عطا کیا ہے، وہ نہ تمہاری ذاتی محنت و مشقت کا نتیجہ ہے۔ نہ تمہارے ماں باپ کی محنت و مشقت کا نتیجہ۔ (یہ تمام مسلمانوں کی مشترک محنت کا ثمر ہے۔) اس لیے ہم کوئی ایسی چیز نہیں کھاتے جو تمام مسلمانوں کے گھروں میں کافی مقدار میں نہ ہو۔"

(بلاذری۔ فتوح البلدان)

یہ ہے رزق کی مساوات کا مفہوم۔ یہی عتبہ جب ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے ہاں آئے تو آپ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جو کی روٹی تھی۔ حضرت عتبہ نے کہا کہ امیرالمومنین

آپ جو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں؟ گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے۔ آپؓ نے فرمایا،
"فرقد! کیا تمام مملکت کے افراد کو گیہوں کی روٹی میسّر آ رہی ہے؟" انہوں نے
کہا کہ ایسا تو نہیں۔ اس پر آپؓ نے فرمایا کہ "فرقد! عمرؓ کس قدر بُرا حاکم
ہوگا کہ رعایا تو جو کی روٹی کھائے اور عمرؓ گیہوں کی۔ عمرؓ اس دن گیہوں کی
روٹی کھائے گا جب تمام افرادِ مملکت کو گیہوں کی روٹی ملنے لگے گی۔"

(طبری۔ عہدِ فاروقی)

یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا عملی مفہوم۔ اسلامی مملکت میں وسائل کے مطابق معیارِ زندگی متعین کر لیا جائے گا۔ اور یہ معیار، مملکت کے تمام افراد کا ایک جیسا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ آغازِ کار میں اس کا نقشہ وہ ہو جسے حضرت ابو موسےٰ اشعری رضؓ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

"اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں کھانا تھوڑا رہ جاتا، یا کسی اور وجہ سے سامانِ خورد و نوش میں کمی واقع ہو جاتی تو یہ لوگ کھانے پینے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔ اور حصّے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔"

(صحیحین)

جوں جوں مملکت کے وسائل زیادہ ہوتے جائیں گے۔ یہ معیار بلند ہوتا جائے گا حتیٰ کہ یہ اس مقام تک پہنچ جائے گا جسے قرآن نے تمثیلاً جنّت کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرے کے متعلق کہا ہے کہ اس میں شہد اور دودھ کی نہریں ہوں گی۔ پھلدار درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ پرندوں کا گوشت کھانے کو، عمدہ ترین لباس پہننے کو ہوگا۔ حریر و اطلس کے پردے مخمل اور کمخواب کے صوفے، اور اعلیٰ درجہ کے قالین زینت دہ فرش ہوں گے لیکن یہ سامان تمام اہلِ جنّت کو یکساں طور پر میسّر ہوگا — اور دوسرا طبقہ نانِ جویں پر گزارہ کر رہا ہوگا۔ جہاں تک ان کی "انسانی زندگی" کا تعلق ہے اعمال کے مطابق ان کے مدارج میں تفاوت ہوگا۔ لیکن جہاں تک زندگی کی طبیعی ضروریات کا تعلق ہے، وہ سب کے لیے یکساں موجود ہوں گی۔ (طبیعی زندگی کی ضروریات میں حسنِ ذوق (AESTHETIC TASTE) بھی شامل ہے) یہی وہ اصول ہے جسے حضرت صدیقِ اکبرؓ

نے وظائف کے تعین کے سلسلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ آپ رض نے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق وظیفہ مقرر کیا۔ اس پر بعض حضرات نے کہا کہ جن لوگوں نے اسلام کی زیادہ خدمت کی تھی جنگوں میں زیادہ حصّہ لیا تھا، انہیں زیادہ ملنا چاہیئے۔ اس پر آپ رض نے فرمایا کہ "ان لوگوں کو ان کی خدمت کا صلہ خدا کے ہاں سے ملے گا۔ ہم معاشی تقسیم کر رہے ہیں۔ اس میں ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنا چاہیئے۔ یہ ہے مساواتِ محمدیؐ کا اصول ہے"۔

(بحوالہ مساوات محمدیؐ)

علامہ اقبال اور روٹی کا مسئلہ

علامہ اقبال جنہوں نے اپنے اشعار میں "قل العفو" کے اس قرآنی مفہوم کو ہی اُجاگر کیا تھا آپ نظامِ سرمایہ داری کے بھیانک نتائج سے بخوبی واقف تھے کہ یہ نظام انسانی زندگی کو کس قسم کی مہلک بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ آپ کے ہی الفاظ ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیلِ رواں میں اصول و مذہب بھی بے انتہا مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہوئی ہے کہ روزی کمانے کا دھندہ ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے سے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریاتِ زندگی کے مکمل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے، غریبی قویٰ انسانی پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی رُوح کے مجلا آئینہ کو اس قدر پراگندہ کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم وجود برابر ہو جاتا ہے"

پھر فرمایا" اس زمانہ میں یہ سوال پیدا ہُوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظامِ عالم میں ایک ضروری جزء ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں۔ اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔"

(بحوالہ "اقبال اور قرآن" صفحہ ۸، شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام)

قائدِ اعظم اور سرمایہ دار

جہاں تک قائدِ اعظم کی ذات کا تعلق ہے تو ان کی دُور رس نگاہ بھی نظام سرمایہ داری کے نتائج

سے پوری طرح آگاہ تھی کہ یہ نظام انسانوں میں ہر قسم کی طبقاتی تفریق پیدا کر دیتا ہے اور پھر ملت فروش ان طبقاتی گروہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے قوم کو پارٹیوں میں تقسیم کیے رکھتے ہیں۔ تاکہ ملت کا باہمی انتشار اس کے قویٰ کو اس قدر مضمحل کر دے کہ ان کی تجوریوں کی طرف کسی کا ہاتھ بڑھنے ہی نہ پائے۔ حضرت قائدِ اعظم کی یہی وہ بلند نگہی تھی کہ جس کی بنا پر آپ نے پاکستان بننے سے بھی ۴ سال پیشتر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"اس مقام پر مَیں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سُننے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہو۔ مَیں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں مَیں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو مَیں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

لیکن افسوس پاکستان بننے کے ۴۰ سال بعد تک بھی نہ تو ہمیں حضرت علامہ کے درد انگیز نالے سُنائی دیئے اور نہ ہی ہم نے اپنے قائد کی بلند صدا کو کوئی اہمیت دی بلکہ اس کے برعکس اپنی مفاد پرستی کی تکمیل کی خاطر "تجوریوں کے منہ کھول دینے والے" نظام کی ہی آبیاری کرتے رہے اور اس طرح اہلِ پاکستان بھی دیگر مسلم ممالک کی طرح مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے بعد اقتصادی فرقہ بندی میں اُلجھ کر رہ گئے۔ یاد رکھیں کہ نوعِ انسانی کی معاشی مشکلات کا حل قرآنِ حکیم کے نظامِ ربوبیت میں ہی مضمر ہے اور کہیں نہیں۔

اور اس نظام کا ماحصل یہ ہے کہ: ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اس کے بعد اب ہمارا رختِ سفر ہمیں اس قریہ کی طرف لیے جاتا ہے جہاں کی نوجوان نسل کا ایک ایک بچہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں ہر اہلِ دانش کو پکار رہا ہے کہ ؎

دل توڑ گئی میرا دو صدیوں کی غلامی
دارُو کوئی سوچ میری پریشاں نظری کا!

پندرھواں باب

تعلیم

ارشادِ قائدِ اعظم

"پاکستان کا مستقبل اس بات پر منحصر ہوگا کہ ہم اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دیتے ہیں۔"

حصولِ آزادی کی قیمت

کسی قوم کو جغرافیائی آزادی حاصل کرنے کی خاطر جس قدر جانکاہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہر قوم کو اس مقصد کے حصول کی خاطر صدیوں دوسروں کے ساتھ نبرد آزما ہونا پڑا۔ خون کے دریا پھلانگنے گئے۔ قتل اور غارت گری اس کا معمول بن کر رہ گئی۔ اس قوم نے اس نیلم پری کے دیدار کی خاطر نسل در نسل اپنے جسم و جاں کا نذرانہ کچھ اس طرح پیش کیا کہ تاریخ کے اوراق پر انسانی خون کے بے شمار دھبوں کے باعث اور کچھ تحریر ہی نہ ہوسکا اور تب کہیں جاکر اسے کرۂ ارض کے ایک کونے میں اپنے قدم جمانے کا موقع حاصل ہوا۔ لیکن اس قدر جنگ و جدل اور ستم ظریفی پر بھی بات ختم نہ ہوئی بلکہ اس ثمر باری کو دوسروں کی دسترس سے محفوظ رکھنے کے لیے اُسے قدم قدم پر کھربوں روپے کی لاگت سے توپ و تفنگ کا وہ مہلک سامان حاصل کرنا پڑا کہ جس کے باعث لاکھوں معصوم جانیں اور انسان کی تعمیری صلاحیتیں اس بے دردی سے نذرِ آتش ہوئیں کہ کوئی انسانی پیمانہ آج تک ان کا وزن کر ہی نہیں پایا۔

نظریاتی مملکت کا حصول

مشکل اندر مشکل یہ کہ جس مملکت کی بنیاد کسی خاص آئیڈیالوجی پر رکھنی مقصود ہو یعنی ایسی آئیڈیالوجی اور پھر

ایسی نظریاتی مملکت جس میں کوئی شخص نہ کسی کا حاکم ہو نہ محکوم، نہ محتاج۔ جس میں کوئی انسان بھی کسی دوسرے انسان کا شکار نہ کر سکے۔ جس میں انسان کی اپنی محنت ہی اس کا معاوضہ تسلیم کیا جائے اور جہاں انسان کی عظمت صرف انسان ہونے کی جہت سے محترم قرار پائے۔ جہاں قدم قدم پر ہر لمحہ اور ہر لحظہ رنگ، نسل، زبان اور علاقہ کی قربانی پیش کرنا پڑے جہاں نہ کوئی فرعون باقی رہے نہ ہامان اور نہ قارون، جس میں نہ مغرب کی اجارہ داری قائم رہ سکے نہ مشرق کی توہم پرستی، جس میں مذہبی پیشوائیت اور خانقاہیت کی تمام دوکانیں سربمہر کردی جائیں۔ المختصر جس نظریاتی مملکت کی آئیڈیالوجی اپنے زور دروں سے قیصرو کسریٰ کی قدیم سے قدیم تہذیب کو اُلٹ کر رکھ دے تو اس مملکت کا قیام تو سیکولر سٹیٹ سے بھی زیادہ مشکل اور ہمت طلب ہوتا ہے۔ مذہب دین کے مقابلے میں پیدائشی اندھا اور جذباتی ہوتا ہے۔

اس لیے جب خدا کا دین مذہب میں بدل جائے تو اس قوم میں نظریاتی ہم آہنگی باقی نہیں رہتی اور اس طرح اپنے، بیگانے سب اس نظریاتی مملکت کے قیام کے مخالف ہو جاتے ہیں اور اس مملکت کے قیام کے بعد قوم کا یہ باہمی انتشار خانہ جنگی کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس کی جغرافیائی حدود ہی کو مخدوش بنا دیتا ہے۔ اور آخر کار بات بنائے بھی نہیں بنتی اور صورت حال یہ ہو جاتی ہے کہ باہمی طور پر ایک دوسرے کے گلے کاٹنے والی اس قوم کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا کیونکہ دوسروں کے لیے یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ یہ معاملہ اس قوم کا اندرونی معاملہ ہے اور اس طرح وہ قوم بتدریج اپنے تشخص سے ہی محروم ہو جاتی ہے اور آخر کار اقبال جیسے دیدہ ور اور غم گسار انسان کو اس قوم کے لیے "امتِ مرحوم" کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔

علّامہ اقبال اور زوالِ داستان

پاکستان کے اندر فروری ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والی سربراہی کانفرنس کی خدمت میں صدرِ کانفرنس جناب ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) سابق وزیرِاعظم پاکستان نے جو استقبالیہ پیش کیا اُس میں مسلمانوں کی عمومی زوال کی داستان پیش کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ:

"علامہ اقبال کے الفاظ میں

اِس طویل دورِ انحطاط میں یوں سمجھیے کہ ہم افکار و جذبات کے اُس قید خانہ میں محبوس رہے جسے ہم نے اپنے ہاتھوں سے خود ہی تعمیر کر رکھا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے متکلمین اور متقشفین کی تخیل پسندی نے اسلام کے بلند و بالا نصب العین حیات کو منجمد کر کے رکھ دیا

تھا۔ ذہنی جمود نے ہماری فکر کو مفلوج کر دیا تھا۔ خارجی کائنات ہمارے لیے افسردہ و پژمردہ ہو چکی تھی۔ قدامت پرستی کی تاریکیاں ہم پر مسلط ہو چکی تھیں۔ تحقیق و تجسس کی رُوح مر چکی تھی۔ رسومات کے پیکروں نے روح سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی تھی۔ ہم فرقوں میں بٹ چکے تھے اور یہ فرقے ہمیشہ باہم گر معروف جنگ و پیکار رہتے تھے۔ اس انتشار و افتراق نے بیرونی یورشوں کے دروازے کھول دیئے اور ہم رفتہ رفتہ مغربی استعمار کا شکار ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ اِس سے ہماری ثقافت کی دھجیاں بکھر گئیں۔ ہماری روایات ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں اور ہم میں ربطِ باہمی کا کوئی سلسلہ باقی نہ رہا۔ استعماری قوتوں نے ہمارے بیش بہا ورثہ کو خود ہماری نظروں میں حقیر بنا دیا۔ وہ ہمارے خزانے لوٹ کر لے گئیں اور ہمیں ہمارے ذرائع سے محروم کر دیا۔ ہمارے نونہالانِ ملت ان کے عیار مقاصد کی بھینٹ چڑھ گئے۔ بھائی بھائی سے الگ ہو گیا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی جان کا دشمن بن گیا۔" (پاکستان ٹائمز۔ ۲۳ر فروری ۱۹۷۴ء)

نظریاتی مملکت کے تحفظ کا علاج

پاکستان جیسی نظریاتی مملکت کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے ہم نے کیا کچھ کیا اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں، اس کا اندازہ ہر شخص اپنی اپنی دانست کے مطابق سابقہ صفحات اور مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں لگا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی اندازہ ہو چکا ہو گا کہ ایک نظریاتی مملکت کے تحفظ کی خاطر اس مملکت کی جغرافیائی سرحدوں پر گھوڑے ہی کس کر باندھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ اس قوم نے اجتماعی طور پر اس مخصوص آئیڈیالوجی کے تحت نظریاتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر تعلیمی میدان میں کیا کچھ کیا۔ لہٰذا ہمیں اس چیز کا جائزہ لینا ہو گا تاکہ صورت حال مزید نکھر کر سامنے آ جائے اور شاید ہمارے کانوں تک صدر ایوب مرحوم کے ان الفاظ کی رسائی ہو جائے جو انہوں نے قاہرہ میں نیشنل یونین ریلی کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے یعنی یہ کہ:

صدر ایوب مرحوم کی نگاہ بصیرت

"ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہنِ رسا کے بھی ایسا ہی

قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔ یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے لیکن۔۔۔۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ کیا بیتی ہے۔ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام کی طرف نگاہ ڈالیے بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔ آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورت حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہو گئی ہے؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے؟ اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ وہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ "

اس دعوت غور و فکر کے پیش نظر اگر دیکھا جائے تو یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ قوموں کی تعمیر میں نئی نسل کی فکر کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جبکہ فکر کی نشو و نما اس تعلیم کی رہین منت ہوتی ہے جو اس قوم کو دی جا رہی ہے۔ راقم نے سابقہ صفحات میں مختلف عنوانات کے تحت جو صورت حال پیش کی ہے وہ بنیادی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمارے ہاں دی جانے والی تعلیم کا ہی نتیجہ ہے۔ لیکن اس عرضداشت کے باوجود " دینی اور دنیاوی " تعلیم کے متعلق بعض حقائق ابھی باقی ہیں جن کی طرف ہر کس و ناکس کی توجہ دلانا راقم اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

ٹیکنالوجی کی اہمیت اور ہم

قبل اس کے کہ ہم نظریاتی تعلیم کے انحطاط کے متعلق کچھ گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت مختصر الفاظ میں یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم آج " دنیاوی " تعلیم کے میدان میں کس مقام پر کھڑے ہیں۔ لہٰذا یہ جاننے کے لیے مجھے یہاں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالم کا ایک حصہ درج کرنا ہوگا جو آپ نے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کو " سائنسی اور فنی تعلیم و تربیت کی ناگفتہ بہ حالت " کے عنوان سے تحریر کیا تھا اور وہ یہ کہ :

> " سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور ریسرچ کے لیے ملک میں دستیاب سہولتوں کے بارے میں باخبر حلقے پہلے ہی کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھے۔ لیکن اگلے روز کراچی یونیورسٹی کے زیر اہتمام " سائنس، تعلیم اور ریسرچ میں یونیورسٹی کا کردار " کے موضوع پر جو دو روزہ مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی اور جس میں ملک بھر کی انیس یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور دوسرے ممتاز ماہرین تعلیم نے شرکت کی اس کی

کارروائی پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سائنسی تعلیم کے میدان میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔ ابتدائی درجوں سے یونیورسٹی کی سطح تک سائنسی تعلیم کے لیے جو سہولتیں دستیاب ہیں، ان کی تفصیل اس قدر افسوسناک ہے کہ انسان کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے اس دور میں جبکہ انسان کو چاند پر پہنچے تیرہ سال ہو چکے ہیں کہ ملک میں صورتِ حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو سکتی ہے۔

یہ بات باخبر حلقوں کو پہلے سے معلوم تھی اور اب بعض ماہرین نے اس کا پھر تذکرہ کیا ہے کہ ہائی سکول کی سطح تک پورے ملک میں سائنس کی تعلیم و تدریس کے لیے سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مناسب طور پر آراستہ لیبارٹریوں کی موجودگی تو خیر ناقابلِ تصور ہے ہی ۸۰۔ ۹۰ فیصد سکولوں میں کوئی ایسا کمرہ بھی نہیں جسے سائنس روم کہا جا سکتا ہو۔ اکثر سکولوں میں مناسب تعلیم اور تربیت رکھنے والے سائنس ٹیچر موجود نہیں بلکہ کسی بھی استاد کو سائنس کی کلاس پڑھانے پر مامور کر دیا جاتا ہے۔"

یونیورسٹیوں کی حالت

یہ کچھ تو کراچی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ہونے والی مجلسِ مذاکرہ کی روئداد تھی اور اگر آپ اس سلسلہ میں مزید آگہی حاصل کرنا چاہیں تو روزنامہ نوائے وقت بابت ۲۲، اکتوبر ۱۹۸۲ء کا وہ اداریہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو تعلیمی انحطاط کے نام پر تحریر کیا گیا تھا۔ اور وہ یہ کہ:

"پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے صد سالہ جشن کے موقعہ پر ایک پروفیسر نے بڑے دکھ سے یہ تاثرات ظاہر کیے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیمی فضا میں علم کی جستجو اور ذہنی نشوونما کا عمل مدھم پڑ گیا ہے۔ نظم و ضبط کا فقدان واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اساسی نظریات کی رُوح بھی ماند پڑ گئی ہے۔ طلباء کے اسباق رٹنے کی عادت کی وجہ سے اب علمی تجسس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اب تو اعلیٰ تعلیم کا مقصد اچھے درجے میں صرف ڈگری کا حصول رہ گیا ہے۔ طلباء خواہ وہ باقاعدہ طالب علم ہوں یا پرائیویٹ دونوں کا علم کے ساتھ سطحی رابطہ رہ گیا ہے۔ اقساط کے ساتھ امتحان پاس کرنا ایک عادت بن گئی ہے۔ طلباء کی اجتماعی زندگی میں علمی اور ثقافتی سرگرمیوں سے زیادہ سیاسی رقابتیں اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔"

اور اگر یہاں کے امتحانی نظام کی دگرگوں حالت کو جاننا مقصود ہو تو ہمیں روزنامہ جنگ لاہور کا اداریہ بابت ۱۵، جنوری ۱۹۸۵ء دیکھنا ہوگا۔ تحریر ہے کہ:

"بی اے۔ بی ایس سی کے امتحان میں ناجائز ذرائع کے استعمال پر چھ سو طلباء کو ایک سے پانچ سال تک امتحان دینے کا نااہل قرار دیا جا چکا ہے اور مزید ہم سو طلباء کو اظہارِ وجوہ۔ کے نوٹس۔

دیئے گئے ہیں۔ نیز امتحانی مراکز میں بعض طلبہ کی طرف سے دھونس اور غنڈہ گردی کے مظاہرے بھی ہوتے رہتے ہیں۔"

صدر غلام اسحاق خان صاحب کا بیان

پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے صد سالہ جشن کے موقعہ پر جناب پروفیسر موصوف کے بیان کے بعد اب آپ نومبر ۱۹۸۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ۱۰۸ ویں کانووکیشن کے موقع پر صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خاں صاحب کے خطاب کی چند ایک ہیڈلائن ملاحظہ کریں جو ہماری سوچ کا رخ بدلنے کے لئے کافی ہیں۔ مائیں اپنے طالب علم بیٹوں کو گولی چاقو سے محفوظ رکھنے کی خاطر امام ضامن باندھ کر رخصت کرتی ہیں یہ کیسا مہذب معاشرہ ہے؟ پاکستان ۲۳ کروڑ کی پان چھالیہ اور صرف ۳۰ کروڑ کی کتابیں درآمد کرتا ہے ——— گزشتہ چھ ماہ میں تعلیمی اداروں میں ۱۲۹ سنگین واقعات ہوئے، ۱۷ قیمتی جانیں تلف ہوئیں، ۲۸۰ افراد زخمی ہوئے، ان تعلیمی اداروں میں چار سال کا کورس چھ سال میں بمشکل مکمل ہوتا ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے تعصب اور نفرت کا مرکز بن رہے ہیں ہم سند یافتہ جاہل ہی پیدا کر سکیں گے۔ تعلیم یافتہ نوجوان نہیں، کتابیں چھوڑ کر کلاشن کوف اٹھانے والے ہاتھ اپنی زندگیوں کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہتے۔ علم کی پیاس پر منشیات کی طلب غالب آ رہی ہے، کیمپس کے مہذب ماحول پر غنڈہ گردی کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے انتباہ کیا کہ اگر ہم نے وقت ضائع کئے بغیر ان حالات کا تدارک نہ کیا گیا تو مستقبل میں ذلت و خواری ہماری منتظر ہوگی۔ ہمارا نظام تعلیم ابہام اور ایڈہاک ازم کا شکار رہا ہے، ایک طرف عالیشان درسگاہیں ہیں دوسری طرف بغیر چھت کے سکول، تضادات دور کئے بغیر تعلیمی نظام میں ترقی نہیں ہو سکتی

ٹیکنالوجی کے لیے فنڈ

ٹیکنالوجی کے اس دور میں سائنسی تحقیقات پر ہم کیا خرچ کرتے ہیں اس کا اندازہ پاکستان اٹامک کمشن کے چیئرمین منیر احمد خاں صاحب کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے جنوری ۱۹۸۳ء کو ثانوی تعلیمی بورڈ سرگودھا کے زیر اہتمام سائنسی میلے کا افتتاح کرتے ہوئے دیا۔ آپ نے فرمایا: "ہم آج کل قومی پیداوار کا ہزارواں حصہ سائنسی تحقیقات پر خرچ کر رہے ہیں۔"

اس کل قومی پیداوار کے ہزارویں حصہ کا استعمال بھی ہمارے ہاں کس حد تک ہوتا ہے تو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ

۳ر جون ۱۹۸۶ء کے اداریہ کے مطابق :

" انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے نئے کمپیوٹر کی تنصیب کے لیے ۴۵ لاکھ روپے کی جو گرانٹ یونیورسٹی گرانٹس کمشن نے دینا منظور کی تھی، وہاں کی انتظامیہ اسے حاصل کرنے اور استعمال میں لانے سے قاصر رہی جس سے یہ گرانٹ ضائع ہو گئی ۔"

اس کے بعد مدیر جنگ رقمطراز ہے کہ : " ایک طرف تو ہمارے بیشتر تعلیمی ادارے ضروری ساز و سامان سے محرومی کا رونا روتے ہیں دوسری طرف ایک فنی تعلیمی ادارہ کی انتظامیہ نے اپنی کوتاہی سے گرانٹ ضائع کر دی اور طلبا ایک جدید کمپیوٹر کے استفادہ سے محروم رہ گئے ۔ معاملہ توجہ طلب اور تحقیق طلب ہے ۔"

ظاہر ہے کہ آج کے دور میں جب کوئی قوم ٹیکنالوجی کی تعلیم سے اس قدر لاتعلق ہو کر رہ جائے یا اسے لاتعلق کر دیا جائے اور اس کے بعد یہ کہ اس کے سکول کالج اور یونیورسٹی ان گنت سیاستدانوں کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائیں تو پھر اس قوم کی جغرافیائی سرحدوں کے مخدوش مستقبل کے متعلق جاننے کے لیے کسی افلاطونی دماغ کی ضرورت نہیں رہتی ۔

جہاں تک ہمارے ہاں عام مطالعہ کا تعلق ہے تو اس کا موازنہ کچھ اس طرح ہے کہ :

۱۹۸۶ء کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق یورپی ممالک میں یونیورسٹیوں کے طالب علم اپنی تعلیمی اور معلوماتی استطاعت کو بڑھانے کی غرض سے اوسطاً ہفتے میں دو کتابیں پڑھتے ہیں جبکہ ہمارا طالب علم سال میں بھی دو کتابیں نہیں پڑھ پاتا ۔

خواندگی کا تناسب

اور اس کے بعد جہاں تک پاکستان میں خواندگی کا تعلق ہے، یہاں آج یہ ۲۵-۲۶ فیصد سے زیادہ نہیں ۔ اور صوبہ بلوچستان میں تو صرف ۲-۳ فیصد خواندہ ہیں جبکہ عورتوں کا تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونا مردوں کی تعلیم سے بھی زیادہ ضروری ہے ۔ بقول پیر علی محمد راشدی صاحب :

" جب تک عورتوں میں تعلیم نہیں ہوتی تب تک صرف مردوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے سے کچھ نہیں بنے گا ۔"

وفاقی وزیر تعلیم کا بیان

خواندگی کے سلسلہ میں تو وفاقی وزیر تعلیم ڈاکٹر محبوب الحق نے تعلیم کی بگڑی ہوئی صورت حال کو تشویشناک قرار دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ :

" اگر یونیسکو کے معیار کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پاکستان میں خواندگی کی شرح ۲۶ فیصد سے گھٹ کر ۱۰ فیصد سے بھی کم رہ جاتی ہے جبکہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ہم وطنوں کی تعداد ۲ فیصد سے زیادہ نہیں"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵ مئی ۱۹۸۶ء)

اور اب تو بعض یونیورسٹیوں میں فلسفے کی تعلیم بھی بند کردی گئی ہے۔ ان حالات میں آنے والا دور اپنے اندر کس قسم کی ہولناکیاں لیے ہوئے ہے اس کے لیے مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ کرنا مناسب ہوگا۔

جنگ فورم میں مجلس مذاکرہ

اعلیٰ تعلیم پر فروری ۱۹۸۶ء میں جنگ فورم میں خصوصی مجلس مذاکرہ کے دوران پروفیسر خواجہ امجد سعید صاحب نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ:

" جاپان کے نظامِ تعلیم کو دنیا کے بہترین نظاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ۲۴۵ دن درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے جبکہ ہمارے ملک میں صرف ۱۲۰ دن یونیورسٹیوں میں پڑھائی ہوتی ہے۔"

جناب امجد سعید صاحب کے بعد جناب پروفیسر مقصود الحسن بخاری نے فرمایا کہ:

" اکانومسٹ میں ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کے مطابق پاکستان تعلیمی شعبے میں ۵۰ برس پیچھے ہے اور امریکہ کے مقابلے میں پوری ایک صدی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۸ فروری ۱۹۸۶ء)

اور جہاں تک موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بیروزگاری کا تعلق ہے تو فروری ۱۹۸۶ء میں روزنامہ جنگ کی اشاعت کے مطابق:

جونیئر کلرک کی اسامی کے لیے گیارہ ڈبل ایم اے امیدوار

یہاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے علاقائی دفتر میں جونیئر کلرک کی ایک اسامی کے لیے تین سو افراد نے درخواستیں دی ہیں۔ جن میں بیس ایسے افراد ہیں جو ایم اے تعلیم یافتہ ہیں اور ۱۱ ایسے ہیں جنہوں نے ڈبل ایم اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ ان میں سے پچاس درخواستوں پر مختلف سندھ کے وزراء کے سفارشی نوٹ درج ہیں جبکہ ایک صوبائی وزیر نے خود دفتر آکر اپنے امیدوار کی سفارش کی۔

ایک اور خبر کے مطابق ملک میں سالانہ پچیس لاکھ بے روزگاروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ (بحوالہ نوائے وقت لاہور ۲۶ $\frac{1}{86}$)

نوجوانوں کے اِس قسم کے مسائل کے پیشِ نظر مدیر روزنامہ جنگ لاہور "تنظیم جواں فکر" کے حوالے سے رقمطراز ہے کہ:

نوجوانوں کے مسائل

"تنظیم جواں فکر لاہور نے پاکستان کے نوجوانوں کے مسائل پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے جس کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی۔ وہ بیروزگاری کا شکار ہیں، ان کا کوئی مقصدِ حیات نہیں اور وہ ذہنی اور نفسیاتی کرب میں مبتلا ہیں۔ ملک کی کل آبادی کے ۴۸ فیصد کی عمر پندرہ برس سے کم ہے مگر اس کی تعمیر و ترقی کے لیے حکومت کے پاس کوئی مربوط منصوبہ نہیں اور یہ ایک خوفناک حقیقت ہے۔ آئندہ چند برسوں میں جب وہ کھانے کمانے کے لیے گھروں سے نکلیں گے تو کدھر جائیں گے۔ ان میں سے اکثریت ناخواندوں اور بے ہنروں کی ہوگی۔ ان کو ملکی معیشت میں کھپانا ممکن نہ ہوگا۔ یعنی کس کے گھر جائے گا طوفان بلا میرے بعد۔ اب بھی یہ عالم ہے کہ ایک ایک آسامی کے لیے ہزاروں درخواستیں آرہی ہیں اور تعیناتی کے لیے سفارشیں سفارشوں سے ٹکرا رہی ہیں۔ پاکستان کی حکومتیں روزِ اول ہی سے ملکی مسائل کے سلسلے میں ڈنگ ٹپاؤ پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ مستقبل پر کبھی کسی نے نظر نہیں ڈالی۔ کچھ صنعتی منصوبے ضرور بنے، مشینی کاشت بھی رواج پاگئی اور پیداوار میں اضافہ بھی ہُوا۔ مگر اس کے نتیجے میں جو بیروزگاری پھیلی اس کا حساب کسی نے نہ لگایا۔ نوجوانوں کے لیے صحت مند تفریح کا کوئی انتظام نہیں۔ وہ کھیت، کھلیانوں اور گلی بازاروں میں آوارہ پھرتے ہیں تو ان پر لعن طعن کی جاتی ہے۔ خوشحال گھرانوں کے نونہال عیش کوشی ہی کو حاصلِ زندگی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان میں ہیروئن کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ متوسط طبقے کی بچیاں حالات سے مجبور ہو کر کام کاج کو گھروں سے نکلتی ہیں تو ان پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ غرض چاروں طرف ایک مایوسی کا عالم ہے۔ وعظ و نصیحت اس کا علاج نہیں۔ ان کے لیے کسی باقاعدہ منصوبے کی ضرورت ہے جو ان کی صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچائے۔"

(اداریہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۸ جولائی ۱۹۸۵ء)

خوداحتسابی کی درخشاں مثال

نوجوانوں کے مسائل کے سلسلہ میں اس جگر سوزی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر روزنامہ نوائے

وقت لاہور کا وہ اداریہ جو ۷ ارمئی ۱۹۸۸ء کو سپردِ قلم کیا گیا تھا قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گو اس اداریے کا روئے سخن اسلامی جمیعت طلبہ کی طرف ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ جناب مدیر کی طرف سے پیش کردہ گذارشات اور حقائق تمام طالب علموں کے لئے مشعل راہ ہیں اور وہ اس لئے کہ ملت پاکستان کا ہر طالب علم ہر فرد کے لئے سرمایہ حیات اور قابل احترام ہے۔ بہر حال جناب مدیر لکھتے ہیں کہ :-

"اسلامی جمیعت طلبہ کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں انجنیئرنگ یونیورسٹی میں پیش آنے والے حالیہ واقعات پر غور و خوض کے بعد وائس چانسلر کے ساتھ بدسلوکی کو ہر لحاظ سے قابل مذمت قرار دیا گیا۔ ان سے معذرت کا اظہار کیا گیا اور اس واقعہ کے ذمہ دار ان افراد کو جمیعت سے خارج کر دیا گیا ہے جنہوں نے بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اخلاقی اصولوں سے انحراف کیا۔ انجنیئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے ساتھ بدسلوکی، انہیں اغوا کرنے اور دھمکیاں دینے کا واقعہ انتہائی افسوسناک تھا جس کے ردعمل کے طور پر یونیورسٹی کے ستر اساتذہ نے اپنے استعفےٰ پیش کر دیئے اور یونیورسٹی کا تمام نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ طلبہ کی ایک ایسی تنظیم کے عہدیداروں کی طرف سے جو دینی اقدار اور اخلاقی اصولوں سے وابستگی کی علمبردار ہے ایسی حرکت پر عوامی اور تعلیمی حلقوں نے تشویش کا اظہار کیا تاہم یہ امر باعث اطمینان ہے کہ جمیعت کی مجلس شوریٰ نے اخلاقی ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور وائس چانسلر سے معذرت کر کے اس معاملے کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے اس واقعہ کے ذمہ دار افراد کا جمیعت سے اخراج بھی خود احتسابی اور اخلاقی اصولوں کی ہر حال میں پابندی کے اعلان کے مترادف ہے جس کو سراہا جائے گا۔ اس تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یا اسے آگے بڑھاتے ہوئے اسلامی جمیعت طلبہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کردار اور حالیہ طرز عمل کا از سر نو جائزہ لے اور اسی حقیقت پسندی کے ساتھ جس کا مظاہرہ انجنیئرنگ یونیورسٹی کے واقعہ کے سلسلہ میں کیا گیا یہ تجزیہ کرے کہ بالخصوص مارشل لاء دور میں تعلیمی اداروں میں اس کی ساکھ کو کس قدر نقصان پہنچ چکا ہے اور اسے بحال کرنے کے لئے کن اقدامات کی ضرورت ہے کیونکہ یہی نسل آئندہ زندگی کے ہر شعبے میں ذمہ دار شہری کے طور پر کردار ادا کرے گی اگر ان کے کچھ ساتھی خواہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی کیوں نہ ہو اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا ارتکاب کریں گے تو لا محالہ اس سے جمیعت بلکہ پوری نوجوان نسل کی بدنامی ہوگی جو کسی المیہ سے کم نہیں، اس لئے جمیعت نے اپنے ساتھیوں کے اس عمل

لہ۔ ہمارا خیال ہے کہ "آہنگِ بازگشت" کے یہ الفاظ ہر درسگاہ کی در و دیوار پر کندہ ہونے چاہیئے کہ "آپ نہیں جانتے آپ کا بچہ کیا ہے اس لئے اسے حقیر نہ سمجھئے اس کی تعظیم کیجئے"۔

سے اظہار برآت اور انہیں اپنی صفوں سے خارج کرکے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے مگر اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ جمیعت نے اتنے عرصے تک مختلف تعلیمی اداروں کی انتخابی سیاست میں کامیابی حاصل کرکے کیا کھویا اور کیا پایا ہے نیز احتجاجی اور جارحانہ سرگرمیوں سے اس کی مجموعی کارکردگی اور ساکھ پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اس عرصے میں جمیعت کی ہردلعزیزی میں جو کمی آئی ہے اور اس کا نام بھی مار دھاڑ کرنے والی تنظیموں کے ساتھ لیا جانے لگا ہے اس کا تجزیہ بھی خود احتسابی کے اس عمل میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ یہی خواہانہ مشورہ اس موقعہ پر ہم ہر اس طلبہ تنظیم کو بھی دیں گے جو کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے کھل کر یا اندرون خانہ تعاون کرتی ہے اس سلسلے میں سوچ بچار کریں کہ آیا جس جماعت یا قیادت کے لئے وہ قربانیاں دے رہے ہیں وہ اس کی مستحق بھی ہے یا نہیں، اس کے قول وفعل میں کوئی تضاد تو نہیں طلبہ کو سیاست کا ایندھن بنا کر عملی زندگی میں وہ کوئی مثبت کامیابی حاصل کرنے کی اہلیت بھی رکھتی ہے یا نہیں اور اگر نوجوان نسل کی رضاکارانہ خدمات جوان جذبوں اور انتھک محنت کے باوجود اس جماعت کی عملی کامیابی مشکوک ہے اور وہ معاشرے اور ملک میں کوئی مثبت تبدیلی لانے کی پوزیشن میں نہیں تو طلبہ جو قوم کا عظیم سرمایہ اور مستقبل کے امین ہیں اس کے لئے کب تک اپنی صلاحیتوں، توانائیوں اور وقت کا ضیاع کرتے رہیں گے۔ ہمارا روئے سخن اگرچہ تمام طلبہ تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کی طرف ہے لیکن چونکہ اسلامی جمیعت طلبہ سب سے منظم فورس کی حیثیت رکھتی ہے اور انجینئرنگ یونیورسٹی کے واقعے کے حوالے سے اس نے خود احتسابی کی درخشاں مثال قائم کی ہے اس لئے ہم اس سے یہ توقع دوسروں کی نسبت زیادہ رکھتے ہیں کہ وہ غور وفکر کے اس عمل کا دائرہ مزید وسیع کرے گی۔

معاملات کو چشم زدن میں نبٹانے کی خواہش یا ہر چہ بادا آباد کی پالیسی سے افراتفری اور انتشار کی وہ کیفیت بھی پیدا ہوسکتی ہے جس کا لازمی نتیجہ کسی نئے مارشل لاء کی صورت میں نکل سکتا ہے اس بنا پر ہم نوجوانوں سے بھی یہی امید رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ارد گرد کا جائزہ لے کر سنجیدگی سے سوچیں کہ کہیں وہ وقت تو ضائع نہیں کر رہے ہیں اور ان کی توانائیاں کسی حد خواہش اور پسند و ناپسند کی بھینٹ تو نہیں چڑھ رہیں۔"

ایک طالب علم کا خط بسلسلہ سیاسی جماعتیں اور طلباؔ

جہاں تک تعلیمی اداروں میں یونین سازیوں کی بنا پر پیدا ہونے والے ماحول کا تعلق ہے، اس کے متعلق راقم اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ایک صاحب درد طالب علم کا وہ خط ہی پیش خدمت کردینا ضروری سمجھتا ہے جو جناب وارث میر صاحب کی وساطت سے مورخہ ۱۲-۵-۸۶ کو روزنامہ

جنگ لاہور کی اشاعت میں شائع ہُوا۔ تحریر ہے کہ :

" موجودہ تعلیمی فضا، اربابِ بست وکشاد کی بے پروائیوں اور راہلِ فکر کی بے چارگیوں کے پیشِ نظر چند گزارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کیونکہ آپ زیادہ بہتر اور اچھے انداز میں ان مسائل اور اختلافات کی سنگینیوں کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ جن کے لیے رجحانہ جبر و استبداد سے نئی نسل کے طلبہ و طالبات کتاب اور قلم سے زیادہ پستول کو اپنے لیے لازم تصور کیے بیٹھے ہیں۔ اساتذہ اگلے وقتوں میں ماں باپ سمجھے جاتے تھے لیکن بدقسمتی سے آج ان کی نگاہِ شفقت سہمی سہمی فضاؤں میں لرزہ براندام ہے اور اکثر صورتوں میں وہ طالب علموں کی ایسی حرکات وسکنات کی بھی تائید کرتے رہتے ہیں، جنہیں وہ دل سے مکروہ اور قابلِ نفرت سمجھتے ہیں۔ تشدد اور اس کے پرچار نے ہماری درسگاہوں کا سارا حسن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

سیاسی جماعتوں کے اشاروں پر معصوم طالب علموں کا خونِ ناحق ایسی بے رحمی سے بہایا جا رہا ہے جیسے ہم کسی دوسری قوم کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ جدید ترین اسلحہ اور مکروہ ترین ارادوں سے لیس میرے ہی بھائی بند اپنے ہم وطنوں کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ استدلال اور معقولیت کی پوری عمارت کو گرا دینے کے لیے ایک گولی ہی کافی ہے جس کی سنسناہٹ فریقِ ثانی کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ بھی حفاظت ماتقدم کے پیشِ نظر ان راستوں کو شعار بنا لے جنہیں وہ دل سے مکروہ اور غیر انسانی خیال کرتا ہو۔ تشدد کے فروغ اور پرورش کے لیے انتظامی و عدالتی رویّہ اور انصاف کے تقاضوں کو بھی بہرصورت ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اربابِ اقتدار اور حل وعقد پر لازم ہے کہ وہ ان وجوہات اور رویّوں کا جائزہ لیں جن کی بابت آج تعلیمی اداروں میں یہ مسئلہ وحشیانہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ غیر یقینی اور تذبذب کا یہ عالم ہے کہ ؎

جو درپئے آزار ہیں ان قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے "

اداریہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ جنوری ۱۹۸۷ء کے مطابق اسلام آباد فیڈرل بورڈ کے نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء کو انعامات دینے کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے قابلِ فخر سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر نے کہا کہ:

" ایوب خان کے مارشل لاء کے بعد طلباء اور تعلیمی اداروں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا جو سلسلہ شروع ہُوا اس نے سارے تعلیمی نظام کو بگاڑ دیا۔ یہ بگاڑ جاری ہے اور اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

نظریاتی تعلیم کا فقدان

مملکتِ پاکستان میں شرحِ خواندگی اور ٹیکنالوجی کے اس قدر انحطاط کے بعد اگر اب نظریاتی تعلیم کے فروغ کا جائزہ لیا جائے کہ جس کی بنیاد پر پاکستان کی جغرافیائی حدود کی تعمیر ہوئی تھی تو اس معاملہ میں جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ مندرجہ بالا حقائق سے بھی کہیں زیادہ تشویشناک دکھائی دے گی اور اس کی بنیادی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم چاروں طرف سے متضاد تصورات اور نظریات کے اندر گھرے ہوئے ہیں اور یہ تو ظاہر ہے کہ متضاد نظری کے باعث یکرنگی اور یک نگہی کا فقدان قوموں کو کسی فیصلہ پر پہنچنے ہی نہیں دیتا۔ پھر جب قوتِ فیصلہ کمزور پڑ جائے تو وقت کا زیاں برس کی بجائے صدیوں تک پھیلنے کے باوجود بھی محسوس تک نہیں ہوتا اور بالآخر تذبذب کا یہ جلایا قوم کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ پھر یہ قوم ذلت و رسوائی کے جہنم کی اس تہ میں پہنچ جاتی ہے جہاں سے کسی کی پکار بھی اسے سنائی نہیں دیتی۔ لہٰذا اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم ہزار سال سے جہنم کی اسی تہ میں اپنا بسیرا کیے ہوئے ہیں اور کسی معقول اور صحیح بات کو سننے کے لیے گوش بر آواز ہی نہیں ہوتے۔ علامہ اقبال نے شاید اسی کیفیت کے پیشِ نظر کہا تھا کہ:

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہو جا   سراسر موم ہو یا سنگ ہو جا

لیکن افسوس کہ اس کے باوجود ہمارے دار العلوموں، سکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کے نام پر پڑھایا جانے والا نصاب اس قدر اخلاق سوز اور متضاد نظریات پر مبنی ہے کہ نئی نسل یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ اور پکار اٹھتی ہے کہ ہمیں اس اسلامی تعلیم نے جس صحرا میں لا کھڑا کیا ہے اس بنا پر ہم کس بات کو سچ تسلیم کریں اور کس کو رد کریں۔ نیز یہ کونسا اسلام ہے جو ہمیں تعلیم کی مقدس طشتری میں پیش کیا جا رہا ہے۔ سو بجائے اس کے کہ ہم ان کی اس پریشان نظری کا کوئی دارو سوچیں، انہیں بے دین، دہریہ، گستاخِ رسولؐ جیسے القابات سے نواز دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ نوجوان لفظِ اسلام سے ہی متنفر ہوتا جا رہا ہے۔

روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۲ جون ۱۹۸۴ء کے اداریہ کے مطابق اگر اب تک انڈونیشیا کے ۳۰ لاکھ اور بنگلہ دیش کے ڈھائی لاکھ مسلمانوں نے عیسائیت قبول کی ہے تو اس کی وجہ خالصتاً مادی نہیں بلکہ اس کی بنیادی وجہ ہمارا یہ خود ساختہ عجمی اسلام ہے جس کی دن رات ہمارے ہاں تبلیغ ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے اللہ والوں کی متاعِ دین و دانش لٹتی جا رہی ہے۔

بی اے کی اسلامیات کا نصاب جدید

اس وقت راقم کے سامنے نصاب جدید بی اے علوم اسلامیہ (پرچہ ب) برائے ۱۹۷۹ء و مابعد کی کتاب جو غلام احمد حریری صاحب ایم اے عربی، ایم اے علوم اسلامیہ، ایم او ایل عربی، فاضل السنہ شرقیہ، فاضل درس نظامی سابق صدر شعبہ اسلامیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور حال صدر شعبہ علوم اسلامیہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کی تصنیف کردہ ہے، اور جس کے آغاز سخن میں تحریر ہے کہ:

"کتاب ہذا حسبِ سابق پرچہ ب کے کامل نصاب پر مشتمل ہے اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں۔ کتاب ہذا اساتذہ اور طلبہ اسلامیات کی جانی پہچانی ہے اور عرصے سے پاکستان کے کالجوں میں مقبول چلی آرہی ہے۔"

لیکن اس کتاب میں جس قسم کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں مثلاً مرد اور عورت کے ستر ڈھانپنے کے متعلق لکھا ہے:

"مرد:- زیرِ ناف سے لے کر زانو تک مرد کا ستر ہے اسے ڈھانپنا ضروری ہے۔ دونوں زانو ستر میں داخل ہیں لہٰذا انہیں ڈھانپنا ضروری ہے مگر ناف کا ڈھانپنا ضروری نہیں۔

آزاد عورت:- آزاد عورت اپنے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا باقی سارے جسم کو چھپائے رکھے۔

لونڈی:- لیکن لونڈی۔۔۔ مرد کے جسم کے جس حصّہ کے چھپانے کا حکم ہے لونڈی کے لیے بھی وہی حصّہ چھپانا ضروری ہے البتّہ اس کا پیٹ اور پیٹھ بھی ستر میں داخل ہے۔ حالانکہ مرد کے لیے اس حصّہ کا چھپانا ضروری نہیں۔"

اور اس کے بعد تحریر ہے کہ:

"اس کے علاوہ لونڈی اپنے بدن کے دیگر اعضا کو ظاہر کر سکتی ہے۔"

بالفاظِ دیگر آزاد عورت تو عورت ہوتی ہے اس لیے اس کی چھاتی ستر ہے اور کیونکہ لونڈی عورت نہیں ہوتی، اس لیے اس کا یہ حصّہ ستر میں شامل نہیں۔ (پناہ بخدا) سوال یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرہ میں لونڈی کا وجود ہے ہی نہیں تو پھر اس قسم کے مسائل کا تذکرہ کیسا اور طلبہ اسلامیات کی اس معاملہ میں تدریس کیسی؟

بی اے کے لیے حریری صاحب کی دوسری کتاب "تفسیر القرآن"

بی اے کی کلاس میں اسلامیات کے نام پر پڑھائی جانے والی اس کتاب کے علاوہ جناب حریری صاحب کی ایک اور کتاب "تفسیر القرآن" مطابق نصاب جدید برائے بی اے علوم اسلامیہ پرچہ الف کے لیے نصاب میں شامل ہے جس کے افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ:

"یہ نصاب پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۷۳ء میں تجویز کیا تھا اور یہ اوّلین کتاب ہے جو نصاب جدید کے مطابق لکھی گئی ہے اور پاکستان کے تقریباً ڈگری کالجوں میں رائج ہوئی۔ تب سے اب تک اس کتاب کو خلعت قبولیت سے نوازا گیا۔"

مقامِ عورت

اس نصابی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر دو عورتوں کی شہادت کے تحت تحریر ہے کہ :

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، صدقہ کیجئے اور کثرت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں کیونکہ میں نے شبِ معراج میں اکثر عورتوں کو دوزخ میں دیکھا ہے۔ ایک عورت نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا تم دوسروں پر کثرت سے لعنت کرتی ہو۔ اپنے خاوندوں کی نافرمان ہو۔ میں نے کسی ناقص عقل اور دین والے کو تم سے زیادہ کسی صاحبِ فہم و فراست پر چھا جانے والا نہیں دیکھا۔ عورت نے عرض کی ہماری عقل اور دین میں کیا کمی ہے۔ آپؐ نے فرمایا عقل کی کمی کا ثبوت یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہوتی ہے اسی طرح عورتیں اپنے مخصوص ایام میں نہ روزہ رکھتیں اور نہ نماز ادا کرتی ہیں۔ یہ دین کا نقصان ہے۔ (صحیح مسلم)"

یعنی مخصوص ایام عورت کے اپنے پیدا کردہ ہیں جس کی وجہ سے دین کو نقصان ہوتا ہے لہٰذا عورت ناقص العقل ہے اور اسی بنا پر ایک عورت کو شہادت کا حق نہیں دیا گیا۔ کاش یہ حضرات اس قسم کی وضعی روایات کو نبی اکرمؐ کی ذات کے ساتھ منسوب نہ کرتے اور ایسا کچھ لکھنے سے پہلے قرآن حکیم میں نگاہ ڈال لیتے۔

نماز کی ادائیگی اور تضادات

جہاں تک نماز وغیرہ کا تعلق ہے، اس کی ادائیگی کے تضاد کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے لگائیے۔ بی اے کی مذکورہ نصابی کتب میں مسئلہ نمبر ۹۶ کے تحت لکھا ہے :

"امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرض نماز کی صرف پہلی رکعتوں میں قرأت فرض ہے (لیکن) امام شافعی کے نزدیک تمام رکعات میں قرأت فرض ہے (اور اس کے برعکس) امام مالک پہلی تین رکعتوں میں قرأت فرض قرار دیتے ہیں۔ جبکہ حسن بصری کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں۔"

یہ ہیں وہ فرض اختلافات جنہیں عام نماز میں روا رکھا گیا ہے۔ باقی جہاں تک نماز جمعہ کا تعلق ہے، اس کے متعلق مسئلہ نمبر ۱۳۹ کے تحت تحریر ہے : "دیہات میں جمعہ جائز نہیں"

یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے (جبکہ) امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔

اس سلسلہ میں مسئلہ نمبر ۱۴۰ یہ ہے : جمعہ صرف سلطان پڑھا سکتا ہے یا وہ عالم جو سلطان کی طرف سے جمعہ

لہ صلوٰۃ کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ اس کے لیے اکتوبر ۱۹۸۴ء کا طلوعِ اسلام ملاحظہ کریں۔

پڑھانے کے لیے مامور ہو (لیکن) امام شافعی اور احمد بن حنبل کے نزدیک جمعہ سلطان کے اذن کے بغیر بھی منعقد ہو سکتا ہے۔

مسئلہ نمبر ۱۴۱ ہے: "جمعہ کی شرائط میں سے وقت بھی ہے۔ چنانچہ جمعہ ظہر کے وقت جائز ہے اور اس کے بعد نہیں (لیکن) امام احمد بن حنبل کے نزدیک جمعہ زوال سے پہلے بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر ۱۱۳ کے تحت تحریر ہے کہ:

(۱) سجدہ تلاوت امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل کے نزدیک پڑھنے اور سننے والے کے لیے سنت ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک سنت کی بجائے واجب ہے۔

(۲) حاضرین میں سے جس شخص نے سجدہ کی آیت نہ سنی ہو اس کے لیے سجدہ کرنا تینوں اماموں کے نزدیک ضروری نہیں مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک ضروری ہے۔

(۳) امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک قرآن کریم میں کل ۱۴ سجدے ہیں۔ ان کے نزدیک سورہ حج میں دو سجدے ہیں اور سورہ ص میں سجدہ نہیں لیکن امام ابوحنیفہ سورہ حج میں صرف پہلے سجدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سورہ ص میں بھی سجدہ ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس کتاب میں اس قسم کے تقریباً ۱۵۰ مسائل درج ہیں جن کے پڑھنے کے بعد شاید ہی کوئی طالب علم یہ فیصلہ کر سکے کہ عملی زندگی میں اسے کون سی بات کو صحیح تسلیم کر لینا چاہیئے لہٰذا جب نوجوان نسل کو اس قسم کے مسائل میں اُلجھا کر رکھ دیا جائے تو کیا وہ اس قابل بن سکے گی کہ اپنے دَور کے چیلنج کا دو ٹوک جواب دے سکے!۔

نظامِ صلوٰۃ کے سلسلہ میں مدیر روزنامہ جنگ لاہور نے اپنے ہاں مورخہ ۹ راگست کو جو اداریہ سپردِ قلم کیا، وہ یہ تھا:

"اور اب محکمہ نماز"

"مذہبی اور اخلاقی اقدار کے بارے میں علمائے کرام متفق نہیں، معاشرے کی اصلاح کا معاملہ ویسے بھی نہایت پیچیدہ ہے۔ یہاں خرابی محض اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ معاشرے میں اخلاقی اقدار کی ابتری کا راز ملک کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی نظام کے عدمِ توازن میں مضمر ہے۔ مگر یہی بات حکمران تسلیم نہیں کرتے۔"

کیا قرآن حکیم کا ترجمہ ممکن ہے؟

ان بیان کردہ حقائق کے بعد جہاں تک تعلیمی اداروں میں قرآن حکیم کے پیش کردہ تراجم کا تعلق ہے تو پروفیسر

"گب" جیسے محقق کے کہنے کے مطابق ،

• جس طرح ایک بلند پایہ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں ہو سکتا قرآن حکیم کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا (نیز) ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصل صورت کو مسخ کر رہے ہیں آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اُڑنے والے شاہینِ وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد بک" (R.M. BUCKE) اپنی کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں تحریر کرتا ہے کہ،

"وحی کی زبان کی اہمیت

آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں! آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں، ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو اگرچہ جب ان حصوں کا بھی لفظی ترجمہ سامنے آئے گا تو پڑھنے والا سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وقفوں کو بھی لے آئے۔ اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہو تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہو گا۔ مثلاً قرآن کی سادہ سی آیت ہے اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ (۵۰/۴۳) انگریزی کیا دُنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدتِ قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔"

ترجمہ کرنے کا نتیجہ

اور اس باب میں مشہور مورخ ڈاکٹر (W.M. URBAN) اپنی کتاب (HUMANITY AND DAITY) میں لکھتا ہے :-

"عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفہ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے زبان اور بے رُوح ہو کر رہ گئیں ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانہ مابعد کی سائنٹفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں زمان کی قید سے ماورا تھیں۔ (صفحہ ۱۲۶)"

اور یہی وجہ ہے کہ پروفیسر اربن اپنی کتاب (مذکورہ) میں (CROCH) کروچ کے حوالے سے رقمطراز ہے کہ :

"جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ میں اور دوسرے اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جا سکتا۔ (صفحہ ۶۵)" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" جون ۱۹۵۷ء)

بالفاظِ دیگر قرآنی آیات اور الفاظ کا مفہوم تو بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی کسی خاص حد تک۔ لیکن اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ہمارے ہاں حمد کا ترجمہ "تعریف" کر دیا جاتا ہے۔ جس سے قرآنِ حکیم کی وہ منزہ شہود اور رُوح پرور تعلیم سامنے آتی ہی نہیں۔ جو کہ حمد کے اصل مفہوم میں پوشیدہ ہے لہذا مجھے ترجمہ اور مفہوم کے اس فرق کو واضح کرنے کے لیے یہاں جناب غلام احمد پرویز کی کتاب "مطالب الفرقان" جلد اوّل (قرآن کی تفسیر خود قرآن مجید سے) میں سے حمد کا مفہوم پیش کرنا ہو گا جس کے مطالعہ کے بعد واضح ہو جائے گا کہ ہمارے دارالعلوموں، سکولوں، کالجوں، مسجدوں اور گھروں میں قرآن حکیم کے جو تھوڑے بہت تراجم پڑھائے جاتے ہیں، اس کی وجہ سے ہم اور اس کے بعد ہماری وجہ سے دنیائے عالم قرآنی تعلیم سے کس قدر دُور ہٹی ہوئی ہے ۔ اور شاید اسی سے ہمیں اس سوال کا بھی جواب مل جائے کہ "کیوں نہیں ہوتی سحر حضرتِ انساں کی رات" چنانچہ لفظ حمد کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ :

"حمد کا مفہوم

عربوں کے ہاں کسی نہایت حسین متناسب، نادر شاہکار کو دیکھ کر انسان کے دل میں جو جذبات تحسین بے ساختہ پیدا ہوں، ان کے والہانہ اظہار کو حمد کہا جاتا ہے لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں۔

(۱) جس حسن و رعنائی اور شاہکار کی ستائش کی جا رہی ہو وہ ایک خارجی حقیقت اور محسوس شے ہونی چاہیئے۔ غیر محسوس اور مشاہدہ میں نہ آنے والی چیزوں کے متعلق ہمارے دل میں جذبات تحسین و ستائش پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہم کسی مصوّر کی تعریف اس کی ان تصاویر کے ذریعہ

ہی کر سکتے ہیں جو مرئی طور پر ہمارے سامنے آجائیں۔ اسی لیے قرآن کریم نے ان نمود و نمائش کا ذوق رکھنے والوں پر طنز کیا ہے جو بغیر تعمیری اور نفع بخش کام کرنے کے اپنی ستائش چاہتے ہیں (۳/۱۸۷) وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ کرتے نہیں"

(۲) کسی کی جس بات یا جس کام کی "حمد" کی جارہی ہو وہ اس سے اختیاری طور پر سرزد ہونی چاہیے۔ اضطراری طور پر یا میکانکی انداز سے کسی فعل کا سرزد ہو جانا حمد کا مستحق نہیں بنتا۔ حتیٰ کہ وہ حسن جو کسی میں پیدائشی طور پر موجود ہو، اس کے لیے بھی "حمد" کا لفظ نہیں بولا جاتا۔ "مدح" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً رقص طاؤس میں طاؤس مستحق مدح ہوتا ہے اور اس کا خالق (خدا) سزاوار حمد۔

(۳) "حمد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حمد کرنے والے کے دل کی آواز ہو۔ کسی کے دباؤ سے اس کی تعریف کرنا "حمد" نہیں۔ "مدح" کہلائے گا۔ نہ ہی "حمد" میں ملمع کاری، نمائش، منافقت، یا کسی کو بنانے کے لیے تعریف کرنے کا کوئی دخل ہو سکتا ہے۔ "حمد" میں جذبات تحسین بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں۔

(۴) جس چیز کی حمد کی جارہی ہو اس کا ٹھیک ٹھیک علم ہونا ضروری ہے۔ محض گمان کی بنا پر "حمد" نہیں کی جاسکتی۔ مبہم تصورات، دھندلے نقوش اور شکوک و تذبذب پیدا کرنے والے خیالات و معتقدات کبھی حمد کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتے۔ "حمد" فریب تخیل، توہم پرستی اور اندھی عقیدت سے نہیں ابھرتی اس کا سرچشمہ وہ یقینِ محکم ہوتا ہے جو علی وجہ البصیرت حاصل ہو۔

(۵) جن نفع بخش کشش انگیز رعنائیوں اور حسن و تناسب کے شاہکاروں کی "حمد" کی جارہی ہو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ درجہ کمال تک پہنچ چکے ہوں اور ان کی نفع بخشیاں محسوس ہوں۔ جو آرٹ تکمیل تک نہ پہنچا ہو اور انسانیت کے لیے نفع بخش نہ ہو وہ مستحق حمد و ستائش نہیں ہوتا۔ "آرٹ برائے آرٹ" موجب مدح تو ہو سکتا ہے سزاوار حمد نہیں ہو سکتا۔"

(مطالب الفرقان (بحوالہ صفحہ ۳/۴/۵))

خون کو ٹھنڈا رکھنے کا طریق

آپ قرآن حکیم کے اس ایک لفظ کی جامعیت اور خصوصیت کو سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ اگر قرآن مجید کے الفاظ

اور آیات کا مفہوم اس طریق سے پڑھا دیا جائے تو کیا ذہنوں میں جِلا پیدا نہیں ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہمارے ہاں جو اسلامیات کا نصاب رائج ہے، اس میں اس طریقِ کار کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا بلکہ ان اداروں میں وہی روائتی ترجمہ پڑھا دیا جاتا ہے جس سے طالب علم کی تشنگی بجھنے کی بجائے اور زیادہ شدت اختیار کر جاتی ہے اور ان کا شعور مزید الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بی اے میں پڑھائے جانے والے نصاب میں جناب غلام احمد حریری صاحب کی کتاب "تفسیر القرآن" کا ایک حصہ سورۃ البقرہ کے تحت صرف عام روائتی ترجمے پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس کے علاوہ نوجوانوں کے گرم خون کو ٹھنڈا کرنے اور ان کی زندگی بخش صلاحیتوں کو سلب کرنے کے لیے اس قسم کی وضعی روایات درج کر دی گئی ہیں کہ ان پر ایمان لانے کے بعد ملّتِ اسلامیہ کو عملی زندگی سے دُور رکھنے کے لیے مزید کسی نسخہ کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ مذکورہ نصابی کتاب کے صفحہ ۷ پر "آیت الکرسی کی فضیلت اور افادیت" بیان کرتے ہوئے تحریر ہے:

"حضرت ابو امامہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضور صلعم نے فرمایا (جو شخص) ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھے، اس کے جنّت میں داخل ہونے سے موت کے سوا دوسری کوئی چیز سنگِ راہ نہیں ہے۔" (نسائی۔ ابن حبان)

جنّت کس طرح حاصل ہوگی؟

آپ نصابی تعلیم کے اس تصور کو سامنے رکھیئے اور اس کے بعد قرآنی تعلیم کے اس پہلو کو دیکھئے جس میں ارشاد ہے کہ:

"وحی کی راہ نمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے لیکن چونکہ اس سے انفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے اس لیے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اس جنّتی معاشرہ کے قائم کرنے کے لیے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سو اے جماعت مومنین! تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم اس معاشرہ کو یونہی قائم کر لو گے اور مفت میں جنّت میں داخل ہو جاؤ گے۔ ایسا نہیں ہو سکے گا۔ تمہیں بھی ان جاں گداز مراحل سے گزرنا پڑے گا جن سے وہ لوگ گزرے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے اس انقلاب آفرینی کی کوشش کی۔ سختیاں اور مصیبتیں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کی شدت سے ان کے دل ہل جاتے۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول ۔ ۔ ۔ ۔ پکار اٹھتے کہ بار الٰہی ہماری کوششوں کی بار آوری کا وقت کب آئے گا۔ (۱۴۱/۳ - ۹/۱۴ - ۲۹/۲ - ۳۲/۱۰) ایسے ایسے ہمت شکن اور صبر آزما مراحل کے بعد کہیں جا کر ان

کی کوششیں کامیاب ہوتیں اور تائید ایزدی ان کی سعی و عمل کو ثمر بار کرتی۔ تمہیں بھی ان مراحل سے گزرنا ہوگا۔" (۲/۲۱۴)

اسی سلسلہ میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

ایک اور روایت

لیکن اس حقیقت کے برعکس مذکورہ کتاب کے صفحہ ۰، پر جہاں جنّت کا حصول اس قدر آسان بنا دیا گیا ہے، وہاں اس کے ساتھ یہ بھی تحریر ہے کہ:

"آنحضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا یہ ارشاد ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی تلاوت کرے تو اس پر خدا کی جانب سے ایک محافظ مقرر کر دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کا مال چوری سے محفوظ رہتا ہے۔" (بحوالہ صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن)

اقبال نے سچ کہا تھا کہ: ؎

حقیقت خرافات میں کھو گئی   یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

کاش یہ حضرات ان خیالات کو نبی اکرم صلعم کی طرف منسوب کرنے کی بجائے نوجوان نسل کے سامنے قرآن حکیم کی حیات بخش تعلیم پیش کرتے تو یقیناً اس سے اس ضابطۂ حیات کی افادیت اور فضیلت اُبھر کر سامنے آجاتی۔

مجھے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان تصریحات سے راقم کا مقصد جناب حریری صاحب کی ذات پر تنقید کرنا نہیں بلکہ اس سے مقصود ہمارے ہاں دی جانے والی نصابی تعلیم جس کے متعلم وہ خود بھی رہے ہیں کی چند ایک جھلکیاں کا پیش کرنا ہے جس کے لیے ایک دو مثالوں کا تحریر کرنا نہایت ضروری تھا اور ہے لیکن قبل اس کے کہ مزید کسی مثال کو درج کیا جائے ہمیں تمہیداً اس فرانسیسی محقق اور سائنسدان "مورس بوکائے" کی شہرہ آفاق تصنیف جو بائیبل، قرآن اور سائنس کے نام سے شائع ہوئی ہے (اور جس کا اردو ترجمہ ثناء الحق صدیقی صاحب کی طرف سے کیا گیا ہے) سے ایک دو اقتباس کو دیکھ لیں اس سے یقیناً زیرِ نظر مسئلہ کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ لہذا تحریر ہے کہ:

مورس بوکائے کی حق گوئی

"بدقسمتی سے قرآن کی عبارتوں بالخصوص ان عبارات کا جو سائنسی معاملات سے متعلق ہیں،

ترجمہ اور تشریح نہایت خراب اور ناقص کی گئی ہے۔ لہٰذا کسی بھی سائنس دان کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ خود کو حق بجانب قرار دیتے ہوئے اس کتاب پر ایسی تنقید کرے جس کی فی الحقیقت وہ ہرگز مستحق نہیں ہے۔"

اس کے بعد تحریر ہے :

قرآن اور سائنس

" ترجمہ میں غلطیاں یا مغالطہ آمیز تشریحات (اور اکثر ان میں سے ایک دوسری سے وابستہ ہے) جن پر وہ ایک صدی پہلے تک کسی کو حیرت نہیں تھی ان پر آج کل کے سائنس دان برہم ہو جاتے ہیں جب کوئی غلط ترجمہ کی ہوئی عبارت سامنے آتی ہے جس میں سائنسی اعتبار سے کوئی ناقابلِ قبول بیان شامل ہوتا ہے تو سائنسدان اس عبارت پر سنجیدگی سے غور کرنے سے اجتناب برتتا ہے آدمی کی ولادت سے متعلق باب میں اس نوع کی غلطی کی ایک نہایت مخصوص مثال پیش کی جائیگی۔"

چنانچہ وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ :

تراجم غلط کیوں ہیں ؟

" ترجمہ میں اس قسم کی غلطیاں کیوں ہیں ؟ اس کی صفائی اس واقعہ کی مدد سے پیش کی جاسکتی ہے کہ جدید دور کے مترجم اکثر قدیم مفسرین کی تفاسیر کو بغیر تنقیدی نظر ڈالے ہوئے قبول کر لیتے ہیں۔ مؤخر الذکر حضرات کے پاس ان کے اپنے زمانہ میں تو یہ عذر تھا کہ وہ کسی عربی لفظ جس کے کئی معنی ہو سکتے تھے۔ ایک ناموزوں مفہوم بیان کر دیتے تھے۔ وہ غالباً اس لفظ یا محاورہ کے اس حقیقی مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے جو سائنسی معلومات کی بدولت موجودہ دور میں ہی واضح ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر تراجم اور تفاسیر پر ضروری نظر ثانی کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہ بات ماضی میں کسی بھی وقت ممکن نہیں تھی۔ لیکن آج کل ہمیں اس نوع کی معلومات حاصل ہیں جن سے ان کا صحیح مفہوم پیش کیا جاسکتا ہے۔ ترجمہ کے یہ مسائل یہودی، عیسائی وحی و تنزیل کے متن کے سلسلہ میں موجود نہیں ہیں۔ جو بات یہاں بتائی گئی ہے، وہ مطلقاً قرآن کے لیے مخصوص ہے۔"

اس کے بعد تحریر ہے کہ :

" کیونکہ بیشتر سائنسی حقائق جن کی یا تو قرآن میں نشان دہی کی گئی ہے یا جو صاف طور پر بیان

ہوئے ہیں، ان کو موجودہ دَور میں ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

اس لیے یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ کس لیے صدیوں تک مفسّرینِ قرآن نے بشمول ان تصانیف کے جو اسلامی تمدّن کے انتہائی عروج کے زمانہ میں منصۂ شہود پر آئیں)، ناگزیر طور پر بعض ان آیات کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں غلطیاں کی ہیں جن کے ٹھیک مفہوم کو امکانی حد تک ترجمہ اور تفسیر میں پیش کرنا ممکن ہُوا ہے۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ زبان سے مکمل واقفیت ہی بذاتِ خود قرآن کی ان آیات کی تفہیم کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ضروری ہے کہ سائنس کی بے انتہا گوناگوں معلومات بھی ہونی چاہئیں۔ جس قسم کا مطالعہ موجودہ زمانہ میں کیا جا رہا ہے، اس میں علم کے بہت سے شعبے آجاتے ہیں اور اس مفہوم کے اعتبار سے اس مطالعہ کو قاموسی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جب ان سوالات پر جو اُٹھائے جاتے ہیں، بحث کی جاتی ہے تو قرآن کی بعض آیات کو سمجھنے کے لیے جتنی متنوع قسم کی سائنسی معلومات لازمی ہیں وہ واضح ہوجائے گی۔“

(بحوالہ ”بائبل قرآن اور سائنس“ صفحہ ۱۵۱ - ۱۴۷)

قرآن اور کائنات

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ جس وقت تک انسان اپنے دَور کی علمی سطح سے کما حقہٗ واقفیت حاصل نہ کرے، اس وقت تک وہ قرآن کے بیان کردہ حقائق سے پوری طرح استفادہ نہیں کرسکتا۔ بلکہ کئی قسم کی غلط فہمیوں کا شکار ہوکر رہ جاتا ہے۔ مثلاً :

خالقِ کائنات نے آج سے چودہ سو سال پیشتر ہمارے ان فضائی کرّوں کی تخلیق کے متعلق جن حقائق کی طرف اشارہ کیا تھا آج کا انسان جب ان پر غور کرتا ہے تو اس کی نگاہ بصیرت بے ساختہ دادِ تحسین دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

سورہ النّٰزعٰت کی آیت کریمہ ۲۹ - ۳۰ - ۳۱ - ۳۲ میں ارشاد ہے کہ :

” پھر اسی فضا میں رات کو تاریک بنایا اور دن کے وقت اس کی روشنی کو نمودار کیا۔ پھر اس زمین کو (کیونکہ یہ اور دیگر اجرام پہلے ایک ہی ہیولے تھے۔ اس نے اس ہیولے سے) زمین کو الگ کرکے یوں دُور پھینک دیا جس طرح گوپھنے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔“ (۳۰ ، ۳۱)

ٖ۱ عصرِ حاضرہ کا علمی انکشاف یہ ہے کہ آولین ہیولیٰ کی تیز گردش سے جو چھینٹے اُڑے وہ ان کرّوں کی شکل میں گردش کر رہے ہیں

اس کے بعد اس میں سے پانی کشید کر کے سمندروں کو الگ کیا (اور خشکی کے قطعات کو الگ)
پھر ان قطعات میں نباتات کی نمود ہوئی اور انہی میں بڑے بڑے محکم پہاڑوں کو ابھارا اور
اس طرح تمام سلسلہ کو اس انداز سے استوار کیا کہ یہ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے لیے
سامان زیست پیدا کرے۔" (بحوالہ "مفہوم القرآن صفحہ ۱۱۴۱)

پہلے پوری کائنات ایک ہیولیٰ تھی

اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہے کہ:

"یہ لوگ جو قرآن کی دعوے کی صداقتوں سے انکار کرتے ہیں کیا انہوں نے اس پر غور نہیں
کیا کہ ارض و سمٰوٰت پہلے ایک ہیولیٰ تھے۔ پھر یہ پھٹ کر الگ الگ ہو گئے۔" (۲۰/۳۰)

تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت کرتے ہوئے "طلوع اسلام" بابت ستمبر ۱۹۶۹ء
کے شمارے میں تحریر کیا گیا تھا کہ:

ارض وسماوات کا بیان

"قرآن حکیم میں" ارض وسماوات "کے الفاظ بے شمار مقامات پر آئے ہیں اس سلسلہ میں
یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ارض کے معنی پستی اور سماء کے معنی ہیں بلندی لہٰذا سماء کے معنی آسمان
نہیں ہوں گے ہمیں جو کچھ اپنے اوپر فضا، چاند، سورج، ستارے، مرئی یا غیر مرئی معلوم اور نامعلوم
جملہ اجرام فلکی سب ہمارے لیے سماء ہوں گے۔ اصل یہ ہے کہ ارض (پستی) اور سماء (بلندی)
اضافی الفاظ ہیں ہم جو کچھ اوپر دیکھتے ہیں وہ ہمارے لیے سماء ہے اور اس کے لیے ہم ارض ہیں
اور جو کچھ ہمارے نیچے ہے وہ ہمارے لیے ارض ہے اور ہم اس کے لیے سماء یعنی ہر سماء کی
ایک ارض ہوتی ہے اور ہر ارض کا ایک سماء یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان مختصر
الفاظ میں (نہایت جامعیت سے) بیان کر دیا ہے کہ اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ
الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔ ( )

(بقیہ حاشیہ) اس سے قرآنی مثال کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے یعنی اس ہیولیٰ سے کرۂ ارض یوں اڑ کر الگ ہوا جس طرح تیزی سے
گھومنے والے گرینیڈ سے نکل کر پتھر دور چلا جاتا ہے اور گھومتا رہتا ہے۔

یعنی :

" خدا وہ ہے جس نے متعدد سمٰوٰت پیدا کیے اور ہر سماء کے مقابلے میں ایک ارض (عربی زبان میں سبع کا لفظ جہاں "سات" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہاں اس سے مراد "متعدد" بھی ہوتے ہیں جیسے ہم اپنے ہاں کہتے ہیں کہ "میں نے انہیں بیسیوں مرتبہ کہا ہے، سو بار تاکید کی ہے، ہزار بار منع کیا ہے۔" ان الفاظ سے مراد متعین طور پر بیس، سو، یا ہزار نہیں ہوتا، بلکہ اس سے مقصد بکثرت یا متعدد بار ہوتا ہے اسی انداز سے عربی زبان میں سات، ستر، سات سو وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔"

یہی وہ ارض و سماء ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا ۔

شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی　　　تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

کائنات کی وسعت

یہ ارض و سما کس قدر وسعت پذیر ہیں، یہ جاننے کے لیے مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اسی سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ہماری موجودہ تفاسیر، قرآنی تراجم۔ عقائد و تصورات حقیقت سے کس قدر دُور ہیں ۔

" جس زمین، چاند اور سورج کو ہم کل کائنات سمجھتے تھے وہ سارا نظام شمسی کُل کائنات کے ایک بڑے محیط میں صرف ایک ذرّہ کے برابر نکلا۔ انسان نے جب تحقیق کی اور زمین سے آسمان تک کی وسعتوں کا مشاہدہ کیا تو خدا کی عظمت کے بے شمار نشان نظر آئے۔ ہماری زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے، اس کی وسعت کا یہ حال ہے کہ ہماری زمین کا قطر تو کُل بارہ ہزار سات سو چوّن کلو میٹر ہے جبکہ جوپیٹر JUPITER کا قطر ایک لاکھ بیالیس ہزار سات سو چوّن کلو میٹر ہے اور نظامِ شمسی کے مرکز یعنی سورج کا قطر ۱۴ لاکھ کلو میٹر ہے یعنی زمین سے ۱۰۹ گنا بڑا۔ قطر کی یہ وسعت تو کچھ بھی نہیں جبکہ اس کے بالمقابل اگر ایک لاکھ کو ۹۵ کھرب سے ضرب دی جائے تو اس کے حاصل ضرب کے برابر کلو میٹر کا قطر ہماری کہکشاں کا ہے۔ جس کا عرض ۲۰ ہزار × ۹۵ کھرب کلو میٹر ہے اس کو MILKY WAY یعنی دودھیا کہکشاں کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی کہکشاں میں ہمارا نظامِ شمسی شامل ہے۔ اس کہکشاں میں ایک لاکھ ملین یعنی سو ارب ستارے

پائے جاتے ہیں۔ ہمارا پورا نظام شمسی اس کہکشاں کے ایک چھوٹے سے کونے میں پڑا ہے۔ اب تک انسانی مشاہدہ ایسی ایک سو ارب کہکشاؤں کا سُراغ لگا چکا ہے

یہ تو تھا جسامت کا اندازہ، اب فاصلوں کا اندازہ کیجئے کہ زمین سورج سے صرف ۱۵ کروڑ کلو میٹر دُور ہے جبکہ نیپچون NEPTUNE سورج سے ۴ ارب ۴۹ کروڑ ۵۰ لاکھ کلو میٹر دُور ہے۔ پلیٹو PLUTO کا سورج سے فاصلہ ۵ ارب ۹۱ کروڑ کلو میٹر ہے یہ فاصلے اس وقت بہت معمولی رہ جاتے ہیں جب ملکی وے MILKY WAY کا فاصلہ ۹۲ ہزار × ایک ہزار × ایک ارب کلو میٹر کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہکشاؤں کے فاصلے جو اَب متعین ہو رہے ہیں وہ ہندسوں یا لفظوں میں پورے نہیں لکھے جا سکتے شاید اس بات سے کچھ اندازہ لگایا جا سکے کہ اضافت کے حساب سے کائنات کچھ اتنی جگہ میں سمائی ہوئی ہے کہ مکعب سنٹی میٹر میں ایک کا ہندسہ لکھیں اور پھر اس کے آگے ۸۴ صفر لگائیں یا اسی پیمائش کو مکعب کلو میٹر میں لیا جائے تو ایک کے آگے ۶۹ صفر لگائے جائیں تب حساب پورا ہو اس کے باوجود کائنات لامحدود ہے اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ جسامت اور فاصلوں کے اعداد و شمار سے آپ خدائے تعالےٰ کا خیال کیجئے کہ وہ کس قدر عظیم ہے اور پھر سوچیئے کہ کیا ہم خدا کو واقعتاً اتنا ہی عظیم سمجھتے ہیں۔

اب ذرا اور آگے بڑھیئے اور وقت کا اندازہ لگائیے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت والوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس کے متعلق اندازہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اس سے چار ارب نوری سال سے بھی پہلے روانہ ہوئی تھیں وہ آج ہم تک پہنچی ہیں۔

ستاروں کا فاصلہ ماپنے کے لیے ہمارے اعداد و شمار ناکافی ہیں اس لیے نوری سال کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ نور یعنی روشنی ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلو میٹر سفر طے کرتی ہیں۔ اس طرح ایک سال میں اس کا سفر تقریباً ۹۵ کھرب کلو میٹر ہوا۔ یہ فاصلہ نوری سال کا ہے۔ اب ۴ ارب کو ۹۵ کھرب سے ضرب دیجئے تو کہکشاں کا ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا فاصلہ یا وقت معلوم ہوگا کہ ایک روشنی جو ایک کہکشاں سے چلی ہے وہ ہمارے کرہ تک کتنے وقت میں پہنچی۔ تازہ ترین مشاہدہ میں ایسی کہکشاں بھی دیکھی گئی ہے جس کی روشنی ہم تک دس ارب نوری سال میں

پہنچی ہے۔ یعنی اس نے دس ارب × ۹۵ کھرب کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا ہے۔

مزید دیکھئے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کائنات میں ایک مرکز کہکشاں ہے جس کے گرد تمام ستارے چکر کاٹ رہے ہیں۔ ان کا ایک چکر تیس کروڑ سال میں پورا ہوتا ہے۔ یہ تو اب آپ کو بہت معمولی بات معلوم ہو گی کہ ہمارے سورج کی عمر کا اندازہ پانچ ارب سال ہے جب کہ کائنات کی عمر تقریبًا پندرہ ارب سال ہے۔

ہم ان اعداد و شمار سے صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ ساری کائنات جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ وقت، حجم اور فاصلہ کے اعتبار سے کس قدر لامحدود ہے۔ لیکن خدائے تعالٰے کی ازلی و ابدی عظمت و کبریائی کا اندازہ لگانے کے لیے وقت کے یہ سارے پیمانے، حجم کے یہ کل اندازے اور فاصلوں کی یہ تمام پیمائشیں بالکل ناکافی ہیں۔ اللہ تعالٰے زمان و مکان کی جملہ وسعتوں سے بھی بہت بلند و برتر ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہا اور جو نظم، حکمت، تناسب اور باہمی مناسبت ان اربوں کہکشاؤں اور ان کے گرد گردش کرنے والے ستاروں، سیاروں میں پائی جاتی ہے اور ہم زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دُور دراز دنیاؤں کے مشاہدے کرتے، ان کے فاصلے ماپتے اور ان کی رفتار کے حساب لگاتے ہیں، تو اس سے ہم کو خدا کی عظمت اور اس کی قدرت و حکمت کا اندازہ ہونا چاہیے اور یہ مشاہدہ کرنا چاہیے کہ اتنی بڑی لامحدود کائنات کی ایک ایک چیز باہمی جذب و کشش کے قانون میں کس قدر جکڑی ہوئی ہے کہ بڑے سے بڑا کرہ اپنے مدار سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ اور ہر چھوٹے سے چھوٹا ذرہ قاعدے اور قانون کے تحت مکمل نظم و ضبط اور منصوبہ بندی کے تحت مصروفِ کار ہے۔ ہم جوں جوں اپنے مشاہدات میں آگے بڑھتے جائیں گے، ہمارا ایمان پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے گا۔"

(بحوالہ مطالعۂ فطرت اور ایمان

اور بقول ڈاکٹر محمد گلستان صاحب کے:

"ممکن ہے کہ اس صدی کے آخر تک انسان مریخ اور زہرہ پر بھی اپنا جھنڈا گاڑ دے اس کے بعد وہ کیا کرے گا؟ زہرہ اور مریخ کے علاوہ ہمارے گرد چھ اور سیارے بھی ہیں ان میں سے قریبی سیارے پر پہنچنے میں تین ماہ لگتے ہیں جبکہ سب سے دُور سیارے تک پہنچنے کے لیے ۴۵ سال درکار ہوں گے۔ اس بات کا امکان بہت

کم ہے کہ انسان اس صدی میں قریبی سیاروں سے آگے جانے کی سوچ سکے گا۔ لیکن اگر اس نے ان تمام سیاروں کو فتح بھی کر لیا تو ایک بار پھر خود کو بالکل بے بس پائے گا۔ کیونکہ زمین سے قریب ترین سیارہ بھی اتنا دُور ہے کہ موجودہ راکٹ کی مدد سے اس تک پہنچنے میں ایک لاکھ سال لگیں گے۔"

(بحوالہ "راکٹ میزائل اور مصنوعی سیارے" شائع کردہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور)

قارئین نے مندرجہ بالا تصریحات سے بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ جس وقت انسان اس "کائناتی قرآن" کا مطالعہ سائنٹیفک نقطۂ نظر سے نہیں کرتا اس وقت تک قرآنِ حکیم کی اعلیٰ و ارفع تعلیم اور اس کے بیان کردہ رموز و اسرار کما حقہٗ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔

یہ ہے وہ حقیقت ان بے شمار اُڑنے والے "چھینٹوں" کی جو مختلف اور ان گنت اجرام فلکی کی شکل میں اس کائنات میں سرگرم عمل ہیں۔

ہمارے ہاں کی تعلیم

لیکن افسوس ہمارے ہاں آج بھی ان اجرام فلکی کے متعلق تعلیمی اداروں، مسجدوں اور دارالعلوموں میں یہی تصور پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سات آسمان اور سات زمینیں ہیں اور ہر آسمان کا علیحدہ علیحدہ دروازہ ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "تفسیر القرآن" از جناب حریری صاحب "ترجمان القرآن" بابت اگست ۱۹۵۱ء اور "تفسیر ابنِ کثیر اردو" پارہ پندرھواں)۔ تفسیر ابنِ کثیر میں تو یہاں تک درج ہے کہ زمین سے آسمان کا فاصلہ پانچ سو سال کی راہ ہے اور ہر جگہ سے اُتنا ہی اُونچا ہے اور پھر اس پہلے آسمان کی اپنی موٹائی پانچ سو سال کی ہے اور اس کے بعد اسی طرح ساتویں آسمان تک کا فاصلہ اور اس کی موٹائی کا ذکر کیا گیا ہے۔

عرش کا بیان

آسمانوں کے اس ذکر کے بعد عرش کا تذکرہ ہے جس کے فاصلے کے متعلق تحریر ہے کہ: زمین سے اس کا فاصلہ پچاس ہزار سال کا ہے اور عرش سُرخ یاقوت کا ہے ــــ اور اسی عرش کے متعلق بخاری شریف میں درج ہے کہ:

"ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی ۱۰ سال کی راہ ہے اس کے اوپر سات

پہاڑی بکرے ہیں جن کے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے اور ان بکروں کی پشت پر عرش ہے۔
جس کی موٹائی اسی قدر ہے (اور اس عرش پر خدا کی ذات جلوہ افروز ہے)

اب ظاہر ہے کہ قرآن حکیم کی پیش کردہ تعلیم اور حقائق کے مطابق اجرام فلکی کے سلسلہ میں یہ مذکورہ تصورات بالکل غلط ہی نہیں بلکہ مضحکہ خیز بھی ہیں۔

حضرت نوحؑ کی کشتی، مخلوقِ خدا اور ابلیس

ارض و سما کی اس تفصیل کے بعد اسی تفسیر کے اندر حضرت نوح علیہ السلام کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ:

"نوح علیہ السلام کو حکمِ خدا ہوا کہ اپنے ساتھ کشتی میں جاندار مخلوق کی ہر قسم کا ایک ایک جوڑا نر مادہ سوار کرا لو۔ کہا گیا ہے کہ غیر جاندار کے لیے بھی یہی حکم تھا۔ جیسے نباتات۔ کہا گیا ہے کہ پرندوں میں سب سے پہلے درہ کشتی میں آیا۔ اور سب سے آخر میں گدھا سوار ہونے لگا۔ ابلیس اس کی (یعنی گدھے کی) دُم میں لٹک گیا۔ جب اس کے دو اگلے پاؤں کشتی میں آگئے اور اس نے اپنا پچھلا دھڑ اٹھانا چاہا تو نہ اٹھا سکا کیونکہ دُم پر اس ملعون کا بوجھ تھا۔ حضرت نوحؑ جلدی کر رہے تھے۔ بہتیرا چاہتے تھے مگر پچھلے پاؤں چڑھا نہیں سکتے تھے آخر آپؑ نے فرمایا آجا گو تیرے ساتھ ابلیس بھی ہے۔ تب وہ چڑھ گیا اور ابلیس بھی اس کے ساتھ ہی آیا۔ بعض سلف کہتے ہیں کہ شیر کو اپنے ساتھ لے جانا مشکل ہو پڑا۔ آخر اسے بخار چڑھ آیا تب اسے سوار کر لیا۔ ابن ابی حاتم کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے جب تمام مویشی اپنی کشتی میں سوار کر لیے تو لوگوں نے کہا شیر کی موجودگی میں مویشی کیسے آرام سے رہ سکیں گے؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر بخار ڈال دیا۔ اس سے پہلے زمین پر یہ بیماری نہ تھی۔ پھر لوگوں نے چوہے کی شکایت کی کہ یہ ہمارا کھانا اور دیگر سب چیزیں خراب کر رہے ہیں تو شیر کی چھینک میں سے ایک بلی نکلی جس کو دیکھ کر چوہے کونے کھدرے میں بیٹھ رہے۔"

(بحوالہ "تفسیر ابن کثیر" اردو پارہ بندرہواں صفحہ ۳۶۴)

کوئی پیغمبر زندہ رہنے والا نہ تھا

قبل اس کے کہ ہم اسلامیات کے نام پر دی جانے والی تعلیم کی کوئی اور مثال پیش کریں، قرآن کریم کی چند ایک آیات کا مفہوم پیش کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور ہم نے ان پیغمبروں کو بھی ایسے جسم کا نہیں بنایا کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے تھے۔" (۲۱/۸)

یہاں "رہنے والے تھے" کے الفاظ غور طلب ہیں اور دوسری جگہ فرمایا :

اے رسول تجھ سے پہلے بھی ہم نے کوئی انسان ایسا نہیں بنایا جو ہمیشہ کے لیے زندہ رہا ہو۔ نہ ہی تیرے لیے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ پھر اگر تیرے لیے ایک دن مرنا ہے تو یہ کون سے ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ (۲۱/۳۴ نیز ۳۹/۳۰)

اور اس کے بعد حضرت عیسےٰ (علیہ السلام) کے سلسلہ میں ہے :

جب قوم عیسےٰ کی آخری تدبیر یہ تھی کہ عیسےٰ (علیہ السلام) کو گرفتار کر کے صلیب پر لٹکا دیا جائے اور اس طرح اسے بزعمِ خویش ذلت و رسوائی کی موت مار دیا جائے تو ارشاد ہوا :

وَرَافِعُكَ کا مفہوم

"لیکن خدا نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا کہ تم اطمینان رکھو۔ ان کی یہ سازش کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ تم اپنی طبعی موت مرو گے۔ میری طرف سے تمہارے مدارج بلند ہوں گے (ورافعک) میں تمہیں ان مخالفین کی دسترس سے بہت دور لے جاؤں گا اور جو الزامات یہ تمہارے خلاف تراشتے ہیں ان سے تمہاری بریت کروں گا۔ اس وقت تمہاری جماعت کے افراد کمزور نظر آتے ہیں، لیکن آخر الامر میں ان لوگوں کو جو تیرا اتباع کریں گے ہمیشہ کے لیے ان پر فوقیت دوں گا جو تیرا انکار کر رہے ہیں۔" (۳/۵۴) (مفہوم القرآن)

لیکن اس کے باوجود آنے والے کا عقیدہ

مندرجہ بالا آیات میں وَرَافِعُكَ — کے یہی وہ الفاظ ہیں جو قرآن حکیم نے نبی اکرم کی شان میں استعمال کیے ہیں کہ جب فرمایا "ہم تیرے ذکر کو بلند کر دیں گے" لیکن ہماری متذکرہ نصابی کتب میں آسمانوں کے مروجہ تصور کے مطابق حضرت عیسےٰ کو دوسرے آسمان پر زندہ مقیم بتایا جاتا ہے تاکہ (قربِ قیامت) دینِ حق کا نفاذ کر سکیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جناب حریری صاحب اپنی کتاب "تفسیر القرآن" کے صفحہ ۳۱۴ پر جناب مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ :

"امتِ مسلمہ کا اجتماعی عقیدہ ہے کہ جب یہود نے اپنی ناپاک تدبیریں پختہ کر لیں تو حضرت

مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اُٹھا لیا یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث متواترہ کے مطابق قیامت کے قریب جب دنیا کفر وفسق اور ضلالت وجہالت سے بھر جائے گی تو اللہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت وفادار جنرل کی حیثیت میں نازل کر کے دنیا کو دکھا دے گا کہ انبیاء سابقین کو بارگاہِ خاتم الانبیاء کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے، حضرت مسیح علیہ السلام دجّال کو قتل کریں گے اور آپ کے پیروکار۔۔ یہود کو قتل کریں گے۔ کوئی یہودی ان کی گرفت سے نہ بچ سکے گا۔ شجر وحجر تک پکاریں گے کہ ہمارے پیچھے یہودی کھڑا ہے، اسے قتل کیجئے۔ حضرت مسیح صلیب کو توڑیں گے۔ نصاریٰ کے باطل عقائد کی اصلاح کر کے تمام دنیا کو ایمان کے راستہ پر ڈالیں گے۔ اس وقت تمام مذہبی اختلافات مٹا کر خدا کا سچا مذہب دینِ اسلام باقی رہ جائے گا۔" (تفسیرِ عثمانی)

جناب حریری صاحب کے اس حوالے کے بعد جہاں تک ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تعلق ہے، تو وہ اپنے رسالہ میثاق بابت اپریل ۱۹۸۸ء میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"ہمارے مسلّم عقائد کے مطابق آں حضرت مسیح کا نزول ہوگا اور آں جناب زندہ وسلامت بنفسِ نفیس آسمان سے نزول فرمائیں گے اور ان کا یہ نزول جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی کی حیثیت سے ہوگا۔ وہ یہودیوں کے نجات دہندہ کی حیثیت سے تشریف نہیں لائیں گے بلکہ عذابِ الٰہی کا کوڑا بن کر ان یہودیوں کی پیٹھ پر برسیں گے۔"

یعنی دینِ خداوندی کا غلبہ امام مہدی کی آمد کا رہینِ منّت ہے اور اس وقت تک قرآنِ حکیم مسلمانوں کے پاس صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے رہے گا۔ کیا ملّتِ اسلامیہ کے گرم خون کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کسی اور نسخہ کی بھی ضرورت ہے؟۔

یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی؟

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی علم کے بالکل برعکس امام مہدی کی کہانی کافی پیچھے سے شروع ہوتی ہے۔ صرف شیعہ سُنّی ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام اہلِ مذہب ایک آنے والے کے منتظر ہیں اور یہ بھی کہ آخر عیسائیت ہی کا تسلط ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمانوں کے نزدیک امام مہدی کے نزول کے باعث اسلام کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے گا۔

جبکہ شیعہ حضرات اس انتظار میں ہیں کہ امام آخر الزماں تشریف لائیں گے اور اپنے شیعوں کو

تمام غیر شیعوں پر غالب کریں گے۔ تینوں خلیفوں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو پھر دنیا میں واپس بلائیں گے اور انہیں قتل کریں گے (اسے رجعت کا عقیدہ کہتے ہیں)

بہرحال کس قدر قیامت کا ہوگا وہ منظر جب یہ سب آنے والے ایک ہی وقت یعنی قیامت کے قریب آئیں گے اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مذہب کے غلبہ و تسلط کے لیے خدا کی طرف سے آخری کوشش کرے گا۔

ان تصریحات سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے ہاتھوں قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا نہیں ہو جائیگی؟

ختمِ نبوّت کی حقیقت

کاش نوجوان نسل کو اس قسم کے قصّوں اور کہانیوں کی بجائے یہ بتایا جائے کہ :

" یہ آنے والا رسول كَافَّةً لِّلنَّاسِ اور رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْن بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی، اسی کتابِ مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد صلعم کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی میں آتاری گئی۔ شامہ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر ریزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمن کی ان پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخرالزماں کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا اور مقامِ محمدیؐ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذرّات نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا، وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے، یہ ملّت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتدا تھی یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است

رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

(بحوالہ "معراجِ انسانیت از پرویز ص ۱۴")

؎ مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر　　بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

راقم کا تو یہ ایمان ہے کہ اگر آپ تشریف نہ لاتے تو علم و شعور کی چنگاری جہالت کے ڈھیر کے نیچے دبی کی دبی رہ جاتی۔ اور دنیا میں بے جان انسان کو شرفِ حیات نصیب ہی نہ ہوتا۔

کاش ہماری نوجوان نسل اگر ایک آنے والے کے انتظار میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے ختمِ نبوت کے اس صحیح مفہوم سے روشناس ہوتی اور یہ باور کر لیتی کہ اب نوعِ انسانی کو اپنا سفرِ زندگی شمعِ قرآنی کی روشنی میں خود اور صرف خود ہی طے کرنا ہے، تو آج ہم غلط اور کمزور سوچ کے علاوہ اس قدر ضعیف الاعتقادی اور اپنی ذات پر عدمِ اعتماد جیسی مہلک بیماریوں کا شکار نہ ہوتے۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ نے جس دن ختمِ نبوت کے اس مفہوم کو پا لیا اس دن کرۂ ارض کی قسمت بدل جائے گی اور اسی دن یہ مسجودِ ملائکہ کائناتی قوتوں پر بھی عزت و آبرو کے ساتھ حکمرانی کے قابل بن سکے گا اور اپنے آپ پر بھی ــ لیکن یہ سب کچھ تعلیم کے بدلنے سے ہو گا۔ کیونکہ تعلیم ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو افراد سے لے کر اقوام تک کے زاویۂ نگاہ کو بدل سکتا ہے کیونکہ جیسی تعلیم ویسی سوچ اور جیسی سوچ ویسی اس قوم کی حالت۔ اس لیے ضرورت صرف اور صرف اس امر کی ہے کہ ان آنکھوں میں بصارت اور قلب میں قرآنی بصیرت پیدا کی جائے، تاکہ ہمارے دلوں کی ان مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا ہو سکے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم نبضِ حیات میں از سرِ نو تازگی و شگفتگی پیدا کرنے کے لیے وحی خداوندی کو اپنا امام کب تسلیم کرتے ہیں۔

مذہبی درسگاہوں کے نصاب کے متعلق حکومت کی مقرر کردہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ

بہر حال یہ تو وہ "اسلامی تعلیم" ہے، جو ہماری "دنیاوی" درسگاہوں میں بی اے تک طلبہ کو دی جاتی ہے اور جہاں تک ہماری مذہبی درس گاہوں کا تعلق ہے تو وہاں کے نصاب کے بارے میں حالت یہ ہے کہ چودہ سال قبل ۱۹۸۳ء میں حکومت نے جائزہ کمیٹی مقرر کی تھی جس میں تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر، محکمہ تعلیم امور مذہبی اور محکمہ خزانہ کے سیکرٹری صاحبان شامل تھے، تو اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق صورتِ حال یہ ہے

"موجودہ دینی نصاب کوئی دو سو برس قبل مقرر ہوا تھا اور اس میں منقولات اور معقولات کو الگ الگ رکھا گیا تھا مگر پھر غیر ملکی حکمرانوں کے زیرِ اثر ان میں سے معقولات کا باب آہستہ آہستہ

خارج کردیا گیا۔ چنانچہ یہ تعلیم حدیث وفقہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ حتیٰ کہ قرآن شریف کے بھی صرف (۹ سال میں) ڈھائی پارے پڑھائے جانے لگے اور وہ بھی تفسیر بیضاوی کی روشنی میں۔ چنانچہ اکثر معلمین تحصیل علم کے بعد لازمی طور پر قرآن پاک کے حقائق سے آشنا نہیں ہوتے

(بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء)

بی اے کی اسلامیات کا تذکرہ کرنے کے بعد جہاں تک یونیورسٹی کی سطح کا تعلق ہے، اس کے لیے قارئین کی خدمت میں ہمیں حافظ محمد یعقوب[1] صاحب کی طرف سے لکھی گئی مندرجہ ذیل چند سطور کا مطالعہ کرنا ضروری ہوگا جو آپ نے انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کی طرف سے شائع ہونے والے ایک خطبہ جمعہ کے سلسلہ میں تحریر کیں۔

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

"— اتفاق سے ہمیں ایک خطبے کو پڑھنے کا موقع ملا ہے جس کی اشاعت انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد نے کی ہے۔ اجراء کی تاریخ، فروری ۱۹۸۶ء ہے۔ یہ خطبہ اس تدریسی سلسلے کا ایک حصہ ہے جو یہ یونیورسٹی اپنے اشتراک عمل سے بین الاقوامی سطح پر بذریعہ خط و کتابت کر رہی ہے۔ اس خطبے کا نمبر **خطبہ جمعہ 125** ہے۔ اور سورۃ المائدہ کی آیات ۴۳-۴۱ کا ترجمہ اور تفسیر و تشریح اس میں شامل ہے۔

— اردو زبان و ادب کی بات ایک طرف، ترجمے میں اسی قسم کا تضاد اور اقوال و نقوش موجود ہیں جس طرح قرآن کے عام ترجموں میں ہمارے ہاں اکثر ملتے ہیں اور جو تحقیقی عمل اور تشریحی نکات کی چھان بین کے بغیر ہی حسبِ دستور درج کر دیئے جاتے ہیں خطبے کو تشکیل دیتے وقت اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی کہ معانی کو پڑھنے سے ایک متعلم کے ذہن پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے۔

— قرآنِ کریم کی تعلیم و حکمت کا وہ اعلیٰ معیار جسے خود خدا نے قائم کیا ہے کیا وہ اپنی پوری سچائی سے متعارف ہو رہا ہے یا تعارفی تحریروں میں ہم کہیں غلطی تو نہیں کھا رہے، اس کا دیکھنا ہم سب کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

---

[1] موصوف "ریسرچ انسٹی ٹیوٹ — اسلامک لٹریچر اینڈ نالج آف قرآن" کے بانی ہیں۔

— اور تو اور خود اللہ رب العزت کی ذات کے متعلق جس قسم کا غلط تصور یہاں نظر آ رہا ہے وہ بصیرت سے خالی ہی نہیں، حقائق سے دور ہے۔ حوالے کے طور پر اسی خطبے کو لیجیے جو خوبصورت کاغذ پر چھپا ہوا ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے صفحے پر قرآن کی آیات، ان کے سامنے اُردو کا ترجمہ اور اس کے سامنے ایک نو مسلم کا انگریزی زبان میں ترجمہ یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ باقی تین صفحات پر ان آیات کی تفسیر اور تشریح ہے۔ اُردو کے ترجمے میں جو کچھ درج ہے، اسے مختصر سا تعارف سمجھ کر ملاحظہ فرمائیے اور سوچیئے کہ یہ کس قسم کا درسِ وفا ہے جو یہ ادارہ ملتِ اسلامیہ کے افراد کو دے رہا ہے۔ لکھا ہے؛

"...... اور اگر کسی کو خدا گمراہ کرنا چاہے تو اس کے لیے تم کچھ بھی خدا سے (ہدایت کا) اختیار نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو خدا نے پاک کرنا نہیں چاہا، ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی ....."

— خدا ہی گمراہ کرے اور خدا ہی دل کو پاک نہ کرے تو بندے کا اس میں کیا قصور؟ پھر بندے پر خدا کا عذاب کیوں؟

اپنے ضابطۂ کار میں کیا خدا خود ظالم ہے؟

— اس وقت اس اُردو اور انگریزی ترجمے پر بحث مقصود نہیں بلکہ اس یونیورسٹی — الجامعۃ الاسلامیہ العالمیہ — کے اسی خطبے کے صفحہ ۳ پر دی گئی مذہبی آیات کی تفسیر و تشریح کے اُس اقتباس سے ہے جس میں لکھا ہے،

"...... یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اوّل تو احکام بالخصوص تعزیرات و حدود بنیادی طور پر تورات و قرآن دونوں میں یکساں ہیں۔ پھر بھی آنحضرت ؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جن امور میں قرآن کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہوتی ان میں آپ فیصلہ احکام تورات کے مطابق فرماتے ...."

— اس تحریر کو لکھنے اور ترتیب دینے والے معلمین نے قرآن کی تمام ارفع اقدار و سرفرازی کی کس طرح سرے سے نفی کر دی اور کس طرح محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو بلند سطح سے اُس سطح پر لے آئے جس کا اندازہ، اپنے شعور سے نہیں، قرآن کی متعدد آیات ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپنی طرف سے ہم اگر کچھ کہیں گے تو یونیورسٹی کے اکابرین و زعماء اپنی خفگی کے اظہار میں — حصولِ کامرانی کی خاطر — قوم کو یونہی لوازہتے چلے جائیں گے — اور ہماری تفسیروں کی کیفیت بدستور وہی رہے گی جو اب تک چلی آ رہی ہے۔

— معلمین یہ فرمارہے ہیں،

"۔۔۔۔ تعزیرات وحدود بنیادی طور پر تورات وقرآن دونوں میں یکساں ہیں ۔۔۔۔"

جبکہ قرآن کا ارشاد ہے :

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ
يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا (۱۷/۹)

"یقیناً یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جس سے زیادہ سیدھی راہ اور کوئی نہیں اور ان مومنوں کو خوشخبری دیتا ہے جو اچھے کام کرتے ہیں، کہ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔"

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

(۶/۱۵۵)

"یہ مبارک کتاب دی گئی ہے بس اب تم سب اس کا اتباع کرو اور تخریبی راستوں سے بچتے رہو تاکہ تمہاری صلاحیتوں کی نشوونما ہو سکے۔"

— یہ لوگ لکھتے ہیں،

"۔۔۔ آپ فیصلہ احکام توراۃ کے مطابق فرماتے ۔۔۔۔۔۔"

جبکہ قرآن یہ فرمارہا ہے،

"اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ" ۴۶/۹

"میرا کام یہ ہے کہ میں اس وحی کا اتباع کیے جاؤں جو میری طرف نازل ہوتی ہے اور تمہیں غلط کاموں کے انجام سے ڈراتا رہوں۔"

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِىْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِىْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَىَّ اِنِّىْۤ
اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّىْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ (۱۰/۱۵)

"کہو کہ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے اسے بدل دوں۔ میں تو کسی چیز کی پیروی نہیں کرتا سوائے اس کے کہ جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو یقیناً میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔"

— الجامعۃ الاسلامیہ العالمیہ والے رقمطراز ہیں،

"۔۔۔ جن امور میں قرآن کی کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہوتی ۔۔۔۔"

قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ یہ فرمارہے ہیں،

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ . . . .

(سورۃ عنکبوت - آیت ۵۱)

" کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے . . . . "

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ

" اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے ۔ "

— قرآن ہی کے مفصل ہونے اور اسی کی عظمت و تکمیل کے سلسلے میں خوبصورت ترین الفاظ جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں ،

امّ الکتاب	سورۃ آل عمران -	آیت ۶
مفصّل کتاب	سورۃ ہود	آیت ۱
	سورۃ الاعراف -	آیت ۵۲
	سورۃ الانعام -	آیت ۱۱۵
مبارک کتاب	سورۃ الانعام -	آیت ۱۵۶
لاریب کتاب	سورۃ بقرہ -	آیت ۲
	سورۃ السجدہ -	آیت ۲
مُنیر کتاب	سورۃ الحج -	آیت ۸
	سورۃ لقمٰن -	آیت ۲۰
مسطور کتاب	سورۃ بنی اسرائیل -	آیت ۵۸
معلوم کتاب	سورۃ الحجر -	آیت ۴

— خطبہ بنانے والوں کا یہ لکھنا ،

" . . . . . آپؐ کا فیصلہ تورات کے قانون کے عین مطابق ہے . . . . . "

قرآن کی رُو سے درست نہیں کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم صاحبِ قرآن تھے اور اُن کا ہر عمل اور ہر قدم اُسی راستے کی طرف اُٹھتا جس کا تعین قرآن نے کیا ،

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ

(سورۃ الانعام - آیت ۱۲۶)

" اور یہ تیرے رب کا سیدھا راستہ ہے ، یقیناً ہم نے مفصل آیتیں بیان کیں ان لوگوں

کے لیے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں "

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۔۔۔۔ (سورۃ بقرہ۔ آیت ۲۱۳)

"کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے ۔"

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِن شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ۔

(سورۃ الشوریٰ۔ آیت ۱۰)

"اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رُو سے کر لیا کرو "

— دینِ اسلام کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے تورات کے احکامات کے مطابق نہیں بلکہ اللہ کی کتاب "قرآن مجید" کے احکامات کے مطابق طے پاتے اور جزئیات کا تعین باہمی مشورے سے آپ کیا کرتے " [1]

۔۔۔۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۔۔۔۔۔ (سورۃ آل عمران۔ آیت ۱۵۸) — "

انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کا ایک اور خطبہ

اسلام آباد اسلامک یونیورسٹی کی طرف سے ۲۰ فروری ۱۹۸۶ء کے اس خطبہ کے بعد مورخہ ۲۳ مئی ۱۹۸۶ء کو جو خطبہ شائع ہوا وہ بھی اس پہلے خطبے سے کچھ کم حیران کن نہیں۔ یہ خطبہ کیا تھا اور یہ قندیلِ آسمانی کی تعلیم سے اُسے کس قدر بُعد ہے، یہ جاننے کے لیے ہمیں ایک بار پھر حافظ محمد یعقوب خان صاحب کا مشکور ہونا پڑے گا۔ موصوف " وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ " (اور مت چھپاؤ گواہی کو) (سورۃ البقرۃ۔ آیت ۲۸۳) " کے زیرِ عنوان تحریر کرتے ہیں کہ :

— " پچھلے دنوں میں دیئے گئے اُس ایک خطبے کو اٹھا کر دیکھئے جو اسلام آباد انٹرنیشنل یونیورسٹی نے شائع کر کے ——— ائمہ کی تربیت کے سلسلے میں ملک کے لوگوں کو بھجوایا ہے۔ اِس خطبے کا نمبر ۱۳۹ ہے۔ یہ خطبہ ۲۳ مئی ۱۹۸۶ء کا ہے اور اس میں سورۃ المائدہ کی آیات ۱۰۹ تا ۱۱۲ تک کا ترجمہ اور تفسیر و تشریح شامل ہے :

— قرآن مجید کی مذکورہ آیات سے پہلے کی آیات میں شہادت اور گواہی کے احکامات بیان ہوئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ حقیقت کے مطابق سچی گواہی کا ہونا ضروری ہے تاکہ مجرم کو اس کے جُرم کی سزا دی جا سکے۔ گواہوں کی شہادت کے ذکر کے ساتھ انسانوں

---

[1] ماہنامہ تعمیرِ انسانیت لاہور شمارہ جولائی ۱۹۸۶ء

کی توجہ اس فکر کی طرف دلائی گئی ہے کہ جو کام بھی انسان کرتا ہے اس کا نتیجہ ہر حالت میں اس کے سامنے آتا ہے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کے کیے ہوئے اچھے یا بُرے کاموں کی جزا سزا اسے نہ ملے۔

— یوم حساب کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے اس روز پوچھا جائے گا کہ فرمایئے ان اقوام تک آپ نے جو خدا کا پیغام پہنچایا تھا تو ان سے کیا جواب آپ کو ملا۔ یہ لوگ راہِ راست پر آنے میں کس قسم کا اظہار کرتے رہے اور کہاں تک حق کی طرف انہوں نے رجوع کیا۔ انبیاءُ علیہم السلام سے اس سوال کے ساتھ جس بات کا تفصیلی تذکرہ اِن آیاتِ کریمہ میں ہے، وہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اُن عنایات کا جو اللہ تعالیٰ نے اُن پر مرحمت فرمائیں۔ ان آیات کی تفسیر و تشریح بیان کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اساتذہ نے اس خطبے میں لکھا ہے ،

خطبے کا اقتباس

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِس میدان میں جب روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے سوال ہوتا ہے کہ آپ کی اُمّت نے آپ کو خدا کا شریک بنایا تو وہ ساری عزّت وعظمت اور عصمت و نبوّت کے باوجود گھبرا کر اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور بار بار مختلف عنوانات سے وضاحت فرمائیں گے۔ حدیثوں میں ہے کہ جب بارگاہِ خداوندی سے یہ سوال ہو گا تو یہ جاننے کے باوجود کہ وہ بے قصور ہیں، حضرت عیسےٰ علیہ السلام اس سوال کی دہشت سے ستّر سال تک سکتے میں رہیں گے۔ ان کے جسم کی ہڈیاں ہل جائیں گی اور رونگٹوں سے خون بہ نکلے گا۔ پھر آخر کار وہ عرض کریں گے کہ مَیں نے ان کو یہ تعلیم نہ دی تھی۔ میری کیا مجال تھی ایسی بات کہنے کے لیے جس کا مجھے حق نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔"

— اس اقتباس کو جو اُوپر درج کیا گیا ہے ایک بار پھر پڑھیئے اور غور سے دیکھئے کہ یہ جو کچھ لکھا ہے اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے ایک بنیادی جملے کا ہونا صرف لازمی تھا جو یہ کہ کر پورا کر دیا گیا،

"حدیثوں میں ہے کہ جب بارگاہ" حدیثوں میں ہے کی علامتی تشکیل اور جرأتِ

گفتار سے ساری اس بات کی ذمہ داری اٹھا کر رکھ دی گئی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر کہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ عیسےٰ علیہ السلام قیامت کے دن ستر سال تک سکتے میں رہیں گے اور اذیت و کرب سے ان کے جسم کی ہڈیاں ہل جائیں گی اور رونگٹوں تک سے خون نکل آئے گا۔

—— آیئے ہم دیکھیں کہ کیا واقعی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا فرما سکتے تھے اور کیا یہ الفاظ اُن ہی کے ہو سکتے ہیں؟ بات اُس وقت ہی بے نقاب ہو کر سامنے آئے گی جب ہم قرآن میں نگاہ ڈالیں گے اور ایسے عناصر کا پتہ کریں گے جو قرآن کی رُو سے غیر فطری ہی نہیں بلکہ اخلاقیات کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے بھی اُن کا کوئی وجود نہیں۔

—— قرآنِ حکیم کا بیان ہے:

" فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ " (سورۃ یٰسٓ ۔ آیت ۵۴)

" پس اس دن نہیں ظلم کیا جاتا کسی جان پر کچھ بھی اور نہیں تم بدلہ دیے جاتے مگر وہی جو تھے تم عمل کرتے۔"

—— اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالےٰ یہ فرمارہے ہیں کہ قیامت کے دن —— یوم الدین دن انصاف کے —— کسی کی جان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جاتا اور یہ کہ بدلہ دیا جاتا ہے صرف اُن اعمال کا جو انسان اپنی ارضی حیات میں کر گذرا ہُوا ہوتا ہے۔ یعنی یہ دن یومِ حساب کا دن ہے اور یومِ حساب میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جو عدل کا تقاضا پُورا نہ کرے۔

—— حضرت عیسےٰ علیہ السلام کا قیامت کے روز ستر سال تک کے لیے سکتے میں آجانا اور تکلیف میں اتنا لمبا عرصہ رہنا ایک ایسے عذاب سے دوچار ہونا ہے جو اِن کے ناکردہ گناہوں کی وجہ سے اُن کے رُوح اور جسم پر —— خدا کے ایک سوال کے نتیجے میں —— روا رہا، انصاف کے منافی ہی نہیں بلکہ اس فرمان کے خلاف ہے جو قرآنِ حکیم کی اس آیت میں درج ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عدالت میں کسی ایسے واقعہ کا سرزد ہونا خارج از قیاس ہے اور اسی بنا پر یہ کہا

جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔

اِس قسم کا مواد جو کسی کتاب میں حدیث کے نام پر درج ہے وہ غیر معتبر ہے۔

— قرآن مجید کی دو اور آیات لکھے دیتا ہوں تا کہ پڑھنے والے اپنے فکری رجحان سے از خود دیکھ سکیں کہ حقائق کیا ہیں۔

" يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۔ " (سورۃ النور۔ آیت ۲۵)

" اس دن پورا دے گا انہیں اللہ بدلہ ان کا حق اور وہ جان لیں گے یہ کہ اللہ ہی ہے حق کھول کر بیان کرنے والا۔ "

" اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۚ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا " (سورۃ الفرقان۔ آیت ۲۶)

" بادشاہت اس دن حق ہوگی رحمٰن کے لیے اور ہوگا وہ دن کافروں پر بہت سخت۔ "

— اب آیئے ایک اور زاویے سے اسے دیکھیں اور قرآن کی رُو سے سمجھیں کہ اس معاملے میں سچائی کا دخل کہاں تک ہے۔ میعاد ستر سال بڑی لمبی ہے اور اِس دنیا میں بسنے والے انسانوں کی پوری عمر کے اگر مساوی نہیں تو کم بھی نہیں ہے۔ یہ سال یہ مہینے اور یہ دن ہم سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کے موجودہ کائناتی نظام کے مطابق بناتے ہیں۔ یعنی سورج کے طلوع ہونے سے دوسرے دن کی صبح تک کو ہم ایک دن کا نام دیتے ہیں۔ اور اِس اکائی کی بنیاد پر مہینوں اور سالوں کی گنتی کرتے ہیں۔ اب جبکہ قیامت کے برپا ہونے سے نہ ہماری یہ زمین رہی نہ دکھائی دینے والے یہ ستارے رہے اور نہ یہ نظام شمسی رہا، سب کچھ ہمارا فنا ہو گیا۔ تہذیبیں ختم ہو گئیں،

" وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ "

" باقی رہے گی ذات تیرے رب کی صاحبِ جلال اور صاحبِ عزت کی "

تو پھر یوم عدل کے دن ۷۰ سال کے عرصے کا تعین کس کائناتی نظام کی رُو سے عمل میں آیا؟ کیسے یہ تصور کر لیا گیا! اگر کہا جائے کہ یہ شمار ' خدا کے دنوں ' کو سامنے رکھ کے کیا گیا تو پھر مسئلہ یہ سامنے آگیا کہ خدا کے دن تو بڑے ہوتے ہیں،

"فِی یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ"

"ایک دن میں ہے اندازہ اس کا ہزار سال اس سے جو تم گنتے ہو۔"

— خدا کا ایک دن پچاس ہزار سال کا بھی ہے۔

— اللہ تعالےٰ کے دنوں کے اس حساب سے ۰، سال کا طویل عرصہ قیامت کے دن سے شروع ہوا اور یہ روز حضرت عیلےٰ علیہ السلام کی قوتِ عمل کو معطل رکھنے کے لیے روزِ اوّل قرار پایا۔ قیامت کے دن سے کسی انسان کا تکلیف کی زد میں آجانا اور پھر مدتوں اس میں مبتلا رہنا جہنمی زندگی سے کیا کم ہوگا۔

— یہاں یہ عرض کرنے کا صرف مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا ذہن صاف شستہ اور پاکیزہ تھا۔ تعلیم وحکمت خدا نے سکھائی تھی۔ صاحبِ قرآن تھے۔ فہم وتدبّر کے مالک تھے۔ اس بات کا لہٰذا قطعی کوئی جواز نہیں ہے کہ آپؐ نے یہ کچھ واقعی فرمایا تھا۔

— آگے چلیئے اور دھیان دیجئے خطبے کے ان الفاظ پر،

"حضرت عیلےٰ علیہ السلام اس سوال کی دہشت سے ستر سال تک..."

— سوال کرنے والا خود ربّ العالمین ہے۔ اس کی بے شمار صفات ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ اگر غفور رّحیم کے الفاظ ہی لے لیں تو قرآنِ حکیم کے صفحات آپ کو بتائیں گے کہ کم وبیش یہ الفاظ ۵۰ جگہ پر آئے ہیں۔

— اللہ تعالےٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں تھی۔ حضرت عیلےٰ علیہ السلام کی پوری زندگی کے تمام لمحات خدا کے سامنے تھے۔ پھر رحم وکرم اور جُود وعنایات وبخشش والی ہستی سے دہشت کا اظہار کیسے ممکن تھا۔ اور اگر سوال کی نوعیت سے خود حضرت عیلےٰ علیہ السلام دہشت زدہ ہو گئے تو یہ اُن کی شخصی عظمت کے خلاف تھا۔

قرآن کا کہنا ہے،

"یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ"

(سورۃ الزخرف، آیت ۶۸)

"اے میرے بندو نہیں کوئی خوف تم پر آج کے دن اور نہ تم غمگین ہو گے۔"

"مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ" (سورۃ النمل : آیت ۸۹)

"جو کوئی لایا نیکی پس اس کے لیے بہتر ہے اس سے اور وہ خوف سے اس دن امن میں ہوتے ہیں۔"

— تلاش و جستجو میں جوں جوں ہم مختلف زاویوں سے اِس "حدیثوں میں ہے..." کے علم کا تجزیہ کرتے جائیں گے ہم پر قرآن کے حوالوں سے کھلتا چلا جائے گا کہ یونیورسٹی کے اس خطبے میں حدیث کے نام پر جو درج ہے وہ بالکل وضعی ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا اُس سے کوئی واسطہ نہیں۔

— اور آخر میں اہلِ نظر کے سامنے قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں اس کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا ہے۔ یہ آیت پڑھ لینے کے بعد سوچیے کہ یہ کیسے ہُوا اور کیونکر ہُوا کہ قرآن کے واضح، لطیف، بلیغ، غیر مبہم الفاظ کے ہوتے ہوئے ایک تراشیدہ بات کو قرآن کی پاکیزہ تعلیم کے اندر سمو دیا گیا؟۔ قرآن کے مفصّل بیان کی موجودگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منسوب کر کے اس قسم کا بیان دینے والے یہ کون لوگ تھے! اِس طرح کی باتیں اب نقل کرنے والے یہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں:

"وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ۗ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۗ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۗ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

(سورۃ المائدہ : آیت ۱۱۶-۱۱۷)

" اور جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تُو نے کہا تھا لوگوں سے ٹھہراؤ مجھے اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے۔ عرض کیا پاک ہے تُو کہاں تھا شایاں میرے لیے یہ کہ کہوں وہ بات کہ نہیں ہے مجھے کوئی حق اگر میں نے کہا ہوتا ایسا تو یقیناً علم ہوتا تجھے اس کا تُو جانتا ہے جو کچھ ہے دل میں میرے اور نہیں جانتا میں جو کچھ ہے دل میں تیرے یقیناً تُو سب جاننے والا غیب کے بھیدوں کا نہیں کہا میں نے اُنہیں مگر وہی کہ حکم دیا تُو نے مجھے جس کا کہ عبادت کرو اللہ میرے ربّ کی اور اپنے ربّ کی اور میں تھا اُن پر گواہ جب تک رہا میں اُن میں اور پھر جب تُو نے وفات دے دی مجھے تو تھا تُو نگہبان اُن پر اور تُو ہے کُل چیز پر گواہ۔"

اپنے اظہار کے لیے کیسا نیا اسلوب ہے!!

— کیا خوبصورت اور پیارا انداز ہے سوال و جواب کا! کس قدر شفقت پائی جاتی ہے اس سوال میں اور کس قدر احترام پایا جاتا ہے اس جواب میں! ایمان سے دیکھا جائے تو اتنے متوازن اور فصیح الفاظ اللہ کے ایک رسولؑ کے ہی شایانِ شان ہو سکتے ہیں۔

— حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا یہ جواب اس بات کی ترجمانی کر رہا ہے کہ،

" وُجُوْهٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ "

(سورۃ القیامۃ : آیت ۲۲-۲۳)

" کتنے منہ اُس دن تر و تازہ ہوتے ہیں طرف اپنے ربّ کے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔"

— اِس ایک ہی آیت کے اندر ادب کی وہ تخلیق بھی ہے اور وہ سب کچھ آ بھی گیا ہے، جس کے پڑھ لینے سے ساری بات سمجھ میں آجاتی ہے۔

— قرآن کا فرمان ہے،

" كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ "

(سورۃ ص : آیت ۲۹)

" یہ کتاب ہے کہ اُتارا ہم نے اسے تیری طرف برکت دی گئی ہے تاکہ وہ غور کریں آیات پر اس کی اور تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اصحابِ دانش۔"

— اِس آیتِ مقدسہ میں واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ " تاکہ وہ غور کریں آیات پر اس

کی اور تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اصحابِ دانش " لیکن جس قسم کا غور ملتِ اسلامیہ کے اصحابِ دانش قرآنِ حکیم کی آیات میں کر رہے ہیں اور جس قسم کی تبلیغ اسلامی ذرائع ابلاغ سے ہم انسانوں تک پہنچ رہی ہے وہ مایوس کن نہیں ہماری شکستگی کا موجب بن رہی ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں

سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس قسم کی اختلاط آمیز تعلیم کے ذکر کے بعد جہاں تک رحمتِ خداوندی کا تعلق ہے، وہ تو ہر آن مائل بہ کرم ہے کوئی سائل بھی تو ہو — ارشاد خداوندی ہے :-

" اس کی ذات جو (زمین کے جھلس جانے کے بعد) ان ٹھنڈی ہواؤں کو بھیجتی ہے جو اس کے ابرِ کرم کی پیشوائی میں ایک حیاتِ نو کی بشارت دیتی ہے۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے کر اڑتی ہیں تو خدا کا قانون انہیں زمین مُردہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ وہاں ان بادلوں سے پانی برستا ہے جس سے اس زمین مردہ سے ہر قسم کے پھول اور پھل پیدا ہو جاتے ہیں اور ہر طرف زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔" (۷/۵۷)
(مفہوم القرآن)

اِن کلیوں کو بکھرنے نہ دیجئے

لہٰذا اس سلسلہ میں میری اہلِ دانش سے التماس ہے کہ اگر سب کے سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے ہی مل بیٹھیں اور یہ سوچیں کہ ملتِ اسلامیہ کی نئی نسل جسے اس صحن کائنات کی فضا میں بادِ نسیم کی مانند ایک سدا بہار پھول کی خوشبو بن کر پھیلنا ہے کہیں یہ کلیاں حسبِ سابق ہماری کوتاہی کے ہاتھوں ہی پژمردہ ہو کر ملتِ اسلامیہ کے اس اجڑے ہوئے گلستان میں بکھر کر نہ رہ جائیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ " قرآنی تعلیم ہی وہ روشنی ہے، جسے مومن دنیا میں لے کر چلتا ہے " اور اسی کے سہارے یہ اُمت خود بھی ہر قسم کی مستبد قوتوں سے محفوظ رہتی ہے۔ اور دوسری مظلوم اور محکوم قوموں کو بھی اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ حرکت و عمل کے سمندر میں تیزی سے تیرنے کے قابل بن جائیں تاکہ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی حائل نہ ہو حتیٰ کہ ظلم پروری کی خاطر قدم قدم پر مادیت کی سنگلاخ چٹانیں اور عمیق و تاریک غاریں کسی بھی انسان کے راستے میں حائل نہ ہو سکیں۔

مُستبد قوتوں کے مختلف حربے

جبکہ قرآن کریم کے الفاظ میں :

"مستبد قوتیں زیردست طبقہ کو اس قدر کچلتی ہیں کہ ان کی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ بالکل بنجر زمین کی طرح نظر آتے ہیں جس میں زندگی کی کوئی علامت ہی باقی نہ رہے..... لیکن قوانین خداوندی کی اطاعت سے ایسی انقلابی جماعت پیدا ہو جاتی ہے جو اس مظلوم و مقہور طبقہ کی صلاحیتوں کو پورے زور سے کھینچ کر اوپر لے آتی ہیں جو مستبد طبقہ نے ان کی راہ میں جس قدر رکاوٹیں ڈال رکھی ہوئی ہیں وہ جماعت ان سب کو راستے سے ہٹا کر کمزور طبقہ کی غلامی کی گرہیں کھول دیتی ہیں تاکہ وہ آزادانہ سرگرم عمل ہوں۔" (۱-۲-۳/۹)

(بحوالہ مفہوم القرآن)

صدر ایوب کی پکار

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس مقصد کی خاطر ہمارے اہل دانش موجودہ نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ مروجہ "اسلامی نصاب تعلیم (جو ہماری اُبھرنے والی نسلوں کے لیے زہرِ قاتل ہے) کی طرف کب توجہ کرتے ہیں۔ یہی وہ خواہش تھی جس کی طرف صدر ایوب مرحوم نے مئی ۱۹۶۴ء کو کراچی میں اربابِ علم و فکر سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"لوگ فرسودہ خیالات سے چمٹنے اور پامال راستوں پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنے کے عادی ہو چکے ہیں اور ہر تبدیلی کو شک و شبہات و بدظنی کی نظروں سے دیکھتے ہیں یہ سب اس لیے کہ جیسا ہوتا چلا آ رہا ہے ویسے کرتے چلے جائیں۔ اس میں بڑی تن آسانی اور سہل انگاری ہوتی ہے اور ان راستوں سے ہٹ کر نئی راہیں تلاش کرنے میں بڑی مشقت درکار ہوتی ہے لیکن اگر ہمیں ترقی کرنی ہے تو ہمیں فرسودہ اور پامال راستوں کو چھوڑنا ہو گا۔ اگر ہم نے ان خیالات کو نہ چھوڑا جن سے ہم محض اس لیے چمٹے ہوئے ہیں کہ وہ صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔ تو ہم کبھی اس رفتار سے ترقی نہیں کر سکیں گے جس رفتار سے ہمیں ترقی کرنی چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں دنیائے فکر میں زیادہ سے زیادہ "باغی اور ملحد" پیدا ہوں۔"

لہٰذا جو خوش بخت کالجوں اور دار العلوموں کی ثنویت کو ختم کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو موجودہ تعلیمی بحران سے نکالے گا، وہی اس کا محسن ہو گا اور تاریخ کے اوراق پر اسی کا نام سورج کی سنہری کرنوں سے رقم کیا جائے گا۔ صدر ایوب نے تو یہ دعا کی تھی کہ ہمارے ہاں دنیائے فکر میں زیادہ سے زیادہ "باغی اور ملحد" پیدا ہوں،

ور علامہ اقبال نے ایسی ہی صلاحیتوں کے مالک نوجوانوں کو پکار پکار کر کہا تھا کہ: ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

چونکہ اس تحریک میں علم و بصیرت کو کفر اور عقل و شعور کو الحاد قرار دیا جاتا ہے، اس لیے مذہب کو جذبات کے زور پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ اس سے ان ملکوں میں مذہبی جنون عام ہو رہا ہے جن میں فنڈامینٹل ازم کا دور دورہ ہے۔ یہ جنون منظم ہو کر "اسلامی دہشت گردی" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ "دی مسلم" کی (۱۴) ستمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ملائشیا میں کس طرح اس تحریک نے بغاوت کی شکل اختیار کر رکھی ہے اور اس سے وابستہ مذہب پرست (اسلام پسند جماعت (کس طرح) حکومت کے مدمقابل کھڑی ہو رہی ہے اور اعلان کرتی ہے کہ "ہم اپنے اسلامی جہاد کو آخر تک جاری رکھیں گے۔" اسی قسم کی آگ دیگر مسلم ممالک میں بھی سلگ رہی ہے اور اس طرح مسلمان خود مسلمانوں کی تلوار سے ذبح ہو رہے ہیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر پرویز صاحب نے "طلوعِ اسلام" میں تحریر فرمایا کہ :

"دو برس ادھر کی بات ہے، ڈیوک یونیورسٹی کے ایک پروفیسر، جو وہاں ریلیجس کے استاد اور عرب اور اسلامی مطالعاتی پروگرام کے مشیر ہیں پاکستان آئے تھے۔ ان کا ایک انٹرویو کراچی کے روزنامہ ڈان کی ۱۱ جون ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اس سوال کے جواب میں کہ ان کے نزدیک فنڈامینٹل ازم کا مفہوم کیا ہے۔ انہوں نے کہا تھا اس تحریک کے ساتھ وابستگان کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ یہ غیر مسلموں ہی کی نہیں خود اپنے مسلمان بھائیوں کی بھی کسی بات کو برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ فنڈامینٹلسٹ وہ ہے جو اس بات پر مصر ہوتا ہے کہ صرف اس کا نقطۂ نظر اور مسلک صحیح ہے، باقی سب گمراہ ہیں۔ مصر کے اخوان المسلمون ہوں یا ایران کے مجاہدین، ان سب کا طرزِ عمل متصلب (بے لچک) ہوتا ہے اور کسی دوسرے کی بات ماننے کیلیے ان کے ہاں گنجائش نہیں ہوتی۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" اگست ۱۹۸۲ء ص ۸)

فنڈامینٹل ازم کے عملی نتائج

اس کے بعد تحریر ہے کہ :

" ان کی یہی ذہنیت انہیں دوسرے مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت، معاشرہ میں دہشت گردی اور خود حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیتی ہے نیز وہ اسے جہاد سمجھتے ہیں، اور اس میں جان دے دینے کو شہادت "

" اسلام کے ساتھ محبت و احترام کی حیثیت نظری عقیدہ کی نہیں۔ اس کے عملی مضمرات بہت دور رس ہیں۔

اس سلسلہ میں دو باتیں ذہن میں رکھیئے۔ ایک یہ کہ جنہیں علماء کہا جاتا ہے ان کا مبلغ علم صرف اتنا ہوتا ہے کہ پیشِ نظر معاملہ کے متعلق فلاں امام نے کیا فرمایا ہے۔ فلاں مفسّر کا کیا قول ہے۔ فلاں محدّث کا کیا ارشاد ہے۔ جس شخص کو ان حوالوں پر زیادہ عبور ہوگا وہ بہت بڑا عالم تصور کیا جائے گا۔ قرآن ان کے نصاب میں ہوتا ہی نہیں اور اسلاف کے مسلک کے متعلق عقل و بصیرت سے کام لینا ان کے نزدیک حرام ہوتا ہے۔"

مسلم انسٹی ٹیوٹ لندن

"دوسری بات یہ ہے کہ فنڈامینٹل ازم کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں اقتدار انہی علماء کے ہاتھ میں رہے۔ یعنی ان کے ہاں نظامِ حکومت تھیا کریٹک ہو تاکہ یہ نہ دین کے رہیں نہ دنیا کے۔"

روزنامہ جنگ (لاہور) کے کالم نگار محترم ارشاد احمد حقانی صاحب، حال ہی میں دیارِ فرنگ اور ارضِ حرم کے دورہ سے واپس آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لندن کی مسلم انسٹی ٹیوٹ کی ایک قرارداد کا تفصیلی جائزہ لیا ہے جسے انہوں نے ۳۰ ستمبر ۱۹۹۲ء کی اشاعت میں تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "زیرِ نظر قرارداد میں مجوزہ اسلامی انقلاب کی قیادت اور رہنمائی علماء کو سونپی گئی ہے۔ یہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی سوچ کا ایک اہم عنصر ہے۔ وہ جدید تعلیم یافتہ افراد اور طبقہ سے بہت زیادہ الرجک ہیں۔ ان کے نزدیک اس طبقہ کے افراد خواہ کسی قدر صاحبِ علم اور دینی مزاج کے حامل ہوں اور خواہ تہذیبِ مغرب کی فلسفیانہ بنیادوں کے ناقد بھی ہوں، ایک اسلامی ریاست میں رہنمائی کے منصب پر فائز ہونے کے قابل نہیں۔ رہنمائی صرف علماء ہی فراہم کر سکتے ہیں کیونکہ وہ تہذیبِ مغرب کے مضر اثرات سے پوری طرح محفوظ ہیں اور جدید تعلیم یافتہ افراد کے اندر ان کی تمام تردینداری کے باوجود "مغرب زدگی" کے جراثیم موجود ہوتے ہیں" اس کے بعد حقانی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔
>
> "ان کی دانست میں کوئی بھی جدید تعلیم یافتہ شخص مسلمان عوام یا اُمتِ مسلمہ کی حقیقی قیادت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی رائے ہے جسے کہے بغیر چارہ نہیں۔ ایک مسلم انسٹی ٹیوٹ کو اس پر اصرار ہے اور عالمِ اسلام کے لیے اس کے تجویز کردہ نسخہ کا یہ لازمی جزو ہے۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ فنڈامینٹل ازم، کوئی مقامی یا کسی خاص ملک کی تحریک نہیں۔ اسے عالمگیر تحریک کے طور پر چلایا جا رہا ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے لٹریچر میں اس تحریک کے متعلق اکثر معلومات ملتی ہیں۔ اس کا بیج کہاں بویا گیا۔ اس کی جڑیں کہاں کہاں ہیں۔ اس کی آبیاری اور نشوونما کیسے کی جاتی ہے۔ اس کے لیے فنڈز کا کیا انتظام ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت یہ تحریک

مختلف مسلم ممالک میں الگ الگ تنظیموں کی شکل میں ہے (جن کے نام بھی الگ الگ ہیں۔)
اس کے سرپرستوں کے نزدیک اس کی آخری منزل کیا ہوگی " اس کے متعلق امریکہ سے شائع ہونے والے
جریدہ ٹائم کی ۳۰ مئی ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں ایک بڑا معلومات افزا مضمون شائع ہوا تھا جس میں مشرقِ وسطےٰ
کے ممالک کا سیاسی جائزہ لینے کے بعد لکھا تھا۔

"مسلمانوں کی فنڈامینٹل اسٹ تحریک، یعنی وہ طوفانی قوت جس نے ایران میں انقلاب برپا کردیا
تھا، اب اپنی قوت کی نمود، مصر، اردن، شام، سعودی عرب اور خلیج کی عمارات میں بھی کر رہی
ہے۔ مشرقِ وسطےٰ کے مسائل کے ماہرین یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ اگر ان نصف درجن ممالک
میں اس تحریک کے حامیوں نے متحدہ محاذ بنالیا تو معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو؟"

(طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۸۳ء ص۔۳۰)

چنانچہ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ:

"نتیجہ ظاہر ہے ہزار برس کی خوابِ غفلت کے بعد مسلم اقوام نے ہلکی سی کروٹ لی تھی کہ
اقوامِ مغرب کو اس میں خدشہ محسوس ہوا انہوں نے ایسا تریاک (افیون) ایجاد کر دیا جس سے یہ
پہلے سے بھی زیادہ گہری نیند میں سو جائیں۔ جس قوم کی قیادت اس قسم کے علماء کے ہاتھ میں آجائے
اس کے انجام کے متعلق کسی منجم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔ اقبال نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ

؎ میں جانتا ہوں انجام اس کا جس معرکہ کے ملّا ہوں غازی

اقوامِ مغرب کی یہ تریاکی بھی ان کی نگہ فراست میں تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

؎ خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مسلم انسٹی ٹیوٹ (لندن) کے ڈائریکٹر، ڈاکٹر کلیم الدین نے جب کہا کہ اس قسم کی قیادت، علماء
ہی فراہم کرسکتے ہیں۔ تو اس پر حقانی صاحب نے ان سے کہا کہ " پاکستان میں تو آپ کے تصور
کے علماء نہ ہونے کے برابر ہیں۔" تو وہ کہنے لگے کہ " ہمیں انہیں پیدا کرنا چاہیئے۔ دینی مدارس میں
پڑھنے والے ایک لاکھ یا اس کے لگ بھگ دینی طلبہ میں سے دو سو انقلابی علماء تیار کرلینا مشکل نہیں"۔

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے تحریر کیا کہ " پاکستان میں اس کے آثار ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک میں پائے جاتے
ہیں۔ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، انہوں نے ایک دفعہ خود اپنے متعلق کہا تھا کہ وہ فنڈامینٹل اسٹ ہیں۔ ان کی
تحریک کے عناصرِ ترکیبی یہ ہیں:

(۱) قرآن کا نام بکثرت دہرایا جائے لیکن اسے دین میں آخری سند نہ تسلیم کیا جائے۔

(۲) دین میں سند اور حجت اسلاف کا مسلک قرار دیا جائے اور اس سے اعراض یا اختلاف کو الحاد اور ارتداد کا موجب گردانا جائے۔"

اس کے بعد طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ "ڈاکٹر اسرار صاحب نے اس کی بنیاد رکھ دی ہے اور ماہنامہ میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی فیلوشپ (رفاقت) سکیم کا اعلان شائع ہوا ہے۔ جس میں دو سالہ تدریسی نصاب کے لیے ایم اے ایم ایس سی۔ اور بی اے بی ایس سی نوجوانوں سے درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ انہیں مطلوبہ "عالم" بنایا جائے گا۔ اول الذکر طالب علموں کو ایک ہزار روپیہ ماہانہ اور مؤخر الذکر کو آٹھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ ملک کے ذہین تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اس سکیم میں کس قدر کشش پیدا کی جا رہی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس تحریک کے فروغ کے لیے روپیہ کس طرح سیلاب کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ جس درسگاہ کے طلباء کو ایک ایک ہزار روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اس کے مجموعی اخراجات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے رفقاء سمیت، قریب نصف سال بیرونی ممالک، بالخصوص امریکہ کینیڈا کے دوروں پر رہتے ہیں۔ ان کے اخراجات کا تو حساب شمار ہی نہیں ہو سکتا۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے تنظیمی پروگرام سے متعلق بھی واقفیت حاصل کر لی جائے جس کی تفصیل اُن کے اپنے شمارہ "میثاق" بابت جولائی ۱۹۸۴ء کے صفحہ ۳۶ پر دی گئی ہے اور جسے ادارۂ طلوعِ اسلام" نے اپنے ہاں ماہ ستمبر ۱۹۸۴ء میں مندرجہ ذیل عنوان سے بمعہ تبصرہ اس طرح شائع کیا ہے:

"تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا تنظیمی پروگرام

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ایلوپیتھک ڈاکٹر ہیں۔ ایک عرصہ تک ڈاکٹری کی پریکٹس کرتے رہے ہے۔ خاصا وقت جماعتِ اسلامی سے منسلک رہے۔ اسلامی جمعیت طلباء میں انہیں نمایاں پوزیشن حاصل تھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب کالعدم جماعتِ اسلامی کے بعض اراکین نے مودودی صاحب (مرحوم) سے علیحدگی اختیار کی تو ان میں ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ خاصا عرصہ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے خدام القرآن کے نام سے ایک انجمن کی بنا ڈالی جس کا مقصد قرآنی تعلیم کی نشر و اشاعت تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جماعتِ اسلامی کے نقشِ قدم پر تنظیمِ اسلامی کے نام سے اپنی الگ پارٹی قائم کی۔ وہ خود اس پارٹی کے امیر ہیں اور اس میں شامل ہونے والوں سے باقاعدہ بیعت لیتے ہیں۔ وہ آرمی ڈسپلن والی جماعت جو اپنے امیر کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو۔ (میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء صہ ۳۶) اس تنظیم کے مقاصد اور عزائم

کیا ہیں اسے انہوں نے پردۂ اخفاء میں نہیں رکھا۔ مثلاً سابقہ اپریل وہ بھارت کے دورے پر گئے تو حیدرآباد دکن میں ایک نشست منعقد ہوئی۔ اس کی روئداد (ان کے صاحبزادہ کے قلم سے) ان کے ماہنامہ میثاق کی جون ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں شائع ہوئی:

"کئی حضرات کی جانب سے سوالات ہوئے جن میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں آپ کا طریقۂ کار کیا ہوگا! جواباً ابا جان نے فرمایا کہ ایک مسلمان حکومت کے ہوتے ہوئے جو اگرچہ صرف نام کے اعتبار سے مسلمان ہے، اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایک ایسی تنظیم کا قیام ضروری ہے جس کے رفقاء ایک امیر کے ہاتھ پر سمع و طاعت اور جہاد فی سبیل اللہ کی بیعت کریں۔ ان کی بھرپور تربیت کی جائے اور جب ایک ایسی جمعیت فراہم ہو جائے کہ امیر کو ان کے بارے میں اعتماد ہو کہ وہ جان ہتھیلیوں پر رکھ کر آئے ہیں تو وہ اس نظام کے کسی منکر کے خلاف ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً جماعت کا امیر اگر فیصلہ کرے کہ ۱۴ اگست کو خواتین کی کھلے بندوں جو پریڈ ہوتی ہے اس کو نہیں ہونے دیں گے تو اب اس منکر کے خلاف ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوگی۔ اگر حکومت وقت اس پر رضامند ہو جائے کہ پریڈ نہیں ہوگی تو کسی اور منکر کے خلاف یہی طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا اور منکرات کو ختم کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس طرح بجائے اس کے کہ خود اقتدار کے طالب بن کر سامنے آئیں۔ اس حکومت کے ہاتھوں منکر کی تنکیر کرائی جائے اور معروف کو رائج کرایا جائے گا لیکن اگر حکومتِ وقت اس پر تیار نہ ہو تو ظاہر ہے اس منکر کے خلاف جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترنا ہوگا، گولیاں کھانی ہوں گی۔ ماریں سہنی ہوں گی۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی ہوں گی لیکن یہ منحصر ہے اس بات پر کہ امیر کو یقین اور اعتقاد ہو اپنے ساتھیوں کی تعداد پر بھی اور ان کی جانفروشی پر بھی۔ یہ ہے وہ طریق کار جس کے ذریعے کسی نام نہاد اسلامی حکومت میں حقیقی اسلامی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔"

(ص ۲۲)

اسی ماہنامہ کی جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں ان کے نائب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تنظیم کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"تیسری منزل پر چڑھنے کے لیے یعنی اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے یہ جہاد، قتال فی سبیل اللہ کی شکل (یعنی اللہ کے راستے میں جنگ) اختیار کرے گا۔ لہٰذا باطل قوتوں اور اللہ کے دین کے قیام میں رکاوٹ بننے والے افراد سے نپٹنے کے لیے سیف بدست میدان میں آنا پڑے گا...... آگ اور خون کی وادی سے گذر کر ہی یہ فریضہ ادا ہو پائے گا۔"

(میثاق بابت جولائی ۱۹۸۴ء ص ۵۵)

طلوعِ اسلام کا تبصرہ

اس کے بعد طلوعِ اسلام نے اپنے ہاں جو کچھ عرض کیا وہ یہ تھا کہ:

"آپ تصور میں لائیے اس فساد کو جس کی آماجگاہ یہ بدنصیب ملک اس وقت بنے گا جب ڈاکٹر صاحب[1] کی اسکیم عمل میں آئے گی۔ ڈاکٹر صاحب (بہ حیثیت امیر) جس عمل کو منکر قرار دیں گے اسے زبردستی روکنے کے لیے ان کی جماعت میدان میں آجائے گی۔ اگر حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے تو ہو المراد۔ ورنہ معاملہ عملی تصادم تک پہنچ جائے گا۔ اول تو ڈاکٹر صاحب کے "منکرات" کی فہرست محدود نہیں (وہ تو عید الفطر کی سویّوں اور کرکٹ کے کھیل تک کے بھی خلاف ہیں۔) ایک منکر کے ازالہ کے بعد دوسرا منکر سامنے آجائے گا اور اس طرح یہاں جنگ و فساد کا لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ پھر منکرات کے انسداد کے لیے نہ تو ڈاکٹر صاحب کو کوئی لائسنس حاصل ہے نہ ہی اس پر ان کی اجارہ داری ہے۔ جس کا جی چاہے اسی قسم کی جماعت تیار کرکے حکومت کے یا خود ڈاکٹر صاحب کے بالمقابل یہ کہتا ہوا کھڑا ہو جائے کہ جسے ڈاکٹر صاحب منکر قرار دے رہے ہیں وہ ہمارے عقیدے کے مطابق منکر نہیں، معروف ہے۔"

ڈاکٹر اسرار احمد کے بعد جہاں تک ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں پاکستان کا وہ کونسا کونہ اور کونسا گوشہ ایسا ہے۔ جہاں کے لوگ محترم ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے نام سے واقف نہ ہوں بلکہ موصوف تو اپنے حلقہ میں "عالم اسلام کی عظیم انقلابی شخصیت۔ مفکر اسلام داعئ انقلاب اور مجاہد حریت کے علاوہ نابغہ عصر جیسے روح پرور القابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔"

سو جناب ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے اپنے بیان کے مطابق "انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر ادارہ منہاج القرآن کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ آپ نے چار سو کنال کے وسیع رقبہ پر منہاج القرآن یونیورسٹی کمپلکس قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جس میں درس نظامی۔ حدیث اور پنجاب یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق ریگولر تعلیم دینے کا پروگرام بھی شامل ہے اور منہاج القرآن یونیورسٹی کے اس قیام کو پذیرائی بخشتے ہوئے روزنامہ

---

[1] ڈاکٹر اسرار صاحب اپنے جریدہ میثاق، مارچ ۱۹۷۶ء صفحہ ۸۹ پر مولانا مودودی صاحب مرحوم کے ساتھ باہمی تعلقات کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ میں اُن کی گود میں پلا ہوں اور میں نے اپنی شعوری آنکھ انہی کی گود میں کھولی ہے۔ میں نے انہی کی آنکھ سے دیکھنا اور انہی کے کانوں سے سننا سیکھا ہے۔ انہی کے دیئے ہوئے تصورِ فرائضِ دینی کو میں نے اختیار کیا ہے اور اسی پر آگے چل رہا ہوں۔" (بحوالہ ماہنامہ تعمیر انسانیت لاہور، ستمبر ۱۹۸۶ء)

نوائے وقت لاہور ۱۳ مارچ ۱۹۸۷ء کو اپنے اداریے میں لکھا کہ

"ہم منہاج القرآن یونیورسٹی کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ جن اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ادارہ قائم ہوا۔ اللہ ان مقاصد کو پورا کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔"

علاوہ ازیں روزنامہ جنگ لاہور نے ۱۲ مارچ ۱۹۸۷ء کو منہاج القرآن تحریک کے سلسلے میں ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جس میں اس تحریک کا مکمل پروگرام تحریر تھا جس کے تحت دنیا بھر کے بائیس ممالک میں اس تحریک کی شاخوں کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر وسیع تر انتظامات کرنے والے ادارے کی طرف سے اس قائم ہونے والی یونیورسٹی میں کس قسم کی دینی تعلیم دی جارہی ہے جس سے نوجوان نسل کے ذہنوں کو جلا ملے اور ان کے بال و پر کو قوت پرواز حاصل ہو۔ لہذا یہ جاننے کے لئے مجھے آپ کے ذوق سلیم سے معذرت کے ساتھ ڈاکٹر موصوف کی تحریر کے صرف دو اقتباس پیش کرنے ہوں گے۔

محترم ڈاکٹر صاحب اپنے رسالہ "منہاج القرآن اگست ۱۹۸۹ء کے صفحہ ۹ اور ۱۱ پر" اسوہ حسنہ کی چھبیسویں قسط" میں لکھتے ہیں۔

فضلات مبارکہ اور جسم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

انسان جن اشیاء کو استعمال کرتا ہے مثلاً گوشت، سبزی، پھل، کھانا، پانی وغیرہ تمام پاکیزہ اور خوشبودار ہوتی ہیں مگر جب ان اشیاء کو انسانی جسم کی صحبت میسر آتی ہے تو اس کی کثافت کی وجہ سے ان میں تعفن اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور اتنا فرق واقع ہو چکا ہوتا ہے کہ وہی اشیاء جو پہلے پسندیدہ اور مرغوب تھیں اب قابل نفرت و کراہت ہو چکی ہوتی ہیں اور تمام انسانی جسم سے ناپاک فضلہ کی صورت خارج ہوتی ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک جسم کو اتنا مقدس ومعطر، پاکیزہ، خوشبودار اور لطیف بنایا کہ اتنی لطافت ملائکہ کو بھی (جو نورانی مخلوق ہیں) میسر نہیں۔ چنانچہ یہی اشیاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم اقدس کی صحبت میں رہنے کے بعد بصورت فضلہ خارج ہوتیں تو بجائے بدبو پیدا ہونے کے ان میں پہلے سے بھی زیادہ مہک اور خوشبو پیدا ہو چکی ہوتی ایسی مہک جس کا مقابلہ کوئی دوسری خوشبو نہ کر پاتی۔ جس زمین کے ٹکڑے کو آپ بول و براز کے لئے منتخب فرماتے وہ اسے نگل لیتا اور وہاں سوائے خوشبو کے اور کچھ محسوس نہ ہوتا۔"

استنجے کے پتھر مسجد میں لانا

یہ سب کچھ کہنے کے بعد آپ اپنی اس تحریر کی روشنی میں لکھتے ہیں کہ

" حضرت ملا علی قاری اور امام زرقانیؒ ایک صحابیؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر کے موقع پر رسالتماب صلی اللہ علیہ وسلم بیت الخلاء رفع حاجت کے لئے تشریف لے گئے جب باہر تشریف لائے تو بعد میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ وہاں کوئی شے نہیں۔ ہاں میں نے وہاں تین ایسے پتھر پائے جن کو آپ نے استعمال فرمایا تھا میں نے ان کو اٹھایا تو ان سے کستوری کی طرح خوشبو آرہی تھی میں انہیں جمعہ کے دن مسجد میں اپنی جیب میں لے کر آتا ان کی خوشبو ان تمام خوشبوؤں اور عطروں پر غالب آتی جو دوسرے لوگ لگا کر آئے ہوتے ۔" (یاد رہے کہ حضرت مُلّا علی قاری جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایک مشہور محدث اور مفسر قرآن کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔)

قارئینِ گرامی! یہ سب کچھ اس ذات گرامی کے متعلق کیا جا رہا ہے جنہوں نے نوع انسانی کو طہارت پاکیزگی اور صفائی کا سبق دیا اور یہ ہیں وہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب جن کا تعارف گلی گلی کوچہ کوچہ چھوٹے چھوٹے اشتہارات کے ذریعے مختلف القابات کے حوالے سے کرایا جا رہا ہے اور جن کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنی تحریک کی دنیا کے بائیس ممالک میں شاخیں قائم کریں گے اور پھر ان کا دعویٰ یہ کہ

وہ مصطفوی انقلاب کی ٹھوکر سے موجودہ نظام پاش پاش کر دیں گے۔" نیز انہوں نے انتباع کیا کہ "ہم سوئے کربلا چلے ہیں جس کا دل چاہے معرکہ کربلا برپا کر دے"۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۸۹-۱۰-۱۷)

اور جہاں تک عورت کی سربراہی کا تعلق ہے ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ "عورت خواتین کی کسی تنظیم کی قیادت تو کر سکتی ہے مگر سربراہ مملکت نہیں بن سکتی" (روزنامہ جنگ لاہور ۸۷-۲-۲۶)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں اب یہ بات قارئین کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کی طرف سے قائم ہونے والی یونیورسٹی کو منہاج القرآن یونیورسٹی کے نام سے پکارے یا اسے یونیورسٹی آف دی فنڈامینٹل ازم کا نام دیں۔

لہ مفتی غلام سرور قادری نے پروفیسر طاہر القادری کے اس بیان پر منہاج القرآن آنائے مدار کا مہمان خانہ ہے اور یہ کہ اس مرکز میں آنے والے خدا اور رسول کے مہمان ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ پروفیسر طاہر القادری من گھڑت مکر اور مصنوعی خوابوں سے مذہب اور سیاست کی دکان چمکانے میں مصروف ہیں۔ اب نئی سیاسی جماعت کی آڑ میں وہ اہلسنت کو تقسیم در تقسیم کرنے کی سازش کر رہے ہیں انہوں نے کہا طاہر القادری جنرل ضیاء مرحوم اور میاں نواز شریف کے پروردہ ہیں اور اب پیپلز پارٹی کو چل دینے کیلئے اتفاق برادرز سے علیحدگی اختیار کی تاکہ میاں نواز شریف کی بخشی ہوئی دو سو کنال اراضی اور ٹی وی کے پروگراموں کو تحفظ حاصل ہو۔

قصہ آدمؑ کی پیدائش کا

تعلیم کے سلسلہ میں جو کچھ اس سے پیشتر تحریر کیا گیا ہے وہ کس حد تک اہم اور ضروری تھا، اس کا اندازہ قارئین خود لگا سکیں گے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک اور گوشہ ابھی باقی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اگر اسے سامنے نہ لایا گیا تو موضوعِ زیرِ نظر کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا اب جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے کیونکہ اس کو سمجھے بغیر قرآنی تعلیم کا ماحصل سمجھ میں نہیں آسکتی، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ عجمی اسلام نے اس مسئلہ کو جس قدر غلط رنگ میں پیش کیا ہے کسی اور کو پیش نہیں کیا۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس ایک سازش نے قرآن حکیم کی تقریباً تمام اصطلاحات کا مفہوم ہی یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔

راقم کی یہی وہ حساس خیالی تھی جس کے پیشِ نظر اس نے اپریل ۱۹۸۳ء میں ملکی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں اور اہم علمی شخصیات کو ۱۶ صفحات پر مشتمل ایک خط تحریر کیا جس میں ملتِ اسلامیہ کے ساتھ کی جانے والی اس گہری سازش کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ تعلیم کے اس باب میں اس خط کا ایک اقتباس (قرآنی آیات کی مزید وضاحت کے ساتھ) پیشِ خدمت کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اس خیال سے کہ شاید ہم ان قرآنی حقائق پر کسی پہلو سے غور و فکر کرتے ہوئے اپنی علتِ مرض کا کوئی علاج تجویز کر لیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۶ را پریل ۱۹۸۳ء

جنابِ محترم و قابلِ احترام . . . .

یوں تو علامہ اقبال کے الفاظ میں "ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ" لیکن میں سمجھتا ہوں مملکتِ پاکستان کے اندر تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں نئی نسل کی ذہنی آبیاری کے لیے آپ کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اور ابھرنے والی نسل کا زاویہ نظر بدلنے میں آپ ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں بلکہ نئی نسل کے معمار آپ ہیں جبکہ کوئی دوسرا شخص اپنی محدود علمی سطح اور محدود اختیارات اور وسائل کے باعث یہ فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔ میری یہی وہ حساس خیالی ہے جس کی بنا پر میں پہلی بار فقط ایک پاکستانی مسلمان ہونے کے ناطے سے آپ کی خدمت میں ایک طویل خط کے ساتھ حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ہمارے محترم جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن حکیم نے ایک جگہ عِوَجاً کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی ایسا ٹیڑھ پن پیدا کرنا جسے محسوس نظریں دیکھ نہ سکیں۔ لہٰذا مجھے جس سازش کے متعلق آپ سے عرض کرنا ہے اس کا تعلق اسی عِوَجاً کی اختیار کردہ ٹیکنیک سے ہے۔ جس نے ملّتِ اسلامیہ کی پوری کی پوری ہیئت کو بدل کر رکھ دیا ہے لیکن مادی نگاہوں کو اس زوالِ امّت کا ادراک تک بھی نہ ہونے دیا۔ میں سمجھتا ہوں یہ معاملہ آپ جیسی ہی شخصیات کی توجہ کا رہینِ منّت ہے۔ کیونکہ آپ جہاں موجودہ دَور کی علمی سطح سے بخوبی واقف ہیں وہاں بلند سطح پر ہونے کے علاوہ آپ کو معاشرتی طور پر ایک قوت بھی حاصل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ میری زیرِ نظر آہ و فغاں آپ کے قیمتی وقت کی قربانی چاہتی ہے۔ میری عرضداشت آپ کے نزدیک کس حد تک قابلِ قبول ہوتی ہے، اس کا اندازہ میں آپ کے جواب سے ہی لگا سکوں گا۔ مجھے امیدِ واثق ہے کہ آپ کی بلند نظری ملّتِ اسلامیہ کے نام پر مجھے مایوس نہیں کرے گی۔ میری یہ عرضداشت ذاتی نوعیت کی نہیں بلکہ قومِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تصوّر لیے ہوئے ہے لہٰذا مجھے عرض یہ کرنا ہے۔

آج کے دور میں اس بات کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہی کہ کائنات کی ہر شے نظریہ ارتقاء کی ہی رہینِ منّت ہے اور پھر یہ اپنے نقطۂ آغاز سے نقطۂ انتہا کی طرف جاری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تمام مراحل بڑے ہی طویل المیعاد وقفوں پر محیط ہوتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے آج سے چودہ سو سال پیشتر نہایت واضح اور بلیغ انداز میں بیان کر دیا جب کہ فرمایا:

" اس کے عالمِ مشیت میں ایک سکیم سامنے آتی ہے۔ وہ اس سکیم کا آغاز اس کے پست ترین نقطہ سے کرتا ہے اور پھر وہ (کائناتی عناصر کے باہمی تعاون سے نشو و نما پاتی ہوئی) ارتقائی منازل طے کرتی جاتی ہے۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ اس نقطۂ تکمیل کی طرف اٹھتی اور بڑھتی جاتی ہے جو اس نے اس کے لیے مقرر کیا تھا۔ ۳۵/۱۰

ان ارتقائی منازل کی مدت تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال ۲۲/۴۷ بلکہ بعض سکیموں کے سلسلہ میں پچاس پچاس ہزار سال کی ہوتی ہے۔ ۳۲/۵

اور دوسری جگہ فرمایا:

" ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے! جو ہر شے کی تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اسے گردش دے کر مختلف ارتقائی مراحل سے گزارتا ہوا اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ۲۷/۶۴ ۱۴/۸

یعنی، وہ اپنی ہر سکیم کو ارتقائی مدارج (کی سیڑھیوں) پر چڑھا کر تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ وہ اس کے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک نہیں لے جاتا بتدریج ایسا کرتا ہے۔ ۵/۳

اور پھر یہ کہ:

" وہ سلسلۂ کائنات کو ایک بار وجود میں لا کر معطل ہو کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ اس قانونِ مشیئت کے مطابق کائناتی تخلیق میں نت نئے اضافے کرتا رہتا ہے۔ ۳۵/۱ "

جہاں تک اس کائنات کے اندر کرۂ ارض کی تخلیق اور اس پر زندگی کی ابتداء کا تعلق ہے، تو قرآن حکیم نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ :

(" بعض لوگ بر بنائے جہالت مظاہرِ فطرت کو دیوی دیوتا سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ سلسلہ کائنات تمام کا تمام خدا کا پیدا کردہ ہے۔ اور اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ اس وقت تو انہیں کائنات میں مختلف مظاہر الگ الگ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن) انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ تخلیق کے ابتدائی ادوار میں یہ سب ایک ہی ہیولیٰ تھے پھر ہم نے انہیں الگ الگ کر دیا۔ مثلاً کرۂ ارض اس اوّلین ہیولیٰ سے یوں الگ ہوا جس طرح گوپھیے سے پتھر پھینکا جاتا ہے۔ ۷۹/۳۰ اور اس طرح تمام کرّے اپنے اپنے مدار میں تیرنے لگ گئے۔ ۲۱/۳۳ و ۳۶/۴۰

اور اس تخلیقی عمل کے کروڑہا سال بعد جب یہ زمین اس قابل ہو گئی کہ اس پر ہر قسم کی جاندار مخلوق رہ سکے تو پھر قرآنی الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے :

" اپنے اس قانون کے مطابق ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ پھر ان میں وہ بھی ہیں جو پیٹ کے بل رینگتے ہیں۔ بعض دریاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ تخلیق کے مطابق جو چاہتا ہے، پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس نے ہر شے کے لیے اندازے اور پیمانے مقرر کر رکھے ہیں اور ان سب پر اس کا کنٹرول ہے۔" ۲۴/۴۵

لہٰذا اس طرح انسانی زندگی اور دیگر جاندار مخلوق ایک ہی طریقِ کار کے مطابق وجود میں آئی۔ چنانچہ خالقِ کائنات اپنے اس محیر العقول سلسلہ پر غور و فکر کرنے کے لیے فرماتا ہے کہ :

" اس غلبہ اور حکمت کی نشانیاں صحنِ کائنات میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں لیکن یہ انہی کو نظر آسکتی ہیں جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان رکھیں۔ ۴۵/۳

ان تمام حقائق کے بعد اگر انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل کے متعلق معلوم کرنا مقصود ہو تو قرآن حکیم میں اس سلسلہ میں بھی بیسیوں آیات موجود ہیں مثلاً ارشاد فرمایا کہ :

" قانونِ خداوندی کی حیات بخشیوں کا اندازہ لگانا ہو تو تم خود اپنی پیدائش پر غور کرو۔ (مٹی) میں زندگی کے کوئی آثار نہیں ہوتے۔ خدا نے اس مٹی ہی سے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی اور پھر اسے مختلف گردشیں دیتا ہوا اس مقام تک لے آیا جہاں تم پیکرِ بشریت اختیار کر کے ساری

دنیا میں پھیل گئے۔ ۳۰/۲۰

اور دوسری جگہ فرمایا کہ:

("اس خدا کے نظامِ ربوبیت کی زندہ شہادت تو خود تمہارا اپنا وجود ہے) اس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی پھر زندگی کو مختلف مراحل سے گذارتے ہوئے اُسے اس منزل میں لے آیا جہاں پیدائش نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ۴۰/۶۷

پھر فرمایا:

" تاریکی اور روشنی تو پھر بھی کرّوں کی گردش کا نتیجہ ہے۔ خدا تو وہ ہے جس نے تمہاری تخلیق کی ابتدا بے جان مادہ سے کی۔" ۶/۲ ۲۳/۱۲

اور اس حقیقت کو اس طرح بھی بیان کیا کہ:

" یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتدا سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے۔" (یعنی وہ مٹی جس سے زندگی کا اوّلین جرثومہ وجود میں آیا) اس کی تخلیق کی ابتدا نفس واحدہ سے ہوئی۔ اور بعد میں یہ جرثومہ جوشِ نمو سے دو حصوں میں بٹ گیا۔ سورۃ نساء میں اس کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ:

" اے نوعِ انسانی اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون کی نگہداشت کرو جس نے تمہاری پیدائش کی ابتداء ایک جرثومۂ زندگی سے کی۔ ۶/۹۹ ۳۹/۶ ازاں بعد یہ جرثومہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس سے نر و مادہ کی تقسیم وجود میں آئی اور یوں نر و مادہ کے اختلاط سے اس نے کرۂ ارض پر کثیر آبادی پھیلادی جو مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے۔ ۴/۱ ، ۷۱/۱۴

اس کی مزید وضاحت ۲۳/۱۳ کے حوالے سے اس طرح کی گئی کہ:

(پھر ہمارا تخلیقی پروگرام اس کڑی تک جا پہنچا جہاں افزائشِ نسل بذریعہ تولید ہوتی ہے) اس طرح ہم نے اسے نطفہ بنایا جو (رحم کے اندر) ٹھہر گیا اور مادہ کے بیضہ میں قرار گیر ہو گیا"

اور اس کے بعد ۱۳/۴ میں واضح تر انداز میں فرمایا:

" خدا نے تمہاری تخلیق نباتات کی طرح کی ہے .... (کہ زمین سے ایک تنا اوپر کو اُبھرتا ہے لیکن آگے جا کر اس کی بے شمار شاخیں اِدھر اُدھر پھیل جاتی ہیں۔ اس کے باوجود اِن کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ زمین سے جو خوراک حاصل کرتی ہے اسے اپنے لیے سمیٹ کر نہیں رکھ لیتی وہ اسے پتی پتی تک بقدرِ ضرورت پہنچاتی ہے۔ اگر پتیاں ہَوا سے نمی اور حرارت جذب

کرتی ہیں تو وہ انہیں درخت کی رگ رگ تک پہنچاتی ہیں۔ یوں پورے کا پورا درخت سرسبز و شاداب رہتا ہے۔ پوری نوعِ انسانی کی تخلیق بھی ایک شجر کی طرح ہوتی ہے۔ اس کی سرسبزی و سربلندی کا راز باہمی ربط و ضبط اور اشتراک و تعاون میں ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔)

پھر ۴/۹۹ میں فرمایا:

" وہی ہے جس نے تمہیں نفسِ واحدہ سے نشو و نما دی۔ پھر تمہارے لیے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقت معین کے لیے ایک منزل میں ٹھہرو اور پھر وہ منزل تمہیں دوسری منزل کے سپرد کر دے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے قوانینِ حیات کو سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ ۴/۹۹

اور آخر پر ایک دو اقتباس اور، وہ یہ کہ:

" یہ واقعہ ہے کہ انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اسے نطفہ بنایا ایک ٹھہر جانے اور دبا پانے کی جگہ پھر نطفہ کو ہم نے علقہ بنایا۔ پھر علقہ کو ایک گوشت کا ٹکڑا کر دیا پھر اس کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنایا پھر ڈھانچہ پر گوشت کی تہہ چڑھا دی۔ یہاں تک کے مراحل حیوانی زندگی کے قانونِ طبعی کے مطابق طے ہوتے ہیں اس کے بعد ہم نے اس میں اپنی توانائی کا شمّہ ڈال کر (اختیار و ارادہ کی قوت) ۳۲/۹، ۷ اسے ایک بالکل نئی مخلوق کی شکل میں نمودار کر دیتے ہیں ۱۴/۱۷

یہ جدید قسم کی مخلوق جو حیوانات سے یکسر مختلف ہے انسان ہے۔

جنابِ محترم ان حقائق کی روشنی میں کیا یہ سمجھنے میں کوئی الجھن کوئی ابہام باقی رہ جاتا ہے۔ کہ نوعِ انسانی کی پیدائش کس طرح ہوئی اور یہ خاک کا ذرہ پیکرِ انسانی میں کس طرح متشکل ہوا۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کی روشنی میں علامہ پرویز صاحب مرحوم بانیٔ تحریکِ طلوعِ اسلام نے لکھا تھا:

" واضح رہے کہ قرآنِ حکیم میں بیان کردہ قصۂ آدمؑ کسی ایک فرد کا یا ایک جوڑے کی داستان نہیں بلکہ آدم سے مراد آدمی ہے اور وہ انسان کی سرگزشت کا تمثیلی بیان ہے۔ قرآن کریم میں اس قصہ سے ہٹ کر صرف ایک مقام پر آدم کا لفظ آیا ہے جہاں کہا:

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۳/۳۳

اس آیت سے اگر آدم مراد کوئی خاص فرد ہے اور وہ نبی تھے وہ یقیناً (انسانی پیدائش کے سلسلہ میں) وہ آدم نہیں ہو سکتے جن کا تمثیلی ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اس لیے کہ کسی نبی کی شان سے یہ بعید ہے

کہ خدا اُسے خاص طور پر تاکیداً ایک کام سے منع کرے اور وہ اس کے علی الرغم اس کی خلاف ورزی کرے اور یہ جُرم ایسا ہو جس کی پاداش میں اسے جنّت سے نکال دیا جائے۔ کوئی نبی ایسا نہیں کرسکتا۔" (بحوالہ "عالم گیر افسانے" صفحہ ۱۱)

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "ابلیس و آدم" شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام)

لہٰذا قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق نسلِ انسانی ہی وہ آدم ہے جسے بار بار کہا گیا کہ دیکھو اگر تم نے مشاجرت کی شکل اختیار کرتے ہوئے جمعیتِ آدم کی بجائے جمعیت اقوام کی روش پر اپنے اپنے سرکش جذبات (شیطان) کی حکمرانی قبول کرلی تو یاد رکھو یہ تمام کائناتی قوتیں (ملائکہ) جو تمہارے تابع تسخیر (سجدہ ریز) کردی گئی ہیں تمہارے ہی خلاف اُٹھ کھڑی ہوں گی اور تم وحی کی راہنمائی کے بغیر تنہا عقلِ انسانی کے بَل بوتے پر خوف و حزن سے پاک معاشرہ کو تشکیل نہ دے سکو گے۔ اور پھر وہ جنّت جو قوانین خداوندی کی اتباع کا لازمی نتیجہ ہے تم سے چھن جائے گی اور پھر اس کے بعد نتیجہ یہ ہوگا کہ مایوسی (ابلیسیت) تمہارا مقدر بن جائے گی۔ سچ کہا تھا علامہ اقبال نے ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں

راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

یہی وہ مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی تھی جس سے اجتناب کرنے کے لیے "حضرت آدم" کو پہلے روز ہی یہ کہہ کر منع کیا گیا تھا کہ کچھ بھی ہو اس شجر کے نزدیک مت جانا۔ اور جناب پرویز صاحب مرحوم اپنی تصنیف کردہ قرآنی تفسیر مطالب الفرقان میں اِس شجرِ ممنوعہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

شجر سے کیا مراد تھا

"سوال یہ ہے کہ یہ "شجر" کونسا تھا جس کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا؟ اس کی تفسیر میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ بائبل میں تو اسے "علم کا درخت" (TREE OF KNOWLEDGE) بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو بالبداہت غلط ہے۔ قرآن کریم نے تو آدم کی پہلی خصوصیت ہی یہ بتائی ہے کہ اُسے خدا نے تحصیلِ علم کی صلاحیت عطا فرمائی ($\frac{۲}{۳۱}$) اور یہی علم تھا جس کی بنا پر اُسے ملائکہ پر فضیلت حاصل ہوئی۔ قرآن کریم میں علم کی اس قدر فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اس کی روشنی میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ خدا نے آدم کو علم کے قریب جانے سے منع کردیا تھا۔

بائبل میں یہ بھی ہے کہ وہ درخت "خیر و شر کی تمیز" کا تھا۔ یہ بھی غلط ہے۔ اگر آدم کو خیر و شر میں تمیز کرنے سے روکا گیا تھا تو یہ مقامِ آدم کیا حیوانات سے بھی پست سطح زندگی ہوئی۔ قرآن کریم کی رُو

ے تو قصۂ ابلیس و آدم سے بنیادی طور پر مقصود ہی خیر و شر کی تمیز ہے۔

یہ بائبل میں تھا اور ہمارے ہاں یہ کہہ کر قصہ ہی ختم کر دیا گیا کہ یہ گیہوں کا درخت تھا۔[1] یہ مفہوم ایسا سطحی ہے کہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

عربی زبان میں ہر وہ چیز، جو مجتمع ہو کر، کسی وجہ سے متفرق ہو جائے "شَجَر" کہلاتی ہے۔ درخت کو بھی شجر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی جڑ اور تنے کی حد تک مجتمع ہوتا ہے اور اس کے بعد مختلف شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ اسی لیے شَجَرَ بَیْنَہُمْ کے معنی ہیں باہمی اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنا، تفرقہ پیدا کر لینا۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۴/۶۵)

"اے رسولؐ! تیرا خدا اس حقیقت پر شاہد ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن قرار نہیں پا سکتے تاوقتیکہ یہ اپنے ان معاملات میں، جن میں یہ باہمی اختلاف کرتے ہوں، تجھے اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں۔ اور پھر اس کے بعد ان کی کیفیت یہ ہو کہ تیرے فیصلے سے سرتابی تو ایک طرف، یہ اس سے اپنے دل میں بھی کسی قسم کی گرانی محسوس نہ کریں۔ ان کا مسلک یہ ہو کہ تیرے فیصلے کے سامنے، اپنا سر ہی نہیں، دل بھی جھکا دیں۔" اس آیت میں "شَجَرَ بَیْنَہُمْ" کا مفہوم واضح ہے۔ مشاجرت کہتے ہی باہمی منازعت اور مخاصمت کو ہیں۔

شَجَر کا جو مفہوم اوپر بیان کیا گیا، اسے ایک بار پھر سامنے لائیے۔ یعنی کسی شے کا پہلے مجتمع ہونا اور پھر پھٹ کر الگ الگ ہو جانا۔ باہمی تفرقہ پیدا کر لینا۔ قرآن کریم میں نوعِ انسان کی ابتدائی زندگی اور اس کے بعد اس مشاجرت کے متعلق سورہ یونس میں کہا ہے وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (۱۰/۱۹) "شروع میں تمام نوعِ انسان، اُمت واحدہ تھی یعنی ایک عالمگیر برادری۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے باہمی اختلاف کیا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔" اور دوسری جگہ کہا ہے کہ ان کے اختلافات کو رفع کر کے انہیں پھر سے اُمت واحدہ بنا دینے کے لیے خدا نے آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت شروع کیا (۲/۲۱۳)۔ اس سے اس مشاجرت کا نقشہ سامنے آ گیا جس سے آدم کو منع کیا گیا تھا۔ اس سے یہ کہا گیا تھا کہ تم ایک عالمگیر برادری بن کر رہنا۔ ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جانا۔ اگر تم نے ایسی روش اختیار کر لی تو یاد رکھو! اس حلقی زندگی کا سارا نقشہ بگڑ جائے گا۔ کوئی شے اپنے مقام پر نہیں رہے گی (ظلم کے بنیادی معنی یہی ہیں)۔ تمہاری معیشت تنگ

---

[1] ان حضرات کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ گیہوں کا درخت نہیں ہوتا، پودا ہوتا ہے۔

ہوجائے گی- افلاس اور بھوک عام ہوجائے گی۔ تم طبقات میں بٹ جاؤ گے اور تم میں جنگ و جدال شروع ہوجائیں گے، اور ملائکہ نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ یہ نئی مخلوق فساد انگیزیاں اور خونریزیاں شروع کردے گی —— ، وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے گا- یاد رکھو! ابلیس کی پوری پوری کوشش یہ ہوگی کہ تم میں باہمی اختلاف پیدا ہوجائے - تم خاندانوں، قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں بٹ جاؤ اور پھر ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہوجائے - دیکھنا ایسا نہ کرنا، ورنہ یہ جنت چھن جائے گی اور دنیا جہنم بن جائے گی۔

غور کیجئے - قرآن کریم نے ابلیسی سازش کی تمام تفاصیل کو کس طرح ایک لفظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے - "مشاجرت" یعنی نوعِ انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ اسی بنا پر اقبال نے (جاوید نامہ میں) ابلیس کو "خواجۂ اہلِ فراق" کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ "تفرقہ ڈالنے والوں کا سرخیل -"

ان تصریحات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو انسان سے کہا یہ گیا ہے کہ :

اے آدم (اے نوعِ انسانی) اگر تو چاہتا ہے کہ تمہیں ایک بار پھر فردوسِ گم گشتہ میں داخل کر دیا جائے اور کائناتی قوتیں (ملائکہ) تمہارا ساتھ دینا شروع کر دیں تو تجھ پر لازم ہے کہ تو اس شجرِ ممنوعہ کے پاس تک نہ پھٹکے - اپنے سرکش جذبات سے ہٹ کر (شیطان کی اتباع کیے بغیر) قندیلِ آسمانی کی روشنی میں اپنے سفر کا آغاز کرے - کیونکہ اس نورِ آفتاب کو تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رکھنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ جنت سے نکلا ہوا یہ آدم جس وقت بھی چاہے اس سے راہنمائی کا سہارا حاصل کر سکے گا۔ یہی وہ طریق ہے جس کے اپنانے پر یہ آدمِ خاکی ہر دو جنتوں کا وارث قرار پا سکتا ہے۔

آج اہلِ یورپ نے کائناتی قوتوں (ملائکہ) کو سرِ تسلیم خم کرانے کے ساتھ ساتھ اگر اپنے سرکش جذبات کو بھی "مسلمان" کر لیا ہوتا تو اس کرۂ ارض کی قسمت بدل چکی ہوتی - نبی اکرم ﷺ نے اس نکتہ کو کس قدر دلکش انداز میں بیان فرمایا کہ جب آپ سے پوچھا گیا کہ اے نبی ﷺ کیا آپ کا بھی کوئی شیطان ہے تو فرمایا! "ہاں ہے لیکن مَیں نے تو اسے مسلمان کر لیا ہے۔" ؎

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا   یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

پس آج نوعِ انسانی کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شیطان (جذبات) کو جس نے قیامت تک اس کے ساتھ رہنا ہے، کب مسلمان کرتی ہے ورنہ اس وقت تک یہ آدم جو صدیوں سے خون کی ندیاں یوں پھلانگتا آگ کے دریا عبور کرتا اور تقاضوں کے تھپیڑے کھاتا چلا آرہا ہے نہ معلوم مزید کہاں تک اور کتنی دیر اور کھاتا چلا جائے گا-

قصۂ آدم اقبال کی نظر میں

قبل اس کے کہ ہم اس خط کے باقی ماندہ حصّہ کو تحریر کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے خطباتِ اقبال (جن کا اُردو ترجمہ "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام پر جناب سید نذیر نیازی کی طرف سے شائع ہوا) میں قصّہ "آدم پر جو گفتگو کی ہے اس کے دو ایک اقتباسات قارئین کو پیش کر دیئے جائیں کیونکہ ہمیں اُمید ہے کہ ان اقتباسات کے پیش کرنے سے انسانی پیدائش اور ہبوطِ آدم کے متعلق صدیوں سے جو غیر قرآنی تصور ہمارے ذہنوں میں جاگزیں ہو چکا ہے اور جس کے تباہ کن نتائج سے قرآن کی منطقی اور اعلیٰ تعلیم نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک بار پھر واضح انداز سے سامنے آسکے گی اور اس طرح نسل انسانی ان نعمائے خداوندی سے بہرہ ور ہو سکے گی جو اللہ تعالےٰ نے پوری عالمگیر انسانیت کے لئے تخلیق کر رکھی ہیں۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں درج کرتے ہیں

"قرآن میں جب کوئی قِصّہ بیان کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود بالعموم یہ نہیں ہوتا کہ کسی تاریخی واقعے کا ذکر کیا جائے اس سے عام طور پر کوئی عالمگیر اخلاقی سبق دینا یا کوئی عالمگیر فلسفیانہ حقیقت اجاگر کی جاتی ہے لہٰذا قرآن پاک نہ تو افراد کے ناموں کا ذکر کرتا ہے نہ مقامات کا۔ ناموں کے استعمال سے قِصّے عموماً تاریخی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے معنی بھی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآنِ پاک ان جزئیات کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے جن کا تعلق جذبات و احساسات کے کسی مخصوص عالم سے ہو"

اس تمہید کے بعد علامہ اقبال، کرہ ارض پر انسان کی آفرینش کے متعلق رقم طراز ہیں کہ

"انسان کی آفرینش کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے قرآن پاک نے اس کے لئے بشر اور انسان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آدم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ لفظ آدم سے مقصود تو صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ انسان کے اندر نیابت الٰہیہ کی صلاحیت موجود ہے لہٰذا قرآن پاک نے وہ سب اسمائے معرفہ حذف کر دیئے جو عہد نامہ عتیق کی اس روایت میں مذکور ہیں۔ آدم، حوا تاکہ اس کی نگاہیں جس حقیقت پر ہیں اس کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے۔

لفظ آدم کی وضاحت

وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط ۷/۱۱

ترجمہ: اور ہم نے تم کو پیدا کیا۔ پھر تمہاری صورت شکل بنائی پھر ملائکہ کو حکم دیا کہ اس آدم کے لئے سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہیں۔

قرآن حکیم نے یہاں یہ نہیں کہا کہ ہم نے آدم کو پیدا کیا بلکہ "تم" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "کُمْ" کی شکل میں ضمیر مخاطب بھی ہے اور جمع کا صیغہ بھی اور قرآن کی مخاطب تو پوری نوع انسانی ہے۔ سو "آدم" سے مراد کوئی (مخصوص) انسان نہیں بلکہ آدمی ہے۔

لفظ آدم کی اس وضاحت کے بعد، جہاں تک ہبوطِ آدم کا تعلق ہے، اس کی وضاحت کے لئے علامہ اقبال اس جنت کی حقیقت کی طرف آتے ہیں جس جنت سے نسل انسانی (آدمیت) محروم ہو گئی۔ لکھتے ہیں۔

"پھر اس امر کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ لفظ جنت (باغ) کا اشارہ یہاں اس فوق الحواس بہشت کی طرف ہے جس سے کہا جاتا ہے کہ انسان زمین پر آ گرا تھا۔ قرآن پاک نے کہیں یہ نہیں کہا کہ انسان کی حیثیت اس (زمین) میں اجنبی کی ہے۔ جب ارشاد ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ ۷۱/۱۷

ترجمہ: اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے [1]

لہٰذا یہ جنت جس کا اس قصے میں ذکر آیا ہے نیکوکاروں کا وہ مسکن نہیں جہاں وہ ہمیشہ رہتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ ان معنوں میں جہاں کہیں جنت کا ذکر آیا ہے اس کی تعریف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کی ہے۔

یَتَنَازَعُوْنَ فِیْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ ۵۲/۲۳

ترجمہ: وہاں (جنت میں) لوگ ایک دوسرے سے جام حاصل کریں گے جس کے پینے سے نہ لغویات ہوں گی نہ گناہ سرزد ہو گا ۵۲/۲۳

---

[1] (غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قرآن حکیم نے یہاں بھی "کم" کی ضمیر استعمال کر کے براہ راست نسل انسانی کو مخاطب کیا ہے اور اس طرح بتایا گیا ہے کہ انسان کا رشتہ روز اوّل سے اسی کرۂ ارض سے ہے)۔ (راقم)

نیز ان الفاظ میں بھی:

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ہ

ترجمہ: (ان کو) نہ وہاں کوئی تکلیف پہنچے گی نہ وہاں سے نکالے جائیں گے $\frac{۱۵}{۴۸}$

لیکن وہ جنت جس کا ذکر اس قصے میں آیا ہے اس میں تو انسان نے سب سے پہلے گناہ ہی کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔ دراصل قرآن مجید جہاں کہیں کوئی لفظ استعمال کرتا ہے وہیں اس کے معنی بھی بیان کر دیتا ہے چنانچہ آگے چل کر اس قصے کی دوسری حکایت میں اسی باغ (جنت) کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔"

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ہ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى

ترجمہ: یہاں تم کو یہ (آسائش) ہوگی کہ نہ بھوکے رہو گے نہ ننگے۔ نہ پیاسے اور نہ دھوپ لگے گی" $\frac{۲۰}{۱۱۸-۱۱۹}$

چنانچہ علامہ اقبال تحریر کرتے ہیں۔

"اس لئے میں سمجھتا ہوں قرآن پاک کی اس آیت میں لفظ جنت کا اشارہ حیاتِ انسانی کے اس ابتدائی دور کی طرف ہے جس میں انسان کا اپنے ماحول سے ابھی عملاً کوئی رشتہ قائم نہیں ہوا تھا اور جس میں وہ اس تکلیف دہ احساس سے بے خبر تھا کہ جو اپنی ضروریات میں محتاجی کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے"

علامہ اقبال اس کے بعد مزید لکھتے ہیں "لہذا قرآن مجید نے ہبوطِ آدم کا ذکر کیا تو یہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہ کرۂ ارض میں انسان کا ظہور کس طرح ہوا اس کے پیش نظر حیات انسانی کا وہ ابتدائی دور ہے جب اس پر جبلی خواہشات کا غلبہ تھا اور جس سے گزر کر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ وہ اپنی ذات میں آزاد اور اس لئے شک اور نافرمانی دونوں کا اہل ہے۔ مختصر یہ کہ ہبوطِ آدم کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں بلکہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف اور سادہ حالت میں شعورِ ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا"

یہ ہے وہ اقتباس جو علامہ اقبال کی معرکۃ الاراء انگریزی کتاب سے لیا گیا ہے جس کی اہمیت کے متعلق جناب محمد یوسف گورایہ صاحب اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے اجتہاد

افکار اور نظریات انتہائی منظم، مربوط اور منضبط صورت میں اس کتاب میں پیش کئے ہیں۔ یہ انگریزی نثر کی کتاب ہے اور نثر میں جو افکار اور تصورات پیش کئے جاتے ہیں وہ ٹھنڈے دل و دماغ گہرے شعور، منظم فکر مربوط خیالات اور منضبط نظریات پر مشتمل ہوتے ہیں وہ نظم کی طرح گرد و پیش کے فوری واقعات سے متاثر

ہو کر نہیں لکھے جاتے اور نہ وہ ماحول کے جذباتی ترجمان ہوتے ہیں بلکہ دینی اور جدید علوم کے عمیق مطالعے، پختہ فکر، تاریخی شعور، سائنسی تجزیئے معروضی مشاہدات ذاتی رجحانات اور ملی تقاضوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ جو متعین مقاصد اور دور رس نتائج کے اثرات کے حصول کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس جگہ یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کی نثر اور نظم میں اگر اختلاف ہو تو نثر کو نظم پر ترجیح حاصل ہوگی کیونکہ نظم میں وقتی حالات اور ہنگامی واقعات کی فوری اور جذباتی ترجمانی ہو سکتی ہے مگر نثر بالعموم مستقل اور دائمی افکار و نظریات کی ترجمان ہوتی ہے۔ (بحوالہ مضمون پاکستان۔ اقبال اور اجتہاد) روزنامہ جنگ ۱۹۸۰ء

کاش کہ ہم نے علامہ اقبالؒ کی اس قرآن فہمی کو عام فہم انداز سے پیش کرنے کا کوئی انتظام کیا ہوتا تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوتی جب کہ بقول محمد یوسف گورایہ صاحب کے حالت یہ ہے کہ

"اگرچہ انگریزی زبان میں علامہ کے اجتہادات کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے مگر ایک تو ترجمہ عام فہم نہیں بلکہ بہت مشکل اور مغلق ہے دوسرے وہ عام طور پر دستیاب بھی نہیں۔ علامہ اقبال کے نام پر اب تک کروڑوں روپے کا بجٹ خرچ ہو چکا ہے مگر کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے کو ان کے انگریزی خطبات کا عام فہم اردو ترجمہ شائع کرنے کی توفیق حاصل نہیں ہوئی۔ علامہ کے اجتہادات ان کے خطوط اور مکاتیب میں بھی موجود ہیں جو انہوں نے اپنے معصروں کے نام وقتاً فوقتاً تحریر کئے یہ بھی انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ہیں۔ ان کی نوعیت تاریخی علمی اور تحقیقی ہے جو خاص علمی اسلوب اور ادبی انداز میں لکھے گئے ہیں اور بعد میں مرتب ہوئے ہیں۔ ان کی تدوین اور ترتیب موضوع اور مضمون کے مطابق ابھی تک نہیں کی گئی۔"

قصہ آدم کی رنگینی کو قرآن حکیم نے جس محاکاتی انداز میں پیش کیا اور اس کے بعد ہمارے اکابرین نے اس کی حقیقت کو جس انداز سے سمجھا اس کی مختصر سی تفصیل تو پیش کی جا چکی ہے لیکن مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ ایسے موقعے پر علامہ عنایت اللہ مشرقی جیسی عظیم شخصیت کے خیالات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ چنانچہ علامہ نے جو کچھ کہا ان کی تحریر کے چند اقتباسات اس خیال سے پیش کئے جا رہے ہیں کہ یہ قارئین کے لئے سود مند ہوں گے۔

قصہ آدم علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کی نظر میں

علامہ صاحب فرماتے ہیں۔

" قرنِ اوّل کی نبویؐ تعلیم کا ماحول چونکہ موجود نہیں رہا۔ دین اسلام کا مفہوم بگڑ چکا ہے۔ اس لئے اب عام مسلمان قرآن حکیم کے مطالعے سے اپنے لئے کوئی مستقل شے اخذ نہیں کرتا اور جو پڑھتا ہے اس کو روایتی عزت اور عقیدت سے دیکھ کر اپنا مطالعہ ختم کر دیتا ہے اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان قرآن حکیم کو پھر علمی بلکہ عملی نقطہ نظر سے دیکھے، اس کے بے پناہ طور پر حیران کن صداقتوں کو پیش نظر رکھ کر میدانِ عمل میں گامزن ہو اور ایک دفعہ پھر دنیا میں امتیازی مقام حاصل کرے"

مقام انسان اور کائنات کی ماہیت

کیونکہ قصہ آدم کی اصلیت کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ پہلے کائنات کی ماہیت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے لہٰذا علامہ مشرقی سب سے پہلے اس مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

کائنات کی ماہیت کو سمجھنے کے لئے پہلی شے جو جاننے کے لائق ہے یہ ہے کہ انسان کا اس کائنات میں مقام کیا ہے۔ اس مسئلے کے سلسلے میں انسان ہزارہا سال تک صحیفۂ فطرت کی مختلف اشیاء سے مرعوب ہو کر ان کے سامنے سجدہ کرتا رہا۔ انبیاء نے انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں خدا کے وجود کا احساس دلایا مگر انسان کے سمع و بصر اور ذہن کے ابتدائی حالت میں ہونے کی وجہ سے تخیل اکثر نقش بر آب رہا۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اُمتیں خدا کے وجود سے کافی طور پر آشنا رہیں اور مقدم الذکر نبی نے تورات میں انسان کو خدا کا مماثل بھی کہا مگر یہ امتیں بھی بہت جلد وہم و جہالت میں پھنس گئیں اور انسان کا اس کائنات میں صحیح مقام واضح نہ ہو سکا۔ قرآن حکیم نے تمثیلی طرز کلام میں انسان کا اس دنیا میں مقام سب سے پہلے حسبِ ذیل بلیغ اور معنی خیز الفاظ میں واشگاف کیا "جب خدا نے فرشتوں کو کہا کہ میں زمین میں اپنا قائم مقام مقرر کرنے والا ہوں انہوں نے کہا کہ کیا تو ایسی نسل کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس دُنیا میں فساد مچائے گی اور خون کرائے گی۔ حالانکہ ہم تیرے پورے فرمانبردار ہیں۔ خدا نے کہا کہ تم نہیں جانتے (کہ انسان اس کے لئے زیادہ موزوں ہے) اور میں جانتا ہوں" اس وضاحت کے بعد علامہ فرماتے کہ

" خدا ویسے تو سوائے اپنے کسی کو سجدے کی اجازت نہیں دیتا (یعنی حکم نہیں دیتا) یہاں کیوں دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ذی روح انسان والا سجدہ نہیں تھا بلکہ مراد یہ تھی کہ یہ غیر ذی حس فرشتے انسان کے تابع ہو کر رہیں گے گویا وہ" خدا کی بے پناہ قوتیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے ایسی نہیں کہ انسان ان کو تابع اور فرمانبردار نہ کر سکے۔ یہاں واضح کر دیا ہے کہ سب فرشتے" سجدہ کر سکتے ہیں بلکہ انہوں نے سجدہ کیا۔ صرف

ایک فرشتہ" اکڑا یعنی شیطانی طاقت جو انسان کو ہر لحظہ راہ راست سے بھٹکاتی رہتی ہے۔ اس طاقت نے کہا کہ میں ہرگز ہرگز اس انسان کے تابع بن کر نہ رہوں گا۔"

آدم کا لفظ نسل انسانی کے لئے استعمال ہوا ہے

خدا کے سامنے ابلیس کی اس گفتگو اور لب ولہجہ کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں علامہ مشرقی رقمطراز ہیں کہ:۔

اس آیت سے صاف یقین ہو جاتا ہے کہ آدم کا لفظ نسل انسانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور مُلّائی تخیّل کہ یہ سوال جواب حضرتِ آدم علیہ السلام سے ہوئے غلط ہے۔ اس کی واضح دلیل اس آیت کے لفظ ثُمَّ سے ظاہر ہے (یعنی پہلے انسان کو پیدا کیا" پھر موجودہ صورت بنائی" پھر جب وہ نسل روئے زمین پر پھیل گئی تو فرشتوں کو کہا کہ اس انسان کے آگے سجدہ کرو۔ اس سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ موجودہ انسان کے آباؤ اجداد کی صورتیں اور تھیں اور موجودہ صورت اور ہے یہ تحقیق طبقات الارض کے عالموں نے بڑے زور شور سے کی ہے اور حیرت انگیز طور پر صحیح ہے اس کی تائید قرآن حکیم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے بلکہ اس کے بعد ایک اور آیت سے بھی روشن طور پر ثابت ہے کہ انسان آئندہ بھی اس سے بلند تر مخلوق ضرور بنتا چلا جائے گا $\frac{۱۷}{۱۴-۱۳}$ میں ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلّٰهِ وَقَارًا وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ سے عزت کی اُمید نہیں رکھتے حالانکہ اس نے تم کو کئی پیدائش کے مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا۔

$\frac{۸۴}{۱۹}$ میں ہے۔ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ $\frac{۸۴}{۱۹}$ ؟

تم ضرور ایک طبقے سے دوسرے طبقے تک چڑھتے جاؤ گے۔

تحریر از علامہ مشرقی۔ مرسلہ شیخ محمد یعقوب لاہور

قرآن حکیم کو سمجھنے کا قرآنی طریق

ہمارے ہاں قرآن حکیم کو سمجھنے میں اکثر مشکلات درپیش ہیں تو ان کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں کہ قرآن حکیم میں تضاد یا کوئی نقص موجود ہے جس کی وجہ سے اسے سمجھنے میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں بلکہ اس کے برعکس اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہم نکتہ قرآنی کو اس طریق سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس طریق کی نشاندہی خود خدا نے کر رکھی ہے مثلاً قصہ آدم کو لیجیے اور اس کے متعلق مختلف روایات کو ذہن میں رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سطور کا مطالعہ کیجیے۔

ڈاکٹر سید عبدالودود اور قصہ آدم

پاکستان میں ڈاکٹر سید عبدالودود جیسی نامور شخصیت سے کون واقف نہیں آپ کو قرآنی تعلیم اور سائنسی حقائق پر قابلِ فخر حد تک عبور حاصل ہے چنانچہ موصوف نے اپنی کتاب "مظاہر فطرت اور قرآن" میں تخلیقِ آدم کے متعلق بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس کی چند ایک ابتدائی سطور قرآن حکیم کو سمجھنے کے متعلق بھی ہیں

"قرآنِ کریم کو سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ ایک موضوع کی تمام آیات کو جمع کر کے ان پر غور و فکر کیا جائے تاکہ مطالب واضح ہو جائیں۔ اس لئے کہا گیا۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا (۱۸-۵۴)

"ہم اس قرآن میں لوگوں کو ہدایت کے لئے ہر قسم کی مثالیں لوٹا لوٹا کر بیان کرتے ہیں تاکہ بات ہر پہلو اور ہر گوشے سے صاف اور واضح ہو جائے لیکن اس کے باوجود انسان کی حالت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ بات واضح ہو جائے کے بعد تسلیم کر لے) یہ اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے۔"

چنانچہ آیاتِ قرآنی کی وضاحت کے لئے قرآن نے جو نسخہ تجویز کیا وہ 'تصریف آیات' پر غور و فکر کرنا ہے۔ اس کے علاوہ جو راستہ ہوگا وہ جھگڑوں اور جنگ و جدال کا راستہ ہوگا۔ خاص طور پر وہ آیات جو کائنات کے متعلق ہیں ان کو سمجھنے کے لئے اگر قرآن کا تجویز کردہ راستہ اختیار نہ کیا جائے تو ان کا سمجھ میں آنا ناممکن ہے

مثال کے طور پر تخلیق آدم کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ .... (۶۷-۴۰)

"اس نے تمہاری تخلیق کی ابتداء مٹی (بے جان مادہ) سے کی۔"

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا .... (۲۵ - ۵۴)

"اور وہی تو ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا۔"

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ .... (۲ - ۶)

"خدا تو وہ ہے جس نے تمہیں گارے سے پیدا کیا۔"

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ ...... (۱۱ - ۳۷)

"انہیں ہم نے چپکتے ہوئے گارے سے بنایا۔"

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ (۱۲ - ۲۳)

"اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔"

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ..... (۱۴ - ۵۵)

"اُس نے انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے بنایا۔"

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۲۶ - ۱۵)

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتداء ایسے کیچڑ سے ہوئی جو سن رسیدہ ہو کر متغیر ہو چکا تھا۔

اگر ان آیات کے فرداً فرداً معانی لیے جائیں تو بات واضح نہیں ہوتی۔ لیکن اگر سب کو یکجا کر کے ان پر سائنس کے علوم کی روشنی میں غور و فکر کیا جائے تو تخلیق آدم کی ایک نہایت خوبصورت اور مربوط داستانِ ارتقاء بنتی ہے۔ جس سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

۳۔ ہمارے مفسرین نے تصریفِ آیات پر غور و فکر کے پہلو کو چھوڑ کر اپنی تفسیروں کی بنیاد انسان کے خود تراشیدہ تصورات اور یہود و نصاریٰ کی من گھڑت کہانیوں پر رکھی جس کی وجہ سے حق اور باطل کے مرکب نے قرآن کی تعلیم پر دبیز پردے ڈال دیئے۔ حالانکہ قرآن نے واضح طور پر بیان کیا تھا۔

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (۴۸ - ۵)

"اور حق جو تمہارے پاس آ چکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی (یہود و نصاریٰ کی) خواہشات کی پیروی نہ کرو۔"

قرآن حکیم کے اس سنہری اصول کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب قصہ آدم کی اصل حقیقت کو بیان فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمارے مذہبی پیشوا اب بھی خصوصی تخلیق کے نظریہ کو درست تسلیم کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ

تخلیق ارتقاء کی من گھڑت کہانی جو عیسائیوں اور یہودیوں کی نقالی ہے برابر دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اللہ میاں نے مٹی کا پتلا بنایا اس میں پھونک۔ بابا آدم بن گیا۔ اس کی پسلی چیری اماں حوا نکل آئی۔ ان دونوں سے پھر نسلِ انسانی آگے چل پڑی رجب کہ اس کے برعکس) قرآن حکیم پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آدم سے مراد بنی نوع انسان ہے نہ کہ کوئی خاص فرد۔ ملائکہ سے مراد کائناتی قوتیں ہیں اور شیطان سے مراد انسان کی جذباتی کمزوریاں ؟"

لفظ ملائکہ کی تشریح اور وضاحت

لفظ آدم اور لفظ شجر کی اس وضاحت کے بعد ہمارا خیال ہے کہ لفظ ملائکہ کی مزید وضاحت پیش کر دی جائے تاکہ آدم۔ شجر اور ملائکہ ان تینوں الفاظ کے مفہوم کو یکجا دیکھا جا سکے اور اس طرح قصۂ آدم کا وہ قرآنی تصور اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے جس کا صحیح مفہوم پیش نظر نہ ہونے کے باعث ملت اسلامیہ صدیوں سے مختلف توہمات اور غلط روایات کو حقیقت سمجھ کر نظریاتی انتشار کا شکار چلی آرہی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اپنی مذکورہ کتاب میں ملائکہ کی تشریح مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

• قرآن مجید میں صرف کائنات کی مادی اشیاء کو بطور شہادت پیش نہیں کیا گیا، بلکہ کائناتی قوتوں کی بھی بہت سے مقامات پر قسم کھائی ہے۔ بعض مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات مثلاً روزِ آخرت وغیرہ کا تعین دلانے کے لئے کائناتی توانائی کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے۔ ان آیات میں جن چیزوں کی شہادت پیش کی گئی ہے ان کے نام نہیں لئے گئے بلکہ ان کی صفات کا ذکر کیا گیا ہے چونکہ نام نہیں دیئے گئے اس لئے ہمارے مفسرین جو کائناتی توانائی کی ماہیت اور اس کے افعال سے ناواقف ہیں۔ ان صفات کو مادی اشیاء کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ الذاریات (۵۱) سورۃ المرسلٰت (۷۷) اور سورۃ النّٰزعٰتِ (۷۹) کی ابتدائی آیات پر نظر ڈالیئے۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْرًا إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ (۵۱ : ۱-۶)

بکھیرنے والیوں کی قسم جو بکھیر دیتی ہیں۔ پھر بوجھ اٹھاتی ہیں۔ پھر آسانی کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ پھر احکام خداوندی کے مطابق تقسیم کار کرتی ہیں کہ جس واقع کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ سچا ہے اور انصاف ضرور واقع ہوگا۔

یہاں آیت (۱تا۴) میں چار چیزوں کا بیان ہے جو آیت (۵۔۶) میں درج واقعات کے لئے بطور شہادت

پیش کیا گیا ہے۔ ان چاروں چیزوں کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ بعض مفسرین ان چیزوں کو ہواؤں سے منسوب کرتے ہیں جب کہ دوسروں کے نزدیک ان آیت میں ملائکہ کا ذکر ہے۔ اور بعض ہر آیت میں انہیں ایک مختلف نام سے منسوب کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر

عبداللہ یوسف علی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا — ہواؤں کی قسم جو نشریات میں آواز کو بکھیر دیتی ہیں۔

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا — اور وہ جو بھاری وزن اٹھاتی ہیں۔ (اس سے مراد ہوائیں بھی ہو سکتی ہیں جو پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو تھامتی ہیں اور خود پانی سے بھرے ہوئے بادل بھی ہو سکتے ہیں۔

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا — اور وہ جو آسانی اور نرم روی سے تیرتی جاتی ہیں۔ ان سے مراد وہ ہوائیں بھی ہو سکتی ہیں جو جہازوں کے بادنوں میں بھر جاتی ہیں اور انسانوں کو ان کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہیں۔ اس سے مراد خود جہاز بھی ہو سکتے ہیں۔"

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا — اور وہ جو حاکم کے حکم سے تقسیم کرتی ہیں۔ یہ ہوائیں یا دیگر چیزیں بھی ہو سکتی ہیں جو نمی یا بارش یا ہوا کے دباؤ کو تقسیم کرتی ہیں۔ مرمدوک پکتھل ان آیات کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا — "ان ہواؤں کی قسم جو بھوسے کو دانوں سے الگ کرتی ہیں"

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا — "اور وہ جو بارش کے پانی کا بوجھ اٹھاتی ہیں"

فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا — "اور وہ جو سمندر کی سطح پر آسانی سے چلتی ہیں"

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا — "اور وہ جو برکتوں کو حکماً تقسیم کرتی ہیں"

ابو الاعلیٰ مودودی ان سب کو ہواؤں اور بادلوں سے منسوب کرتے ہیں۔

مولوی فتح محمد جالندھری بھی ان سب کو ہواؤں اور بادلوں سے منسوب کرتے ہیں۔

لیکن باوجود ان مختلف تفاسیر کے وہ مفسرین جو ان بیان کردہ صفات کو ملائکہ سے منسوب کرتے ہیں وہ حقیقت سے زیادہ قریب ہیں لیکن چونکہ ان کے نزدیک لفظ ملائکہ کا تصور مبہم ہے اس لئے ان کی تفاسیر ادھوری رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ پہلے لفظ ملائکہ پر غور کیجیے۔ لغات میں لفظ ملائکہ کے دو مادہ ROOTS لئے گئے ہیں۔ ایک ا ل ک جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں۔ دوسرا م ل ک جس کے معنی توانائی کے ہیں۔ اب دیکھئے کہ کائنات میں کسی ایک نکتہ سے دوسرے نکتہ تک پیغام رسانی کا ذریعہ ریڈی ایشن ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی ہر شے میں کام کرنے کی قوت اور صلاحیت ریڈی ایشن کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ریڈی ایشن کی لہریں کائنات میں

طاقت کا مصدر بھی ہیں اور پیغام رسانی کا ذریعہ بھی ہیں۔

اس لئے جہاں تک طبعی دنیا کا تعلق ہے۔ لفظ ملائکہ کے معنی بجا طور پر ریڈی ایشن ہے۔ قرآن کریم نے ملائکہ کے دو بڑے افعال بیان کئے ہیں۔ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (۴ : ۵۱) یعنی خالق کائنات کے حکم سے کائنات کے اندر تقسیم کار اور دوسرا فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۵ : ۷۹) "کائنات کے مختلف اجزاء کی QUANTITY مقدار اور QUALITY مخصوصیات میں باہمی توازن پیدا کرنا۔"

چنانچہ آیت (۴-۱ : ۵۱) کا مطلب واضح ہے۔

توانائی کی ان بنیادی صورتوں کی قسم جو کائنات میں توانائی کو بکھیرتی ہیں۔ اور کشش ثقل کی قسم جو اربوں ٹن وزنی ستاروں۔ سیاروں اور دیگر اجرام فلکی کو اپنے اپنے مدار میں تھامے ہوئے ہے۔

اور توانائی کی ان تمام لہروں کی قسم جو نہایت آسانی اور خاموشی سے اور بلا روک ٹوک تیرتی چلی جاتی ہیں اور خالقِ کائنات کی طرف سے کائنات کے ہر گوشے میں تقسیم کار کرتی ہیں۔"

اسی طرح قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر اشیاء کا نام لیے بغیر ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔

کائنات کے ہر گوشہ میں ایٹمز اور سالمات کے باہمی ٹکراؤ کے نتیجہ میں ان کے درمیان BONDS جڑتے رہتے ہیں اور ٹوٹتے بھی رہتے ہیں۔ ایک قسم کی توانائی دوسری قسم میں تبدیل ہوتی رہتی ہے کہیں مادہ توانائی میں تبدیل ہو رہا ہے کہیں توانائی مادہ میں بدل رہی ہے کائنات میں ہر فالتو شے جس میں بڑھنے پھولنے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی، الگ کر دی جاتی ہے اور ہر وہ چیز جس میں باقی رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی نشو ونما پاتی جاتی ہے۔ یہ تمام سلسلہ کائنات نہایت خاموشی اور توازن کے ساتھ جاری ہے اور اس کا دارو مدار ریڈی ایشن کی لہروں پر ہے۔

چنانچہ سورۃ المرسلٰت میں اس سلسلہ کو یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ہ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ہ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ہ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ہ فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا ہ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ (۷۷ : ۱-۷)

" توانائی کی لہروں کی قسم جن کو پیہم اور متواتر بھیجا جاتا ہے جو ہر چیز کو جس میں بڑھنے پھولنے کی صلاحیت موجود نہ ہو بھوسے کی طرح اڑا کر الگ پھینک دیتی ہیں اور جس چیز میں نشو ونما کی صلاحیت موجود ہو، اس میں نشو ونما کا سامان پیدا کر کے دور دور تک پھیلا دیتی ہیں۔ اس طرح تعمیری اور تخریبی عناصر کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہیں اور یوں کائنات میں تعمیر و تخریب کے قانون کو بے نقاب کرتی جاتی ہیں تاکہ ہر شے مثبت عمل سے باقی رہ جائے اور منفی عمل سے ضائع ہو جائے۔ کہ جس

چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ یقیناً ہو کے رہے گی"

چنانچہ مندرجہ بالا آیات میں بھی جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس کا نام نہیں لیا گیا۔ صرف اس کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جن پانچ صفات کا ذکر ہے ان کو ہر مفسر نے مختلف چیزوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ بعض کے نزدیک پانچوں آیت میں ہواؤں کا ذکر ہے اور بعض کے نزدیک ملائکہ کا ذکر ہے۔ ایک تیسرا گروپ کہتا ہے کہ پہلی دو آیت میں ہواؤں کا ذکر ہے اور باقی تین میں ملائکہ کا ذکر ہے۔ ایک پانچواں گروپ ہے جس کے مطابق پہلی آیت میں ملائکہ رحمت کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ملائکہ عذاب کا ذکر ہے اور باقی تین آیات میں آیت قرآنی کا ذکر ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ جلد ۶ صفحہ ۲۰۹)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کی تفاسیر ان کائناتی قوتوں سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں جو ارض و سمٰوت میں ہر حرکت کی بنیاد ہیں یعنی ریڈی ایشن کی لہریں۔

اسی طرح سورۃ النزعات (۷۹) کی ابتدائی چھ آیات میں بھی یہی معاملہ درپیش ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کائنات میں کیمیائی جوڑ توڑ مسلسل جاری ہیں اور ان کا انحصار توانائی کی مقدار اور اس کے حصول کے برقرار رہنے پر ہے توانائی کی مقدار بڑھتی جائے گی تو ایٹمز اور سالمات کے درمیان جڑنے کی رفتار تیز ہوتی جائے گی۔ لیکن توانائی کی مقدار اگر ایک حد سے آگے بڑھ جائے تو جوڑ ٹوٹنے شروع ہو جائیں گے۔ جوں جوں یہ بڑھتی جائے گی، جوڑ ٹوٹنے کی رفتار تیز ہوتی جائے گی۔ توانائی کی لہریں فضا میں بلا روک ٹوک چلی جاتی ہیں اور چونکہ ان لہروں کی لمبائی مختلف ہے اس لئے ایک قسم کی لہریں دوسری قسم کی لہروں کی نسبت رفتار، طاقت اور جاذبیت کے لحاظ سے سبقت لیتی جائیں گی۔ اس عمل کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ماحول میں مسلسل تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ پوری کائنات میں ایک ہلچل مسلسل جاری ہے۔ قرآن کریم کی اس ہلچل کو اس دن کی ہلچل کے وقوع پذیر ہونے کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے جو ایک بھونچال کی صورت میں آئے گی۔

چنانچہ کہا گیا۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ (۷۹۔۱۔۶)

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا — توانائی کی لہروں کی قسم جو کیمیائی جوڑوں BONDS کو مادہ کے اندر گھس کر سختی سے توڑ پھوڑ دیتی ہیں:

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ اور وہ جو ان جوڑوں کو آرام سے توڑ دیتی ہیں۔

وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ اور وہ جو بلا روک ٹوک چلتی ہوئی اور ایک

دوسرے سے آگے بڑھتی ہوئی (مختلف کاموں کو سرانجام دیتی ہیں)

اور اس طرح

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا	خالق کائنات کے حکم سے کائنات میں تدبیر امور کرتی ہیں کہ ایک دن آئے گا جب یہ ہلچل ایک زوردار ہلچل کی شکل میں نمودار ہو گی

عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا	ان فرشتوں کی قسم جو (شر پسند لوگوں کی) سختی سے جان نکالتے ہیں اور
وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا	اور ان کی قسم جو نیک لوگوں کی آسانی سے جان نکالتے ہیں؛
وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا	اور وہ جو رحم کا پیغام لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا	اور پھر آگے بڑھنے کے لئے دوڑ لگاتے ہیں۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا	اور پھر حاکم کے حکم کو بروئے کار لاتے ہیں۔ کہ ہر وہ شے جو اس وقت حرکت میں ہے ایک دن حرکت میں ہو گی۔

پکتھال اِن آیات کا یوں ترجمہ کرتے ہیں۔

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا	اُن کی قسم جو تباہی کی طرف دھکیلتے ہیں۔
وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا	اور تیزی سے بڑھتے ہوئے شہاب ثاقب کی قسم۔
وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا	اور اکیلے اکیلے ستاروں کے تیرنے کی قسم۔
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا	اور فرشتوں کی قسم جو تیزی سے چلتے ہیں۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا	اور وہ جو امور کا انتظام کرتے ہیں۔

ابوالاعلیٰ مودودی بھی مندرجہ بالا صفات کو ان فرشتوں سے تعبیر کرتے ہیں جو انسانوں کی جان نکالتے ہیں ان تراجم میں بھانت بھانت کی بولی ہی اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مفسرین ریڈیشن کی لہروں اور ان کے اثرات سے ناواقف ہیں۔

لیکن میں یہ واضح کر دوں کہ جب میں کہتا ہوں کہ لفظ ملائکہ سے مراد ریڈیشن کی ہر رین یا وہ کائناتی توانائی ہے جو کائنات میں تدابیر امور کرتی ہے تو میرا اشارہ صرف طبعی دنیا کی طرف ہے چنانچہ ملائکہ وہ

کائناتی قوتیں ہیں جو انسان کے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا ..... ۝ (۲:۳۴)

اور جب ہم نے کائناتی قوتوں کو کہا کہ (آدم) بنی نوع انسان کے آگے جھک جاؤ تو وہ سب جھک گئیں۔

لیکن اس کے علاوہ قرآن کریم نے ملائکہ کا لفظ ان قوتوں کے لئے بھی استعمال کیا ہے جو انسانی دنیا اور خالق کائنات کے درمیان رابطہ کا ذریعہ ہے۔

چنانچہ کہا گیا۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ۝ (۲۲:۷۵)

اللہ ملائکہ میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی اور وہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ ملائکہ میں سے بعض کو چن لیتا ہے تاکہ وہ اس وحی کو انسانوں تک پہنچا دیں اور انسانوں میں سے بعض کو منتخب کر لیتا ہے کہ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیں۔ انسانوں میں وحی کو وصول کرنے والے نبی ہوتے ہیں۔ نبوت اور رسالت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ نبی جو کہ رسول بھی ہوتا ہے۔ اللہ کے پیغام کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا ہے یہ ملائکہ جو اللہ کے پیغام کو نبیوں تک پہنچاتے ہیں انسان کے احاطۂ ادراک سے باہر ہیں۔ انسان معلوم نہیں کر سکتا کہ یہ کیا ہیں اور کس طریق سے عمل کرتے ہیں۔ ہم ان کو DIVINE ENERGY یا الوہیاتی توانائی کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ملائکہ ان قوتوں کو بھی کہا گیا ہے جو انسان کی نفسیاتی دنیا پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا ..... (۴۱:۳۰)

"یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ اللہ کی ربوبیت پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اس ایمان پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کسی چیز کا غم اور اندیشہ مت کرو۔"

یہاں نزول ملائکہ سے مراد وہ نفسیاتی تغیر ہے جو اللہ کی ربوبیت پر یقین رکھنے والوں میں پیدا ہوتا ہے چونکہ ریڈی ایشن یا کائناتی تصور نہ صرف ساتویں صدی عیسوی میں بلکہ موجودہ صدی کے ابتداء تک وجود نہیں تھا اس لئے ان آیات قرآنی کا مفہوم جو کائناتی توانائی کے متعلق ہیں اب تک نظروں سے اوجھل رہا۔

ملائکہ سے متعلق اس پہلو کو نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ تقسیم امور میں صرف وہی افعال سرانجام دیتے ہیں جن کے لئے خالقِ کائنات نے ان کو مقرر کیا ہے۔ یہ صرف انسان ہے جس کو اختیار اور ارادہ دیا گیا ہے۔ ملائکہ اپنی مرضی سے کوئی کام انجام نہیں دے سکتے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (۱۶ : ۴۹)

کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے ان میں سے ہر چیز اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا کائناتی قوتیں۔ ان میں سے کسی کو مجالِ سرتابی نہیں وہ ان قوانین کی اطاعت سے کبھی سرکشی نہیں کرتیں۔

اس آیت میں یَسْتَكْبِرُوْنَ کا لفظ یَسْجُدُ کے مقابلے میں آیا ہے۔

ازروئے قرآن ملائکہ پر ایمان ایک مومن کے ایمان کا حصہ ہے لیکن ملائکہ کے لئے قرآن نے جو STATUS درجہ مقرر کیا ہے اس کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ (STATUS) یہ ہے کہ کائناتی قوتیں انسان کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ جس قدر انسان کی علمی سطح بلند ہوتی جاتی ہے اسی قدر ملائکہ انسان کے سامنے جھکتے جاتے ہیں۔

ملائکہ چھپی ہوئی قوتیں ہیں

ملائکہ کے ایک اور پہلو کا ذکر بھی ہے وہ یہ کہ وہ انسانی آنکھ کو نظر نہیں آتے۔ ازروئے قرآن (ملائکہ) توانائی پہلے وجود میں آئی اور جاندار مخلوق جن میں سب سے اونچا درجہ انسان کا ہے، بعد میں وجود میں آئے اور جنوں کی تخلیق آگ سے ہوئی اور انسان کی مٹی سے۔

چنانچہ کہا گیا

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ (۱۵ : ۲۶ - ۲۷)

"ہم نے انسان کو ایسے گارے سے پیدا کیا جو وقت گزرنے کے بعد تغیر پذیر ہو کر خشک ہو چکا تھا۔ اور جان "چھپی ہوئی مخلوق کو اس سے قبل بے دھوئیں کی تیز آگ سے پیدا کیا۔

قرآن کریم میں جان (مادہ، ج ن ن) کو مادی اشیاء کے متعلق بھی استعمال کیا ہے اور توانائی کے متعلق بھی۔ مثلاً قبر کو "جنن" کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ مردہ جسم کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔ اس طرح مال

کے پیٹ کے اندر بچے کو جنین کہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ...... (۶ - ۷۶)

" جب رات کی تاریکی نے چھپایا تو اس نے ایک سیارہ دیکھا "

کا جنّ لہٰذا الامر کے معنی ہیں۔ اس بات پر کوئی راز (پوشیدہ) نہیں۔ جن اور انس کے الفاظ اکثر جگہوں پر اکٹھے آئے ہیں۔ عربوں کے ہاں انس ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر رہتے ہیں اور جنّ ان خانہ بدوش قبائل کو کہتے تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ جگہ پھرتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے چھپے رہتے تھے۔ آجکل وسائل رسل و رسائل عام ہونے سے یہ فرق بڑی حد تک مٹ چکا ہے۔ چنانچہ جنّ اور انس کے معنی ہیں غیر مہذب لوگ۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیت میں ان ہی غیر مہذب لوگوں کا ذکر ہے۔

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ (۷۲-۱)

"اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ ایک غیر مانوس بادیہ نشین قبیلے کی ایک جماعت نے قرآن سنا تو کہنے لگے کہ ہم نے ایک عجیب و غریب قرآن سنا ہے۔ (۲۹-۴۶ بھی دیکھیے)

ہمارے ہاں جنّ کا جو عام تصور پایا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں کہیں موجود نہیں۔ درحقیقت دورِ توہم پرستی میں ہر وہ چیز جو انسان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دیوی یا دیوتا بن جاتی تھی۔ انہی چیزوں کو پوشیدہ ہونے کی بنا پر عربوں نے جن کہا۔

مندرجہ بالا الفاظ میں لفظِ جنّ کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ چنانچہ آیت (۲۷ : ۱۵) لفظ جانّ کے معنی ریڈیشن یا توانائی کی لہریں ہیں۔ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ "جان کو نار السموم سے پیدا کیا۔ مفسرین نے نار السموم کا ترجمہ "بغیر دھوئیں کی آگ" بھی کیا ہے اور FIERCE BLAST OF FIRE تند و تیز گرم ہوا بھی کیا ہے۔ لغت میں سموم مادہ س م م کے معنی ہیں۔ ایسی چیز جو ہلکی ہو اور نہایت تیز رو بھی ہو۔ ابنِ فارس نے اس کے بنیادی معنی بتائے ہیں "کسی چیز میں داخل ہونے کی جگہ" وہ لکھتا ہے کہ زہر کو سم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بدن میں گھس جاتا ہے اور سموم اگرم اور تیز ہوا کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز میں تیزی سے گھس جاتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کائنات میں کون سی چیز ایسی ہے جس میں یہ تمام صفات یعنی ہلکا پن تیز روی اندر دھس جانا اور سخت گرم ہونا بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈی ایشن کی لہروں میں یہ تمام

صفات اس حد تک موجود ہیں کہ کوئی دوسری شے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ۔ ہوا بھی ایک ہلکی چیز ہے اور تیز بھی چلتی ہے لیکن اس کا توانائی کی لہروں سے کیا مقابلہ جو ایک سیکنڈ میں لاکھوں میل چلی جاتی ہیں دوسری چیزیں بھی گرم ہو سکتی ہیں لیکن ریڈیشن کی چھوٹی لہریں بذاتِ خود آگ ہیں ۔ اور ایسی آگ جو بغیر دھوئیں کے ہے اگر سَمّ کے معنی زہر ہے تو بھی ریڈیشن کی لہروں سے زیادہ تیز زہر اور کیا ہو سکتی ہے سوائے روشنی کی ان لہروں کے جو مادی شے کے ساتھ ٹکرا کر واپس لوٹتی ہیں ۔ باقی ہر قسم کی ریڈیشن نگاہوں سے اوجھل ہے ۔ آپ گاما ریز ۔ الٹرا وائیلٹ ریز اور گرمی کی لہروں کو دیکھ نہیں سکتے ۔ صرف محسوس کر سکتے ہیں ریڈیو کی لہروں کو ریڈیو سیٹ پر حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھی نہیں جا سکتیں ۔ چنانچہ آیت (۱۵:۲۷) میں جس چھپی ہوئی مخلوق کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے مادی مخلوق سے پہلے پیدا کیا گیا وہ یہی ریڈی ایشن کی لہریں ہیں ۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ملائکہ (انرجی کی لہروں) کا کام مُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ، یعنی کائنات کے خالق کے حکم سے کائنات میں تقسیم کار ہے ۔ چنانچہ ارض و سمٰوات کے ہر گوشے میں مادی اشیاء کی حرکت اور غیر جاندار اور جاندار اشیاء کی نئی نئی شکلوں کا مسلسل معرضِ وجود میں آنا ۔ ماضی ۔ حال اور مستقبل میں ہر مادی شے کا ارتقاء ۔ ان تمام امور کا انحصار ملائکہ یعنی توانائی کی لہروں پر ہے ۔ کائنات میں ایک خوردبینی شے سے لے کر پورا کرۂ ارض بمعہ دیگر آسمانی کروں کے ہر آن اپنی ملائکہ کے زیرِ اثر تغیر پذیر ہیں ۔

پروفیسر وارث میر صاحب کے نام خط

قبل اس کے کہ ہم قصّۂ آدم کے سلسلہ میں لکھے جانے والے اس خط کا بقایا حصّہ قارئین کی خدمت میں پیش کریں ضمناً پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ قصّۂ آدم کے متعلق اوپر بیان کردہ قرآنی مفہوم کو آج کس قدر پذیرائی نصیب ہو چکی ہے ، چنانچہ اس کا اندازہ ہمیں جناب پروفیسر وارث میر صاحب کو ملنے والے اس خط سے ہو سکے گا جو آپ کی طرف سے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت مورخہ ۸۶-۵-۱۳ میں " شجرِ ممنوعہ کا اصلی مفہوم کیا ہے " کے زیرِ عنوان شائع ہوا ۔ چنانچہ پروفیسر وارث میر صاحب تحریر کرتے ہیں :

" امریکہ کے ایک کالج میں منعقد ہونے والے مذاکرے کی تفصیلات پر مشتمل میری رپورٹ بہ عنوان " حقوقِ نسواں کی اسلامی تحریک " پر ملک اور بیرون ملک قارئین کی طرف سے کئی خطوط موصول ہوئے ہیں ۔ بعض حلقوں کی طرف سے انگریزی متن کا مطالبہ بھی کیا گیا جو حسبِ استطاعت

میں نے پورا کرنے کی کوشش کی ۔ اِس سلسلے میں ایک فاضل قاری کی طرف سے نہایت دلچسپ اور فکر انگیز خطوط موصول ہوئے ہیں ۔ ان متعدد خطوط میں سے ایک خط کے ضروری حصّے نذرِ قارئین ہیں :

محترم وارث میر صاحب

السلام علیکم ! آپ کا مضمون " حقوقِ نسواں کی اسلامی تحریک " نظر سے گذرا ۔ جس میں بے نظیر کے حوالے سے اسرائیلیات کو اسلام کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جبکہ آدم و حوا کا جو عیسائی قصّہ آج تک عوام کو سُنایا گیا ہے دراصل وہ دو نفوس کا قصّہ نہیں ہے ۔ قرآن سے ثابت ہے کہ نوعِ انسانی اسی طرح زمین سے پیدا ہوئی جس طرح باقی انواع زمین سے پیدا ہوئیں ۔ آدم کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ایک نظام کے تحت زندگی گذارنا ۔ جس کا مادہ ا ۔ د ۔ م ہے ۔ اس کے بنیادی معانی مِل جُل کر رہنا الادمۃ کے معانی ہیں مخلوط ہونا ، ہم آہنگ ہونا ، یا ایک دوسرے کے لیے سازگار ہونا ، الاِدَامُ کہتے ہیں سالن کی ترکاری کو ، جس کے ساتھ روٹی کھائی جاتی ہے اس سے اس لفظ کے معنی نِکھر کر سامنے آجاتے ہیں " موافق و ہم مقصد و ہم آہنگ " اور یہ چیز اس کے بغیر ممکن نہیں کہ سب لوگ کسی ایسے واحد قانونی نظام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں جو افرادِ معاشرہ کے لیے ایک ہو ۔ سب کے حقوق مشترک ہوں ۔ اور سب کے فرائض واحد ہوں ۔

شروع میں جب نوعِ انسانی نے تمدنی زندگی شروع کی تو یہی نوع جو ذاتی طور پر بشر تھی ، صفت موانست سے انسان ہوئی ۔ یہ تمدنی زندگی سے آدم ہوئی ۔ اب اگر یہ نوع وحی کے نازل کردہ ہموار نظام کے ساتھ منسلک ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تمیز نہیں ۔ جس میں حاکم و محکوم کے حقوق و فرائض میں سرِ مو فرق موجود نہیں ۔ جس میں ڈیوائن رائٹ یا حقوقِ سلطانی کے نام سے سربراہ معاشرہ کے لیے نہ کوئی رعایت ہے اور نہ خصوصیت ۔ جس میں صدر بھی عوام جیسے لباس میں ملبوس ، عوام جیسے مکان کا مکین اور عوام ہی کا ایک فرد شمار ہوتا ہے تو پھر تو یہ آدم ہے ۔

اگر یہ معاشرہ پاکستان جیسے ناہموار نظام میں جکڑا ہوا ہے جس میں اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز ہے ، آقا و غلام کی تمیز ہے ، امیر اور غریب کی تمیز ہے ، جس میں عوام کے لیے الگ قوانین

ہیں اور حکام کے لیے الگ قوانین ہیں، جس میں ایک کھاتا ہے، دوسرا زکوٰۃ کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے یا ترستا رہتا ہے، جیساکہ پاکستان میں ہے، جس میں سرمایہ داری، تاجری، جاگیرداری، سرداری اور اجارہ داری ہے۔ یعنی کوئی تو فلک بوس محلوں میں محوِ استراحت ہے اور کوئی بے زمین، بے مکان ہے۔ اِس معاشرے کا فرد نہ آدم ہے نہ انسان۔ محض حیوانی تقاضوں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے ہوئے انسانی پُتلے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بشر اِس وقت آدم کہلایا جب زمین پر قانونی زندگی کا آغاز ہُوا۔ پورے ملک کا ایک قانون، ایک سربراہ یا سردار قوم یا خلیفہ یا امیر۔ عربی میں سردار قوم کو بھی آدم کہتے ہیں (بحوالہ مرۃ القرآن از عبدالحیٰ ص ۸) آدم بین المخاصمین۔ اس نے دو جھگڑنے والوں میں فیصلہ کیا۔ المنجد ص ۶۳ اس طرح آدم کا معنی سربراہ سلطنت بھی ہے۔

قرآن میں آدم کا قصہ سورۃ بقرہ میں آیت مجید نمبر ۳۰ سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلی آیت ۲۹ میں پوری نوع انسانی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔ (مفہوم) اے نوعِ انسانی اللہ وہ ہے جس نے زمین کی سب کی سب چیزوں کو تم سب کے لیے پیدا کیا ہے۔

غور کا مقام ہے کس وضاحت سے قرآن (اسلام) کہہ رہا ہے کہ زمین کی نعمتیں کسی سربراہ حکومت کے باوا کی ملکیت نہیں بلکہ سب کی سب نوعِ انسانی کا سرمایۂ حیات ہے۔ خود اللہ تعالےٰ فرما رہے ہیں کہ ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے سربراہِ مملکت مع ماتحت عملہ اور عوام کے حقوق مساوی ہیں اور اسی ہموار و متوازن معاشرہ ہی کو قرآن کریم نے جنت کہا ہے جس میں نہ کوئی بھوکا رہتا ہے نہ ننگا۔ نہ بے مکان اور نہ بے علاج ہوتا ہے۔ (بحوالہ ۱۱۹۔۱۱۸/۲۰)

دنیا میں ذاتی مفاد پرستی کا دور شروع ہو گیا تو اللہ تعالےٰ نے سورۃ بقرۃ آیت ۲۱۳ اور ۱۰/۱۹ کے مطابق انسانوں میں سے بہتر انسانوں کو چُن لیا جن کے پاس ذاتی مفاد کوشی پھٹک نہ سکتی تھی، ہر خطہ زمین پر نبی بھیج کر نوعِ انسانی کو ایک نظام اور ایک سربراہِ مملکت (۴۹/۱۳) کے تحت زندگی گذارنے کی ہدایت فرمائی اور سربراہِ مملکت کو باقی تمام افراد مملکت کا ساتھی قرار دیا اور اپنے انبیاء کی معرفت ہونے والے سربراہ کو حکم دیا کہ تم اپنے ساتھی یعنی عوام سمیت یعنی مساوی طور پر جنتی معاشرہ میں بافراغت کھاؤ پیو اور تم دونوں سربراہ و عوام نہ کہ آدم و حوّا) اِس شجرِ ممنوعہ (ذاتی مفاد کوشی) کے

قریب نہ پھٹکنا ورنہ ظالم قرار دیے جاؤگے۔ ۲/۳۸۔ قرآن کریم نے اس مضمون کو سورۃ بقرۃ میں انسان کے ظاہر دشمن، نفس امارہ کے ذکر کے بعد متصل بیان فرمایا ہے۔،،

اب ہم دوبارہ اپنے اس خط کے باقی ماندہ حصّے کی طرف لوٹتے ہیں جو اپریل ۱۹۹۶ء کو ملک کی اہم علمی شخصیات کو لکھا گیا تھا اور وہ یہ کہ:

جناب محترم میں پھر عرض کروں گا کہ میں مایوس نہیں ہوں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق ایک روز ،، یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی" اور یہ یقیناً ہوکر رہے گا۔ کیونکہ انسان نے اپنے ناکام تجارب سے تنگ آکر اسی نظامِ زندگی کی طرف لوٹنا ہے۔ جس کی نشاندہی قرآن کریم نے کر رکھی ہے۔ لیکن قابلِ فہم بات تو یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ آخر ہم نے اپنی نئی نسل اور دنیائے عالم کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے قرآن پاک کی اس درخشندہ تعلیم کو کس حال میں پیش کیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہوگا وہ آپ کے ذوقِ سلیم سے معذرت کے ساتھ عرض کرنا ہوگا۔ اور وہ صرف اس لیے کہ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ اِس لیے اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل اقتباسات یقیناً قابلِ غور ہوں گے جن سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ اقبال کے الفاظ میں، ہم نے اس کتاب کے درخشندہ مفہوم کو کس قدر چیستان بنا رکھا ہے۔

جنابِ محترم! آج کے دور میں کونسی مسجد ہے اور کونسا محراب ہے ہے جہاں تخلیقِ آدم کے سلسلے میں تفسیر ابنِ کثیر جیسے ہمارے ہاں معتبر ترین تفسیر گردانا جاتا ہے۔ (بلکہ جس کی روشنی میں ہی ہماری اکثر تفاسیر مرتب کی گئی ہیں) کی یہ تعلیم نہ دی جا رہی ہو کہ:

"فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے جنات جمعرات کے دن اور آدم جمعہ کے دن۔"

بحوالہ اردو ترجمہ پارہ اوّل صفحہ ۸۰، اور پھر فرمایا " حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے:

" پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اٹھائی جو چکنی اور اچھی تھی جب اس کا خمیر اُٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے۔ ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا کہ وہ بجتی مٹی تھی جیسے کھوکھلی چیز ہو۔ پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا۔ پھر جب اللہ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے کی طرف آئی تو جہاں جہاں تک روح پہنچتی رہی خون گوشت بنتا گیا جب ناف تک روح پہنچی تو وہ اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور جھٹ سے اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لیے اٹھ نہ سکے۔ جب روح سارے جسم میں پہنچ گئی اور چھینک آئی تو کہا الحمد للہ رب العٰلمین، اللہ نے کہا یرحمک اللہ۔"

عورت کی پیدائش :

اور اس کے بعد آدم کی بیوی کی پیدائش کے سلسلہ میں لکھا ہے :

" آپ تن تنہا تھے (ایک دن) آپ پر نیند کا غلبہ ہوا تو آپ کی بائیں پسلی[1] سے حضرت حوّا کو پیدا کیا (حوّا کا لفظ بھی قرآن پاک کا نہیں ۔ (ناقل) جاگ کر انہیں دیکھا تو پوچھا تم کون ہو ؟ انہوں نے کہا ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لیے پیدا کی گئی ہوں ۔" (تفسیر ابن کثیر ۔ صفحہ ۸۵)

مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کا بیان

اور مولانا احتشام الحق (مرحوم) حضرت آدم علیہ السلام " اور حضرت حوّا کے نکاح کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ :

" حضرت آدمؑ نے حضرت حوّا کو چھونے سے پہلے خدا کے حکم پر نبی اکرم پر ۱۰ بار درود بھیجا اور ملائکہ کی شہادت کے ساتھ ان دونوں کا نکاح قائم ہوا اور فرشتوں کو حکم ہوا کہ وہ یاقوت اور سچے موتیوں کے زیورات اور لباس زینت سے حوّا کو آراستہ کر کے دونوں کو جنّت میں داخل کر دیا جائے ۔"

اور اس کے بعد ہر محراب و منبر سے یہ بتایا جاتا ہے کہ اسی جوڑے کے ایک حمل کی اولاد کا دوسرے حمل کی اولاد یعنی حقیقی بہن بھائیوں کا نکاح ہوتا رہا اور اس طرح نسل انسانی آگے بڑھنی شروع ہوئی ۔ ہابیل اور قابیل کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں " حضرت آدم علیہ السّلام " کے بیٹے تھے اور ان کے مابین جو جھگڑا اٹھا اور قتل تک نوبت پہنچی ، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک حمل کی لڑکی حوّا کے دوسرے حمل کے لڑکے کو پسند آگئی تھی " یعنی بالفاظ دیگر ایک حقیقی بھائی دوسری حقیقی ہمشیرہ پر عاشق ہو گیا تھا (العجب) یاد رہے ہابیل اور قابیل کا نام قرآن مجید کا نہیں ۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

اور پھر ان افسانوں کو منسوب کر دیا جاتا ہے اس ذات اقدسؐ و اعظم کی طرف جو علم و عرفان کی بلند ترین سطح پر فائز تھی ۔

" حضرت آدم علیہ السّلام " کا یہ مروجہ مفہوم آج بھی ہمارے ہاں ــــ کس قدر بلند علمی سطح پر عام ہے ، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مزید ایک دو مثالوں سے لگائیے ۔ مثلاً

(۱) یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کا سالانہ مجلہ ۱۹۸۳ء " ایکو " جو زیر سرپرستی جناب پروفیسر ڈاکٹر اے ایچ قریشی وائس چانسلر شائع ہوا اس کے صفحہ ۱۶ پر سیرت النبیؐ (مولانا شبلی نعمانی) کے حوالے سے ایک

[1] پسلی سے پیدا ہونے کے تصور کو ہم نے کس حد تک قبول کر رکھا ہے اس کا اندازہ آپ کو " عورت کی حالتِ زار " کے باب کے آخر پر دیے گئے چارٹ کی پشت پر لکھی گئی تحریر سے بھی ہو سکے گا ۔

حدیث درج کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب حضرت آدم ؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا " اے خدا! میں تجھ کو محمد صلعم کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے۔" خدا نے کہا" تم نے محمد کو کیونکر جانا"۔ حضرت آدم ؑ نے کہا" میں نے سر اُٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لا الہٰ اللہ محمد رسول اللہ اس سے میں نے قیاس کیا کہ تُو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے، وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا۔"

خدا نے کہا" آدم ؑ تم نے سچ کہا، اور محمد ؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا۔"

(۲) کسی زبان میں شائع ہونے والے انسائیکلو پیڈیا کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آج پاکستان میں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور کے ہاں سے اُردو جامع انسائیکلو پیڈیا شائع ہو رہا ہے جس کی جلد اوّل کے صفحہ پر" آدم علیہ السلام" کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ

آدم) اوّلین انسان جس سے نوعِ بشر پھیلی دنیا کے کروڑوں آدمی سب انہی کی اولاد ہیں۔ قرآن مجید میں سترہ جگہ یہ نام آیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انہیں کرۂ ارض پر اپنا خلیفہ بنایا اور جملہ فرشتوں کو ان کے سامنے جھکنے کا حکم دیا کیونکہ انہیں تمام اشیا کے نام سکھا دیئے گئے تھے۔ یعنی علمِ اسماء عطا ہوا تھا۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کے باعث آدم اور ان کی زوجہ (حوّا) زمین پر پھینکے گئے اور یہاں کی جسمانی زندگی بسر کرنا نسلِ آدم کا امتحان قرار پایا کہ اگر خدا کی عبادت اور احکام کی پابندی کریں گے تو قیامت کے دن بڑی دائمی جزا (جنّت) پائیں گے۔ کفر و نافرمانی کی سزا دوزخ ہے۔ یہود و نصاریٰ بھی آدم کو سب انسانوں کا باپ مانتے ہیں۔"

جناب محترم! یہ کس قدر گہری سازش تھی۔ میرا خیال ہے قرآن کے اس قصّۂ آدم کے تمثیلی واقعہ کا مفہوم بدلنے والے کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس ایک واقعہ کے مفہوم کو بدلنے سے قرآن حکیم کی پیش کردہ اصطلاحات کا پورا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ معنی بدل جائیں گے اور اصطلاحات کا مفہوم بدل جانے سے اُمّتِ مسلمہ کی پوری کی پوری تاریخ بدل جائے گی۔ تصوّرِ زندگی بدل جائے گا۔ انسانیت کے خون کا رنگ بدل جائے گا۔ چہرے بدل جائیں گے۔ مسرتوں کے رُوپ بدل جائیں گے۔ آخرت کا تصوّر بدل جائے گا۔ یہاں تک کہ ملّتِ اسلامیہ کے تہوار بدل جائیں گے اور تہواروں کی نوعیت بدل جائے گی۔ اور آخر کار پوری کی پوری تعلیم بدل جانے سے اُمّتِ مسلمہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے گی اور پھر راکھ کا ڈھیر۔ اُف! کس قدر اذیت ناک ہے یہ سزا قرآن کے ایک لفظ کا مفہوم بدلنے کی لیکن افسوس کہ جن تصورات اور تعلیم نے ہمیں راکھ کا ڈھیر بنا دیا وہی تصورات اور اسی تعلیم کو عقیدت کے پھولوں

طرح تعلیمی نصاب اور وعظوں کی خوبصورت طشتریوں میں ہر محراب و منبر اور مدرسہ سے ایک دوسرے کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیا جاتا ہے۔ **کاش آج کا مسلمان صرف اور صرف یہ سمجھ لے کہ قرآن حکیم کی رو سے انسانی پیدائش کس طرح ہوئی۔** کیونکہ اس ایک تصور کے بدل جانے سے پوری کی پوری تاریخ بدل جائے گی۔ اور نئی نسل یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گی کہ اگر حقیقت یہ ہے تو پھر ملائکہ کی اصطلاح کا مفہوم کیا ہے اور وہ ملائکہ کیا تھے جو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور وہ شیطان کون تھا جس نے آدم کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور وہ شجر کون سا شجر تھا جس کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا اور وہ جنت کون سی جنت تھی جس سے ہبوطِ آدم ہوا۔ اور اگر یہ سوچ پیدا ہو گئی تو پھر یہ آدم فردوس گمگشتہ میں دوبارہ داخل ہونے کے طریق پر بھی عمل پیرا ہو جائے گا — یہ انقلاب ہو تو بڑا انقلاب ہے۔ اُف! ہم کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ کاش ہم شیطان پر پتھر پھینکنے والے شیطان کی حقیقت کو جان لیں۔

یا الٰہی میرا حال دیکھ   صدا آئی اپنا نامۂ اعمال دیکھ

جنابِ محترم! ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم کتاب حکمت ہے اور جو کتاب انسانوں کو بار بار پکارے کیا تمہیں شعور نہیں کیا تمہارے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہو سکتے ہیں — اور پھر پوری نوعِ انسانی کو پکارے ہی نہیں بلکہ چیلنج دے کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو لاؤ کوئی دلیل لاؤ کوئی برہان تو اس کتاب کے لیے لازم ہے کہ وہ بذاتِ خود بھی کوئی مافوق الفطرت۔ مافوق العقل۔ مافوق البشر زبان کہے اور کیا اور کیوں کا واضح جواب دے۔ لیکن افسوس اور صد افسوس ہماری مروجہ تفاسیر اور تراجم اس دعوے پر پورے نہیں اُترتے۔ نتیجہ یہ کہ آج ہر شخص (میں نے یہاں ہر شخص کا لفظ آٹے میں نمک کے برابر معقولہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے) خواہ کوئی میڈیکل کا طالب علم ہو جسے انسانی زندگی کے ابتداء کے متعلق کالج میں کچھ اور پڑھایا جاتا ہے اور مسجد میں اور دار العلوموں میں کچھ اور یا خواہ کوئی انجنیئر ہو یا ادیب، صحافی ہو یا ایڈیٹر یا معاشیات کا ماہر یا قانون دان اور یا کوئی تعلیم یافتہ ہو یا کوئی ان پڑھ۔ (قرآن کے بیان کردہ قصۂ آدم کے تمثیلی بیان کے بجائے) حضرت آدم علیہ السلام، حوّا، ہبوطِ آدم، جنت، ملائکہ، شیطان اور ابلیس وغیرہ کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر مروجہ مفہوم میں ہی اُلجھے زندگی گزارتا ہے۔ ایک اہلِ یورپ کے مفکر نے سچ کہا تھا کہ:

• جو لوگ وحی کا دیا روشن کرنے کے لیے عقل و فکر کے دیے کو گل کر دیتے ہیں دراصل وہ دونوں کا چراغ گل کر دیتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس وقت تک خدا کی طرف سے نازل کردہ یہ کتاب، کتابِ مبین بن کر ہمارے سامنے نہیں آجاتی (جیسی کہ وہ حقیقتاً ہے) اس وقت تک ملتِ اسلامیہ میں علی وجہ بصیرت ایمان پیدا کیا

نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک کے مروّجہ تراجم، تفاسیر، روایات اور تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں قرآن حکیم کی روشنی میں از سرِ نو مرتب کریں۔ ایسی کتاب کی روشنی میں جس نے ایک ایک لفظ اور اپنی ایک ایک اصطلاح کا مفہوم تصریف الآیات کی رُو سے خود واضع اور متعین کر رکھا ہے اور پھر اس میں کوئی تضاد نہیں اور ہر لحاظ سے مکمل بھی ہے۔ آسان بھی، نُور بھی اور اس کے بعد اس کی منزہ اور مشہود تعلیم کو ہر اسلامی ملک (جسے آج کے حالات میں اسلامی ملک کی بجائے مسلمانوں کے ممالک کہنا زیادہ مناسب ہے) میں تعلیمی نصاب کا جزو بنا دیا جائے تاکہ مذہبی دارالعلوموں اور سکولوں اور کالجوں کی ثنویت ختم ہو جائے کیونکہ صحیح تعلیم کے بغیر نہ تو انسان کے شیطان کو مسلمان کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے بغیر کوئی نفسیاتی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ لہٰذا یہی وہ واحد طریق ہے جس کے ذریعے اُمّتِ مُسلمہ — اُمّتِ مسلمہ کی شکل میں دنیا کی امامت کرنے کے قابل بن سکے گی۔
یہی وہ دور ہوگا جس دور میں انسانی زندگی ہر آن نئی شان لیے رواں دواں جانبِ منزل ہوگی۔

حتیٰ کہ آئندہ کی زندگی کی سرفرازیاں بھی اس کی زندگی کا حصہ بن جائیں لیکن یہ سب کچھ ایک ایسی اذان کی رہینِ منت ہے کہ جس آواز سے اس سوئے ہوئے شبستان کا وجود صرف جاگ ہی نہیں بلکہ لرز اُٹھے۔ بقول اقبال؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس قسم کی اذان دینے کی سعادت کس خوش بخت کے حصے میں آتی ہے۔ خدا کرے کہ ہم قرآن حکیم میں چار پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کرنے والی دلکش مثال کی روشنی میں اس قابل ہو جائیں کہ پہلے خود اور پھر نوعِ انسانی کو قرآن کی درخشندہ تعلیم سے مانوس کرسکیں۔ تاکہ انسانیت مصائب و آلام کے بنے ہوئے تانے بانے اور خود ساختہ نظامِ حیات کے جال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے قابل بن جائے۔ آمین ثم آمین۔

آج مغرب کے دانشور ایسی ہی حسین دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لیے مسرت حاصل کرسکے۔ سیاسی طور پر اس سے مراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی

جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورے سے اپنے کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی رُوح کے مذہبی نشیمن میں کسی اس قسم کی حسین دنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یک جہتی ہو۔"

BEYOUND WELFARE STATE BY GUNNER MYRDAL

لیکن اِس جہانِ نو کو متشکل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ جنت سے نکلا ہُوا آدم قرآن حکیم میں محفوظ قوانین کا اسی طرح طواف کرے۔ جس طرح آج کا مسلمان کعبے کے گرد طواف کرتا ہے۔ کہاں ہم اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ۔ ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

آخر میں میری آپ کی ذاتِ خاص سے گزارش ہے

اور وہ یہ کہ جناب محترم ہماری نئی نسل میں اگر اچھے سے اچھے ادیب، ماہرِ اقتصادیات، انجنیئر، فلاسفر، سائنس دان اور اعلیٰ سے اعلیٰ عدالت کے جج بن سکتے ہیں تو کیا وہ ان علوم و فنون کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے فلاسفر نہیں بن سکتے؟ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم کے اوپر پڑے ہوئے غلط تصورات کے دبیز پردوں کو اُلٹ دیا جائے اور یہ کام آپ جیسے ناظم اور حکمرانوں کے ہی کرنے کا ہے۔ کیونکہ آپ کے پاس علم بھی ہے، اندازِ گفتگو بھی، اندازِ بیاں بھی، قلم بھی اور وسائل بھی۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ ہے کہ مندرجہ بالا گزارشات کی روشنی میں آپ کی پھیلائی ہوئی شعاعیں ہماری تاریک دنیا کو روشن کرنے میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہوں گی اور آپ گھر گھر میں دلوں کو لپیٹنے والی آگ کو ٹھنڈا کرنے میں اہلِ پاکستان کی مدد فرمائیں گے یقیناً اِس آگ کو قرآن حکیم کے ابرِ رحمت سے ہی ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے۔ جناب محترم! ممکن ہے آپ کا لگایا ہُوا پودا ملتِ اسلامیہ کے لیے سایہ فگن پیڑ کی صورت اختیار کر جائے اور پھر آنے والی نسلوں کے لیے سکون اور راحت کا باعث بنے۔ سابقہ صفحات میں میں نے جو کچھ عرض کیا ہے جنابِ محترم وہ اسی بنا پر تھا۔ میں تو جب ان حقائق کا اِس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتا ہوں تو میری یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ؎

آگہی آتی گئی، بے زباں ہوتا گیا

لہٰذا یہ ہیں اس بے زباں کی زبانی وہ گزارشات جن کی تڑپ لیے میں آپ کی خدمت میں بذریعہ خط حاضر ہوں۔ آخر میں میں اپنی دعا میں آپ کو بھی شامل کرتے ہُوئے علامہ اقبال کے الفاظ میں خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہوں کہ:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو رُوح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے
پھر شوق تماشا دے پھر ذوق تقاضا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سُوئے حرم لے چل
اِس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

ہر دَور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر دِل صورتِ مینا دے

فقط آپ کا خیر اندیش

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اور جو کوئی نہ فیصلہ کرے مطابق اس کے جو نازل کیا اللہ نے تو وہی لوگ ہیں کافر، انکاری —

(سورۃ المائدہ : آیت ۴۴)

موجودہ تعلیم کے خدوخال کی مختصر سی گفتگو کے بعد قبل اس کے کہ ہم سیاسی فرقہ بندیوں کی اندوہناکیوں کا تذکرہ کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کے اُن دو محسنوں (قائدِ اعظم اور علامہ اقبال) کی اُس رفاقت کا ذکر کر دیا جائے جن کے دیدارِ حسن کی خاطر تاریخِ مسلم ہزار سال سے انتظار میں کھڑی تھی۔

قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی رفاقت

ہمارے موجودہ دور کی مذہبی اور سیاسی "رفاقتوں اور ہم آہنگیوں" کے برعکس دوسری طرف قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی قلبی رفاقت اور ذہنی ہم آہنگی تھی جس نے کرۂ ارض پر برِ صغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ سو اس موقع پر ان عظیم اور قابلِ صد احترام ہستیوں کے باہمی ربط اور یگانگت کی ایک دو مثالیں صرف اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ شاید ہماری کور نگاہیں ان چراغوں سے کوئی روشنی حاصل کر لیں۔

قائدِ اعظم علامہ اقبال کی نظر میں

۱۹۳۵ء میں علامہ نے ایک دوست کو جس نے آپ کی صحت کی دعا کی تھی، فرمایا کہ:

"میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام بھی ملت تک پہنچ چکا ہے، میرے لیے دعائے صحت مانگنے کی بجائے آپ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور کمال اتاترک کی درازیٔ عمر کی دعا مانگیے کہ انہوں نے ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے"۔ (بحوالہ قائدِ اعظم اور قرآن۔ صفحہ ۲۰)

۱۹۳۵ء میں ہی پنڈت جواہر لال نہرو جب علامہ اقبال سے ملنے کے لیے آئے تو میاں افتخار الدین مرحوم نے حضرت علامہ سے کہا کہ لیگ کی قیادت آپ خود اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لیتے۔ اس پر انہوں نے ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر فرمایا:

"میں تو مسٹر جناح کا ایک معمولی سپاہی ہوں"

(بحوالہ "اقبال کے آخری دو سال"۔ از عاشق حسین بٹالوی صفحہ ۵۳۲)

اس کے علاوہ علامہ اقبال کے وہ الفاظ جو آپ نے قائدِ اعظم کو انگلستان سے واپس بلانے اور اہلِ ہند کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کے لیے استعمال کیے تھے ان سے کون واقف نہیں۔ آپ نے تحریر کیا تھا کہ:

"میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا

گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّت کو اپنی امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کشتی کو صحیح و سالم بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔" (بحوالہ اقبال کے خطوط جناح کے نام")

علامہ اقبال کے متعلق قائدِ اعظم کا فرمان

یہ کچھ تو علامہ اقبال نے قائدِ اعظم کے متعلق کہا تھا لیکن یہ جاننے کے لیے کہ قائدِ اعظم کی ذات علامہ اقبال کی ذات سے کس قدر متاثر تھی، اور کتنا چاہتی تھی، اس کا اندازہ قائدِ اعظم کے مندرجہ ذیل بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً آپ نے ۱۹۴۰ء میں یومِ اقبال کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک مقام پر فرمایا:

"شعراء اقوام میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اقبال نے سب سے زیادہ خدمت کی ہے کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے کہ وہ شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دے گا۔" (اس کے بعد قائدِ اعظم نے فرمایا) گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن اگر سلطنت مِل جائے اور اقبال اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو مَیں اقبال کو منتخب کروں گا۔" (بحوالہ "انقلاب" ۲۹، مارچ ۱۹۴۰ء)

قائدِ اعظم نے علامہ اقبال کی وفات کی خبر سُن کر اپنے تعزیتی بیان میں جو کچھ کہا، وہ ہم سب کے لیے قابلِ غور ہے۔ فرمایا:

"مجھے سر محمد اقبال کی وفات کا سُن کر رنج ہُوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت ممتاز شاعر تھے اور ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انہوں نے اتنی بہت سی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جاسکتا ہے جو کبھی پیدا ہُوا ہو، حال تک وہ پنجاب کی صوبہ وار مسلم لیگ کے صدر تھے جبکہ ایک غیر متوقع علالت نے انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے حامی تھے۔ **میرے لیے وہ ایک رہنما تھے** ۔ دوست اور فلسفی اور تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انہوں نے اس کامل اتحاد کا

ذکر پڑھا یا سنا ہو گا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدین کے مابین ہو گیا اور آج میں فخر و مباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب پورے طور پر اب لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے علم تلے آچکے ہیں جو یقیناً سر اقبالؒ کے لیے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور عمیق ترین ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں۔ اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو مہیب نقصان پہنچا ہے۔" لہ

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۰ء میں "یومِ اقبالؒ" کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کو ان الفاظ میں یاد فرمایا:

"اقبال میرا پرانا دوست تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتداء میں ایک علمی سی جماعت تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں ۱۹۳۶ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا، وہ اقبال تھا۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کیے۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور اس وقت سے تادمِ مرگ وہ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ علامہ اقبال عظیم انسان اور بلاشبہ بہت بڑے فلاسفر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی، اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے لیکن دنیا میں شاعرِ اعظم کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انہوں نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں ریل کا سفر کر رہا تھا۔ راستہ میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے، کہ دفعتاً ان سب نے اقبالؒ کا ترانہ پڑھنا شروع کر دیا"

۱۹۴۰ء کے بعد ۱۹۴۱ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ:

"اگر میں اس تقریب میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبال کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا

لہ سب رس (اقبال نمبر) جون ۱۹۳۸ء جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۹۶۔ بحوالہ کتاب "علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے سیاسی افکار" از محمد حنیف شاہد صفحہ ۲۹۷

موقع ملا ہے۔ اقبال کی ادبی شہرت عالمگیر ہے کہ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکر عظیم تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں اقبال سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔"

(ہفتہ وار "حمایت اسلام" ۴ مارچ ۱۹۴۰ء)

رفاقت کی اصل وجہ

ان تصریحات کی روشنی میں

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال رح نے قائدِ اعظم کا اور قائدِ اعظم رح نے اقبال کا سپاہی بننا کیوں گوارا کیا تو اس کا جواب صرف اور صرف یہ تھا کہ ان میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں جیسا اتحاد نہ تھا بلکہ یک نگہی اور قرآنی یک رنگی کی بنا پر وحدت تھی جس کا اظہار قائدِ اعظم نے ان الفاظ میں کیا ہے آپ نے یومِ اقبال کی تقریب منعقدہ لاہور ۹ دسمبر ۱۹۴۴ء کو اپنے پیغام میں فرمایا اور وہ یہ کہ:

"اس سے (آپ کی شاعری سے) ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کس قدر سرشار اور اس کے کس حد تک وفاشعار تھے۔ وہ حضور نبی اکرمؐ کے ایک سچے اور پُرخلوص متبع تھے وہ اوّل بھی مسلمان تھے اور آخر بھی مسلمان۔ وہ ترجمان الاسلام بلکہ صوت اسلام تھے۔ لہٰذا میں اقبال ڈے کی اس تقریب میں عمیق قلب سے شریک ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے اس ملی شاعر کے پیش کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں تاکہ جب مملکتِ پاکستان متشکل ہو تو ہم ان نظریات کو عملی قالب میں ڈھال سکیں۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" نومبر ۱۹۸۳ء)

لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اقبال کے اس خواب کو عملی شکل دیں تو پھر ہمیں ہر قسم کی فرقہ بندی کو ختم کرتے ہوئے آپس میں اتحاد کی بجائے یگانگت کو اپنانا ہوگا۔ کیونکہ قرآنِ حکیم نے اتحاد کی بجائے یگانگت کا ہی سبق دیا ہے اور یقیناً اس قسم کی یگانگت قرآنی تعلیم کے بغیر کوئی اور تعلیم پیدا کر نہیں سکتی۔

ایک دردِ دل کی پکار

ہم نے قائد اور علامہ اقبال کے اس حسین خواب کو کس حد تک پورا کیا، اس کا اندازہ ہمیں جناب محمد یوسف

گورایہ صاحب سابق ڈائریکٹر محکمہ اوقاف کی اس تحریر سے ہو سکے گا جو آپ نے اپنی آنکھوں کی شبنم سے تحریر کی ہے

"حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی سرزمین پر تو مخالفانہ قبضہ کر لیا گیا اور اس کے اخوت، مساوات اور حریت کے اشعار کو ریڈیائی لہروں کے ذریعے ہوا اور فضا میں تحلیل کر دیا گیا۔ یعنی مصورِ پاکستان کی پاک سرزمین تو قبضہ مخالفانہ میں چلی گئی اور اس کی فضا اقبال کے لیے چھوڑ دی گئی۔ اقبال پاکستان کا مصور ہے تو پاک سرزمین اُس کے تصور کا بیج چاہتی ہے۔ کوئی تصور حقیقت کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ جب تک اُسے اُگنے، نشو ونما پانے اور پھلنے پھولنے کے لیے زمین میسر نہ ہو۔ مگر یہ اقبال کے ساتھ بے انصافی ہے کہ اس کے تصور کو ہوا میں تحلیل کر دیا جائے اور طعن دیا جائے کہ وہ بے برگ وبار ہے۔ پاکستانی قوم کی اپنے محسن کے ساتھ بے وفائی کی یہ بدترین مثال ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے اس قوم کو فرقہ واریت، صوبائیت، لسانیت، علاقائیت، غربت، جہالت اور بیماری کے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اب آخری چارہ کار یہ رہ گیا ہے کہ قوم اپنی بے وفائی کا کفارہ ادا کرے۔ اپنے محسن سے معافی مانگے۔ جتنا پاکستان باقی رہ گیا ہے، اس کے حفظ و بقاء وحدت و یک جہتی اور تعمیر و تشکیل کے لیے علامہ اقبال نے جو تعمیری، فکری اور تخلیقی مواد جمع کیا تھا اسے استعمال میں لائے۔ علامہ اقبال کے تعمیری مواد میں اتنی قوت، طاقت اور توانائی موجود ہے کہ شکستہ پاکستان کو بھی ایک متحدہ، مضبوط اور مستحکم جدید اسلامی ریاست میں بدل سکتا ہے۔ علامہ کے عقیدت مندوں کو اس خوف سے اپنے آپ کو آزاد کر لینا چاہیے جو تحریکِ پاکستان کی شکست خوردہ ذہنیت نے اب دوبارہ پیدا کر رکھا ہے۔ اگر علامہ کے عقیدت مند اسی جذبے اور ولولے سے سرشار ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں جو اُن میں تحریکِ پاکستان کے دوران پیدا ہوا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تعمیرِ پاکستان کے اس عمل کو اسی طرح کامیاب نہ ہوں جس طرح تحریکِ پاکستان کے وقت بھی مسلمانوں کو اپنی ہی صفوں سے خطرہ لاحق ہوا تھا، تعمیرِ پاکستان کے دوران بھی یہ خطرہ جتنا اپنوں نے پیدا کر رکھا ہے اتنا بیگانوں سے نہیں۔ لہٰذا قوم کو ہمت سے کام لے کر علامہ کے افکار کے مطابق پاکستان کو ایک جدید اسلامی ریاست بنانے کے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۹۶ء)

اس گفتگو کے بعد قارئین کی خدمت میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے دراصل وہ جناب گورایہ صاحب کے بیان کی ہی وضاحت میں ہو گا۔ جس میں ہم دیکھیں گے کہ ہم نے قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کے نخلِ تمنا کی ایک ایک پتی کو کس طرح نوچا

ستر ھواں باب

پاکستان کے سابق حکمران کردار کے آئینہ میں

اس میں شک نہیں کہ قوموں کے عروج زوال کا بہت زیادہ انحصار اس قوم کی اپنی اجتماعی سوچ اور اُن کے اپنے اس عمل کا بھی رہین منت ہوتا ہے جس عمل کی وہ قوم از خود مالک ہو۔ لیکن اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں کہ کسی قوم کی سوچ اور کردار کے دھارے کو بدلنے کے لئے رہنمایان قوم کے ذاتی افعال اس کی اپنی تربیت اور اس کے اپنے نظریات بھی اثر انداز ہوتے ہیں حتیٰ کہ کسی رہنما کی ایک خفیف سی غلطی بھی اس قوم کے مستقبل پر اثرات مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ایک حکایت ہے کہ

بارش کے دوران کسی شخص نے ایک بچے کو پیچھے سے آواز دی کہ "بیٹا بارش ہو رہی ہے سنبھل کر چلنا کہیں گر گئے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی اور سفر زندگی میں ناکارہ ہو جاؤ گے۔"

بچے نے جب پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا تو آواز دینے والی ملک کی ایک اہم ترین شخصیت تھی چنانچہ بچے نے اس شخصیت سے مخاطب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"جناب محترم اگر میں گرا تو صرف میری ذات متاثر ہو گی۔ آپ سنبھل کر چلئے کیونکہ اگر خدانخواستہ آپ گر گئے تو پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔"

قرآن حکیم نے نا عاقبت اندیش رہنمایان قوم کے انجام کے متعلق ایک جگہ فرمایا

ارشاد خداوندی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ ۱۴/۲۸

(اقوام عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور) ان راہنمایانِ قوم کی حالت پر غور کرو جنہیں اللہ نے زندگی کی خوشگواریاں اور فراوانیاں عطا کیں۔ لیکن انہوں نے ان کی قدر نہ کی (ان کا غلط استعمال کیا) اور اپنی قوم کے کارواں کو ایسی منڈی میں لا کر کھڑا کر دیا جس میں ہر

طرف کساد بازاری تھی۔ جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہ تھا۔ ۱۳/۲۸ - ۹/۱۲۴

لہٰذا ارشاد ربانی اور مندرجہ بالا حکایت کی روشنی میں اگر یہ جاننا مقصود ہو کہ پاکستان کے سابق حکمرانوں نے اپنا اپنا دورِ اقتدار کس "حسن و خوبی" سے گزارا اور مملکت پاکستان کے ان ناخداؤں نے اہلِ پاکستان کے اس سفینہ کو کس قسم کی تلاطم خیزیوں سے دوچار کئے رکھا اور آج یہ کس کٹھن منزل پر کھڑا ہے تو اس سلسلہ میں پاکستان کی جانی پہچانی صاحب قلم شخصیت آئی۔سی۔ایس قدرت اللہ شہاب جو حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اپنی کتاب شہاب نامہ میں سابقہ حکمرانوں کے نقشے کچھ اس طرح اتارتے ہیں۔

مسٹر غلام محمد کی شخصیت

"سیکرٹری کی پوسٹ کا چارج لینے کے بعد کئی روز تک میں خاموشی سے اس شخصیت کا جائزہ لیتا رہا جس کے ساتھ اب مجھے دن رات پالا پڑنے والا تھا۔ مسٹر غلام محمد کافی عرصہ سے فالج کے مریض تھے۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا۔ وہ چند قدم سے زیادہ چلنے پھرنے سے قطعاً معذور تھے اور اکثر مریضوں والی پہیہ دار کرسی میں بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا گشت کیا کرتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ مزید کچھ لکھنے کے قابل نہ تھے۔ فالج نے ان کی زبان اور چہرے کو بھی متاثر کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی گفتگو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اُس کے دہن کا عضلاتی نظام اس قدر کمزور ہو گیا تھا کہ جب وہ کھانے پینے کی کوئی چیز اپنے منہ میں ڈالتے تھے تو اس کا کچھ حصہ دونوں کونوں سے باہر گرتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں جب کوئی غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورنر جنرل کے ساتھ لنچ بھی کھلایا جاتا تھا۔ سٹاف ممبر بھی لنچ میں شریک ہوتے تھے جس وقت مسٹر غلام محمد لقمہ منہ میں ڈال کر نئے سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے وہ سماں بڑا عبرتناک ہوتا تھا۔

دہن کے علاوہ اُن کا مزاج بھی پل پل میں تولہ ماشہ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی گرم، کبھی سرد، کبھی نرم، کبھی سخت لیکن میرا خیال ہے کہ اُن کے مزاج کی گرمی، نرمی اور سختی میں کم مدکم ہوتی تھی اور آورد زیادہ۔ وہ دوسرے پر رعب گانٹھنے کے لئے محض تفننِ طبع کے طور پر گیدڑ بھبکیوں سے کام لینا شروع کرتے تھے۔ آواز بلند کرکے اپنے اوپر بناوٹی غصّہ طاری کرنا اُن کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ بلڈ پریشر کا عفریت اُن کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا اور اصلی غصّہ اُن کے حواس پر قابو پا لیتا تھا۔ اُن کے منہ سے جھاگ نکلنے لگ جاتی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو جاتے تھے اس نوعیت کے نظارے بڑے ناگفتہ بہ ہوتے تھے۔

مسٹر غلام محمد کے کردار میں کسی قسم کی کوئی آئیڈیل اِزم نہ تھی۔ اُن کے مقاصد میں اوّلیت کا شرف، ہوسِ اقتدار

کو حاصل تھا۔ دوسرے درجہ پر صنفِ نازک کی طرف ان کا شدید رجحان تھا جو اکثر مریضانہ حد تک پہنچ جایا کرتا تھا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہ خود غرضی، خودسری، ہٹ دھرمی، دھونس، دھاندلی اور ایچ پیچ سمیت ہر قسم کا حربہ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے...... یہ مفلوج، معذور اور مغرور شخص ایسی مٹی سے بنا ہوا نہیں تھا کہ گورنر جنرل کے سنہرے اور آہنی پنجرے میں بند ہو کر صبر و شکر سے بیٹھا رہ

صـ ۸۱۷ ۱۰۔۹۹

صدر ایوب کی ذات وصفات

صدر ایوب کا المیہ یہ ہے کہ وہ سیاست دانوں کے خلاف گرجتے برستے، ان پر لعن طعن کرتے اور اُن کے خلاف نفرت و حقارت کے نعرے لگاتے کرسئ اقتدار پر قابض ہوئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے لنگر لنگوٹ کس کر بذاتِ خود سیاست کے اکھاڑے میں اُتر آئے اور یہیں پر عوام، افواج اور سیاست دانوں کے داؤ پیچ نے انہیں چاروں شانے چت مار گرایا اور گھسیٹ کر اقتدار کے اکھاڑے سے نکال باہر پھینکا۔ معاشرے کو سیاسی جماعتوں سے نجات دِلانا اُن کا بلند بانگ دعویٰ تھا۔ لیکن مارشل لاء اُٹھے ہوتے ابھی چالیس دن بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ صدر کی منظوری کے ساتھ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ جاری ہوا۔ جس کی رو سے اسمبلیوں کے اندر اور باہر سیاسی جماعتیں از سرِ نو بحال ہو گئیں۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی صدر ایوب اپنے نام نہاد انقلابی نصب العین کے بلند پایہ ستون سے لُڑھک دھڑام سے نیچے گرے اور سیاست کی اسی دَلدَل میں آ پھنسے جس کی سڑاند اور عفونت مٹانے کے لیئے انہوں نے مارشل لاء کا سارا کھڑاگ کھڑا کیا تھا۔

صدر ایوب کی شخصیت چنار کے درخت کی طرح خوبصورت، تناور اور شاندار تھی۔ لیکن گرتے وقت اس کا تنا کافی حد تک کھوکھلا ہو چکا تھا۔ ذاتی طور پر وہ نیکی، شرافت، عمل پسندی اور رحمدلی کے خوگر تھے اقتدار میں آ کر انہوں نے ایک محنتی طالب علم کی لگن سے اپنا کام سیکھا اور اس میں نمایاں مہارت حاصل کی۔ ان کی رَگ رَگ میں حُبّ الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خارجہ پالیسیوں میں نئے زاویے قبول کر کے انہوں نے دنیا بھر میں پاکستان کا وقار بلند کیا۔ اندرونِ ملک انہیں زرعی، صنعتی اور تجارتی ترقی کو بامِ عروج تک پہنچانے کا جنون تھا ان شعبوں میں انہوں نے اتنی کامیابی ضرور حاصل کی کہ بہت سے لوگ ان کے دورِ حکومت کو پاکستان کی مادی ترقی کا سنہری زمانہ کہتے ہیں۔"

آیئے! ایک اور قائد کا حال دیکھیں

یحییٰ خاں کی کہانی

جب یحییٰ خاں اپنے بے ضمیر باطن کی اندھیر نگری سے چوپٹ راجہ بن کر ارضِ پاک پر نازل ہُوا تو میرے اندر ایک دبے ہوئے جنون نے بھی کروٹ لی۔ اس شخص کو میں مدت سے پہچانتا تھا۔ اس کی پیشانی پر بے برکتی اور بد توفیقی کی ایک واضح مہر ثبت تھی۔ جن دنوں آزاد کشمیر کا جہاد زوروں پر تھا۔ یحییٰ خاں کسی سلسلے میں پونچھ فرنٹ کی طرف آیا۔ میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹری جنرل تھا۔ پلندری اور تراڑ کھیل کے ایک پہاڑی جونجال ہِل پر ہمارا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ یہاں پر چند کچے مکان تھے۔ جن میں آزاد کشمیر کے صدر، وزراء اور دوسرے ملازمین کی رہائش گاہیں اور دفاتر تھے۔ دن کے وقت سیکرٹریٹ کا کام عموماً درختوں کے سائے تلے ہوتا تھا کسی کے پاس ٹوٹی ہوئی کرسی تھی، کسی کے پاس چوبی اسٹول، کوئی پتھروں کا چبوترا بنا کر بیٹھتا تھا، کوئی گھاس پر نیم دراز ہو کر فائلیں چلاتا تھا۔ دن میں کئی بار ہندوستان کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے گزرتے تھے، کبھی کبھی ان کی پرواز اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ پائلٹ کا چہرہ تک نظر آنے لگتا تھا۔

ایک روز ہم کوئی میٹنگ کر رہے تھے کہ ایک گول مٹول سا فوجی جیپ سے اُتر کر ہمارے پاس آیا، چہرے پر سوجن اور آنکھوں میں گندے انڈے کی اُبلی ہوئی زردی سی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بید کی چھڑی اور دوسرے میں چمڑے کا گول تھیلا تھا۔ آتے ہی اُس نے اپنی چھڑی میری ناک کے عین سامنے گھمائی اور قدرے ڈانٹ کر پوچھا، "یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟" میں نے عرض کیا یہ آزاد جموں و کشمیر گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ ہے۔

یہ سُن کر اس کی توند تسلے میں پڑی ہوئی باسی اوجھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوں غوں غاں کی کچھ رندھی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں یہ اس بات کی دلیل تھی کہ آغا محمد یحییٰ خاں صاحب ازراہِ تمسخر قہقہہ فرما رہے ہیں ہمارے سیکرٹریٹ کی ہیئت کذائی پر چند تحقیری اور تضحیکی پھبتیاں کسنے کے بعد آغا صاحب پور ہو گئے اور کچھ دُور پرے جا کر درختوں کی اوٹ میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اپنا تھیلا کھول کر انہوں نے کچھ سینڈوچ نوش فرمائے اور پھر پیاس بجھانے کے لئے غالباً بیئر کی بوتل نکالی۔ رمضان کے دن تھے۔ یہ دیکھ کر میرا پونچھی اردلی جلال میں آ گیا۔ اور اُس نے دُور ہی دور سے انہیں للکارا، "خبردار صاحب! یہ حرام بند کرو۔ ابھی ابھی پیندھر کی وادی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے قبضے میں چلی گئی ہے، اب خدا کے غضب کو اور نہ بلاؤ، بوتل توڑ دو، ورنہ پھر خون خرابہ ہو جائے گا۔" یحییٰ خاں نے بوتل تو نہ توڑی، لیکن جلدی جلدی سامان سمیٹ کر زیرِ لب بڑبڑاتا ہُوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

کئی برس بعد مجھے یحییٰ خاں کی زیارت ایک اور رنگ میں ہوئی۔ جب پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی اور اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا تو ارباب پنڈی کلب نے کراچی سے تازہ واردان بساط ہوائے دل کی خیرسگالی کے لئے ایک زبردست محفل ناؤنوش منعقد کی، مارشل لاء کا بول بالا تھا۔ کئی سول سرونٹ چند کلیدی فوجی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ بیگمات بھی اس مہم میں اپنے خاوندوں کا ہاتھ بٹانے کے لئے سج دھج کر شریکِ محفل تھیں۔ اس انجمن میں یحییٰ خاں چہک چہک کر، پھدک پھدک کر کبھی ایک بیگم، کبھی دوسری بیگم سے ٹکراتا تھا۔ بڑی محنت مشقت کے بعد اس نے ایک طرحدار خاتون کو پھانسا اور اُسے گھیر گھار کر باہر لان میں لے گیا کچھ دیر آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا رہا، بدمستی کے عالم میں یحییٰ خاں کی ہیجانہ ہنہناہٹ اور طرحدار خاتون کے نرم و نازک قہقہے، اندر بیٹھے ہوئے دوسرے اُمیدواروں کی چھاتی پر مونگ دلتے رہتے۔ پھر زور کا دھماکہ ہوا اور سب لوگ بھاگ کر باہر آ گئے۔ خاتون ایک میز پر ٹانگیں لٹکائے شیمپین کا جام پی رہی تھی، لیکن غریب یحییٰ خاں کسی کرسی سے ٹکرا کر ادھ موئے دُنبے کی طرح زمین پر چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔ یار لوگوں نے دھکیل دھکال کر اسے اٹھایا وہ حنوط شدہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور کسی نے اس کی پتلون اوپر کھینچ کر توند کے نشیب پر از سرِ نو فٹ کی۔"

ایک صدر اسکندر مرزا اچانک میرے کمرے میں آئے اور بولے: "تم زُلفی کو جانتے ہو؟"

صدر اسکندر مرزا صاحب اور ذوالفقار علی بھٹو صاحب ۵

یہ نام میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو وہ بڑے حیران ہوئے اور پھر کہنے لگے "تعجب ہے، تم زُلفی کو نہیں جانتے، بڑا اسمارٹ لڑکا ہے۔ آج کل کراچی کی نائٹ لائف اِسی کی وجہ سے چمکی ہوئی ہے۔ میں نے کراچی کی نائٹ لائف کی رونق سے بھی اپنی محرومی کا اقبال کیا تو صدر اسکندر مرزا نے مجھے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک نوجوان بیرسٹر ہے۔ بڑا پڑھا لکھا آدمی ہے۔ سندھ کے امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، کتابیں جمع کرنے کا شوقین ہے وہ ایوان صدر کی لائبریری میں سندھ کے متعلق جو بہت سی کتابیں ہیں اُنہیں دیکھنا چاہتا ہے۔ صدر مرزا نے مجھے ہدایت کی کہ میں ٹیلیفون کر کے اس نوجوان کو اپنے پاس بلاؤں۔"

صدر ضیاء الحق کا دورِ حکومت

ان شخصیات کے تذکرے کے بعد اب ہم صدر ضیاء الحق کے مارشل لاء کی طرف آتے ہیں جس کے متعلق جناب محترم حقانی صاحب اپنے ایک کالم میں رقم طراز ہیں کہ:۔

۵ جناب بھٹو صاحب کے متعلق ۔۔ ۱۰ ۔۔ صفحہ 585 پر ملاحظہ فرمائیں۔

صدر ضیاء الحق کے مارشل لاء دور پر پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق کا تبصرہ

مارشل لاء دور کی زیادتیوں کی کوئی شہادت درکار ہے تو صرف اس فاضل جج کا تازہ ترین بیان ہی پڑھ لیجیے جس نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کی توثیق کی تھی۔ ایک ماہنامہ کو انٹرویو دیتے ہوئے پاکستان کے سابق چیف جسٹس انوار الحق نے اگلے ہی روز کہا ہے۔

"مارچ ۱۹۸۱ء میں عبوری آئین کے حکم کے نفاذ کے بعد سے جنرل محمد ضیاء الحق کا تمام دور حکومت قطعی طور پر غیر آئینی تھا۔ یہ غیر آئینی دور پاکستان کی عدلیہ کے لئے تاریک ترین دور تھا اور اس عہد میں سپریم کورٹ اور ہائیکورٹوں کے ججوں پر جو کچھ گزری وہ پاکستان کے کسی فوجی ڈکٹیٹر کے عہد میں نہیں گزری تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اس غیر آئینی نوعیت کی وجہ سے پاکستانی عدلیہ کے سات ججوں نے ضیاء الحق کے عبوری آئین کے حکم (پی سی او) کے تحت حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا جب کہ بارہ ججوں سے خود حکومت نے اس آئین کا حلف نہ لینے کا فیصلہ کر کے انہیں عدالتوں سے نکال پھینکا تھا۔ اس طرح پی سی او کے نفاذ پر سپریم اور ہائیکورٹوں کے ۱۹ جج عدلیہ سے الگ ہو گئے تھے جن بارہ ججوں سے حلف نہ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا انہیں آج تک یہ بتانے کی زحمت نہیں کی گئی کہ ان کا قصور کیا تھا۔

شیخ انوار الحق نے دعویٰ کیا کہ بلا وجہ اور بلا جواز نکالے جانے والے یہ جج صاحبان آج بھی تلافی کے لئے چارہ جوئی کر سکتے ہیں اور ضیاء الحق کے اس آٹھ سالہ طویل غیر آئینی عہد حکومت کو بھی عدالتوں میں چیلنج کیا جا سکتا ہے جناب انوار الحق نے انکشاف کیا کہ پاکستان کے کسی فوجی ڈکٹیٹر نے اعلیٰ عدالتوں کے ججوں سے اتنا آمرانہ سلوک نہیں کیا جتنا ضیاء الحق نے کیا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے زمانے میں صرف ایک جج (مرحوم جسٹس اخلاق حسین) کے خلاف منصب سے برطرفی کی کارروائی ہوئی تھی اور یہ کارروائی بھی خود سپریم کورٹ کی سفارش پر ہوئی تھی اس کے بعد یحییٰ خان نے ججوں سے ان کی آمدن اور جائیداد کے گوشوارے طلب کر کے ان کی چھان بین کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کا چیئرمین بھی ایک ریٹائرڈ جج کو ہی مقرر کیا تھا مگر پاکستان کی عدلیہ نے اس کمیٹی کو قبول نہیں کیا کیونکہ "سپریم جوڈیشل کونسل" کی موجودگی میں یہ کمیٹی ججوں کی توہین تھی۔ چنانچہ اس وقت کے چیف جسٹس، جسٹس حمود الرحمٰن نے تین سینئر ججوں کے وفد کے ہمراہ یحییٰ خان سے اس مسئلہ پر بات چیت کی۔ جس پر یحییٰ خاں بھی گوشواروں کی چھان بین کو کمیٹی کی بجائے "سپریم جوڈیشل کونسل" کے سپرد کرنے پر رضامند ہو گیا اس کونسل نے صرف دو ججوں کے گوشواروں پر عدم اطمینان کا اظہار کیا جس پر ایک جج نے تو احتجاجاً استعفےٰ دے دیا جب کہ دوسرے نے الزام کا مقابلہ کیا۔ شیخ انوار الحق نے تسلیم کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے آئینی ترمیم کے ذریعے اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کم ضرور کئے مگر کسی جج کو غیر آئینی کارروائی کا نشانہ نہیں بنایا۔

ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے پی سی او کے تحت حلف کیوں نہ اٹھایا؟ اس کے جواب میں جناب انوار الحق نے کہا کہ: ججوں کو جو حلف لینے کے لیے کہا گیا وہ انتہائی توہین آمیز تھا۔ مزید برآں پی سی او کے نفاذ کا مقصد صرف یہ تھا کہ نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو ختم کیا جائے کیونکہ اس کی وجہ سے مارشل لا حکام کے اختیارات محدود ہو رہے تھے۔ چنانچہ سات ججوں نے ازخود حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے عدلیہ کی توہین کے پیش نظر اپنے ذہن اور ضمیر کو آلودہ کرنا پسند نہ کیا۔ جن بارہ ججوں سے حلف نہیں لیا گیا وہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ناپسندہ جج تھے۔ یہ پاکستان کی عدلیہ کا بدترین حادثہ تھا۔ سابق چیف جسٹس سے دریافت کیا گیا کہ بیگم نصرت بھٹو کیس میں آپ نے مارشل لاء کو تحفظ دیا جنرل ضیاء نے اس فیصلے کو اپنے لئے ڈھال بنایا۔ اس پر آپ کیا تبصرہ کریں گے؟ جناب انوار الحق نے جواب دیا کہ نصرت بھٹو کیس کا فیصلہ اس وقت کے حالات کے تحت ملکی مفاد میں تھا۔ مگر اس فیصلے میں کچھ شرائط بھی رکھی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بدستور قائم ہے۔ صرف بعض دفعات معطل ہیں۔ مارشل لاء کے نفاذ کو ایک محدود مدت اور ایک مخصوص مقصد کے لئے جائز قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ مارشل لاء حکام آئین کے تحت انتخابات کرا کر بیرکوں میں واپس جائیں۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے چھ سے آٹھ ماہ تک کی مہلت مانگی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ ملکی آئین کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا۔ صرف بعض دفعات معطل رہیں گی۔ مزید برآں نصرت بھٹو کیس کے فیصلہ میں اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات بھی برقرار رکھے گئے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے اس فیصلہ اور عدالتی اختیارات کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ دنیا میں اس کی تشہیر بھی کی۔ ۱۹۸۱ء تک اس فیصلے پر عمل بھی ہوتا رہا۔ لیکن اس دوران مارشل لاء حکام نے محسوس کیا کہ رٹ پٹیشنوں کے ذریعے مارشل لاء حکام کے فیصلے ختم کرا دیئے جاتے ہیں اور یہ بات ان کے اختیارات پر قدغن ہے وہ جیسے تیسے تین سال تک تو فیصلہ کی پابندی کرتے رہے بالآخر ۲۴، ۲۵ مارچ کی درمیانی شب کو پی سی او نافذ کر دیا گیا اور صرف ججوں کو ہی مجبور کیا گیا کہ وہ اس کے تحت حلف اٹھائیں۔ حالانکہ اگر یہ عبوری آئین تھا تو ان تمام افراد کو اس کا حلف اٹھانا چاہیئے تھا۔ جو آئین کا حلف اٹھانے کے پابند ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اس کا مطلب صرف اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات سلب کرنا اور عدلیہ کی آزادی کو ختم کرنا تھا ان سے پوچھا گیا کہ آپ سپریم کورٹ کے سربراہ ہونیکے باوجود مارشل لاء حکام کے عزائم کا اندازہ کیوں نہ لگا سکے؟ سابق چیف جسٹس نے کہا کہ میں نے مارشل لاء حکام کو سمجھایا کہ مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ یا سی تھی، ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں دھاندلی کی سزا حکمران پارٹی کو آپ نے دے دی ہے لیکن عوام کے حقوق آپ غصب نہیں کر سکتے اگر آپ ایسا کریں گے تو اس سے بے چینی پھیلے گی۔ بہر حال مجھے پی سی او کے نفاذ کا گمان تک نہیں تھا۔ اس کا نفاذ تو شب خون مارنے کے مترادف تھا اور میرے نزدیک پی سی او کے نفاذ کے بعد جنرل ضیاء الحق کا

دور غیر آئینی تھا۔ یہ طاقت کے بل بوتے پر قطعی آمرانہ انداز میں حکومت کا دور تھا۔ اس لئے میں نے تحریری طور پر پی سی او کے تحت حلف لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ جنرل ضیاء الحق سے یہ بھی کہا کہ پی سی او کے لفاذ سے پہلے آپ کم از کم عدلیہ کے سربراہ سے مشورہ تو کر لیتے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش رہے مگر پھر کہا خدشہ تھا کہ آپ لوگ خفگی محسوس کریں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ اچھا کام کرتے تو ہم خفگی کیوں محسوس کرتے؟ بہر حال میں نے حلف اٹھانے کی بے ضمیری برداشت کرنے سے گھر بیٹھ رہنا زیادہ بہتر سمجھا۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۳ر نومبر ۱۹۸۸ء)

مسٹر جسٹس جاوید اقبال کا تبصرہ

سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج مسٹر جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال[1] نے اپنی ریٹائرمنٹ پر ریفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ضیاء الحق کے دور حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ضیائی دور استبداد میں عدلیہ کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا جو عدلیہ سے وابستہ رہے معتوب ٹھہرے جو فارغ ہو گئے وہ شہر چھوڑ کر گئے "غازی بن گئے"۔

تحریک استقلال کے جنرل سیکرٹری کا بیان

خورشید محمود قصوری سیکرٹری جنرل تحریک استقلال کی نظر میں ضیاء الحق صاحب کا دورِ حکومت کچھ اس قسم کا تھا کہ ضیاء الحق نے عدالتوں کے اختیارات سلب کئے اور اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو ایڈہاک ازم کے دائرے میں جکڑے رکھا۔ ضیاء الحق کے اقدامات نے وفاق کو کمزور کیا۔ وفاق اور صوبوں کے تعلقات میں زبردست ضعف پیدا ہوا اور ملک میں کنفیڈریشن کے نعرے سنائی دینے لگے۔ ملک گیر سیاسی جماعتوں کی بجائے انہوں نے لسانی اور علاقائی گروہوں کی جان بوجھ کر سرپرستی اس لئے کی کہ ان کی نگاہ میں ہر سیاسی جماعت ان کے اقتدار کے دوام کے لئے خطرہ بن سکتی تھی۔ صدر ضیاء الحق ملک میں ایک ایسی (ملائی ریاست) ریاست قائم کرنا چاہتے تھے جو ان کے اقتدار کے استحکام اور دوام کی ضمانت بن سکے چنانچہ اپنی پسند کے مذہبی عقائد پر مبنی اسلام کا تصور پیش کر کے بعض علماء اور مشائخ کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں وہ ان لوگوں سے اپنے اقدامات کے حق میں فتویٰ لیتے رہے یہاں تک کہ بعض علماء نے مارشل لاء کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس کے ڈانڈے اسلام

---

[1] اس کے بعد صدر ایوب کے متعلق فرمایا کہ "ایوب خانی دور میں آئین کی نا تحریر پڑھی گئی تو عدلیہ کے غروب کی داستان بھی شروع ہوئی۔"

بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۵ ۱۰/ ۸۹

کے دور اوّل سے جا ملائے، ملک میں علماء اور مشائخ کی کانفرنسوں کے انعقاد کا مقصد اسلام کا فروغ اور نفاذ نہ تھا بلکہ مذہبی طبقے کی حمایت حاصل کرکے اپنے اقتدار کو دوام بخشنا تھا۔ انہوں نے بعض دینی مدارس کو زکوٰۃ فنڈ سے بھاری رقوم دیں۔

ضیاء الحق کی قرآن فہمی کے متعلق ڈاکٹر سید عبدالودود کا بیان

ضیاء الحق مرحوم ذہنی طور پر فکرِ قرآنی کو کس حد تک سمجھتے تھے اس کے متعلق پاکستان کے مشہور سائنس دان اور عالمی شہرت یافتہ کتاب "مظاہر فطرت اور قرآن" کے مصنف اپنے ایک تفصیلی مضمون "صدر ضیاء الحق مرحوم کا نفاذ اسلام حقیقت یا سراب" کے آخر پر لکھتے ہیں کہ

"صدر ضیاء الحق مرحوم ذاتی طور پر (بظاہر) سچے مسلمان تھے لیکن ان کے نظام اسلام کے قیام کی کوشش ایک ناسمجھ بچے کی کوششوں جیسی تھیں۔" (بحوالہ طلوع اسلام نومبر ۱۹۸۹ء)

صدر کی اسلامائزیشن پر حقانی صاحب کا تبصرہ

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا یہ خیال کہ صدر ضیاء الحق کی کوششیں ایک ناسمجھ بچے کی کوشش جیسی ہیں" کس حد تک صحیح ہے اس کا اندازہ قارئین یا آنے والا مورخ خود لگا سکے گا البتہ جناب ارشاد احمد حقانی کا اس سلسلہ میں کہنا یہ ہے کہ:۔

"صدر صاحب نے علماء اور عوام کو ساتھ لے کر چلنے کی جو بات کی ہے ہماری دانست میں حقیقت ایک حد تک اس کے برعکس ہے انہوں نے جس انداز اور نوعیت کی اسلامائزیشن آٹھ نو سال میں کی ہے اس میں علماء تو وہ ایک حد تک ساتھ لے کر ضرور چلے ہیں، عوام کو ان سے بھی کم وہ ساتھ لے سکے ہیں۔ انہوں نے اپنے اسلامائزیشن کے عمل میں علماء کو جس قدر پیش نظر رکھا ہے، عوام کو اس قدر نہیں رکھا۔ حدود آرڈیننس کا اجراء شرعی عدالتوں کا قیام اور ان میں علماء کا تقرر علماء کی تکریم میں اضافہ، سود کے حقیقی خاتمہ کی بجائے اس کا نام بدلنے کی کوشش اور ریڈیو اور ٹی وی پر اذانوں کا نشر کیا جانا، علماء اور مشائخ کو مدعو اور ان کی خاطر مدارات کرنے والی ان گنت اور لاتعداد کانفرنسیں، زکوٰۃ کی تحصیل اور بالخصوص تقسیم کا نظام ..... یہ سب اقدامات علماء کو ساتھ لے کر چلنے اور انہیں مطمئن اور راضی کرنے والے اقدام ہیں۔ عوام اور ان کے مسائل پر ان کا کوئی بڑا اور براہ راست اثر نہیں پڑا۔

نہ زرعی اصلاحات کی ضرورت ہے نہ زرعی ٹیکس لگانے کا کوئی جواز

اس کے بعد حقانی صاحب لکھتے ہیں "تو مارچ ۱۹۸۵ء کو آر سی او کے نفاذ کے بعد جناب صدرِ مملکت نے "جنگ" کے ایک پینل کو انٹرویو دیا تھا اس میں میں نے صدر صاحب سے سوال کیا تھا کہ آپ نے اپنے عہدِ اقتدار میں سماجی و معاشی انصاف کے مقصد کے حصول کی خاطر زرعی اصلاحات کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی؟ صدر صاحب نے فرمایا تھا کہ اب تک تو میں اس طرف توجہ نہیں دے سکا لیکن اب جب کہ میرا انتظامی بوجھ (نئے انتظام میں) کچھ کم ہو رہا ہے، میں مذکورہ سوال کا جائزہ لوں گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ جواب محض سائل کو مطمئن کرنے کے لئے دیا تھا وہ گذشتہ سال ڈیڑھ سال کے دوران ایک سے زیادہ بار کہہ چکے ہیں کہ نہ زرعی اصلاحات کی ضرورت ہے اور نہ زرعی انکم ٹیکس لگانے کا کوئی جواز ہے۔"

میں پرویز صاحب کے خیالات اور نظریات سے متاثر نہیں ہوا

اسی انٹرویو میں میں نے ان سے یہ بھی پوچھا تھا کہ آپ نے حالیہ دنوں میں معاشی انصاف کے حوالہ سے غلام احمد پرویز صاحب سے منسوب اور بعض مخصوص اصطلاحات مثلاً ربوبیت عامہ وغیرہ استعمال کی ہیں، اس کی کیا اہمیت ہے؟ کیا آپ اس فلسفہ کے قائل ہو رہے ہیں؟ صدر صاحب نے جواب دیا میرے سامنے ان اصطلاحات کا ذکر کیا گیا اور میں نے لغت میں ان کے معنی دیکھے جو مجھے پسند آئے اور میں نے یہ اصطلاحات استعمال کر دیں لیکن اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ میں پرویز صاحب کے خیالات اور نظریات سے متاثر ہو گیا ہوں بلکہ انہوں نے مسکراتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ میرے محترم والد صاحب تو ساری عمر پرویزی مکتب فکر سے نبرد آزما رہے اور حدیث کی اہمیت کم کرنے والوں سے بحثیں کرتے رہے اس لئے بعض اصطلاحات کے استعمال سے یہ سمجھنا کہ میں کسی نئے فلسفہ کا قائل ہوتا جا رہا ہوں، درست نہ ہوگا۔

امیرِ جماعت اسلامی کا تبصرہ

۱۵ جولائی ۱۹۸۸ء کو قومی انتخابات کا آغاز کرتے ہوئے امیر جماعت اسلامی نے کراچی میں ایک جلسہ میں فرمایا کہ "صدر ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دور میں اسلام کا مذاق اڑایا گیا آئین و قانون کی

دھجیاں بکھیری گئیں اور آئین و قانون کی خلاف ورزی کا یہ بدترین دور ہے۔"

(بحوالہ ہفت روزہ ایشیا ۳۱ جولائی ۱۹۸۸ء)

یاد رہے کہ جماعت اسلامی خود ضیاء الحق کے دور حکومت میں کچھ عرصہ شریک اقتدار رہی جبکہ بعد میں بھی اسے مارشل لاء کی بی ٹیم کے نام سے پکارا جاتا رہا۔

جناب احمد ندیم قاسمی کا تبصرہ

"دراصل صدر ضیاء الحق کے دور مطلق العنانی میں عوام کی رائے معلوم کرنے کے دو خاص تجربات ہوئے اور ان تجربات نے عوام کو انتخابات اور ان کے نتائج ہی سے بدظن کر دیا۔ ایک تو صدر ضیاء الحق کے اس ریفرنڈم کا ڈھونگ تھا جس کے بارے میں حبیب جالب نے کہا تھا!

شہر میں ہو کا عالم تھا
جن تھا یا ریفرنڈم تھا

اس ریفرنڈم میں رائے عامہ کو جس طرح روندا گیا اور جو کھلم کھلا دھاندلی برپا کی گئی، اس کا ایک زمانہ شاہد ہے۔ ملکی حالات کو ذرا سا پرسکون ہونے دیجئے۔ پھر دیکھئے گا کہ اس نام نہاد ریفرنڈم کے بارے میں ملک بھر میں کیسے کیسے راز طشت از بام ہوتے ہیں۔ یوں رائے دہندگان کی بے چاری رائے خود ہی کے قدموں تلے کچلی گئی۔ دوسرا تجربہ غیر جماعتی انتخابات کا تھا۔ "غیر جماعتی" کا مقصد و مدعا ہی یہ تھا کہ انتخابات میں سے سیاست اور سیاسی شعور اور سیاسی تقاضوں کو خارج کر دیا جائے۔ مگر کسی بھی ملک کی حکومت غیر سیاسی خلاء میں قائم نہیں ہوتی اور اگر خلاء میں قائم ہوتی ہے تو اسے خلاء میں رکھنے کے لئے ستون تعمیر کرنے پڑتے ہیں جن پر اسے کھڑا رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غیر جماعتی انتخابات کے بعد جب حکومت وجود میں آئی تو محسوس کیا گیا کہ اسے تادیر خلاء میں معلق نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ اسے سیاسی جماعت کے ستون کا سہارا دیا گیا۔ دنیا میں حکومتیں سیاسی جماعتوں کی طرف سے بنتی ہیں۔ صدر ضیاء الحق کے دور میں حکومت نے سیاسی جماعت بنائی یہ اتنا مضحکہ خیز تجربہ تھا کہ ہم نے پوری دنیا کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقع فراہم کر دیا۔ پھر جب رائے عامہ کے ساتھ یہ بدسلوکی ہو چکی ہو تو ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں سنجیدگی کہاں سے آئے۔"

(روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۵/۱۱/۸۹)

خزانے کی حالت کے متعلق نوائے وقت کا اداریہ

صدر ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ۱۹۸۸ء کے دوران خزانے کی کیا کیفیت تھی یہ جاننے کے لئے ہمیں روزنامہ نوائے وقت لاہور کا وہ اداریہ ملاحظہ کرنا چاہیئے جو ۱۳ر جون کو سپردِ قلم کیا گیا جناب مدیر لکھتے ہیں۔

" وزیر خزانہ و منصوبہ بندی ڈاکٹر محبوب الحق نے نگران کابینہ میں شمولیت کے بعد اپنی پہلی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ ملک مالی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکا ہے۔ جناب صدر نے بھی اپنے ۲۹ر مئی کے مسول کو دینا سے چند روز قبل کہا تھا کہ خزانہ تو خالی پڑا ہے ان ذمہ دارانہ بیانات کے بعد ملک کی اقتصادی صورت حال کے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو پچھلے دو تین سال سے متواتر یہ بھی بتاتے چلے آ رہے ہیں کہ قومی خزانے کی لوٹ کھسوٹ کس طرح کی جا رہی ہے اور ان کا یہ بیان تو اب ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ ہر سال پچاس ارب کے ٹیکس چوری ہو جاتے ہیں اور ۳۰ ارب روپے بیوروکریسی خورد برد کر لیتی ہے۔ سابقہ قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی اور وفاقی انسداد رشوت ستانی کمیٹی نے بھی سرکاری اداروں، خود مختار کارپوریشنوں اور حکومتی دفاتر کی بدعنوانیوں کے بارے میں کوئی غفلت نہیں دکھائی لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ دگرگوں مالیات کو ٹھیک کرنے کی طرف کسی نے دھیان نہ دیا۔ گزشتہ برس بجٹ کے موقع پر قومی خزانے کی بدحالی عام آدمی سے بھی چھپی نہ رہ سکی۔"

صدر ضیاء الحق کی حکومت کے متعلق دو سو دانشوروں کے اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد

حکومت پاکستان کی طرف سے ۲۵ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو اسلام آباد میں مرکزی سطح کے ۲۰۰ دانشوروں کا ایک اجلاس اس غرض سے بلایا گیا تاکہ یہ سوچا جائے کہ پاکستان کو کس طرح ایک فلاحی مملکت بنایا جا سکتا ہے چنانچہ اس اجلاس کی روئداد روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۶/۱/۸۹ کی اشاعت میں جناب پروفیسر وارث میر صاحب کے قلم سے شائع ہوئی اس کا عنوان تھا۔

" جو باتیں رپورٹ نہ ہو سکیں "

اس موقعہ پر اس اجلاس کی طرف سے منظور ہونے والی قرارداد کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ ... کی حکومت میں پاکستان کس قدر خسارے میں رہی اور اب ہمیں اس کا ازالہ کرنے کے لئے کن کن مراحل سے ... ہو گا بہر حال پروفیسر وارث میر صاحب اس اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد درج کرنے سے پیشتر تحریر

رتے ہیں کہ

۲۵ دسمبر کے روز اسلام آباد کے افق پر جرأت اور ایمان کا ایک نیا سورج طلوع ہوا، لاہور والوں نے اگرچہ لیڈ کیا لیکن موجودہ حکومت کے سابق ہم سفر جرنیل وزیروں اور بیوروکریٹس نے وہ کچھ کر دکھایا جس کی لاہور کے دانشور توقع نہیں کر رہے تھے۔ قائداعظمؒ کے جمہوری اصولوں اور وفاقی پارلیمانی نظام حکومت کی آواز لاہور کے گورنر ہاؤس میں بلند ہوئی تو یہی آواز اسلام آباد کے ایوان صدر میں بھی گونجی۔ جماعتی بنیادوں پر مڈٹرم الیکشن کا مطالبہ یہاں بھی کیا گیا اور وہاں بھی۔ جنرل صاحب کی حکمت عملی واضح طور پر بیک فائر کر گئی۔ چنانچہ اب وہ جگہ جگہ اسلامی سیاست کا بار بار ذکر کر کے الٹ جانے والی بساط پر دوبارہ مہرے سجانے کی کوشش میں مصروف ہیں بلکہ اب تو انہوں نے ایک سربراہ مملکت کے رکھ رکھاؤ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، مذہبی حلقوں کو ایک طرح سے قلم دے دیا ہے کہ اکثریت کے زور پر اس ملک کے اقلیتی فکر کی آواز کو خاموش کر دو تاکہ نویں ترمیم آسانی سے منظور ہو سکے۔ ایک بات اطمینان کا باعث ہوئی۔ ملک کی سالمیت اور قوم کے اتحاد کے لئے حکومت کو کیا کرنا چاہیئے؟ اس سوال کا "مرکزی" اور "صوبائی" سطح پر جمع ہونے والے دانشوروں کا جواب یکساں تھا! اور اب آیئے اس منظور ہونے والی قرارداد کی طرف

منظور ہونے والی قرارداد

۱۔ پاکستان کو امریکہ کی طفیلی ریاست بنا کر خودکشی کی راہ پر گامزن خارجہ پالیسی اختیار کی گئی ہے اس پالیسی نے ملک کی سلامتی اور عوام کی یکجہتی کو سنگین ترین خارجی اور داخلی خطرات سے دوچار کر دیا ہے پاکستان کی آخری قوت پاکستان کے عوام ہیں اور خارجہ پالیسی کو عوامی خواہشات کے مطابق تشکیل دیا جانا چاہیئے۔

۲۔ موجودہ پالیسیوں کی وجہ سے ملک کے مختلف علاقوں میں بسنے والوں کے درمیان عناد اور تعصبات میں اضافہ ہوا ہے۔ محبت اور بھائی چارے کی بجائے پنجابیوں سندھیوں بلوچوں پشتونوں اور دیگر زبانیں بولنے والوں میں باہمی نفرت اور بیگانگی کی خلیجیں حائل ہو گئی ہیں۔ پاکستانیوں میں قومیت کا جذبہ کمزور پڑ گیا ہے اور قومی یکجہتی اور سماجی وحدت ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گئی ہے۔

۳۔ اسلام کے نام کو ذاتی اقتدار کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا ہے ملک میں انتہاپسندانہ رجحانات کو ہوا ملی ہے۔ عوام کو شریعت بل اور نویں ترمیم کے چکر میں ڈال کر انہیں ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ملک میں خون ریز فسادات کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ مسلمانوں نے مسلمانوں کا گلا کاٹا ہے اور

مختلف مذہبی عقائد رکھنے والے پاکستانی شہریوں میں خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو گئی ہے ان حالات میں ملکی سلامتی اور یکجہتی کو مزید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔

۴۔ جنرل ضیاء الحق نے ساڑھے آٹھ سال تک مارشل لا قائم رکھا۔ اس کے بعد کریڈ پبلسٹی سے محروم ریفرنڈم کرایا اور خود ہی صدر کے اختیارات حاصل کر لئے اور اس حیثیت سے غیر جماعتی انتخابات کرائے۔ فوج کے سربراہ کے ملازمتی عہدوں پر رہتے ہوئے مسلمہ آئینی اصول سیاست توڑا گیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کی وفاقی پارلیمانی اور جمہوری خصوصیات کو ختم کر کے ۱۹۸۵ء کا آئین نافذ کیا اور مارشل لائی نظام سیاست کو سول لبادے میں جاری رکھا۔ سیاسی جماعتوں کو کالعدم کیا سیاسی عمل کو پامال کر کے خوف و ہراس اور جبر پر مبنی ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے ذریعے مارشل لاء آرڈرز کو آئینی جواز عطا کر کے جابرانہ سزاؤں کو بحال رکھا گیا اور پارلیمنٹ سے اپنے اقدامات پر مہر تصدیق لگوائی۔ عدلیہ کو بے اختیار کر دیا گیا اور اسی وجہ سے تاحال سینکڑوں افراد فوجی عدالتوں کی طرف سے سنائی گئی سزاؤں کی وجہ سے جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔

۵۔ غیر جماعتی انتخابات نے فرقہ، عقیدہ، ذات، برادری، نسل، قبیلہ، علاقہ و زبان اور جنس کے ایسے تعصبات پیدا کر دیئے ہیں کہ قوم جمہوری اقدار کی سچائیوں سے بے خبر ہو چکی ہے۔ کالا دھن راج کر رہا ہے اور انسان سماجی ضابطہ اخلاق کے تمام تقاضوں سے بے نیاز ہو چکا ہے اس کا نتیجہ نفسا نفسی زر پرستی اور لوٹ کھسوٹ کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔ قومی مستقبل اور مقدر سے لاتعلقی مایوسی اور بددلی نے ملک میں پریشانی اور عدم اطمینان کو فروغ دیا ہے۔

۶۔ ملکی معیشت سخت بحران کا شکار ہے۔ روپے کے تبادلہ کی شرح ۹،۹۰ برابر فی ڈالر سے گر کر ۳۰ روپے برابر ایک ڈالر کے ہو چکی ہے سامراجی مفادات کی خدمت کر کے ۳۰ ارب ڈالر کا زر مبادلہ ضائع کر دیا گیا ہے غیر ملکی مال کے لئے دروازے غیر ملکی شیر دل کھول کر درآمد کئے گئے اور اس طرح پاکستان کی صنعتی ترقی کے راستے مسدود کر دیئے گئے۔ ملکی معیشت کو عالمی بنک، آئی ایم ایف، غیر ملکی کنسورشیم اور امریکہ کے تابع کر کے پاکستان کی جڑیں ہلا دیں۔

۷۔ بموں کے دھماکے، لوٹ مار، اغوا، قتل، ڈاکے، غبن اور مختلف گروہوں میں مسلح مقابلے قومی زندگی کا معمول بن چکے ہیں۔ سرحد پار سے حملے ہونے لگے ہیں۔ سمگلروں اور منشیات کے سوداگروں کے مسلح دستے ملک میں دندناتے پھرتے ہیں۔ منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور چور بازاری کے بھوت ملک پر مسلط ہیں۔

۸۔ تعلیمی اداروں میں تعلیم کے علاوہ سب کچھ ہو رہا ہے جھگڑوں فسادات پارٹی بازی اور غنڈہ گردی نے تعلیمی ماحول کو ختم کر دیا ہے۔

۹۔ ایک منظم منصوبے کے تحت دقیانوسیت اور جہالت پھیلائی گئی ہے اس گھٹی ہوئی فضا میں ادیبوں شاعروں عالموں اور فنکاروں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زنگ لگ گیا ہے۔

۱۰۔ عام انسان کی عزت نفس اور اس کے بنیادی حقوق کے علاوہ عورتوں اقلیتوں اور دوسرے کمزور طبقوں، کسانوں اور محنت کش عوام کے حقوق کو بھی سلب کیا گیا ہے اس لئے یہ اجلاس موجودہ حکومت اور ۱۹۸۵ء کے آئین اور مندرجہ نظام سیاست اور موجودہ ریاستی ڈھانچے کی مذمت کرتا ہے اور جو عناصر آج تک اس حکومت کی سیاسی معاشی سماجی اور ثقافتی حکمت عملیوں کے معاون اور مددگار رہے ہیں ان کو عوام دشمن قرار دیتا ہے۔ خصوصی طور پر وہ ادیب شاعر صحافی اور دانشور بھی قابل مذمت ہیں جو موجودہ نیم فوجی حکومت کی ہمنوائی اور معاونت کر رہے ہیں۔ یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق مستعفی ہو جائیں ایک نگران حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے تاکہ ملک میں ۱۹۷۳ کے آئین اور ۱۹۷۷ء کے انتخابی قوانین کے تحت عام انتخابات کرائے جا سکیں۔ یہ اجلاس ملک بھر میں محب وطن قوتوں ادیبوں شاعروں، صحافیوں، وکیلوں فنکاروں، دانشوروں، علمائے حق، خواتین، تاجروں، مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ فرد واحد کی آمریت ختم کرنے اور ملک میں سچی جمہوریت کی بحالی کے لئے متحد ہو کر جدوجہد تیز کر دیں۔ یہ اجلاس انہیں یاد دلاتا ہے کہ وفاق پاکستان کو صرف اور صرف جمہوریت کی بحالی کے ذریعے ہی بچایا جا سکتا ہے یہ اجلاس جمہوریت پسند سیاسی جماعتوں سے بھی اپیل کرتا ہے کہ وہ باہمی مفاہمت سے کام لیتے ہوئے قوم کے جمہوری اتحاد کو مضبوط بنائیں۔ گروہی اور ذاتی مفادات کو پس پشت ڈال کر پاکستان کی سلامتی اور قومی یکجہتی کو اپنا نصب العین بنائیں اور اختلاف فکر و نظر کو راہ میں حائل نہ ہونے دیں۔ یہ اجلاس ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اپنی پارٹیوں کے طرز عمل سے عوام کی فکری تربیت بھی کریں گی۔"

دانشوروں کی طرف سے اس قرارداد کی روح داد کے بعد جناب پروفیسر وارث میر لکھتے ہیں کہ :۔

یہ قرارداد منظور تو ہو گئی لیکن کسی اردو اخبار میں شاید اس لئے شائع نہ ہو سکی کہ جگہ جگہ جنرل ضیا کی ذات تنقید کی زد میں آتی تھی۔ پاکستان میں انگریزی اخبارات سخت سے سخت تبصرہ یا خبر چھاپ سکتے ہیں لیکن اردو اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کے بارے میں حکومت بہت حساس ہوتی ہے اردو میں لکھا گیا مضمون یا کالم براہ راست رائے عامہ پر اثرانداز ہوتا ہے چنانچہ اس اجلاس کی خبر انگریزی کے غیر سرکاری اخبارات میں شائع ہو گئی اور خیریت رہی۔ میں نے جنرل ضیاء الحق کے نام کو اکثر مقامات سے حذف کر دیا ہے اور اس رپورٹ کو حتی الامکان اس قابل بنانے کی کوشش کی ہے کہ چھپ کر قارئین تک پہنچ جائے۔ حکومتی ایوانوں میں مرتب کی جانے والی سفارشات کی تفصیل اخبارات

ہیں بڑے تزک و احتشام سے شائع ہو چکا ہے اور ہمارے فخر امام کا بھی ایک اعتراض ہے کہ پڑھنے لکھنے والے لوگوں سے مشورہ کرنے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن سرکاری ذرائع ابلاغ کے ذریعے اس مشورے کی اس قدر بھرپور پبلسٹی اگر قومی اسمبلی کے وقار کو کم کرنے کے ضمن میں آسکتی ہے تو دانشوروں کے مشورے کو بہ یک جنبش زباں مسترد کر دینا بھی مہمان دانشوروں کی توہین کے مترادف ہے۔"

جو کچھ بھی ان تمام کے تمام دانشوروں نے صدر ضیاء الحق کی حکومت کے متعلق کہا ہے اس کی روشنی میں اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ :۔

کبھی ٹکرا کے ٹوٹا کبھی مکر و فن سے ٹوٹا
مجھے ایک راہزن نے بڑے بانکپن سے لوٹا

(فیض کوثر)

جناب ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ کا اظہارِ خیال

ملک کے ان دوسو دانشوروں کی طرف سے اس منظور ہونے والی قرارداد کے بعد اب ہم ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ صاحب کے مضمون "اجتہاد یا الحاد" کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں جو روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ ر اپریل ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

قرارداد مقاصد سے نظریہ پاکستان تک

"پاکستان شاید دورِ جدید کا واحد اسلامی ملک ہے جو اپنی اصل بنیاد قرارداد مقاصد پر قائم نہ رہا وہ طبقے جو تحریک پاکستان کے دوران اس ملک کے قیام کے حامی نہ تھے۔ انہوں نے قرارداد مقاصد سے اپنے اصل مقاصد حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ قرارداد میں اسلام کے اصولوں جمہوریت حریت مساوات رواداری اور سماجی انصاف کو ریاست کی بنیاد بنانے کا عزم کیا گیا تھا۔ ان طبقوں نے ان میں سے صرف اسلام کا لفظ اچک لیا جمہوریت حریت مساوات رواداری اور سماجی انصاف سب کو نظرانداز کر دیا اب انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اسلام کے وہ اجارہ دار ہیں۔ جس چیز کو وہ اسلام کہیں وہ اسلام ہے جسے وہ کفر کہیں وہ کفر ہے اس نئے موقف کا نام " نظریہ پاکستان" رکھا گیا۔ اس اصطلاح کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ علامہ اقبال کے افکار اور تصور پاکستان میں اس کا سرے سے وجود نہیں ملتا۔ قائد اعظم کی تعلیمات میں شاید ہی کہیں اس کا استعمال ہوا ہو۔ اس اصطلاح کی دریافت اور اس کی وسیع پیمانے پر تشہیر سے خود بخود اس طبقے کی اس پر اجارہ داری قائم ہو گئی

انہوں نے اسے جو چاہے معانی پہنائے۔ بعض اوقات سوشلزم کے حامیوں نے بھی اسے استعمال کیا در حقیقت یہ اصطلاح طالع آزماؤں کی آماجگاہ بن گئی۔ اس غیر متعین اور مبہم اصطلاح کے ذریعے جو چاہتا اپنی خواہشات کا اظہار کر لیتا ہے۔

قرارداد مقاصد اور "نظریہ پاکستان" لفظ روح معنی مطلب اور مقصد ہر اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد اور رد تھے۔ قرارداد مقاصد میں متعین معلوم اور معروف طور پر اختیار حکمرانی کے اصل امین عوام تھے وہی مقننہ انتظامیہ اور عدلیہ کے اصل مالک تھے۔ اسلام کی تفسیر تعبیر اور تشریح اور اس کے نتیجے میں آئین اور قانون سازی کا مکمل اختیار عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل تھا۔ "نظریہ پاکستان" کے مطابق اختیار حکمرانی متذکرہ طبقے کو یا جنہیں وہ اہل سمجھیں انہیں حاصل تھا۔ اس کی اہلیت کی شرائط خود اس طبقے کی متعین کردہ تھیں۔

اسلام کی تفسیر تعبیر تشریح اور اس کی بنیاد پر قانون سازی کے اختیار پر انہوں نے اپنی اجارہ داری قائم کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ انتظامیہ اور عدلیہ انہیں کی تعبیر اور تشریح کے مطابق قائم ہوں۔ نظام تعلیم معاشرت معیشت اور سیاست ان کی خواہشات کی تابع ہوں قرارداد مقاصد کے مغز اور اس کی روح کو کچل کر اپنے مخفی عزائم کو بروئے کار لانے کا یہ انتہائی ماہرانہ حربہ تھا۔

قرارداد مقاصد اور "نظریہ پاکستان" کے مطالب، مفاہیم میں تضاد اور تصادم کو سمجھنے کے لئے اوپر بیان کردہ قرارداد کے اصولوں کو دوبارہ ذہن میں لایا جائے۔ اس سے ان دونوں میں ہر ہر قدم پر تضاد تصادم اور تخالف نظر آئے گا قرارداد مقاصد جمہوریت حریت مساوات رواداری اور سماجی انصاف کی علمبردار ہے جبکہ خود ساختہ "نظریہ پاکستان" آمریت جبر طبقات فرقہ واریت تنگ نظری اور ظلم کا آئینہ دار ہے۔

اس طرح اس خود ساختہ "نظریہ پاکستان" کو ہر آئین اور قانون پر فوقیت دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہ ایسا ذہین حربہ تھا، جس کے ذریعے جمہوریت حریت مساوات رواداری اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں کو نظر انداز کرنے میں مدد ملتی تھی "نظریہ پاکستان" ایسی خوبصورت اصطلاح تھی جسے ہر موافق اور مخالف اپنانے پر آمادہ تھا۔ مگر کسی کو ہمت نہ تھی کہ اس میں پوشیدہ مخفی عزائم میں جھانک سکے۔ یہ ہر آمر کو راس آئی۔ جس آمر نے آمریت جبر طبقات تنگ نظری اور ظلم سے حکومت کرنا ہوتی وہ "نظریہ پاکستان" کا داعی بن جاتا۔ تاریخ پاکستان کے مورخین خوب جانتے ہیں کہ اصطلاح کا سب سے زیادہ استعمال پاکستان کے آمروں ایوب خان، یحییٰ خان اور ضیاء الحق اور ان کے حواریوں نے کیا اور خاص پر اس کا سب سے زیادہ استعمال سب سے بڑے آمر مطلق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق نے کیا۔ قرارداد مقاصد کا مغز اور اس کی روح اجتہاد اور جمہوریت تھی۔ اس آمر نے قرارداد مقاصد کو آئین میں شامل کرنے کا مطلب خود اپنی آمرانہ خواہشات اور

ہمارا برائے عوام پر قابو غیر جماعتی پارلیمنٹ کو بلا وجہ بلا جواز اور بلا مناسب غیر آئینی اور غیر قانونی طریقے سے توڑنا اور اپنی آمریت کو دوام دینے کے لئے "شریعت آرڈیننس" کا نفاذ قرار دیا۔ قرارداد کا یہ مطلب پاکستان کی تاریخ میں اجتہاد اور جمہوریت کی سب سے بڑی رسوائی تھا۔ اس رسوائی کا سب سے رسوا کن پہلو یہ تھا کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہوا ان حالات کا اگر انیسویں صدی کے آخر ربع میں ترکی کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو دونوں میں قدم بقدم اور شانہ بشانہ مماثلت نظر آئے گی۔

اسلام اور ملک سے بغاوت

اجتہاد اور جمہوریت کو چھوڑ کر جمود اور جبر کو اپنانا نہ صرف پاکستان، بانیان پاکستان اور شہیدان پاکستان کے ساتھ غداری ہے بلکہ یہ اسلام سے کھلی بغاوت ہے کیونکہ آمریت اسلام میں شرک حرام ہے مارشل لاء نہ صرف توہین انسانیت ہے یہ اسلام کی بھی سب سے بڑی اہانت ہے کیونکہ مارشل لاء قوم کے اجتماعی اجتہاد پر مبنی آئین کو توڑ کر نافذ ہوتا ہے یہ قوم کی توہین ہوئی۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، خدا کے قانون اور قوم کے قانون، دونوں کو توڑ کر خدا، رسولؐ اور انسانیت کا باغی بن جاتا ہے۔ اسلام سے بغاوت اور قوم سے غداری کا نتیجہ وہی عذاب ہوتا ہے جس میں پاکستان مارشل لاء کی وجہ سے مبتلا ہے۔

مارشل لائی اسلام کے اثرات

مارشل لائی اسلام کے سبب تین بڑے عذاب نازل ہوئے۔

اوّل : نشہ، ہیروئن

دوم : فحاشی، وڈیو، وی سی آر

سوم : کلاشن کوف، تشدد و قتل و غارت گری۔"

جناب صدر غلام اسحٰق صاحب کا بیان

اب ہم آخر میں جناب صدر غلام اسحٰق خان صاحب کا وہ بیان پیش کرنا چاہتے ہیں جو آپ نے ۱۹۸۸ء کے ملکی انتخابات کے بعد (۵ سال کے لئے صدر کا عہدہ سنبھالنے پر) سینٹ اور قومی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس میں دیا آپ نے فرمایا۔

"ماضی میں آئین سے منحرف ہو جانا بنیادی غلطی تھی آئین کی شرح اپنی مرضی سے کی گئی اور اس طرح لاقانونیت کے پھاٹک کھل گئے۔"

بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کا ذکر خیر اور قصہ قرضوں کی معافی کا

جہاں تک پاکستان کے سرمایہ داروں کے حق میں ان بادشاہوں کی فراخدلی کا تعلق ہے تو پاکستان کریڈٹ انفارمیشن بیورو کے مطابق مملکت پاکستان کے مجموعی قرضوں کا 74.5 فی صد (23.36 ارب روپیہ) اگر نواز شریف کے دونوں ادواروں میں اپنے چہیتوں کو معاف کیا تو 24.2 فی صد (7.23 ارب روپے) دن رات پاکستان کے غریبوں کا دم بھرنے والی خاتون بے نظیر بھٹو نے اپنے دونوں ادوار میں معاف کئے جبکہ 42.433 کروڑ روپے وزیر اعظم جونیجو صاحب نے معاف کر دیئے اور اس طرح پاکستان کے ان محسنوں نے پاکستان کی بنیادوں کو "استحکام" بخشنے کی خاطر 30 ارب روپے کی کثیر رقم مفت میں دوسروں کی نذر کر دی تاکہ ان کے اقتدار کی کرسی کو زیادہ سے زیادہ دوام حاصل رہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ 13 مارچ 2000ء۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ صدر ضیاء الحق کے سلسلہ میں میاں نواز شریف کا فرمان یہ بھی تھا کہ وہ صدر ضیاء الحق کی پالیسیوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کام کریں گے تو یہ دیکھنے کے لئے میاں نواز شریف نے اپنے دور اقتدار میں مملکت پاکستان پر کیا کیا نوازشیں کیں یہ جاننے کے لئے 7 مئی 2000ء کے روزنامہ جنگ لاہور میں جناب ارشاد احمد حقانی کا ایک کالم قارئین کی توجہ کے لئے پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

"سپریم کورٹ آف پاکستان کے 12 فاضل جج صاحبان پر مشتمل ایک بنچ پچھلے سال 12 اکتوبر کے فوجی اقدام کے جواز اور عدم جواز کا جائزہ لے رہا ہے۔ جناب خالد انور اور جناب وہاب الخیری سمیت بعض فاضل وکلاء اپنے دلائل پیش کر چکے ہیں۔ ان دنوں اٹارنی جنرل عزیز اے منشی اپنا کیس پیش کر رہے ہیں۔ جمعے کے روز جناب منشی نے ان سابق ارکان اسمبلی' وزراء' وزرائے اعظم اور دوسرے مناصب پر فائز سیاستدانوں کی ایک فہرست پیش کی جن کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے فروری 1997ء کے انتخابات کے لئے جو کاغذات نامزدگی داخل کئے اور ان کے ساتھ اپنے اثاثوں کے جو گوشوارے پیش کئے ان میں بہت سے حقائق کو چھپایا گیا تھا اور یہ چیز انہیں انتخابات میں امیدوار بننے سے نااہل قرار دلوانے کے لئے کافی ہے۔ جو فہرست انہوں نے داخل کی اسے پاکستان کی سیاسی ایلیٹ کا Who is who قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسمبلیوں اور حکومتوں میں رہنے والا شاید ہی کوئی بڑا سیاسی نام ہو گا جو اس فہرست میں شامل نہ ہو۔ اٹارنی جنرل نے شریف خاندان کے مالی اور صنعتی عروج کی کہانی بھی بڑی تفصیل سے بیان کی اور جناب منشی کے نزدیک اس عروج کے حصول میں جن ناجائز اور مشتبہ وسائل' حربوں' طور طریقوں اور تدابیر سے کام لیا گیا ان کی بھی ایک حیرت انگیز تفصیل انہوں نے فاضل بنچ کے سامنے رکھی۔ ایک دوسری فہرست اٹارنی جنرل نے پیش کی جس میں ان لوگوں کے نام ہیں جن کے ٹیلی فون نواز دور میں ٹیپ کئے جاتے رہے (یہ گنہگار بھی ان میں شامل ہے)۔ سرکاری وکیل نے سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کی مبینہ مالی بدعنوانیوں کی تفصیل بھی عدالت عظمیٰ کے سامنے پیش کی۔ اٹارنی جنرل نے کہا کہ 1980ء میں شریف خاندان کے پاس صرف ایک صنعتی یونٹ تھا۔ 10 سال بعد ان کے صنعتی یونٹوں کی تعداد 10 ہو گئی۔ اس عرصہ میں میاں نواز شریف پنجاب کے وزیر خزانہ اور وزیر اعلیٰ کے مناصب پر فائز رہے تھے۔ جب میاں صاحب پہلی دفعہ وزیر اعظم بنے تو تین سال میں ان کے صنعتی یونٹوں کی

تعداد 30 ہو گئی۔ یہ یونٹ کس طرح بنے' لندن کے فلیٹ کس طرح خریدے گئے' کالا دھن سفید کرنے کے لئے کون کون سے قانونی اور غیر قانونی طریقے اختیار کئے گئے اس کی ایسی ہوشربا تفصیلات مسٹر منشی نے پیش کی ہیں کہ انسان انہیں پڑھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ "جس ملک کا حکمران خود تاجر ہو وہ ملک کبھی فلاح نہیں پا سکتا"۔ کہتے ہیں کہ جب میاں نواز شریف پہلی دفعہ وزیراعظم بنے تو ان کے ایک مربی اور سرپرست جنرل حمید گل نے میاں محمد شریف کی موجودگی میں میاں نواز شریف کو مشورہ دیا کہ جب تک آپ اقتدار پر فائز ہیں آپ اور آپ کا خاندان اپنے کاروبار کو توسیع نہ دیں لیکن ان کا مشورہ نہ مانا گیا۔ اس واقعے کا ذکر میاں شہباز شریف بہت عرصہ پہلے میرے نام ایک خط میں بھی کر چکے ہیں لیکن آج میں نے اپنے کالم میں اس واقعے کا ذکر کرنے سے پہلے ٹیلی فون پر جنرل حمید گل سے اس کی تفصیلات معلوم کیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں صاحب کے بطور وزیراعظم پہلی دفعہ حلف لینے سے دو روز پہلے آرمی چیف جنرل بیگ کی اجازت سے میں انہیں ملا اور انہیں تین مشورے دیئے۔ اس مجلس میں میاں محمد شریف' میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف' جناب حسن پیرزادہ' جنرل حمید گل اور ان کے صاحبزادے عمر گل شامل تھے۔ پہلا مشورہ یہ تھا کہ آپ شہباز شریف کو پنجاب کا وزیراعلیٰ نہ بنائیں۔ دوسرا یہ تھا کہ آپ ہر اختتام ہفتہ لاہور اور رائیونڈ یا ماڈل ٹاؤن میں گزارنے کی بجائے سندھ میں گزارا کریں۔ تیسرا مشورہ کاروبار کے بارے میں تھا کہ آپ اپنے اقتدار کے زمانے میں اس کو توسیع نہ دیں۔ جنرل حمید گل نے مجھے بتایا کہ شہباز شریف والا مشورہ انہوں نے مان لیا۔ دوسرا نہ مانا۔ تیسرے مشورے پر شہباز شریف اور حسن پیرزادہ کا موقف مثبت تھا۔ انہوں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہمیں اپنے عرصہ اقتدار کے دوران اپنے کاروبار کو توسیع نہیں دینی چاہئے۔ میاں نواز شریف زیادہ وقت خاموش رہے لیکن ان کے والد گرامی میاں محمد شریف نے میرا مشورہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ کاروبار کو توسیع دینا ہمارا حق ہے۔ ہمارے اندر اس کے لئے ایک امنگ (Urge) ہے اور ہم اس کی تسکین چاہتے ہیں (بھٹو دور میں) ہمارے ادارے چھین لئے گئے۔ اب ہم اپنے کاروبار کو ضرور توسیع دیں گے۔ جنرل حمید گل کا فرمانا ہے کہ ہماری ملاقات تین گھنٹے جاری رہی اور میں نے اسلامی تاریخ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حوالے دے دے کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ آپ کو ان شخصیات کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن میری بات نہ مانی گئی۔ آخر میں نے مجبور ہو کر یہ تجویز دی کہ آپ اپنے کاروبار کو بے شک پھیلائیں لیکن اسے ایک ٹرسٹ بنا دیں اور نئے کاروبار کی آمدنی تعلیمی اور طبی سہولتوں کی فراہمی کے لئے وقف کر دیں لیکن میرا یہ مشورہ بھی نہیں مانا گیا۔ جنرل حمید گل کہتے ہیں کہ یہ طویل ملاقات میرے لئے انتہائی مایوسی کا باعث تھی اور میں نہایت افسردہ اور دل شکستہ واپس آیا۔ جنرل صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ جب میاں صاحب دوبارہ وزیراعظم منتخب ہوئے تو میں دو مارچ 1997ء کو رائیونڈ میں ان سے ملا۔ ان کے والد محترم اور میاں شہباز شریف بھی موجود تھے۔ اس مجلس میں میں نے احتساب کا نظام قائم کرنے کے لئے انہیں کچھ مشورے دیئے جس پر انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنی تجویز متعین شکل میں لکھ کر ہمیں دیں۔ میں نے میاں صاحب کے تجویز کردہ دو حضرات کے ساتھ بیٹھ کر رات دو بجے تک محنت کی اور ایک خاکہ بنا کر دے دیا جس پر ایک دن بھی عمل نہ ہوا۔ میں نے گفتگو میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ میرے تجویز کردہ خطوط کے

تحت اگر احتساب ہوا تو آپ سے بھی کچھ سوالات پوچھے جائیں گے۔ جنرل گل نے مجھے بتایا کہ اس مجلس میں میاں محمد شریف نے مجھے کہا کہ پچھلی دفعہ ہم نے آپ کا یہ مشورہ مان لیا تھا کہ شہباز شریف کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ نہ بنایا جائے اور ہم نے وائیں صاحب کو اس منصب پر فائز کر دیا تھا لیکن اس دفعہ ہم آپ کا مشورہ تسلیم نہیں کریں گے اور میں نے اپنے بیٹوں سے کہہ دیا ہے کہ شہباز شریف کو وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے۔ میاں شریف نے کہا کہ میں نے ان سے کہا ہے کہ کسی کے مشورے یا کسی کی رائے یا کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کرو اور شہباز شریف کو پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا دو "جب وہ صوبے کی خدمت کر سکتا ہے تو آخر ہم اسے اس موقعے سے کیوں محروم رکھیں"۔

اس تفصیلی گفتگو کے بعد 30 مئی 2000ء کے کالم میں "پاکستان کی موجودہ مشکلات کا کوئی آسان حل ہے" کے زیر عنوان حقانی صاحب نواز شریف کے دور حکومت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"12 اکتوبر تک فی الحقیقت ملک ایک انتہائی ناقابل رشک صورتحال سے دوچار ہو چکا تھا اور نواز حکومت نے جس پست معیار کی کارکردگی دکھائی تھی اس کے پیش نظر اصلاح احوال کی تمام توقعات نقش بر آب ثابت ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اگر میاں نواز شریف جنرل مشرف کو بھی نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ داخلی طور پر کتنے بڑے آمر بن جاتے اور امریکہ اور بھارت کے ساتھ تعلقات کو وہ کس نہج پر آگے بڑھاتے۔ مسلم لیگ کے سینئر نائب صدر جناب اعجاز الحق نے پچھلے ہفتے لاہور میں ریکارڈ پر یہ بات کہی کہ میاں صاحب بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کے راستہ پر چل رہے تھے۔ اعجاز الحق نے نہیں کہا کہ مجھے غلط رپورٹ کیا گیا ہے اور بیگم کلثوم نواز سمیت کسی مسلم لیگی نے اپنی ہی پارٹی کے سینئر نائب صدر کی اس بات کی تردید نہیں کی۔"

ان پیش کردہ حقائق کے بعد جناب ارشاد احمد حقانی صاحب تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جنرل حمید گل کی یہ گفتگو شریف خاندان بالخصوص اس کے محترم اور بزرگ سربراہ کی سوچ سمجھنے میں کافی مدد دے سکتی ہے کم از کم ان لوگوں کو جو اپنے تعصبات کے بالکل ہی اسیر ہو کر نہیں رہ گئے۔ بیگم کلثوم نواز نے اگلے روز لاہور میں پریس کلب میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہمارا خاندان تو بالکل سادہ زندگی بسر کرتا ہے۔ ہم فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں' پلاسٹک کی پلیٹیں استعمال کرتے ہیں اور ہم نے آج تک اپنے بچوں کو ایک بھی مشکوک لقمہ نہیں کھلایا۔ اس ادعائے صالحیت و پارسائی پر کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے"

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جناب پرویز مشرف کی کوششوں سے ۳۰ جون ۲۰۰۰ء تک ایمنسٹی سکیم کے تحت ۹۰ ارب روپے کی خفیہ دولت ظاہر کی جا چکی ہے۔ جس سے سرکاری خزانے کو ۹ ارب روپے کا ٹیکس وصول ہوا' سابقہ دو حکومتوں کے ادوار میں کالے دھن کے تحت اربوں ڈالر بیرون ملک منتقل کر دیئے گئے جب کہ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ ۱۹۸۸ء میں اگر پاکستان میں غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد ۷ ملین تھی تو اس وقت یہ تعداد ۴۴ ملین تک جا پہنچی ہے۔

جس معاشرے میں اس قدر معاشی بعد واقع ہو چکا ہو اس قوم کا معاشرتی حسن کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

انتظامی امور کے سلسلہ میں وزارت داخلہ و قانون کی ایک اہم رپورٹ

"ایک سال کے دوران ڈکیتی کے 1395 مقدمے' 612 چالان عدالت سے صرف 6 کا فیصلہ ہو سکا۔ 4 مقدموں میں ملزم بری ہو گئے۔

صوبے میں راہزنی کے 8022 مقدمات درج ہوئے جن میں سے 16 کے چالان پیش کئے گئے' 41 کا فیصلہ ہوا 27 ملزم بری کر دیئے گئے۔

صرف لاہور ڈویژن میں ڈکیتی کے 55' راولپنڈی 32' سرگودھا 49' فیصل آباد 114' ملتان 92 اور ڈیرہ غازیخان میں 59 مقدمات درج کئے گئے۔"

(روزنامہ جنگ' 4 اپریل 2000ء)

نظام سرمایہ داری کی پیدا کردہ سوچ

نظام سرمایہ داری کے تحت انسانی ذہن کس قدر ظالمانہ سوچ اختیار کر لیتا ہے اس کا اندازہ روزنامہ (جنگ لاہور "۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء کی اشاعت (واشنگٹن ریڈیو رپورٹ) سے لگایئے

(۱) بچوں کی تجارت سے عالمی خرکار ۱۰۰ گنا منافع کماتے ہیں۔ گوئٹے مالا سے ۳۰۰ ڈالر خریدا گیا بچہ امریکہ فرانس میں ۳۶۰۰۰ ڈالر میں بکتا ہے

(۲) بچوں کی فحش نگاری اور جنسی استحصال کی عالمی صنعت کی مالیت ۴ ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔

نظام سرمایہ داری کی بقا کا تمام تر دارومدار اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ اپنی توجہ انسانوں کی بجائے مشینوں پر زیادہ سے زیادہ مرکوز کی جائے۔ چنانچہ اس ضمن میں (Eric Gill) اپنی مشہور کتاب (Money and Morals) میں لکھتا ہے:

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد سے انسانی محنت میں بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں' انسانوں کو ختم کرنا چاہئے۔ یہ انسان جنہیں ہم دنیا سے مٹا دینے کے خواہشمند ہیں' وہ انسان ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ نہ کہ وہ انسان جو گلی محلوں میں بستے ہیں۔ یہ انسان تو ہمارے ساتھی ہیں۔ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چیزوں کے پیدا کرنے میں انسانی محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بچت کی جائے اور اس کے برعکس' ان چیزوں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے اور ان کی خریدنے کی قوت کو بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے' جڑ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے۔"

چنانچہ اس سلسلہ میں مشہور مفکر ریکارڈو رقم طراز ہیں

,,اگر پیداوار زیادہ ہو جائے تو سرمایہ دار کا منافع کم رہ جاتا ہے اس اصول پر آج کل کے نظام سرمایہ داری میں کس طرح عمل کیا جارہا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب برازیل میں کافی زیادہ مقدار میں پیدا ہونے لگ گئی تو وہاں کے سرمایہ داروں نے مل بیٹھ کر مشورہ کیا کہ اس زائد پیداوار کا کیا کیا جائے انہوں نے پہلے سوچا کہ اسے زمین میں دفن کیا جائے لیکن چالیس لاکھ بوریوں کو زمین میں دفن کرنے کے لیے کافی رقبہ درکار تھا اس پر سوچا گیا کہ اسے سمندر میں غرق کر دیا جائے لیکن اس سے مچھلیوں کے تباہ ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا بالآخر یہ طے پایا کہ اسے جلا دیا جائے کیونکہ سبز پودوں کا جلانا بھی آسان نہیں ہوتا اس لیے مٹی کے تیل کی ضرورت پڑی چنانچہ اس پر تقریباً دو لاکھ پونڈ کا تیل صرف کیا گیا اور یہ کچھ انہیں ہر سال کرنا پڑتا ہے تاکہ کافی کی قیمت نہ گر جائے۔(Inside Latin America) اسی طرح ایک اور پول کی بندرگاہ سے ایک سال قریب دس لاکھ سنگترے سمندر میں بہا دینے پڑے تاکہ رسد نہ بڑھنے پائے

(An Introduction to Socialism by Muker Jee)

نظام سرمایہ داری انسانی سوچ پر نفسیاتی سوچ کو کس قدر متاثر کرتی ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس باب کے آخر پر ایک فکر انگیز بات جو پاکستان کے نامور کالم نگار جناب منو بھائی کے الفاظ میں پیش خدمت ہے اور وہ یہ کہ:

,,صدیوں پر پھیلی ہوئی مختلف بادشاہتوں نے ہمارے ذہنوں اور دماغوں پر اس قدر گہرے پنجے گاڑ رکھے ہیں کہ ہم مہدی حسن کو ,,شہنشاہ غزل' نصرت فتح علی خاں کو موسیقی کا ,,بے تاج بادشاہ' ملکہ روشن آرا بیگم کو ,,ملکہ موسیقی اور نور جہاں کو ,,ملکہ ترنم کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے بلکہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ انہیں ان القاب سے پکار کر ہم ان کی تعریف کر رہے ہیں یا ہتک کے مرتب ہو رہے ہیں''

ہمارے یہ حکومتیں نوجوان نسل کو تعلیمی مواقع فراہم کرنے میں کس حد تک ممد ثابت ہوئیں اس کا اندازہ صرف اس حقیقت سے کیجیے کہ ۱۹۷۳ء سے لے کر نواز شریف کے دور کے آخری ایام تک سوائے ایک آدھ کے کوئی سرکاری ہائی سکول لاہور میں قائم نہیں ہوا بہر حال یہ ہیں پاکستان کے حکمرانوں کی وہ داستان غم جس کی پاداش میں آج ساری قوم مرغ بسمل بنی ایک دوسرے سے یہ کہتی سنائی دے رہی ہے۔

رہزن کو ڈھونڈتے ہیں مسافر ادھر ادھر
رہبر سے کارواں کی قیادت نہ ہو سکی

مندرجہ بالا حقائق کو پیش کرنے پر یہ حقیقت یقیناً نکھر کر سامنے آچکی ہو گی کہ ہم دنیا کے سامنے پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر پیش کرنے میں کیوں کامیاب نہ ہو سکے؟ اور پھر عملی طور پر کیوں یہ ثابت نہ کر سکے کہ انسانیت کا آخری سہارا صرف اور صرف فکرِ قرآنی کو عملی شکل دینے میں ہی مضمر ہے؟

قرآن حکیم کے الفاظ میں حقیقت تو یہ ہے کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا۔۔۔۔

جہاں کسی نے خدا کے عالمگیر نظام ربوبیت کی دعوت دی تو وہاں کے اکابرین نے اس دعوت کی مخالفت کے لئے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے۔ اگر وہ ذرا بھی عقل و شعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں خود ان کا اپنا نقصان تھا اس لئے کہ نظام خداوندی کا قیام ان کی بہتری کے لئے تھا۔ ۶/۱۲۴

پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا

وزیر اعلیٰ پنجاب میاں نواز شریف نے کمالیہ میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے صدر ضیاء الحق کی قومی خدمات پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے شہید صدر ضیاء الحق کو شہادت کا رتبہ عطا فرمایا۔ شہید صدر نے انہیں جو دعا دی تھی وہ اس کے لئے عمر بھر ان کے ممنون رہیں گے اور شہید صدر ضیاء الحق کی پالیسیوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کام کریں گے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۸۹ء)

اٹھارواں باب

سیاسی فرقہ بندی

جواہر لال نہرو

ہندو اِس قرآنی نظریۂ حیات کے بنیادی طور پر خلاف تھا جس کی تشریح کتاب کے پہلے حصے میں کی جا چکی ہے اور یہی وجہ تھی کہ جواہر لال نہرو اس سلسلہ میں اپنی تصنیف کردہ کتاب "میری کہانی" میں رقمطراز ہے کہ:-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نگاہ سے یہ بہت دور از کار ہے۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے۔"

(بحوالہ "میری کہانی" جلد دوم - صفحہ ۳۳۱)

اور دوسری جگہ لکھا ہے:

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہا جاتا ہے۔ اسے ہندوستان اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو کی ہے۔"

(بحوالہ "میری کہانی صفحہ ۱۶۱)

ہندوستان ٹائمز

اس سلسلہ میں ہندوستان ٹائمز کا کہنا تھا کہ:

"حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا یہ فعل عبث ہو گا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔"

(ہندوستان ٹائمز، مورخہ ۱۴، نومبر ۱۹۳۸ء)

ایک طرف ہندوؤں کے نزدیک مسلمانوں کے لیے دینِ خداوندی اور حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ تھا اور دوسری طرف جہاں جمہوری نظام کا تعلق ہے تو اس کے متعلق جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "میری کہانی" کے صفحہ ۴۵۵ میں تحریر کیا تھا کہ:

"در اصل جمہوری حکومت کے یہ معنی نہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔"

اور یہ تو ظاہر ہے کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی ہمیشہ اکثریت رہی ہے اور اگر اکثریت کے یہ عزائم ہوں تو پھر اقلیت کی زبوں حالی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مسٹر گاندھی

جواہر لال نہرو کے بعد اگر مسٹر گاندھی کا خیال معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے ان کا وہ مضمون جو ۴ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء کو ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوا دیکھا جا سکتا ہے:

"دو قومی نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب کو چھوڑ کر مسلمان ہوئی یا ان کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے ہیں اس لیے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جُداگانہ قوم نہیں بن سکتے۔ جنہیں خدا نے ایک بنا دیا ہو انسان انہیں کبھی دو نہیں بنا سکتا۔ میری رُوح اس امر کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت دو مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے مذاہب ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے۔ کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے اور ہم ایک ہی خدا کے عیال ہیں خواہ ہم کسی نام سے کیوں نہ پکارے جائیں۔ مَیں اِس نظریہ کے خلاف یقیناً بغاوت کروں گا کہ وہ لاکھوں مسلمان جو ابھی کل تک ہندو تھے، اسلام قبول کر کے اپنی قومیت بدل لیں۔"

ہندو پاکستان کے کس قدر خلاف تھے، اس کا اندازہ مسٹر گاندھی کے ان الفاظ سے لگائیے:

"اگر سارا ہندوستان جل کر راکھ ہو جائے ہم پھر بھی مطالبۂ پاکستان منظور نہیں کریں گے۔ خواہ مسلمان اسے بزورِ شمشیر ہی کیوں نہ طلب کریں۔"

(بحوالہ "دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا" صفحہ ۱۴۱ مصنفہ ای۔ ڈبلیو۔ آر لومی)

۱۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کو مسٹر گاندھی نے قائدِ اعظم کے نام خط تحریر کرتے ہوئے کہا:

میں تاریخ میں ایسی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، ان کی اولاد یہ دعوے کرے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے آجانے کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔"

پٹیل

ہندوؤں کی آخری دم تک یہ کوشش رہی کہ وہ جہاں تک ہو سکے، مسلمانوں کو ذہنی طور پر مایوس کیے رکھیں تاکہ پاکستان کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے۔ یہ وہ مقصد تھا جس کے پیشِ نظر ولبھ بھائی پٹیل نے اپریل ۱۹۴۷ء میں کلکتہ کے چیمبر آف کامرس کے جلسہ میں تقریر کے دوران قائدِ اعظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"پاکستان کیا ہے، کہاں ہے، کدھر ہے، جناح بولتا ہے ہم پاکستان بنائیں گے ہم پوچھتے ہیں بھئی تم کدھر بناؤ گے پاکستان، یہ سرحد کانگریس ہے، بنگال ملک کے دوسرے سرے پر ہے، آسام ہندو اکثریت ہے، پنجاب اور سندھ ہمارے ساتھ ہے۔ یوپی، سی پی، بہار اور مدراس کے لوگ پاکستان کا نام سن کر ہنستے ہیں تو پھر بھائی جناح تم پاکستان کہاں بناؤ گے۔ سمندر میں، ہوا میں، پاتال میں۔"

(بحوالہ "مشرق میگزین" مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء)

ڈاکٹر شیام پرشاد

اور ۱۹۴۷ء میں ہی ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی یہ فرما رہے تھے کہ:

"میں نا اُمید ہونے والوں میں سے نہیں ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ تقسیم ایک عارضی سا حادثہ ہے۔ اس کے باوجود ہمیں تیس کروڑ ہندوؤں کو اس مقصد کے حصول کے لیے جان تک دے دینے کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ بہت غلط ہوگا کہ ہم اپنی قوم کو امن اور شانتی کی لوریاں دے کر اس طرح سلائے رکھیں جس طرح ہم نے انہیں اس وقت تک سلائے رکھا جس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ ہم ضرورت سے زیادہ

امن پسند واقع ہوئے ہیں۔" (بحوالہ "آرگنائزر" ۳ جولائی ۱۹۴۷ء)

پنڈت جواہر لال نہرو

دشمنوں کی اس قدر مخالفت کے باوجود جب پاکستان بنتے ہوئے نظر آیا تو تقسیمِ ہند کے وقت پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا:

"ہماری سکیم یہ ہے کہ اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جُھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجیے۔"

پاکستان کی تباہی کے سلسلہ میں ہندو کے علاوہ یہی کچھ انگریز کہتا تھا۔

وزیرِ اعظم لارڈ ایٹلی

تقسیمِ ہند کی سکیم منظوری کے لیے جب برطانوی پارلیمان میں پیش ہوئی تو برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ ایٹلی (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے) نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ:

"ہندوستان تقسیم ہو رہا ہے لیکن مجھے اُمید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکے گی اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ کر رہے ہیں ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔"

لال بہادر شاستری

یہ سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود اس زمانہ کے ہندوستان کے وزیرِ اعظم مسٹر لال بہادر شاستری کا کہنا تھا کہ:

"ملک میں لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے لیکن غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا یہ رویّہ ہماری روایات کے مطابق ہوگا؟ ہمارے سامنے دو راستے ہیں ایک تو یہی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور دوسرا راستہ امن و خوشحالی کا ہے جو قوم کے باپو مہاتما گاندھی نے ہمیں سکھایا ہے۔ امن اور عدمِ تشدد کا جو راستہ ہمیں گاندھی جی نے سکھایا وہ نہ صرف فطری طور پر مناسب ہے بلکہ عملی نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہے۔ جب ہم پوری دنیا میں

امن وصلح کی تبلیغ کرتے ہیں تو ہم کس طرح دوسرا راستہ اختیار کر سکتے ہیں؟۔"

(بحوالہ اخبار "مدینہ" بجنور جنوری ۱۹۶۵ء)

پاکستان بننے کے بعد

قبل اس کے اب یہ دیکھا جائے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہندو نے کیا رویہ اختیار کیا یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ تقسیمِ ہند سے قبل مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو سیاسی اور معاشی میدان میں کس قدر مستحکم پوزیشن میں تھا۔ نیز انگریز بیوروکریسی کو اس کے ساتھ کتنی محبت تھی اور اس کے ساتھ اس کے کس قسم کے تعلقات تھے، تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اِس کے متعلق اپنی تالیف "استحکامِ پاکستان" میں رقم طراز ہیں:

انگریز بیوروکریسی اور ہندو

"ادھر ہندو خود بھی مسلمانوں کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ تعداد کے اعتبار سے لگ بھگ تین گنا تھے، بلکہ دولت و سرمایہ اور تجارت وصنعت پر تو تقریباً بلا شرکت غیرے قابض تھے اور تعلیم، قومی بیداری اور سیاسی تنظیم کے اعتبار سے بھی بہت آگے تھے...... اور "اکھنڈ بھارت" کے پلڑے میں اضافی وزن پڑ رہا تھا۔ دیگر غیر مسلم اقوام اور نیشنلسٹ مسلمانوں کا۔ اور ان سب کے مقابلے میں تھی مسلمان عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے والی۔ صرف مسلم لیگ! گویا معاملہ بالکل وہی تھا کہ ع

"لڑا دے ممولے کو شہباز سے"

یا ع "الجھ رہے ہیں زمانے سے چند دیوانے"

چنانچہ اعداد وشمار، حالات و واقعات اور اجتماعیات وعمرانیات کے کسی بھی اصول اور قاعدہ کی رُو سے "مطالبۂ پاکستان" ایک 'دیوانے' کے خواب اور مجذوب کی بڑ یا زیادہ سے زیادہ سودے بازی کے حربے BARGAINING TECHNIQUE سے بڑھ کر نظر نہ آتا تھا۔

اس پر مزید اضافہ کیجئے اس کا کہ برطانیہ میں اُس وقت لیبر پارٹی کی حکومت تھی۔ جس کی ہمدردیاں واضح طور پر کانگریس کے ساتھ تھیں اور ہندوستان کی وحدت وسالمیت برقرار

رکھنے کو اس نے اپنی پالیسی کا سنگِ بنیاد بنا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں جب اس حکومت کے فرستادہ وزارتی مشن نے اپنا منصوبہ پیش کیا تو اس کی تمہید کے طور پر واضح الفاظ میں ہندوستان کی تقسیم کو ناقابلِ عمل قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ مزید برآں اُس وقت تو یہ حقائق صرف اہلِ نظر کی نگاہ اور واقف حال لوگوں کے علم میں ہوں گے لیکن اب تو یہ تمام راز طشت از بام ہو چکے ہیں کہ شخصی اعتبار سے برطانوی وزیر اعظم ایٹلی کو مسلم لیگ اور قائد اعظم سے ذاتی بغض تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن، جس کے ہاتھوں قدرت نے ہندوستان کو تقسیم کرایا ایک طرف خود گاندھی کا چیلا تھا تو دوسری طرف پنڈت نہرو کی دوستی صرف اس ہی سے نہیں، اس کے پورے خاندان سے تھی، جبکہ قائد اعظم سے اسے ذاتی پُرخاش اور نفرت تھی!!"

بال ٹھاکرے

ہندو انتہا پسند تنظیم "شیو سینا" کے صدر بال ٹھاکرے نے ہندو کنونشن کے ایک اجلاس (بمبئی کے نواحی قصبہ) میں تقریر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور مسلمانوں کے متعلق کہا کہ:

"ہم مسلمانوں کو بھارتی فوج میں بھرتی کر کے نیا پاکستان نہیں بنانا چاہتے۔ مسلمان کینسر ہیں۔ لہٰذا "ہتھیار اُٹھاؤ کینسر بھگاؤ"۔ بال ٹھاکرے نے مزید کہا کہ "اگر مجھے ایک روز کے لیے بھی اقتدار مل جائے تو قسم ہے کہ میں ان سب کو "آپریشن دربار صاحب" کی طرح ختم کر کے رکھ دوں گا۔" (بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور۔ مورخہ ۲۰ جون ۱۹۸۴ء)

رام منوہر لوہیا

سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے اپنی کتاب "اگلا قدم" میں لکھا ہے:

"ہم زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر سکتے۔ شاید دو تین سال کے عرصہ میں ہی امرتسر اور پاکستان کی درمیانی حدِ فاصل مٹ جائے گی، ہمیں پاکستان کے زہر کو ختم کر کے تقسیمِ ہند کو معدوم کر دینا چاہیئے۔"

ایس کے موجمدار

بھارت کے ایک نامور بھگت۔ بیرسٹر اور معروف تاریخ نویس ایس کے موجمدار نے پاکستان اور ہندوستان کو ایک دوسرے میں مدغم ہونے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا :

" پرانے ہندوستان کو تقسیم کر کے ایک خود مختار مسلم ملک بنانے سے دونوں ملکوں میں سے کسی کے لیے بہتری نہیں ہوئی۔ پاکستان کے قیام سے کوئی مسئلہ بھی تو حل نہیں ہُوا۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی بھلائی کے لیے دونوں کی سلامتی اور دفاع کے لیے اور عالمی امن کے لیے اِس تقسیم میں کچھ نہ کچھ "ترمیم" کرنی ضروری ہے۔ اِس "ترمیم" سے آخر کار کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک "دفاعی طرز" یا "کنفیڈریشن" اِس کا فیصلہ تو بعد میں ہو سکتا ہے۔ مگر سب سے پہلے اتحاد کی خواہش پیدا ہونی ضروری ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی نفرت اور تلخی کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان کس کا قصور تھا اس کا تعین کرنے سے گریز کیا جائے۔ فریقین کو چاہیئے کہ وہ خود تسلیم کر لیں کہ کم یا زیادہ دونوں ہی قصوروار ہیں۔"

(بحوالہ "جناح اینڈ گاندھی" مؤلف ایس کے موجمدار)

اندرا گاندھی

بہر حال پاکستان بننے کے بعد تک بھی ہندو کے ذہن میں دو قومی نظریہ کے سلسلہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی بلکہ اپنی پالیسی کی تائید میں سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر جشنِ مسرت مناتے ہوئے پارلیمان سے خطاب کے دوران وزیرِ اعظم بھارت مسز اندرا گاندھی نے کہا :۔

" یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے، نہ ہی حکومت کی کامیابی ہے۔ حق پر مبنی نظریہ کی کامیابی ہے۔ اِس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی ہے۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ جو کچھ ہم کہتے تھے، وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل تھا۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" اگست سنہ ۱۹۷۹ء)

مہندر پرتاپ

اور جب پاکستان وجود میں آگیا تو اس کے تین سال بعد راجہ مہندر پرتاپ نے ۱۹۵۰ء میں اپنی قوم کو مشورہ دیا تھا:

"جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جارہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ضرور ہوگی۔ بنابریں میں حکومت کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان کو ختم کردے۔" (بحوالہ "ویر بھارت مورخہ ۲۱؍دسمبر ۱۹۵۰ء)

مسٹر مہاجن

لیکن ہندو قیادت نے تو ۱۹۵۰ء سے بھی قبل پاکستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا انکشاف بھارت کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر مہاجن نے ان الفاظ میں کیا کہ:

"ہندوستان نے دسمبر ۱۹۴۷ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر دیا جائے لیکن بعض داخلی مصالح کی بنا پر اس فیصلہ پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" اگست ۱۹۴۷ء صہ ۴۳)

ہندو کی اس قدر مخالفت اور مخاصمت کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ قائدِاعظم دو قومی نظریہ کے تحت یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور اس بنا پر ان کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کی ضرورت ہے جبکہ ہندو اس نظریہ کو کسی صورت میں بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ مسلمانوں کو الگ قوم کی حیثیت سے الگ خطۂ زمین کی ضرورت ہے —— لہٰذا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم کی حیثیت سے الگ خطۂ زمین کے مالک بن جائیں اور پھر وہ وہاں آزادانہ طور پر بغیر کسی مداخلت کے قرآنی حکومت قائم کریں۔ لہٰذا انہیں وجوہات کی بنا پر وزیرِ دفاع مسٹر چون نے کہا تھا کہ:

مسٹر چون

"پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ جس دن پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے اور اس کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں اور یہ اختلاف مہینے یا ہفتہ بھر کا نہیں بلکہ سالہا سال تک رہے گا (اس لیے) بھارت کو ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" اگست ۱۹۴۷ء صہ ۴۳)

ہندو مسلمانوں کو صرف معاشی، عائلی، تمدّنی اور سیاسی طور پر ہی اپنا غلام اور محکوم نہیں بنا دینا چاہتے تھے بلکہ وہ انہیں دینی اور تصوراتی لحاظ سے بھی مفلوج کر دینا چاہتے تھے۔ اور ہندو نے اپنا یہ منصوبہ پاکستان بننے سے بھی ۲۲ سال پہلے بنا رکھا تھا۔ مثلاً اخبار "الوکیل" امرتسر ۹ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہندوؤں کے ایک مشہور لیڈر سوامی ستیا نے مسلمانوں کو بنیادی طور پر تباہ و برباد کرنے کے سلسلہ میں بھاشن دیتے ہوئے کہا تھا:

"جب ہم طاقتور ہو جائیں گے تو ہم مسلمانوں کے سامنے یہ شرائط رکھیں گے۔ (۱) قرآن کو الہامی کتاب مت مانو (۲) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا نبی مت مانو (۳) مکہ کے ساتھ اپنا تعلق ختم کر لو (۴) اسلامی تقریبات کی بجائے ہندوؤں کی تقریبات مناؤ۔ وہ تمام تقریبات مناؤ جو رام کرشن اور دوسرے دیوتاؤں سے متعلق ہیں۔"

پروفیسر رام دیو

اور باقی رہی سہی کسر ہندوؤں کے پروفیسر رام دیو نے کچھ اس طرح پوری کی کہ:

"ہندوستان کی ہر ایک مسجد پر ویدک دھرم یا آریہ سماج کا جھنڈا بلند کر دیا جائے گا۔"

(بحوالہ اخبار "گروگھنٹال" ۱ر جنوری ۱۹۲۶ء)

اندرا گاندھی

اور پھر سال ہا سال سے وہ جذبات جو مسز اندرا گاندھی کے سینے میں پرورش پا رہے ہیں - نومبر ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ کے طلبا اور اساتذہ کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے منظرِ عام پر آئے جن کے تحت اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ:

"میرے پتا پنڈت نہرو تحریکِ آزادی کے ایک عظیم رہنما تھے۔ وہ میرے سب کچھ تھے۔ وہ میرے شفیق باپ تھے۔ استاد بھی اور راہ نما بھی۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ درست ہے لیکن بھارت کی تاریخ ان کے اور ان کی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے ایک بھیانک جرم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ جرم ہے بھارت کی تقسیم۔ انہوں نے سرگ باشی پٹیل اور ہندو مہاسبھا کے دباؤ میں آکر ایک ایسا فیصلہ قبول کر لیا جس نے بھارت ماتا کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ بات مجھے بڑے دکھ سے کہنی پڑ رہی ہے۔ اس لیے کہ وہ میرے پتا تھے لیکن اس سے زیادہ وہ بھارت کے ہر دلعزیز رہنما بھی تھے۔ آج مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے تو میں ان کی بیٹی سے زیادہ

بھارت کی وزیرِاعظم کی حیثیت سے بھی بات کر رہی ہوں۔ میں یہ بات نہ بھی کہوں تو بھارت کی موجودہ نسل اور آنے والی نسلیں ہمیشہ کہتی رہیں گی کہ وہ پنڈت نہرو اور انڈین کانگریس کے اس جرم کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔"

(بحوالہ روزنامہ "مشرق" لاہور۔ مورخہ ۱۷ مارچ سنہ ۱۹۷۲ء)

اور آخر پر پاکستان کی کہانی ہندو کی زبانی سننے کے لیے دو ایک اور اقتباس کا پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ہمیں یہ اندازہ ہو سکے کہ

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مسٹر ستیہ مورتی

سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ جب یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر مخلوط حکومت قائم کر سکتی ہیں تو اس پر کانگریس کے ایک بلند پایہ لیڈر مسٹر ستیہ مورتی نے کہا تھا کہ:

"کانگرس اس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط حکومتیں کس طرح قائم کر سکتی ہے جس کا نصب العین اسلامی حکومت کا احیاء ہو"

(بحوالہ "ہندوستان ٹائمز" ۱۱ جون سنہ ۱۹۴۰ء)

مسٹر ملشی

اور اس کے ایک سال بعد نومبر ۱۹۴۱ء میں لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کے اجلاس کے دوران میں ہندوؤں کے مشہور لیڈر مسٹر ملشی (آنجہانی) جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

"تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لیے ایسے اماکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔"

(بحوالہ "ٹریبیون" ۱۲ نومبر ۱۹۴۱ء)

یعنی یہ تھی وہ اصل وجہ کہ ؎

"ہو نہ جائے آشکار شرعِ پیغمبر کہیں"

ڈاکٹر شیام پرشاد

اور اس مقصد کے حصول کی خاطر ہندو کب چاہتا تھا کہ پاکستان پھلے پھولے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۴۶ء میں ہی مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے اعلان کیا تھا۔

" ہمارا نصب العین یہ ہونا چاہیئے کہ پاکستان کو پھر سے ہندوستان کا حصّہ بنالیا جائے۔ اس حقیقت کے متعلق میرے دل میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا خواہ یہ معاشی دباؤ سے ہو یا سیاسی دباؤ سے یا اس کے لیے دیگر ذرائع اختیار کرنے پڑیں۔" (بحوالہ "آرگنائزر" مورخہ ۳ جولائی ۱۹۴۶ء)

وار دھا رام سکیم

کسی قوم کی قومی حیثیت ختم کرنے کا بہترین طریق یہ ہوتا ہے کہ اس کا زاویہ نگاہ بدل جائے اور زاویہ نگاہ کو بدلنے کا ہتھیار تعلیم ہے کیونکہ جیسا نصاب ویسی تعلیم ویسا زاویہ نگاہ اور ہندو اس فارمولے سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے اس کی شروع دن سے ہی یہ کوشش تھی کہ مسلمانوں کو تعلیم ہی اس قسم کی دی جائے کہ غیر محسوس طور پر ان کا تشخص ہی باقی نہ رہے لہٰذا اس مقصد کے لیے انہوں نے پاکستان بننے سے پہلے وار دھا رام سکیم کے نام سے ایک تعلیمی سکیم شروع کی جس کے مضر اثرات کے پیشِ نظر مولانا ابوالحسن ندوی کو ہندوستان کے مسلمانوں سے کہنا پڑا کہ:

" مجھے دل پر پتھر رکھ کر لیکن آنکھوں سے پٹی کھول کر یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ اب اس باب کو سمجھنے میں کسی دُور بینی یا فراستِ ایمانی کی ضرورت نہیں کہ سرکاری سکولوں میں جو نصاب (بالخصوص ہندی اور سنسکرت میں) پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی مسلمان بچے کا کم سے کم معنی میں بھی مسلمان رہنا اس طرح ممکن نہیں جیسے دریا میں کودنے اور غوطہ لگانے کے بعد جسم کا خشک رہنا اور دامن کا تر نہ ہونا ممکن نہیں۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" نومبر ۱۹۶۶ء)

لال بہادر شاستری

جہاں تک مسئلہ کشمیر کا تعلق ہے تو ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کے ناظم عمومی اور مولانا مدنی (مرحوم) کے صاحبزادے مولانا سیّد اسعد مدنی نے اپنا ایک خط اخبارات میں شائع کرایا تھا جو انہوں نے کسی وقت لال بہادر شاستری کو لکھا تھا:

" میں نے اخبارات میں شائع شدہ آپ کی ایک تقریر پڑھی تھی جس میں آپ نے نیشنل کیڈٹ کور کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ پاکستان جو ہمیشہ اسلام کی اصطلاح سے سوچتا ہے اس دھوکے میں ہے کہ وہ کشمیر کو اس لیے ہڑپ کرے گا کہ وہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ یہ پاکستان کی خام خیالی ہے ــــ ہندوستان میں پانچ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ اگر پاکستان یہ سوچتا ہے کہ وہ مسلم اکثریت کے بل پر کشمیر کو لے سکتا ہے تو اسے اچھی طرح سوچ رکھنا چاہیے کہ اس صورت میں ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔" (ماہنامہ " تذکرہ " دیوبند بابت دسمبر ۱۹۶۵ء)

بالفاظ دیگر اگر مسلمانوں نے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے آواز بلند کی تو پھر اس گستاخی پر ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو ذبح کر دیا جائے گا۔

تاشقند کا چناؤ کیوں؟

اصل تو یہ ہے کہ ہندو ذہنی طور پر بڑا عیار واقع ہوا ہے اور اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے بھی لگائیے جو پاکستان کے نامور صحافی مولوی محمد سعید صاحب کی کتاب آہنگ بازگشت سے ماخوذ ہے اور جس کا تعلق ۱۹۶۵ء میں شکوہ ملک و دین کی خاطر ہندوستان کے ساتھ لڑی جانے والی جنگ کے سلسلہ میں معاہدہ تاشقند سے ہے۔ تحریر ہے کہ؛

" ہندوستان نے ہزیمت اٹھا کے نیا رُخ بدلا اور اس کی حمایت میں اس کی دوست قومیں پاکستان پر دباؤ ڈالنے لگیں۔ روس نے مصالحت کرانے کی پیشکش کی۔ چنانچہ گفتگو کے لیے تاشقند کو چنا گیا۔ تاشقند کا انتخاب تاریخ کی ستم ظریفی تھی۔ یہ شہر پورے سو برس قبل ۱۸۶۵ء کے جون میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا تھا۔ جب ایک پادری ہاتھ میں صلیب تھامے روسی فوج کی رہنمائی کر رہا تھا اور جسے ورثے میں ملنے والی صلیب کے علاوہ میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دینے پر فوجی صلیب (ملٹری کراس) بھی دی گئی۔ اسی شہر کے کوچہ و بازار میں ایک اور اسلامی ریاست کی رسوائی کے سامان سو برس بعد ہوئے۔ اور میدانِ جنگ کی سرخروئی کو مذاکرات کی میز کی روسیاہی میں بدلنے کی سازش ہوئی۔ بہر کیف ہندوستان کس ذہنیت سے مذاکرات میں شریک ہوا اس کی ایک جھلک اس گفتگو میں ملتی ہے جو سید امجد حسین نے سردار سورن سنگھ سے کی

سید صاحب نے کہا "سردار جی کشمیر سے آپ کس طرح بچ سکتے ہیں۔ آپ نے اس معاہدے پر انگوٹھا لگایا ہوا ہے۔" سردار سورن سنگھ نے کہا "مہاراج! ہم تو انگوٹھا لگا کے بھی مُکر جایا کرتے ہیں۔"

آج کے ہندوستان میں مُسلمانوں کی حالتِ زار

قائدِ اعظم کا انکشاف

اس کے بعد اگر یہ دیکھنا ہو کہ آج ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی حالتِ زار کیا ہے تو یہ جاننے سے قبل قائدِ اعظم کی ایک تقریر (دسمبر ۱۹۴۱ء) کا اقتباس پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں ہندوؤں کی ایک سکیم کا انکشاف کرتے ہوئے فرمایا:

"ساورکر (صدر ہندو مہاسبھا) کی سکیم یہ ہے کہ جیسا کہ (انگریز کے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج میں ہندوؤں کو ۵۰ فیصد حصّہ مِل جائے گا تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی (اور پھر وہاں کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں ان کے متعلق آپ نے فرمایا) وہ کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائے گی جس طرح برطانوی فوج متعین ہے اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اُٹھا سکیں۔"

(بحوالہ "تقاریر قائدِ اعظم" جلد اوّل صفحہ ۵۰-۳۵۵)

مسٹر شکلا وزیرِ اعلیٰ سی پی

قائدِ اعظم کے اس انکشاف کی تصدیق کے لیے مسٹر شکلا وزیرِ اعلیٰ سی پی کا یہ بیان پیش کیا جا سکتا ہے جو ۱۲ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ملاپ میں شائع ہوا اور وہ یہ کہ:

"ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں اب تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے۔ یہ چیلنج دیتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انہیں نہ تو ہم برداشت

کریں گے اور نہ کامیاب ہونے دیں گے۔ مسلمان بھائی یا دوسرے لوگ اگر اس دیس میں رہنا چاہتے ہیں تو انہیں ہندی کو راشٹر بھاشا بنانا ہوگا۔ انگریز کے راج میں جو اختلاف تھا ہم اسے باقی نہیں رہنے دیں گے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ پُرانی باتوں کو بھول جائیں اور یہ محسوس کریں کہ انہیں نہ صرف یہ کہ اس دیس کی زبان بولنی ہوگی بلکہ جس طرح اس دیس کے لوگ رہتے ہیں، اسی طرح رہنا ہوگا۔ متضاد اور مخالف تہذیبوں کے لیے ہمارے دیس میں اب کوئی جگہ نہیں۔"

مہاسبھا کا منشور

۱۹۴۷ء کے بعد ۱۹۶۶ء میں مہاسبھا نے الیکشن کے سلسلہ میں جو منشور شائع کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ: "مہاسبھا دستور میں اس قسم کی ترمیمات کے حق میں ہے جو ہندو کلچر کی روایات کے مطابق ہوں، اور جس کے نتیجہ میں ملک صحیح معنوں میں ایک جمہوری ہندو ریاست بن سکے۔ اگرچہ اقلیتیں کلچر اور مذہب کے معاملہ میں آزاد ہوں گی لیکن انہیں ہندو قومیت کے خاص دھارے میں سمو جانا چاہیئے اور مذہب اور کلچر کے نام پر علیحدہ قومیت کے تصور کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔"

(بحوالہ اخبار "مدینہ" بجنور ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء)

بال ٹھاکر

بمبئے کے ہفت روزہ بلٹز نے انتہا پسند اور متعصب ہندو رہنما بال ٹھاکر کا ایک انٹرویو شائع کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

"(۱) مسلمانوں کو عبادت میں ہندوؤں کا حصّہ دار بن کر رہنا ہوگا۔

(۲) مسلمانوں کو اپنے تحفظ کا نعرہ لگانے کا کوئی حق نہیں۔

(۳) پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کی کامیابی پر خوش ہونے والے مسلمانوں کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں۔

(۴) ہمیں ایسے مسلمانوں کی ضرورت ہے جو اپنا مذہب اپنے گھر میں رکھ کر آئیں۔

(روزنامہ جنگ ۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ابراہیم سلیمان سیٹھ کا انٹرویو

پاکستان کا دورہ کرنے والے بھارتی مسلمانوں کے خیرسگالی وفد کے سربراہ بھارتی لوک سبھا کے رکن اور

بھارتی متحدہ مسلم لیگ کے صدر ابراہیم سلیمان سیٹھ کا وہ انٹرویو ملاحظہ فرمائیں جو انہوں نے جنگ فورم کو دیا۔ . . نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"آزادی کے بعد اب تک ہزاروں کی تعداد میں ایسے فسادات ہو چکے ہیں اور اس کی زد ہمیشہ غریب مسلمانوں پر پڑی ہے۔" انہوں نے فسادات کی ذمہ دار ایک فرقہ پرست نیم فوجی تنظیم کو قرار دیا جو مسلمانوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ "یہ فسادات ایسے علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں مسلمان اقتصادی طور پر زیادہ خوشحال ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مراد آباد۔ بنارس اور جمشید پور کا خاص طور پر حوالہ دیا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ یکم فروری ۱۹۸۴ء)

ہندو کی اس تمام تر مخالفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے قارئین کے لیے یہ خبر (جو مع تصویر روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۸۴ء کو شائع ہوئی) یقیناً قابلِ فہم اور دلچسپ ہو گی۔ اس کا ایک اقتباس ہے :-

"آندھرا پردیش کے برطرف وزیر اعلیٰ این۔ ٹی راما راؤ، جو فلمی اداکار بھی ہیں، نے مسلمانوں سے ووٹوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد میں عام مسلمانوں کے ہمراہ عید الاضحٰے کی نماز ادا کی۔"

ڈاکٹر خلیق انجم

یہ ہے ہندو کی وہ ذہنیت جو شروع سے آج تک کارفرما ہے اور اس سے پیشتر انجمن ترقی اردو (ہند) کے سیکرٹری ڈاکٹر خلیق انجم ۱۹۷۹ء میں ذاتی کام کے سلسلہ میں لاہور تشریف لائے تو انہوں نے ایک تقریب کے موقع پر اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں فرمایا جو بعد میں ڈاکٹر محمد باقر صاحب کے قلم سے ہفت وار چٹان کی ۹ جولائی ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں شائع ہوئے۔

" ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۸ کروڑ ہے لیکن انہیں کسی صوبے یا مرکز میں اکثریت حاصل نہیں۔ سماجی طور پر ہندی مسلمان معتوب بن کر رہ گیا ہے۔ یہ تعلیم سے بے بہرہ ہوتا جا رہا ہے اور کسبِ معاش کے دروازے اس پر آہستہ آہستہ بند کیے جا رہے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ کلو رخ اندازی کو اپنا شعار بنا کر اپنی بے چینی کا اظہار کرتا ہے۔"

ہندوستان میں رہنے والا مسلمان دینی معاملہ میں کس قدر پست درجے تک پہنچ چکا ہے' اس کا اندازہ اسی سے لگائیے۔ خلیق صاحب نے فرمایا:

"میری بیوی ہندو ہے۔ گھر میں مورتیوں کی پُوجا کرتی ہے۔ دوسرے کمرے میں میری والدہ نماز پڑھتی ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی — اور ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے۔ یہی لبرل اسلام ہے۔ ہندوستان میں زیدی کی صاحبزادی (یہ پطرس بخاری کی سالی قدسیہ کی لڑکی ہے جو دو نسلوں سے کم از کم سیّدوں کی اولاد ہے) نے ہندو سے شادی کی ہے۔ ہندوستان میں تو اسے کسی نے بُرا نہیں جانا کیونکہ ہم ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔"

بھارت کی طرف سے پاک فوج کو مفلوج کرنے کا حربہ

سنہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے سلسلہ میں پاکستانی فوج کا سپاہی سیّد فقیر ایک زخمی کی حیثیت سے پانچ ماہ تک بھارت کی قید میں رہنے کے بعد جب پاکستان پہنچا تو اس نے دورانِ قید اپنے تجربات اور مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ:

"پاکستان کی فوجی قوت کو مفلوج کرنے کے لیے بھارت کے فوجی ڈاکٹروں نے یہاں تک غیر انسانی کارروائیاں کیں کہ ہمارے بیشتر زخمی جنگی قیدیوں کی ہڈیاں غلط جوڑیں۔ بعض کے زخم خراب کیے۔ اور انہیں اتنا عرصہ وہیں روکے رکھا کہ پاکستان میں ہڈیاں از سرِ نو جوڑنے اور خراب کیے ہوئے زخم ٹھیک کرنے کا امکان ہی ختم ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ ہمارے نوجوانوں کی ٹانگوں اور بازوؤں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے سِرے مِلا کر جوڑنے کے بجائے ہڈی کے ٹوٹے ہوئے حصّے اُوپر تلے رکھ کر پٹیاں کس دی گئیں۔ بد قسمت افسر جب پاکستان آئے تو ہڈیاں مکمل طور پر بیکار ہو چکی تھیں اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کے متاثرہ اعضا کاٹ دیے جائیں۔ چنانچہ وہ تمام افراد عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے جن کی ہڈیاں جوڑی جا سکتی تھیں اور وہ فوج کے قابل رہتے۔ بعض کے زخم اس قدر خراب کر دیے گئے تھے کہ پوری ٹانگ یا بازو کاٹنا پڑا۔"

(بحوالہ ماہنامہ "حکایت" لاہور ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء)

مسلمان نوجوان لڑکیوں سے بہیمانہ سلوک

اسی جنگ کے دوران مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کے ساتھ کس قسم کی الم انگیز داستانیں وابستہ ہیں وہ

پھر میں لاکھ کر ان میں سے صرف ایک واقعہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے تھرڈ ایئر کے ایک طالب علم اعجاز احمد کی زبانی سنیئے :-

"ہمیں ۱۳ دسمبر کو صبح ۹ بجے نوضلع گوجرانوالہ ۔ جمانی پور شالے اور ردولے چک کی تقریباً سولہ جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان لڑکیوں کو گورداسپور جیل میں ہمارے ساتھ والے چھوٹے سے بلاک میں رکھا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت اچانک زور زور سے رونے اور دل ہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں۔ بعض لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ خدا کے واسطے ہمیں چھوڑ دو۔ ہمیں کچھ نہ کہو۔ ہم سمجھ گئے کہ ان لڑکیوں سے زیادتی کی جا رہی ہے۔ ان کی آبرو پر حملہ ہو رہا ہے۔ لیکن ہم بے بس تھے رات بے چینی سے گزری۔ صبح اٹھتے ہی جب ہم نے اس چیخ و پکار کے بارے میں جیل کے ملازمین سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ "بعض لڑکیاں پاگل ہیں اور وہ بلا وجہ چیخیں مار رہی تھیں"۔ اعجاز نے کہا "مجھے یقین نہیں آیا اور حقیقت جاننے کے لیے جستجو کرتا رہا۔ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی پر نظر پڑی تو اس کی جو حالت دیکھی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسی رات کے بعد ان لڑکیوں کو نہ جانے جیل حکام کہاں لے گئے۔" (بحوالہ روزنامہ "امروز" مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۲ء)

سچ ہے کہ ۔ حرام رچ جائے ہڈیوں میں تو ڈوب جاتی ہیں غیرتیں بھی

ہندوؤں کا ہندوؤں سے سلوک

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ قوم ذہنی طور پر بڑی ہی سنگدل، کینہ پرور اور ظالم واقع ہوئی ہے۔ غیر تو غیر یہ اپنے کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتی ہے، یہ دیکھنے کے لیے نوائے وقت بابت ۵ دسمبر ۱۹۸۰ء کی یہ خبر دیکھئے جسے ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنے ہاں جنوری ۱۹۸۱ء کو "ہلاکو اور چنگیز سے کہیں آگے" کے عنوان سے شائع کیا۔ تحریر ہے کہ :

"تاریخ میں ہلاکو اور چنگیز کے فرضی یا حقیقی مظالم کی داستان ضرب المثل بن چکی ہیں لیکن اب بھی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن کے غبار میں وہ داستانیں گم ہو جاتی ہیں۔ بھارت کے شہر بھاگل پور کا حال ہی کا واقعہ ہے۔ اکتیس ملزم جن کے مقدمات زیرِ سماعت تھے، پولیس کی حراست میں تھے۔ ایسے ملزموں کو پولیس کی زیرِ حراست اس لیے رکھا جاتا ہے کہ وہ محفوظ رہیں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی پولیس نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

انہوں نے ان میں سے ہر ایک کی آنکھوں میں پہلے بائیسکلوں کی سلاخیں چبھو کر انہیں اندھا کر دیا۔ اور اس کے بعد ان کی آنکھوں میں تیزاب ڈال کر انہیں جلا دیا تاکہ ان کا علاج بھی نہ ہو سکے۔ کہا جائے گا کہ یہ ان چند سپاہیوں کی انسانیت سوز شقاوت قلبی تھی اور اس قسم کی درندہ صفت انسان ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن بات اس سے آگے بڑھتی ہے۔ وہاں کی حکومت نے ان پندرہ سپاہیوں کو معطل کر دیا جنہوں نے اس لرزہ خیز جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہاں کے شہری ان سپاہیوں کو سخت سزائیں دینے کا مطالبہ کرتے، انہوں نے ان کی حمایت میں مکمل ہڑتال کی۔ تعلیمی ادارے، دکانیں، بینک اور دفاتر مکمل طور پر بند رہے۔ ہڑتال کی اپیل وہاں کی پولیس تنظیم نے کی تھی اور بعد ازاں دوسری انجمنوں نے بھی اس کی حمایت کر دی۔ عام لوگوں کی حمایت حاصل ہونے سے معطل شدہ پولیس افسروں کے حوصلے بلند ہو گئے اور حکومت کو دھمکی دی گئی کہ اگر ان کی معطلی کے احکام واپس نہ لیے گئے تو پولیس کے تمام بڑے بڑے افسر حکومت سے عدمِ تعاون پر مجبور ہو جائیں گے۔"

اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے ادارہ نے لکھا کہ:

"سوچیے کہ جو قوم خود اپنوں کے ساتھ یہ کچھ کرتی ہے، اگر کوئی غیر ان کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اس کے ساتھ کیا کچھ نہیں کرے گی۔ تقسیم ہند کے زمانے میں جو کچھ انہوں نے نہتے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا اور جو کچھ وہاں اب تک مسلمانوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی مستند تفصیل شائع کر دی جائے تو اس سے کم از کم اس سطح میں پاکستانیوں کی آنکھیں کھل جائیں جو اُٹھتے بیٹھتے یہ طعن دیتے رہتے ہیں کہ ہم نے ہندو سے الگ ہو کر کیا پایا۔"

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد روزنامہ "جنگ" لاہور مورخہ ۶، نومبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہونے والا مندرجہ ذیل بیان بلا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں جو مسز اندرا گاندھی کی موت کے سلسلہ میں تھا:

"غلام مصطفےٰ جتوئی، بیگم نسیم ولی خان، نواب زادہ نصر اللہ خان، مولانا فضل الرحمن، خواجہ خیر الدین، مشیر پیش امام، فتح یاب علی خان، اقبال حیدر اور لطیف آفریدی صاحب نے مشترکہ طور پر مسز اندرا گاندھی کی المناک موت کو دنیا بھر کی جمہوری قوتوں کے لیے ایک عظیم صدمہ قرار دیا۔"

ہندو مت کے اصولِ زندگی

میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس موقع پر ہندو مت کے اصولِ زندگی اور نظریۂ حیات کی ایک مثال پیش کر دی جائے

ترجمہ اس قوم کی پوری تہذیب کی تاریخ کو سمجھنے میں نہ کوئی اُلجھاؤ رہے گا نہ ابہام بلکہ اس کا ایک ایک لفظ ہمارے ذہنوں کو جگانے کے لیے کافی ہوگا۔

مسٹر جے پرکاش نارائن جو ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی طرف سے پاکستان میں سفیر تھے۔ انہوں نے ۱۴ نومبر ۱۹۴۸ء کو کراچی میں تقریر کے دوران دو ٹوک انداز میں فرمایا کہ:

"کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے جس کا کھُلے بندوں اعتراف کرنا چاہیے کہ ہندومت میں کوئی اصولِ زندگی قطعی اور ابدی نہیں۔ ہر مصلحت کے لیے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر دیانت اور سچائی سے کام نہیں چل سکتا اِس لیے وہ کبھی ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو اور یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر ہندومت ہزاروں سال مختلف حالات اور مختلف ماحول میں زندہ رہا ہے اور زندہ ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" دسمبر ۱۹۴۸ء)

شاستری کی شخصیت

ہندوؤں کے ہاں مہاتما گاندھی اور نہرو کے بعد شاستری کی شخصیت کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں لیکن ان کا اندرونی انسان اس قدر متضاد واقع ہوا کہ ہندوستان کے صحافی ان کی دو رُخی پالیسیوں سے تنگ آکر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"ایک سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی جاتی ہے۔ اور ہم فانی انسان اس کا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔"

(بحوالہ "ہندوستان ٹائمز"۔ مورخہ ۵ جنوری ۱۹۶۶ء)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو کیا ہمارا ۲۹ سالہ تجربہ اس کی زندہ شہادت نہیں کہ یہ قوم کس قدر فریب کار واقع ہوئی ہے۔ اس کی مصلحت آمیزی کا اندازہ اس دلچسپ اور حقیقت پر مبنی واقعہ سے ہوتا ہے جس کا ذکر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے دسمبر ۱۹۷۵ء میں اخبارات میں کیا۔ انہوں نے کہا۔

ہندو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نظر میں

"ایک دن مسز سروجنی نائیڈو سے میں نے سوال کیا کہ میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ لوگ مہاتما گاندھی کو تھرڈ کلاس میں سفر کرنے اور بھنگیوں کی بستی میں اچھوتوں کے ساتھ رہنے کی اجازت

دے کر اپنی اس قدر قیمتی متاع کے لیے ایسا خطرہ کس طرح مول لیتے ہیں تو اس کے جواب میں سروجنی نائیڈو نے کہا کہ ہم ان کے لیے ڈبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسے اچھی طرح صاف کرتے ہیں۔ پھر ہم ان لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ سفر کرنا ہوتا ہے اور انہیں اچھوتوں کے سے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ دہلی میں ہم بھنگیوں کی بستی کی صفائی کا خاص طور پر اہتمام کرتے ہیں۔ اور جن لوگوں کو ان کے ساتھ رکھنا مقصود ہوتا ہے، انہیں بھی بھنگیوں جیسے کپڑے پہنا دیتے ہیں۔ اس بوڑھے آدمی کو اس طرح مفلسی اور غریبی کی حالت میں دکھانے کے لیے کانگریس کو جو کھیل کھیلنا پڑتا ہے، وہ بہت مہنگا ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" فروری ۱۹۷۶ء)

قائدِ اعظم کا تبصرہ

یہ تھا وہ گاندھی جو اپنی پوری ہندو قوم کے نزدیک اوتار مانا جاتا ہے۔ اسی منافقانہ روش کے پیشِ نظر قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا:

"ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے، وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے مفید مطلب نہیں ہوتا ہے وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندے نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔ اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کبھی زبان پر نہیں لاتے۔ جب اوزھول سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہیں بن پڑتی تو اندرونی آواز کو بلا لیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں وہ تو ایک چیستان بے معمہ ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" ۱۹۶۸ء)

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ان طویل اقتباسات کے پیش کرنے میں کوئی معذرت طلبی کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہوئے بھی یہ نہیں جانتے کہ ہندو کیا ہے اور ہمیں وہ کس قدر ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا کہ اگر ہم خود ان حقائق سے کما حقہٗ واقف ہوتے تو پھر صوبجاتی تفریق کے سلسلہ میں جو کچھ اب تک پاکستان میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے، اور نہ معلوم کہاں تک ہوتا رہے گا، یہ نہ ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں ہندوؤں پر خواہ مخواہ یہ گلہ ہے کہ وہ دو قومی نظریہ کے قائل کیوں نہیں جب کہ ہم میں بہت سے خود بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ مثلاً پاکستان بننے سے پہلے تو ہم ہندوؤں کے مقابلے میں الگ قوم تھے اور جب پاکستان بن گیا تو ہم نے یہاں چار قومیتوں کا نعرہ کچھ اس طرح لگایا کہ پاکستان کی ساری فضا اس چھوڑے گئے شوشہ سے زہر آلود ہو گئی لیکن

قبل اس کے کہ ہم اپنے اس سیاہ نامۂ اعمال کی ورق گردانی کریں اس بطلِ جلیل اور حریت و عظمت کے پیکر قائداعظم کے فرمودات کو سامنے لایا جائے کہ شاید معاملہ زیرِ نظر کی حقیقت و اہمیت کے نکھر اور ابھر کر سامنے آجانے پر ہماری یہ دیدہ کوری بانیٔ پاکستان کی سپہ سالاری کے اعتراف اور احترام میں جھک جائے اور شاید ہم یہ باور کرلیں کہ ہماری عظمت اور بقاء کا راز اسی جھکنے میں ہی پوشیدہ ہے اگر ہماری سوچ میں یہ انقلاب پھر پیدا ہوگیا تو یہ ایک عظیم انقلاب ہوگا۔

قائدِ اعظم کی شخصیّت

ہر وہ شخص جو کسی منزل کے حصول کے لیے کوشاں ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے وہ اس کے مقصد اور مدعا سے پوری طرح آگاہ ہو۔ لہٰذا اگر یہ دیکھنا ہو کہ قائدِ اعظم کے نزدیک ان کی اس تمام تگ و تاز سے مفہوم کیا تھا تو ان کے ہی الفاظ میں سُنیئے اور وہ یہ کہ :۔

پاکستان، اسلام کا بنیادی تقاضا تھا

" آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ " (بحوالہ "نیوز ریل" ۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء)

اسلام اور ہندو دھرم میں فرق

اور اس کی تشریح میں کہ اسلام کیا ہے فرمایا :

" اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کرسکیں گے، میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ "

(بحوالہ "اجلاس مسلم لیگ" لاہور ۳۰ مارچ ۱۹۴۰ء)

مزید وضاحت

قائدِ اعظم ان دو تہذیبوں کے باہمی تضاد سے بخوبی واقف تھے۔ جس کی وضاحت آپ کے اس خط میں ملتی ہے جو آپ نے مسٹر گاندھی کے نام ۱۹۴۴ء کو تحریر کیا گیا جس میں کہا گیا تھا:

"آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسان سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لیے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم ہو جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔" (بحوالہ "تقاریرِ جناح" جلد اوّل صفحہ ۱۴۰-۱۳۹)

اور ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈز کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔" (بحوالہ تقاریر جلد دوم صفحہ ۲۴۶)

۱۹۴۰ء کے بعد ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کے مدراس سیشن کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملّی تشخص کو مٹانے کے لیے جو کوشش کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ ہم نے اپنے جداگانہ تشخص اور جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہنا ہے۔ اس باب میں کسی کو کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔" (بحوالہ "تقاریرِ جناح" جلد اوّل صفحہ ۲۸۰)

اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو یہی مزید فرمایا:

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات اس قدر بنیادی ہیں کہ زندگی کا کوئی مسئلہ بھی تو ایسا نہیں جس میں ہم دونوں متفق ہوں۔" (بحوالہ "تقاریرِ جناح" جلد اوّل صفحہ ۵۰۳)

پہلا پاکستانی

اور یہی چیز دو قومی نظریہ کی بنیاد تھی جس کی وضاحت آپ نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں ان الفاظ میں فرمائی :

"پاکستان کا آغاز تو اُس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم اسلام قبول کر کے مسلمان ہُوا تھا۔ حالانکہ اس وقت ہنوز مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی جونہی کوئی ہندو مسلمان ہوتا، ہندو اُسے مذہباً ہی نہیں معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے بھی اپنی برادری سے خارج کر دیتے۔ (اسی طرح اس کی پہلی قومیت ختم ہو جاتی) جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اسلام نے ان پر یہ پابندی عائد کر رکھی تھی کہ وہ کسی دوسری قومیت میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ (اس طرح یہاں دو قومیں وجود میں آتی چلی گئیں) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی قصبہ اور ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود کسی ایک قوم میں مدغم نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ دو علیحدہ قوموں کی حیثیت سے رہتے چلے آ رہے ہیں۔"

(بحوالہ "تقاریر جناح" حصّہ دوم۔ صفحہ ۴۴)

مسلمان ایک الگ قوم ہے

قائدِ اعظمؒ کا سارا زور صرف ہی اس پر ہو رہا تھا کہ ہم ایک الگ قوم ہیں۔ کیونکہ آپ سے زیادہ اور کون جانتا تھا کہ اگر ہم یہ تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ایک الگ قوم کے لیے ایک الگ خطۂ زمین کے حصول کا مطالبہ مشکل نہ ہوگا۔ لہٰذا اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :

"یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ ہم اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں اور ایک قوم کے لیے لامحالہ ایک الگ علاقہ چاہیئے۔ اگر ایک قوم کے لیے اپنا علاقہ نہ ہو تو اس کے قوم پکارنے کا فائدہ کیا ہے... ایک قوم خلا میں تو نہیں رہ سکتی۔ وہ ہوا میں نہیں بلکہ زمین پر رہتی ہے۔ اسے زمین پر حکومت کرنی چاہیئے۔ اس لیے اس کی اپنی مملکت ہونی چاہیئے۔ اور یہی ہمارا مطالبہ ہے۔"

(بحوالہ "تقاریر جناح" جلد اوّل صفحہ ۲۴۷)

ایک مرکز نہیں ہو سکتا

حق اور باطل کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے کیونکہ حق اسی وقت تک ہوتا ہے جب تک وہ باطل کے مقابلے میں اپنے وجود کو برقرار رکھے۔ اور کیونکہ پاکستان کے حصول کا مقصد ایک قرآنی حکومت کا قیام تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ اس کی جداگانہ حیثیت کو ہمیشہ کے لیے برقرار رکھا جائے۔ چنانچہ اس حقیقت کے پیشِ نظر

قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:

"پاکستان نہ کبھی اس معاملہ میں سرِ تسلیم خم کرے گا نہ رضامند ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس قسم کا آئینی سمجھوتہ ہو جائے جس کی رو سے اس کا مرکز ایک بن جائے۔ اگر اس طرف سے اس قسم کی کوئی کوشش ہو جس سے ان دونوں ملکوں کو زبردستی ملا دینا مطلوب ہو تو ہمیں اسے سختی سے روک دینا چاہیئے (کیونکہ) دو قومی نظریہ محض ایک نظریہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے اور ہندوستان کی تقسیم اس حقیقت پر مبنی ہے۔" (بحوالہ "پاکستان ٹائمز" لاہور مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء)

قائدِ اعظمؒ کی بیباکانہ وضاحت

قائدِ اعظم نے اپنے مؤقف کو بیان کرنے کے لیے کبھی بھی کسی سے بھیک نہیں مانگی بلکہ جرأت اور وقار کے ساتھ اپنے مؤقف کو پیش کیا۔ یہ ان کی سیرت کی عکاسی ہی تھی کہ اُن کی گفتگو اس قدر مدلل اور جامع ہُوا کرتی کہ جس کا اعتراف اپنوں کو بھی تھا اور بیگانوں کو بھی۔ وہ اپنے مقصد کو کس قدر جامعیت اور بے باکی کے ساتھ پیش کرتے تھے اس کی ایک دو مثالیں حسب ذیل ہیں۔ ایک موقع پر "لندن ٹائمز" کے ایک مقالہ نگار کا جواب دیتے ہُوئے آپ نے فرمایا:

"مَیں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ ملّت اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح ملکہ معظمہ کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومت برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شاید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس کے لیے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصّہ دار ہیں ان سب پر لازم ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمّہ دار قوم متصوّر کریں۔" (بحوالہ "طلوع اسلام" اپریل ۱۹۴۶ء)

ہماری رُوح کو فنا نہیں کیا جا سکتا

جب مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہُوا جس میں مسلمانوں کے حقوق کی پامالی ہوتی تھی تو قائدِ اعظمؒ نے جس انداز میں اس بل کی مخالفت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ نے فرمایا:

"مَیں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی ہماری روح کو فنا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں

بل ہے۔ ہمارا نورِ ایمان زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو۔ ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔"

یوم پاکستان کی ایک تقریب پر تقریر کے دوران فرمایا تھا:

"اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریاں اور سازشوں پر اتر آئیں تو ہم اس کی مدافعت کریں گے تاآنکہ ہم ایک ایک کر کے کٹ کر مر جائیں"

ہمارا کوئی دوست نہیں

سنہ ۱۹۴۵ء میں پشاور میں ایک جلسۂ عام سے فرمایا:

"ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے خواہ وہ آپس میں متحد ہو جائیں۔"

جولائی سنہ ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کرے گی۔ اس لیے اب ہم اپنے حفظ و بقاء کے لیے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں۔ اور اب ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ براہِ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہو گا۔"

امریکہ، چین اور نہرو

طلوعِ اسلام کے کہنے کے مطابق:

"اس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شیک برسرِ اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوامِ متحدہ میں لے جایا جائے تو اس پر قائدِ اعظم نے نومبر ۱۹۴۶ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی مجنونانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے

کر اپنی حفاظت کے لیے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔۔۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جس کے سائے میں کانگریس راج رچایا جا رہا ہو گا ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔"

نہ برطانیہ کی حکمرانی نہ بھارت کی

فروری ۱۹۴۰ء میں لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا:

"برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم تو برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ ہندو کو ہم آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔"

لیکن برطانیہ کی اس خواہش کے باوجود کہ وہ یہاں حکومت کرے جب اسے یہ محسوس ہو گیا کہ جلد یا بدیر اسے یہاں سے رخصت ہونا ہی پڑے گا تو اس صورت میں وہ اس کوشش میں مصروف ہو گئی، کہ ہندوستان کسی شکل میں بھی تقسیم نہ ہونے پائے۔ تاکہ مسلمان ہندوؤں کے غلام بنے رہیں۔ چنانچہ برطانیہ کی اس سازش کے پیشِ نظر قائدِ اعظم نے سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں فرمایا:

"برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے جس میں قوت ہو۔ لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑیں گے۔"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا مقصد اور جناح کی استقامت

اور پھر اس چو مکھی لڑائی کے لیے ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک قائدِ اعظم رح کی اسالہ تگ و تاز اس کی زندہ شہادت ہے کہ آپ کو کس کس محاذ پر کس کس طریق سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ بالآخر انگریز نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا کہ جس طرح ممکن ہو، ہندوستان تقسیم نہ ہونے پائے۔ لیکن اُسے بھی اس مردِ مجاہد کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا جس کا اعتراف اس نے بی بی سی سے ایک انٹرویو براڈ کاسٹ کراتے ہوئے ان الفاظ میں کیا کہ:

"میں ہندوستان گیا تھا اس مقصد کے لیے تھا کہ اسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں

کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے تو چاہتے تھے کہ اسے ایک متحدہ شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لیے انتہائی کوشش کی لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناح۔ صدر مسلم لیگ جو شروع ہی سے نہ کہتا چلا گیا اور اس کے ارادہ کو بدلنے کے لیے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔"

(بحوالہ "طلوع اسلام" فروری ۱۹۷۶ء)

سچ کہا تھا علامہ اقبال رح نے کہ

؎ مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

قائد کا کریکٹر

جی نہیں چاہتا کہ اس بندۂ مومن کے کریکٹر کی ایک مثال پیش کیے بغیر آگے نکل جاؤں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی اس خواہش اور کوشش کے علاوہ برطانیہ کے وزیر اعظم لارڈ رمزے نے ہندوستان کو فیڈریشن کی شکل میں دیکھنے کی غرض سے ایک مرتبہ قائد اعظم رح کو خریدنے کی کوشش کی اور اس غرض کے لیے آپ کو کہا کہ:

"اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔"

تو اس پر ہمارے قائد نے جو جواب دیا تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ آپ نے فرمایا:

"اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔"

(بحوالہ "طلوع اسلام" اکتوبر ۱۹۷۶ء)

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ انگریز کی یہ خواہش تھی کہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں مسلمان ہندو کے غلام بنے رہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انگریز تو یہاں سے جا ہی رہا تھا تو پھر یہاں کون کس کا غلام بنتا ہے اور کون کس کا نہیں۔ اسے اس سے کیا واسطہ اور کیا تعلق کہ بوم بسے یا ہما رہے لیکن اصل تو یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کی صورت میں مسلمانوں کو ہندو کا غلام بنانے میں بھی ایک راز مضمر تھا۔ اور وہ راز یہ تھا کہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

برطانیہ کی خواہش

لہٰذا اس حقیقت کو جاننے کے لیے صرف لارڈ کرومر (برطانوی قوم کے نمائندہ) کے وہ الفاظ ہی کافی ہیں کہ:

"اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے لیکن اگر وہ اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔" (بحوالہ ہفت روزہ "ایشیا" ۱۸ر جنوری ۱۹۷۶ء)

یہی کچھ ہندو کہتا تھا اور یہی کچھ انگریز۔ اس موقع پر ہندوؤں کی طرف سے اسی انداز کا اقتباس پیش کرنے کے لیے ہمیں واپس ہندوستان ٹائمز کی ۱۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ اخبار نے لکھا تھا کہ:

"پاکستان بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف و ہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا، جتنا اِس حقیقت سے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول و روایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہو جائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کر دے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔"

پاکستان ہمارا جزوِ ایمان ہے

اور اس کے مقابلے میں دوسری طرف قائدِ اعظم جیسا راسخ العقیدہ مسلمان تھا جس نے پنجاب مسلم لیگ سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس منعقدہ ۱۸ر مارچ ۱۹۴۴ء میں ہی تقریر کرتے ہوئے فرما دیا تھا کہ:

"پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک جزوِ ایمان بن چکا ہے۔ یہ اب ایک نعرہ نہیں رہا۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور عقائد کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان کہ جب وہ وجود میں آگیا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونج اُٹھے گی کہ ہاں اب ایک ایسی مسلم اسٹیٹ کا قیام عمل میں آگیا ہے جو اسلام کے ماضی کی درخشندہ عظمت و شوکت کا احیاء کرے گی۔"

(بحوالہ "تقاریرِ جناح" جلد دوم صفحہ ۸۵)

یہ تھی اِس خطۂ پاکستان کی وہ اہمیت اور اس کا مقصد جس کے حصول کا آغاز قائدِ اعظم نے بے یار و مددگار کی حیثیت سے شروع کیا۔ تحریکِ پاکستان کے شروع میں ہمارے قائد کو کس قدر ناگفتہ بہ حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا، اس کی روئیداد خود قائدِ اعظم کی زبانی سُنیئے :

۵؍ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں "عہد نامہ لکھنؤ" کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

" نہ جانے اُن دنوں میری خودداریوں کو کیا ہو گیا تھا کہ مَیں کانگریس کے سامنے صلح کے لیے ہاتھ پھیلایا کرتا تھا۔ مَیں نے اس مسئلہ کے حل کے لیے اتنی انتھک اور مسلسل جدوجہد کی کہ ایک اخبار نے لکھا " مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کی کوشش سے کبھی بیزار نہیں ہوئے۔" لیکن واقعہ یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے اجلاسوں میں پہلی بار مجھے ایک شدید دھچکا لگا اور جن اندیشوں پر رواداری کے پردے پڑے رہتے تھے، وہ کھل کر سنگین خطرے کی صورت میں سامنے آ گئے۔ پھر ہندو دل و دماغ، ہندو جذبات اور ہندو روش نے ایسی صورت اختیار کی کہ اتحاد کی رہی سہی توقع بھی جاتی رہی۔

اُس وقت میرے احساسات پر ایک قنوطیت طاری ہو گئی تھی۔ جذبات پر یاسیت کا اثر چھایا ہوا تھا۔ اور مَیں اپنے ملک کے حالات سے نا اُمید ہو گیا تھا۔ ماحول کی فضا پریشان کُن تھی۔ مسلمان بے یار و مددگار تھے۔ ان کا کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ کبھی حکومتِ برطانیہ کے چاپلوس اور خوشامدی ان کی قیادت کا دم بھرتے اور کبھی کانگریس کے خوش اعتقاد مریدان کی سربراہی کا مظاہرہ کرتے۔ اگر مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کی جاتی تو ایک جانب سے انگریزوں کے ٹوڈی اور خوشامدی دوسری جانب سے کانگریس کیمپ کے پاپچریں سوار ان کوششوں کو بے اثر بنا دیتے۔ ان حالات میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا کہ نہ مَیں ہندوستان کی مدد کر سکتا ہوں، نہ ہندو ذہنیت کو تبدیل کر سکتا ہوں اور نہ ہی مسلمانوں کو ان کی حالتِ زار پر متوجہ کر سکتا ہوں۔ یہ احساس اتنا بڑھا کہ مَیں نے لندن میں اقامت اختیار کرنے کو مناسب سمجھا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہیں رہی تھی بلکہ اس لیے کہ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مَیں نے ہندوستان سے برابر اپنا رابطہ قائم رکھا۔ بالآخر پورے چار سال بعد مَیں نے دیکھا کہ مسلمان شدید خطرہ میں ہیں اور مَیں لندن

میں رہتے ہوئے ان کی بہبودی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں نے ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کر لیا[1] مگر میں بے یار و مددگار تھا۔ میری حیثیت ایک بن بلائے مہمان کی سی تھی اور پھر سلوک بھی میرے ساتھ ایسا ہی کیا گیا جیسا کسی بن بلائے مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

بہر حال میں نے ۱۹۳۵ء میں صوبائی انتخابات کے سلسلے میں صدر کانگریس سے گفت و شنید کی۔ نتیجے کے طور پر ایک فارمولا مرتب کیا گیا۔ مگر ہندوؤں نے اسے پسند نہ کیا۔ ۱۹۳۶ء میں کانگریس سے میں نے اپیل کی کہ جو کچھ ہوا وہ ہوا، اب کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ نمائندگی) پر کی جانے والی تلخ بحثیں ختم کر دی جائیں۔ اچھا یا بُرا جیسا بھی ہُوا اسے یونہی رہنے دیا جائے۔ تاآنکہ ہم ایک متفقہ حل نہ دریافت کر لیں۔ اور بہتر یہی ہے کہ اب ہم اس سے زیادہ اہم امور پر متوجہ ہو جائیں۔

اور پھر جب میں نے محسوس کیا کہ حصولِ اتحاد کے سارے طریقے آزمائے جا چکے تو میں نے ایک بار ٹھہر کر حالات کا جائزہ لیا۔ اُن کے تقاضے معلوم کیے تو دیکھا کہ یہاں تو نئے دستور کی آمد آمد ہے۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۶ء تک ہم نے اس سلسلے کچھ بھی تو نہ کیا تھا۔ ان مایوس کُن حالات نے مجھے پہلے سے زیادہ بے باک بنا دیا۔ چنانچہ میں نے اپریل ۱۹۳۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ اِس فیصلہ کی ہر طرف سے مخالفت کی گئی حتیٰ کہ کانگریس کے علاوہ بہت سے اپنوں نے بھی شدید مخالفت کی۔

خدا کا شکر ہے کہ ابتدائی تنظیمی ڈھانچوں کی تکمیل کے بغیر اور انتہائی بے سر و سامانی اور وسائل کی کمی کے باوجود اس انتخابی مہم میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی۔ ہر چند کہ ہمارے بعض اکثریتی صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارٹیاں بنی تھیں پھر بھی ۱۹۳۶ء سے ہم نے عزم و استقلال کے ساتھ جو کچھ کیا اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔

آیئے، اب ہم ایک بار پھر اپنے حالات پر غور کریں۔ سب سے پہلے دفتری ذہنیت اور افسر شاہی کو لیجیے۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمانوں پر ایک عرصے سے حکومت کرتے رہنے

---

[1] اس فیصلہ تک پہنچنے میں علامہ اقبال کا کس قدر ہاتھ تھا، اس کا ذکر آئندہ سطور میں ملاحظہ کریں۔

کے باعث اسے اس پر کوئی خاص حق حاصل ہوگیا ہے۔ اس حلقے کے بعض افراد کہتے تھے: "اگر یہ جناح دخل انداز ہوتا رہا تو مسلمان ہمارے قبضے سے نکل جائیں گے" اور ہُوا بھی ایسا ہی۔ خدا کا شکر ہے کہ مسلمان اب ان کی گرفت سے باہر آگئے ہیں لیکن اب اقتدار ایک حد تک اکثریتی فرقہ کے ہاتھ منتقل ہوگیا ہے اور یہ بات کھُل کر سامنے آگئی ہے کہ حکومتِ برطانیہ اب مسلمانوں کی دستگیری پر مائل نظر نہیں آتی بلکہ انہیں بھیڑیوں کی تحویل میں دے رہی ہے۔ اور یہ بھی اچھا ہی ہُوا — مسلم لیگ نے بڑی حد تک مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے چنگل سے چھُڑا لیا ہے لیکن اب ایک اور طاقت ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی ہے جسے زعم ہے کہ وہ حکومتِ برطانیہ کی جانشین ہے آپ اس کو جس نام سے چاہیں پکاریں مگر وہ دراصل "ہندو" اور "ہندو راج" ہے۔" — اس کے بعد آپ نے فرمایا "ہندوستان میں ہماری سیاسی تربیت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی روایات کے تحت ہوئی ہے۔ یہ دستور جو ہمارے اوپر تھوپا گیا ہے کم و بیش برطانوی طرز پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس ملک اور ہندوستان کے حالات میں بنیادی فرق ہے۔ برطانیہ میں اکثریتی سیاسی جماعتیں تغیر پذیر رہا کرتی ہیں۔ ان کا رنگ رُوپ اور ان کی قوت و مقبولیت آئے دن کم زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ آج اگر وہاں قدامت پسندوں کی حکومت ہے، تو کل لبرل پارٹی والوں کی اور پرسوں مزدور جماعت والوں کی۔ مگر ہندوستان میں یہ حالات نہیں ہیں — یہاں ایک مستقل ہندو اکثریت ہے اور باقی اقلیتیں ہیں جو کسی قابلِ قیاس مدت میں اکثریت بن جانے کی توقع نہیں کرسکتیں۔ ہوسکتا ہے کہ اکثریت غیر فرقہ وارانہ نقاب منہ پر ڈال لے لیکن وہ اپنی سرشت اور اعمال و افعال میں بلاشرکتِ غیرے ہندو ہی رہے گی — اقلیتوں کے لیے صرف یہی ایک امید کی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی تنظیم کرلیں اور اپنے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے اختیارات کا ایک معیّن اور فیصلہ کُن حصّہ حاصل کرلیں۔ ایسے واضح تحفظ کے بغیر ہندوستان میں کوئی بھی دستور کامیابی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ مجھے یقین ہے اور آپ بھی مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کانگریس کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ مسلمانوں میں افتراق پیدا کیا جائے جو برطانوی حکومت کی پُرانی چال ہے۔ کانگریسی اپنے آقاؤں کی اسی روش کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آپ اس سے خبردار رہیں اور ان کی چالوں میں نہ آئیں۔ اہلِ اسلام کے لیے یہ موت و حیات کے لمحات ہیں۔ اگر مسلمانوں میں باہمی اتحاد نہ ہُوا تو وہ کسی طرح بھی تباہی سے نہ بچ سکیں گے! مسلم نے آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا ہے لیکن یہ آزادی صرف با اختیار اور طاقتور ہی کے لیے نہ ہوگی بلکہ مجبور اور کمزور کے لیے بھی ہوگی!" (بحوالہ قائدِ اعظم نے فرمایا۔ شائع کردہ فیروز سنز لاہور)

قرآن ہمارا ضابطہ ہے

اور پھر جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ :

" کہ اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطۂ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرّہ کے معمولات، روح کی نجات کا سوال ہو یا انفرادی واجبات عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مواخذہ کا۔ ان سب کے لیے اس میں قوانین موجود ہیں اس لیے نبی اکرم نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآن کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔"

(بحوالہ " تقاریر " جلد دوم صفحہ ۳۰۰)

اسلام ایک مکمل دین ہے۔

اور جو شخص یہ بار بار اعلان کرے کہ " جب میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو ایک زبان اور محاورے کی رو سے میرا ذہن لامحالہ خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا، نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلام کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور طریق عمل نہ صرف مسلمانوں کے لیے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لیے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے، اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے۔"

(بحوالہ " قائدِ اعظم آپ کہاں ہیں " صفحہ ۱۵)

توان علمی، عملی اور تجرباتی حقائق کے پیشِ نظر اس شخص کو یہ کہنا کہ وہ اسلامی حکومت کے تصور سے باز آ جائے کیونکر ممکن تھا۔

ہندو کو بھی یہ اعتراف تھا

اور حقیقت تو یہ ہے کہ ان حقائق کا اعتراف خود ہندو کو بھی ہو چکا تھا کہ قائدِ اعظم کا پیش کردہ مؤقف اس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ اسے کسی صورت میں بھی ٹالا نہیں جا سکتا۔ مثلاً لالہ لاجپت رائے جو ایک کٹر ہندو لیڈر تھا اور تحریکِ پاکستان کا شدید ترین مخالف، اسے ایک مرتبہ مسٹر سی آر داس جو کانگریسی راہنما تھا، کو لکھتے ہوئے آخر کار یہ اعتراف کرنا پڑا کہ :

" ایک اور بات جو کچھ عرصہ سے میرے لیے وجۂ اضطراب بن رہی ہے ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس پر دعوت غور و خوض دوں۔ گذشتہ چھ ماہ میں میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اس سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز (ہندو مسلم اتحاد) ایک محال اور ناقابلِ عمل شے ہے وہ مسلمان راہنما، جو عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہیں اگر ان کی خلوصِ نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی میرے خیال میں ان کا مذہب ان کے راستے میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو گا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ میں کلکتہ میں اپنی اس گفتگو کا جو اس باب میں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر کچلو سے ہوئی تھی۔ آپ سے تذکرہ کیا تھا۔ ہندوستان میں حکیم اجمل خاں صاحب سے زیادہ سلجھا ہوا کوئی مسلمان نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکیم صاحب یا کوئی دوسرا مسلمان راہنما قرآن کریم کے احکام پر خطِ تنسیخ کھینچ سکتا ہے۔ . . . میں تہہ دل سے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کا قائل ہوں اس لیے میں مسلمان راہنماؤں پر اعتماد بھی کرنے پر تیار ہوں لیکن قرآن و حدیث کے احکام کو ہم کیا کریں گے مسلمان راہنما ان پر تو خطِ تنسیخ نہیں کھینچ سکتے۔"

(بحوالہ "تقاریر" جلد دوم صفحہ ۴۷/۵۰)

یہ تھا وہ اعترافِ خط کی شکل میں جس کا حوالہ قائدِ اعظم نے مسلم لیگ سیشن سنہ ۱۹۴۰ء کے خطبۂ صدارت میں دیا تھا۔ چنانچہ یہی بات قائدِ اعظم زندگی بھر اپنوں اور بیگانوں سے کہتے رہے کہ :

"مسلمان اس لیے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اس مملکت میں وہ اپنے ضابطۂ زندگی، اپنے ثقافتی نشو و نما اور روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

(بحوالہ "تقاریر" حصہ دوم صفحہ ۳۳۳)

اور ۱۳ نومبر ۱۹۳۹ء کو ریڈیو پر قوم کے نام پیغامِ عید نشر کرتے ہوئے اس نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی کہ :

"معاشی احیاء ہو یا سیاسی آزادی اسے آخرالامر زندگی کے کسی گہرے مفہوم پر مبنی ہونا چاہیئے اور مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہمارے نزدیک زندگی کا وہ گہرا مفہوم اسلام اور رُوح اسلام ہے۔"
(بحوالہ "تقاریر" جلد اوّل صفحہ ۱۰۸)

ہماری نجات کا واحد راستہ

اور اگر آخر پر مزید یہ دیکھنا ہو کہ قائداعظم کو قرآن حکیم کے عطا کردہ نظریۂ حیات پر کس قدر محکم یقین تھا۔ اور پھر آپ اس عالمگیر نظامِ حیات کو عملاً قرآنی شکل میں متشکل کرنے کے لیے اِس حاصل ہونے والے خطۂ کی حفاظت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے تو اس کے لیے پاکستان کے بچّہ بچّہ کو یہ الفاظ سن رکھنے چاہئیں ؛

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان نہ مٹ جائے تو اِس کے لیے پاکستان نہ صرف یہ کہ ایک عملی نصب العین ہے بلکہ یہی اور صرف یہی واحد نصب العین ہے۔"
(بحوالہ "تقاریر" جلد اوّل صفحہ ۲۶۷)

یہ آپ نے ۱۹۴۱ء میں مسلم یونیورسٹی یونین علی گڑھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا اور اس کے بعد اسی قسم کا انتباہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۵ء کو یوم پاکستان کی تقریب پر اپنا پیغام دیتے ہوئے کہا کہ :

"ہماری حفاظت، نجات اور عزّت و آبرو کے تحفظ کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ یاد رکھو اگر ہم اس جدّوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور پھر اس برّصغیر میں مسلمانوں کا اور اسلام کا نشان تک باقی نہیں رہے گا۔"
(بحوالہ "تقاریر" جلد دوم صفحہ ۲۵۵)

مملکتِ پاکستان کے قیام و بقاء سے اسلام کے علاوہ برّصغیر کے مسلمانوں کی نجات اور ان کی عزّت و آبرو کا تحفظ ہی مقصود نہ تھا بلکہ یہ خطّۂ زمین مشرق وسطےٰ کے لیے بھی اتنی ہی اہمیّت کا حامل ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جس کو آپ نے پاکستان بننے سے پہلے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ :

"ہمارے لیے پاکستان زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اس وقت کوئی بھی ایسی مسلم حکومت موجود نہیں جو صحیح معنوں میں آزاد ہو اس وقت تک ایران، مسلمان عرب حکومتیں اس وقت تک آزاد نہیں ہوں گی جب تک پاکستان قائم نہیں ہو گا۔ اِس لیے کہ جو ہندوستان پر اقتدار رکھتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ہندو شہنشاہیت قائم ہو گی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان سے اسلام ختم ہو گیا بلکہ ہندوستان سے ہی نہیں دوسرے اسلامی ممالک سے بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی اور روحانی رشتے ہمیں اور مصریوں کو ایک رشتے میں باندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ڈوبے تو سب ڈوب جائیں گے۔"
(بحوالہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور)

علامہ اقبال کا خط جناح کے نام

یہ تھا وہ عزم و ہمت کا پیکر محمد علی جناح جسے قوم نے قائدِ اعظم کہہ کر پکارا اور پھر جس نے زندگی بھر نگاہ بلند، سخن دلنواز اور جاں پُر سوز کا رختِ سفر باندھے ملّت کی کشتی کو ساحلِ مراد پر لا کھڑا کیا۔ اور یہی تھی وہ بے لوث اور جہاں بینی کی صفات کی حامل شخصیت جسے علامہ اقبال کی دُور رس نگاہ نے تلاش کرتے ہوئے ۲۱ر جون ۱۹۳۷ء میں انگلستان میں لکھا کہ :

"میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف انسان ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا آپ پر گراں نہیں گزرتا ہو گا (میرے اصرار اور تکریم کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہ میں اِس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کے ساتھ ملّت اسلامیہ کو اپنی یہ اُمیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے اس کی کشتی کو ثابت و سالم، بہ امن و عافیت ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے۔"

(بحوالہ " قائدِ اعظم کی سوانح عمری۔ مولفہ ہیکٹر بولیتھو۔ صفحہ ۱۱۵)

ان تصریحات کے بعد، قبل اس کے ہم یہ دیکھیں کہ قائدِ اعظم کے پاکستان کی تعمیر میں ہندو اور انگریز کے علاوہ ہم خود کس قدر مخل ہوئے اور پھر اس کی بیخ کنی کے لیے کیا کچھ کیا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ علامہ اقبال کے اس گوہرِ تابدار نے تحریکِ پاکستان کی ۱۰ سالہ طویل جنگ کو جیتنے کے لیے آخری دم تک کس اصول کو اپنا ہتھیار بنائے رکھا۔ ان حقائق کی واقفیت سے جہاں نئی نسل آپ کی کامیابی اور کامرانی کے راز سے واقف ہو گی وہاں ہر اُس راہرو منزل کے لیے جو دل میں ملّتِ اسلامیہ کا درد لیے کسی منزل کے حصول کا عزم کیے ہوئے ہو، راہنمائی حاصل کر سکے گا۔ اگر ہم نے ان حقائق کو اس طرح پا لیا تو ہمارا شمار احسان فراموشوں میں نہیں ہو گا۔

قائد کے دردِ دل کی آواز

سب سے پہلے یہ دیکھیئے کہ آپ کی ذات کس قدر شفیق اور حساس واقع ہُوئی تھی۔ یہ یکم مارچ ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے کہ آپ نے کلکتہ مسلم لیگ ورکرز سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

"میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ نے اپنے فضل سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گذار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں کے لیے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنت شاقہ آپ غریبوں کے لیے کر رہا ہوں۔ میں

نے ملک میں دردانگیز مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فردِ خوشحالی کی باعزت زندگی بسر کر سکے۔"

(بحوالہ "قائدِ اعظم اور قرآن" تتمہ)

قائد کی جرأت و بیباکی

قائدِ اعظم رح کی شخصیت شفیق اور حساس ہی نہ تھی بلکہ صاف گوئی کی بنا پر جرأت و بیباکی کی مالک بھی تھی۔ ایک مرتبہ تقسیمِ ہند سے پہلے صوبہ بمبئی کے گورنر لارڈ سیڈنہم نے اہلِ ہند کے خلاف کچھ تحقیر آمیز الفاظ کہے تو اس پر اس مردِ جلال و جمال نے اسے للکارا اور فرمایا :

" یہی وہ رجعت پسند جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز رہا اور اس سے تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی راہنمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لیے باعثِ فخر نہیں ہو سکتی ہیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حقِ خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لیے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔"

(بحوالہ "عظمت و کردار کا گوہرِ تابدار" صفحہ ۶)

گاندھی کے خلاف

اسی طرح ایک مرتبہ مسٹر گاندھی نے قائدِ اعظم رح کے خلاف یہ الزام عائد کیا کہ :

" مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جناح صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔"

تو ظاہر ہے آپ جیسا با اصول اور صاف گو شخص اس قسم کی غلط بیان بازی کو کب برداشت کر سکتا تھا۔ چنانچہ گاندھی کی اس ذلت آمیز حرکت کا جواب دیتے ہوئے فرمایا :

" یہ قطعی افتراء اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہتے۔"

(بحوالہ "عظمت و کردار کا گوہرِ تابدار" صفحہ)

اصُول پرستی کی خاطر اقتدار کی قربانی

اِس حق گوئی و بے باکی کے بعد ایک مثال اصول پرستی اور ایمان داری کی دیکھیے جس میں آج کی سیاستدانی کے لیے ہزار سبق پوشیدہ ہیں۔ بات یوں ہوئی کہ تقسیم ہند سے صرف ۵ ماہ قبل جب پنجاب میں خضر حیات خاں کی وزارت نے استعفےٰ پیش کر دیا تو گورنر کی طرف سے نواب ممدوٹ کو وزارت قائم کرنے کی دعوت دی گئی لیکن عددی اعتبار سے مسلم لیگ اسی وقت وزارت بنا سکتی تھی جبکہ کچھ غیر مسلم اراکین بھی شامل کر لیے جاتے۔ چنانچہ اس مصلحت کی بنا پر حسب یہ تجویز قائدِ اعظم کی خدمت میں پیش کی گئی کہ وقتی طور پر چند غیر مسلموں کو ساتھ ملا لیا جائے تو آپ اس بات پر سخت برافروختہ ہوئے اور فرمایا:

"آپ کان کھول کر سُن لیجئے کہ مَیں اِس قسم کی سیاسی چالبازیوں اور مصلحت انگیزیوں سے کبھی کام نہیں لینا چاہتا۔ میری سیاست ان سے بہت دُور ہے۔ تم غیر مسلم ممبر کہتے ہو میں تو غیر لیگی ممبروں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر کے کابینہ بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ دو قومی نظریہ کے خلاف ہوگا اور یہی نظریہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔"

اور چند ہی ماہ بعد پاکستان بن گیا تو نواب ممدوٹ نے پہلی لیگی وزارت قائم کر لی۔

(بحوالہ "قائدِ اعظم اور قرآن")

قائدِ اعظمؒ — دوسروں کی نظر میں

لارڈ ماؤنٹ بیٹن

آپ کی یہی بلند نگہی اور اصول پرستی تھی جس کے باعث لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، کو آپ کے متعلق یہ کہنا پڑا:

"جناح کی شخصیت بھی بڑی نمایاں اور ممتاز تھی۔ چٹان کی طرح اپنے مقام پر محکم اور سخت اور اس کے ساتھ انتہائی درجہ کا ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تم اس کے سینے کی گہرائیوں میں اُتر سکو۔ نہایت ذہین وفطین۔ وہ میرے دلائل کو نہایت آسانی سے سمجھ جاتا لیکن اس کے بعد ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے اپنے اور میرے درمیان کوئی پردہ لٹکا دیا ہو۔ وہ تمام دلائل کو ایک طرف رکھ دیتا اور مَیں ان کے جواب کے لیے اس کے دماغ میں ذرا سا تحرک

پیدا کرنے میں بھی ناکام رہتا۔ میں اسے اس کے مقام سے ذرا سا بھی سرکا نہ سکتا۔"

(طلوعِ اسلام ۔ فروری ۱۹۷۶ء)

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک دوسرے مقام پر کہا کہ:

" جناح ان لوگوں میں سے ہیں جو ذاتی اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر آگے نہیں بڑھتے ان کی سیاست پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی۔ ان کی پُر خلوص کوشش ہر قسم کی تنقید سے مبرا ہے۔"

("دی پڈا ویکلی")

وزیرِ اعظم برطانیہ سر ونسٹن چرچل

جہاں تک برطانیہ کے وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل کا تعلق ہے، اس نے کہا تھا کہ:

" مسٹر جناح اپنے ارادے اور رائے کے سخت ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جناح کسی قیمت پر بھی برطانیہ کے آلہ کار نہیں بن سکتے۔ ان کے متعلق بڑے سے بڑا لیڈر کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ کسی قیمت پر بھی خریدے نہیں جا سکتے۔"

(دا پڈا ویکلی ۱۹۸۲ء)

لارڈ برٹرینڈ رسل

لارڈ برٹرینڈ رسل جیسا عالمی شہرت یافتہ مفکر آپ کے جسمِ خاکی میں چھپی ہوئی شخصیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ:

" قائدِ اعظم رح اگر کسی فریق سے سمجھوتہ کرتے تھے تو جھک کر نہیں، بزدلانہ انداز میں نہیں، بلکہ مردانہ وار سمجھوتہ کرتے تھے۔"

(دا پڈا ویکلی ۱۹۸۲ء)

سر آغا خاں

دنیا کا وہ کون سا کونہ ہے جو سر آغا خاں کی ذات سے واقف نہ ہو۔ آپ قائدِ اعظم رح کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

" مجھے اپنی زندگی میں بے شمار سیاست دانوں سے واسطہ پڑا۔ لارڈ کرزن، لائیڈ جارج، ونسٹن چرچل، میسولینی، گاندھی ۔ لیکن جناح ان سب میں منفرد تھے ۔ میرے خیال میں ان کے ہم عصر سیاستدانوں میں کوئی شخص بھی ان سے زیادہ مضبوط سیرت و کردار کا مالک نہیں ۔ ہوش، تدبر،

عزیمت، استقامت جو سیاست کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔"

(ویکلی واپڈا ۱۹۸۱ء)

مسٹر گاندھی

انسان کو انسانیت کے مقام سے گرانے کے لیے تین قسم کے حربے ہمیشہ کارگر ثابت ہوئے اور وہ یہ کہ یا تو اسے مختلف طریق سے غصّہ دلا دیا جائے۔ لالچ کی طرف راغب کیا جائے یا پھر اسے مرعوب کر کے اپنا محکوم بنالیا جائے۔ اگر اس نقطۂ نظر سے قائدِ اعظمؒ کی شخصیت کے متعلق جاننا مقصود ہو تو پھر مہاتما گاندھی کے ہی الفاظ میں دیکھئے اور وہ یہ کہ:

"یہ حقیقت ہے کہ قائدِ اعظمؒ بلاشبہ اعلیٰ وارفع اوصاف کے مالک تھے۔ وہ سیرت و کردار کی ان بلندیوں پر تھے جہاں کوئی لالچ، خوف یا غصہ انہیں اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ وہ عزم و استقامت کے کوہ گراں تھے۔ نہ امارت و ثروت ان کی راہ میں حائل ہوئی نہ حکومت کا جاہ و جلال انہیں مرعوب کر سکا۔ محمد علی جناح کو مسلم عوام پر بے پناہ قابو حاصل تھا۔"

(بحوالہ" واپڈا ویکلی" ۱۹۸۳ء)

سروجنی نائیڈو

سروجنی نائیڈو جو برصغیر کی ممتاز مقررہ تھیں نے قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں فرمایا تھا:

"میں بڑی مدت سے مسٹر جناح کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے لیکن میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جاسکتا۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" اکتوبر ۱۹۷۶ء)

ایران کے سفیر آقائے علی اصغر

مملکتِ ایران کے سفیر آقائے علی اصغر حکمت نے آپ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

" ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی طرح ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسبِ فیض کیا جاسکتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لیے مینارۂ نور کا کام دے گی۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" اپریل ۱۹۷۷ء)

لکشمی پنڈت

سچ تو یہ ہے کہ برِ صغیر میں اگر قائدِ اعظم رح جیسا لیڈر نہ پیدا ہوتا تو اس خطۂ زمین کو برطانوی حکومت کے تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لیے کتنے سال اور درکار ہوتے اور اس چیز کا ثبوت کسی اپنے سے نہیں بلکہ ہندوؤں کے عظیم لیڈر رہے لکشمی پنڈت کے الفاظ میں سنیئے، جس کا اعتراف شعوری یا غیر شعوری طور پر ان الفاظ میں کیا گیا تھا کہ:

"مسلم لیگ کے پاس ایک سو گاندھی اور دو سو ابوالکلام آزاد ہوتے لیکن کانگریس کے پاس صرف ایک قائدِ اعظم ہوتا تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔"

مسٹر گوکھلے

مسٹر گوکھلے جیسے مدبر نے تو بہت عرصہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ:

"ہندوستان کو جب آزادی نصیب ہوگی وہ جناح کی ہی بدولت ہوگی۔" (طلوعِ اسلام، اکتوبر ۱۹۷۶ء)

ڈاکٹر سٹینلے

مسٹر گوکھلے کے بعد برطانوی مصنف اور کیلی فورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سٹینلے والفرڈ نے اس حقیقت کا اعتراف اپنی کتاب "جناح آف پاکستان" میں ان الفاظ میں کیا:

"قائدِ اعظم ہی وہ واحد شخصیت تھے جن کی کوششوں کی بدولت برِ صغیر پاک و ہند آزادی کی دہلیز تک پہنچا۔ قائدِ اعظم حالیہ تاریخ کے با اصول اور کرشمہ صفت انسان تھے۔ اور انہوں نے تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا۔ قائدِ اعظم نہایت حساس طبیعت کے مالک اور زخم خوردہ انسان تھے۔" (بحوالہ "جناح آف پاکستان" روزنامہ نوائے وقت ۲۰ اپریل ۱۹۸۸ء)

لہٰذا اگر دیکھا جائے تو غلامی کے طوق سے نجات دلانے کے متعلق قائدِ اعظم رح کا یہ احسان صرف ہم پر ہی نہیں تھا بلکہ ہندوؤں پر بھی تھا۔

ہندو جو شروع سے احسان فراموش چلا آ رہا ہے اس سے مثبت توقعات تو کی ہی نہیں جا سکتی تھیں، لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم بھی قائدِ اعظم رح کے اس احسان کا بدلہ نہ چکا سکے۔

مسٹر گاندھی

لہٰذا اس سلسلہ میں ضمناً عرض ہے کہ ہندو تو اپنے اندر اس کی بھی ہمت نہیں پاتا تھا کہ آزادی کے بعد وہ اپنے ملک کا ہی انتظام چلا سکے۔ جبکہ آزادی حاصل کرنا تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی کے الفاظ میں ان کی ہمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"تھوڑی دیر کے لیے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لیے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ مسلمان ہوں یا سکھ ہندوستان کو اپنی جولان گاہ بنا لیں گے۔ ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی امداد پر منحصر ہے۔" (بحوالہ جریدہ "اسٹیٹسمین" ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء)

مسولینی

مسولینی جیسی شہرت یافتہ شخصیت (اٹلی کا سربراہ) بھی قائدِ اعظمؒ کے متعلق یہ کہے بغیر نہ رہ سکی کہ:

"انسان کا قیمتی سے قیمتی سرمایہ یہی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ کردار اور عمدہ سیرت کا مالک ہو۔ قائدِ اعظم کی اعلیٰ سیرت و کردار وہ مؤثر حربہ تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنی زندگی کے ہر معرکہ کو سَر کیا۔"

(بحوالہ جریدہ "اسٹیٹسمین" ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء)

ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد نے آپ کو ان الفاظ سے یاد کیا کہ:

"جناح بے جا جذباتیت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر مسئلہ کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیتے تھے اور یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز تھا۔" (بحوالہ "اسٹیٹسمین" اکتوبر ۱۹۳۹ء)

راج گوپال

راج گوپال اچاریہ کی زبان پکار اُٹھی کہ:

"جناح کسی بھی طاقت کے آگے جھکنا نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے ہر محاذ پر انگریزوں اور ہندوؤں کو شکستِ فاش دی۔ انہیں زبان و بیان پر ملکہ حاصل تھا۔"

لندن ٹائمز

اور دنیا کے عظیم ترین اخبار "لندن ٹائمز" نے آپ کی وفات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

” انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک قوم ہیں ——— ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستان کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے، اس پر براہِ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔“ (بحوالہ ”عظمت کردار کا گوہر نایاب“ صفحہ ۱۱)

پروفیسر ڈاکٹر کراہمن

قائدِ اعظمؒ ناقابلِ تسخیر حریف اس لیے تھے کہ بقول جرمن سکالر پروفیسر ڈاکٹر کراہمن کے :

” قائدِ اعظم محمد علی جناح کے سامنے ماڈل قرآن مجید تھا۔“ (بحوالہ ”پاکستان ٹائمز“ ۲۰ فروری ۱۹۷۷ء)

سچ تو یہ ہے کہ یہ قرآن حکیم کا ماڈل ہی تھا جس نے آپ کی ذات میں یہ تمام مندرجہ بالا خصوصیات پیدا کر دیں جن کی وجہ سے آپ ایک بااصول، باوقار، باریک بین اور دل سوز شخصیت کے مالک قرار پائے۔ اس موقعہ پر جی نہیں چاہتا کہ (اس امر کی مزید وضاحت کے لیے) قائدِ اعظمؒ کی عملی زندگی کی چند ایک مثالیں پیش کیے بغیر ہم آگے چل دیں۔ جبکہ وہ مثالیں بھی ایسی ہوں کہ جن میں ہماری تاریک راہوں کو منور کرنے کا ہزار سامان پوشیدہ ہو۔ ویسے بھی قائدِ اعظمؒ کی شخصیت کے متعلق یہ تمام تر وضاحتیں آئندہ تحریر کیے گئے صفحات کے لیے ازبس ضروری ہیں۔

مذہب کی پبلسٹی سے گریز

قیامِ کوئٹہ کے دوران ایک روز یحییٰ بختیار اپنا کیمرہ اور فلیش لے کر قائدِ اعظمؒ کی رہائش گاہ پہنچے۔ اس وقت قائدِ اعظمؒ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر مشتمل ایک کتاب کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ یحییٰ بختیار صاحب یہ چاہتے تھے کہ وہ قائدِ اعظمؒ کی تصویر ایسے زاویے سے لیں کہ کتاب کا ٹائٹل بھی فوکس میں آ سکے۔ لیکن قائدِ اعظمؒ نے تصویر کھچوانے سے پہلے یہ کتاب علیحدہ رکھ دی اور یحییٰ بختیار خاں صاحب کے اصرار پر فرمایا کہ ” میں ایک مقدس کتاب کو اس قسم کی پبلسٹی کا موضوع بنانا پسند نہیں کرتا۔“

دھاندلی کی بجائے ہارنا بہتر

جی الانہ لکھتے ہیں کہ ۲۶/۳/۱۹۴۵ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات تھے۔ پولنگ سے قریباً چار ہفتے پہلے قائدِ اعظم کراچی تشریف لائے اور بحیثیت سیکرٹری مجھے صحیح صورت حال بتانے کے لیے کہا۔ میں نے عرض کیا کہ چار سیٹوں کا معاملہ تو زیادہ مشکل نہیں البتہ پانچویں نشست میں جہاں جی ایم سید کھڑے ہیں حاصل کرنا ناممکن ہے۔ قائد نے غصے سے میری طرف دیکھا اور گھورتے ہوئے پوچھا آخر اس حلقہ سے ہماری کامیابی کیوں نہیں ہو گی؟“ میں

نے وضاحت کی کہ قاضی اکبر کے بجائے جی ایم سیّد اپنے ضلع کے انتہائی بااثر شخص ہیں مگر قائدِ اعظمؒ نے فرمایا "میں جی ایم سیّد کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں لہٰذا قاضی اکبر کو بہر طور اس نشست سے کامیاب ہونا ہے تو اس حلقہ میں لٹریچر کی بارش کر دو۔ کارکنوں کی فوج بھیج دو۔ جلسے کرو اور قاضی اکبر کی انتخابی مہم کے لیے ہر قسم کی سہولت مہیا کرو۔ لیکن یہ بات یاد رکھو کہ انتخاب جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہ دی جائے۔ میں یہ ہرگز پسند نہ کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔"

احساسِ ذمّہ داری

مطلوب حسن صاحب آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ عظیم قائد کی زندگی کے ایک اہم گوشہ احساس ذمّہ داری کے متعلق بتاتے ہیں کہ یہ بات شاید آپ کو عجیب معلوم ہو لیکن قائدِ اعظمؒ میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے مشیر کار کی رائے اور فیصلے سے اتنے متاثر نہیں ہوتے تھے جتنے ادنیٰ درجوں کے پیروؤں کی رائے سے۔ ان کے عقیدت مند ہر طرح کی باتیں لکھ کر بھیجتے اور اس طرح کے سینکڑوں خط ہر روز ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے ان خطوں کو کھولتے۔ اگر کسی اہم قومی کام میں مصروف نہ ہوتے تو ہر خط کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھتے۔ ان خطوط کو پڑھ کر اپنے لاکھوں عقیدت مندوں کے صحیح احساس کا پتہ چلتا۔ یہ خط لکھنے والے جن کے نام سیاست کی دنیا میں کبھی کسی نے نہ سُنے تھے۔ ان کے سچے عقیدت مند ہونے کے باوجود ان کے کاموں پر نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔ بہرحال ہمارے قائد جہاں تک ممکن ہوتا ان کو جواب دیتے۔

گورنر جنرل کے منصب کا خیال

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش آپ کے ذاتی معالج تھے جن کو آخری عمر میں آپ کے قریب رہنے کا زیادہ موقع ملا۔ ان کا کہنا ہے کہ جب قائدِ اعظمؒ سخت علیل تھے اور کوئٹہ میں زیرِ علاج تھے تو ہم نے محسوس کیا کہ کوئٹہ میں ان کا قیام خطرے سے خالی نہیں تو میں نے اصرار کیا کہ وہ کراچی تشریف لے چلیں لیکن ہر بار انہوں نے اس تجویز کو رد کر دیا۔ رات کو میں نے محترمہ فاطمہ جناح سے تفصیلی بات کی۔ میرے اصرار پر انہوں نے بتایا کہ بیماری کی حالت میں قائدِ اعظمؒ گورنر جنرل ہاؤس واپس چلیں لیکن انہوں نے میری رائے سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ وہ بھی ایسی ہی جگہ ہے لیکن وہاں قیام کا مسئلہ پیدا ہوگا۔

میری نظر میں نواب آف بہاولپور کی کوٹھی تھی جس میں قائدِ اعظمؒ کے قیام کا اہتمام ہو سکتا تھا۔ ان دنوں ولی عہد اس میں فروکش تھے اور ان سے کوٹھی خالی کرانا مشکل نہ تھا بلکہ طے پایا کہ پہلے قائدِ اعظمؒ کو رضامند کرایا جائے پھر ولی عہد سے بات چیت کی جائے گی۔

اگلی صبح ئیں نے قائدِ اعظم رح سے بات چیت کی اور انہوں نے اپنی رضا مندی ظاہر کردی۔ چنانچہ اسی وقت کراچی کے جی او سی میجر جنرل اکبر خاں کو اطلاع دی کہ نواب آف بہاولپور کوٹھی خالی کرنے کو تیار نہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ نواب صاحب سے بھی اجازت لے لی جائے جو ۳۰ دسمبر کو لندن سے کراچی آ رہے ہیں۔ ۵ اگست کی صبح میں نے قائدِ اعظم رح کے سامنے صورت حال رکھی تو انہوں نے قدرے توقف کے بعد فرمایا؛

"آپ نے سُنا ہوگا کہ پہلے زمانے میں جب کوئی وکیل ہائی کورٹ کا جج بن جاتا تو کلبوں اور نجی محفلوں میں جانا بند کر دیتا تھا مبادا اس کی غیر حاضری پر اثر پڑے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے گورنر جنرل کے اعلیٰ منصب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ یہ بات درست ہے کہ اس وقت ہم ضرورت مند ہیں لیکن میں اپنی ذات کی خاطر اس عظیم منصب کی عظمت کو خاک میں نہیں ملا سکتا اس لیے تار دینے کی اجازت سے معذور ہوں۔"

قائدِ اعظم کی ظرافت پسندی

قائد کے معالج کرنل الٰہی بخش صاحب نے قائد کے آخری ایام میں جب کوئٹہ سے کراچی جانے کے لیے کہا تو قائد نے فرمایا:
"جلدی نہ کیجئے۔ مجھے یہاں سے یوں نہ دھکیلیے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے اُٹھ کر چلوں پھروں۔ لیکن کیا کروں مجھے ابھی تک کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ میں بستر سے نکلنے کا مشتاق نہیں۔ اس لیے آپ مجھ پر وہ علاج نہ آزمائیے جو ایک معالج نے ایک بوڑھی عورت پر آزمایا تھا۔ یہ عورت کئی ماہ سے بستر پر پڑی ایڑیاں رگڑ رہی تھی۔ جب وہ کسی قدر سنبھلی تو ڈاکٹر نے اسے اُٹھ کر چلنے پھرنے کا مشورہ دیا۔ وہ بولی۔ میں ابھی اس قابل نہیں۔ ایک ہفتہ کے بعد ڈاکٹر نے پھر یہی رائے دی۔ وہ پھر بھی نہ مانی۔ اور تامل کرتی رہی۔ آخر ہار کر وہ ڈاکٹر چلا گیا اور ایک دوسرے معالج کا علاج شروع ہُوا۔ اس نے سر سے لے کر پاؤں تک بڑھیا کا معائنہ کیا اور کہا کہ آپ کو واقعی اب کوئی تکلیف لاحق نہیں، بہتر ہے کہ آپ بستر سے نکل آئیں۔ بڑھیا تھی ضدی، ڈاکٹر کے مشورے کو خاطر میں نہ لائی اور برابر بستر ہی میں گھسی رہی۔" پھر قائدِ اعظم نے کچھ سیکنڈ کے لیے مجھ پر ایک پُرمعنی نظر ڈالی اور فرمایا؛ "پھر ایک تیسرا ڈاکٹر بلایا گیا جو آپ ہی کی طرح جلد باز تھا۔ اس نے کیا کیا کہ ایک روز چپکے سے بڑھیا کے بستر کو آگ لگا دی۔ چنانچہ بڑھیا بوکھلا کر چارپائی سے اچھلی اور تیزی سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔" اس پر قائدِ اعظم مسکرائے اور کہنے لگے، "آپ بھی میرے ساتھ یہی سلوک نہ کیجئے گا۔" ہم قائدِ اعظم کی اس بات پر خوب ہنستے رہے۔"

قائدِ اعظم رح کے آخری دستخط

فرخ امین صاحب قائد رح کے بہت نزدیک ہے وہ اپنی یادداشت میں لکھتے ہیں کہ قائدِ اعظم رح اپنی آخری بیماری کے زمانے میں بھی سرکاری امور پر توجہ رکھتے۔ جب تک ان میں ملکہ سکت رہی تمام کاغذات فائلیں منگواتے

عموماً ہم کوشش کرتے کہ انتہائی ضروری کاغذات ان تک پہنچائے جائیں۔ اس کے باوجود وہ کام کرنے پر مُصر رہتے تھے۔ مجھے وہ دن ہمیشہ یاد رہے گا جب انہوں نے یو این او میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لیے سر ظفر اللہ خاں کو پورے اختیارات دینے کے لیے آخری سرکاری کاغذ پر دستخط کیے۔

قائدِاعظمؒ انتہائی کمزور ہو چکے تھے اور خود اُٹھ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ہم نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور دونوں ہاتھ کے سہارے ان کے جسم پر سیدھا کیا۔ قائدِاعظمؒ نے تحکمانہ لہجہ میں فرمایا "مضبوطی سے پکڑو" لیکن آواز میں اس قدر ضعف تھا کہ قائدِاعظمؒ نے بڑی مشکل سے اس کاغذ پر دستخط کیے۔ جب وہ یہ کام کر چکے تو قطعی تھک چکے تھے۔ انہوں نے بڑے دردناک انداز میں فرمایا "امین میں بھی ہانپ رہا ہوں اور تم بھی ہانپ رہے ہو۔" میرا سانس بے شک تیز تھا لیکن اس لیے نہیں کہ قائدِاعظمؒ کو سہارا دینے سے تھک گیا تھا بلکہ میں اس لیے ہانپ رہا تھا کہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش نے مجھے تھکا دیا تھا۔ وہ شخصیت جس کے ایک اشارے پر لاکھوں انسان اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھے آج بیماری نے اسے نڈھال کر دیا تھا کہ مجھے اسے پکڑنے کی ضرورت پیش آ رہی تھی۔ اس خیال نے مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ انہیں بستر پر لٹاتے ہی میں کمرے سے نکلا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے بعد میری کوشش ہوتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے، قائدِاعظمؒ کی خدمت میں نہ جاؤں کیونکہ مجھے دیکھ کر انہیں کوئی سرکاری کام یاد آ جاتا۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس قدر کمزوری میں بھی کام جاری رکھیں۔

قائدِاعظمؒ کے آنسو

تقسیم کے فوراً بعد ایک موقع پر قائدِاعظمؒ جب کراچی کے ہوائی اڈے پر اترے تو لوگوں نے انہیں دیکھ کر "قائدِاعظمؒ زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ قائدِاعظمؒ نے ہاتھ ہلا کر، ہجوم کے خلوص کا جواب دیا۔ بیگم عبداللہ ہارون بھی استقبال کرنے والوں میں دوسری خواتین کے ساتھ شامل تھیں اور قائدِاعظمؒ کے بہت نزدیک پہنچ چکی تھیں۔ سب نے دیکھا کہ قائد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے جو پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والوں کے لیے تھے۔

اپنے عوام پر اعتماد

قائدِاعظمؒ اور ان کے ملٹری سیکرٹری کے درمیان صرف ایک مسئلے پر اختلاف پیدا ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان میں مجنونوں کی کمی نہ تھی اور ان میں بہت سے ایسے تھے جو موقع ملنے پر کسی لیڈر کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ملٹری سیکرٹری نے قائدِاعظمؒ سے اجازت چاہی کہ گورنمنٹ ہاؤس میں ایک اونچی دیوار اس طرح تعمیر کروائی جائے کہ جس حصے میں قائدِاعظمؒ کا قیام تھا وہ بالکل الگ اور محفوظ ہو جائے جب یہ تجویز پہلی دفعہ قائدِاعظمؒ کی خدمت میں پیش کی گئی تو انہوں نے جواب دیا:

"یہ بہت اچھی بات ہے کہ آپ کو میری حفاظت کا اتنا خیال ہے۔ لیکن آپ نے اس سے پہلے جو گورنر جنرل دیکھے ہیں میری حیثیت ان سے بہت مختلف ہے۔ میں اسی ملک کا باشندہ اور اسی قوم کا فرد ہوں۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں۔"

کرنل برنی اس بات سے مطمئن نہ ہوئے اور جواب دیا کہ ممکن ہے کوئی ہندو آپ پر گولی چلا دے۔ قائد نے پھر یہی جواب دیا کہ "میں اپنے ملک میں، اپنی ہی قوم کے لوگوں کے درمیان ہوں اور مجھے کسی طرح کا خطرہ نہیں ــــ اور میں بہرحال اس کو فضول خرچی سمجھتا ہوں۔" اس آخری فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی نجی زندگی کی طرح سرکاری معاملات میں بھی وہ روپیہ خرچ کرنے میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھے۔"

بہرحال یہ تھے دو قومی نظریے کے وہ نقوش اور یہ تھیں قائدِ اعظم" کی وہ بنیادی خصوصیات جن کی بنا پر آپ نے اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک قربان کر دیا۔ حتیٰ کہ آپ ٹی بی کے مریض ہو گئے۔ لیکن اس کے باوجود دن کا چین اور راتوں کی نیند اپنے اوپر حرام کیے رکھی۔ صحت کی اس کمزوری کے پیشِ نظر جب کبھی محترمہ فاطمہ آپ کو آرام کے لیے کہتیں تو آپ جواب میں فرماتے کہ:

"فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج اپنی بقاء اور آزادی کی جنگ میں مصروف ہو۔" (بحوالہ "میرا بھائی۔" صفحہ ۱۲)

اور پھر یہ کہ اس قدر جانفشانی کے دوران اپنے ٹی بی کے مرض کو راز بنائے رکھا حتیٰ کہ اپنی زندگی کی سب سے زیادہ راز داں بہن سے بھی اور "مونٹ بیٹن" (FREEDOM AT MID NIGHT) نامی کتاب (جس میں مونٹ بیٹن کی ڈائری کے اوراق شائع ہوئے تھے) کے مطابق اس راز کو راز اس لیے رکھا کہ:

"اگر مونٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربستہ راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیم ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔"

جناب محمد سعید صاحب، پاکستان کے ممتاز صحافی اور دانش ور کے الفاظ میں:

"قائدِ اعظم مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا سمبل بن کے ابھرے۔ منطق اُن کی ریخ بستہ ہوتی اور خطابت شعلہ فشاں، دلائل پر جائیے تو مفر نہیں تھا۔ خطابت پر جائیے تو رکنا محال ہوتا"

نیز قائدِ اعظم کی شخصیت اور نہرو کی شخصیت میں کس قدر بنیادی فرق تھا اس کے متعلق جناب محمد سعید صاحب اپنی کتاب "آہنگِ بازگشت" میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"قائدِ اعظم بھی آئے اور یونیورسٹی کی کایا پلٹ گئے۔ کہاں نہرو پرستی کا یہ عالم، ہر طالب علم اس کی حسین و جمیل صورت کا قتیل اور اُس کی آئیڈیل ازم کا پجاری تھا اور کہاں قائدِ اعظم کی تقریر کہ جس سے ہر شخص کے قلب میں خود شناسی کی لذت پیدا ہو گئی۔ قائدِ اعظم کا کام

شکل تھا۔ ایسی عمر میں جب نوجوان کی نگاہیں حقائق کی بجائے رومان کی قوس و قزح دیکھنا چاہیں انہیں کسی پُرخار وادی کی جانب لے جانا بڑا کٹھن کام تھا لیکن جس یقین اور بصیرت سے وہ اس وادی میں انہیں لا رہے تھے وہ بجائے خود سفر کی کلفتوں کو کم کرنے والی تھی۔"

علامہ سلیمان ندوی

اور آخر پر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے بقول کہ:

"کہنے کو تو ہم میں ملت کے غم خواروں کی کوئی کمی نہیں اور نہ ملت کے دوستوں کی قلت مگر واقع یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے غم خوار پیدا کیے۔ ایک محمد علی جناح مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم۔" (بحوالہ "یادِ رفتگان")

(قائد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی تعریف کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت کے اعتراف کے طور پر ہے۔ کیونکہ مسٹر اصفہانی کے بقول، قائدِ اعظم کہا کرتے تھے کہ جو لوگ میری دیانت داری کی تعریف کرتے ہیں وہ کسی طور پر بھی میری عزت افزائی نہیں کرتے۔ دیانت دار ہونا تو انسانیت کا تقاضا ہے اور انسانی تقاضے کو پورا کرنے پر تعریف کیسی؟)

تصویر کا دوسرا رُخ

یہ تھا وہ بطلِ جلیل اور پُراعتماد مُدبّر جس کی زندگی کے بعد قرآنی حکومت کے قیام کا شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوگیا اور پھر آہستہ آہستہ کیفیت یہ ہوگئی کہ ہم مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی میں کچھ اس طرح اُلجھے کہ حکومت الٰہی کے تمام راستے جو قائد کی ذات نے خونِ جگر سے روشن کیے تھے، تاریک سے تاریک تر ہوتے چلے گئے اور دین اور دنیا کی اس دیرینہ ثنویت کے باعث وہ مقصد پایا ہی نہ جا سکا جس کے لیے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔

حقیقت کو تسلیم نہ کرنے کا نتیجہ

اگر دیکھا جائے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر دین و دنیا کی یہی ثنویت تھی جس کے باعث ہم شعوری اور عملی طور پر تو پاکستان بننے سے پہلے دو قومی نظریہ کے قائل ہوئے اور نہ ہی پاکستان کی تشکیل کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوئے۔ کیونکہ اگر یہ ذہنی طور پر تسلیم کر لیا ہوتا تو پھر (۱) قائدِ اعظمؒ کو اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ اس قدر طویل جنگ نہ لڑنا پڑتی۔ (۲) پاکستان کی سرحدیں موجودہ سرحدوں سے کہیں مختلف ہوتیں (۳) پھر شاید پاکستان کو ہندوستان کے ساتھ دو جنگوں میں بھی نہ اُلجھنا پڑتا (۴) مشرقی پاکستان کا نام حرفِ غلط کی طرح تاریخ کے صفحات سے مٹ سکتا۔ (۵) اور آج اس بچے کھچے پاکستان کی فضا چار قومیتوں کے نعروں سے اس طرح زہر آلود نہ ہوتی۔

ہندوستان ٹائمز کی جرأت

ہماری یہی وہ کمزوری ہے جس کے باعث ہندو ذہنیت کے اخبار "ہندوستان ٹائمز" کو یہ لکھنے کی جرأت ہوئی تھی۔

"حکومت الٰہیہ کا تصور ایک داستان پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعل عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں۔ مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لیے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار راہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔"

(بحوالہ "ہندوستان ٹائمز" ۱۴ نومبر ۱۹۳۹ء)

یہ سب کچھ کیوں اور کس طرح ہوا؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے ہمیں ایک بار پھر اس دور کی جدوجہد کے متعلق ورق گردانی کرنی پڑے گی جس دور میں قائداعظمؒ کی شخصیت تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کر رہی تھی۔ ممکن ہے کہ اس ورق گردانی سے ہمیں اپنی خامیوں کا احساس ہو جائے اور ہم نوشتہ دیوار کو پڑھنے کے قابل بن جائیں۔ لیکن افسوس کہ ؎

ہم اپنی روئداد کیا سنائیں کچھ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا ہمیں سمجھتے اسے فسانہ!

لیکن اس روئداد کو سننے سے پیشتر آپ سابقہ اوراق میں بیان کردہ ہندوؤں کی طرف سے دو قومی نظریہ کے متعلق کی جانے والی مخالفت، ان کے لیڈروں کے مختلف بیانات، پاکستان کو ختم کرنے کے لیے مختلف منصوبے اور اس کے مقابلے میں قائداعظمؒ کی عملی جدوجہد اور ان کے ارشادات کو، ایک بار پھر سامنے لائیں اور اس کے بعد اس روئداد کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ہندوؤں کی مخالفت اور ان کی سوچ اور ہماری غلط نگہی اور سوچ میں کچھ بھی فرق تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس مشترکہ روئداد کے پیش کرنے کے بعد جہاں ہمیں اپنی علتِ مرض کو جاننے کا موقع ملے گا وہاں قائداعظمؒ کی عظمت اور نکھر کر سامنے آ جائے گی اور اس سے یہ بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ آپ کی ذات نے ایک قرآنی مملکت کے قیام کی خاطر — آزادی کے اس میدان میں کس قدر ثابت قدمی کے ساتھ اپنے سینے پر تیر کھائے۔

راقم کے لیے یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نزدیک اُمت واحدہ کی قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی شرک ہے۔ اس لیے نہ تو مجھے کسی مذہبی فرقہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ کسی

سیاسی پارٹی سے کوئی لگاؤ۔ لہٰذا آئندہ سطور میں جو کچھ عرض کیا جائے گا اس سے مقصود صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم سب مل کر خدا کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے قابل بن جائیں اور بس!

ہندو کی عیّار سیاست اور مولانا آزاد

ہندو ذہنی طور پر اس قدر عیّار واقع ہُوا تھا اور ہے کہ اس نے تحریکِ پاکستان کے دوران دو قومی نظریہ کی مخالفت کے لیے قائدِ اعظمؒ کے بالمقابل خود مسلمانوں سے مولانا آزاد کو منتخب کیا تاکہ ان پر یہ ثابت کیا جاسکے کہ دو قومی نظریہ قطعی طور پر صحیح نہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۴۰ء میں مولانا آزاد نے (بحیثیت صدر کانگرس) لاہور میں ایک تقریر کے دوران فرمایا کہ:

"مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جُدا گانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مَیں اس باب میں ان سے متفق نہیں۔" (بحوالہ "اسٹیٹسمین" ۱۹ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء)

اور اس کے بعد رام گڑھ کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں کہا:

"ہماری ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر اس پر لگ چکی ہے۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہندوستانی قوم ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکی ہے۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تصور ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

اور اس کے بعد امام (الہند) حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نہایت فخریہ انداز میں فرماتے ہیں کہ:

"مَیں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مَیں ہندوستانی ہوں۔ مَیں ہندوستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔"

تقسیم کے بعد

اگر تقسیمِ ہند کے بعد مولانا مرحوم کے خیالات معلوم کرنا چاہیں تو اس کے لیے ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ جریدہ "مدینہ" (بجنور) کی زبانی سُنیئے۔ اس نے اپنی ۵ر مارچ ۱۹۵۸ء کی اشاعت میں مولانا آزاد کی وہ تقریر شائع کی تھی جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے جامع

مسجد دہلی میں کی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا :

" ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریۂ حیات مسلمانوں کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جس پر تم نے بھروسہ کر رکھا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں یہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا ہوا کرتا ہے۔ مجھے آج جو کہنا ہے اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی غلطی تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا ہی نتیجہ ہے ۔" (بحوالہ " طلوعِ اسلام " جون ۱۹۸۱ء)

" نیز یہ کہ مسٹر جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو جداگانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ میں اس باب میں ان سے متفق نہیں۔" (بحوالہ سٹیٹسمین - مورخہ ۱۹، فروری سنہ ۱۹۴۰ء)

گاندھی کی بیعت سے پہلے

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ابو الکلام کا یہ راگ گاندھی جی کی بیعت کے بعد کا ہے۔ ورنہ دو قومی نظریہ کے متعلق وہ اس سے پہلے بالکل وہی کچھ کہتے تھے جو کچھ علامہ اقبال رحمہ اور قائدِ اعظم رحمہ نے کہا تھا یعنی :

" مسلمان صرف ہندوؤں کے مقابلے میں ہی نہیں بلکہ دیگر تمام غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں ایک الگ قوم ہے" کیونکہ " خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی "

مولانا ابو الکلام آزاد کی اسی قسم کی دیگر خوب صورت تحریروں کے لیے دیکھئے : البلاغ ۱۱/۱۹۱۵، ۲ - اور الہلال ۱۲/۱۹۱۲، ۸

قائدِ اعظم رحمہ کا تار بنام مولانا آزاد

مولانا آزاد (جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی) کے صدر تھے، کی یہی وہ مخالفانہ سوچ تھی جس کی بنا پر جولائی میں قائدِ اعظم رحمہ نے مولانا آزاد کے ایک تار کے جواب میں فرمایا تھا کہ :

" چونکہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا اعتماد کلیتہً کھو چکے ہیں اس لیے میں بذریعہ خط و کتابت یا کسی اور نہج سے آپ سے ان معاملات پر بات نہیں کرنا چاہتا۔ کیا آپ کو اس امر کا احساس نہیں کہ آپ کو ایک نمائشی صدر بنانے سے ہندوؤں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کہ اس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ کانگریس یقیناً ایک قومی جماعت ہے اور اس طرح باہر کی دنیا کو دھوکا دیا جائے آپ نہ ہندوؤں کے نمائندہ ہیں نہ مسلمانوں کے۔ کانگریس ہندو جماعت ہے اس لیے اگر آپ کو عزتِ نفس کا کچھ بھی پاس ہے تو اس جماعت سے فوراً مستعفی ہو جائیں۔ آپ نے اس وقت

تک مسلم لیگ کی تخریب کے لیے انتہائی کوشش کر دیکھی اور آپ کو علم ہے کہ آپ کس طرح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہیں۔ اب ان حرکات کو چھوڑ دیجئے۔" ("طلوعِ اسلام" مئی ۱۹۸۲ء)

بلکہ قائدِ اعظمؒ کو اسی تار میں مولانا آزاد صاحب کی اس خدمت گذاری پر انہیں کانگریس کا "شو بوائے" تک کہنا پڑا تھا۔

لیکن اس کے برعکس آج ہمارے ہاں اخبارات میں یہ اعلان ہو رہا ہے کہ:

"ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام جناح ہال میں ایک جلسہ ہوگا جس کی صدارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی (جو مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے جانشینوں میں سے ہیں) کریں گے۔ خطبۂ صدارت کا موضوع ہوگا "مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اور حضرت شیخ الہند کا ان سے خصوصی تعلق۔" (بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور، مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۲ء)

سچ ہے کہ اگر ہم ان دو قومی نظریہ سے اختلاف رکھنے والے "محسنوں" کی یاد کو تازہ نہیں رکھیں گے تو اور کون رکھے گا؟

جوش ملیح آبادی

جہاں تک جوش ملیح آبادی جیسی مشہور و معروف شخصیت کا تعلق ہے دو قومی نظریہ کے متعلق ان کا فتویٰ تھا کہ:

"اپنے آپ کو مسلم یا ہندو پہلے اور ہندوستانی بعد میں کہنا جغرافیائی صداقت اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے۔ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے۔ لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے ۔۔۔ قومیت تو ہمارا گوشت پوست ہے اور ہمارا لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور خمیر کو کون بدل سکتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے باہر ہے۔"

(بحوالہ: جوش صاحب کا اپنا رسالہ "کلیم" دسمبر ۱۹۳۷ء)

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم)

اس کے بعد مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (جو اپنے زمانہ میں شیخ الہند تھے) نے فرمایا:

"ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، آزادی

حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اِس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔" (بحوالہ "زمزم" ، جولائی ۱۹۳۸ء)

اور پھر فرمایا:

"کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں جس کی وجہ سے مذہب اسلام کو تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔"

مدنی صاحب مرحوم کے اسی بیان پر علامہ اقبال رح نے فرمایا تھا کہ:

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت — نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور ایک دوسری جگہ "ضربِ کلیم" میں فرمایا:

ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا — اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد!

نیز مدنی صاحب نے فرمایا:

"جواہر لال نہرو ہندو ہے اِس لیے اس نے کبھی نہیں کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس کے باوجود وہ مسلمانوں کی حفاظت چاہتا ہے۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" اکتوبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۴)

اور شیخ الہند کے اس قول سے کون واقف نہیں کہ:

"قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں۔" (بحوالہ "معرکہ دین و وطن")

جبکہ قائدِ اعظم رح کے نزدیک قومیں اوطان سے نہیں بلکہ دین اور صرف دین کے اشتراک سے بنتی ہیں — (اور قرآنِ حکیم کی رو سے قوم الکٰفرین اور قوم یؤمنون الگ نظریات کی دو الگ قومیں ہیں) جبکہ مدنی صاحب کے خیال میں قائدِ اعظم رح مسلمان نہیں بلکہ کافر تھے۔ چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے یہ فتویٰ صادر کر دیا کہ:

"مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائدِ اعظم کافرِ اعظم ہے۔" [1]

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" جنوری ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۶)

کاش لیگ کے پاس ان حضرات کے لیے ۵۰ ہزار روپے ہوتے تو یہ مردِ مومن کافر نہ گردانا جاتا!

مدنی صاحب کا خط بنام شوکت علی صاحب

یہی وہ حسین احمد مدنی (مرحوم) ہیں جنہوں نے ۱۹۳۸ء میں مولانا شوکت علی (مرحوم) کو ایک خط تحریر کیا تھا:

---

[1] جمعیت علمائے ہند کے صدر اور راجیہ سبھا کے رکن مولانا سید اسعد مدنی صاحب نے پاکستان میں اپنی تشریف آوری پر "جنگ فورم" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ "میرا تعلق کانگریس سے ہے مگر یہ دین یا عقیدے کا مسئلہ نہیں۔"

(بحوالہ جمعہ میگزین جنگ۔ دسمبر ۱۹۸۴ء)

"چونکہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندو اکثریت میں اور ان کی اکثریت بھی غیر معمولی ہے اور تین اور ایک کی نسبت ہے اور ان کی یہ حالت ہے کہ آج تک ڈاکٹر مونجے صاحب یہی فرما رہے ہیں کہ یہ سرزمین کسی مسلمان یا کسی اور فرقہ کی زمین نہیں ہے یہاں جو راج قائم ہوگا، وہ ہندو راج ہوگا۔ مجھے کروڑوں ہندو رضاکاروں کی ضرورت ہے جو مظالم آئے دن یہاں دفتروں میں شہروں میں اور ریاستوں میں کیے جا رہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت حسب تصریح جناب "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت نہیں بنا سکتے۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" اپریل ۱۹۴۲ء)

مدنی صاحب کا صدارتی خطبہ

اور پاکستان بننے کے بعد مولانا حسین احمد مدنی نے جمیعت العلمائے ہند کے اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۴۸ء میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا تھا کہ:

"تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد بھی تقسیم ہو گئے ہیں ہمارا فریضہ اب یہی ہے کہ ہم مسلمانانِ ہند کے مفاد کا تحفظ کریں نہ کہ ان مسلمانوں کے مفاد کا جو سرحدِ ہند کے اس پار پاکستان میں بستے ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں شدید قسم کے اختلافات رونما ہوئے تو ہمارا مسلک ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی روشنی میں متعین کرنا ہوگا نہ کہ پاکستان کے مفاد کے پیشِ نظر وہ اپنے مفاد کی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔"

(بحوالہ "ہندوستان ٹائمز" ۲۸ اپریل ۱۹۴۸ء)

مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب

مولانا غلام غوث ہزاروی مجلس احرار میں ایک مقتدر حیثیت کے مالک تھے اور جہاں تک پاکستان کی مخالفت کا تعلق ہے تو آپ نے جون ۱۹۷۲ء کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میں آج محترمہ اندرا گاندھی کو خطاب کرنا چاہتا ہوں کہ میں تحریک آزادئ وطن میں ابتدا سے شریک رہا ہوں۔ اور جب آپ کے والد پنڈت جواہر لال نہرو قصبہ بفہ میں آئے تھے اور انہیں جو سپاسنامہ پیش کیا گیا وہ میں نے لکھا تھا۔ انہوں نے اسے سنبھال کر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ ہماری جماعت نے جنگِ آزادی میں بھرپور حصہ لیتے ہوئے ملکی تقسیم کی مخالفت کی تھی۔

مگر آپ کے بڑوں نے ملکی تقسیم کا فیصلہ کرتے وقت ہم لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے ہمیں مشکلات میں ڈال دیا جو کسی وفادار ساتھی کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔" (بحوالہ روزنامہ "جنگ" ۴ جون ۱۹۷۲ء)

مفتی محمود صاحب

اس کے بعد مفتی محمود صاحب جو حسین احمد مدنی کے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے متعلق اخبار نوائے وقت نے اپنی اشاعت بابت ۲۷ ستمبر ۱۹۷۷ء کے اداریہ میں لکھا تھا کہ:

"قومی اتحاد کے سربراہ مولانا مفتی محمود صاحب اپنے ایک انٹرویو میں یہ کہہ چکے ہیں کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ صوبائی خود مختاری اور مسلمانوں کا مفاد بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس لیے تحریکِ پاکستان کے مخالف تھے۔"

اور اس کے بعد جمعیت علماء پاکستان کے اس زمانہ کے سینئر نائب صدر سید محمود گجراتی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا:

"مولانا مفتی محمود نے خود پی این اے کے ایک اجلاس میں کہا تھا کہ وہ پاکستان کو قائم کرنے کے گناہ میں شامل نہیں تھے۔" (بحوالہ روزنامہ "مشرق" مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۷ء)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مفتی محمود صاحب پھر اسی پاکستان جس کے قیام کو گناہ سمجھتے تھے، کے صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔ سچ کہا تھا کہ

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

مفتی محمود صاحب مرحوم کے صاحبزادہ صاحب

مفتی محمود صاحب کے بیان کے بعد اگر ان کے صاحبزادہ صاحب کا ذکر کیا جائے تو پاکستان بننے کے ۴۰ سال بعد بھی وہ تحریکِ پاکستان کو اسلام کے نام پر دھوکہ متصوّر کرتے ہیں۔ چنانچہ مولانا فضل الرحمٰن (جو آج کل جمعیت علماء اسلام کے سیکرٹری جنرل ہیں) کے اس بیان پر کہ "تحریکِ پاکستان کے وقت اسلام کے نام پر دھوکہ کیا گیا تھا" صوبائی اسمبلی کی رکن بیگم فرحت خواجہ رفیق نے فرمایا کہ:

لہ اس فتوے کا جواب مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے تحریر کیا جو ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو حیدر آباد دکن کے جریدہ "رہبرِ دکن" میں شائع ہوا۔

" تحریکِ ختمِ نبوت کے موقع پر ان پاکستان مخالف مولویوں کو اپنی دکان چمکانے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ قوم ان کی عزت کرنے لگی۔ لیکن یہ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ ان مولویوں کے ذہنوں سے تحریکِ پاکستان اور بانئ پاکستان کی دشمنی کا زہر نہیں نکلا۔ قوم کو ان عناصر کے بارے میں نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔"
(بحوالہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور، ۶ جولائی ۱۹۸۵ء)

مولانا سراج احمد دین پوری

مفتی محمود صاحب اور ان کے صاحبزادہ کے بیانات کے بعد حال ہی میں کالعدم جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا سراج احمد دین پوری صاحب نے اسی قسم کا بیان دیتے ہوئے فرمایا:

" تحریکِ پاکستان کے دوران " پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ بھی ڈھونگ تھا جو مسلمانوں کے جذبات اُبھارنے کے لیے لگایا گیا تھا ورنہ پاکستان کے قیام کی وجہ معاشی تھی۔"

اس کے بعد آپ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ:

" خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کا اسلام اب نافذ نہیں ہو سکتا کیونکہ موجودہ دور میں یہ چھوٹے ملک کی حکومت طفیلی ہے۔"
(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور۔ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

علماءِ دیوبند نے کوئی کوشش نہیں کی

ہندوستان کے مشہور نیشنلسٹ اخبار "مدینہ" (بجنور) ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں مولانا اسرار احمد صاحب آزاد (دیوبندی) نے یہ فرمایا تھا کہ:

" یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علماءِ ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔"

اور شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ مذہبی پیشوائیت کا اقتدار سیکولر اسٹیٹ میں زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ اس لیے ان حضرات کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان سے انگریز واپس چلا جائے اور ہندوستان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب مل کر مشترکہ حکومت قائم کریں۔

مجلس احرار کی قرارداد

جہاں تک مجلس احرار کا تعلق ہے یہ اس زمانے میں کانگریس کی ہمنوا تھی۔ اس مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۹، مارچ ۱۹۴۶ء میں ایک قرارداد پاس کی جس میں کہا گیا تھا کہ :

" یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ "

مولانا مظہر علی اظہر

اور اسی جماعت کے ایک مشہور لیڈر مولانا مظہر علی اظہر نے قائدِ اعظمؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا ؎

اِک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا — یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام واقعہ کے یکسر خلاف ہی نہیں تھا بلکہ (مولانا) کی لاعلمی کا مظہر تھا۔ آپ نے جس پارسی عورت سے شادی کی تھی وہ شادی سے پہلے مسلمان ہو چکی تھی۔ اس کے ثبوت کے لیے اس وقت کے اخبارات گواہ ہیں۔

مولانا نورانی کا فرقہ

اس کے بعد مولانا احمد رضا خاں بریلوی (مرحوم) کے متبعین آتے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی (کالعدم جمعیت العلمائے پاکستان کے صدر) اسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس فرقہ کی طرف سے فتویٰ صادر ہوا تھا:

" بحکم شریعت، مسٹر جناح اپنے ان عقائد کفریہ، قطعیہ، یقینیہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر و مرتد ہونے میں شک رکھے یا ان کو کافر کہنے میں توقف کرے وہ بھی کافر و مرتد ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام "۔ (بحوالہ تجانب اہلسنت عن اہل الفتنۃ صفحہ ۱۲۲)

مولانا اولادِ رسول

نیز اسی فرقہ کے ایک (ممتاز عالم) مولانا اولادِ رسول نے ایک رسالہ " الجوابات السنیہ " شائع کیا۔ اس میں حزب الاحناف لاہور کے مولانا ابو البرکات سید احمد (مرحوم) کا یہ فتویٰ درج تھا کہ :

" لیگ کی حمایت کرنا۔ اس میں چندے دینا، اس کا ممبر بننا۔ اس کی اشاعت و تبلیغ کرنا۔ منافقین و مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔ " (بحوالہ " مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی)

اور علامہ اقبال کے متعلق ارشاد تھا کہ :

" ڈاکٹر صاحب کی زبان پر شیطان بول رہا ہے۔ اگر ان اعتقادات کے باوجود بھی ڈاکٹر صاحب مسلمان ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی اور اسلام گھڑ لیا ہے۔ " (تجانب اہل السنۃ صفحہ ۲۴۴/۲۴۵)

مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا بیان قائدِ اعظم کے متعلق

قائدِ اعظم کو تحریکِ پاکستان کی کامیابی کے لیے کن کن مراحل سے گذرنا پڑا اس کا اجمالی سا ذکر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تالیف "استحکامِ پاکستان" میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ :

"یہ حقیقت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب برِ صغیر پاک و ہند میں ہندو مسلم مسئلے کے پورے تاریخی پس منظر کو سمجھا جائے اور خاص طور پر ان نئی پیچیدگیوں کا فہم و شعور اور ان نئی جہتوں کا ادراک حاصل کیا جائے جن کا اضافہ اس انتہائی اہم اور نازک مرحلے میں انگریزوں کے لگ بھگ دو صد سالہ دورِ اقتدار میں ہوا تھا۔"

چنانچہ ان حقائق کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ :

"ایک جانب پوری ہندو قوم تھی جو 'اکھنڈ بھارت' کو اپنے دھرم یعنی 'دین و ایمان' کا مسئلہ بنائے ہوئے تھی اور اس کے نزدیک بھارت کی تقسیم 'گؤ ماتا' کے ٹکڑے کر دینے کے مترادف تھی اور یہ معاملہ ان کے نزدیک کس قدر جذباتی نوعیت کا تھا اس کا اندازہ گاندھی جی کے اس تاریخی جملے سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے تقسیمِ ہند کے آخری فیصلے سے کچھ ہی دن پہلے کہا تھا یعنی "پاکستان صرف میری لاش پر بن سکتا ہے"

(مولانا ابوالکلام آزاد، انڈیا ونز فریڈم ۔ صہ ۱۶۷)

. . . . . یہاں یہ واضح رہے کہ گاندھی جی کوئی عام اور غیر اہم انسان نہیں تھے بلکہ جدید ہند کے بہت بڑے سیاسی لیڈر اور ہندوؤں کے لیے تو ایک عظیم رہنما ہی نہیں مہاتما تھے! اور انہیں عام طور پر جذباتی اور مشتعل مزاج انسان نہیں سمجھا جاتا!!

اکھنڈ بھارت کے اس قدر جذباتی اور پُر جوش حامی تو اگرچہ صرف ہندو ہی تھے لیکن انہیں اس معاملے میں بھرپور تائید حاصل تھی ہندوستان کی جملہ غیر مسلم اقوام کی . . . . . جیسے سکھ، پارسی اور عیسائی!! . . . . اور اس پر مستزاد یہ کہ خود مسلمانوں کے بعض فعال عناصر تقسیمِ ہند کے خلاف تھے جن میں اہم ترین معاملہ تو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زیرِ قیادت کانگریسی مسلمانوں اور مولانا حسین احمد مدنی رح کی زیرِ سرکردگی جمعیت علمائے ہند اور ان کے متوسلین اور معتقدین کا تھا! پھر پنجاب میں مجلس احرار اسلام ایسی زور دار عوامی خطباء و مقررین پر مشتمل جماعت تھی اور سرحد میں خدائی خدمت گاروں جیسا پُرجوش عوامی کارکنوں کا گروہ تھا!"

ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان

مندرجہ بالا تصریحات کے بعد جہاں تک مودودی صاحبؒ اور تحریکِ پاکستان کا تعلق ہے، قبل اس کے کہ اس سلسلہ میں ان کی تحریروں کے مختلف اقتباسات پیش کیے جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وہ بیان جو پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا بمع روزنامہ نوائے وقت کے تبصرہ کے درج کر دیا جائے تاکہ تحریکِ پاکستان کے متعلق مودودی صاحب کی سابقہ تحریروں کو سمجھنے میں کوئی اُلجھاؤ محسوس نہ ہو۔ آپ نے فرمایا تھا کہ:

"جو لوگ تحریکِ پاکستان کی صفِ اوّل میں شامل تھے وہ ہمیں سچے مسلمان نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے دل میں اس تحریک (کے اسلامی ہونے) کے متعلق شکوک کی یہ وجہ تھی کہ ہم صرف قائدِ اعظم کے خلاف نہیں تھے (بلکہ) اِس پوری قیادت کے خلاف تھے جو تحریکِ پاکستان کو چلا رہی تھی۔"

اداریہ نوائے وقت

چنانچہ اس پر "نوائے وقت" نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

"اور آخری گذارش کی ضرورت جنوری میں قومی اتحاد کے قیام کے ساتھ ہی محسوس ہونے لگی تھی لیکن اب ایک بزرگ سیاستدان اور عملی سیاست سے ریٹائر ہونے کے باوجود جماعت اسلامی کی حد تک اہم ترین شخصیت مولانا مودودی نے ایک مقامی انگریزی معاصر سے انٹرویو میں تحریکِ پاکستان کی "ساری لیڈرشپ کے اندر مسلمان نظر نہ آنے" کے سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے اس کے باعث ہمیں افسوس کے ساتھ یہ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قوم و ملک جس نازک مرحلے سے گذر رہے ہیں اس کے پیشِ نظر ایسے غیر مدبرانہ اور نامناسب باتوں کا اصرار کے ساتھ اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی باتوں سے مولانا مودودی کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ یہ تو وہ خود ہی جانتے ہیں لیکن اس طرح وہ اپنی جماعت کو موجودہ سیاسی تناظر میں ایک الجھن میں مبتلا کرنے کے علاوہ اپنے سیاسی حلیفوں کو بھی مشکل سے دوچار کر سکتے ہیں۔"

نوائے وقت کا ایک اور اداریہ

ان تمام حقائق کے باوجود ستمبر ۱۹۸۶ء کے دوران قاضی حسین احمد نے سینٹ میں ایک تحریکِ استحقاق پر بحث کرتے ہوئے جب ایک بار یہ فرمایا کہ:

"یہ بات غلط ہے کہ جماعتِ اسلامی نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی" تو اس بیان کے خلاف رکن سینٹ مسٹر سعید حفتاری صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ: "جماعتِ اسلامی کی طرف سے پاکستان کے

بارے میں جاننا ہو تو آج کے نوائے وقت میں مولانا مودودی کا مضمون پڑھ لیں۔" اور اس سلسلہ میں دوسرے روز مورخہ ۲۴/۹/۹۶ کو مدیر نوائے وقت نے اداریہ لکھتے ہوئے تحریر کیا کہ :

" حقیقت یہ ہے کہ اس سال مولانا مودودی مرحوم کی برسی کے موقع پر خود جماعتِ اسلامی کی ہائی کمان کی طرف سے مذکورہ مضمون ہمیں اشاعت کے لیے بطورِ خاص موصول ہوا، ہماری طرف سے کوئی درخواست نہیں کی گئی اور ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ مذکورہ مضمون کے انتخاب میں جماعتِ اسلامی کی موجودہ قیادت کے پیشِ نظر کیا مصلحت تھی، لیکن اس ضروری وضاحت کے بعد ہم قاضی حسین احمد اور ان کی فکر کے حامل دیگر عناصر پر یہ کھلی حقیقت بھی واشگاف کرنا چاہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کا سہرا سوائے علامہ اقبالؒ اور حضرت قائدِ اعظمؒ کے کسی کے سر نہیں سجتا۔ جب خود مولانا مودودی مرحوم نے اپنے مذکورہ مقالے کے ذریعے اپنی غلطیوں کو تسلیم کیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ ان کی عظمت کی دلیل ہے تو پھر ان کے پیروکار کس بنیاد پر یہ رٹ لگا رہے ہیں کہ جماعتِ اسلامی نے قیامِ پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس حد تک تو قاضی صاحب نے بھی اقرار کیا ہے کہ جماعت میں کچھ خامیاں موجود تھیں۔ ہمارا مقصد یہاں ان خامیوں کو اُجاگر کرنا یا زیرِ بحث لانا نہیں، لیکن برملا طور پر اس حقیقت کا اظہار کریں گے کہ صرف مسلم لیگی ذہن ہی نظریہ پاکستان کا خالق اور اس مملکت کا بانی ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور انہی کی نظروں نے اس تصور کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے قائدِ اعظمؒ کا انتخاب کیا۔ علامہ اقبالؒ کا یہ انتخاب ایک "بشارت" ثابت ہوا اور حضرت قائدِ اعظمؒ نے اس نصب العین کو حاصل کر دکھایا۔ جماعتِ اسلامی کی طرف سے اگرچہ جماعت سے باہر کے لوگوں کو "پیدائشی مسلمان"، "بابو" یا "لادین" کہہ کر مطعون کیا جاتا ہے، جبکہ انہی پیدائشی مسلمانوں اور بابوؤں نے جدید تاریخ کا ایک انقلاب آفریں کارنامہ سرانجام دیا تھا اور صفحۂ ہستی پر خالصتہً اسلام اور مسلمانوں کے نام پر ایک مملکت قائم کر دکھائی تھی۔ ہم آج بھی اسی خیال کے حامی ہیں کہ اسلام کو اقبالؒ اور سیاست کو قائدؒ کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہم دانشورانہ بھول بھلیوں اور فکری انتشار کے اندھے غار سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اقبالؒ اور قائدؒ کی فکر کو آگے بڑھانے اور اس کی تشریح و توضیح کا کام جاری رہنا چاہیے تھا۔ لیکن قائدِ اعظمؒ کی بے وقت موت کے بعد مسلم لیگ کی سیاسی قیادت یہ فریضہ بوجوہ انجام نہ دے سکی۔ اور خانہ خالی را دیو می گیرد کے مصداق نظریہ پاکستان کی ذمہ داری زبردستی دوسروں نے اپنے ذمہ لے لی۔ اگرچہ بجائے خود یہ

کام مجرا نہیں تھا لیکن نئے اجارہ داروں نے اپنے علاوہ باقی پاکستانیوں کو سچا مسلمان سمجھنا ہی چھوڑ دیا اور ان کے لیے بطورِ خاص "پیدائشی مسلمان" کی اصطلاح گھڑ لی گئی۔ ہم کسی پر ان حوالوں سے نکتہ چینی کر کے بدگمانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتے بلکہ محض یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ صرف اور صرف اپنے آپ کو اسلام کا داعی اور نفاذِ اسلام کا خواہاں قرار دینے سے جو لوگ پہلے بھی مجموعی قومی دھارے سے کٹے رہے ہیں اور آئندہ بھی یہ پالیسی ان کے لیے سود مند نتائج کی حامل نہیں ہو سکتی، انہیں اپنی انا کے دائرے سے باہر نکلنا چاہیے اور اسلام یا دینی موضوعات پر گفتگو کا حق دوسروں کو بھی دینا چاہیے ورنہ پیر پگاڑا کے بقول یہ "ازم" باقی سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے ہمیشہ متصادم رکھے گا۔ اور اس باہمی کشمکش کا فائدہ یقیناً ان لوگوں کو پہنچے گا جو اس مملکت کے دشمن ہیں۔ اِس کے نصب العین کے دشمن ہیں۔

لیکن دوسری طرف روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳۰-۹-۸۶ کے مطابق مولانا مودودی ؒ صاحب مرحوم کی ساتویں برسی کے موقع پر پروفیسر مرزا منور صاحب نے ایک مقامی ہوٹل میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"اگر مولانا مرحوم تحریکِ پاکستان میں شامل نہیں ہوئے تو انہوں نے اس کام میں مداخلت بھی نہ کی تھی بلکہ مولانا خود کہتے تھے کہ اگر مسلم لیگ اس تحریک میں ناکام ہو گئی تو وہ اس کو خود آگے چلائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا صرف جماعتِ اسلامی ہی کے نہیں بلکہ پوری امت کے ہیں۔" بہرحال مودودی صاحب نے قائدِ اعظم ؒ کا نام لیتے ہوئے اس قسم کا اظہارِ خیال پہلی مرتبہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس سے پیشتر اپنی کتاب "سیاسی کشمکش" کے حصہ سوم کے صفحہ ۳۷ پر تحریر فرمایا کہ:

قائدِ اعظمؒ اسلامی طرزِ فکر سے عاری تھے

"افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔" — اور پھر فرمایا کہ:

"ایسے لوگوں کو محض اس لیے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرزِ تنظیم کے استادِ فن ہیں اور قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔" (حصہ سوم۔ صفحہ ۷۰)

پھر فرمایا: "ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔" (حصہ سوم۔ صفحہ ۷۴)

اِس سے آگے چل کر تحریر کیا کہ:

"پھر وہ لوگ جو اس طائفہ کے سرخیل ہیں ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جایئے، تو آپ کو نماز کے وقت کوئی یہ بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت کعبہ کدھر ہے اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجیے تو شاید کوئی صاحب دو فیصدی سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے۔" (ایضاً۔ حصہ سوم صفحہ ،،)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

"نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی جھگڑا ہے نہ انگریزوں سے۔ وطنیت کی بنیاد پر ہماری کوئی لڑائی ہے نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا بنے بیٹھے ہیں۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے نہ اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور صرف یہ کہ اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔"

("سیاسی کشمکش" حصہ سوم۔ صفحہ ۱۱۰)

مودودی صاحب کے اس بیان کی روشنی میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان میں ہندوؤں کی مخلوط حکومت سے مل کر کسی ایسی حکومت کا قیام ممکن تھا تو پھر آپ پاکستان کیوں تشریف لے آئے؟ حقیقت یہ ہے کہ آپ کو پورے ہندوستان میں کوئی مسلمان نظر نہیں آتا تھا۔ ان کے اپنے الفاظ میں کہ:

"اس وقت ہندوستان کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں۔ اگر فی الواقع اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب جنس بے کار نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علماء دین اور مفتیان شرح متین دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ اور دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔" ("سیاسی کشمکش" حصہ سوم۔ صفحہ ۹۵)

آپ نے مزید تحریر کیا کہ:

"نہ ان کی جماعت اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے۔ نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و طاعت کا حق پہنچتا ہے۔"

("سیاسی کشمکش" حصہ سوم، صفحہ ۹۵)

"محض لفظ مسلمان سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو گی۔ ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے۔" ("سیاسی کشمکش" حصہ سوم صہ ۸۲)

پھر فرمایا:

"اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں فرق ہی کیا ہے۔" ("سیاسی کشمکش" حصہ سوم صہ ۸۲)

یعنی اگر بحیثیت قوم کا وجود بھی باقی نہ رہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (راقم)

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اِس مسئلہ میں بھی کوئی دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمانوں کی کثیر تعداد ہے وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔" (ایضاً) پھر فرمایا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کرایا جائے۔" اور اس کے بعد یہ کہ:

"آزاد وطن کے نعرے اور پنڈت نہرو کے سروں میں امپیریلزم کی مخالفت یہ سب ہمارے لیے بکری کی بولیاں ہیں۔" (ایضاً۔ صفحہ ۹۹) اور اس کے بعد آپ کا یہ بیان کہ:

"مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔"

"یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے کے لیے کافی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔" اور اس کے بعد لکھا ہے:

"اس پورے گروہ میں ایک بھی کو ممکن نہ تھا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی۔ جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندہ بنے ہوئے تھے۔"

قائد کے متعلق مودودی کے مزید ارشادات

ملک پاکستان میں ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات کے دوران سامنے آنے والا ایک اشتہاری پرچہ نظر سے گزرا جس کا عنوان تھا "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!" اور یہ پرچہ جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی صاحب کے ارشادات پر مشتمل تھا جس میں جناب مودودی صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

۱۔ پاکستان کا قیام الو کی پیدائش درندے کے برابر ہے۔

(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ نمبر ۵ اشاعت ۴۸ء پاکستان)

۲۔ "محمد علی جناح کا مقام مسند پیشوائی نہیں بلکہ بحیثیت غدار عدالت کا کٹہرا ہے۔"

(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ ۶۲ اشاعت ۱۹۴۸ء)

۳۔ "تقسیم ہند کے تین اداکار تھے اور محمد علی جناح کی اداکاری سب سے زیادہ ناکام رہی۔"

(ترجمان القرآن جلد نمبر ۳۱ صفحہ ۷۰ اشاعت ۱۹۴۸ء)

۴۔ محمد علی جناح جنت الحمقاء (احمقوں کی جنت) کا بانی اور اصل فاجر (گنہگار انسان) ہے۔
(ترجمان القرآن فروری ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۵۳)

۵۔ مسلم لیگ کو ووٹ دینا حرام ہے۔ (ترجمان القرآن جلد نمبر ۲۸ صفحہ ۱۲۵ اشاعت پٹھان کوٹ)

۶۔ پاکستان جنت الحمقاء اور مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہے۔
(ترجمان القرآن ۱۹۴۶ء صفحہ ۱۵۴)

۷۔ انتخابی مہم شکاری کتوں کی دوڑ ہے۔ (کوثر ۲۸ جنوری ۱۹۵۰ء)

۸۔ مہاجر وہ بھگوڑے اور بزدل ہیں جنہوں نے قومیت کی جنگ لڑی اور جب سزا بھگتنے کی باری آئی تو راہ فرار اختیار کر لی۔ (بیان مولانا مودودی نوائے وقت ۲۹ اگست ۱۹۴۸ء)

تحقیق این ایم فاضل، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

ہمارا اصل مقصد

پاکستان کے حصول کے بعد ایک موقع پر قائدِ اعظم رح نے فرمایا تھا کہ:

"پاکستان کا قیام جس کے لیے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لیے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں اور اسلام کے عدل عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔"

(بحوالہ "تقاریر" جلد دوم صفحہ ۲۲)

لیکن ظاہر ہے کہ اس عظیم مقصد کا حصول اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس خطۂ زمین میں پرورش پانے والی نئی نسل کی ذہنی آبیاری قرآنی خطوط پر نہ کی جائے کیونکہ ذہنی نشو و نما اور تعلیم و تربیت کے بغیر حسین سے حسین خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

انقلابِ چین کے رہنما کا تجزیہ

یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انقلابِ چین کے قائد ماؤزے تنگ نے کہا تھا کہ:
"دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا مسئلہ ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لیے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ تحریک کے لیے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہیئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لیے بڑے طویل المیعاد صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے اور نہ ہی ایسی کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور وعظوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کر دیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جاکر مرتب ہوتے ہیں اس لیے راتوں رات انہیں بدلا نہیں جاسکتا۔ یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لیے آمادہ کرنا ہوگا۔"

(بحوالہ "قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں۔")

لیکن مودودی صاحب کا نقطۂ نظر

لیکن اس زمانے میں مودودی صاحب کا کہنا یہ تھا کہ:
"بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز کی ہی سہی مسلمانوں کی قومی اسٹیٹ قائم ہو جائے تو پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کر لیا جاسکتا ہے مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں۔ اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے تو اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا۔"

("سیاسی کشمکش" حصہ سوم ص ۱۴۸)

آپ ان مندرجہ بالا مختلف بیانات کو سامنے رکھیے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کیا قوم کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تمسخر ہو سکتا ہے۔ اے کاش یہ سب کچھ ایسا نہ ہوتا۔

لیکن اس کے برعکس یہ بھی

"قائدِ اعظم مرحوم کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے۔"
اور جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیا نے مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء میں تحریر کیا کہ:
"اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ اس سے سیاسی آزادی مقصود نہیں بلکہ اسلام کی حفاظت مقصود ہے۔ اقبال نے آپ کو نظریہ دیا، قائدِ اعظم نے اس نظریہ پر ایک وطن حاصل کیا۔"

مودودی صاحب نے ۱۴ اگست ۱۹۷۶ء کو روزنامہ "نوائے وقت" میں جو مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا تھا، اس میں آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

"یہی وہ زمانہ تھا جس میں مسلم لیگ کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک زبردست عوامی قوت کی حیثیت سے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ابھری۔ قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا مسلمان اس کے فتنے سے بچ گئے اور ان کے اندر یہ جذبہ شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا کہ ہندوستان میں ان کی قومیت کے امتیازی وجود کو ایک آزاد اور مستقل حیثیت ہونی چاہیئے۔"

سب سے زیادہ احترام

اور اس کے بعد فرمایا:

"آپ کی معلومات کے لیے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا ان میں سے ایک قائدِ اعظم مرحوم بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک با اصول، راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا۔ اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔"

اقلیتی صوبوں میں نفرت

جن دنوں تحریکِ پاکستان ثمربار ہو رہی تھی تو آپ کی طرف سے اقلیتی صوبوں کو متنفر کرنے کی خاطر یہ کہا جا رہا تھا کہ:

"ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کر لیں گے کہ جس قوم پرستی پر انہوں نے اپنے اجتماعی رویّہ کی بنیاد رکھی تھی وہ انہیں بیابانِ مرگ میں لا کر چھوڑ گئی ہے اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش و خروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتی۔" ("ایشیا" ۲۱ ستمبر ۱۹۶۹ء ص ۱۱۴)

فوج میں بھرتی کی ممانعت

اور پاکستان بننے کے بعد یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ:

"موجودہ حکومت پاکستان غیر اسلامی ہے اس لیے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔" (بحوالہ "جماعت اسلامی پر ایک نظر" ص ۵۵ اور روزنامہ "نوائے وقت" ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

جہادِ کشمیر حرام ہے

اس کے علاوہ یہ بات تو ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ پاکستان کے بنتے ہی جب ہندوستان نے کشمیر پر

اپنا قبضہ جمانے کے لیے حملہ کر دیا تو پاکستانی فوج نے اپنی جانوں کی قربانی پیش کی لیکن جماعت اسلامی نے اس جہاد کو حرام قرار دیا۔ چنانچہ مودودی صاحب کے اس فتویٰ پر جب عوام نے زبردست غم و غصے کا اظہار کیا تو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا جس میں اس جاری کردہ فتویٰ کی ناکام تاویل پیش کرتے ہوئے وضاحت کی کہ : "یہ کوئی فتویٰ نہیں تھا بلکہ امیر جماعت اسلامی کی فقہی رائے تھی۔"

اور اس کے بعد مجلس شوریٰ نے فرمایا کہ :

"اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود اہلِ پاکستان کے لیے جہادِ کشمیر میں جنگی حصّہ لینا الکل جائز ہے۔"

بالفاظ دیگر اس دوسرے فتوے کے بعد جو لوگ اپنی جانیں قربان کریں گے وہ حلال ہو گئیں ــــ ۔ باقی رہا یہ سوال کہ فقہی رائے اور فتوے میں کیا فرق ہوتا ہے تو اس کے متعلق وہ خود ہی وضاحت کر دیتے تو اچھا ہوتا۔

نوائے وقت کا اداریہ

مودودی صاحب کے یہی خیالات تھے جن کے پیشِ نظر ۱۹۴۸ء میں نوائے وقت جیسے ملکی اخبار کو اپنے اداریہ میں یہاں تک کہنا پڑا کہ :

"جب تک انگریزوں کی حکومت تھی تو مودودی صاحب کے ہمدرد، معاون، معتقد، سرکاری افسر اور اہلکار انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے اور مودودی صاحب نے انہیں نہ روکا نمائشی پروپیگنڈا دوسری چیز ہے لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے سرپرست رہے۔ مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریز کا راج تھا، اس وقت تک مودودی صاحب نے تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لیے فوج میں بھرتی حرام ہے۔ اور نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاون اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے لیکن پاکستان آ کر انہوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر ان کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ حلفِ وفاداری کے مسئلے پر حکومتِ پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔" (بحوالہ اداریہ" نوائے وقت" لاہور۔ مورخہ ۵ دسمبر ۱۹۴۸ء)

یہ محاذ آرائی کیوں ؟

اداریہ نوائے وقت کی یہ تشویش کہ محترم مودودی صاحب نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا کیوں بنایا کہ پاکستان کی انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر ان کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا تو اس کا جواب میاں طفیل صاحب امیر کالعدم جماعتِ اسلامی کے اس بیان سے مل جائے گا جو انہوں نے ناصر باغ میں ایک تقریر کے دوران دیا تھا اور وہ یہ کہ :

" حکومت کے خلاف نفرت پھیلانا صرف ہمارا حق نہیں بلکہ دینی اور قومی فریضہ ہے اور ہم نفرت پھیلانے سے باز نہیں آئیں گے۔"
(بحوالہ "مساوات" ۲۶ راگست ۱۹۷۲ء)

میاں صاحب کا ایک اور بیان

۲۶ راگست ۱۹۷۲ء کو تو یہ فرمایا اور نومبر ۱۹۷۲ء کو ایک مسجد کی بنیاد رکھتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا

" چند لوگ ہمیں کمزور تصوّر کرتے ہیں لیکن جب وقت آیا اور ہم نے اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کر لیا تو یہ لوگ تو کیا امریکہ، بھارت اور روس مل کر بھی ہماری طاقت کے سامنے ایک منٹ نہیں ٹھہر سکیں گے۔ مشرقی پاکستان میں جماعت کے پانچ سو کارکن تھے۔ لیکن انہوں نے اس نازک دور میں بھی اپنی بھرپور طاقت کا لوہا منوا لیا۔ یہاں جماعت کے چند ہزار کارکن ہیں لیکن ہم کمزور ہرگز نہیں ہیں۔ اور جب وقت آیا تو لوگوں کو ہماری طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔ جماعتِ اسلامی کی تحریک پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اسلامی سوشلسٹ ممالک میں بھی ہمارے کارکن خفیہ طور پر کام کر رہے ہیں۔"
(روزنامہ امروز ۹ر نومبر ۱۹۷۲ء)

اقتدار حاصل کرنے کا طریق

اور اقتدار حاصل کرنے کے سلسلہ میں مودودی صاحب کا ارشاد تھا:

" ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبارِ دنیا کو چلانے کے لیے ایک ہمہ گیر طریقہ رکھتی ہو قطع نظر اس کے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی طبعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکمانہ اختیارات پر قبضہ کرے۔ زمام کار اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کا نقشہ اپنی طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی نظریہ و ضابطہ کو پیش کرنا یا اس کا معتقد ہونا بے معنی ہے۔"
(بحوالہ "احیائے دین" ۔ صفحہ ۲۱)

جھوٹ بولنے کی اجازت

اور پھر جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مودودی صاحب کا کہنا ہے کہ:

" راست بازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہیں اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین بُرائی ہے لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جس کی خاطر جھوٹ کی نہ

صرف اجازت ہے بلکہ بعض اوقات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے اور اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دے دی۔ (بحوالہ "ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء")

جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں:

فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (پس ہم کریں لعنت اللہ کی جھوٹوں پر)

یعنی بالفاظِ دیگر حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم جنہیں خدائے خبیر نے علیٰ خلقٍ العظیم کہہ کر پکارا، مودودی صاحب کے نزدیک وہ ذات معاذ اللہ دوسروں کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دیا کرتی تھی۔ خدا پناہ! اس ایک مثال سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مودودی صاحب نے قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں جو کچھ کہا وہ کس قدر مصلحت آمیز تھا اور اس کے ثبوت میں تو مودودی صاحب کی اور بھی کئی ایک تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں جن کی تضاد بیانی اپنی زبان سے پکارتی ہے کہ مودودی صاحب کے پیشِ نظر قائدِ اعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

پاکستان ہم نے بنایا

مودودی صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ اس سے پیشتر کہا تھا، اسے ایک بار پھر سامنے لائیں اور اس کے بعد ان کے مندرجہ ذیل دعوے کے ایک ایک لفظ پر غور کریں جسے آنے والا مورخ دیکھ کر یقیناً انگشت بدنداں رہ جائے گا اور وہ یہ کہ:

" ہم نے مسلمانوں کے قومی تحفظ کے لیے کوشش کی تو اس لیے نہیں کہ دوسری قوموں کی طرح اس قوم کا بھی امتیازی وجود قائم رہے بلکہ صرف اس لیے کہ یہ قوم دنیا میں حق کی شہادت ادا کرنے کے لیے زندہ رہے۔ ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جائے جو اسلامی نظام کا مکمل نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرے۔"

(بحوالہ "ترجمان القرآن" اکتوبر ۱۹۵۰ء)

مودودی صاحب کے اس بیان میں لفظ "ہم" قابلِ غور ہے۔

سرحد میں ریفرنڈم

تحریکِ پاکستان کے دوران سرحد میں ریفرنڈم کا جب سوال پیدا ہُوا تو اس وقت ایک ایک ووٹ کی جس قدر ضرورت تھی، اس کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں لیکن آپ نے اس سلسلہ میں فرمایا:

" رہا یہ سوال کہ کس چیز کے حق میں رائے دیں تو اس معاملے میں جماعت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی کیونکہ جماعت اپنے ارکان کو صرف ان امور میں پابند کرتی ہے جو تحریکِ اسلامی کے اصول اور مقاصد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ معاملہ اصولی ہے نہ مقصدی۔"

"ایشیا" کا دعویٰ

ضمناً عرض ہے کہ اس مخالفت کے باوجود ۲۲ سال کے بعد جماعتِ اسلامی کے ترجمان "ایشیا" کا یہ دعویٰ قابلِ فہم ہے کہ:

"جب پاکستان سے الحاق کا وقت آیا تو جماعتِ اسلامی کی پوری تنظیم مولانا مودودی کی ہدایت پر پاکستان کے حق میں مصروفِ جہاد ہوگئی۔" (بحوالہ "ایشیا" ۱۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء)

مودودی صاحب (مرحوم) کا دعویٰ یہ تھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ پیش کیا جبکہ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے تحت کوئی غیر مسلم، مسلم قوم کی کسی سوسائٹی کا ممبر نہیں بن سکتا چہ جائیکہ اسے مجلس قانون ساز میں شمولیت کا حق دے دیا جائے بلکہ مودودی صاحب مرحوم کے ہی الفاظ میں:

" مجلس قانون ساز میں غیر مسلموں کو رکنیت یا رائے دہندگان کا حق نہیں ہوگا۔"

(بحوالہ اسلامی ریاست۔ صہ ۵۲۵ ایڈیشن ۱۹۶۷ء)

لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے سلسلہ میں اپنے تیار کردہ منشور میں فرمایا کہ:

" پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو نہ صرف حق رائے دہندگی حاصل ہوگا بلکہ وہ مجالس آئین و قوانین ساز کے رکن بھی بن سکیں گے۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" دسمبر ۱۹۷۳ء)

" اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری حمایت حاصل ہوگی اس لیے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہیئے۔"

(بحوالہ روزنامہ "امروز" ۱۰ اگست ۱۹۶۳ء)

اس کے ساتھ ساتھ آپ کا فرمان یہ بھی تھا کہ :

" جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہیہ قائم ہو جائے گی - ان کا گمان غلط ہے - دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی - "

(بحوالہ "ترجمان القرآن" بابت محرم سنہ ۱۳۶۰ھ)

تاریخِ پاکستان کے بڑے لوگ

اور ادارہ "طلوعِ اسلام" کے شمارہ (نومبر سنہ ۱۹۹۰ء) کے مطابق :

" جماعتِ اسلامی کی جانب سے تازہ شائع کردہ کتاب " تاریخِ پاکستان کے بڑے لوگ " جس میں قیامِ پاکستان کی تاریخ کو بُری طرح مسخ کیا گیا ہے - یہ دعوےٰ ان الفاظ میں موجود ہے -

" اسی زمانے میں یعنی سنہ ۱۹۳۸ء میں مولانا مودودی نے تقسیمِ ہند کی ایک تجویز پیش کی ، جو تقسیمِ ہند کی اُن تجویزوں میں شمار کی جاتی ہے ، جس کے نتیجے میں مسلم لیگ نے سنہ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور کی - "

(۱۹۸۲ء - ایڈیشن صہ ۳۵۵)

جناب عثمان خان صاحب کا احتجاج

چنانچہ اس دعوے پر تبصرہ کرتے ہوئے قومی اسمبلی کے ایک رکن جناب عثمان خان صاحب نے اس پروپیگنڈا کو سفید جھوٹ قرار دیتے ہوئے مختلف اخبارات میں یہ بیان جاری کیا کہ :

" مولانا مودودی صاحب (مرحوم) پاکستان اور بانئ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے مخالف لوگوں میں سے ایک تھے - انہیں پاکستان کے بانیوں میں شامل کرنا بہت بڑی تاریخی بد دیانتی ہوگی - جماعتِ اسلامی پنجاب کے سربراہ کے حالیہ بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی کو پاکستان کے بانیوں میں شمار کرنا کہاں کا انصاف ہے - اس لیے کہ مولانا کے نظریات اور پاکستان کے خلاف ان کی جدّوجہد کسی سے ڈھکی چھُپی نہیں بلکہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے - انہوں نے کہا کہ ابھی لاکھوں کی تعداد میں وہ لوگ بقیدِ حیات ہیں کہ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے - یہ لوگ جماعتِ اسلامی کے کردار کے عینی شاہد ہیں - انہوں نے کہا کہ جماعتِ اسلامی کے دامن پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت

کا جو داغ ہے، اسے چھپانا نہ صرف ایک زیادتی اور بددیانتی ہوگی بلکہ اس طرح جماعت اسلامی کا کردار مزید مشکوک ہو جائے گا۔"

انہوں نے کہا کہ "دانش مندی اور دیانتداری اسی میں ہے کہ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا جائے۔" انہوں نے کہا کہ "جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے آج تک قائدِ اعظمؒ کے مزار پر جا کر فاتحہ نہیں پڑھی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ ابھی تک بانیٔ پاکستان سے بغض رکھتے ہیں" انہوں نے جماعتِ اسلامی کی حالیہ پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ "مارشل لاء کی حمایت میں سب سے پہلے اسی جماعت کے امیر نے بیان دیا تھا اور پھر ۱۸ ماہ تک ان کی جماعت کے لوگ مارشل لاء کی چھتری تلے وزارت میں رہ کر مارشل لاء کو تقویت پہنچاتے رہے اور اب مخالفت کر کے یہ لوگ جمہوریت کے چیمپئن بننے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔"

(روزنامہ مشرق ۵ ستمبر ۱۹۸۵ء بحوالہ "نوائے وقت ۱۳ ستمبر ۱۹۸۵ء)

جناب عثمان خان صاحب کے اس تبصرہ کے بعد کالعدم جماعتِ اسلامی کے رہنما جاوید انصاری صاحب کا یہ بیان بھی قابلِ دید ہے جو روزنامہ جنگ لاہور ۱۶ دسمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔

"جماعتِ اسلامی پاکستان کی واحد سیاسی قوت ہے جو پاکستان میں اسلامی خطوط پر انقلابی تبدیلیاں لا سکتی ہے۔" آپ نے مزید فرمایا کہ "گذشتہ آٹھ سالوں میں ہم سے سنگین غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں اور سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ جماعت نے اپنے ارکان کی اخلاقی اور روحانی نشوونما پر خاص توجہ نہیں دی۔"

سوال یہ ہے اس کمی کی وجہ جواز کیا ہے ہمارا خیال ہے کہ اس کا جواب ہمیں مولانا مودودی صاحب کے شاگرد ڈاکٹر اسرار احمد کی مندرجہ ذیل تحریر سے ہو سکے گا۔

مودودی صاحب کا اخلاق

انہوں نے (i) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاء پردازی سے بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا۔ (ii) نہ ابو الکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصور حکومت الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکرِ خیر کیا۔ (iii) اور نہ ہی علامہ اقبال کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدر آباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"، پنجاب کی اس

سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعویٰ نبوت تک کے لئے نہایت زرخیز و ساز گار ہے۔۔ حتیٰ کہ جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صف ماتم بچھ گئی، تب بھی مدیر ترجمان القرآن نے کوئی کلمۂ خیر۔۔۔۔ یا کلمۂ تعزیت اپنے مؤقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔ اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انھوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انھوں نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

"میں اس وقت حالت جہاد میں ہوں اور میدان قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے"

چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چوہدری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا ع

کہ ہم نے انقلاب چرخِ گرداں یوں بھی دیکھتے ہیں!

(بحوالہ ماہنامہ حکمت قرآن بابت ستمبر ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۷)

خطیب جامعہ مسجد لبرٹی مارکیٹ لاہور اور قائدِ اعظم رح

علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار　　　انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس فکر خام اور آزادیٔ افکار کے سلسلہ میں راقم کو جناب پروفیسر عثمان صاحب کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرنا ہوگا جس میں آپ نے لبرٹی مارکیٹ مارکیٹ گلبرگ لاہور کی جامعہ مسجد کے خطیب کے وعظ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"پاکستان بنا تو خواندگی ۱۵ سے ۱۷ فیصد تھی۔ پاکستان کو بنے ہوئے ۳۷ سال گذر گئے ہیں اور بیار لوگوں کا خیال ہے کہ خواندگی کا تناسب اب بھی بیس فیصد سے نیچے نیچے ہے۔ یہ تو خواندگی کا حال ہے۔ تعلیم کا تناسب ظاہر ہے پانچ سات فیصد ہے۔ گویا پاکستان کی آبادی کا نوّے فیصد آج بھی علماء کے قبضے میں ہے اور یقین مانیئے ان علماء میں اچھی خاصی تعداد

ان بزرگوں یا ان کے جانشینوں کی ہے جنہوں نے قیام پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی تھی اور وہ پاکستان کے تو مخالف نہیں (نہ رہ سکتے ہیں) مگر جس ذہن نے پاکستان بنایا تھا اس کی قیادت کی مخالفت ان کی رگ رگ میں ہے (سبھی جانتے ہیں کہ ایک عام آدمی ناکام ہونے پر "دشمن" کے بارے میں اپنے دل میں کیسے کیسے خیالات رکھتا ہے اور علم والا تو شکست کھا کر جیتنے والے کو کبھی معاف کر سکتا ہی نہیں) ابھی چند ماہ کی بات ہے میں لبرٹی مارکیٹ گلبرگ کی جامع مسجد کے قریب سے گزر رہا تھا اور خطیب جمعہ کا وعظ فرما رہے تھے۔ اور انہوں نے برملا قائدِ اعظم کو سخت سُست کہا اور ان کے لہجہ میں غصہ اور نفرت تھی۔ اور بظاہر قائدِ اعظمؒ کا قصور یہ تھا کہ "ٹی وی والے کسی حدیث کے بعد یعنی فرمانِ رسولؐ کے بعد قائدِ اعظم نے فرمایا" پروگرام دکھا دیتے ہیں اور یہ کس قدر گستاخانہ حرکت ہے۔ کہاں رسولؐ پاک کا مقام اور کہاں یہ قائدِ اعظم جسے نماز تک پڑھنی نہیں آتی تھی وغیرہ وغیرہ۔" پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اس عالم دین کا چہرہ مبارک دیکھنے کے لیے مسجد میں جاؤں اور وہیں نماز پڑھنے کے بعد ان سے کچھ پوچھوں لیکن میں بے حد جلدی میں تھا۔ ناچار مجھے یہ معاملہ نمازیوں کی غیرت پر چھوڑنا پڑا۔"

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور مورخہ ۳ جون ۱۹۸۴ء)

نیشنلسٹ علماء کی تحریکِ پاکستان سے علیحدگی

قائدِ اعظمؒ کی شخصیت ان بیان کردہ حقائق سے پوری طرح واقف تھی اور ان کی ذات اس سے بھی آگاہ تھی کہ ان حضرات کے نزدیک دین کی قیمت کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں جمعیت علمائے اسلام کے متعلق محترم ایم اے ایچ اصفہانی صاحب کی کتاب (QUAID-E-AZAM, AS I KNOW HIM) کا وہ اقتباس جو ۱۹۳۶/۳۷ء کے انتخابات کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نیشنلسٹ علماء مسلم لیگ سے کیوں الگ ہوئے تھے۔ لکھا ہے:

" پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ میں ہماری قدیم روایت اور ہوسِ تقریربازی کی کمزوری کے مطابق بہت سی تقاریر ہوئیں۔ اجلاس میں پہلے دن مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی تائید کی۔ اور ان کے اس اقدام کو خوش آمدید کہا کہ وہ مسلم لیگ کو زندہ تحریک کے میدان میں لے آئے ہیں لیکن اجلاس کے آخری دن ان بزرگوں میں سے ایک صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ انتخابات لڑنے کے لیے لیگ کو وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کرنے پڑے گا۔ دیوبندی جماعت پروپیگنڈہ مشنری کو لیگ کی تفویض میں دینے کے لیے آمادہ ہے۔ بشرطیکہ اس کے جملہ اخراجات مسلم لیگ برداشت کرے۔ آغازِ کار کے لیے اندازاً پچاس ہزار روپے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن لیگ کے خزانہ میں تو اس زمانہ میں پچاس پیسے بھی نہیں تھے۔ لیگ کا صدر اور اس کا

سیکرٹری اعزازی طور پر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان مولانا صاحبان کو لیگ کی مالی پوزیشن کا اچھی طرح علم تھا۔ جناح صاحب نے اس کی وضاحت کی تو مولانا حضرات مایوس ہو گئے اور لیگ سے نکل کر سیدھے کانگریس کی طرف چل دیئے۔ اور اس کے حق میں پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ کیونکہ کانگریس نے ان کا مطالبہ پورا کر دیا تھا۔"

ارزاں فروشی کی انتہا

اس دکھ بھری داستان کے سلسلہ میں جناب پرویز صاحب اپنے ہاں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"اس ارزاں فروشی کا اندازہ اس خط سے بھی لگایئے جو پنڈت جواہر لال نہرو نے ۵ جولائی ۱۹۳۶ء کو جھانسی کے بائی الیکشن کے سلسلہ میں مسٹر رفیع احمد قدوائی (مرحوم) کو لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا:۔

جہاں تک کارکنوں کا تعلق ہے، وہ باہر سے بھیجے جا چکے ہیں اور ابوالکلام آزاد نے اس کی بابت حسین احمد مدنی اور شبیر احمد کو بھی مطلع کر دیا ہے اور احمد سعید صاحب کو بھی کہہ دیا ہے۔ انہیں سفر خرچ دینا چاہیئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ مالی امداد بھی فراہم کی جائے۔ اس سلسلہ میں سات سو روپیہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔" (JAMIL-UD-DIN AHMAD—MIDDLE PHASE OF MUSLIM POLITICAL MOVEMENT. P. 201)

یہ تھی قیمت دو قومی نظریہ کو خلافِ اسلام اور متحدہ قومیت کو عین مطابق اسلام قرار دینے کی!

بورڈ سے علیحدگی

اس کے بعد احرار پارٹی کی باری آئی۔ یونینسٹ پارٹی کے سر فضل حسین مرحوم نے مشہور کر دیا کہ مسٹر جناح نے بمبئی کے تاجروں اور راجہ محمود آباد سے پارلیمنٹری بورڈ کے لیے کئی لاکھ روپے حاصل کیے ہیں۔ اس سے احرار کے چودھری افضل حق اور مولانا حبیب الرحمٰن وغیرہ اس مغالطہ میں مبتلا ہو گئے کہ اس فنڈ میں سے کم از کم ایک لاکھ روپیہ ان کے حصے میں ضرور آئے گا لیکن پارلیمانی بورڈ نے اس کے برعکس یہ شرط عائد کر دی کہ جس امیدوار کو لیگ کا ٹکٹ دیا جائے گا اسے پانچسو روپیہ بورڈ کے فنڈ میں جمع کرانا ہو گا۔ اس سے ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ بھی مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے[1] اور پھر بقایا عمر جناح رح کو کافر قرار دینے کے "جہاد" میں گزار دی۔

پنجاب میں یہ کچھ ہو رہا تھا تو مسلم لیگ کے مرکزی بورڈ میں حالات اس سے بھی زیادہ مایوس کن تھے۔ یو۔پی سے نواب چھتاری۔ سر محمد یوسف اور نواب زادہ لیاقت علی خان نے بورڈ سے استعفٰی دے دیا۔ اور مسلم لیگ کے بجائے نیشنل اگریکلچرل پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یاد رہے کہ نواب زادہ لیاقت علی خان کو ابھی چند ماہ قبل آل انڈیا مسلم لیگ کا سیکرٹری

---

[1] عاشق حسین بٹالوی صفحہ ۲۲۶۔

منتخب کیا گیا۔ یہ پارٹی کس قسم کی تھی اور ان حضرات کا خمیر کس قسم کی مٹی سے اٹھا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب نواب چھتاری نے یو۔پی کے گورنر کو ان ناموں کی فہرست بھیجی جنہیں پارلیمانی بورڈ میں شامل کیا جانا مطلوب تھا تو گورنر صاحب اس پر سخت برافروختہ ہوئے اور نواب صاحب نے معافیاں مانگتے ہوئے وہ فہرست واپس لے لی۔ اور اپنے رفقاء سمیت پارلیمانی بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی ؎ بہار سے سید حسین امام اور سید عبدالعزیز نے بھی بورڈ سے استعفےٰ دے دیا۔ بنگال میں مولوی فضل الحق صاحب نے لیگ سے الگ ہو کر نہ صرف اپنی جداگانہ پارٹی — کرشک پرجا پارٹی تشکیل کر لی بلکہ لیگ کے خلاف سب وشتم کا افسوسناک سلسلہ بھی شروع کر دیا ؎

پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ یعنی ملک برکت علی اور راجہ غضنفر علی خان۔ راجہ صاحب (مرحوم) اس کامیابی کے بعد سیدھے یونینسٹ پارٹی کے جلسے میں پہنچے اور جاتے ہی اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گئے ہیں۔ سر سکندر حیات نے ان کا استقبال کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں انہوں نے فرمایا کہ

راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایماء سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیکن انہوں نے شروع ہی سے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے فوری بعد یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے ؎"

مسلمانوں کی ذہنی پستی کے متعلق قائدِ اعظم کا ارشاد

یہ مردِ قلندر ملتِ اسلامیہ کی کشتی کو کن کن بھنوروں سے نکال کر ساحلِ مراد تک لے آیا تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے ہی لگایا جا سکے گا جن سے مسلمانوں کی ذہنی پستی نکھر کر سامنے آ جائے گی۔ قائدِ اعظم نے جب قوم سے بددل ہو کر وطنِ عزیز سے باضابطہ "ہجرت" کر لی تھی اور مستقل طور پر ہندوستان میں جا ڈیرے لگائے تھے۔ آپ نے اس وقت ہندوستان کے لوگوں کے بارے میں کہا تھا:

"ہندو کوتاہ اندیش ہیں اور میرے خیال میں ناقابلِ اصلاح اور مسلمانوں کی صفیں ایسے کم ہمت لوگوں سے بھری پڑی ہیں جو میرے ساتھ بات کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر سے پوچھیں گے کہ کیا کرنا چاہیئے! ان دو گروہوں کے مابین مجھ جیسے آدمی کی جگہ کہاں ہے؟" (شیخ محمد اکرام۔ ماڈرن مسلم انڈیا)

قائدِ اعظم اور علماءِ کرام

یہی وہ حقائق تھے جن کے پیشِ نظر ایک موقع پر قائدِ اعظم رح سے پوچھا گیا کہ "جب آپ کی "تحریکِ اسلامی بنیادوں

۳۔ شریف الجاہد روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۱ء۔

پر استوار ہے تو مسلم لیگ زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کیوں نہیں کرتی تو آپ نے فرمایا کہ:

"حقیقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ہمارے علماؒ کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کی حدود کیا ہیں ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر اہلیت و استعداد کے باوجود مجھ میں یا آپ میں یا اپنے سوا کسی اور میں اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجاآوری کے لیے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں میں ان مولوی صاحبان میں الّا ماشاءاللہ نہیں پاتا اور (مشکل اندر مشکل یہ ہے) کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔" (بحوالہ "طلوع اسلام" اپریل ۱۹۷۷ء)

تھیاکریسی نہیں ہوگی

چنانچہ قائدِ اعظمؒ نے ۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں مسلم لیجسلیٹو کنونیشن کے آخری اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیوکریسی نہیں ہے۔ ہم تھیوکریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے۔"

(بحوالہ "تقاریر قائدِاعظم" جلد دوم صہ ۳۸۶)

قائدِ اعظمؒ اور قرآن

آپ تھیوکریسی یا مذہبی پیشوائیت کے پیدا کردہ خوفناک نتائج سے کس قدر واقف تھے اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام دیا تھا کہ:

"پاکستان کی مجلس آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری شکل کیا ہو گی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئین پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ہم اس کا پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو مسلّم بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے اور وہ بزعمِ خویش خدائی مشن پورا کریں۔" (بحوالہ تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صہ ۶۵)

مسلم لیگ کا کارنامہ

یہی وہ تصور تھا جس کے تحت قائدِ اعظمؒ نے شروع ہی سے اس کوشش میں مصروفِ جہاد رہے کہ مسلمان قوم ذہنی طور پر مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے آزاد ہو جائے اور اگر دیکھا جائے تو پاکستان کا حصول اسی فتح مندی کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ دراصل قائدِ اعظمؒ کو اس امر کا پورا پورا اندازہ تھا کہ جس وقت تک ان "خدائی خدمت گاروں" سے ہندوستان کے مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھڑا دیا جاتا۔ اس وقت تک نہ تو ہمیں ذہنی آزادی میسر آسکتی ہے اور نہ ہی ہم جغرافیائی طور پر آزاد ہو سکتے ہیں۔ مسلم لیگ کی یہی وہ خدمت تھی جس کے پیشِ نظر ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے نوجوان طالبعلموں سے فرمایا

"مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا کہ جو لوگ خود غرضی کا مفاد پرستانہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے (مسلم لیگ) نے تمہیں اس ناخوش آئند عنصر (   ) کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ میں یہ بات مولویوں کے پورے کے پورے طبقے کے متعلق نہیں کہتا۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو دوسروں کی طرح آزادی پسند اور مخلص ہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا ہے جو (   ) ہے۔ اب جو ہم نے حکومتِ برطانیہ، کانگریس، رجعت پسند طبقہ اور نام نہاد مولویوں سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے تو میں اپنی قوم کے نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے طبقہ نسواں کو بھی آزادی دلائیں۔ یہ نہایت ضروری ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ہم مغرب کی خرابیوں کی اندھا دھند تقلید کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری مستورات نہ صرف معاشرتی بلکہ ہماری سیاسی زندگی میں بھی ہمارے دوش بدوش چل کر ہمارا ساتھ دیں۔"

(بحوالہ "تقاریر قائدِ اعظمؒ" حصہ اوّل صہ ۸۰)

حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے فرعونیت یعنی ملوکیت اور قارونیت (نظامِ سرمایہ داری) کیساتھ ہامانیت (مذہبی پیشوائیت) کی جو اس قدر مخالفت کی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ظاہری طور پر تو ان بتوں کے وجود الگ الگ دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ تینوں کے تینوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور ازل سے تا امروز خدا کی طرف جانے والے راستے میں روک بن کر کھڑے رہے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انسانیت پر ہر قسم کے مظالم کی تاریخ انہیں کے گرد گھومتی دکھائی دے گی۔

ملوکیت اور علامہ اقبالؒ

جہاں تک ملوکیت کا تعلق ہے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

"اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں اس قدر تکریم آدمیت اور شرفِ انسانیت کی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک ورق بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔" (بحوالہ ریڈیو تقریر ۱۹۳۹ء)

ملوکیت یعنی انسان کی حکومت انسانوں کے اوپر (خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو) کا ثمر اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قوموں کی موت و حیات کے پیمانے اور اقدار مقرر کرنے والی خبیر و علیم ہستی کا یہ ایک غیر متبدل عمل ہے لیکن افسوس ہے ان حقائق کے باوجود مذہبی پیشوائیت نے ملوکیت کو ہمیشہ خدا کا اوتار کہہ کر لکارا تاکہ اس کی وساطت سے ان کی اپنی دکانیں مختلف ناموں سے سجی رہیں اور کوچہ کوچہ قریہ قریہ ان کی یہ سلطنتیں قائم و دائم رہیں لیکن اگر کوئی شخص ان کی اس اجارہ داری کو ختم کرنے کے لیے دین و دنیا کی ثنویت کو ختم کرنا چاہے تو اس کے خلاف فتوے دے کر اس قسم کی نفرت پیدا کر دی جائے کہ کوئی اس کی بات تک نہ سننے پائے۔

احبار و رہبان اور انجیل

بنی اسرائیل کے احبار و رہبان کی یہی مذہبی اجارہ داری تھی جس کو حضرت عیسٰیؑ ختم کرنا چاہتے تھے لیکن یہ (خدائی) مسندوں پر بیٹھنے والے اس چیز کو کب گوارا کرتے تھے۔ چنانچہ کتاب انجیل کے بیان کے مطابق:

"تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے ساتھ مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے .... اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا انجام کیا ہو گا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس وقت شکر ہے کہ ہمارا بادشاہ اور حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں اور ہماری شریعت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے جیسے ہم ان کی شریعت کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ ہم جو چاہیں کر لیں۔ اگر ہم نے غلطی کی تو ہمارا اللہ رحیم ہے اور قربانی اور روزے کے ساتھ اس کا راضی کر لینا ممکن ہے لیکن اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہرگز راضی نہ کیا جا سکے گا۔ جب تک خدا کی عبادت (محکومیت) ویسے ہی ہوتے نہ دیکھے جیسی موسٰی نے لکھی ہے۔" (بحوالہ انجیل برنباس صہ ۱۴۲)

اس مندرجہ بالا تحریر کا کون سا لفظ ایسا ہے جو ان لوگوں کی مفاد پرستی کے زہریلے ڈنک کو بے نقاب نہ کر رہا ہو۔ اسی بنا پر خدا کا پیغمبر خدا کی خدائی کو ان کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے بار بار للکارتا اور کہتا کہ:

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا ایندھن بنا دیتے ہو۔"

"اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خو... کھائی دیتی ہیں مگر ...ں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاست سے بھری

ہوتی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔

"اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے۔" (انجیل متی۔ باب ۲۳)

دراصل مذہبی پیشوائیت کی ٹیکنیک ہی کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ جو سطحی طور پر باور ہی نہیں ہونے دیتی کہ ان کی یہ اجارہ داری کس قدر خطرناک ہے۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے خدا کے عطا کردہ دین کے مقابلے میں اپنا خود ساختہ مذہب پوری طرح مسلط کر رکھا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کیفیت یہ پیدا کر دی جاتی ہے کہ سمجھا یہی جائے کہ ان چند ایک عقائد کا نام ہی دین ہے اور ان کی بجا آوری باعثِ ثواب اور جو شخص ان رسومات کی ادائیگی میں کوتاہی کرے وہ ان کے نزدیک نہ تو صحیح معنوں میں مسلمان ہے اور نہ دین دار ۔۔ لہٰذا جہنمی۔

قرآن حکیم کی بشارت

یہ تھی تحریکِ پاکستان کے دوران کی وہ مختصر سی روئداد اور اس کے اندر یہ گھرا ہوا مردِ آہن جو اس سنگلاخ اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قرآنی قندیل کے سہارے نہایت ثابت قدمی اور خوش کرداری کے ساتھ رواں دواں جانبِ منزل تھا۔ حتیٰ کہ حصولِ آزادی کا یہ آفتاب اپنی ضیا پاشیوں کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو آسمانِ عالم پر طلوع ہوا جس کی پیشانی پر یہ قرآنی ارشاد سنہری حروف سے کندہ تھا کہ:

"ہم اپنے قوانین کے زور سے ان تمام لوگوں کو زندگی کی راہ سے ہٹا کر الگ کر دیں گے جو یہ چاہتے ہیں کہ نوعِ انسانی کے لیے ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کیے بغیر دنیا میں بڑائی اور کبریائی حاصل کر لیں۔" (۷/۱۴۶)

اور ان قرآنی حقائق کی دوسری طرف بانیٔ پاکستان اور ملت کا یہ شیدائی آزادی کی سنہری کرنوں سے یہ تحریر لکھنے میں مصروف تھا کہ ؎

کلیوں کو میں سینے کا لہو دے کے چلا ہوں
صدیوں مجھے گلشن کی فضا یاد کرے گی !

ان بیان کردہ تمام تر مشکلات اور عوامل کے علاوہ حصولِ پاکستان کی تحریک کو ناکام بنانے کی خاطر غیروں کی طرف سے آخری مورچہ کیبنٹ مشن پلان کی شکل میں پیش کیا گیا کیونکہ یہ اس تاریخ کا اہم ترین حصہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ موقع کی مناسبت سے اسے قارئین کی خدمت میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے شکریہ کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

کیبنٹ مشن پلان کی حقیقت

"تو اس ضمن میں آخری فیصلہ کن معاملہ کیبنٹ مشن پلان، کا ہے جس کے بعد اس امر میں کسی شک کا شائبہ بھی نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کا قیام مشیت و قدرتِ خداوندی کے خصوصی ظہور کی حیثیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس پلان کے مجوزین نے ہندوستان کی تقسیم کو نامناسب

ہی نہیں بلکہ ناممکن العمل قرار دے کر گویا بزعم خویش آزاد و خود مختار پاکستان کے مطالبہ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔ اور اس کے بجائے ہندوستان کی ایک مرکزی حکومت کے تین خطوں ZONES پر مشتمل وفاق کا نقشہ پیش کیا تھا۔

ہندوستان کے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ قائدِ اعظم مرحوم کی سیاسی زندگی کا نازک ترین مرحلہ اور ان کے تدبر و تحمل اور دُور اندیشی و معاملہ فہمی کا سخت ترین امتحان تھا!... انہیں ایک طرف صاف نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت مختلف داخلی و خارجی عوامل کے تحت ہندوستان سے بوریا بستر لپیٹنے پر تُلی ہوئی ہے اور اگر اس مرحلے پر مسلم لیگ کی جانب سے ذرا بھی ضد اور ہٹ کا مظاہرہ ہوا تو لیبر پارٹی کی "ہز میجسٹیز گورنمنٹ" ہندوستان کی حکومت یک طرفہ طور پر کانگریس کے حوالے کر دے گی۔ اور پھر ہندوؤں کے چنگل سے رہائی پانا شاید لاکھوں نہیں کروڑوں جانوں کی قربانی ہی سے ممکن ہو سکے! دوسری طرف یہ بات بھی واضح تھی کہ اس منصوبہ کو تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ نے ہار مان لی اور کم از کم وقتی طور پر آزاد اور خود مختار پاکستان کے مطالبے سے دستبرداری اختیار کر لی اور گزشتہ چند برسوں کے دوران جو نفسیاتی اور جذباتی فضا ہندوستان کی مسلم قوم میں پیدا ہو چکی تھی، اس کے پیش نظر شدید اندیشہ تھا کہ اس کے نتیجے میں یا مسلمان مشتعل ہو کر قابو سے باہر ہو جائیں گے یا اُن کے حوصلے اور ولولے ہمیشہ کے لیے سرد ہو جائیں گے یا کم از کم مسلم لیگ اور خود قائدِ اعظم کی سیاسی موت واقع ہو جائے گی! گویا قائدِ اعظم اور مسلم لیگ دونوں کو اس وقت "ایک جانب کنواں اور دوسری جانب کھائی" والی صورتِ حال سے سابقہ تھا۔ البتہ کیبنٹ مشن پلان میں دو باتیں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق بھی تھیں.... ایک یہ کہ اس میں تین خطوں ZONES کی صورت میں پاکستان کے نقشے کی دھندلی سی تصویر موجود تھی اور دوسرے یہ کہ دس سال کے بعد ہر خطے کے لیے مرکزی حکومت کے ساتھ اپنے تعلق پر نظرِ ثانی کرنے کی گنجائش موجود تھی!.... اس طرح اُس وقت نہیں تو دس سال بعد آزاد پاکستان کے قیام کا امکان کم از کم نظری طور پر موجود تھا۔ اگرچہ یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ ایک بار مرکزی حکومت کے قیام کے بعد اس کا بالفعل امکان بہت کم تھا!.... میرے نزدیک یہ قائدِ اعظم کے سیاسی تدبر STATESMANSHIP اور واقعیت پسندی REALISM کا شاہکار تھا کہ انہوں نے ۶ جون ۴۶ء کو کیبنٹ مشن

١

پلان کو منظور کر لیا۔"   (بحوالہ "استحکام پاکستان" باب ہفتم)

قائدِ اعظم کی طرف سے اس تجویز کردہ "کیبنٹ مشن پلان" کی منظوری کے بعد ہندوؤں نے اس سلسلہ میں اپنے تاثرات کا اظہار جس انداز سے کیا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے الفاظ میں وہ کچھ اس طرح تھا:

" ہندو پریس نے خوب بغلیں بجائیں، تمسخر اڑایا، کارٹون شائع کیے اور اسے پاکستان کے تصور کی آخری اور حتمی تدفین قرار دیا۔ لیکن اس وقت اس سچی بات کا زبان سے نکال دینا ہی اکھنڈ بھارت کے نقطۂ نظر سے سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔" چنانچہ " پنڈت نہرو جی (جو کانگریس کے صدر تھے) نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر فتح کی "مستی" میں جو کچھ کہا تھا وہ بالکل درست تھا اور واقعتاً صورت یہی تھی کہ اگر ایک بار اس پلان کے تحت انڈین یونین گورنمنٹ وجود میں آجاتی تو پھر کسی منطقہ ZONES کے علیحدہ ہونے کا بالفعل کوئی امکان نہ رہتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی نے اپنے پتا جی کے بارے میں کہا تھا کہ " ہمارے بابا تو صوفی تھے انہیں سیاست نہیں آتی تھی " اور شاید پنڈت جی کی ایسی ہی باتیں تھیں جن کی بنا پر چوہدری خلیق الزمان مرحوم نے کہا تھا کہ " پنڈت نہرو سے زیادہ سیاست تو میرا سائیس جانتا ہے "۔ بہرحال اگرچہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے پیچ در پیچ ریزولیوشن کے ذریعے پنڈت نہرو کے بیانات کی تلافی کی کوشش کی لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا اور قائدِ اعظم ایسی عقابی نگاہ رکھنے والی شخصیت اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے والی نہیں تھی چنانچہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری واپس لینے کا اعلان کر دیا اور اس طرح ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کے قیام کا مسئلہ جو نظری طور پر کم از کم دس سال کے لیے اور حقیقتاً ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا تھا، از سرِ نو زندہ ہو گیا۔"

تھا ہمارا وہ معمارِ پاکستان جس نے اس قدر تند و تیز ہواؤں کے دوش پر آزادی کے اس چراغ کو روشن کیا اور بجائے اس کے کہ ہم عالمگیر سطح پر قندیلِ آسمانی کے پیش کردہ نظامِ حیات سے نوعِ انسانی کو ایک بار متعارف کراتے ہم خود ہی اپنی اپنی مفاد پرستیوں کی تسکین اور مفادِ عاجلہ کے حصول کی خاطر ہم کی گرد باد زندگی میں الجھ کر رہ گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مقصدِ حیات جس کے لیے قائد نے اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک ملت کی نذر کر دیا تھا وہ عظیم مقصد آج تک حاصل نہ ہو سکا۔

قائد کی کہانی فاطمہ جناح کی زبانی

یہ ایک حقیقت ہے کہ قائد اعظمؒ کی ارادی قوت اس قدر عزم و ہمت کی مالک تھی کہ اس سلسلہ میں تاریخِ عالم خال خال ہی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے چنانچہ یہ نہایت ضروری ہے کہ نوجوان نسل کے سامنے قائد اعظم کے متعلق محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی برطانوی اشاعتی ادارے "STACY" "انٹرنیشنل" کو لکھوائی جانے والی تحریر کے کچھ اقتباسات پیش کر دیئے جائیں تاکہ ہماری نئی نسل یہ جان لے کہ آسمانِ علم و فضل پر رفعتِ ثریا کا ہم رکاب ہونے بلکہ اس کی بلندیوں ——— سے بھی آگے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کتنی قسم کی دشوار گذار اور کٹھن راہوں پر متواتر سفر کرنا پڑتا ہے سو اس روح پرور زندگی کی روئداد محترمہ فاطمہ جناح کچھ اس طرح بیان کرتی ہیں کہ

" ان کا قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ اور وزن تقریباً ایک سو بارہ پونڈ تھا جو ایک ایک اونس کر کے گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنی صحت کے بارے میں کسی التجا پر کان نہ دھرتے تھے۔ فطرت نے انہیں غیر معمولی طور پر مضبوط قوت ارادی سے نوازا تھا۔ لیکن یہ غیر معمولی طور پر مضبوط قوت ارادی ایک انتہائی کمزور جسم میں مقید تھی

ان کی صحت ہنگامہ خیز زندگی کی سختیوں کی متحمل نہیں تھی لیکن یہ ان کا عزم محکم ہی تھا جس کی بدولت انہوں نے راہ میں حائل تمام دشواریوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے عوام کی قیادت کی۔ ڈاکٹروں کی ہدایتوں اور چھوٹی بہن کی منتوں کے باوجود آرام کرنے سے انہوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ کام، کام اور مزید کام۔ یہی ان کا انداز زندگی تھا۔ میں اکثر اوقات ان سے التجا کرتی کہ اپنے دورے جو بگولے کی طرح انہیں ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لئے پھرتے تھے کم کر دیں لیکن وہ جواب دیتے :۔

" کیا تم نے سنا ہے کہ کوئی جنرل جس کی فوج اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو خود چھٹی لے لے "۔

یہ جواب سن کر میں منطق چھوڑ کر جذبات کا سہارا لیتی۔ لیکن آپ کی زندگی آپ کے عوام کے لئے انتہائی قیمتی ہے، آپ کو اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنی چاہیئے !

وہ اپنی نگاہیں دور کسی غیر مرئی نقطہ پر جما کر جواب دیتے ! جب مجھے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی بقا کی فکر ہو تو پھر میری اپنی صحت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے ! ان کا یہ جواب مجھے خاموش کرنے کے لئے کافی ہوتا۔

فروری ۱۹۳۷ء میں جب پورے ہندوستان میں عام انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو منظم کرنے اور رائے عامہ لیگ کے حق میں ہموار کرنے کا کٹھن کام میرے بھائی کے کندھوں پر تھا۔ عام جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے جتنا زیادہ وہ سفر وہ کرتے اتنا ہی زیادہ مطالبہ اور ہوتا۔ وہ شہروں، قصبوں اور دیہات کے مسلمانوں کی التجاؤں کے طوفان میں ڈوب گئے "!

محترمہ فاطمہ جناح بیان کرتی ہیں

• اس دور کی یاد اب بھی میرے ذہن میں روشن ہے اور میرے بھائی کی تصویر میری آنکھوں میں ہے کہ وہ تکان کے باوجود کس طرح اپنے وجود کو گھسیٹ کر بستر سے نکلتے تھے پھر اہم جلسوں میں جاتے تھے جب جلسہ میں پہنچتے تو وہ خاموش ہو جاتے، اپنے خیالات مجتمع کرتے، پھر وہ عوام کے خیر مقدمی نعروں کا جواب دیتے ہوئے ڈائس کی طرف بڑھتے اور جب ڈائس کی سیڑھیاں چڑھتے تو ان کی آنکھیں روشن اور چمک دار ہو جاتیں، جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے تو قرآن پاک کی تلاوت ہوتی مقامی رہنما تقریریں کرتے ان کے بعد وہ مائیکروفون کی طرف بڑھتے اور زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں انسانوں کے مشتاق چہرے دیکھتے، جو صرف انہیں سننے کے لئے آئے ہوتے اور پھر وہ تقریر شروع کرتے ان کی آواز میں بیماری اور کمزوری کا ہلکا سا نشان بھی نہ ہوتا۔ اپنے قائد کا خیر مقدم کرنے والوں کو یہ پتہ بالکل نہ چلتا کہ ان کا قائد کتنا تھکا ماندہ اور کتنا بیمار ہے۔ میرے بھائی عوام کے ہیرو تھے۔"

قائد کے سفر آخرت کی روئداد

آیئے اب ہم اس مرد مومن کی خدمت میں اپنی پرنم آنکھوں کا نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی ملتِ پاکستان کے قائد عظیم کی درخشاں زندگی کے آخری لمحات کی وہ روئداد بھی سن لیں جو اپنے اندر سوچنے والوں کے لئے کئی ایک تحقیقاتی رموز لئے ہوئے ہے۔

محترمہ فاطمہ جناح واپسی کے اس سفر کا حال یوں بیان کرتی ہیں:۔

" اگست کے آخر میں وہ اچانک افسردہ و دلگیر ہو گئے۔ ایک دن مجھ سے کہا " فاطمی! اب مجھے مزید زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں جتنی جلدی دنیا سے اٹھ جاؤں بہتر ہو گا۔"

ان کے یہ الفاظ سن کر مجھے بڑا دھچکا پہنچا میں نے بڑی مشکل سے اپنی حالت پر قابو پایا اور بڑے سکون سے کہا آپ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے، ڈاکٹروں کو بڑی امید ہے۔"

" نہیں" انہوں نے اصرار سے کہا" میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

کرنل الٰہی بخش نے کہا قائد اعظم " جریان خون کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں پریشان ہوں۔ ہمیں انہیں کراچی لے جانا چاہیئے۔ اب کوئٹہ کی بلندی بھی ان کے لئے فائدہ مند نہیں رہی۔

" ہاں ٹھیک ہے مجھے کراچی لے چلو۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ میں وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ جلد ہی انہیں نیند آ گئی، لیکن نیند میں بھی وہ بے آرام رہے۔ وہ بڑبڑا رہے تھے ماں ...... پپا ...... کشمیر ..... مہاجرین .... پپا ...... فاطمی ......"

محترمہ فاطمہ جناح بیان کرتی ہیں۔

"طیارے کو فوری طور پر کوئٹہ سے پرواز کرنے کا حکم دے دیا گیا اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ اسٹیمر کو وہ دو بجے دوپہر کراچی جانے کے لئے ہوائی اڈے پر آ جائیں۔

طیارے کے فرنٹ کیبن میں ان کے لئے بستر بنا دیا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر اور سسٹر ڈنہم اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے ہمیں انتباہ کیا کہ مجھے کچھ دیر تک سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنا پڑے گی۔ جونہی پہاڑی علاقہ ختم ہوا۔ میں طیارہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر لے آؤں گا۔ آکسیجن اور گیس ماسک تیار تھے جونہی طیارہ بلند ہوا۔ قائداعظم کو سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ میں نے انکی ناک اور منہ پر گیس ماسک رکھ دیا۔ انہوں نے کچھ دیر تک آکسیجن کے سانس لئے لیکن پھر گیس ماسک اپنے منہ سے ہٹا دیا جیسے وہ کہہ رہے ہوں۔ "بیکار ہے یہ سب" میں نے ڈاکٹر مستری کو کرنل الٰہی بخش کو بلانے کے لئے کہا۔ وہ آئے اور مجھے خوشی ہوئی کہ وہ قائداعظمؒ کے منہ پر گیس ماسک دوبارہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔" آگے چل کر وہ بیان کرتی ہیں "ماڑی پور کراچی کے اڈے پر قائداعظم کو ایک سٹریچر میں فوجی ایمبولینس تک پہنچایا گیا۔ یہ ایمبولینس ان کی سرکاری رہائش گاہ تک لے جانے والی تھی۔ میں اور سسٹر ڈنہم ان کے ساتھ ہی ایمبولینس میں بیٹھ گئیں جو آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئی۔ ہماری پارٹی کے دیگر ارکان کاروں میں چلے گئے۔

تقریباً چار پانچ میل کا سفر طے کرنے کے بعد ایمبولینس کا انجن کھانسا اور وہ رک گئی۔ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد میں گاڑی سے باہر نکلی تو ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ پٹرول ختم ہو گیا ہے وہ اضطراب کی حالت میں انجن کے ساتھ بھی کھڑبڑ کر رہا تھا۔ جب میں دوبارہ گاڑی میں داخل ہوئی تو میرے بھائی کے ابرو سوالیہ انداز میں میری جانب اٹھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی خفیف سی جنبش ہوئی۔ میں نے انہیں جھک کر بتایا۔

"انجن رک گیا ہے۔" اور انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سسٹر ڈنہم اور میں باری باری ان کے چہرے سے مکھیاں اڑانے لگیں۔ ہمیں انتظار تھا کہ کوئی اور گاڑی آئے اور ہمیں گورنر جنرل ہاؤس تک پہنچا دے۔"

قائداعظم کے لئے زیارت میں کوئٹہ سے جو نرسنگ سپرنٹنڈنٹ سسٹر ڈنہم بلوائی گئی تھیں وہ اس سفر میں تھیں۔ انہوں نے اس مرحلے کی تصویر کشی کچھ یوں کی ہے۔

"ہم مہاجروں کی بستی اور اس کی کیچڑ سے زیادہ دور نہ تھے اور مکھیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ میں نے ایک دفتی کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا اور اس سے مسٹر جناح کے منہ پر پنکھا جھلنے لگی تاکہ مکھیاں نہ بیٹھنے پائیں۔ چند منٹ تک ان کے پاس میرے سوا کوئی نہ تھا اور اس اثناء میں انہوں نے میری دلجوئی اس انداز سے کی کہ میں ساری عمر نہیں

بھول سکتی۔ انہوں نے اپنا بازو چادر میں سے نکالا اور اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ وہ زبان سے کچھ نہ کہہ سکے لیکن ان کی آنکھوں سے ان کے جذبہ تشکر کا پوری طرح اظہار ہو رہا تھا۔ میں ان کی جو کچھ خدمت کر سکی تھی یہ ایک نگاہ اس کا مکمل صلہ تھی۔ اس سے بہتر صلہ مجھے کیا مل سکتا تھا۔ اس وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ قائداعظم کی ساری روح ان کی آنکھوں میں آ گئی ہے۔"

اس سے آگے کا سفر پھر محترمہ فاطمہ جناح کی زبانی:۔

"ہمیں تقریباً ایک گھنٹہ تک انتظار کرنا پڑا اور وہ ایک گھنٹہ میری زندگی کا طویل ترین اور انتہائی کرب ناک تھا۔ ایک اور ایمبولینس آئی۔ قائداعظم کا سٹریچر اس میں منتقل کیا گیا اور گورنر جنرل ہاؤس میں سٹریچر سے بستر پر لٹایا گیا تو میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ ماری پور کے ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس تک پہنچنے میں ہمیں دو گھنٹے سے زیادہ عرصہ لگا تھا۔

ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے تھکا دینے والا سفر بخیر و عافیت طے کر لیا ہے اسی اثناء میں قائداعظم کو نیند آ گئی اور ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ وہ تھوڑی دیر تک واپس آ جائیں گے۔ میں اب اپنے بھائی کے پاس اکیلی تھی اور وہ آرام کی نیند سو رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ وہ تقریباً دو گھنٹے تک سوئے پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ مجھے دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے پاس بلایا جب میں قریب ہوئی تو انہوں نے سرگوشی کی "فاطمی! خدا حافظ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رسول اللّٰہ۔ ان کا سر آہستگی سے دائیں طرف گر پڑا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں چیختی ہوئی کمرے سے نکلی۔ "ڈاکٹر، ڈاکٹر فوراً آؤ، میرے بھائی مر رہے ہیں۔ ڈاکٹر کہاں چلے گئے۔؟"

کچھ دیر بعد ڈاکٹر آ گئے۔ انہوں نے میرے بھائی کا معائنہ کیا، انہیں انجکشن لگائے۔ میں پتھر کی طرح بے حس و حرکت اور گنگ کمرے کے کونے میں کھڑی تھی۔ تب ڈاکٹروں نے میرے بھائی کا جسم سر سے پاؤں تک ڈھانپ دیا۔

کرنل الٰہی بخش بھاری قدموں سے چلتے ہوئے میری جانب بڑھے۔ اپنا دایاں ہاتھ آہستگی سے میرے کندھے پر رکھا اور پھر رو پڑے۔ میری آنکھوں سے آنسو خشک ہو چکے تھے میں گھسٹتی ہوئی اپنے بھائی کے بستر تک پہنچی اور پھر بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑی۔"

یوں قائد ہم سے رخصت ہو گئے۔ انگریز سے لڑے، ہندو سے لڑے، مسلمانوں میں سے بھی کتنے ہی گروہ کتنی ہی جماعتیں تھیں، جن سے انہیں لڑنا پڑا۔ ان کی جھولی میں کھوٹے سکے بھی تھے۔ اس کے باوجود ان کا عزم تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی زندگی کے آخری لمحہ تک وہ مسلسل لڑتے رہے۔ قوت ارادی نے انہیں بار بار گرنے

کے باوجود سنبھالا دیا انہوں نے فولادی عزم اور مومنانہ بصیرت سے ملک کو آزادی دلائی۔ لیکن کتنے ہی غم جمع ہو گئے تھے مہاجرین کا غم۔ جوناگڑھ اور حیدر آباد کا دکھ۔ کشمیر میں فوج نہ بھیج سکنے کا دکھ۔ ریڈ کلف ایوارڈ کے غلط فیصلے کا رنج، اپنوں کی سازشوں کا افسوس، آئین نہ بنا سکنے کا افسوس، قتل و غارت اور خون خرابے کا افسوس اور پھر سب سے بڑھ کر کوئی ایسا افسوس جس کا اظہار انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح اور کرنل الٰہی بخش سے یوں کیا کہ پانچ ہفتے پہلے میں زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن اب مرنا چاہتا ہوں۔"

جناب ممتاز احمد خاں جو ۱۹۳۶ء میں ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا رائٹرز کے لاہور بیورو سے منسلک تھے اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ

قائداعظمؒ کی وصیت

بھارت کے مشہور انگریزی روزنامہ سٹیٹ مین نے مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے شمارے میں قائداعظمؒ کی وصیت کے بارے میں مندرجہ ذیل خبر شائع کی۔

"مسٹر جناح نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں چالیس لاکھ روپے چھوڑے ہیں جن سے پاکستان اور انڈیا میں تعلیمی ادارے فائدہ اٹھائیں گے۔ پبلک فنڈ میں انہوں نے چوراسی لاکھ روپے چھوڑے ہیں جو مسلم لیگ اور چند دیگر اداروں کو منتقل ہو جائیں گے۔

ذاتی فنڈ سے بمبئی یونیورسٹی کو جہاں مسٹر جناح نے کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی پچاس ہزار روپے انجمن اسلام بمبئی اور اینگلو عربک کالج دہلی کے لئے پچیس پچیس ہزار روپے، اپنے خاندان کے افراد کو کچھ حصہ دینے کے بعد باقی بیس لاکھ روپوں کی رقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ سندھ مدرسہ کراچی (جہاں مسٹر جناح نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی) کے مابین برابر برابر تقسیم کر دی جائے گی۔

اس جگر خراش اور ہمت طلب داستان کے بعد اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ اس محسنِ ملت کی زندگی کے بعد ہم نے اس لگائے ہوئے پودے کی نوخیز کلیوں کو صوبائی تفریق کے تحت سیاسی فرقہ بندی کی آڑ میں کس طرح مسخ کیا تو یہ جاننے کے لیے ہمیں آئندہ باب کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جہاں ہم دیکھیں گے کہ،

قائداعظمؒ کی باعمل شخصیت ۴۴ سال سے کس قدر حسرت بھری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی ہے کہ ہم ان کے احسانات کا بدلہ قرآنی حکومت کی تشکیل میں کب ادا کرتے ہیں۔

صُوبائی تفریق اور اس کے نتائج

پاکستان کا خطۂ زمین اس لیے حاصل کیا گیا تھا کہ اس میں مسلمان، رنگ، نسل، زبان، جغرافیائی حدود کی تنگ نظری اور مغربیت کے قومی تصور اور وہاں کی جمہوریت کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن حکیم کی آئیڈیالوجی کے مطابق اُمّتِ واحدہ کا تصور لیے ایک جہانِ نو کی طرف اپنے سفر کا آغاز کر سکیں اور یہی وہ مسلم آئیڈیالوجی تھی جس کے تحت "مشرقی اور مغربی" پاکستان کے اس جغرافیائی بعد کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ قائدِ اعظم رح کے الفاظ میں:

اِس بُعد کا واحد حل

"مغربی پاکستان مشرقی پاکستان سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکت ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں جن میں اس قدر بُعد ہو وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی تو اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا جو یہ ہے: ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان مستقبل پر۔ لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، وہ ایسے مختصر جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لیے مَیں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔ پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جن میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا نہایت گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات ہیں۔ ہم اپنے اسالیبِ فکر نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں اور یہی ہیں وہ عوامل جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتے ہیں۔"

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل صہ ۵۸)

متحدہ ہندوستان میں ہماری نظریاتی عداوت ہندوؤں کے ساتھ یہی تھی کہ ہم ایک دوسری قوم کے افراد اور مسلم ہیں۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد ایک گہری سازش کے تحت اہلِ پاکستان میں صوبائی تفریق کی بنا پر اس ایک قوم میں پانچ قومیتوں کا نعرہ کچھ اس طرح بلند ہُوا کہ آہستہ آہستہ یہ تفریق صوبائی خود مختاری کا مطالبہ

بن گئی اور آخر کار زبان کے بل بوتے پر اگر مشرقی پاکستان کا صوبہ بنگلہ دیش کے نام سے پکارا جانے لگا تو صوبہ سندھ میں جئے سندھ کے نعرے بلند ہوئے اور صوبہ سرحد میں پختونستان کے جراثیم نے پرورش پائی۔

صوبوں کی جغرافیائی حقیقت

قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہ میں اپنی اس سیاسی فرقہ بندی کی دل خراش داستان کو شروع کریں اور تاریخ کے آئینے میں اپنی شکل و صورت دیکھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ صوبائی حدود کی یہ جغرافیائی حیثیت کیا تھی اور کیا ہے، اور وہ اس لیے کہ یہ جاننے سے ہم حقیقتِ حال سے زیادہ قریب ہو سکیں گے اس تمام داستان میں، جو کچھ عرض کیا جائے گا اس سے مقصود صرف تاریخی کوائف کا بیان کرنا ہے کہ شاید ہم اپنی علتِ مرض کو جان سکیں۔ کیونکہ علتِ مرض کو جانے بغیر مناسب علاج ممکن ہی نہیں۔ لہذا جہاں تک موجودہ پاکستان کے صوبوں کا تعلق ہے، ان کی جغرافیائی حقیقت کے سلسلہ میں ۸ سال قبل اکتوبر ۱۹۶۷ء کو ادارہ طلوع اسلام نے اپنی اشاعت میں تحریر کیا تھا کہ:

"تقسیم ہند کے وقت یہ خطۂ زمین جسے اب مغربی پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے چار صوبوں میں تقسیم تھا۔ (بلوچستان کو صوبائی حیثیت تو حاصل نہیں تھی لیکن زیرِ نظر موضوع کے لحاظ سے ہم اسے بھی صوبہ ہی کہہ کر پکارتے ہیں) انگریزوں نے یہ تقسیم انتظامی مصالح کی خاطر کی تھی۔ اگر ان کی یہ مصلحت کارفرما ہوتی تو یہ علاقہ بھی بنگال کی طرح ایک ہی صوبہ ہوتا۔ انگریزی عملداری کے شروع میں پنجاب اور سرحد ایک ہی صوبہ تھے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انہیں الگ الگ صوبے بنا دیا گیا۔ سندھ کو انگریزوں نے سنہ ۱۸۴۳ء میں ہتھیایا اور بمبئی کے ساتھ ملا دیا۔ اس وقت پنجاب ابھی انگریزوں کی عملداری میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس وقت پنجاب انگریزوں کے پاس ہوتا تو سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملایا جاتا نہ کہ بمبئی کے ساتھ۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ صوبوں کی ان لکیروں کو نہ کوئی تقدس حاصل ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ازلی سند۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے کہ یہ لکیریں انتظامی مصلحتوں کی خاطر کھینچی گئیں لیکن جس انداز میں یہ لکیریں کھینچی گئیں وہ اس امر کی بھی غماز ہیں کہ ان لکیروں سے مقصد ان کے درمیان نسلی تفرقہ کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا تھا۔ بلوچستان سندھ اور سرحد میں سے ہر ایک میں کم و بیش ایک ہی نسل کے باشندے بستے ہیں۔ صرف پنجاب ایک صوبہ ہے جس میں یہ کیفیت نہیں۔ یہاں مخلوط نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ انگریزوں کی عملداری میں نسلی امتیازات مستقل حیثیت اختیار کر گئے ان کی حکومت کا مفاد اسی میں تھا۔"

وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی تقریر

جب پاکستان بن گیا تو نومبر ۱۹۵۴ء کی ایک شام کو اس زمانے کے وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ نے ریڈیو

کراچی سے ایک تقریر کی جس میں صوبائی تفریق کے تدارک کے متعلق ایک تجویز پیش کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے یکم نومبر کے براڈ کاسٹ میں صوبائی تعصب کے خطرات کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب صوبائیت کے خطرہ سے آگاہ ہوں گے۔ پاکستان میں باہمی تفریق کی ایسی مصنوعی لکیریں کھینچی ہوئی ہیں کہ جن سے ہماری قومی وحدت قائم نہیں رہتی۔ ہمیں بلا استثنا سب کو یقین ہو چکا ہے کہ جب تک ان مصنوعی حدود بندیوں کو نہ توڑا جائے گا صوبائی تعصب کی لعنت دُور نہیں ہو گی۔ اب یہ مطالبہ چاروں طرف سے اُٹھ رہا ہے کہ صوبائیت کی یہ لعنت جو ملت واحدہ کی حیثیت سے ہمارے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رہی ہے۔ اس کا استیصال ضروری ہے۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی ایک خدا، ایک رسولؐ اور ایک قرآن کی بنیادوں پر استوار ہے، اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام اہلِ پاکستان کو ایک ملت بنا سکتی ہے۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا:

"کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے نزدیک بہترین اندازِ حکومت تو وحدانی انداز تھا۔ لیکن چونکہ تمام پاکستان کو ایک وحدت بنانا ممکن نہیں اس لیے ہمیں کم از کم مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ تفریق کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا۔ ویسے بھی ہمارے لیے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سیکرٹریٹ، اور خدا جانے کیا کیا الگ الگ ساز و سامان ہوں۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔" (بحوالہ "تقریر ریڈیو پاکستان" ۱۹۵۴ء)

طلوعِ اسلام کا تبصرہ

حکومت کے اس اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے "طلوعِ اسلام" نے تحریر کیا تھا کہ:

"یہ قدم جو اب اُٹھایا گیا ہے، ہر چند بڑا اہم اور قابلِ قدر ہے لیکن یہ بہر حال ایک تخریبی قدم ہے یعنی اس سے صوبائی تفریق کی لعنت ختم ہو گئی لیکن ملت کی وحدت اسی صورت میں قائم ہو گی جب اس کے بعد تعمیری قدم بھی اُٹھایا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جو صوبائی تفریق کا سانپ مرا ہے تو اس کی لکیریں بھی باقی نہیں رہنی چاہئیں۔ مفاد پرست گروہ یقیناً اس قسم کے سوالات پیدا کرے گا کہ اس نئی وحدت میں پُرانے صوبائی تحفظات ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر اس قسم کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا تو یاد رکھیے جس مقصد کے لیے یہ قدم اُٹھایا گیا ہے، وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد ہمیں ہر قدم ایسا اُٹھانا چاہیئے جس سے اس فتنہ ماضی کی یاد تک بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ پٹھانی، پنجابی، سندھی، بلوچی الگ الگ کلچر اور روایات کا خیال عہدِ جاہلیت کے تصورات ہیں۔ مسلمان کا ایک ہی کلچر ہوتا ہے اور ایک ہی روایات؛ اسلام اس کا کلچر ہے۔ اور اسلامی روایات ہی اس کی روایات ہیں۔ لہٰذا اس

خیال کے مطابق جداگانہ تحفظات کے کسی مطالبے کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ جو علاقے پسماندہ ہوں، ان کی مدد کر کے انہیں دوسروں کے برابر لے آنا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ اس کا نام قرآن حکیم کی زبان میں "احسان" ہے، یعنی جہاں کسی کمی سے معاشرہ کے توازن میں فرق آجائے اس کمی کو پورا کر کے معاشرہ کے حسن کو برقرار رکھا جائے۔ اس باب میں "طلوعِ اسلام" وقتاً فوقتاً اپنے مشورے پیش کرتا رہے گا۔"

ون یونٹ[1] کے بعد انتظامی استقام کا نتیجہ

افسوس ان حقائق کی طرف کسی نے توجہ نہ دی لہٰذا "طلوعِ اسلام" کے ہی الفاظ میں:

"جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "وحدتِ مغربی پاکستان" جسے (ONE UNIT) کی اصطلاح سے پکارا جاتا تھا وہ تو وجود میں آگیا لیکن اس سے جو انتظامی استقام پیدا ہوئے ان کی اصلاح کی طرف کسی نے توجہ نہ دی (جو نہایت ضروری تھا) چاہیئے تو یہ تھا کہ پسماندہ علاقوں کی بہبود کے لیے خصوصی اقدامات کیے جاتے اور مختلف علاقوں کے مقامی حکام کو زیادہ سے زیادہ وسیع اختیارات دے دیے جاتے تاکہ عوام کو اپنے روزمرّہ کے معاملات کے تصفیہ اور مسائل کے حل کے لیے دُور دراز سفر طے کر کے مرکزی دارالحکومت میں نہ آنا پڑتا لیکن ایسا نہ کیا گیا اس سے عوام کو جو مشکلات پیش آئیں، ان سے ان کے دل میں ون یونٹ کے خلاف جذبات اُبھرنے شروع ہو گئے۔ جوں جوں ان مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا، ان کے جذبات شدید سے شدید تر ہوتے گئے، صوبوں کے الگ الگ وجود کے ساتھ سیاسی راہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کے مفاد وابستہ تھے۔ ون یونٹ سے یہ مفادات ختم ہو گئے تو انہوں نے عوام میں اشتعال پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں انتہائی صدمہ سے لکھنا پڑتا ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا حتیٰ کہ جب ۱۹۶۸ء میں چار قومیتوں کا فتنہ جگایا گیا تو اسے فرو کرنے کے لیے کوئی بھی مؤثر قدم نہ اُٹھایا گیا اور جنرل یحییٰ کے دور میں ون یونٹ کو ختم

---

[1] بجائے اس کے کہ ہم ون یونٹ کے اس عظیم منصوبے کو دل و جان سے کامیاب کرنے کی کوشش کرتے ہم نے اس کی منفعت بخشی کو کوئی اہمیت ہی نہ دی اور اس اجتماعیت کی سکیم کو نقصان رہ جاتا۔ ہمارے دل کی یہی وہ کمزوری تھی جو جناب سید اسعد گیلانی ایم اے کی زبان سے کچھ اس طرح وا ہوئی۔ وہ اپنے ایک مضمون "پنجاب کی آواز" میں روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱/۵/۸۶ کی اشاعت کی وساطت سے تحریر کرتے ہیں کہ "یہ منصوبہ ۵۴ء میں بنایا گیا اور پنجاب میں اس کے حق میں وسیع پیمانے پر پروپیگنڈا کیا گیا۔ پنجاب کے اخبارات و رسائل نے تو مشرقی پاکستان کا مقابلہ کرنے والے اس منصوبے کو حصولِ پاکستان کا مقصد قرار دیا۔ ۱۹۵۶ء کے دستور کی بنیاد بھی اسی منصوبہ کو قرار دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس منصوبے کا اصل مقصد پنجاب کو اقتصادی لحاظ سے تباہ و برباد اور سیاسی لحاظ سے مفلوج اور غیر مؤثر بنانا تھا۔

کرکے پھر صوبجاتی نظام بحال کردیا گیا۔"

اُلٹا علاج

اس طرح ہم نے سر درد کا علاج یہ کیا کہ سر کو ہی کاٹ پھینکا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس گردن زدنی سے پہلے ہی کل پاکستان جمعیت العلمائے اسلام اور جماعتِ اسلامی نے اپنے اپنے انتخابی منشور میں یہ شق شامل کر رکھی تھی کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو ون یونٹ کو ختم کرکے صوبوں کو ازسرِنو قائم کر دیا جائے گا۔ العجب! ظاہر ہے کہ اس قسم کے غلط علاج سے مریض کیونکر اچھا ہو سکتا تھا۔ لہٰذا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور اس طرح دو قومی نظریہ کا وہ سبق جو سرسیدؒ، علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ نے سالہا سال کی محنت شاقہ کے بعد ہمیں یاد کرایا تھا، ذہنوں سے اس کے نقوش دھندلے پڑتے گئے اور آہستہ آہستہ ہم نے بھی وہی کچھ کہنا شروع کر دیا جو کچھ ہندو اور انگریز کہتا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ اسی بھولے ہوئے سبق کا ہی نتیجہ ہے۔

ون یونٹ کا خاتمہ اور پانی کی تقسیم کا مسئلہ

ون یونٹ کے خاتمے سے ہمارے ہاں کس قسم کی خطرناک جراثیم پرورش پا چکے ہیں اس کا اندازہ پنجاب اور سندھ کے مابین پانی کی تقسیم پر ہمارے ہاں ایک دوسرے کی طرف سے دیئے گئے بیانات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ہمیں پہلے روزنامہ "جنگ" لاہور بابت ۱۶ جون ۱۹۸۵ء کے مطابق پنجاب اسمبلی میں متفقہ طور پر پاس ہونے والی قرارداد اور "جنگ" اخبار کا اداریہ دیکھنا ہوگا۔ تحریر ہے کہ:

"پنجاب اسمبلی نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں چشمہ جہلم لنک کینال کو بلاتاخیر کھولنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ یہ قرارداد اس خصوصی کمیٹی نے تیار کی تھی جسے اسمبلی کے سپیکر میاں منظور احمد وٹو نے ایوان کے مشورے سے نامزد کیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ نہر بند ہونے سے ۲۷ لاکھ ایکڑ رقبہ پانی سے محروم ہو گیا ہے اور فصل خریف خاص طور پر کپاس کی بوائی بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔

چشمہ جہلم لنک کینال ۹ مئی ۱۹۸۵ء سے بند ہے۔ دریائے سندھ سے پانی حاصل کرکے تریموں اور اسلام ہیڈ ورکس کے نہری نظام کو اس نہر کے ذریعے پانی فراہم کرنا معاہدہ سندھ طاس کا ایک حصہ ہے اور اس معاہدے کے بعد اس سے قبل کے تمام عارضی اور عبوری انتظامات کالعدم ہو گئے تھے۔ دریائے سندھ کے پانی پر اس نہر کے استحقاق کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب جناب نواز شریف نے وزیرِ اعظم جناب جونیجو کو پنجاب کے جنوبی

اضلاع کے دورے کی دعوت دی تاکہ وہ صورت حال کا خود مشاہدہ کر سکیں۔ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق پانی کی شدید قلت اور کمیابی سے متاثرہ علاقوں سے انتقال آبادی کا عمل شروع ہو گیا ہے اِس صورت حال سے جو تلخی پیدا ہوئی ہے، اس کی صدائے بازگشت پنجاب اسمبلی میں بھی سنی گئی جب ایک رکن اسمبلی نے کہا کہ اگر ایک ہفتہ تک نہر میں پانی نہ چھوڑا گیا تو متاثرہ تین ڈویژنوں سے تعلق رکھنے والے ارکان صوبائی اسمبلی مستعفی ہو جائیں گے۔ اِس سے زیادہ تلخ لہجہ ملک اللہ یار خاں کا تھا جنہوں نے کہا کہ پنجاب بڑے بھائی کا کردار ادا کرتے کرتے تھک گیا ہے اب وقت آگیا ہے کہ برابری کی سطح پر ہم اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔

اِدھر سندھ میں صورتِ حال یہ ہے کہ نہریں وافر پانی کو سنبھال نہیں سکتیں، اور روہڑی نہر میں پانی کے دباؤ سے پڑنے والا شگاف اس کا واضح ثبوت ہے۔ گدو اور سکھر بیراج میں پانی کا اخراج بدستور بڑھ رہا ہے۔ وزیر اعلیٰ سندھ نے اعتراف کیا ہے کہ سندھ ساٹھ فیصد نہری پانی استعمال کر رہا ہے۔ اِس قسم کی خبریں بھی آرہی ہیں کہ متاثرہ علاقوں میں امن امان کی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ متاثرہ علاقوں میں لوگوں کو پینے کا پانی بھی میسر نہیں آ رہا۔ ایک طرف پنجاب کا ۲۷ لاکھ ایکڑ رقبہ متاثر ہو رہا ہے اور کئی لاکھ افراد مصیبت میں مبتلا ہیں۔ دوسری طرف سندھ کی نہریں پانی سنبھالنے سے عاجز ہیں اور وافر پانی سمندر کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس سنگین مسئلہ پر وفاقی حکومت کا ردِعمل بھی حوصلہ افزا نہیں۔ اور مسئلہ سرد مہری کا شکار ہوتا دکھائی دیتا ہے ——— مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صوبائی عصبیت کو ہوا دینے والے عناصر عوام کو گمراہ کرنے کا موقع حاصل کر لیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسئلہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے وفاقی حکومت ایک لمحہ ضائع کیے بغیر ایسا فیصلہ کرے کہ پنجاب کی زرعی معیشت کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ ہو سکے۔ اس میں مزید تاخیر قومی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچائے گی۔"

وزیرِ اعلیٰ سندھ کا بیان

اس اداریہ کے بعد وزیرِ اعلیٰ سندھ جناب غوث علی شاہ نے روزنامہ جنگ کے حوالے سے ۷ رجون ۱۹۸۵ء کو جو کچھ فرمایا وہ درج ذیل ہے " ہم دریائے سندھ پر اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گے"

عبدالحمید جتوئی

اور مورخہ ۱۱ رجون ۱۹۸۵ء کو روزنامہ جنگ لاہور ہی کے حوالے سے قومی اسمبلی کے رکن جناب

عبدالحمید جتوئی صاحب نے فرمایا:

"پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کے اِس بیان کے بعد ہم انہیں قیدیوں کی طرح قومی اسمبلی کے رُوبرو پیش کرنا چاہتے ہیں کیونکہ انہوں نے مسئلے کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔" انہوں نے کہا کہ "بنگال کے چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم راؤ کمیشن نے ۱۹۴۵ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ پنجاب صوبہ سندھ کو سالانہ تین کروڑ روپے کی شرح سے معاوضہ ادا کرے گا جب کہ سندھ کا مطالبہ آٹھ کروڑ روپے تھا۔ اس کے مطابق رقم کی ادائیگی ہوتی رہی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پانی سندھ کا تھا۔ کیونکہ اگر وہ پانی کا مالک نہ ہوتا تو پنجاب اس کی قیمت کیوں ادا کرتا۔" انہوں نے بتایا کہ "۱۹۷۲ء میں پانی کی تقسیم پر معاہدہ ہُوا تھا اگر ان معاہدوں کو پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر سندھ کو ۱۹۴۷ء کے اس معاہدے سے الگ رہنے کا بھی حق مِل جائے گا جو پاکستان میں شامِل ہونے کے لیے اس نے کیا تھا۔ اس طرح حالات خطرناک ہو جائیں گے۔" عبدالحمید جتوئی نے کہا کہ "اگر آج پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کہتے ہیں کہ پنجند اور تریموں کے ہیڈ ورکس پنجاب میں واقع ہیں اور وہ پانی مرضی سے کھول بند کر سکتے ہیں تو پھر یاد رکھیں کہ کراچی کی بندرگاہ پر پنجاب کے لیے آنے والے مال کو واگزار کرنے سے بھی یہ کہہ کر انکار کیا جا سکتا ہے کہ بندرگاہ سندھ میں واقع ہے۔ اگر پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ نے ایسی محاذ آرائی شروع کر دی تو پھر اس کا کوئی انجام نہیں ہوگا۔"

یہ تو خدا کا شکر ہے کہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کے اس بیان پر کہ ہم اپنے خون سے سندھ کو سیراب کریں گے" کچھ وقتی بچت ہو گئی لیکن یہ بچت کتنے وقت تک ساتھ دیتی ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ پانی کے سلسلہ میں ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہُوا ـــــ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۹۸۵ء کے مطابق "وفاقی حکومت نے چشمہ جہلم لنک پر پنجاب کا حق مسترد کر دیا۔" اور اس کے بعد تحریر ہے کہ "حکومت دریائے سندھ کے پانی کا صرف ۱۶ فی صد پنجاب کو اور ۸۴ فی صد سندھ کو دینا چاہتی ہے۔ پنجاب نے فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

چشمہ جہلم لنک کینال کے پانی کی تقسیم کے اس تنازعہ کے علاوہ جہاں تک کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خاں نے اس کی تعمیر کے خلاف مہم کے آخری مرحلے پر اکوڑہ خٹک اور سرحد کے مختلف مقامات پر اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"تربیلا ڈیم سے ہمیں ایک چھوٹی سی سرنگ سے پانی دیا گیا تھا جسے بعد میں بند کر دیا گیا جبکہ

پنجاب کو سیراب کرنے کے لیے ان بندوں سے پانی لیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت نے پہلے تو ہمیں سندھ کے پانی سے محروم کیا اور اب کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا اعلان کر کے ہمیں مکمل طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔ اس لیے ہم کسی قیمت پر بھی نہ صرف یہ بلکہ بھاشا کے مقام پر بھی بند تعمیر نہیں ہونے دیں گے۔" خان عبدالغفار خان نے خیال ظاہر کیا کہ "جناح صاحب کا پاکستان ختم کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں پنجاب کے بعض طبقوں کو قصوروار قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ نئے معاہدہ کے ذریعہ چاروں بھائیوں کو اکٹھے بیٹھ کر ایک ایسا نظام بنانا ہوگا جس میں چاروں صوبوں کے حقوق کا تحفظ ہو۔ انہوں نے کہا کہ آج میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ بلوچ، پختون اور سندھی تینوں مظلوم ہیں اور اگر ہمیں اپنے جائز حقوق نہ ملے تو ہم ان حقوق کے حصول تک جدوجہد کریں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۵ ر اکتوبر ۱۹۸۵ء)

ہمارا خیال ہے کہ پانی کی تقسیم کے سلسلہ میں ان مندرجہ بالا خبروں، تقریروں اور اخباری اداریوں پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر اب ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کی داستان کے لیے گوش بر آواز ہونا چاہیے۔ جس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ[1]

وزیرِ اعظم ہند مسز اندرا گاندھی کا بیان

سقوطِ ڈھاکہ کی المناک داستان کے سلسلہ میں ہماری غلط فکر اور ہندوؤں کی سوچ میں کس قدر مماثلت پیدا ہو چکی تھی، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مسز اندرا گاندھی وزیرِ اعظم ہند کا وہ بیان جو اس نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے موقع پر اپنی پارلیمان میں دیا تھا، پیش کر دیا جائے۔ اس نے کہا تھا کہ:

"یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی۔ اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربے نے بتا دیا کہ جو کچھ ہم کہتے تھے، وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل تھا۔ یہ ان کے باطل نظریے کی شکست ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" ۱۹۷۷ء)

---

[1] جس طرح پاکستان کا قیام فتحِ قسطنطنیہ کے بعد ملتِ اسلامیہ کی سب سے بڑی کامیابی تھی، اسی طرح سقوطِ بغداد و اندلس کے بعد سقوطِ مشرقی پاکستان اس ملت کے جسد میں سب سے گہرا زخم تھا۔" (بحوالہ تحریکِ تکمیلِ پاکستان)

نذر الاسلام

مسز اندرا گاندھی کے اس بیان کے بعد اب یہ دیکھئے کہ مسٹر نذر الاسلام جو بنگلہ دیش کے قائمقام صدر تھے اس سلسلہ میں کیا فرماتے ہیں:

"ہماری فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے نہ کسی ملک کی۔ یہ فتح حق کی باطل پر۔ یہ فتح ہے ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیم ہند سے پہلے سرپھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل۔ اس پر اصرار نہ کرو لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے، سقوط ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے منقش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بنا پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو حشر آج مشرقی پاکستان کا ہوا ہے وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہوگا۔ حقائق کسی کے جھٹلانے سے جھوٹے نہیں ہوجایا کرتے۔"

(بحوالہ "طلوع اسلام" اگست ۱۹۷۷ء)

شیخ مجیب الرحمٰن (صدر بنگلہ دیش) کا بیان

اور جہاں تک مجیب الرحمان کا تعلق ہے تو اس نے پاکستان سے رہا ہونے کے بعد ڈھاکہ پہنچ کر کہا تھا کہ:

"میری قوم سیکولرازم، سوشلزم اور جمہوریت کے نظریات کی حامی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ میری پالیسی اور اندرا گاندھی کی پالیسی میں اس قدر مطابقت کیوں ہے اس کا جواب صاف اور واضح ہے کہ ہم دونوں کے نصب العین، زاویہ نگاہ اور اقدار حیات ایک ہیں۔"

(بحوالہ پاکستان ٹائمز ۱۱ جنوری ۱۹۷۷ء)

ڈاکٹر کمال حسین مورتیوں کے چرنوں میں

اور روزنامہ جنگ کراچی کی، ۲ نومبر ۱۹۸۲ء کی یہ خبر تو ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ کی متقاضی ہے کہ:

"چاٹگام ۶/ نومبر ۱۹۸۲ء (م ن الف) بنگلہ دیش میں صدارتی انتخابات کی مہم عروج پر پہنچ گئی ہے۔ عوامی لیگ کے صدارتی امیدوار ڈاکٹر کمال حسین کا چاٹگام میں زبردست خیر مقدم کیا گیا انہیں ہاتھی پر سوار کر کے پورے شہر میں گھمایا گیا۔ ڈاکٹر کمال حسین کے ہاتھی کے پیچھے دس ہاتھیوں پر عوامی لیگی کارکن سوار تھے جن کے ہاتھوں میں مرحوم شیخ مجیب الرحمٰن کی قد آدم تصاویر تھیں۔ جلوس کے آگے ایک جیپ چل رہی تھی جس پر ڈاکٹر کمال حسین کا انتخابی نشان رکھا ہوا تھا۔ جلوس انتخابی نعرے لگاتا ہوا ایک مندر کے قریب ٹھہر گیا جہاں مندر کے پجاری کی طرف سے سونے کی ایک کشتی جس کی قیمت تقریباً دس لاکھ روپے ہوگی ڈاکٹر کمال حسین کو پیش کی گئی۔ اس موقع پر تالیوں کی گونج میں ڈاکٹر کمال حسین مندر کے اندر گئے اور مورتیوں کے چرنوں میں پھول چڑھائے۔ اس موقع پر تالیوں کی گونج میں پجاری نے ان کی کامیابی کے لیے پرارتھنا کی۔ مندر یاترا کے بعد ڈاکٹر کمال حسین نے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ صدر منتخب ہونے کے بعد اقلیتوں کی اقتصادی حالت بدل دیں گے۔"

یہ تو وہاں کے بڑے بوڑھوں کی باتیں تھیں۔ اور جہاں تک نوجوان نسل کا تعلق ہے وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہی بلکہ سنہ ۱۹۶۹ء میں ہی ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایم اے کے طالب علم عزیز الرحمان نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ :-

"ہم نشری چیتنیا خودی رام سبھاش بوس بیجائے سنگھ جیسے اپنے قومی ہیرو کو فراموش کر بیٹھے تھے اور ان کی جگہ خالد، طارق، موسٰے اور علی جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے تھے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا تھا اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا تھا۔ اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اسلامی قومیت کے بندھن ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے راستے مضبوط ہو جائیں گے۔"

آئیڈیالوجی کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ

یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ کسی قوم کا وجود اس کی آئیڈیالوجی کا ہی رہین منت ہوتا ہے۔ اگر کوئی قوم اپنی آئیڈیالوجی کے تصور کو ہی نظر انداز کر دے تو پھر اگرچہ جسمانی طور پر اس قوم کا وجود باقی بھی رہے لیکن عملی طور پر اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے اور آخر کار وہ قوم اس دوسری قوم کا جزو بن جاتی ہے۔ جس کی آئیڈیالوجی کو اس نے اپنا رکھا ہو۔ سقوط ڈھاکہ کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ہم نے پاکستان بننے کے بعد نہ تو وہاں کی نئی نسل کو نظریہ پاکستان

کے روز مرد و زن یہاں برہنہ پا آتے اور تجدید عہد کرتے۔ ڈھاکے کا بیت المکرم اجتماعِ اُمت کے لیے وہ کچھ نہ کر سکا جو کچھ تشتت و افتراق کے لیے اس مینار نے کیا۔"

مشرقی پاکستان میں یہ تبدیلی شیخ مجیب الرحمٰن کی وجہ سے ہوئی یا کسی دوسرے شخص کی وجہ سے لیکن یہ بات تو مسلم ہے کہ قوموں کی تعمیر اور تخریب میں نظامِ تعلیم کا بڑا گہرا ہاتھ ہوتا ہے اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اگر وہاں کا نظامِ تعلیم صحیح خطوط پر استوار ہوتا اور نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر ہندوؤں کی اجارہ داری قائم نہ ہوتی تو آج تاریخِ پاکستان کے اوراق پر یہ سیاہ دھبے کبھی دکھائی نہ دیتے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے وقت وہاں کے حالات

راقم ہر چند اپنی تحریر کو ان ہی پیش کردہ عوامل اور نتائج تک محدود رکھنا چاہتا تھا جو "مشرقی پاکستان" میں دو قومی نظریہ کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں مرتب ہوئے۔ لیکن مزید آگہی کے پیشِ نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حکومت پاکستان کے سرکاری ترجمان کا وہ بیان جو ۷ مئی ۱۹۷۱ء کو پاکستان ٹائمز کی اشاعت میں شائع ہوا درج کر دیا جائے جس میں اس قیامت کا ذکر ہے جو اسمبلی کے اجلاس کے عارضی طور پر التواء پر مشرقی پاکستان میں برپا کی گئی۔ کیونکہ ان سطور سے بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ اگر قوم کی نظروں سے اس کی منزل اوجھل ہو جائے تو پھر وہ قوم اپنی خودکشی کے لیے اپنے ہی ہاتھوں سے گڑھے کھودنے میں کس قدر جوش و خروش کے ساتھ مصروف ہو جاتی ہے۔

ترجمان کا کہنا ہے کہ:

"اس کے بعد جہنم کے دروازے چوپٹ کھل گئے۔ بپھرے ہوئے عوام گلیوں اور بازاروں میں ہجوم کر کے امنڈ آئے اور آتش زنی، قتل و غارت گری، عصمت دری اور لوٹ مار کے ہنگامے عام ہو گئے۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ایک جھنڈی دکھائی گئی اور مزدور کارکن فیکٹریوں سے باہر آ گئے۔ کاروباری ادارے بند ہو گئے اور سرکاری ملازمین دفاتر سے غائب ہونے شروع ہو گئے۔ جو ان ہنگاموں میں رضاکارانہ طور پر حصہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے انہیں ڈرا دھمکا کر ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ ایسے ہی جیسے نازی دہشت پسند کیا کرتے تھے۔ خوف و ہراس اور وحشت و بربریت اس طرح پھیلا دی گئی کہ روزمرہ کی زندگی مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ملک کی آئینی اور قانونی حکومت کے بجائے "سرکاری احکامات" عوامی لیگ کے ہیڈ کوارٹر سے جاری ہونے شروع ہو گئے۔ ان احکامات کی رو سے لوگوں سے کہا گیا کہ وہ سرکاری ٹیکس مت ادا کریں اور جو رقوم وصول ہوں انہیں مرکزی

حکومت کی بجائے صوبائی حکومت کی مد میں جمع کیا گیا اور روپیہ حکومت کے خزانہ میں داخل کرنے
کی بجائے صوبائی حکومت کی مد میں جمع کیا گیا اور روپیہ حکومت کے خزانہ میں داخل کرنے کی بجائے
پرائیویٹ بنکوں میں جمع کیا گیا۔ یکم مارچ تا ۲۵ مارچ تک سرکاری نظم و نسق
کی مشینری یکسر معطل ہو کر رہ گئی۔ قتل و غارت گری، لوٹ مار، عصمت دری، آتش زنی کی وارداتوں کی اطلاعات
صوبے کے طول و عرض سے موصول ہوتی رہیں۔ ڈھاکہ، چٹاگانگ، کھلنا، راج شاہی، سلہٹ
اور دیگر متعدد علاقوں میں فاشسٹوں کے سے جھکڑ چلنے لگے۔ فوج ملک میں موجود تھی لیکن چونکہ
افسرانِ بالا کی طرف سے سخت تاکید تھی کہ وہ اپنی جگہ خاموش کھڑے رہیں اس لیے انہوں نے ایک
قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ انہیں یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ حکومت چاہتی تھی کہ سیاسی لیڈروں کو
موقع بہم پہنچایا جائے کہ وہ باہمی افہام و تفہیم سے کسی فیصلہ پر پہنچ جائیں۔ فوج کا ضبط و تحمل قابلِ
ستائش تھا۔ انہوں نے قومی جھنڈے کو جلتے ہوئے دیکھا۔ قائدِ اعظم کی تصویر کو پاؤں تلے روندے
جاتے ہوئے دیکھا۔ ان مناظر سے ان کے دل پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اور ان کی آنکھیں خون سے
سرخ ہو رہی تھیں لیکن اس پر بھی انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔"

بیان کے مطابق "مغربی پاکستان" کی اکثریتی پارٹی اور صدرِ مملکت کی ذاتی کوششیں سب بے سود تھیں اور دراصل عوامی لیگ کے لیڈر گفتگوئے مفاہمت میں محض وقت حاصل کرنے میں مصروف تھے۔

ترجمان کے مطابق:

" وہ درحقیقت ایک عرصے سے اپنی سازش میں مصروف تھے۔ اس سازش کا انکشاف اگرتلہ
کیس نے کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ہر ضلع میں" سنگرام پریشاد" کے نقاب
میں رضاکاروں کو عسکری ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے بھاری مقدار میں ہتھیار
اور گولہ بارود سمگل کر کے اسے صوبے کے اہم مراکز میں اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ خود ڈھاکہ یونیورسٹی کا
جگن ناتھ ہال اس کا مرکز تھا۔ عوامی لیگ کی سازش کس قدر منظم اور پلاننگ کے مطابق تھی، اس
کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۶/۲۵ مارچ کی درمیانی شب کو جگن ناتھ ہال سے مارٹر توپ سے
فائر کیا گیا تھا اور تیس گھنٹے کے اندر اندر ڈھاکہ تمام سڑکوں پر ایسی رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں جو سے
فوج کی نقل و حرکت کو مسدود کرنا مقصود تھا۔ عوامی لیگ جن لوگوں کو بات چیت سے اپنے ساتھ
ملانے سے قاصر رہی، انہیں نازیوں جیسے دہشت خیز حربوں سے اپنی قطار میں کھڑا کر لیا گیا۔ سارے
صوبے میں ناقابلِ فراموش دہشت و بربریت عام کر دی گئی اور ایسے مظالم برپا کیے گئے جس کے تذکرہ

سے روح کانپتی ہے۔ اس ہنگامہ آرائی میں عوامی لیگ کے ہاتھوں کس قدر قتل و غارت ہوا اس کا کچھ کچھ اندازہ اب سامنے آنے لگا ہے۔"

"جو شہادتیں میسر ہو سکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عوامی لیگ کا پلان یہ تھا کہ ۲۶ مارچ کی علی الصبح فوجی چھاؤنیوں پر دھاوا بول دیا جائے اور بنگلہ دیش کی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا جائے۔ سکیم یہ تھی کہ سب سے پہلے چٹاگانگ اور ڈھاکہ پر قبضہ کر لیا جائے تاکہ مغربی پاکستان سے بحری اور ہوائی فوج کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ اس وقت سارے مشرقی پاکستان میں صرف ایک ڈویژن فوج تھی جو ۱۸ بٹالین پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ۱۲ بٹالین مغربی پاکستان کی تھیں جو سارے صوبے بالخصوص ہندوستان سے ملحقہ سرحدی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنی سی فوج کے مقابل ہندوستان سے گھس آنے والی فوج، ایسٹ پاکستان رائفلز اور ایسٹ بنگال رجمنٹ اور دیگر عسکری اداروں کے باغی سب متحدہ محاذ کی شکل میں تھے۔ یہ سب مارٹر توپوں، اعلیٰ رائفلوں اور ریڈی اور چھوٹی مشین گنوں سے مسلح تھے۔ بعد میں موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق انہیں ہندوستان سے اسلحہ وغیرہ برابر موصول ہو رہا تھا۔"

"عوامی لیگ کی طرف سے باقاعدہ حملہ اور آزادی کے اعلان میں بس چند گھنٹوں کا وقفہ رہ گیا تھا کہ صدرِ مملکت نے (افہام و تفہیم سے آخری مایوسی کے بعد) افواجِ پاکستان کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔ وہ نہایت عزم و حوصلہ سے آگے بڑھیں اور بند کے ٹوٹنے سے ذرا پہلے آگ و خون کے اس سیلاب کو روکنے میں کامیاب ہو گئیں۔"

آخر کار ظہورِ نتائج کا وقت آپہنچا

لیکن افسوس یہ کامیابی وقتی ثابت ہوئی اور بالآخر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو نسل پرستی اور علاقائی عصبیت کی کند تلوار نے مشرقی پاکستان کی مبارک پیشانی پر بنگلہ دیش کا نام کندہ کر دیا۔ اور یہ سب کچھ ہمارے اپنے اعمال کی وجہ سے اس قانونِ مکافات کی رو سے ہوا جس قانون کی نظر میں انسان کی انفرادی زندگی سے لے کر قوموں کی اجتماعی زندگی کے ایک ایک عمل کا نتیجہ ساتھ ساتھ مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس قسم کی خودکشی کے سلسلہ میں بقول شخصے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

"اس سے زیادہ المناک خودکشی اور کیا ہوگی کہ انسان دشمن سے خود پوچھے کہ کیا ارشاد ہے تو وہ اس کی شاہ رگ پر انگلی رکھ کر کہہ دے کہ اسے یہاں سے کاٹ لو۔ اور

وہ احمق یہ کر گذرے۔"

اور آخر کار اس خودکشی کے بعد ہم نے بنگلہ دیش کے وجود کو بھی تسلیم کر لیا۔

آخر کار بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا گیا

فروری ۱۹۷۴ء پاکستان میں لاہور کے مقام پر جو مسلم سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی اس پر تبصرہ کے دوران ادارہ طلوعِ اسلام نے بنگلہ دیش کے تسلیم کرنے کی روئداد کچھ اس طرح تحریر کی ہے:

"کانفرنس میں شرکت کرنے والے نامور حضرات اس لیے محوِ تگ و تاز ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی نہ کسی طرح کانفرنس میں شریک کر لیا جائے۔ پہلے مؤقف یہ تھا کہ اُدھر سے شیخ مجیب الرحمان پاکستان کے ۱۹۵ قیدیوں پر مقدمہ چلانے کے فیصلہ سے دست برداری کا اعلان کرے اور اِدھر سے پاکستان اُسے تسلیم کر لینے کا اعلان کر دے بائیس فروری کو کانفرنس کی کارروائی شروع بھی ہو گئی۔ لیکن ڈھاکہ اور لاہور میں وفود کی تگ و تاز کا سلسلہ جاری تھا۔ شام پانچ بجے کے قریب وزیرِ اعظم بھٹو نے وفاقی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان اور کچھ دیگر حضرات کو ایک کمرے میں جمع کیا۔ محترم بھٹو، جو چند ہی منٹ پہلے گل لو میدکی طرح مہک اور چہک رہے تھے، جب اس کمرے میں داخل ہوئے تو وہ انتہائی افسردہ حال اور آشفتہ مُو نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے گہرے غم و تاسف میں ڈوبی ہوئی آواز میں بمشکل چند الفاظ کہے جن کا ملخص یہ تھا کہ مَیں جس فیصلے کا اعلان کرنے والا ہوں اُس میں خوش نہیں۔ لیکن بعض فیصلے انتہائی مجبوری کے عالم میں کیے جاتے ہیں۔ مَیں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فیصلہ یقینی طور پر صحیح ہے اس کا فیصلہ تاریخ ہی کرے گی۔ اس کے بعد انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا کہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم نے بنگلہ دیش کو بلا مشروط تسلیم کر لیا ہے۔

فیصلے کا اعلان تو اس انداز و کیفیت سے ہُوا لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ سامعین نے جوش و مسرت کی تالیوں سے اس کا استقبال کیا۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ خود مسٹر بھٹو بھی ان تالیوں میں اپنے مخصوص انداز کے مطابق شریک ہو گئے۔ چشمِ حیراں بار بار پوچھتی تھی کہ ع۔

اے عقل چہ می گوئی ! اے عشق چہ فرمائی !

دوسری صبح الجزائر کے صدر محترم بومدین کے مخصوص ہوائی جہاز میں شیخ مجیب الرحمان اپنے رفقاء کی معیت میں لاہور کے ہوائی اڈے پر نزول فرما ہو گئے۔ وہ جہاز کی سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو اس انداز سے جیسے سکندرِ اعظم پورس کی سرزمین کو روندتے آ رہا ہو۔ وہ نیچے اُترے تو وزیرِ اعظم بھٹو مع دیگر ارکانِ مملکت مستانہ وار استقبال کے لیے آگے بڑھے وہ آگے بڑھنے کے لیے قدم اُٹھا رہے تھے اور ہماری نگاہیں ان کی کتاب "عظیم المیہ" کے وہ ورق اُلٹتی جا رہی تھیں۔ جن میں لکھا تھا:

(۱) مجیب کے دل میں مغربی پاکستان کے لیے سخت نفرت تھی جسے وہ تصنع کے نقاب میں چھپائے رکھتا تھا۔ (ص ۱۳)

(۲) ایک آزاد بنگلہ دیش کے لیے ہندوستان کی طرف سے سازش تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی اور اگر تلہ کیس کے بعد اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ص ۵

(۳) مجیب کا منتہائے مقصود ایک آزاد بنگلہ دیش تھا۔ ص ۵،

(۴) مجیب، مغربی پاکستان سے سخت نفرت کرتا تھا اور خود پاکستان کے متعلق بھی کسی فریب میں مبتلا نہیں تھا۔ ص ۵،

(۵) جنگ ستمبر ۶۵ء کے بعد مشرقی پاکستان کے اُس وقت کے گورنر منعم خاں نے صدر ایوب کو رپورٹ بھیجی تھی کہ جنگ کے دوران، مجیب نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اعلان کر دے کہ وہ آزاد بنگال کا وزیرِ اعظم ہے اور اِس طرح مغربی پاکستان سے تعلق ختم کر لے۔ ص ۶۹

اِس کے ساتھ ہی مسٹر بھٹو کی یہ آواز بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی جس کی رو سے انہوں نے اُنہی دنوں کہا تھا کہ انہوں نے اگر تلہ کیس کا فائل دیکھا ہے جس کی رُو سے مجیب واقعی بغاوت کے جرم کا ارتکاب ثابت ہوتا تھا۔

اِدھر سے مسٹر بھٹو جا رہے تھے، اُدھر سے وہ مجیب آ رہا تھا جس نے پاکستان سے رہائی کے بعد ڈھاکہ سے اعلان کیا تھا کہ اگر مسٹر بھٹو سمجھتا ہے کہ میری جاں بخشی کے عوض وہ میرے ساتھ کوئی تعلق قائم کر سکے گا تو وہ اس قابل ہے کہ اُسے پاگل خانہ بھیج دیا جائے۔

ہم ان صداہائے بازگشت میں محو تھے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ایسے والہانہ انداز سے مستانہ وار ایک دوسرے سے گلے ملے اور پیار و محبت کے ایسے مظاہرے کیے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچپن کے مخلص دوست مدت کی جدائی کے بعد،

اچانک ایک دوسرے کے سامنے آ گئے ہیں اور وفورِ جذبات سے ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہیں اور کیا کریں۔ آغا حشر نے تو معلوم نہیں کس کیفیت کے ماتحت یہ کہا تھا لیکن اس منظر پر ہمیں بلا ساختہ ان کا یہ شعر یاد آ رہا تھا کہ ؎

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے
دِل اُس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

آپ اس شعر میں "عشق" کی جگہ جو لفظ مناسب سمجھیں رکھ لیں، ہماری سمجھ میں جو لفظ بھی آتا ہے، اُس سے شعر بے وزن ہو جاتا ہے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام" اپریل ۱۹۷۴ء)

قائدِ اعظم کی مومنانہ فراست

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ خدا کے دیئے ہوئے نُور سے دیکھتا ہے اور قائدِ اعظم کی مومنانہ فراست نے سقوطِ ڈھاکہ سے ۲۳ سال قبل ۱۹۴۸ء میں جب وہاں زبان کے مسئلہ کی آڑ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں فسادات شروع ہو گئے تو وہاں کے باشندوں سے ریڈیو پر اپنے پیغام میں فرمایا تھا کہ "پاکستان مسلم قومیت کی وحدت کا مظہر ہے۔ وہ اسے ایسا ہی رہنا چاہیئے۔ اگر ہم اپنے آپ کو اولاً بنگالی پنجابی، سندھی وغیرہ کی حیثیت سے سمجھنا شروع کر دیا اور مسلمان اور پاکستانی ہونے کی حیثیت کو محض اتفاقیہ تصور تصور کر لیا تو پھر پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے ... یہ نہ سمجھیئے کہ یہ کوئی بعید از قیاس اور ناقابلِ فہم سا مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمنوں کو اس کے امکان کا اچھی طرح اندازہ ہے اور انہوں نے ابھی سے اس کے لیے بساط بچھانی شروع کر دی ہے۔ میں آپ سے صاف صاف بات کرنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچیئے کہ جب سیاسی ایجنسیاں اور ہندو پریس جس نے تشکیلِ پاکستان کی انتہائی مخالفت کی تھی، مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے مزعومہ "منصفانہ حقوق" کا درد دل میں لے کر اٹھیں تو کیا یہ ایک انتہائی شر انگیز چال نہیں ہوگی۔ کیا اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے نہیں آ جاتی کہ یہ عناصر تخلیقِ پاکستان کی مہم میں ناکام رہ گئے تو اب انہوں نے اس کے لیے ایسا شر انگیز پروپیگنڈا شروع کر دیا ہے جس سے ایک مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائی کے خلاف لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔"

کاش ہم نے قائدِ اعظم رح کی اس آواز پر کان دھرے ہوتے تو آج ایک بھائی دوسرے بھائی سے علیحدہ نہ ہوتا۔

باقی ماندہ پاکستان

بنگلہ دیش کی اس داستان کے بعد اب ہمیں اس باقی ماندہ پاکستان میں سیاسی اور نظریاتی فرقہ بندی کی بنا

پر پیدا کیے جانے والے حالات کا جائزہ لینا ہوگا اور وہ اس لیے کہ شائد ہم قائدِ اعظم رح کے ان الفاظ پر اب بھی یقین کر لیں کہ:

"ہماری نجات، حفاظت اور عزت آبرو کے تحفظ کا واحد ذریعہ پاکستان ہے اور اگر ہم اس جدوجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تباہ ہو جائیں گے اور اس برِ صغیر میں مسلمانوں اور اسلام کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا۔"

علامہ اقبال نے کہا تھا: ؎

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی — علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

یہ نعرہ چند بچوں نے لگایا تھا

لہٰذا اگر قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جس دیرینہ بیماری نے "مشرقی پاکستان" کے خطۂ زمین کو بنگلہ دیش میں تبدیل کر دیا وہی مہلک بیماری ہمارے اس باقی ماندہ پاکستان کو گھن کی طرح اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی ہے اور پاکستان کی چھاتی پر کھڑے ہو کر بھری محفل میں یہاں تک کہا جا رہا ہے کہ:

"پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ چند بچوں نے الیکشن جیتنے کے لیے لگایا تھا۔ ورنہ یہ مسلم لیگ کی سرکاری پالیسی کا حصہ نہیں تھا۔ کیونکہ علماء کی زیادہ تعداد مولانا حسین احمد مدنی مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ بخاری بخاری وغیرہ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں کو کافر قرار دے چکی تھی۔"

پاکستان کے نامور مشاہیر کا ٹی۔وی پروگرام

مندرجہ بالا بیان کسی نامعلوم شخص کا نہیں بلکہ مسلم لیگ کے صفِ اوّل کے رکن سردار شوکت حیات خان صاحب کا ہے جو انہوں نے جنگ فورم کو خصوصی انٹرویو کے دوران دیا۔ (بحوالہ جنگ لاہور مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۸۷ء)

اور اس سے بہت پہلے غالباً ۱۹۷۰ء[1] کی بات ہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لینے والے بعض نامور مشاہیر کو اپنے ہاں اس لیے دعوت دی تاکہ وہ بتائیں کہ تحریکِ پاکستان کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چوہدری خلیق الزماں، مسٹر حسین امام، راجہ صاحب محمود آباد، شاہ عزیز الرحمٰن جیسے بزرگ ٹیلی ویژن پر تشریف لائے اور جو کچھ ان بزرگوں نے اس پروگرام کے دوران فرمایا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پرویز صاحب نے کہا تھا کہ:

---

[1] اس کی وضاحت اپنے مقام پر آئے گی۔

"اسے سُن کر قائدِ اعظمؒ کی رُوح تڑپ اُٹھی ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے وہی کہا تھا جسے اب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے دہرایا ہے یعنی یہ کہ ہندو کی تنگ نظری نے ہمیں مجبور کر دیا تھا کہ ہم اس سے علیحدہ ہو جائیں۔ اگر وہ ذرا کشادہ دلی سے کام لیتا اور ہمارے معاشی استحصال سے باز آجاتا تو ہم کبھی جداگانہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔" (بحوالہ "قائدِ اعظم آپ کہاں ہیں")

شیخ رشید صاحب کا بیان

اور ان مسلم لیگی راہنماؤں کے علاوہ قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور سابق مرکزی وزیر شیخ محمد رشید صاحب نے ۱۹۷۳ء میں قومی اسمبلی کے ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں مسلم لیگ کا کارکن رہ چکا ہوں اور تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں جیل بھی جا چکا ہوں۔ اس تحریک کے حقیقی محرک کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ تحریکِ پاکستان کی واقعاتی شہادتوں کے گہرے مشاہدہ سے ظاہر ہوگا کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد مذہب نہیں تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو عبادت کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی البتہ مسلمانوں کا استحصال روزمرّہ کا معمول تھا۔ قائدِ اعظم نے مسلمانوں کا استحصال ختم کرانے کے لیے انتھک کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ جب تک مسلمان ہندو کے ساتھ رہیں گے وہ اقتصادی استحصال سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ پاکستان کے لیے مسلمانوں کی جدّوجہد طبقاتی جدّوجہد تھی۔" (بحوالہ جسارت مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۷۳ء)

جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کی تحریر

ان کے بعد ہمارے سامنے روزنامہ جنگ لاہور کے مشہور کالم نویس جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کا نام آتا ہے جنہوں نے مورخہ یکم مئی ۱۹۸۴ء کو اپنے کالم "تحریکِ پاکستان میں اسلام کا کردار" پر قلم اٹھایا:

جناب حقانی صاحب نے اپنے اس طویل کالم میں بڑے واضح انداز میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا جس قسم کے خیالات کا اظہار قائدِ اعظمؒ کی زندگی کے بعد جناب جسٹس محمد منیر صاحب (مرحوم) جناب میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور جناب سردار شوکت حیات صاحب وغیرہ کر چکے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ملّتِ پاکستان کے ہاں تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نئی نسل ان الزام تراشیوں کی اصل حقیقت سے آج تک آگاہ نہ ہو سکی۔

حقانی صاحب نے اپنے مذکورہ کالم میں جو کچھ کہا وہ یقیناً طویل ہے لیکن اسے یہاں درج کرنا اس لیے ضروری خیال کیا گیا ہے کہ یہ بخوبی اندازہ ہو سکے کہ ہمارے ان حضرات کی سوچ حقیقت سے کس قدر بعید ہے حقانی صاحب نے اس کالم میں تحریر کیا ہے کہ:

"انگریز سے آزادی کے حصول کے لیے جدوجہد تو جذبۂ قومیت اور حق خود ارادی کے حوالہ سے کی گئی۔ لیکن ہندو کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلام کا حوالہ بھی استعمال ہوا لیکن یہ یاد رکھیے کہ مسلم لیگ کی تحریک مسلم قوم پرستی کی تحریک تھی۔ یہ خالص احیائے اسلام کی تحریک نہ تھی اور تحریکِ پاکستان کے دوران ان علماء نے بھی جو مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص کے قائل تھے۔ یعنی مولانا مودودی مرحوم و مغفور وغیرہ انہوں نے بھی اسے مسلم قوم پرستی کی تحریک ہی قرار دیا تھا۔ اور یہ بات غلط نہ تھی۔ خود مسلم لیگی قیادت بھی اسے مسلمان قوم کی جدوجہد آزادی کہتی اور سمجھتی تھی۔ آج ہمارے ہاں تحریکِ پاکستان میں اسلام کے کردار کے حوالہ سے جو اختلافات پائے جاتے ہیں، وہ اس حقیقت کو فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں اسلام کا کردار کس قدر اور کیا تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے مسلم لیگ قومیت کی علمبردار تھی اور اسلام کا تذکرہ بھی اس کے ایک جزو کے طور پر کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس جماعتِ اسلامی کی جدوجہد اپنی بصیرت اور اپنے نظریات کے مطابق تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی تحریک تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے اسلام کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ بالکل فطری تھا اور تحریکِ پاکستان کے مخالف یا اس سے بے تعلق حلقے حصولِ آزادی سے پہلے کہا کرتے تھے کہ آزاد پاکستان میں مسلم لیگی قیادت صرف ایک حد تک ہی اسلام سے وابستگی کا مظاہرہ کر سکے گی۔ خود مسلم لیگی قیادت نے کبھی اپنی تحریک کو احیائے اسلام کی تحریک قرار نہیں دیا۔ وہ اسے مسلم قوم پرستی کی تحریک ہی قرار دیتی تھی۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد یہ عجیب صورت پیدا ہوئی کہ مسلم لیگی قیادت سے کہا گیا کہ آپ نے تو تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی تحریک چلائی تھی لہٰذا اب یہاں احیائے اسلام کے لیے کام کرو۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگی قیادت کا یہ پروگرام تھا نہ اس کی سوچ اور افتادِ طبع یہ تھی اس لیے اس کے اور اسلام پسند کہلانے والی قوتوں کے درمیان محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ یہ چیز بالکل قدرتی تھی۔ آج بھی مسلم لیگی قائدین برملا کہہ رہے ہیں کہ ہماری جدوجہد مسلم قوم کے حقوق کی جدوجہد تھی۔ علماء کے تصورات کے مطابق تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کی جدوجہد نہ تھی لیکن ان کے مخالفین اصرار کر رہے ہیں کہ نہیں تمہاری جدوجہد احیائے اسلام

اور تجدید دین کی جدوجہد تھی اور تم اس وعدہ سے منحرف ہو گئے ہو۔ ہماری دانست میں اسلام کو ملک کی حیاتِ اجتماعی میں ایک خاص مقام دلانے کے خواہشمند حلقے اگر یہ کہنے کی بجائے کہ تم نے جدوجہدِ آزادی کے دوران پاکستان کو تجدید واحیائے دین کا ذریعہ بنانے کا وعدہ کیا تھا۔ لہٰذا اب یہ وعدہ پورا کرو۔ یہ استدلال کرتے کہ تمہارے اندازوں کے برعکس یہ ملک اب خالص مسلمانوں کا ملک بن گیا ہے۔ اس میں نہ سکھ ہیں نہ اتنے ہندو ہیں جتنے پنجاب اور بنگال کی عدم تقسیم کی صورت میں ہوتے یا جتنے تبادلۂ آبادی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہوتے۔ لہٰذا اب اسے ایک اسلامی ریاست بنایا جائے اور یہاں تجدید واحیائے دین کا کام کیا جائے تو اس دلیل میں زیادہ وزن ہوتا اور مسلم لیگی لیڈروں کو آج یہ نہ کہنا پڑتا کہ ہم نے صرف مسلمانوں کے قومی حقوق کے تحفظ کے لیے یہ ملک بنایا تھا۔ اور ہمیں خواہ مخواہ تجدید دین واحیائے اسلام کا علمبردار ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اس طرح ہم اس مضحکہ خیز صورت حال سے بچ جاتے ہیں جس میں مسلم لیگیوں پر احیائے اسلام کی علمبرداری کا کردار مسلط کیا جا رہا ہے لیکن وہ اس سے انکار کر رہے ہیں۔"[۳۱]

انہی دنوں تحریکِ پاکستان کے بعض ممتاز رہنماؤں نے جن میں میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات نمایاں ہیں، کہا ہے کہ تحریکِ پاکستان میں احیائے اسلام کا جذبہ ایک غالب محرک نہ تھا، اور پاکستان کا مطلب کیا " لا الٰہ الّا اللہ" کے نعرہ سے اگر یہ مراد ہے کہ پاکستان میں اہلِ مذہب کو غلبہ حاصل ہونا چاہیئے تو ہمارا اس تصور سے کوئی تعلق نہیں۔ میاں ممتاز دولتانہ نے کہا: " پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الّا اللہ کا نعرہ قائدِ اعظم نے نہیں لگایا تھا۔ میں نے نہیں لگایا تھا۔ لیگ کی کسی قرارداد میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ سردار شوکت حیات نے کہا کہ یہ نعرہ تو بچوں نے لگایا تھا۔ اور اس کا مقصد لوگوں کے جوش میں اضافہ کرنا تھا۔ ان بیانات کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے کہ یہ حضرات تحریکِ پاکستان میں اسلام کے کردار کو گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس تحریک کا مقصد پاکستان میں تجدید واحیائے دین تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کی تحریک کے دوران اس پر بعینہٖ یہ اعتراض کیا جاتا تھا کہ اس نے اپنی کسی باضابطہ قرارداد میں اسلام کو اپنا منتہائے مقصود بنانے کا اعلان نہیں کیا اور اس کی ساری جدوجہد اور اس کی قیادت کے تمام انداز دوسری قوم پرست تحریکوں سے مشابہ ہیں۔ یہ اعتراض غلط نہ تھا اور مسلم لیگی قیادت اپنی تحریک کے قوم پرستانہ تحریک ہونے سے کل انکار کرتی تھی نہ آج انکار کرتی ہے۔ آپ مسلم لیگ کے موجودہ صدر پیر صاحب پگاڑا شریف سے پوچھ

کر دیکھ لیجئے وہ اسی زبان اور اسی محاورہ میں بات کرتے ہیں جس میں کل کے یا آج کے دوسرے لیگی کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی جماعت کو مذہبی یا دینی جماعت نہیں کہتے بلکہ ایسا کہلانے والوں کو فرقہ پرست جماعتیں کہتے ہیں۔ اندریں حالات یہ دعویٰ کرنا کہ قیامِ پاکستان کا محرک جذبہ تجدید و احیائے دین تھا، درست نہیں۔ ہاں مسلمانوں کے قومی حقوق کا تحفظ (مسلم لیگی قیادت کے تصورات کے مطابق) ضرور اس کا مقصد تھا اور اس میں دوسری باتوں کے علاوہ مسلمانوں کے کلچر کے تحفظ کا ایک واضح تصور شامل تھا۔"

یعنی خان صاحب کے کہنے کے مطابق مسلم لیگی قیادت نے اسلام کا حوالہ بہانے کے طور پر ہندو کی غلامی کے خطرہ کے پیشِ نظر تراشا تھا ورنہ مسلم لیگی قیادت (قائدِ اعظم) کے نزدیک پاکستان کا حصول نظریاتی مملکت کی بجائے دیگر مسلم ممالک کی طرح صرف ایک خطۂ زمین حاصل کرنا ہی تھا اور وہ صرف اس لیے کہ اس علاقے کی مسلم قوم کا تحفظ کیا جا سکے۔ جہاں کا نظامِ حکومت سیکولرازم کی بنیاد پر ہو۔ البتہ حصولِ آزادی کے بعد اسلام پسند جماعتوں نے ایک غلط فہمی کی بنا پر مسلم لیگی قیادت کی توجہ احیائے اسلام کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن چونکہ یہ امر تو شروع ہی سے اس قیادت کے پروگرام کا حصہ نہ تھا اور نہ ہی اس کی سوچ اور افتادِ طبع یہ تھی۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں باہمی محاذ آرائی شروع ہو گئی۔

اداریہ نوائے وقت

بہر حال تائیدی نقطۂ نظر کے پیشِ نظر جہاں تک مودودی صاحب مرحوم کی شہادت کا تعلق ہے، تو (مرحوم) کی اس "خدمت" کا ذکر روزنامہ نوائے وقت" لاہور نے بھی اپنے اداریہ بابت ۱۲ مارچ ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں میاں طفیل محمد کی دھمکی" کے عنوان کے تحت ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

" ایک دور میں اس نے (مودودی صاحب مرحوم کی جماعت) نے علامہ اقبال کی فکر اور قائدِ اعظم کی تحریک کا ساتھ دینا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ مودودی صاحب کے نزدیک قائدِ اعظم کا مقصد صرف مسلمانوں کی آزادی اور علیحدہ مملکت کا قیام ہے۔ اسلامی نظام کا نفاذ نہیں۔"

مودودی صاحب کا اپنا بیان

اب اگر یہ دیکھنا ہو کہ یہ پیش کردہ تائیدی شہادت کس حد تک محترم ہے تو اس سلسلہ میں راقم قائدِ اعظم کے متعلق خود مودودی صاحب مرحوم کے اپنے بیانات کی ہی (معذرت کے ساتھ) تکرار کرتے پر اکتفا کرے گا۔

آپ نے ۱۹۷۶ء میں فرمایا تھا کہ:

"آپ کی معلومات کے لیے اتنا کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی۔ میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں سے ایک قائدِ اعظم مرحوم بھی تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااصول، راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی میرے دل میں ان کے متعلق یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔"

(بحوالہ نوائے وقت لاہور ۲۴ راگست ۱۹۷۶ء)

قائدِ اعظم نے اپنے ضمیر کے مطابق دو قومی نظریہ کی ترجمانی اور اسلام کے تحفظ کے لیے پاکستان کی ضرورت کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ اس سے بیشتر سابقہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے اور اس کی مزید وضاحت آگے چل کر بھی بیان کی جائے گی۔ لیکن سوال تو یہاں خود مودودی صاحب کی اپنی ذات کا ہے کہ انہوں نے اس بااصول، راستباز اور مضبوط سیرت و کردار کے مالک انسان کو جس نے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۸ء تک کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی مودودی صاحب نے اس شخصیت کو قرآنی حکومت کی غرض و غایت اور اہمیت کے حوالے سے کیسا جانا اور کیسا پایا۔ خیال رہے کہ قارئین اس ایک اقتباس سے خود ہی اندازہ لگا لیں گے کہ ان حضرات کا یہ کہنا کہ حصولِ پاکستان کا اصل مقصد صرف مسلم قومیت کا تحفظ تھا نہ کہ قرآنی حکومت کا احیاء خود ان کی اپنی زبان کے تحت ہی کس قدر غلط ہے۔ لیکن اس سے بیشتر یادداشت کے طور پر مودودی صاحب مرحوم کی تحریر کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرنا ضروری ہے۔

یہ تو تحریک کے آغاز سے ہی واضح تھا

"اس تحریک کے آغاز سے ہی عام مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی تمناؤں کا مرکز ایک اسلامی مملکت ہوگا جس میں اسلام کا قانون جاری ہوگا اور اسلامی تہذیب زندہ ہوگی۔ اس لیے ان کا نعرہ یہ تھا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ مسلم لیگ کے لیڈر بھی اپنی تقریروں میں یہی خیال ظاہر کر رہے تھے اور سب سے بڑھ کر خود قائدِ اعظم مرحوم و مغفور نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان کا دستور قرآنی ہوگا۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۲۴ راگست ۱۹۷۶ء)

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں جناب حقانی صاحب کی خدمت میں کیا عرض کیا جائے جبکہ ہمارا خیال ہے کہ ان کے سامنے تو "نظریہ ضرورت" کے تحت کوئی مصلحت بھی کارفرما نظر نہیں آتی۔

جناب حقانی صاحب نے اپنے کالم میں سردار شوکت حیات صاحب کا بھی حوالہ پیش کیا ہے جس کا جواب جناب پرویز صاحب کے قلم سے روزنامہ جنگ لاہور جمعہ میگزین بابت ۴ مئی تا ۱۰ مئی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا جس میں بزبان قائدِ اعظم ان تمام الزامات کی تردید کی گئی جس کے تحت یہ کہا جا رہا ہے کہ بانیٔ پاکستان کے نزدیک اس مملکت کا قیام سیکولرازم کے تصور کا رہین منت تھا۔ پرویز صاحب نے اپنے اس مقالہ میں قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا بھی ذکر کیا جس کو ہمارے ہاں اس قسم کے خیالات کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ قائدِ اعظم کی ذات اور پاکستان کی بنیادی ضرورت کو جاننے کے لیے اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس موقع پر پرویز صاحب کے اس تبصرہ کو درج کر دیا جائے۔ آپ نے جو کچھ تحریر کیا وہ یہ تھا۔

قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر" اور اس کی وضاحت از پرویز صاحب

"اب آئیے قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کی طرف جسے یہ حضرات ترپ کے پتّے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں اور جس پر محترم محمد منیر صاحب مرحوم نے بھی اپنے دعویٰ کی بنیاد رکھی تھی اور اتنا کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ یہاں تک کہنے میں بھی کچھ باک نہیں سمجھا کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کو بھی ختم کر دیا تھا۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ انہوں نے دو قومی نظریہ کی نفی کر دی تھی بلکہ سرے سے اس بنیاد ہی کو منہدم کر دیا تھا جس پر تقسیمِ ہند کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اس تقریر کے سلسلہ میں بات یوں ہوئی کہ جب قائدِ اعظم کو پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا تو انہوں نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اس مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے ایک تقریر فرمائی۔ اس میں انہوں نے پہلے قبل از تقسیم کے ہندوستان کے کوائف و حوادث پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کس قدر باہمی عداوت کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ وہاں مسلمان اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں۔ اس لیے وہاں ہمیشہ مسلمانوں کا خون خرابہ ہوتا تھا پاکستان میں صورتِ حال اس کے برعکس ہوگی۔ یہاں مسلمان اکثریت میں ہوں گے اور ہندو اقلیت میں۔ اس لیے ہندوؤں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اب یہاں ان کے ساتھ وہی کچھ ہوگا جو کچھ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ ویسے بھی ہندو مورخوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا ایسا بھیانک اور دہشت انگیز نقشہ کھینچ رکھا ہے جس سے ہندو عوام خوف و ہراس سے کانپ اٹھتے ہیں۔

بنا بریں یہاں کا ہندو اس لیے بھی خائف ہو سکتا تھا کہ اب یہاں جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے تو ماضی کی تاریخ کو یہاں بھی دہرایا جائے گا۔ ہم ہندوستان ٹائمز کا اقتباس پہلے درج کر چکے ہیں جس میں انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان کے ہندوؤں کے دل میں یہی خطرہ لاحق تھا۔ ان تاثرات کو سامنے رکھتے ہوئے قائدِ اعظم نے اپنی

لے یاد رہے قائدِ اعظم رح کی اسی تقریر کا سہارا لیتے ہوئے ولی خان صاحب نے روزنامہ جنگ کے حوالے سے مورخہ ۲۱ ؍ ۹۶ کو فرمایا: "جب بابائے قوم نے کہہ دیا تھا کہ اب سیاسی طور پر کوئی ہندو ہندو نہیں کوئی مسلمان مسلمان نہیں تو پھر پارلیمنٹ احمدیوں کو غیر مسلم کیسے قرار دے سکتی ہے۔"

اس تقریر میں ہندوؤں کو یقین دلایا تھا کہ پاکستان میں ایسا نہیں ہو گا۔ انہوں نے جملہ اہلِ پاکستان کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تم آزاد ہو تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں یا مملکت پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں تمہاری ذات یا مسلک کچھ بھی ہو اس کا امورِ مملکت سے کچھ تعلق نہ ہو گا۔"

اس کے بعد انہوں نے کہا "اور تو اور انگلستان کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وہاں عیسائیوں ہی کے دو فرقوں . . . رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں کس قدر کشت و خون ہوا کرتا تھا۔ لیکن اسی مملکت نے اپنی کامل ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ان مناقشات کو مٹا دیا۔ اب تم پورے انصاف سے کہہ سکتے ہو کہ وہاں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہیں بلکہ ایک مملکت کے شہری بستے ہیں۔"

اس طرح . . . . .

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان . . . مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا ان سب کے ساتھ پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے سیاسی نقطہ نگاہ سے ہو گا۔"

یہ ہیں قائدِ اعظم کے وہ الفاظ جنہیں بنا کر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد دو قومی نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اور اسلامی مملکت کے تصور کی تردید کر کے اسے سیکولر بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر قائدِ اعظم کہیں مریخ سے ٹپکے ہوتے اور انہوں نے پہلے پہل یہ الفاظ ادا کیئے ہوتے تو اس تقریر سے اس قسم کے استنباط کا شائبہ ہو سکتا تھا۔ لیکن جس شخصیت کی دس سالہ تحریکِ پاکستان کی زندگی اور اس دوران اس کے صدہا صفحات پر مشتمل بیانات، تقاریر، خطابات ہمارے سامنے ہوں۔ اس کی طرف ان نتائج کو منسوب کرنا جس قدر زیادتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب ان لوگوں سے اس دلیل کا جواب نہیں بن پڑتا تو وہ نہایت دیدہ دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ بے شک قائدِ اعظم دس سال تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن وہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقصد جیتنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔ ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ وہ کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں؟ ہم بربنائے عقیدت نہیں کہتے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائدِ اعظم کے کریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے وہ ان کے خلاف اس قسم کے الزامات عائد کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتا۔ حق گوئی اور بے باکی ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لندن ٹائمز نے ان کی وفات پر لکھا تھا:

"قائدِ اعظم نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ کے طور پر پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ لچک نہیں تھی جو انگریزوں کے نزدیک، ہندوستان کا خاصا ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت اور واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔"

سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی حالت

قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست سنہ ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ انہوں نے جب مجلس آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے۔ تقسیمِ ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔ اس سے وہاں کے مسلمانوں کے دل میں خوف و دہشت کے ایسے جذبات اُمبھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان میں آ کر پناہ لے لیں۔ لیکن وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں چھین جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اُچھالا گیا اور دلی سے جو گاڑیاں حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوئیں۔ (میں بھی انہیں میں شامل تھا) یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کی بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِ عمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا۔ اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں (بالخصوص ہندوؤں) کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی، اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوئے۔ آپ سوچیئے کہ ایک ایسی مملکت جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو اس قسم کے لرزہ خیز حالات سے دو چار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ اس کے پاس (ابھی) نہ اپنی فوج ہو نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہوگی۔ اس کے ساتھ اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے مسلمانوں کے خلاف انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لیے نہایت ضروری تھا کہ یہاں غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گے۔ اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن پر قائدِ اعظم کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائدِ اعظم بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ عام طور پر جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اس وقت ملک دو چار تھا اور اتنی

عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اس مملکت پر آن پڑا تھا اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔

اس یقین دہانی کی اصل وجہ

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اس قسم کی حفاظت ملے گی۔ جیسی مسلمانوں کو انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا، اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن (ہمیں اعتراف ہے کہ وہ اپنے معمول کے خلاف) شدتِ جذبات میں الفاظ کے انتخاب میں کما حقہٗ احتیاط نہ برت سکے۔ بایں ہمہ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا وہ اسے پہلے ہی دن نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔

اس تقریر کا مفہوم خود غیروں کی نظر میں

آیئے ہم لگے ہاتھوں یہ بھی دیکھیں کہ قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں کیا انہوں نے یہ سمجھا کہ اس سے قائدِ اعظم مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر کے سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ تھا؟ مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر تھے۔ (ان کا چند سال پہلے ادھر انتقال ہوا ہے) جب صدر ایوب (مرحوم) نے لا کمشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ

۱۔ مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے اور ۲۔ اقلیتوں کے لیے تحفظ۔

اس کے بعد مسٹر جوشوا نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائدِ اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائدِ اعظم کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو ہندو رہے، نہ مسلمان مسلمان، بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو، جس

۱؎ (فسادات پنجاب کے سلسلہ میں) منیر انکوائری کمیٹی میں اس تقریر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مودودی صاحب مرحوم نے فرمایا تھا کہ "ہمارے لیے یہ ماننا بھی ممکن نہیں کہ قائدِ اعظم ایسی متضاد باتیں کر سکتے تھے اس لیے ان کے مرتبے کے انسان سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے دس سال تک جن اصولوں کو بنیاد بنا کر لڑتے رہے تھے ان سے وہ پاکستان قائم ہوتے ہی یک لخت پلٹ گئے ہوں گے۔" (بحوالہ پمفلٹ "قائدِ اعظم اور دو قومی نظریہ"۔ شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام)

کا لازمی نتیجہ سیکولر انداز حکومت ہو جائے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

"یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظم نے جو خود اس پاکستان کے خالق تھے، اپنی پہلی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دُور کا بھی امکان ہے کہ اس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی بالکل پاگل پن ہے۔ قائدِ اعظم نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔"

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد

اس کے بعد مجھے صرف اتنا اور کہنا ہے کہ اگر یہ تقریر قائدِ اعظم کی زندگی کی آخری تقریر ہوتی تو پھر بھی اس مغالطہ آفرینی کی گنجائش نکل سکتی تھی کہ وہ جو کچھ دس سال تک کہتے رہے تھے، آخر میں وہ اس سے تائب ہو گئے۔ اس لیے اب سند ان کی آخری تقریر ہو سکتی ہے۔ حسنِ اتفاق کہ قائدِ اعظم اس کے بعد بھی ایک سال تک زندہ رہے اور اگرچہ ان کا یہ تمام عرصہ انتہائی نازک بیماری کے عالم میں گزرا لیکن بایں ہمہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں پھر اس کی وضاحت کر دی کہ پاکستان کس قسم کی سٹیٹ ہو گی۔"

اس کے بعد پرویز صاحب نے قائدِ اعظم کی زندگی کے آخری سال کی تقریروں کے وہ اقتباسات پیش کیے جن میں حصولِ پاکستان کے اصل مقصد کو بڑی وضاحت کے ساتھ آپ نے بیان کیا تھا۔

مثلاً آپ نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو فرمایا کہ:

پاکستان کا مقصد صرف ایک ٹکڑا زمین کا حصول نہ تھا

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔"

اسی قسم کی مزید وضاحت آگے چل کر آئے گی۔ یہ تھی شروع سے آخر تک آپ کے ضمیر کی آواز جس کو بلند کرنے کے لیے آپ نے کبھی بد دیانتی سے کام نہیں لیا تھا۔

اور آخر پر پرویز صاحب کے یہ الفاظ ہیں:

"اقبال اور قائدِ اعظم نہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے نہ تھیاکریٹک سٹیٹ۔ وہ خالصتاً قرآنک سٹیٹ چاہتے تھے۔"

رفیق احمد باجوہ صاحب کا بیان

جناب رفیق احمد باجوہ صاحب نے شاید انہیں خیالات کے پیشِ نظر فرمایا تھا کہ :

"دو قومی نظریہ اور مطالبہ قیامِ پاکستان کو برِّصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی یا اقتصادی آزادی تک ہی محدود کرنا کوتاہی دانش بھی ہے اور سہو بالحفظ بھی ہے" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

مسٹر جسٹس محمد منیر صاحب (مرحوم) چیف جسٹس آف پاکستان کے خیالات

۱۹۶۴ء میں پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس محمد منیر صاحب (مرحوم) نے پاکستان ٹائمز میں ایک مبسوط مقالہ سپرد قلم کیا تھا جس کا عنوان (DAYS TO REMEMBER) تھا۔ آپ نے اس کے آخر پر کہا تھا کہ :

"تشکیلِ پاکستان کے وقت کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہوگی۔"

اور جہاں تک ان کی تصنیف (FROM JINNAH TO ZIA) کا تعلق ہے اس کے صفحہ ۳۲ پر تحریر کرتے ہیں کہ :-

۱- "قائدِ اعظم سیکولر ڈیموکریٹک مملکت چاہتے تھے۔ یعنی ایسی سٹیٹ جس میں مذہب کو کاروبارِ مملکت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔"

۲- "پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبال کے ذہن میں تھا نہ قائدِ اعظم کے" (ص ۳۴)

۳- اسلامی مملکت کا تصور قائدِ اعظم کی وفات کے بعد پہلی بار ۲۵ مارچ ۱۹۴۹ء کو لیاقت علی خاں (مرحوم) نے قراردادِ مقاصد کی شکل میں اسمبلی میں پیش کیا۔ انہوں نے اس قرارداد کو قائدِ اعظم کی زندگی میں اس لیے پیش نہ کیا کہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس کی سخت مخالفت کریں گے (ص ۳۶)

۴- قائدِ اعظم نے بار بار کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔" (ص ۳۰/۳۲/۳۶) اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے۔

۵- اور انہوں نے اپنی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر میں اسے واضح کر دیا تھا۔

جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق صاحب کا بیان

چیف جسٹس مسٹر جسٹس محمد منیر صاحب مرحوم کے علاوہ ریٹائرڈ چیف جسٹس مسٹر جسٹس

انوارالحق صاحب نے (روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ، فروری ۱۹۸۶ء کے حوالے سے) "شام ہمدرد" کی تقریب کے موقع پر صدارتی خطاب کے دوران فرمایا کہ :

"قائدِ اعظم سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے۔ قائدِ اعظم نہ تو عالمِ دین تھے اور نہ ہی مذہبی انسان وہ انگریزی لباس پہنتے اور انگریزی بولتے تھے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا کہ : "ملک میں لادینی نظام کا قیام نظریۂ پاکستان کی نفی ہے۔"

جناب غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب کا بیان

ہمارے ان بزرگوں کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی صوبہ سندھ کے صدر اور وہاں کے سابق وزیرِ اعلیٰ غلام مصطفےٰ جتوئی صاحب نے جنگ فورم کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ :

"تحریکِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کا نعرہ لاالٰہ الّا اللّٰہ نہیں تھا۔ وہ انگریز اور ہندو کے معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ ، فروری ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر اسرار احمد کا ارشاد

"تحریکِ پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا بلکہ صرف یہ خوف تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہیں کریں گے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور، مورخہ ۱۲ ، دسمبر ۱۹۸۶ء)

مس بے نظیر بھٹو کا بیان

مارچ ۱۹۸۶ء میں ملک واپسی پر پیپلز پارٹی کی سربراہ مس بے نظیر بھٹو نے پشاور ہائی کورٹ اور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشنوں کے وکلاء کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ :

"پاکستان اسلام کے نام پر نہیں ہندوؤں کی معاشی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے بنا تھا۔" آپ نے مزید فرمایا کہ "(اگر) جدوجہد آزادی کی بنیاد اسلام پر تھی ، تو جماعتِ اسلامی نے اس کی مخالفت کیوں کی ؟" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲۳ ، اپریل ۱۹۸۶ء)

سابق وزیرِ دفاع میر علی تالپور کا فرمان

پاکستان کے سابق وزیرِ دفاع میر علی احمد تالپور صاحب نے بھی ایک بیان میں فرمایا کہ "وہ اس بات سے متفق نہیں کہ پاکستان نظریہ اسلام کے تحت وجود میں آیا۔"

چنانچہ جناب تالپور صاحب کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر نوائے وقت مورخہ ۱۱ ، فروری ۱۹۸۶ء

کو جو اداریہ سپردِ قلم کیا اس میں علاوہ دیگر باتوں کے نہایت کرب کے ساتھ یہ کہا کہ :

"یہ تو نئی نسل کو تاریخِ پاکستان کے بارے میں ابہام کا شکار بنانے یا کنفیوژ کرنے والی بات ہے۔ کچھ ہی عرصے کی بات ہے کہ میر صاحب مبلغ اسلام ہُوا کرتے تھے۔ مارشل لاء کے تمام تر دور میں وہ اسلام اور اسلامائزیشن کی باتیں کرتے رہے ہیں، اب مارشل لاء کے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے بیان سے جس تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے وہ از خود ایسی بات ہے، جو فہم و ادراک سے بالا ہے۔ مارشل لاء ختم ہو جانے سے ملکی تاریخ تو نہیں بدل گئی۔ میر صاحب نے اپنے بیانات میں تبدیلی کر کے جو بات کی ہے، ایسا نہ کریں تو شاید بہتر ہو۔ تحریکِ پاکستان کے مقاصد تاریخ کا حصہ ہیں محض سُنی سُنائی بات تو نہیں۔"

جناب غلام احمد پرویز (مرحوم) صاحب کا تبصرہ

جناب مسٹر جسٹس محمد منیر صاحب (مرحوم) کے ان خیالات کے جواب میں غلام احمد پرویز صاحب نے ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے نوائے وقت کی اشاعت بابت ۱۱ر اپریل ۱۹۸۰ء کو لکھا تھا کہ :

"قبل اس کے کہ میں واضح کروں کہ قائدِ اعظم پاکستان میں کس قسم کی سٹیٹ چاہتے تھے۔ میں جسٹس ممدوح کی بزرگی کے احترام کے باوجود اتنا گزارش کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ دلیل کہ چونکہ قائدِ اعظم تھیاکریسی نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے ثابت ہُوا کہ وہ سیکولر سٹیٹ چاہتے تھے بڑی رکیک اور بودی ہے۔ تھیاکریسی اِس طرح خلافِ اسلام ہے جس طرح سیکولرازم۔ لہٰذا قائدِ اعظم جس طرح سیکولرازم کے خلاف تھے اسی طرح تھیاکریسی کے بھی خلاف تھے۔"

اس کے بعد پرویز صاحب نے قائدِ اعظم کی مختلف تقاریر کے حوالے دے کر یہ ثابت کیا کہ قائدِ اعظم تھیاکریسی کے یقیناً خلاف تھے۔ "کیونکہ اس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ بزعم خویش خدائی مشن کو پورا کریں۔" (بحوالہ تقاریر: بحیثیت گورنر جنرل صفحہ ۶۵)

قائدِ اعظم کے مختلف بیانات

جہاں تک پاکستان میں قرآنی حکومت کا تعلق ہے تو یہ قائدِ اعظم کا مقصدِ حیات تھا جس کی وضاحت آپ کے ہی الفاظ میں اس سے پیشتر درج کی جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود مزید ایک دو اقتباسات پیشِ خدمت میں جس سے بخوبی واضح ہو سکے گا کہ بقول پرویز صاحب کے :

"قائدِ اعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے ایسے ہی ہے جیسے کل کو کوئی

مؤرخ یہ لکھ دے کہ قائدِ اعظم لنگوٹ باندھ کر مسٹر گاندھی کی پرارتھنا میں جایا کرتے تھے۔"

اپریل ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے صوبہ سرحد میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے قائدِ اعظم سے ایک پیغام کے لیے درخواست کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا:

"تم نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں کوئی پیغام دوں۔ میں تمہیں کیا پیغام دوں جبکہ ہمارے پاس پہلے ہی ایک عظیم پیغام موجود ہے جو ہماری راہنمائی اور بصیرت افروزی کے لیے کافی ہے۔ وہ پیغام ہے خدا کی کتاب عظیم قرآن کریم۔" (تقاریر جلد اوّل صفحہ ۵۱۶)

دسمبر ۱۹۴۳ء میں کراچی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے خود ہی پہلے سوال اٹھایا کہ:

"وہ کونسا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔"

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ:

"وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی عظیم کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک کتاب، ایک رسول فلہٰذا ایک قوم۔" (تقاریر جلد دوم صفحہ ۵۰)

۱۴ فروری ۱۹۴۸ء کو سبی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"میرے پیشِ نظر ہمیشہ اسلامی ڈیموکریسی کا اصول رہا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا راز ان سنہرے اصولوں کے اتباع میں ہے جنہیں ہمارے مقنّنِ اعظم حضور نبی کریمؐ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی ڈیموکریسی کی بنیاد حقیقی اسلامی نظریات اور اصولوں پر رکھنی چاہیئے۔"

اور آخر پر آپ کا وہ پیغام جو آپ نے ۱۸ جون ۱۹۴۵ء کو فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو دیا کہ:

"پاکستان سے صرف حُریّت اور آزادی مُراد نہیں۔ اس سے فی الحقیقت مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ ضروری ہے۔" (تقاریر صفحہ ۲۶۳)

ان واضح ارشادات کے باوجود

لیکن افسوس کہ قائدِ اعظم کے ان واضح ارشادات کو ہم نے کوئی اہمیت نہ دی اور نہ ہی نئی نسل کو ان حقائق

سے آگاہ کیا۔ اس کے برعکس اگر کچھ کہا۔ تو یہ کہ:

۱۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ چند بچوں نے الیکشن جیتنے کے لیے لگایا تھا۔

۲۔ پاکستان میں ایک مذہبی مملکت کے قیام کا خیال نہ علامہ اقبال کے ذہن میں تھا نہ قائدِ اعظم کے۔

۳۔ پاکستان کا قیام ہندوؤں کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

پاک چین دوستی انجمن کے سربراہ جناب ممتاز احمد خاں صاحب کی وضاحت

۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے سلسلہ میں جناب پرویز صاحب کی اس وضاحت کے علاوہ پاک چین دوستی کی انجمن کے سربراہ جناب ممتاز احمد خاں صاحب کا ایک مضمون بعنوان "پاکستان کی تاریخ کو مسخ کرنے کا مذموم عمل" روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت میں مورخہ ۲۶ رفروری ۱۹۸۶ء کو شائع ہوا جس میں موصوف نے اس ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا تجزیہ بھی کیا ہے کیونکہ یہ تجزیہ ملک کی معتبر شخصیت کی طرف سے ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کی طرف سے پیش کردہ تصریحات کے بعد اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے اور وہ صرف اس لیے کہ ملتِ پاکستان کی ہر نئی نسل کے لیے یہ تحریریں اہم ترین سرمایہ ہیں۔ چنانچہ تحریر ہے کہ:

"اب ہم قائدِ اعظمؒ کی کراچی میں پاکستان آئین ساز اسمبلی سے بطور صدر اسمبلی ۱۱ راگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا تجزیہ کرتے ہیں جو کہ ان کی زندگی کی اہم ترین تقریروں میں شمار ہوتی ہے اور آئین ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے پر اسمبلی سے یہ ان کا اوّلین خطاب تھا جس کے متعلق خان عبدالولی خان اور اس قبیل کے کئی دوسرے اصحاب کا مؤقف ہے کہ اس تقریر میں قائدِ اعظم نے دو قومی نظریہ کو از خود ختم کر دیا تھا اور وہ ایک سیکولر پاکستان کے حامی بن گئے تھے۔ یہ ایک طویل تقریر ہے جس میں قیامِ پاکستان کے بعد مسلمان قوم کے کندھوں پر جو عظیم ذمہ داریاں آن پڑی تھیں ان سے کس محنت جرأت عزم اور یقین کے ساتھ عہدہ برآ ہونا تھا۔ معاشرے میں انگریزی حکومت کے ورثے کی شکل میں جو بے شمار معاشرتی اور معاشی بدعنوانیاں اور بے انصافیاں موجود تھیں ان کا کسی طرح سختی سے قلع قمع کرنا تھا تاکہ پاکستان کو ایک مضبوط اور خوش حال ریاست بنایا جاسکے۔ تقریر کے آخری حصّے میں انہوں نے تقسیم سے پیدا شدہ اقلیتوں کے مسئلہ پر بالوضاحت روشنی ڈالی اور کہا کہ اس مسئلے کا پیدا ہونا ناگزیر تھا اور ہم اپنی روایات کے مطابق اقلیتوں سے مثالی سلوک کریں گے۔ وہ اس مملکت میں برابر کے شہری ہوں گے۔ ان سے کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہاں پر قرونِ وسطےٰ کے یورپ کی طرح رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ

ایک دوسرے کا گلا نہیں کاٹیں گے۔ متحدہ ہندوستان میں دو مذہبی طور پر مختلف قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ کیونکہ اکثریتی قوم (ہندو) ہمیشہ اقلیتی قوم (مسلمان) کے در پئے آزار رہتی۔ یہاں پر ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ خود مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی شیعہ سنی وغیرہ کے فروعی امتیازات موجود ہیں جس طرح ہندوؤں میں برہمن وشنو کھتری بنگالی اور مدراسی وغیرہ ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ یہاں پر ان بنیادوں پر کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہوگی۔ سیاسی طور پر اور قانون کے سامنے سب برابر ہوں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسا وقت آئے گا جب ہندو اور مسلمان رہیں گے کیونکہ مذہب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ لیکن سیاسی اعتبار سے اور اس مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے ہندو اور مسلمان کی تمیز باقی نہیں رہے گی۔"

تین روز بعد ۱۴ اگست کو جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حکومت برطانیہ کی طرف سے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں (جو کہ پاکستان کی پارلیمنٹ بھی تھی) انتقالِ اقتدار کی دستاویزات قائدِ اعظم کو پیش کیں تو اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے بھی قائدِ اعظم نے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق اور تحفظات کا خصوصی طور پر ذکر کیا اور رسولِ اکرمؐ کا حوالہ دیا کہ آپؐ نے عرب میں اسلامی ریاست[۱] کے قیام کے بعد یہودی اور عیسائی اقلیتوں کے ساتھ انتہائی رواداری کا سلوک کیا اور ان کے مذاہب اور عقیدوں کا پورا پورا احترام کیا ــــــ "مسلمانوں کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ جہاں جہاں انہوں نے حکومت کی انہوں نے اقلیتوں کے بارے میں ان عظیم اصولوں کو ہمیشہ مدِ نظر رکھا اور ان پر عمل کیا۔" ان حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ بطورِ نمونہ ان کے پیشِ نظر رسولِ اکرمؐ کی اسلامی ریاست تھی۔

یہ بات ہمیشہ ہمارے مدِ نظر رہنی چاہیئے کہ پاکستان کے متعلق قائدِ اعظم دو بنیادی نکتوں پر ہمیشہ بہت اصرار کے ساتھ غیر مبہم الفاظ میں زور دیتے رہے۔ (۱) پاکستان ایک جمہوری مملکت ہوگا یعنی اس ملک کے نظام میں "سیاسی حاکمیت" اس ملک کے جمہور کو حاصل ہوگی۔ (نہ کہ مذہبی پیشوائیت کو)۔ (۲) پاکستان کی جمہوریہ میں اس مملکت کا ہر شہری بلا لحاظ مذہب و ملت یکساں حیثیت سے شامل ہوگا۔ یعنی پاکستان ان معنوں میں مذہبی مملکت نہ ہوگا کہ یہاں سیاسی حاکمیت رکھنے والے جمہور میں یا نظم و نسق کی مشینری میں صرف ایک مذہب کے پیروؤں کی جگہ ہوگی البتہ ان معنوں میں یقیناً اسلامی مملکت

ہو گا کہ اس ملک کے مسلمانوں کو جمہور کی بھاری اکثریت کی حیثیت سے اس بات کا پورا موقعہ حاصل ہو گا کہ وہ مملکت کی پالیسیوں کو اسلام کے ان اصولوں اور اعلیٰ اقدار کے مطابق ڈھال سکیں جو ان کے نزدیک دائمی سچائی اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا صحیح ذریعہ ہیں جن سے معاشی انصاف کی بنیادوں پر ایک صاف ستھرا پاکیزہ معاشرہ قائم ہو سکے۔ جیسا کہ رسولِ اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ ان دونوں نکات کے متعلق قائدِ اعظم کے بہت سے بیان موجود ہیں۔ ان کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء والی تقریر میں ان کے یہ الفاظ کہ "ایسا وقت آئے گا" بہت اہم اور معنی خیز تھے کیونکہ جس طرح اس نصب العین کا تصور ان کے ذہن میں واضح تھا ان کی محکم رائے یہ بھی تھی کہ یہ مفروضہ اور اس مفروضے پر عمل کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ نصب العین پاکستان بنتے ہی حاصل ہو گیا ہے۔ عملی حالات کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اور عملی حالات یہ تھے کہ کل تک پوری ہندو قوم پاکستان کے تصور اور قیام کے خلاف لڑ رہی تھی آج ہندوؤں کا وہ حصہ جو پاکستان میں رہ گیا تھا اسی نئی مملکت کا شہری اور آئینی اور قانونی طور پر پاکستانی قوم کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ پاکستان کے غیر مسلم عنصر کی اس پوزیشن کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت تھی۔ اسے ذہنی اور جذباتی طور پر پاکستان کو اپنانے اور اپنی وفاداریوں کا مرکز بدلنے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ لہٰذا قائدِ اعظم یہ سمجھتے تھے کہ فی الحال پاکستان کی حفاظت اور اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی ذمہ داری صرف مسلمانوں پر تھی۔ جنہوں نے جانیں لڑا کر اس ملک کو حاصل کیا تھا اور مسلمانوں کے لیے محفوظ پالیسی یہی تھی کہ اپنی پرانی تنظیم کے خطوط پر اپنے آپ کو منظم رکھیں۔ غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں بنانے کے لیے حالات میں تبدیلی اور زمانہ مستقبل کا انتظار کرنا پڑے گا۔

اس پس منظر کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اور اس سیاق و سباق میں ان کی یہ اور ۱۱ر اگست کی تقریریں پڑھنے کے بعد کوئی غیر جانبدار صاحبِ فکر اس کی یہ تاویل نہیں کر سکتا کہ انہوں نے مندرجہ بالا فقروں سے دو قومی نظریئے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن ضد اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج ؟ ہر سیاست دان کے ساتھ کچھ "مخاصین" ہوتے ہیں جو بزاخفش کی طرح ان کی ہر غلط سلط بات پر بھی آمنّا و صدّقنا کہتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی حوصلہ افزائی کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں تک مرحوم چیف جسٹس محمد منیر صاحب کے خیالات کا تعلق ہے

تو وہ اپنی اعلیٰ قابلیت کے ساتھ ایک وسیع المشرب اور آزاد منش بزرگ تھے۔ وہ سیاسی معاملات میں نظریہ سہولت (لا آف کنوینی اینس) کے قائل تھے۔ اسی کے تحت۔ ۔

۔ ۔ ۔ انہوں نے مولوی تمیز الدین خان صاحب (مرحوم) بنام گورنر جنرل ملک غلام محمد (مرحوم) کے تاریخی مقدمہ میں اپنا فیصلہ صادر کر کے ملک کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا تھا اور اسی کے تحت انہوں نے اپنی کتاب "جناح سے ضیاء تک" میں قائدِ اعظم کو سیکولرازم کا حامی قرار دے دیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ تھیوکریسی کا مخالف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سیکولرازم کا حامی بن جاتا ہے۔ اسلام میں نہ تھیوکریسی ہے نہ سیکولرازم۔ لیکن وہ اپنی افتادِ طبع کے ساتھ مفاہمت قائم رکھنے کے بھی قائل تھے۔"

ایک انٹرویو

موقر ماہنامہ "نصرت" لاہور کے مدیر اور پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ جناب حنیف رامے صاحب کو ۱۹۶۷ء میں جناب پرویز صاحب نے اپنے طویل انٹرویو[1] کے دوران ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"باقی رہے وہ حضرات جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ تحریکِ پاکستان میں اسلام کا نام محض عوام کو ساتھ ملانے کے لیے لیا گیا تھا۔ ورنہ اصل مقصد تو مسلمانوں کا معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تحفظ تھا، جو ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے خطرے میں پڑ گیا تھا، تو ان کے متعلق میں ان سے زیادہ اور کیا عرض کروں کہ اس سے تحریکِ پاکستان کے قائد (محمد علی جناح) کے متعلق جس کردار کا تصور یہ حضرات پیش کرتے ہیں وہ تصور قائدِ اعظم کے دشمنوں تک نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کے خلاف بہت کچھ کہا لیکن اتنا کہنے کی جرأت کسی کو بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ "منافق" تھا۔ اور منافق بھی ایسا جو حصولِ مقصد کی خاطر اسلام جیسے مقدس جذبے کی آڑ لے رہا تھا، اسے (EXPLOIT) کر رہا تھا۔ جدوجہدِ آزادی کے دس سالہ دور میں قائدِ اعظم رح کی تقاریر، تحریرات، بیانات، خطوط وغیرہ کو دیکھئے۔ وہ مسلسل اور متواتر پکارتے چلے جاتے ہیں کہ اس مطالبے کی بنیاد ہمارے دین کا تقاضا ہے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں تو بربنائے مذہب ہم اپنی جداگانہ مملکت چاہتے ہیں تو اس لیے کہ:

---

[1] اس انٹرویو کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔

"ہم اس میں اپنے ضابطۂ حیات، ثقافتی نشوونما، روایات اور اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

وہ واضح طور پر بتاتے رہے کہ:

"پاکستان سے یہ مطلب نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی ہی حاصل نہیں کرنی بلکہ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔"

فضا گونج اُٹھے گی

جب پوچھا جاتا کہ تشکیلِ پاکستان سے ہوگا کیا تو وہ جواب میں کہتے:

"اس سے یہ آواز فضائے عالم میں گونجے گی کہ دنیا میں ایک ایسی مملکت بھی ہے جو اسلام کی عظمتِ گزشتہ کو از سرِ نو زندہ کرے گی۔" (بحوالہ "طلوعِ اسلام" جنوری ۱۹۶۶ء)

قائد کی پکار

لیکن اگر اس وضاحت کے باوجود بھی کسی کی تشنگی باقی ہو تو اُن حضرات کی خدمت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں قائدِ اعظم کی دل ہلا دینے والی تقریر کا مندرجہ ذیل حصہ ہمیں ضرور پیش کرنا ہوگا اور وہ اس لیے کہ شاید "ملزم" کا اپنا یہ بیان ہمارے زاویۂ نگاہ کو بدلنے میں ممد ثابت ہو سکے۔ آپ نے فرمایا:

"مسلمانو! میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد و سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔ اور مسلمانوں کی آزادی تنظیم اور مدافعت میں اپنا کردار ادا کر دیا۔ میں آپ سے اس کی داد اور شہادت کا طلب گار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل میرا اپنا ایمان میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے واقعی مدافعتِ اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی تنظیم اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علمِ اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت - ۱۶ ستمبر ۱۹۸۵ء)

(روزنامہ انقلاب لاہور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

بہرحال قائدِ اعظم کے متعلق غلط تصورات کو عام کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "مشرقی پاکستان" کو اس دانش کدہ کی آگ میں جلا دینے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس باقی ماندہ پاکستان کو بھی اسی دوزخ کے کنارے لا کھڑا کیا جس کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے ہر اہلِ درد پکار اُٹھا کہ ؎

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا
تھم اے رہرو! کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا

یہ تھا قائدِ اعظم کے بارے اپنوں کا رویّہ۔ اب آیئے صوبہ سندھ پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

صُوبہ سندھ

جی ایم سیّد کی تقریر

پاکستان کے صوبہ سندھ میں مسٹر جی ایم سیّد کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ سب سے پہلے سندھ میں مسلم لیگ آپ ہی کے نام سے پہچانی جانے لگی۔ لیکن تشکیل پاکستان کے بعد آپ کی سوچ میں یہاں تک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی کہ ۱۹۷۲ء میں آپ نے اپنی سالگرہ کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"پاکستان کے موجودہ انتشار، افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ، مذہبی نظامِ حکومت کا تخیل، فسطائی نظریہ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔"

اس کے بعد آپ نے مشورہ دیا کہ:

"۲۴ سالہ تجربات سے فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیرباد کہا جائے یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔"

(بحوالہ "طلوعِ اسلام"۔ جنوری ۱۹۸۱ء صفحہ ۵)

سندھ یونیورسٹی میں "سندھی شام"

اس کے بعد مارچ ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی نے "سندھی شام" کے عنوان سے ایک تقریب منعقد کی جس میں مسٹر سیّد صاحب نے اپنے نظریات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"سندھی قوم پرستی کے بنیادی اجزاء حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ سندھ کے جداگانہ ملک ہونے میں یقین رکھنا۔

۲۔ پاکستان ایک ملک نہیں بلکہ چار جداگانہ ملکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں یقین رکھنا۔

۳۔ سندھی، وطن، زبان، کلچر، تاریخی روایات، سیاسی اور اقتصادی مفاد کی بنیادوں پر جداگانہ قوم ہے۔

۴۔ سندھی قوم جداگانہ حیثیت میں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

۵۔ نظریہ پاکستان پر اعتماد رکھنے والی حکومت سندھیوں کو کبھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

۶۔ مضبوط مرکز پر اعتماد رکھنے والی حکومت سندھ کی دشمن ہے۔

۷۔ اسلامی آئین یا اسلامی حکومت پر یقین رکھنے والی حکومت سندھ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

۸۔ اور سندھیوں کی جداگانہ قوم اور سندھو دیش سے انکار کرنے والی حکومت سندھ دشمن شمار کی جاسکتی ہے۔"

جی ایم سید کا انٹرویو

یہی وہ جی ایم سید ہیں جنہوں نے بھارتی جریدہ "سنڈے" کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ :

"مسز اندرا گاندھی کو انہوں نے پاکستان پر حملے کی دعوت دی تھی اور یہ کہ آئندہ بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو سندھ بھارت کا ساتھ دے گا۔ نیز یہ کہ پاکستان نفرت کی پیداوار ہے پاکستان نے گاندھی اور نہرو جیسا ایک آدمی بھی پیدا نہیں کیا۔" (روزنامہ جنگ لاہور ۳ جون ۱۹۸۵ء)

اور اسی اخبار کے حوالے سے ۸ جون ۱۹۸۵ء کو جی ایم سید نے کہا کہ :

"ہم اپنی طاقت کے زور سے پنجاب سے الگ نہیں ہو سکتے اور اگر علیحدہ ہو بھی جائیں تو اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بنگلہ دیش علیحدہ ہو کر امریکہ کا ایجنٹ بن گیا۔ اور ان کے مسائل حل نہ ہو سکے اگر ہم علیحدہ ہو گئے تو ہماری حالت بھی بنگلہ دیش کی طرح ہو جائے گی۔ اس لیے ہم بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن چاہتے ہیں۔ ہم دفاع، کرنسی اور چند دوسرے شعبے بھارت کو دے دیں گے اور باقی معاملات خود طے کریں گے۔"

جی ایم سید کی شہرت

اور ابھی جی ایم سید صاحب کی شہرت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ۱۹۷۲ء کی سالگرہ کے بعد ۱۹۸۴ء

میں آپ کی ۸۱ ویں سالگرہ پر ۸ ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی اور روزنامہ جنگ لاہور کے مطابق اس تقریب
میں سندھ یونیورسٹی، مہران انجنیئرنگ یونیورسٹی، لیاقت میڈیکل کالج، زرعی یونیورسٹی ٹنڈو جام اور چانڈکا میڈیکل
کالج لاڑکانہ کے سینکڑوں طلبہ سرکاری اور تعلیمی اداروں کی بسوں میں سوار ہوکر ان کے گاؤں پہنچے تھے۔ اس
تقریب میں ممتاز دانشور، شاعر اور ادیب شامل تھے۔ جبکہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی مستقل رکن اور ممتاز سندھی
دانشور ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو نے بھی شمولیت کی۔ نیز سالگرہ کے اس موقع پر مختلف سیاستدانوں نے بھی اپنی مبارکباد
کا پیغام بھیجا اور کالعدم جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر غفور احمد نے آپ کی سالگرہ پر جی ایم سید کے
لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ جنوری ۱۹۸۴ء)

جبکہ سید صاحب اور اپنی ۸۴ ویں سالگرہ کے موقع پر کہا کہ "سندھ کو آزاد کرا کے بھارت سے محبت بڑھائیں گے۔"
نیز کہا کہ "نوجوانو! ہمت ہے تو بندوق چلاؤ، کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ پٹھانوں اور پنجابیوں کو واپس جانا ہوگا۔"
(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ مورخہ ۱۸ جنوری ۱۹۸۷ء)

سندھی طالبہ کا خط

کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ "حریت" کی ہفتہ وار اشاعت بابت ۴ نومبر ۱۹۸۴ء میں ایک سندھی
طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا جس میں لکھا گیا تھا کہ :-

"وہ اسلام اور پاکستان جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے ایسے اسلام اور اسلامی
فلسفہ کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے
عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہن جو داڑو، کوٹ
ڈی جان کے آثار قدیمہ اور لطیف، سچل، ایاز اور جی ایم سید کی طرح کے شاعروں، دانشوروں
کی وجہ سے عظیم ہے۔"

اور اس کے بعد ہفتہ وار "ادکار" لاہور کی ۱۲ اگست تا ۶ ستمبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں جئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن
کے صدر مسٹر ضمیر لاڑک کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا۔ جس میں ایک سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ :

"شیخ مجیب الرحمٰن علیحدگی نہیں چاہتا تھا لیکن اسے علیحدگی کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ اس
طرح اگر ہمیں مجبور کیا گیا تو ہم بھی علیحدہ ہو جائیں گے۔"

سندھ کی حمیدہ کھوڑو نے، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، مارچ ۱۹۸۴ء میں جنگ فورم کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:
"سندھ کا جوز ہیں طبقہ ہے، اگر آپ اس کی رائے لیں کہ کیا آپ پاکستان سے علیحدگی
چاہتے ہیں تو ۹۹ فی صد لوگوں کی رائے علیحدگی کے حق میں ہوگی۔"

حمیدہ کھوڑو کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے، اہلِ علم حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔

پچھلے دنوں سندھ میں ایم آر ڈی کی تحریک نے جو ہنگامے برپا کیے تھے، اِس سے تو کسی کو کلام نہیں ہوسکتا۔ یاد رہے کہ حمیدہ کھوڑو نے یہ مطالبہ بھی دہرایا ہے کہ چار قومیتوں کی زبانوں کو قومی زبانیں تسلیم کیا جائے۔

جئے سندھ تنظیم

اور آج سندھ کے تعلیمی اداروں میں جئے سندھ تنظیم نے کس قسم کے حالات پیدا کر رکھے ہیں، اس کا اندازہ حامد میر صاحب کے اِس کالم سے لگائیں جو انہوں نے مورخہ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو روزنامہ جنگ لاہور کے لیے سپردِ قلم کیا لکھا ہے کہ:

"سنہ ۱۹۸۴ء کے اوائل میں طلبہ تنظیموں اور انجمنوں پر پابندی عائد کی گئی۔ اس پابندی کے بعد ایک دفعہ پھر جئے سندھ کا تعلیمی اداروں میں اثر و رسوخ بڑھنے لگا۔ جئے سندھ نے طلبہ کی حمایت حاصل کرنے کی بجائے تشدد کے ذریعہ اپنی دھاک بٹھانی شروع کی اور اپنے پیر و مرشد جی ایم سید کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے تمام محبِ وطن پاکستانیوں کو سندھ کا غدار قرار دے کر انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پنجابی، پٹھان اور بہاری نسل کے طلبہ کو "اردو سامراج" کا ایجنٹ قرار دے کر ان پر تشدد کیا جانے لگا۔ یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ سندھ یونیورسٹی، لیاقت میڈیکل کالج، چانڈکا میڈیکل کالج، مہران یونیورسٹی اور دیگر اہم درس گاہوں میں طلبہ کو مصافحہ کرتے ہوئے جئے سندھ کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہاں کے در و دیوار اور ہاسٹلز میں طلبہ کے کمرے نام نہاد سندھو دیش کے نقشوں سے اٹے پڑے ہیں۔ پولیس کے لیے اِن اداروں کے ہاسٹلز علاقہ غیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اگر انتظامیہ پولیس کی مدد سے مسائل پر قابو پانا بھی چاہتی ہے تو طلبہ کے روپ میں جئے سندھ کے طالب علم اور غیر طالب علم کارکنوں کی جانب سے زبردست مسلح مزاحمت کی جاتی ہے۔ حکومت نے اس تشویشناک صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے اِن درس گاہوں کو گذشتہ کئی ماہ سے بند کر رکھا ہے۔ لیکن جی ایم سید کے نظریات پر مبنی لٹریچر جئے سندھ کے ذریعہ بدستور طلبہ تک پہنچ رہا ہے۔"

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اگر یہ سچ ہے تو ہماری دردِ دل رکھنے والے منتظمین سے پُرزور التماس ہے کہ وہ آنے والے حالات کا جائزہ لیں۔ کیونکہ اگر ہم نے اس نفاق پسندی کا تدارک نہ کیا تو پھر اس کا نتیجہ (خاکم بدہن) ہندوؤں کی غلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا اور صدر ایوب خاں مرحوم کے الفاظ میں "اس مرتبہ کی غلامی سابقہ دور کی غلامی کے مقابلے میں بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔"

صُوبہ سَرحد

سندھ کے بعد اگر صوبہ سرحد کے متعلق کچھ جاننے کی کوشش کریں تو وہاں کی کیفیت بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ؎ چُپ ہوں تو کلیجہ جلتا ہے بولوں تو تیری رسوائی ہے

عبدالغفار خاں کی تقریر

مارچ ۱۹۸۲ء کا ذکر ہے کہ صوبہ سرحد کی بزرگ شخصیت جناب عبدالغفار خاں جناب ارباب سکندر خاں مرحوم کی برسی کے سلسلے میں ان کی قبر پر پھولوں کا نذرانۂ عقیدت لے کر حاضر ہوئے تو اس موقع پر آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ :

"میں اپنی قوم سے مایوس ہو چکا ہوں کیونکہ قوم نے پیسے اور کرسی کے لالچ میں غلامی کی زنجیریں پہن لی ہیں۔ جبکہ غلامی اور پختون دو متضاد چیزیں ہیں۔ اب قوم کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ اسے غلامی پسند ہے یا آزادی۔"

مہاتما گاندھی سے گِلہ

اور جب کانگریس نے تقسیم ہند کا منصوبہ منظور کر لیا تو اس وقت خان عبدالغفار خاں جنہیں سرحدی گاندھی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مہاتما گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

"آپ نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ آپ ہمیں بھیڑیوں کے سپرد کر رہے ہیں۔"

اور آپ کی سوانح عمری میں تحریر ہے کہ :

"لیکن انہیں اس وقت عارضی طور پر سکون حاصل ہو گیا تھا، جب مہاتما جی نے تسلّی دیتے ہوئے کہا کہ خاں گھبراؤ نہیں بہت جلد پاکستان اکھنڈ بھارت کا حِصّہ بن جائے گا۔"

یاد رہے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو جب تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان کیا گیا تو خان عبدالغفار خاں نے مہاتما گاندھی سے کہا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں ایک خوفناک تقدیر ہمارا انتظار کر رہی ہے ہم نہیں جانتے کہ کیا کریں۔ اس پر مسٹر گاندھی نے کہا، "خان صاحب عدمِ تشدد مایوسی نہیں جانتا یہ آپ کی آزمائش کا وقت ہے۔ آپ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ پاکستان آپ کے لیے قطعی ناقابلِ قبول ہے۔ آپ بدترین حالات کا مقابلہ کریں۔ ان لوگوں کے لیے کون سا خوف ہو سکتا ہے جو مرنے یا مارنے کا عہد کر چکے ہوں۔"

جن دنوں موجودہ مارشل لاء نیا نیا لگا تھا ان دنوں خان عبدالغفار خاں نے "پختون زلمے" سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

"میں آپ سے مایوس ہو چکا ہوں۔ آپ سے تو بنگالی زیادہ غیرت مند ہیں جنہوں نے الگ وطن حاصل کر لیا ہے۔ آپ ساری زندگی غلام رہیں گے۔"

(بحوالہ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور مورخہ مارچ ۱۹۸۴ء)

بھارت کا دورہ

۱۹۶۹ء میں خاں صاحب بھارت گئے تو وہاں پہنچ کر آپ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ

"میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کیسے ہو سکتا ہے۔ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا، اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تھی ہی۔ لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کر لوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ ہم مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔"

(سٹیٹسمین مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

ٹائمز آف انڈیا سے انٹرویو

۱۹۶۸ء کے بعد ۱۹۷۳ء میں آپ نے ٹائمز آف انڈیا کے نمائندے مسٹر دلیپ کمار کرجی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

"چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لیے اسلام کافی نہیں رہے گا اس لیے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہو گی۔"

مجلس دستور ساز میں تقریر

خان عبدالغفار خاں نے تو پاکستان کی مجلس دستور ساز کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: "ہم تمام پٹھانوں کے لیے پاکستان میں ایک خود مختار علاقہ چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ وہی ہے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈیورنڈ لائن سے مشرق کی طرف پٹھان متحد ہو جائیں اور اس مقصد کے لیے ہم آپ کی مدد چاہتے ہیں۔"

(بحوالہ ہندوستان ٹائمز ۶ مارچ ۱۹۴۸ء)

ولی خان صاحب کے مختلف بیانات

بڑے خان صاحب کے بعد جہاں تک ان کے صاحبزادے جناب عبدالولی خان صاحب کا تعلق ہے، انہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد فرمایا تھا:

"بنگلہ دیش کے وجود میں آجانے سے دو قومی نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے۔"

(بحوالہ نوائے وقت لاہور ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء)

۱۰ اکتوبر کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو نوائے وقت میں فرمایا:

"دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے۔ اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریہ پاکستان غلط تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت اسی نظریہ کو غلط طور پر اساس بنایا گیا تھا لیکن کسی بھی قوم کو زیادہ دیر تک محض جذباتی نعروں سے بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا۔ اب بھی اس بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے سراسر غلط ہے۔ مونٹ بیٹن نے جب اپنے اختیارات پاکستان کے گورنر جنرل کو تفویض کیے تھے تو ہم نے اس وقت بھی اس کی مخالفت کی تھی۔ اس وقت ہمیں غدار کہا گیا تھا لیکن آج دنیا نے دیکھ لیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا اور اسلام ہی کے نام پر ٹوٹا ہے۔"

جولائی ۱۹۷۴ء میں ایک پریس کانفرنس میں خان عبدالولی خان پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے علیحدگی کا مسلک کیوں اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے جواب میں کہا۔

"خود قائدِ اعظم علیحدگی کی تحریک کے بانی تھے۔ انہوں نے ہندوستان سے علیحدگی اختیار کی اب اگر کوئی قائدِ اعظم کے پیروکار بنتے ہیں تو مستحق سزا قرار پاتے ہیں۔"

(بحوالہ نوائے وقت ۲۰ جولائی ۱۹۷۴ء)

اور بقول ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالعدم این ڈی پی کے راہنما جناب عبدالولی خان نے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں یومِ شہداء کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"نصف صدی قبل ان شہیدوں نے جن حقوق کے لیے قربانی دی تھی وہ ہمیں آج بھی حاصل نہیں اور ہم اپنے حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھیں گے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۵ اپریل ۱۹۸۴ء)

اس کے باوجود یہ حضرات مخلص ہیں

یہ ہیں خان عبدالولی خان اور جناب غفار خان کے وہ تعلقات سرزمین پاکستان کے ساتھ! لیکن اس کے باوجود اخبارات کی اس شہ سرخی میں کہاں تک حقیقت ہے جو صدرِ مملکت محمد ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر صاحب کی طرف منسوب کرتے ہوئے دی گئی تھی کہ:

"خان عبدالغفار خاں بہت بڑے محبِ وطن ہیں۔" (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت مارچ ۱۹۸۴ء کالم صبح بخیر)

اور اس کے بعد جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے روزنامہ جنگ لاہور کے ایک پینل کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ :

"ولی خاں انتہائی مخلص اور صفِ اوّل کے راہنما ہیں ۔" العجب ۔

(بحوالہ جنگ لاہور بی ایڈیشن مورخہ ۷/اپریل ۱۹۸۶ء)

حسین احمد مدنی اور خدائی خدمتگار

مولانا نورانی کے علاوہ مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے ۱۹۴۸ء میں کہا تھا کہ :

"صوبہ سرحد میں خدائی خدمت گاروں پر نت نئے مظالم کی اطلاعات ہم تک پہنچ رہی ہیں اگر وہ صحیح ہیں تو قیام وزارت کا طرزِ عمل نہایت قابلِ افسوس ہے ۔ سرخپوش قوم کے سچے خادم ہیں اور انہوں نے جنگ آزادی میں ہمیشہ نمایاں حصّہ لیا ہے ۔ مَیں حکومت سرحد کو متنبّہ کرتا ہوں کہ اسلام کے جعلی نام پر ان فسطائی اطوار کو قوم برداشت نہیں کرے گی ۔"

(بحوالہ "ہندوستان ٹائمز" ۲ دسمبر ۱۹۴۸ء)

این ۔ ڈی ۔ پی کے نزدیک باچہ خاں کا مقام

اور کالعدم این ۔ ڈی ۔ پی کے سیکرٹری جنرل غلام احمد بلور نے جنگ فورم کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا کہ

"باچہ خاں (خان عبدالغفار خان) کا ہماری پارٹی میں وہی مقام ہے جو گاندھی جی کا کانگرس میں ہے ۔" آپ نے مزید کہا کہ "تو رخم سرحد پر ولی کا رول بھائی بھائی کے نعرے نوجوانوں نے لگائے ۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱/اپریل ۱۹۸۴ء صفحہ ۱)

پختون تحریک کے صدر کی تقریر

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جن دنوں حکومتِ پاکستان نے تحریک پختونستان پر پابندی عائد کی تو امریکہ میں اس تحریک کے ہیڈکوارٹر میں ۲۳ ستمبر ۱۹۵۴ء کو پختون تحریک کا یوم آزادی منایا گیا ۔ چنانچہ اس موقع پر اس سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر اورنگ زیب شاہ صاحب نے اپنی تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ :

"چھ سال پہلے کا ذکر ہے کہ آج کے دن پختونستان کے باشندوں نے اپنے اس عزم راسخ اور نصب العین زندگی کا اعلان کیا کہ وہ مکمل آزادی حاصل کر کے رہیں گے اور اقوامِ عالم میں

ایک خود مختار اور آزاد مملکت کی حیثیت سے زندگی بسر کریں گے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد پختون کا خیال تھا کہ انہیں ایک آزاد وحدت کی حیثیت سے حقوق خود اختیاری مل جائیں گے جس طرح برما اور سیلون کو ملے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہیں ان حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ اپنی آواز بلند کریں اور حصولِ آزادی کے لیے ایک قوم کی حیثیت سے کھڑے ہو جائیں۔ چونکہ پختونستان کے رہنے والے افغان ہیں اس لیے یہ قدرتی بات تھی کہ افغانستان ان کے مطالبہ کی تائید کرتا۔ چنانچہ افغانستان کی حکومت اور وہاں کے باشندوں نے اس بات کا حلف لیا کہ وہ اس مطالبہ کی تائید بھی کریں گے اور اس کے حصول میں مدد بھی دیں گے۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام ۔ ۵ر نومبر ۱۹۵۵ء)

بہرحال ایام گذشتہ کے "مشرقی پاکستان" صوبہ سندھ اور صوبہ سرحد کے یہ ہیں وہ الم انگیز واقعات اور کوائف جو ہر صاحبِ بصیرت کے لیے غور و فکر کی ہزار داستانیں اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔

صُوبہ بلوچستان

غوث بخش بزنجو اور سردار اکبر بگٹی کا انٹرویو

اس کے بعد جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے تو اس کے لیے روزنامہ جنگ لاہور بابت ۸ر دسمبر ۱۹۸۳ء کی وہ تفصیلی خبر دیکھی جا سکتی ہے جس میں جناب عبدالحفیظ کاردار صاحب کی زیرِ طبع کتاب کے حوالے سے میر غوث بخش بزنجو اور سردار اکبر بگٹی کے انٹرویوز کا ذکر ہے۔ لکھا ہے:

" اگر ملک کو ایک رکھنا ہے تو تمام صوبوں کو بھی مساوی اہمیت دینا ہو گی۔ تمام صوبوں کو ایک وفاق کے اندر رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہونی چاہیئے۔ پنجاب نے بنگالیوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا وہ الگ ہو گئے۔ اگر آپ بھی ایک وحدت کے اندر رہتے ہوئے تمام صوبوں کو مساوی حقوق نہ دیے گئے تو میں کسی اور کی بات نہیں کرتا لیکن یہ بتا دوں کہ بلوچستان الگ ہو جائے گا اس کے سوا کوئی راستہ سامنے نہیں۔" انٹرویو کے آخر میں مسٹر بزنجو نے مجھے (کاردار کو) مخاطب کر کے کہا " پنجابی ہونے کی بنا پر تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ بلوچستان میں تمہارے خلاف شدید نفرت ہے۔"

سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کا ذکر

اِس انٹرویو کے علاوہ بقول ارشاد احمد حقانی صاحب کے کالم پاکستان نیشنل پارٹی کے سربراہ میر غوث بخش بزنجو نے ایک دفعہ پھر کہا کہ :

" ان کی پارٹی قومی جمہوریت پر مبنی نظامِ حکومت اور سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کے مطابق قومیتوں کے حقوق مانگ رہی ہے ۔ مردان بار ایسوسی ایشن کے ارکان سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا جو کوئی سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی خلاف ورزی کرتا ہے یا اسے منسوخ کرتا ہے تو اس سے یہ اخلاقی اور قانونی جواز ختم ہو جاتا ہے کہ ہم پاکستان میں شامل ہیں ۔ اس لیے سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد ایک معاہدہ تھا ۔ جو کوئی اس معاہدہ یا قرارداد کے مطابق قومیتوں کے حقوق نہیں دے گا وہ غدار اور پاکستان کا دشمن ہوگا ۔ ہم صوبوں کے لیے حقوق نہیں مانگتے بلکہ بلوچوں، پختونوں، سندھیوں اور پنجابیوں کے لیے سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کو بنیاد بنا کر حقوق مانگتے ہیں ۔ " (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵، اپریل سنہ ۱۹۸۲ء)

جناب بزنجو صاحب نے سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے حوالے سے جن حقوق کا ذکر کیا ہے اس کے پس پردہ کیا ہے اور سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی اصل حقیقت کیا تھی یہ جاننے کے لیے ہمیں ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے اس وضاحت کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس نے اپنے شمارہ بابت اگست سنہ ۱۹۸۴ء میں شائع کی اور وہ یہ کہ :

" ایک ریاست یا متعدد ریاستیں :

ہماری قوم انتہائی خوش قسمت تھی کہ اسے ایک قطرۂ خون بہائے[1] بغیر اتنی عظیم مملکت مل گئی اور انتہائی بدقسمت ہے کہ اسے اس مملکت کے یومِ پیدائش سے لے کر اس وقت تک ایک دن بھی چین کا نصیب نہ ہوا ۔ یہ مسلسل خطرات کا شکار اور پریشانیوں میں مبتلا رہی ۔ یہ خطرات بیرونی بھی تھے اور اندرونی بھی ۔ اندرونی خطرات بیرونی سے مہیب تر تھے ۔ اور (اس وقت تک ہیں) ان خطرات کے موجب وہ لوگ ہیں جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور وہ اب بھی اسے دل سے تسلیم نہیں کرتے ۔ لیکن ان کی مخالفت کی تکنیک بڑی مغالطہ آفرینا دام ہمرنگ زمین ہوتی ہے ۔ وہ کھلے بندوں یہ نہیں کہتے کہ ہم ایسا چاہتے ہیں وہ کہیں گے کہ تشکیلِ پاکستان کا مقصد یہ تھا ۔ قائدِ اعظم اسے سیکولر اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے ۔ وہ اشتراکِ وطن (جغرافیائی حدود) کی بنا پر ایک قوم کے قائل تھے ۔ اسی قسم کا ایک اور دعویٰ تھا اور جس کی ہلاکت خیزی پاکستان کو دولخت کر دینے پر منتج ہوئی ۔ شیخ مجیب الرحمٰن (مرحوم) شروع سے ہی پاکستان کے خلاف تھا لیکن وہ برملا اس کا اعلان نہیں کرتا

---

[1] تمام قتل و غارت گری تقسیم ہند کے وقت تبادلۂ آبادی کے دوران ہوئی تھی اس سے پہلے نہیں ۔

چاہتا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اس زمانے کے حزبِ اختلاف کی ایک نیشنل کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اس کی مجلس مضامین سبجیکٹ کمیٹی میں اس نے تجویز پیش کی تھی جس میں کہا تھا کہ :

"ملک کا آئینی ڈھانچا تبدیل کر کے ایسے وفاق کی بنیاد رکھی جائے جو مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو خود مختار ریاستوں پر مشتمل ہو۔ مرکزی حکومت صرف دفاع اور امورِ خارجہ سے متعلق ہو۔ تمام معاملات میں دونوں ریاستیں کاملاً خود مختار ہوں۔"

(روزنامہ کوہستان - ۱ر فروری ۱۹۶۶ء بحوالہ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۶۶ء ص۳)

اس کے حق میں دلیل یہ دی گئی تھی کہ لاہور ریزولیوشن ۱۹۴۰ء میں سٹیٹ نہیں کہا گیا تھا۔

اس چنگاری نے جو آگ سلگائی وہ آتشِ خاموش کی طرح اندر ہی اندر آگے بڑھتی گئی تا آنکہ وہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں شعلہ بار ہوئی۔ ہم نے اسی زمانے میں اس موضوع پر بکثرت لکھا اور دلائل و براہین کی رُو سے ثابت کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کا یہ مفہوم لینا مملکتِ پاکستان کا ایک صوبہ اپنی خود مختاری کا دعویٰ کرتا ہے تو کل کو مغربی پاکستان کے باقی صوبے بھی اسی مطالبہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مشرقی پاکستان بہر حال علیحدہ ہو گیا تھا اور جس خطرہ کا ہم نے اس وقت احساس دلایا تھا، وہ سُلگتا ہوا آگے بڑھتا گیا تا آنکہ اب مختلف گوشوں سے صوبائی خود مختاری کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی ہیں اور ان کی بنیاد ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو قرار دیا جا رہا ہے۔

۱۹۴۰ء کا ریزولیوشن

پہلے ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کو لیجئے۔ بات یوں ہے کہ ہندو اور انگریز چاہتا تھا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت پورے ہندوستان کو ایک مملکت اور وہاں کے باشندوں کو ایک قوم فرض (یا تسلیم) کر کے ہندوستان کے لیے ایک آئین مرتب کیا جائے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ انگریز اور ہندو پر واضح کیا جائے کہ ان کا یہ منصوبہ، مسلمانوں کے مطالبہ کے یکسر خلاف ہے اور اس قسم کا کوئی آئین ان کے (مسلمانوں) کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ اس مقصد کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ ریزولیوشن پاس ہوا جسے بعد میں قراردادِ پاکستان یا لاہور ریزولیوشن کہہ کر پکارا گیا۔ اس ریزولیوشن میں یہ کہا گیا تھا کہ :

"مسلمانوں کے نزدیک کوئی آئینی پلان قابلِ قبول نہ ہو گا تاوقتیکہ وہ ان اصولوں کے مطابق مرتب نہ کیا جائے کہ جغرافیائی اعتبار سے ملحق علاقوں کی نشان دہی کر کے انہیں اس طرح

کے خطّے بنادیا جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں مثلاً ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے خطّے، انہیں باہم دگر ملا کر آزاد مملکتیں بنادیا جائے۔"

ظاہر ہے کہ اس ریزولیوشن میں نہ ایک مملکت کا ذکر ہے نہ دو کا۔ اس میں صرف یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان کا حصّہ قرار نہ دیا جائے۔ انہیں ہندوستان سے الگ آزاد قرار دیا جائے اور اس اعتبار سے نیا کانسٹی ٹیوشن مرتب کیا جائے۔ اس میں شمال مغرب اور شمال مشرق کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس سے قائدِ اعظم یا مسلم لیگ کی مراد شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو الگ الگ آزاد مملکتیں یا ان دونوں کو ملا کر ایک مملکت ——

قائدِ اعظم کا تصوّر

حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء سے لے کر ان کی وفات تک قائدِ اعظم کی کسی تقریر، تحریر یا بیان میں دو مملکتوں کا اشارہ تک بھی نہیں ملتا۔ اس کے برعکس انہوں نے اسی زمانے میں اس کی وضاحت کر دی تھی اور وہ اسے تقسیمِ ہند تک برابر دہراتے رہے کہ اس سے مُراد ایک مملکت ہے۔

لاہور ریزولیوشن سنہ ۱۹۴۰ء میں پاس ہوا۔ اس کے ایک سال بعد مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِ اعظم نے فرمایا:

"ہم نے اس امر کا تہیّہ کر رکھا ہے اور اس باب میں کسی کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ رہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے منوا کر رہیں گے اور اس برّصغیر میں ایک آزاد مملکت قائم کر کے چھوڑیں گے۔"

گاندھی جناح خط و کتابت

یہ سنہ ۱۹۴۰ء کی بات ہے اب آگے چلیے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی اور قائدِ اعظم کے مابین وہ خط و کتابت ہوئی جس نے مسلم لیگ کے مُوقف اور مطالبہ کو نکھار اور اُبھار کر رکھ دیا۔ خط و کتابت میں زیرِ بحث بنیادی سوال یہی تھا کہ — "سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کا مفہوم کیا ہے"

ظاہر ہے کہ اس ریزولیوشن کا جو مفہوم اس خط و کتابت میں پیش کیا گیا تھا اس سے زیادہ مُستند مفہوم اور کون سا ہو سکتا ہے؟ یہ خط و کتابت ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی اور اسے نومبر سنہ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سنٹرل آفس نے نواب زادہ لیاقت علی خاں (مرحوم) کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا

تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے وہی نسخہ ہے۔ یہ خط و کتابت اس قابل ہے کہ اسے بہ تمام و کمال سامنے لایا جائے۔ لیکن ہم اس وقت صرف مسٹر گاندھی کا وہ متعلقہ سوال جس کا تعلق ہمارے مسئلہ زیرِ نظر سے ہے اور قائدِ اعظم کا جواب درج کرتے ہیں۔

مسٹر گاندھی : "کیا یہ دو خطے الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی ؟"

قائدِ اعظم : "نہیں ! یہ مملکت پاکستان کے اجزاء ہوں گے ۔"

ہم سمجھتے ہیں کہ قائدِ اعظم کے اس جواب کے بعد اس مسئلہ کے متعلق اور کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم قائدِ اعظم کی پیش کردہ دو ایک اور وضاحتیں بھی سامنے لاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں کہا تھا کہ ملک کی تقسیم کے بعد متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ :

۱۔ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے مابین ہوگا۔

۲۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے اس میں دو آزاد مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ ایک ہندوستان اور دوسرا پاکستان۔

مسٹر گاندھی نے پوچھا تھا کہ تقسیم کے بعد بھی دفاع اور اسی قسم کے دیگر معاملات ایسے رہ جائیں گے جن کا تعلق ہندوستان اور پاکستان سے مشترکہ طور پر ہوگا۔ ان کا تصفیہ کیسے ہوگا۔ قائدِ اعظم نے جواب دیا تھا :

"جب ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ آزاد مملکتیں ہوں گی تو ان میں کسی مشترکہ معاملہ کا سوال کیسے پیدا ہوگا ؟"

جب یہ مذاکرات ناکام رہ کر ٹوٹے ہیں تو مسٹر گاندھی نے قائدِ اعظم سے کہا تھا کہ آپ مجھے خواہ مخواہ مطعون کرتے ہیں کہ میں نے آپ کا کوئی مطالبہ نہیں مانا۔ اس کے جواب میں قائدِ اعظم نے جن مطالبات کی وضاحت کی تھی۔ ان میں بنیادی طور پر کہا گیا تھا کہ :

"آپ نے (مسٹر گاندھی نے) اسے بھی تسلیم نہیں کیا کہ لاہور ریزولیوشن کی رو سے پاکستان ان دو خطوں پر مشتمل ہوگا جن میں شمال مشرق میں بنگال ، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبے ہوں گے اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام کے صوبے۔ فرمائیے اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہو سکتی ہے۔"

اس کے بعد قائدِ اعظم نے ۵ ر اکتوبر ۱۹۴۴ء کو ڈیلی ورکر لندن کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا :

"مطالبہ پاکستان کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ چھ صوبے یعنی

سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب شمال مغرب میں اور بنگال اور آسام شمال مشرق میں۔ ان میں مسلمانوں کی آبادی کا ستر فی صد ہے باقی غیر مسلم ہیں۔ مسلمان چاہتے ہیں کہ ان صوبوں پر مشتمل پاکستان ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے قائم کیا جائے۔"

یہ اکتوبر ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ قائدِ اعظم نے ۸، نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندہ کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا:

"جغرافیائی حیثیت سے پاکستان مغرب میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب پر مشتمل ہوگا اور مشرق میں بنگال اور آسام اس کا دوسرا حصہ ہوں گے۔"

(بحوالہ تقاریر جناح جلد دوم ص ۲۲۵)

۱۹۴۶ء کا کنونشن

یہ نومبر ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن، ہندوستان آیا۔ تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ اس وقت ضرورت تھی کہ کمشن کے سامنے مسلمانوں کا مطالبہ نہایت متعین الفاظ میں پیش کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے قائدِ اعظم نے ایک نہایت مدبرانہ قدم اُٹھایا۔ اس وقت انتخابات حال ہی میں ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان انتخابات کے نتیجہ میں جو مسلمان اراکین لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے، وہی مسلمانوں کے صحیح اور مستند نمائندے تھے۔ قائدِ اعظم نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ان تمام اراکین جن کی تعداد پانچ سو سے زیادہ تھی، پر مشتمل ایک کنونشن (دہلی) میں منعقد کیا۔ اس کنونشن کا اجلاس ۸۔ ۹، اپریل کو اینگلو عرب کالج کے میدان میں ہوا۔ اس میں بنگال کے رہنما مسٹر سہروردی نے اپنی اس تقریر کے ساتھ جسے فی الحقیقت ایک ادبی شہپارہ کہا جا سکتا ہے وہ ریزولیوشن پیش کیا جس میں پاکستان کی واحد آزاد مملکت کا مطالبہ پیش کیا گیا جو شمال مغرب میں سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان اور شمال مشرق میں بنگال اور آسام پر مشتمل ہوگی۔ اس کنونشن نے اس قرارداد کو منظور کیا۔ اگرچہ اس کنونشن کی حیثیت کچھ کم ذمہ دارانہ نہیں تھی، لیکن مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے وہیں اعلان کر دیا تھا کہ اس قرارداد کی توثیق مسلم لیگ کونسل سے بھی کرائی جائے گی۔ چنانچہ اس کی توثیق مسلم لیگ کونسل کے اجلاس سے کرائی گئی جو قائدِ اعظم کی صدارت میں ۹، جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔

اس ریزولیشن کے پاس ہونے کے بعد قائدِ اعظم نے کیبنٹ پلان کے سلسلہ میں بیان دیتے ہوئے ۲۲، مئی ۱۹۴۶ء کو کہا:

"مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام اور مغرب میں بنگال اور سرحد، سندھ اور بلوچستان مل کر ایک آزاد خود مختار مملکت قرار پائیں گے۔" (تقاریر جلد دوم ص۔ ۹۰م)

اور اسی کے مطابق ملک کی تقسیم ہوئی اور پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آگئی۔

واضح رہے کہ اس کنونشن میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا تھا کہ سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں ایک مملکت کا تصور دیا گیا تھا یا دو مملکتوں کا اِس نکتہ کی شرح وبسط سے تشریح کی گئی تھی اور آخر میں یہی قرار پایا تھا کہ جیسا کہ قائدِ اعظم اس کی تشریح کرتے چلے آئے ہیں اس ریزولیوشن میں ہی ایک ہی مملکت کا تصور دیا گیا تھا۔

سنہ ۱۹۷۲ء کا مقالہ

یہ ہے وہ مقالہ جسے ہم نے سنہ ۱۹۷۲ء میں شائع کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں اور آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ اس سوال کے متعلق کہ سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کا مفہوم کیا تھا اور قائدِ اعظم اس کا کیا مطلب لیتے تھے کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ایک مملکت (پاکستان) کا مطالبہ کیا تھا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں ہمیں ایک مملکت حاصل ہوئی تھی۔ قائدِ اعظم جس کے پہلے (واحد) گورنر جنرل تھے اور مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے صوبے اس ایک مملکت کے انتظامی خطے مشرقی پاکستان کی علیحدگی مملکت کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھی۔ اور اگر مغربی پاکستان کا کوئی صوبہ (خدا نہ کردہ) اس قسم کا خیال اپنے دل میں رکھتا ہے تو وہ خیال باغیانہ ہے اسے جرأت کر کے اپنی طرف سے اسے پیش کرنا چاہیے۔ قائدِ اعظم کے مونڈھے پر رکھ کر بندوق چلانا یا سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی کمین گاہ میں چھپ چھپ کر وار کرنا بزدلی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو اس قسم کے باغیانہ سے باز رکھے۔"

سنہ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن کی مزید وضاحت

سنہ ۱۹۴۶ء کی مسلم لیگ کنونشن جو دلی کے اینگلو عربیک کالج کے احاطہ میں منعقد ہوئی اس کی روئیداد بیان کرتے ہوئے روزنامہ ڈان کے چیف ایڈیٹر جناب محمد سعید صاحب سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کنونشن کو ساڑھے چار بجے شروع ہونا تھا لیکن بنگال کے مندوبین جس گاڑی سے آ رہے تھے، وہ جگہ جگہ رکتی ہوئی بڑی دیر سے پہنچی۔ چنانچہ جلسہ چھ بجے شروع ہوا۔

قائدِ اعظم صدر چُنے گئے۔ ہلکے بادامی رنگ کی ریشمیں اچکن اور سفید شلوار میں ملبوس جب قائد تقریر کے لیے اُٹھے تو پورا پنڈال تالیوں سے گُونج اُٹھا۔ آپ نے کہا کہ "پاکستان کے مسئلے پر کسی سمجھوتے کی قطعی گنجائش نہیں۔ پاکستان کامل طور پر ایک آزاد و خود مختار مملکت ہوگی۔ ہم چونکہ حق پر ہیں اس لیے اللہ کی نُصرت ہمارے ساتھ ہے۔ یہ حل ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حق و انصاف پر مبنی ہے۔ ہم اس کے لیے لڑیں گے جان دینا پڑی تو جان بھی دیں گے لیکن اسے لے کر رہیں گے۔"

دو کتبے بڑے اہم آویزاں تھے۔ ایک پر قائد کے خط کا وہ مشہور اقتباس تھا، جس میں انہوں نے بتلایا تھا کہ مسلمان کیوں علیحدہ قوم ہیں اور دوسرے پر یہ رقم تھا کہ "آزادی کی منزل پاکستان کی راہ سے حاصل ہوگی"۔ اس کنونشن میں دو باتیں بڑی اہم طے ہوئیں۔ ایک بالتصریح اور دوسری بنتیجۃً۔ ایک قرار دادِ لاہور کی تکمیل تھی اور دوسری ایک عہد نامہ تھا۔

سنہ ۱۹۴۶ء تک پہنچتے پہنچتے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اُس شائبے کا حتمی طور پر ازالہ کر دیا جائے کہ مسلمانوں نے دو ریاستوں کا مطالبہ پیش کیا ہے یا ایک کا۔ گو وجود میں آنے والی ریاست کا نام اب دنیا بھر میں پاکستان مشہور ہو چکا تھا۔ تاہم یہ ازالہ ضروری تھا کہ انگریز (دلّی سے لندن تک) ہندو (ہر مہاشے سے مہاتما تک) مسلمان (پشاور سے چٹا گانگ تک)۔ اب کسی شک و شبہ میں نہ رہے تھے کہ مسلمان دو بازوؤں پر مشتمل ایک ریاست کے خواہاں ہیں اور اس ریاست کا نام پاکستان ہوگا۔ قائدِ اعظم سنہ ۱۹۴۴ء میں اپنی خط و کتابت میں یہ بات مہاتما جی پر واضح کر چکے تھے۔

ویسے بھی اگر مسلمانوں کے اس عزم میں خفیف سا رخنہ رہ جاتا اور کسی نئے خیال کو ہوا دینے یا کسی پرانے مفروضے کو پھر سے زندہ کرنے کی گنجائش ہوتی تو مہاتما جی کی نگاہِ باریک بین اُس سے فائدہ اُٹھانے سے کبھی نہ چُوکتی۔ پاکستان کے حق میں ۹۹ فیصد رائے دینے والے پٹھانوں کے اندر جو سیاستدان پختونستان کا شوشہ کھڑا کر سکتا تھا، اُسے اگر ایک پاکستان کی بجائے دو یا دو کی بجائے تین پاکستان بنانے کی گنجائش نظر آتی وہ کہاں چُوکنے والا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ قرار دادِ لاہور کا مطلب سمجھنے میں ہندوؤں نے کبھی کوئی ٹھوکر نہیں کھائی تھی بلکہ اُس کے خدوخال وہ اپنے ذہنوں میں خود متعین کرتے تھے

مسلمانوں کی تاریخ کے نوادرات میں ایک بات یہ بھی ملتی ہے کہ وہ اپنی کوتاہ بینی سے راستوں سے بھٹک جائیں تو کچھ بعید نہیں۔ لیکن ان کا حریف اپنی دُور شناسی سے اُن کی منزل سے ناواقف نہیں رہتا۔ ملک چونکہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم ہو رہا تھا اس لیے دونوں قوموں کا اپنا اپنا تشخص اور اُسی رعایت سے ایک ایک ملک تھا۔ ایک ملک ہندو کا۔ ایک مسلمان کا۔ اگر لسانی یا ثقافتی تقسیم منظور ہوتی اور یہ عوامل بھی پیشِ نظر ہوتے تو پھر تین یا تین سے زیادہ ملکوں کا مطالبہ ہوتا۔ بلکہ ہندوستان جُوڑ جُوڑ ہو چکا ہوتا ہندوستان کو حتمی طور پر دو حصّوں میں تقسیم ہونا تھا۔ ہندو علاقہ اور مسلم علاقہ۔ ہندو علاقہ کا نام بھارت اور مسلم علاقہ کا نام پاکستان۔ جس طرح ہندو علاقہ میں کسی اور وطن کی گنجائش نہیں تھی اسی طرح مسلم وطن میں کسی اور وطن کی گنجائش نہیں تھی۔ تقسیمِ ملک کے بنیادی اصول نے ہر دوسرے اصول کو پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ کنونشن میں اسی بات کا اعادہ ہُوا۔

دوسری بات اس سے کم اہم نہیں تھی۔ کنونشن کی قرارداد، جو صحیح معنوں میں پاکستان کی قرارداد تھی۔ جو حلف ارکانِ اسمبلی نے اُٹھایا اُس کی پیشانی پر قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (کہیے میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ کے لیے وقف ہے جو پروردگارِ عالمین ہے) رقم تھا۔ گویا قرارداد نے سیاسی اور جغرافیائی طور پر پاکستان کے حدود مقرر کر دیئے۔ اور اس میثاق نے اُس کے اندر رائج ہونے والے نظام کا تعین کر دیا۔"

(بحوالہ آہنگِ بازگشت)

نواب اکبر بگٹی

ہم روزنامہ ''اسلام'' لاہور اور جناب سعید صاحب کی طرف سے ۱۹۴۰ء کی قرارداد کی اس وضاحت کے بعد ہم دوبارہ اس انٹرویو کی طرف لوٹتے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس میں بزنجو صاحب کے بعد نواب بگٹی صاحب کے متعلق لکھا ہے:

"نواب اکبر بگٹی نے کہا مجھے افسوس ہے کہ میں نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے لیے ووٹ دیا۔ انہوں نے کہا، پنجاب کی تین قوتوں فوجی قیادت، افسر شاہی، اور صنعت کاروں کے چنگل

سے نکلنا آج ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔" جناب کاردار نے لکھا ہے کہ "ان قوتوں میں بگٹی صاحب نے جاگیرداروں کو شامل نہیں کیا۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک جاگیردار ہیں۔ جب بگٹی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کو مستقبل میں بہتری کی کوئی امید نظر آتی ہے تو انہوں نے پوچھا کس کے مستقبل کی تمہارے یا میرے، پنجاب کے یا بلوچستان کے۔ انہوں نے کہا مینگل اور مری باہر جاکر آزاد بلوچستان کے لیے کام کر رہے ہیں اور گیند پنجابیوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ایک نہیں چار قوموں کے پاکستان کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔"

بزنجو صاحب کا ایک بیان

۱۹۷۸ء میں بزنجو نے فرمایا تھا کہ :

" اب میں اس الزام کی طرف آتا ہوں۔ میں نظریہ پاکستان اور مسلم قومیت کے ان خود ساختہ علمبرداروں کو میرا جواب یہ ہے کہ اس کرہ ارض پر مسلم قومیت جیسی کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ اس طرح نظریہ پاکستان نام کی کوئی چیز نہ تو پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ ظاہر ہے مجھ پر کسی چیز کا الزام نہیں لگایا جا سکتا جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔"

(بحوالہ روزنامہ امن کراچی مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۷۸ء)

پاکستان میں چار قومیں بستی ہیں

اور روزنامہ "نوائے وقت مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۸ء کے حوالے سے آپ نے کہا تھا :

" پاکستان میں چار قومیتیں بستی ہیں۔ یعنی بلوچی، سندھی، پنجابی اور افغان۔ یہ چار قومیتیں اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں بستی ہیں۔ ایک مسلم قومیت کی بجائے ان چار قومیتوں کے الگ الگ وجود کو تسلیم کیا جائے اور ایسا آئین مرتب کیا جائے جس کی رو سے ان صوبوں کو کامل خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کے پاس امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور کرنسی کے محکمے ہوں۔"

افغانستان میں روسی فوجیں

اور ۱۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو جناب میر غوث بخش بزنجو نے روزنامہ جنگ لاہور کے حوالے سے افغانستان

کے سلسلہ میں فرمایا:

"افغانستان میں روسی فوجوں کی موجودگی پر اعتراض بلا جواز ہے کیونکہ وہاں کی حکومت نے انہیں خود دعوت دے کر بلایا تھا۔"

بزنجو۔ ولی تعلقات

اِس موقع پر اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ جناب بزنجو صاحب اور جناب ولی خاں صاحب کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہیں تو یہ جاننے کے لیے روزنامہ جنگ لاہور بابت ۲۰ اپریل ۱۹۸۴ء کی یہ خبر ملاحظہ کریں کہ:

"پشاور (نمائندہ جنگ) کالعدم این ڈی پی کے رہنما خان عبدالولی خان کی جانب سے آج رات میر غوث بخش بزنجو کے اعزاز میں عشائیہ دیا گیا۔ اس موقع پر دونوں رہنماؤں نے کالعدم این ڈی پی اور کالعدم پی این پی کے ادغام کے بارے میں بات چیت کو آگے بڑھانے پر تبادلہ خیال کیا۔"

بلوچستان کے سلسلہ میں آخر پر روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۸۵ء کا وہ اداریہ ملاحظہ فرمائیں جو جناب مدیر جنگ نے کوئٹہ کے اندر ہونے والے مذہبی فسادات کے سلسلہ میں قلم بند کیا تھا:

"کوئٹہ کے واقعات۔ ایک خطرناک عنصر کی نشاندہی

کوئٹہ سے نمائندہ جنگ کی اطلاع کے مطابق حکومت کو ایسے شواہد ملے ہیں کہ کوئٹہ کے حالیہ واقعات میں کلیدی عہدوں پر فائز بعض سرکاری افسران کا کردار مشکوک تھا اور انہوں نے کوئٹہ کے واقعات میں اہم کردار ادا کیا جس سے معصوم اور بے گناہ شہریوں کو جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔" اِس کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ: "بنگلہ دیش میں ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی تھی کہ سرکاری افسران نے علیحدگی پسندوں کا ساتھ دیا اور حکومت منہ دیکھتی رہ گئی۔ اب اگر کوئٹہ کے واقعات نے بعض مشکوک کرداروں کو ننگا کر دیا ہے تو اس کا کیا ثبوت کہ دوسرے صوبوں میں اِس قماش کے لوگ موجود نہ ہوں گے۔ اِس سے ملتی جلتی شکایت سندھ کے واقعات کے دوران بھی سُنی گئی۔ انتظامیہ میں اگر ایسے عناصر گھس جائیں جو کسی ایسے کو جنم دینے والے واقعات کے منتظر رہیں تو پھر ملک کا خدا حافظ۔ بلوچستان ایک حساس خطہ ہے۔ بعض افغان مہاجرین نے وہاں صورتحال کو نازک بنا دیا ہے۔ روس کی نگاہیں بھی اِس خطے پر لگی ہوئی ہیں۔ مقامی آبادی کے بعض بااثر

سردار عرصہ سے حکومت سے ناراض چلے آرہے ہیں۔ بھٹو کے دَور میں پہاڑوں میں روپوش ہونے والے اور افغانستان فرار ہونے والوں کی بھاری تعداد ابھی واپس نہیں آئی۔ ان لوگوں کو سرداروں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پھر قبائلی نظام میں قبائل سے وابستگی اور سردار کی وفاداری ہر فردِ قبیلہ کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ حکومت کے لیے یہ بات لمحۂ فکریہ ہونی چاہیئے کہ سرکاری افسران میں یہ رجحان کیوں پیدا ہوا اور انتظامیہ کے افسران کو اس سے کس طرح بچایا اور روکا جاسکتا ہے۔ کیونکہ محض تادیبی کاروائی اس مرض کا مکمل علاج نہیں۔"

اِس مرض کا علاج

سابقہ صفحات میں بیان کردہ اس الم انگیز داستان کو اگر اسلام کے نظریہ قومیت میں بدلنے کا حل معلوم کرنا مقصود ہو تو "طلوعِ اسلام" کے الفاظ میں اُسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

۱۔ " اسلام نے یہ دعوت پیش کی کہ نسل، رنگ، زبان، وطن کی خود ساختہ حد بندیوں سے بلند ہو کر صرف آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت میں وحدت پیدا کی جائے۔ اسے اسلام کا نظریہ قومیت کہتے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں نے اس حقیقت کبریٰ کو فراموش کر دیا۔ علامہ اقبال نے کہا کہ آیئے ایک خطۂ زمین میں اِس تصوّر کا احیاء کر کے پھر سے انسانیت میں ایک اعلیٰ وحدت کی طرح ڈالیں۔ اس مقصد کے لیے پاکستان وجود میں لایا گیا۔

۳۔ مشرقی پاکستان نے اِس تصور سے اعراض برتا اور یہ غیر اسلامی روش اختیار کرلی کہ قوم کی تشکیل علاقائی بنیادوں پر ہوتی ہے۔ اس طرح وہ پاکستان سے الگ ہوگیا۔ ان کی تتبع میں مغربی پاکستان میں صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں بھی اسی غیر اسلامی نظریہ کو بیدار کیا گیا اور انہوں نے علاقائی بنیادوں پر اپنی اپنی الگ الگ قومیت کا دعویٰ کر دیا۔ اس کا اگلا قدم اپنی الگ الگ مملکت کا قیام ہوگا۔"

پنجاب

اِس سلسلہ میں جہاں تک صوبہ پنجاب کا تعلق ہے، جناب پرویز صاحب نے اگست ۱۹۷۲ء میں

پنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ:

"خوش قسمتی سے خطۂ پنجاب ابھی تک نسلی، لسانی، علاقائی تعصبات سے پاک ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز اس کی فضاؤں میں حضرت علامہ اقبال کا آفاق گیر انسانیت ساز قرآنی پیغام نغمہ بار ہے۔"

سچ کہا تھا کہنے والے نے ؎

چمن کی رنگین فضا کو آکے رشکِ جنت بنا گئے تم
وہاں وہاں پر خزاں نہ آئی جہاں جہاں مسکرا گئے تم

پنجاب کو صوبائی خود مختاری کا سبق

لیکن افسوس پنجاب کی اس اخوت گیر فضا کو بھی بڑے اچھوتے انداز میں صوبائی خود مختاری کا سبق ان الفاظ میں دیا گیا کہ:

"پنجاب گذشتہ برسوں سے مسلسل محرومی اور بے نیازی کا شکار چلا آرہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پنجاب نے ملک کے دیگر پسماندہ حصوں کے لیے مسلسل قربانی اور ایثار کا رویہ اختیار کیا ہے۔ یہ امر قابلِ ستائش ہے اور اس پر پنجاب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے لیکن اُلجھے ہوئے مسائل نے پنجاب کے لوگوں میں محرومی کا احساس بتدریج پیدا کر دیا ہے۔ جو اِس ملک کی ترقی اور بہبودی کے نقطۂ نظر سے بہت مہلک احساس ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں جذبات اور ردِ عمل کی کیفیت مسلسل پرورش پا رہی ہے۔"

ظاہر ہے محرومی کا احساس تو اسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے جس نے اپنے کسی عمل کو خالصتًہ ذاتی مفاد پرستی کے تحت تیری اور میری کی تفریق سے وابستہ کر رکھا ہو لیکن جس کے نزدیک اس کی تمام تر کاوش اور عمل کا ماحصل شرفِ انسانیت کی تکمیل ہو۔ وحدت کی تشکیل اس کا مدعا قرار پائے پھر جسے نہ صلہ کی تمنا ہو نہ ستائش کی حاجت بلکہ حسن کے نکھار کو اپنی تگ و تاز کا معاوضہ جانے اور اگر کسی وجہ سے یہ مطلوبہ نتائج پیدا نہ ہو رہے ہوں تو دل کی دھڑکن اسے کسی پہلو چین نہ لینے دے تو اس میں احساس محرومی کیسا اور کیوں؟

لیکن اہلِ پنجاب کے دل میں محرومی کا احساس پیدا کرتے ہوئے کہنے والے نے یہ بھی کہا کہ:

"پنجاب کی بدقسمتی یہی ہے کہ اس کی بزرگی یا قربانی کا اعتراف کہیں نہیں پایا جاتا۔"

اور اس کے بعد اہلِ پنجاب کو یہ مشورہ دیا گیا:

"پنجاب اگر ملک کے اندر ایک جغرافیائی خطّہ ہے تو اسے اپنے علاقے کی ضرورت اور مسائل کو سامنے رکھ کر اسی حیثیت سے سوچنا چاہیئے۔ اس کے افراد کو بھی، اس کی صحافت کو بھی ورنہ یہ بڑا بھائی بھی کہلائے گا اور چھوٹوں کے جُوتے بھی کھائے گا۔"

لہٰذا ان جُوتوں سے بچنے کے لیے کہا یہ گیا کہ:

"پنجاب صوبائی خود مختاری سے ہمیشہ محروم رہا ہے جس طرح مشرقی پاکستان جب تک رہا اس میں کبھی مرکزی حکومت مؤثر نہیں ہوتی تھی وہاں سب کچھ صوبائی حکومت ہی کرتی تھی۔ اسی طرح پنجاب جب سے پاکستان میں ہے اس میں کبھی کوئی صوبائی حکومت مؤثر نہیں ہوگی۔ یہاں ہمیشہ علاقہ خاص کی طرح مرکزی حکومت ہی براہِ راست مؤثر رہتی ہے۔"

یعنی بالفاظِ دوسرے صوبوں کی پیروی کرتے ہوئے مضبوط مرکز کے تابع "پاکستان میں" رہنے کی بجائے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا جائے۔

یہ ہوگا وہ تاریخی معرکہ جس کی طرف اہلِ پنجاب کی توجہ یہ کہہ کر دلائی جا رہی ہے کہ:

"پنجاب نے اب تک کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔"

یہ معرکہ کس طرح سر ہوگا

یہ ہیں وہ خیالات جس کی تشہیر اس کتابچہ میں کی گئی ہے جو جماعتِ اسلامی صوبہ پنجاب کے شعبہ نشر و اشاعت کی طرف سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اگر یہ دیکھنا ہو کہ یہ "تاریخی معرکہ" کن ہاتھوں سے سرانجام پائے گا تو کتابچہ نگار کا کہنا یہ ہے کہ:

"پنجاب ایک جغرافیائی خطّہ ہے لیکن یہاں کے لوگوں کا ذوق آفاقی اور سوچ غیر علاقائی ہے۔ افتادِ طبع ایک نظریاتی قیادت کی طلب گار رہی ہے۔ بلاشبہ نظریاتی اور آفاقی راہنمائی علاقائی قیادت سے بالاتر منصب ہے۔ لیکن اس راہنمائی اور قیادت کی شناخت ان میں ابھی موجود نہیں۔ اگر ان میں کسی قیادت کی شناخت ہوتی تو اس خطّے کے لوگ آفاق گیری کا حوصلہ بھی رکھتے۔ لیکن بدقسمتی نے انہیں یہیں گھیر لیا ہے۔ ان کی افتادِ طبع نظریاتی قیادت چاہتی ہے اور ان کی سادگی اور کوتاہ نظری انہیں نظری قیادت پا لینے سے محروم رکھتی ہے۔"

اور اس کے بعد اس کوتاہ نظری کی راہنمائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتابچہ میں کہا گیا ہے کہ:

"جس طرح صورتِ حال یہ بنا دی گئی ہے کہ جو بدبخت اسلام کو گالی دینا چاہتا ہے، وہ

جماعتِ اسلامی کو گالی دیتا ہے اِس طرح جو شخص پاکستان کو گالی دینا چاہتا ہے وہ پنجاب کو گالی دیتا ہے۔ ایک مملکت کا محافظ ہے اور دوسرا مملکت کی رُوح کا محافظ۔ لیکن دونوں میں باہمی شناخت ابھی پوری طرح نہیں ہے۔ "

ایضاً

یہ ہے وہ کتابچہ جس پر ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۲ء میں بھرپور تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

" اہلِ پنجاب کے دل میں اِس " محرومی " کا احساس کبھی پیدا نہیں ہُوا اِس لیے اس نے اسے اپنی محرومی سمجھا ہی نہیں۔ اب کوشش کی جا رہی ہے کہ یہاں بھی اِس احساس کو پیدا کیا جائے۔"

(ادارہ " طلوعِ اسلام " صٓ۳۰)

لندن پلان پر تبصرہ

اِس کے بعد ادارہ نے " لندن پلان " کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

" اِس وقت صرف پنجاب ایسا خِطّہ ہے جو پاکستانی سطح پر سوچتا ہے اور باقی صوبوں کے سازشیوں کا منصوبہ یہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کی مدد سے اسے بھی مجبور کر دیا جائے کہ یہ تصوّر کو چھوڑ کر علاقائی سطح پر سوچے۔ "

اہلِ پنجاب سے اِلتماس

اِس کے بعد اہلِ پنجاب سے التماس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" اہلِ پنجاب سے ہماری درخواست ہے کہ (۱) جو لوگ آپ کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آپ پاکستانی سطح کو چھوڑ کر علاقائی سطح پر سوچنا شروع کر دیں آپ ان کی بالکل نہ سُنیئے اس سے پاکستان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا اور (۲) تخریبی عناصر کی سازش یہ ہے کہ آپ کو اشتعال دلا کر یہاں فسادات برپا کرا دیے جائیں جس سے پنجاب کی رگوں کا خون نچڑ جائے۔ اور یہ اُٹھنے اور چلنے کے قابل نہ رہے۔ آپ ان کے اشتعال میں نہ آیئے۔ نہایت ضبط و تحمّل سے کام لیجیۓ اس میں آپ کی کامیابی اور پاکستان کی بقاء کا راز ہے۔"

ایضاً

کوثر نیازی صاحب کی تجویز

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ ہماری اس سیاسی فرقہ بندی نے نسل اور زبان کی آڑ میں صوبجاتی تفریق کو اس قدر ہوا دی کہ دنیا کے نقشہ پر مسلمانوں کی سب سے بڑی حکومت کا ایک حصّہ کٹ کر رہ گیا لیکن بجائے اِس کے کہ ہم ان غلط عوامل سے کوئی سبق حاصل کرتے سابقہ مرکزی وزیرِ اطلاعات کوثر نیازی صاحب نے ۲۹ر جولائی ۱۹۷۲ء کو ملتان کے ایک جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ :

" اردو قومی زبان ہے مگر پنجابی کو پنجاب میں بلوچی کو بلوچستان میں اور سندھی کو سندھ میں صوبائی زبان قرار دیا جاسکتا ہے۔ " (بحوالہ نوائے وقت مورخہ ۳۰ر جولائی ۱۹۷۲ء)

ہمیں سوچنا چاہیئے

یہی تو تھے وہ حالات اور خیالات جن کے تحت پرویز صاحب نے یومِ آزادی کی تقریب منعقدہ ۱۴ر اگست ۱۹۷۱ء پر کہا تھا کہ :

" کہیئے کہ جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہوا ہے اور اس میں اور جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس میں کچھ بھی فرق ہے ؟ اور اگر کچھ بھی فرق نہیں تو اس کا جو نتیجہ وہاں نکلا تھا وہی نتیجہ یہاں بھی برآمد نہیں ہوگا۔ ؟ ضرور ہوگا لیکن اِس فرق کے ساتھ کہ وہاں ایک آزاد مملکت قائم ہوئی تھی یہاں خیر سے چار آزاد مملکت قائم ہوں گی اور انہیں جس کا جی چاہے گا جھپٹ کر لے جائے گا۔ "

(ایضاً . . . .)

بہرحال یہ ہے ہماری وہ مہلک بیماری جس میں ہم ایک عرصہ سے گرفتار چلے آرہے ہیں۔

ہماری ناقدر شناسی

سوال یہ ہے کہ آخر قدم قدم پر یہ تمام قباحتیں اور محرومیاں کیوں پیدا ہوئیں اور آج ہماری یہ حالت کیوں ہے تو اِس کا جواب صرف یہ ہے کہ ہم نے عملی طور پر قائدِ اعظم کو وہ مقام عطا نہ کیا جس کی ان کی ذات حقیقی طور پر مستحق تھی۔ لہٰذا ۴۰ سال گذر جانے کے باوجود بھی ہم نے آج تک نہ تو پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب کی اور نہ ہی ہم قائدِ اعظم کی کوئی سوانح حیات نئی نسل کے سامنے پیش کر سکے۔ لہٰذا ہر آنے والا اُن

ہمیں اس منزلِ مقصود سے اور زیادہ دُور لے گیا جس کو حاصل کرنے کے لیے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا اور پھر اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم صرف اِس چمنستان کے لالہ و گل کی روح پرور خوشبو سے ہی محروم نہ رہے بلکہ دوسروں کے لیے دیدۂ تر کی لذت سے بھی ہمیں آشنائی حاصل نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں اپنی نئی نسل کو بھی اس قابل نہ ہونے دیا کہ وہ ان نعمائے خداوندی سے بہرہ ور ہوں۔ خدائے علیم نے شاید ہمارے جیسے لوگوں کے متعلق ہی کہا تھا کہ روزِ محشر ایسے لوگ بھی پیش کیے جائیں گے جن کے سروں پر اُن کے اپنے گناہوں کا بھی بوجھ ہوگا اور وہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اُٹھائے ہوئے ہوں گے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے متعلق مدیر جنگ لاہور مورخہ ۷ ار ستمبر ۱۹۸۵ء کو تحریر کرتے ہیں کہ :

"قائدِ اعظمؒ سے ہمارا سلوک

" ہماری ناقدر شناسی کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ ہم نے اپنی بداعمالیوں اور کوتاہیوں سے اِس ملک کو دونیم کر دیا۔ نیز خود قائد کی ذات بھی ہماری احسان فراموشی سے نہ بچ سکی۔ قیامِ پاکستان کے عرصہ بعد تک ان کی کوئی مستند سوانح عمری نہ لکھی گئی اور ایوب حکومت کو توفیق بھی ہوئی تو اس نے ایک غیر ملکی پیشہ ور سوانح نگار سے بھاری رقوم خرچ کرکے ایک متنازعہ اور نامکمل کتاب لکھوانے کے بعد فرض کر لیا کہ پوری قوم نے قائد کا احسان چکا دیا ہے۔

موجودہ حکومت نے اِس ادھورے کام کو مکمل کرنے کا بیڑہ اُٹھایا لیکن قائدِ اعظمؒ کے سابق سیکرٹری اور آزاد کشمیر کے سابق صدر جناب کے ایچ خورشید کا یہ انکشاف افسوسناک صورتحال کی غمازی کرتا ہے کہ گذشتہ آٹھ سال سے اِس مقصد کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کا صرف ایک اجلاس ہو سکا۔ اِس سے کام کی رفتار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کمیٹی کے ارکان مراعات کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ انہیں کچھ مشاہرے، کچھ الاؤنس، کچھ اعزازیئے بھی ملتے ہوں گے، انہیں کس حساب میں شمار کیا جائے گا۔ "

سچ کہا تھا ایک دانشور نے کہ " جو قوم اپنے محسنوں کو فراموش کر دے تو پھر اس میں محسن پیدا ہونے بند ہو جاتے ہیں۔ "

اِس مرض کا آخری علاج

اب آخر پر اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ آخر اس مرض کا علاج کیا ہے تو اِس سلسلہ میں ہمیں مندرجہ ذیل

نسخہ پر عمل کرنا ہوگا جو ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ :

"یہ علاج دو قسم کا ہوگا۔ ایک وہ جس کے اثرات فوری طور پر مرتب ہو جائیں گے اور دوسرا وہ جس کے نتائج کی نمود دیر میں جا کر ہوگی لیکن ہوگا وہ مستقل اور دیرپا۔ فوری اثرات کے لیے کرنے کا کام یہ ہوگا کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ :

(۱) پاکستان میں رہنے والے تمام مسلمان اسلام کی بنیاد پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ یہاں ایک سے زیادہ قوموں کا تصور رکھنا اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ غیر مسلم اس قوم کے افراد قرار نہیں پا سکیں گے۔

(۲) پاکستان کی مملکت اسلامی ہوگی۔ اس لیے یہاں سیکولر اسٹیٹ کا نظریہ رکھنا اور اس کی نشر و اشاعت کرنا مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

(۳) مملکت کی وحدت اور سالمیت کے خلاف کسی قسم کا نظریہ رکھنا اور اس کی اشاعت کرنا بغاوت قرار دیا جائے گا۔

(۴) پاکستان کی حکومت وحدانی انداز کی ہوگی۔ صوبوں میں الگ الگ۔

(۵) پاکستان کی قومی زبان ایک ہی ہوگی۔ مختلف زبانیں بولنے والے لوگ نجی طور پر اپنی اپنی زبانیں استعمال کرتے رہیں لیکن کسی جگہ بھی سرکاری زبان، قومی زبان سے الگ نہ ہوگی ایسا مطالبہ یا عمل مملکت کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔

(۶) بغاوت کی سزا خواہ وہ کسی شکل میں ہو موت، ضبطی املاک و مقبوضات ہوگی۔

جہاں تک دُور رس نتائج کا تعلق ہے :

(۱) ملک کا نصاب تعلیم پورے کا پورا بدلا جائے اور اسے از سرِ نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ طالب علموں کے قلب و دماغ میں یہ حقیقت علیٰ وجہ البصیرت راسخ ہو جائے کہ،

(الف) قرآن کریم انسانی زندگی کا واحد مکمل غیر متبدل اور آخری ضابطۂ حیات ہے۔ (قرآن کریم کو آخری ضابطۂ حیات تسلیم کرنے کا فطری اور منطقی نتیجہ ختمِ نبوت پر ایمان ہوتا ہے۔

(ب) مسلم قومیت کا مدار اسلام ہے اور رنگ، نسل، خون، زبان، وطن کی بنا پر تفریق یکسر خلاف اسلام ہے۔

(ج) وحدتِ اُمّت، وحدتِ ضابطۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ اِس لیے مسلمانوں میں نہ مذہبی فرقے ہو سکتے ہیں۔ نہ مختلف سیاسی پارٹیاں۔

(۲) قرآن کریم کو بنیاد تسلیم کرکے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جائے جو پاکستان کے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ العمل ہو۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ خطۂ زمین نہ صرف باقی اور محفوظ رہ جائے گا بلکہ ایسا مستحکم ہو جائے گا کہ کوئی دشمن اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ آپ اِس سے نہ گھبرایئے کہ ہم معاشی طور پر بہت کمزور ہیں۔ ہم میں اسلحہ کی کمی ہے۔ وسائل پیداوار غیر نشوونما یافتہ ہیں۔ یہ سب چیزیں اپنی جگہ ضروری ہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ مقدم حیثیت قوم کی وحدت اور یک جہتی کی ہے۔ قائدِ اعظم نے تحریکِ پاکستان کے آغاز میں کہا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم جو ہندو اور انگریز دونوں کے خلاف آہنی مہیب جنگ کرنے اُٹھے ہیں تو ہمارے پاس ساز و سامان کیا ہے۔ سُنیئے! "میرا یہ اٹیچی کیس (اور انہوں نے اس اٹیچی کیس کو اٹھا کر دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر اور میرا پرسنل اسسٹنٹ۔ یہ ہے ہمارا ساز و سامان"

(بحوالہ "قائدِ اعظم آپ کہاں؟" از پرویز)

سچ کہا تھا اقبال نے ؎

سبب کچھ اور ہے تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

خدا کرے کہ ہم اپنے سفر کا آغاز اِن خطوط پر کرتے ہوئے متاعِ دین و دانش کی ایک ایسی فلک بوس عمارت تعمیر کریں کہ جس سے ملّتِ اسلامیہ ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی اِس فردوسِ گم گشتہ کی سدا بہار، دل رُبا اور رُوح پرور فضاؤں سے ایک بار پھر لطف اندوز ہونے کے قابل بن جائے اور اِس طرح انسانیت کے جسم و جاں پر صدیوں سے افسردگی و پژمردگی، خوف و حزن، تباہی و بربادی، باہمی جنگ و جدل، انتشار و تفریق، حاکم و محکومی، دل و دماغ کی بے چینی، جہالت، توہم پرستی، احساسِ محرومی، غربت و افلاس کی دل خراش و اندوہناک داستانیں۔ غرضیکہ قدم قدم پر ہر قسم کی وہ تمام سلیں جن کے بوجھ سے انسانیت کی ہر قسم کی تعمیری اور رفعت آشنا صلاحیتیں اور دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی خواہشیں دب کر رہ چکی ہیں، ایک ایک کرکے پگھل جائیں اور انسانیت کا کاروانِ حیات اُس منزل کی طرف بڑھنا شروع ہو جسے قرآنِ حکیم نے صراطِ مستقیم کہہ کر پکارا ہے تاکہ وہ عظیم انقلاب جو اَب تک غیر محسوس طور پر ارتقائی

منازل طے کرتا چلا آرہا ہے نکھر اور اُبھر کر سامنے آجائے۔

لہٰذا دعا ہے کہ اس حسین و جمیل خواب کے لیے سرزمینِ پاکستان سے ایک ایسا نورِ آفتاب طلوع ہو جس کی سنہری کرنوں کی ضیا پاشیوں سے یہ پورا کرۂ ارض کچھ اس طرح منور ہو کہ اس جہانِ نو کے باعث آنے والی نسلیں علیٰ وجہ البصیرت پکار اُٹھیں کہ اے بارِ الٰہ اس وسیع و عریض کائنات کے تمام خزینے اور ان کا ایک ایک ذرّہ (جو سراپا انسان کے لیے تسخیر کر دیا گیا ہے) اور پھر یہ زندگی یہ سب کا سب واقعی بڑا حسین بھی ہے اور نعمتِ عظمیٰ بھی۔

آج کی دنیا میں ان مقاصد کا حصول کس قدر ضروری اور لازم ہو چکا ہے، اس کا اندازہ ہمیں آئندہ باب "دنیا کی حالتِ زار" کے مطالعہ سے ہو سکے گا جہاں ہم دیکھیں گے کہ قدرت جب انسان سے اس کی اپنی بداعمالیوں کے باعث اس سے اچھی صلاحیتیں چھین لیتی ہے تو پھر یہ حضرتِ انسان کس طرح "حیوانوں" کا سردار نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان ایڑیاں اٹھا اٹھا کر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا ہے ؎

بڑا غبار بڑی دھول سی ہے راہوں میں
کوئی چراغ جلا دے مری نگاہوں میں

علامہ اقبال نے اقوامِ عالم کی اسی کیفیت کے پیشِ نظر کہا تھا ؎

شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

"اقوامِ عالم میں اس وقت عجیب انداز کی شورش برپا ہے۔ ہر طرف انتشار و اضطراب، ہر طرف چیخ و پکار اور آہ و بکا۔ تو آ — اور اس جہنمی شورش کو متبدل بہ تسکین کر دے۔ اس اضطراب و خلفشار میں صرف تیرا ہی پیغام ایسا ہے جو اقوامِ عالم کے لیے فردوسِ گوش بن سکتا ہے۔" لہٰذا ؎

باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

"اس دنیا میں جہاں ہر قوم دوسری قوم کی تباہی کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے — تو پھر وہ بہار آفریں فضا پیدا کر دے جس سے ہر سمت صلح و آشتی کی بساط بچھ جائے — اس قسم کی جنگجو قوموں میں مصالحت کرا دینا، صرف اس قانون کی رُو سے ممکن ہے جس کا تو حامل ہوگا — ایسا صرف قرآن کے قانونِ ربوبیت سے ہو سکے گا۔"

(بحوالہ "مجلسِ اقبال" — جولائی ۱۹۵۶ء
طلوعِ اسلام - کراچی)

اُنیسواں باب

دنیا کی حالتِ زار

یہ زبوں حالی کیوں؟

آج دنیا کے دوسرے مذاہب کے پیروکار انسانوں میں جو مذہبی یگانگت نہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان کے درمیان بھی ان کی خود ساختہ فقہیں حائل ہیں۔ خواہ یہ فقہیں مذہبی ہوں یا مادی۔ لیکن خالص مادی فقہ پر عمل کرنے والے انسان تو پھر بھی اپنے لیے فکرِ معاش میں کسی حد تک ہم آہنگی اور آسانی پیدا کر لیتے ہیں لیکن جو قومیں انسانوں کی بنائی ہوئی مذہبی فقہوں میں اُلجھ کر رہ گئی ہوں وہ کسی قابل ہی نہیں رہتیں۔ آج ہمارا شمار کچھ اس قسم کی قوموں میں ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کی روشنی نہ ان کے پاس ہے اور نہ ہی ذہنی اور عملی طور پر ہمارے پاس۔ نتیجہ یہ کہ وحی کی اس ضیا پاشیوں سے محروم ہو کر آج پورا کرۂ ارض گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔ سچ ہے اگر نورِ آفتاب ہی طلوع نہ ہو تو رات کی تاریکی کے سوا اور کچھ ہوتا ہی کیا ہے؟ اور جب پوری نوعِ انسانی کا یہ جمِ غفیر نئی ٹیکنالوجی کے "زیور" سے مسلح ہو کر شاہراہِ حیات پر نکل کھڑا ہو تو رات کی اس تاریکی میں کس نفس کی جان محفوظ رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو خوف و حزن سے بچ سکے اور کون ہے جسے دل کا سکون میسر آئے؟۔ آج انسانی دولت کو جس قدر انسانیت کے قتل کے لیے صَرف کیا جا رہا ہے اگر اس کا مختصر ترین حصّہ اس کی فلاح و بہبود پر صَرف کیا جائے تو یہ کرہ ارض جنت ارضی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن اقبال کے الفاظ میں حالت یہ ہے کہ

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو

جبکہ نوعِ انسانی نے اجتماعی زندگی کا رُوپ اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ و مامون رہ سکے۔ بقول محترم پرویز صاحب کے کہ:

اجتماعی زندگی کا مقصد

"انسان نے جب دیکھا کہ وہ ان مخالف قوتوں کا جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں، اکیلا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس نے اکٹھے مل کر رہنے کا انداز زندگی اختیار کیا۔ یہیں سے خاندان

کی بنیاد پڑی۔ خاندان پھیل کر قبیلہ کی شکل اختیار کر گیا اور قبائل پھیلے تو اقوام بن گئے۔ اجتماعی زندگی کی ابتداء ہوئی تھی اس ضرورت کے ماتحت کہ اس طرح غیر انسانی قوتوں مثلاً جنگل کے درندوں یا ارضی و سماوی آفات و حادثات وغیرہ سے مدافعت کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ لیکن جب باہمی مفاد کا تصادم ہوا تو خود ایک خاندان دوسرے خاندان کا، ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا۔ اور ایک قوم دوسری قوم کی دشمن بن گئی۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۝ پھر اشتراکِ مفاد کے تحت ایسا بھی ہوا کہ کچھ خاندان ایک طرف اور کچھ دوسری طرف ہو گئے۔ بعض قبائل نے باہمی اتحاد سے دوسرے قبائل کے مقابل متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ کچھ اقوام باہمی معاہدات سے ایک گروپ میں شامل ہو گئیں اور دوسری اقوام، فریقِ ثانی بن گئیں۔ انسانی زندگی کی ساری تاریخ پر غور کیجئے وہ اسی قسم کی گروہ بندیوں اور فرقہ سازیوں کی مسلسل داستان نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ آج بھی جب کہ انسان بزعمِ خویش فلسفۂ اجتماع اور سیاست مُدن کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اقوامِ عالم ان ہی گروہ سازیوں کی ادھیڑ بُن میں مصروف تعمیر و تخریب ہیں۔ قومیت کی بنیاد آج بھی اسی طرح خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کے اشتراک پر ہے جس طرح انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں تھی۔ صدیوں کے تجربہ اور قرآن کے علمی سرمایہ کے باوجود، یہ ان حدود سے بلند نہیں ہو سکا اور اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔"

(بحوالہ تقریر ریڈیو پاکستان کراچی مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۴ء۔ طلوع اسلام اگست ۱۹۸۵ء)

اسلحہ کی تجارت

اب حالت یہ ہے کہ انسان کو شکار کرنے کے لیے صرف ۱۹۷۷ء تا ۱۹۸۱ء کے سالوں میں اسلحہ کی بین الاقوامی تجارت ۱۲۰ سے ۱۴۰ ارب امریکی ڈالر کے برابر تھی جبکہ اس تجارت کا دو تہائی سامان ترقی پذیر ممالک کے ہاتھ فروخت ہوا۔ نیز دوسری عالمی جنگ کے بعد اب تک دنیا میں ۱۳۰ چھوٹی بڑی جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ یہ سب کی سب جنگیں قریب قریب انہیں ترقی پذیر ممالک کے درمیان ہوئیں اور بڑے ممالک ان جنگوں میں براہ راست ملوث ہوئے۔

ایران اور عراق کی جنگ

جہاں تک دو مسلم ممالک ایران اور عراق کی جنگ کا تعلق ہے ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۳ء تک صرف ایران

کا جو نقصان ہوا وہ ۱۵۰ بلین امریکی ڈالر تک پہنچ چکا تھا جس کا اعتراف ایران کے بنک کے گورنر نے روزنامہ جنگ کے مشہور کالم نویس جناب ارشاد احمد حقانی سے ایک ملاقات کے دوران کیا۔ اسی جنگ کے سلسلہ میں امریکہ کے میگزین "ٹائم" کی ۱۱ راکتوبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت کے مطابق صرف پہلے دو سالوں کے عرصہ میں فریقین کے قریباً ۲ لاکھ سپاہی قتل ہوئے اور ستر ہزار قید کر لیے گئے۔

سائنس دانوں کی آہ و فغاں

قارئین عالمی سطح پر آنے والے دور کی ہولناکیوں کا اندازہ امریکہ کے ۵۰۰ سائنسدانوں کی اس رپورٹ سے لگا سکتے ہیں جو روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کی ۷ ردسمبر ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی اور وہ یہ کہ:

"اگر دو بڑی طاقتوں کے درمیان انسان کی بدنصیبی سے ایٹمی جنگ ہوئی تو کرۂ ارض کے کسی حصے پر بھی زندگی کے آثار باقی نہ رہیں گے۔ یہ خیال محض خوش فہمی ہے کہ بڑی طاقتوں کا ساتھ نہ دینے اور غیر جانبدار رہنے والے یا قطبی علاقوں اور سائبیریا کے برف زاروں میں بسنے والے لوگ ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ جائیں گے۔ ان سائنسدانوں اور ماہرین نے بتایا ہے کہ اگر جنگ کی ہولناکیوں سے بعض قومیں بچ بھی گئیں تو وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گی اور ایٹمی جنگ سے پیدا ہونے والے گرد و غبار اور زہریلی گیسوں کے بادلوں کے نتیجے میں رونما ہونے والی ہولناکیوں تاریکی اور شدت کی سردی ان کے جسموں کو زندگی کی آخری رمق سے بھی محروم کر دے گی اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پھر ہمارے نظام شمسی میں زندگی کا حامل یہ واحد سیارہ مزید کتنے کروڑ سال تک زندگی سے محروم رہے۔ کرۂ ارض کی تاریخ میں یہ زندگی کی متاع کا دوسرا بڑا المیہ ہوگا۔ غالباً چھ کروڑ سال پہلے اس وقت رونما ہوا جب اس سیارے پر کائنات سے بڑے بڑے شہاب ثاقب لاکھوں کی تعداد میں ٹوٹ کر گرے تھے اور ان شہابیوں کے گرنے سے زمین پر میلوں بڑے غار رونما ہو گئے تھے۔ اس وقت یہاں زندگی نے نسل انسانی کی شکل میں ارتقا کے مراحل طے نہیں کیے تھے بلکہ یہ ڈینوسار جیسے عظیم الہیئت جانوروں کی صورت میں کرۂ ارض پر موجود تھے۔ شہابیوں کی بارش سے زمین روئی کی طرح دھنکی گئی اور گرد و غبار کا جو بادل اٹھا ہوگا اس نے سورج کو کئی دنوں تک چھپائے رکھا۔ چنانچہ باقی ماندہ زندگی اندھیرے اور شدت کی سردی سے موت کے منہ میں چلی گئی اور پھر کروڑوں برس کا مزید عرصہ زندگی کو پھر سے نمو پانے میں صرف ہو گیا۔ ماہرین ارض اور ایٹمی جنگ کے ماہرین ایٹمی جنگ کی تباہ کاریوں کو شہابیوں کی لائی ہوئی

قیامت سے زیادہ ہولناک قرار دیتے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ میں اس موضوع پر ۵۰۰ سائنس دانوں کا اجتماع ہوا جس میں دو سال پہلے کے اس مفروضے کو غلط قرار دیا گیا کہ کرۂ ارض کے بعض حصوں میں کچھ لوگ ایٹمی جنگ کے اثرات سے بچ جائیں گے۔ ان سائنس والوں کا کہنا ہے کہ ایٹمی جنگ کے نتیجے میں شہر جنگل حتیٰ کہ دشت و بن جل اٹھیں گے۔ ان کے جلنے سے ہوا میں خوفناک حدت پیدا ہوگی جو دنیا بھر میں ہوا کا طوفان بنا دے گی اور یہ طوفان "تابکاری کو آناً فاناً نہ صرف دنیا کے ہر کونے میں بلکہ سینکڑوں میل اوپر زمین کے گرد محوِ گردش ہوا کے دھاروں کو بھی مسموم بنا دے گی۔ دھوئیں کے ایسے زہریلے بادل اور گرد و غبار کے طوفان اٹھیں گے کہ سورج مہینوں تک نظر نہیں آئے گا۔ اور یوں کرۂ ارض پر نہ صرف انسانوں اور جانوروں بلکہ پرندوں، نباتات اور حشرات الارض تک سے زندگی چھن جائے گی۔ ان سارے عوامل کے نتیجے میں موسموں میں ایسی خوفناک تبدیلیاں آئیں گی کہ ہر چیز تہس نہس ہو کر رہ جائے گی۔ حد یہ کہ زیرِ آب سمندری مخلوق تک نابود ہو جائے گی۔ اس ایٹمی جنگ کی متوقع تباہی کے علاوہ امریکی فوج نے لیزر شعاعوں پر مشتمل ایک ایسا ہتھیار تیار کیا ہے جو پیدل دستوں کو ایک میل دور سے ہی اندھا کر سکتا ہے۔ اس کے استعمال سے بصارت کا نظام تباہ ہو جاتا ہے اور جس کے بعد آنکھوں سے خون بہنا شروع ہو جاتا ہے اور امریکی انٹیلی جنس کا خیال ہے کہ روس بھی عنقریب اس سے ملتا جلتا ہتھیار بنا لے گا۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء)

نیوکلیئر کی بدولت دنیا بھر کی اس تباہی کا ذکر آج سے پانچ سال قبل سویڈن کے وزیرِ خارجہ نے بھی مجلس اقوامِ متحدہ میں ایک رپورٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا کہ اگر نیوکلیئر ہتھیاروں کا عشرِ عشیر بھی استعمال ہوا تو پوری دنیا کا ماحول زہر آلود ہو جائے گا۔ گرد اور آگ پورے آسمان کو ڈھانپ لیں گی اور تمام برِاعظم اس سے اتنے متاثر ہوں گے کہ سانس لینی مشکل ہو جائے گی۔ اور ایسی وبائیں پھوٹ پڑیں گی کہ اس کرۂ ارض پر زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس امر کی تصدیق دنیا بھر کے ۵۰۰ سائنس والوں کے علاوہ امریکہ کے مشہور رسالہ فارن افیئرز نے بھی ۸۴-۱۹۸۳ء کے ایک شمارے میں کی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی (امریکی ریسرچ سروس کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق) ۱۹۸۳ء میں امریکہ نے تیسری دنیا کے ممالک کو ۷ء۹ ارب ڈالر کے ہتھیار فروخت کیے۔ جبکہ روس نے اس سال ہتھیاروں کی فروخت میں ۸ء۷ ارب ڈالر کمائے۔

ربع صدی اور فوجی اخراجات

اور امریکہ کے ایوان نمائندگان نے ۱۹۸۶ء کے مالی سال کے لیے ۵ ء۳۰۲ بلین ڈالر

کی فوجی بجٹ کی منظوری دی اور اس میں سے ۵ء۷۰۲ بلین ڈالر سٹار وار کے لیے ہیں۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۸ فروری ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق دنیا بھر کے فوجی مصارف میں ربع صدی میں اتنا اضافہ ہوا ہے کہ وہ اقتصادی ترقی سے بڑھ گئے ہیں۔ یہ انکشاف ۱۹۸۶ء میں دنیا کی حالت" کے عنوان سے جاری ہونے والی رپورٹ میں لیا گیا ہے جو امریکی ادارے عالمی واچ انسٹی ٹیوٹ نے مرتب کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۶ء تک فوجی اخراجات ۴ کھرب ڈالر سے بڑھ کر ۹ کھرب ۴۰ ارب ڈالر تک پہنچ گئے اور روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت بابت ۲ جولائی ۱۹۸۶ء کے مطابق آج جنگی تیاریوں پر ایک منٹ میں بیس لاکھ ڈالر صرف ہوتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ہر سال ۴ ہزار بچے بھوک اور بیماری سے مرجاتے ہیں۔"

سویڈن حکومت کی رپورٹ

نیز جناب عبداللہ ملک جیسے نامور صحافی نے (سویڈن حکومت کی طرف سے ایک تازہ شائع شدہ رپورٹ جو" اسلحہ کی دوڑ اور اس کے اثرات" کے عنوان سے مرتب کی گئی تھی اور جو کئی جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے، کا حوالہ دیتے ہوئے) لکھا ہے کہ:

"اس رپورٹ میں انسانوں کی باہمی جنگ کے متعلق اعداد و شمار اور ہولناکیوں کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ واقعی دل ہلا دینے والا ہے۔ مثلاً اس نے ایک نقشہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے پورے چھ سالوں میں جو دونوں جانب سے آتشیں اسلحہ استعمال ہوا، اس کی مقدار ۳ میگاٹن تھی۔ لیکن اس وقت نیوکلیئر اسلحہ کی صورت میں جو آتش و آہن کی مقدار مختلف ممالک کے پاس موجود ہے اس کی مقدار ۱۸ ہزار میگاٹن ہے یعنی دوسری جنگِ عظیم سے ۶۰۰۰ گنا زیادہ ہے۔"

اس کے بعد عبداللہ ملک صاحب تحریر کرتے ہیں کہ:

"اس وقت سب سے زیادہ اسلحہ یورپی ممالک کے پاس ہے اور یہی وہ خطہ ہے جس کی تباہی لازمی ہے اس لیے یورپ والے لرزاں و ترساں ہیں۔ یورپ میں جو اس وقت نیوکلیئر ہتھیار، میزائل اور اس قسم کے جو دوسرے ہتھیار ہیں اور ان میں سے جو میزائل ہیں وہ ۱۰۰ کلومیٹر سے لے کر پانچ ہزار کلومیٹر تک مار سکتے ہیں یعنی پورا یورپ چند سیکنڈ میں ملبے کا ڈھیر ہو سکتا ہے۔ یہی حال فوجوں کا ہے، یعنی فوجوں کی نفری بھی اتنی تعداد میں کہیں اور موجود نہیں ہے، اس ضمن میں ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۴ء کے سال کے بارے میں جو اعداد و شمار مرتب کیے گئے تھے، ان کے مطابق نیٹو کے

پاس اس وقت ۴۲ لاکھ نفری کی فوج موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں وارسا[1] پیکٹ کے ممالک کے پاس ۴۷ لاکھ فوج موجود ہے، جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے نیٹو کے پاس ۲۰ ہزار ۷ سو ٹینک ہیں۔ جبکہ وارسا پیکٹ والے ممالک کے پاس ۲۵ ہزار ۵ سو ٹینک موجود ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱ اگست ۱۹۸۵ء)

نیوکلیر ٹیکنالوجی اور جنگ

نیز دنیا میں اس وقت ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے جو ذخیرے موجود ہیں وہ کرۂ ارض کو کئی بار جلا کر راکھ کر دینے کے لیے کافی ہیں اور اب تو خلا میں چھاؤنیاں قائم کی جا رہی ہیں۔

ایٹم بم کے استعمال کا ارادہ

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ایٹم بم بنانے کے لیے یورانیم کا ۹۰ فی صد افزودگی کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ بجلی پیدا کرنے کے لیے محض ۳ فی صد افزودگی کافی ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تیاری پر کس قدر کثیر رقم خرچ کرنا پڑتی ہے اور جہاں تک ایٹم بم کے ذریعے انسانیت کی تباہی کا تعلق ہے تو اگر کہا جائے کہ اس کی تباہی اور بقاء کا انحصار ایک انسان کے من کی لہر پر منحصر ہے" تو غلط نہ ہوگا۔ مثلاً روزنامہ جنگ لاہور بابت ۲۳ اگست ۱۹۸۵ء میں شائع ہونے والی اس خبر کے مطابق جاپان کے شہر ہیروشیما پر امریکہ کے ایٹم بم کے حملے کی ۴۰ ویں برسی کے موقع پر امریکی ہفت روزہ "ٹائم" کو انٹرویو دیتے ہوئے صدر نکسن نے کہا کہ:

" انہوں نے اپنے دورِ صدارت کے دوران چار موقعوں پر ایٹم بم استعمال کرنے کے بارے میں سوچا تھا۔ ٹائم میگزین کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "پہلا موقع ان کے صدر بننے کے فوراً بعد آیا جب انہوں نے ویت نام کی جنگ ختم کرنے کے لیے ایٹم بم استعمال کرنے کے بارے میں سوچا۔ دوسرے موقعے کا ذکر کرتے ہوئے صدر نکسن نے بتایا کہ ۱۹۷۳ء میں خلیج کی جنگ کے دوران جب روس نے مداخلت کی دھمکی دی۔ تیسرا موقع روس اور چین کے مابین سرحدی جھگڑے کا تھا جب انہوں نے سوچا کہ روس، چین پر ایٹم بم استعمال کر سکتا ہے،

---

[1] وارسا پیکٹ نیٹو کے مدِمقابل باہمی دفاعی تنظیم ہے جس میں سوویت یونین، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ، مشرقی جرمنی، ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور البانیہ (جو اَب علیحدہ ہو چکا ہے) پر مشتمل ہے۔

صدر نکسن کے مطابق چوتھا موقع ۱۹۷۱ء میں آیا جب پاک بھارت جنگ کے دوران اس بات کا خدشہ پیدا ہوا کہ چین اس جنگ میں مداخلت کرے گا اور روس اس کو کمیونسٹ دشمنوں کے خلاف بہانے کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ ہم کیا کرتے بس اتنا ہوتا کہ روس پر ایٹم بم گرا دیا جاتا۔"

ڈاکٹر عبدالقدیر صاحب کی اپیل

انہیں خطرناک حالات کے پیشِ نظر پاکستان کے نامور سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں صاحب نے کہا تھا کہ:

"ایٹمی طاقت بننے والے ممالک بین الاقوامی تحفظات قبول نہیں کر رہے جس سے دنیا میں اسلحہ کی دوڑ تیز ہو گئی ہے اور ایٹمی ٹیکنالوجی سے انسانیت کو لاحق خطرات میں اضافہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنے اور ایٹمی تباہی سے بچنے کے لیے اس وقت نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۲ جولائی ۱۹۸۵ء)

بڑھتے ہوئے جوہری خطرات

آج کرۂ ارضی پر جوہری ہتھیاروں کا پھیلاؤ کس قدر خطرناک صورت اختیار کیے جا رہا ہے اس کا اندازہ مئی ۱۹۸۶ء میں چرنوبل کے ایٹمی بجلی گھر میں ہونے والے حادثہ سے بخوبی ہو سکتا ہے جس کے متعلق جناب مدیر روزنامہ جنگ لاہور نے ایک اداریہ سپردِ قلم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"چرنوبل کے ایٹمی بجلی گھر میں رونما ہونے والے حادثہ کے بعد سوویت رہنما مسٹر میخائل گورباچوف نے قوم کو صورتِ حال سے آگاہی بخشنے اور حادثہ کے پس منظر پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ملکوں بالخصوص امریکہ سے اپیل کی ہے کہ اسے جوہری تجربات کو مزید آگے بڑھانے کے بجائے انہیں ختم کر دینے پر غور کرنا چاہیے۔ مسٹر گورباچوف نے دورانِ خطاب صدر ریگن کے اسٹار وار پروگرام کے سنگین خطرات پر روشنی ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ سوویت یونین خود بھی جوہری ہتھیاروں اور تجربات کے معاملہ میں امریکہ سے کم نہیں لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ جوہری اور خلائی تحقیق کے کاموں میں اس سال پے در پے رونما ہونے والے حادثات نے سوویت رہنما کو جوہری حادثات کے ناقابلِ تصور خطرات کا احساس دلا دیا ہے۔ واضح رہے کہ چرنوبل کے ایٹمی بجلی گھر کے حادثہ کے بعد بھارت، پولینڈ،

اور برطانیہ کے بجلی گھروں میں خرابی پیدا ہونے کی خبریں بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں اور صرف اس سال کے دوران امریکہ کے متعدد خلائی تجربات بالکل ڈرامائی انداز میں ناکام ہوکر رہ گئے ہیں۔ جوہری تابکاری کے نقصانات کی شدت کا اندازہ تو اس حقیقت سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ چرنوبل کے بجلی گھر سے خارج ہونے والی تابکاری کے اثرات امریکہ تک محسوس کیے گئے۔ اور اس تابکاری کے اخراج کو روکنے کے لیے بجلی گھر کے اِردگرد تعمیر کی جانے والی کنکریٹ کی موٹی دیواریں بھی کئی سو سال بعد ہی اس تابکاری کے اثرات کو یکسر زائل کرنے میں کامیاب ہوں گی۔

اِدھر امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے مختلف شہروں میں سینکڑوں ممتاز سیاسی، شخصیات، نوبل انعام یافتہ سائنس دانوں، ماہرینِ تعلیم، مذہبی رہنماؤں اور فوجی ماہرین نے دنیا بھر کی حکومتوں کے نام شائع کی جانے والی اپیل میں خلا کے جنگی استعمال کے خلاف اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے پر زور دیا ہے۔ خود امریکہ کے ۶۰۰۰ سے زیادہ سائنسدانوں نے جن میں پندرہ نوبل انعام یافتہ افراد بھی شامل ہیں اسٹار وار پروگرام کے بائیکاٹ کا اعلان کیا ہے۔ اور امریکی کانگریس کی طرف سے بھی اِس پروگرام کے لیے اخراجات کے تخمینہ میں زبردست کٹوتی کا رجحان ظاہر کرتا ہے کہ امریکی عوام کے نمائندے بھی جوہری اور دیگر خطرناک تحقیق و آزمائش کے لیے خلا کے استعمال کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ بہر حال مندرجہ بالا حقائق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جوہری تحقیق و تجربات کا سلسلہ کسی وقت بھی انسانی زندگی کے لیے ناقابلِ تصور خطرات کا باعث بن سکتا ہے۔ دنیا بھر کی حکومتوں کو یک زبان ہوکر جوہری تجربات پر یکسر پابندی اور جوہری ہتھیاروں کے مکمل خاتمہ پر زور دینا چاہیے۔ کیونکہ اگر کمپیوٹر کی ذرا سی غلطی ساری دنیا میں تابکاری پھیلا سکتی ہے تو کسی وقت خلا میں معلق جوہری ہتھیار اس کرۂ ارضی کو نیست و نابود بھی کرسکتے ہیں۔"

(بحوالہ اداریہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۹ مئی ۱۹۸۶ء)

آج سے ۱۴ سو سال پہلے نوعِ انسانی کو پکارتے ہوئے قرآنِ حکیم نے سچ کہا تھا کہ "دیکھنا تمہاری حالت اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور پھر اسے اپنے ہی ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔"

چین کی فوجی قوت

جہاں تک چین کا تعلق ہے آج چین امریکہ کی مدد سے اپنی ۴۴ لاکھ فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کرنے اور جدید ٹیکنالوجی کے لیے کوشاں ہے۔ بالفاظ دیگر:

"مشرق اور مغرب میں اسلحہ کی عالمی دوڑ جاری ہے اور ایسے حالات پیدا کیے جارہے ہیں کہ غریب قومیں ہتھیار خریدنے پر مجبور ہوجائیں۔ یورپ، امریکہ اور روس کی اپنی سرحدیں محفوظ ہیں مگر لاطینی امریکہ میں کشمکش جاری ہے۔ مشرق وسطیٰ میں الگ آگ لگی ہوئی ہے۔ بیروت میں قتلِ عام ہو رہا ہے کیونکہ اسرائیل لبنان پر اپنا تسلط چاہتا ہے۔ عراق اور ایران میں برادر کشی ہو رہی ہے۔ افغانستان میں شعلے بھڑک رہے ہیں اور جنوبی افریقہ میں مقامی باشندوں کو تہ تیغ کیا جارہا ہے۔"

(بحوالہ جنگ لاہور ۔ ۲۴ اگست ۱۹۸۵ء)

"لبنان کی خانہ جنگی جس کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا۔ مصالحتی کوششوں کے باوجود بند نہیں کرائی جاسکی اور اس جنگ کا المناک ترین پہلو یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کے مفادات کو پہنچ رہا ہے کیونکہ مسلمان آبادی مختلف گروپوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہے۔ لبنان کے دستور میں بھی مسلمانوں کو مختلف گروپوں اور فرقوں میں تقسیم کرکے اور انہیں محدود گروہی مفادات کا لالچ دے کر کمال چالاکی سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دیا گیا ہے۔"

مجموعی طور پر اسلحہ کی ان ہیبت ناکیوں کے جاننے کے بعد اگر اس موقع پر عالمِ اسلام کی بے بسی کا تذکرہ بھی کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ یہ بے محل نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں روزنامہ جنگ لاہور بابت ۲ اگست ۱۹۸۵ء کو مدیر جنگ نے اپنے کالم میں پاکستان کے حوالے سے عالمِ اسلام کی صورتِ حال کی جو تصویر کشی کی ہے وہ ہر مسلمان کے لیے ایک تازیانہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لکھتا ہے:۔

"عالمِ اسلام کی حالت

غیر بعض اوقات ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو اپنوں کو نہیں سوجھتی یا اپنے کہنا نہیں چاہتے ان دنوں گورو نانک یونیورسٹی امرتسر کے پروفیسر ڈاکٹر سریندر چوپڑہ یہ دیکھنے کے لیے عالمِ

اسلام کا دورہ کر رہے ہیں کہ اس میں پاکستان کا مقام و کردار کیا ہے۔ وہ اپنی اصل سے لاہور کے ہیں اس لحاظ سے پاکستان ان کا دیکھا بھالا اور بیتا برتا دیس ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے تاؤ تپش سے بھی ناواقف نہیں۔ انہوں نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بارے میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ترکی، شام اور مصر کے مطالعاتی دورے کے بعد انہوں نے یہاں بڑے تاسف کے ساتھ کہا کہ کہیں بھی کوئی ملک عالم اسلام میں پاکستان کے کردار پر تحقیق نہیں کر رہا۔ جہاں جہاں بھی میں گیا میں نے یہی دیکھا کہ مسلمان دانشور اور محقق اپنے اپنے ملکوں کے ساتھ امریکی روابط کے بارے میں مواد اکٹھا کر رہے ہیں اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی ممالک عالمی اسلامی اتحاد اور یک جہتی کے بارے میں نعرہ بازی کے سوا کچھ نہیں کرتے چنانچہ اس خواب کی عملی تعبیر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اگر عالم اسلام صحیح معنوں میں متحد ہو سکتا تو تیسری دنیا کے تمام ممالک کی سامراج دشمن جدوجہد کو تقویت ملتی۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ کہا دردمندی سے کہا اور اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔ پچھلے کچھ سالوں میں وحدت امہ کا چرچا شدت سے ہو رہا ہے مگر اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ ایران اور عراق میں گذشتہ پانچ برس سے برادر کشی جاری ہے۔ حالانکہ دونوں فریق مسلمان ہیں۔ بیروت میں خون کے دریا بہہ رہے ہیں۔ افغانستان میں دونوں سپر پاورز اپنے اپنے قومی مفادات کی شطرنج کھیل رہی ہیں۔ شام، لیبیا اور ایران ایک طرف اور مصر اور سعودی عرب امارات خلیج اور اردن دوسری طرف سیاسی طور پر متحارب ہیں۔ پاکستان، ایران اور ترکی کا اتحاد ثلاثہ ابھی تک بے ثمر رہا۔ انڈونیشیا، ملیشیا اور برونائی الگ تھلگ پڑے ہیں۔ اسلامی ملکوں کی تنظیم کچھ حاصل نہ کر سکی اور عرب لیگ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی ہے اس امر کے باوجود کہ عالم اسلام وسائل اور دولت سے مالا مال ہے۔ نہ اس میں دولت کی کمی ہے نہ افرادی قوت کا توڑا۔ ہماری ابتری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ملکوں کی حکومتیں غیر جمہوری ہیں جن کا طبقاتی اور گروہی مفاد تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک سپر پاور سے وابستہ رہیں۔ اور اس کی اطاعت کریں۔ عربوں کا سارا سرمایہ مغربی بینکوں میں جمع ہے اور امریکہ نے کہہ دیا ہے کہ ہم اس کو سونے کی شکل میں واپس نہیں کریں گے۔ چنانچہ وہ اس سے مغربی ساخت کی اشیائے صرف خریدنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے اللّوں تللّوں نے عربوں کی امیج خراب کر دی ہے اور اس سے عالم اسلام کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی گذشتہ حکومتوں نے عالم اسلامی کی مجموعی سائنسی اور ترقی کے لیے کچھ مشترکہ منصوبے مرتب کیے تھے مگر ان میں کوئی ٹھوس

پیش رفت نہ ہو سکی۔ اور اس کی وجہ بھی ترقی یافتہ صنعتی ممالک کا سیاسی دباؤ ہے جو عالمِ اسلام کی اقتصادی اور سیاسی خود مختاری کو اپنے لیے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں۔ ان کا ارادہ مشرقِ وسطیٰ کو اسرائیل کی رتھ میں جوتنے کا ہے۔ نفاذِ اسلام کی عالمی تحریک بھی رسوم و قیود تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ان حالات میں عالم اسلام کو پاکستان کے کردار پر تحقیق کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خود پاکستان میں اس سلسلے میں کوئی تحریک نہیں ہے۔ بھلا اب ڈاکٹر چوپڑہ کی بات پر کون کان دھرے گا۔"

کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

غیر پھرتا ہے لیے یوں تیرے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

ملتِ اسلامیہ کی دولت کا مصرف

مندرجہ بالا سطور میں یہ جو کہا گیا ہے کہ" عالم اسلام وسائل اور دولت سے مالا مال ہے۔ نہ اس میں دولت کی کمی ہے نہ افرادی قوت کی" تو یہ ایک حقیقت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ہاں اِس دولت کا مصرف کس طریق سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جاننے کے لیے مندرجہ ذیل خبر کا ایک ایک لفظ غور و فکر کا متقاضی ہے۔ تحریر ہے کہ:

" لندن۔ سعودی عرب کے حکمران شاہ فہد کے بھائی نے لندن میں ایک محل خریدا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ محل ملکہ کے بکنگھم پیلس کے بعد سب سے بڑا محل ہے۔ اِس محل کے ۶۰ کمرے ہیں۔ جو انہوں نے تقریباً چودہ کروڑ روپے میں خریدا تھا۔ شاہ فہد کے پاس خود بھی برطانیہ میں ایک محل ہے جس میں ۱۲ کمرے، ۱۵ بیڈ روم، ۱۶ باتھ روم، ۵ شراب خانے، زیرِ زمین سوئمنگ پول اور ماربل کا بنا ہوا ڈرائنگ روم ہے۔ اس محل کی قیمت ۵۰ کروڑ روپے ہے۔
ایک مقامی جریدے کے مطابق برطانیہ میں عربوں کی آباد کاری اور یہاں بڑی بڑی جائدادیں خریدنے کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے۔ ایک دور تھا جب وہ یہاں محض گرمی کی چھٹیاں گذارنے آتے تھے اور تھوڑی سی خریداری کرتے تھے۔ لیکن آج یہ عرب یہاں اربوں روپے کی جائیداد کے مالک بن چکے ہیں۔ برطانیہ میں گھوڑوں کے شائقین کا کہنا ہے کہ چھوٹے موٹے شائقین اِس کھیل سے کنارہ کشی کر رہے ہیں۔ کیونکہ عربوں کی شرکت کے ساتھ ایک عام شخص اِس کھیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایک عرب شیخ نے گذشتہ برس برطانیہ میں ۱۲ کروڑ روپے

کی خریداری کی۔ ایک سعودی شہزادے خالد عبداللہ نے برک شائر میں تیس کروڑ روپے مالیت کا "سٹڈ فارم" خریدا ہے۔"

اس کے بعد اخبار لکھتا ہے کہ:

معلوم ہوا ہے کہ ان عربوں نے یہاں کے سرکردہ ڈربی مالکان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں دو بھائیوں کے پاس ۵۴۰ گھوڑے ہیں جن میں سے ۳۰۰ گھوڑوں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ جبکہ ملکہ کے پاس صرف ۲۰ گھوڑے ہیں جو بہت زیادہ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ عرب ہر گھوڑے کی پرورش پر ۸ ہزار پونڈ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ گذشتہ دس برسوں میں برطانیہ میں گھڑ دوڑ کے کھیل میں اس وجہ سے بڑی تبدیلی آئی ہے۔ ایک اصطبل کے ایک گھوڑوں کی تربیت دینے والے شخص کا کہنا ہے کہ ایک عرب ریس جیتنے کے بعد اسے ایک ایسی گھڑی دے کر گیا جس میں بے تحاشا ہیرے جڑے ہوئے تھے اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ گھڑی نہیں بلکہ ایک فائر سٹیشن ہے۔ اسی طرح ایک ہوٹل میں ایک عرب نے دو ویٹریسوں کو اٹھائیس سو پونڈ ٹپ کے طور پر پیش کیے۔ برطانوی لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ آخر یہ عرب لوگ کب تک برطانیہ میں قیام کریں گے اور ان کی شاہ خرچیوں کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ برطانیہ کی حکومت کسی دن ان کی تمام املاک کو ضبط کر لے۔ چند عرب باشندوں نے برطانیہ میں ۱۳ ہزار ایکڑ پر مشتمل ایک سپورٹس سنٹر قائم کر رکھا ہے۔ ایک سٹڈ مینجر کا کہنا ہے کہ اتنی عربوں کو ہماری ضرورت نہیں جتنی ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ برطانیہ میں قطر کے ایک شاہی خاندان نے سینٹ جانز ووڈ میں ایک محل خریدا ہے جس کی مالیت بارہ کروڑ روپے کے قریب ہے ابوظہبی کے ولی عہد کے پاس بھی برطانیہ میں انتہائی شاندار محل ہے۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں عربوں کی کئی مارکیٹیں زیر تعمیر ہیں۔ متحدہ عرب امارات کے برطانیہ میں مقیم سفیر کے پاس برطانیہ میں ۱۳۳۰ ایکڑ پر مشتمل محل ہے۔

عمان کے سلطان کے پاس "وارگریو میز" ہے جو انہوں نے ہنگل بروکز سے خریدا تھا شارجہ کے حکمران کے پاس "ٹیمز لان" ہے۔ ابوظہبی کے شیخ زید کے پاس "بکٹڈ پارک" ہے جبکہ کویت کے وزیر دفاع کے پاس برطانیہ میں دس لاکھ پونڈ مالیت کا "ہالیڈے ہوم" ہے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ پہلے زمانے میں مہاراجہ بڑودہ اور آغا خاں جس طرح گھوڑوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے، آج کل یہ کام عرب کرتے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور۔ مورخہ ۸ راگست ۱۹۸۵ء)

اُونٹوں کی ریس کے لیے معصوم بچوں کا شکار

پاکستان کے مشہور اخبار روزنامہ جنگ لاہور کی ۱۶ ستمبر اور ۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں مع تصویر یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ اونٹوں کی ریس کے لیے معصوم بچوں کو ایمپلائمنٹ ویزوں پر دبئی لے جانے کی ایک کوشش ناکام بنا دی گئی۔ ان بچوں کی عمر ۳ سے ۵ سال تک تھی۔ تحقیقات کے دوران یہ سنسنی خیز انکشافات ہوئے کہ دبئی متحدہ امارات کی ریاست میں کھیلی جانے والی اونٹوں کی خطرناک ریس کے لیے معصوم بچوں کو وہاں لے جایا جاتا ہے اور مبینہ طور پر اس ریس کو اہم اور بڑی شخصیات شوق سے دیکھتی ہیں۔ اس ریس میں کمسن بچوں کو اونٹوں کی پشت سے باندھ کر ان پر ہنٹر برسائے جاتے ہیں۔ بچے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتے ہیں۔ اور بچوں کے رونے اور چیخنے کی آوازیں سن کر اونٹ تیزی سے بھاگتے ہیں اور اس دوران بعض بچے بندشیں کھل جانے کے باعث پیچھے آنے والے اونٹوں کے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں۔ جبکہ جیتنے والے اونٹ کی پشت سے بندھے ہوئے بچے کو طے شدہ معاوضے کے علاوہ انعام و اکرام بھی دیا جاتا ہے۔

یہ ہے آج کی مہذب دنیا کا وہ نقشہ جس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

امریکہ کی حالت

اس داستان کے بعد راقم کو امریکہ کی مثال پیش کرنا ہوگی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں شعبۂ صحافت پنجاب یونیورسٹی کے چیئرمین جناب پروفیسر ڈاکٹر مسکین حجازی صاحب کے ان تاثرات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کا اظہار آپ نے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۸۵ء کو ایک انٹرویو کے دوران کیا۔ آپ نے فرمایا:

> "امریکہ میں روزانہ دو ہزار اخبارات، آٹھ ہزار سے زائد رسائل، دس ہزار سے زائد ریڈیو سٹیشن اور گیارہ سو ٹیلی ویژن اسٹیشن ہیں۔"

اور پھر یہ کہ: "امریکہ ایک بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں اس کی ترقی حیران کن ہے۔ امریکی معاشرہ بحیثیت مجموعی خوشحال معاشرہ ہے۔ وہاں کے مثبت پہلو یہ ہیں کہ محنت، دیانت اور خوش اخلاقی ان کے طرزِ عمل کا حصہ بن چکی ہے اور صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں ہے ہر شخص پوری ایمانداری سے کام کرتا ہے۔ کام چوری، بددیانتی، رشوت، ملاوٹ ایسی برائیاں

ناپید ہیں۔ پورے نظام کی بنیاد مقابلہ پر ہے۔ فرد کا فرد سے اور ادارہ کا ادارہ سے مقابلہ ہورہا ہے۔ اور مقابلہ و مسابقت کی اس فضا میں ہر روز نیا علم تخلیق ہوتا ہے اور نئی ایجادات ہوتی ہیں۔ معاشرہ میں سماجی امتیازات نہیں ہیں، فرد کی آزادی اور احترام محض نعرہ نہیں، عمل کا حصّہ ہے"

لیکن اس کے باوجود جہاں تک ذہنی سکون کا تعلق ہے، تو آپ نے فرمایا :

" انفرادی آزادی کی انتہا نے مشینی کر زندگی کی بنیاد ہلا ڈالی ہے۔ "نظم" تہہ و بالا ہورہے ہیں۔ سچی خوشی کی تلاش میں تمام حدود پھلانگی جارہی ہیں۔ انسانوں کے ہجوم میں ہر شخص خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ رشتے کمزور ہوکر ٹوٹ رہے ہیں۔"

نیز یہاں کے ۴ لاکھ سے زائد امریکی تمباکو نوشی کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔

یہ اس ملک کی حالت ہے جہاں صرف صحافت کے شعبے میں ۵ ہزار طلباء و طالبات تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

قمار بازی کی وبا

واشنگٹن (جنگ فارن ڈیسک) کے مطابق آج امریکہ قمار بازوں کی قوم میں تبدیل ہورہا ہے، اور ایک امریکی اخبار کے مطابق قانون پر عملدرآمد کرنے والے وفاقی اداروں، جیل خانوں، اور تارکینِ وطن پر قابو پانے کے اقدامات پر مِلاجُلا کر اتنی رقم صَرف نہیں ہوتی جتنی امریکی شہری لاٹری کے ٹکٹوں، جوئے کی الیکٹرانک مشینوں میں سکے ڈالنے کی شکل میں داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ (بحوالہ "جنگ" لاہور مورخہ ۱۸ر جولائی ۱۹۸۵ء)

جنسی بدنہادی

اور بقول ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے کہ : " دولت کی بے نہایت اور بے تحاشا فراوانی کی وجہ سے جو اخلاقی مفاسد کسی معاشرے میں پیدا ہوتے ہیں، امریکہ بھی ان کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔ اور وہاں کی عظیم ترین اکثریت مذہبی، روحانی اخلاقیات کے اعتبار سے تہی دست اور دیوالیہ نظر آتی ہے۔ . . . . حیاسوز مناظر وہاں کے معمولات میں شامل ہیں۔ عریانی عام ہے۔ عصمت و عفت اور پاکداری کی وہاں سرے سے کوئی قدر ہی نہیں۔" (بحوالہ میثاق - اپریل ۱۹۸۱ء)

ضمناً جہاں تک امریکہ کے سامراجی نظام کے نتائج کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں جناب عبداللہ ملک صاحب جو امریکہ اور کینیڈا کے مطالعاتی دورے پر گئے تھے، اپنے "تاثرات" بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

" (اب) امریکہ کے اندر ایسے لوگوں کی کمی نہیں (رہی) جو امریکی نظام کو (اب) ایک سامراجی نظام

سمجھتے ہیں اور لاکھوں انسان اس سامراجی نظام کی مزاحمت میں مصروف ہیں (بلکہ) ایک ربع صدی پہلے صرف کیوبا میں یہ انقلاب کا لاوا بہہ نکلا تھا اور امریکہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس انقلاب کو بند نہ باندھ سکا تھا لیکن اب امریکہ کے چاروں طرف انقلاب کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور طوفان بہہ رہے ہیں۔ کہاں کہاں بند باندھے جا سکیں گے اور کہاں کہاں شعلوں کو دبایا جا سکے گا۔" (بحوالہ جنگ لاہور مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۸۵ء)

امریکہ کے ایک اہل قلم نے وہاں کی موجودہ نسل کو دیکھتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے اسے جناب پرویز صاحب مرحوم اپنی بلند پایہ کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"امریکہ کے مشہور اہل قلم (LEWIS MUMFORD) کا بیان ملاحظہ کیجیے۔ وہ اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں لکھتا ہے: امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم۔ لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں.... یہ نوجوان، یہ مہذب وحشی، حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل کر رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنبشی میلان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں.... یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب ہے تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی۔ اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی کی۔ حیوانی سطح کی لذتوں کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان لذتوں سے محروم کر دیجیے تو ان کے لیے جینا وبالِ دوش ہو جائے۔"

ہیروئن کے بعد کریک

جہاں تک امریکہ میں منشیات کے استعمال کا تعلق ہے، تو اس کے متعلق مندرجہ ذیل خبر ملاحظہ فرمائیں جو روزنامہ نوائے وقت میں مورخہ ۳ جون ۱۹۸۶ء کو شائع ہوئی:

"ابھی ہیروئن جیسی نشہ آور لعنت کی تباہ کاریاں اور ان کی روک تھام پر بحث جاری تھی کہ "کریک" کی لعنت نے تقریباً پورے امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ "کریک یا راک" کوکین کی ایسی صورت ہے جو نشہ تیز کرنے میں سابقہ تمام اشیاء کے ریکارڈ توڑ چکی ہے۔

کریک کو ایک مرتبہ استعمال کرنے کے بعد جی چاہتا ہے کہ اس کے یکے بعد دیگرے کش پر کش لگائے جائیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق کوکین سے حاصل کردہ نشہ آور مواد میں سے ہیروئن مہنگی ترین صورت تصور کی جاتی ہے لیکن اب ہیروئن کو بوجہ عسرت استعمال نہ کرنے والے لوگوں کی مصیبت بھی آسان ہوگئی ہے۔ امریکہ میں کریک کافی سستا نشہ ہے اور اسے ہر کوئی بہ آسانی استعمال کر سکتا ہے۔ امریکی ادارے نیشنل کوکین ہاٹ لائن کے مطابق اب تک ۲۵ ریاستوں کے تقریباً ایک ملین افراد کریک کو استعمال کرتے ہیں کریک نشہ کے متعلق تحقیق کرنے والے ماہرین کے مطابق اسے زیادہ تر ۲۰ تا ۳۵ سال کی عمر کے مرد حضرات استعمال کرتے ہیں اور ان میں سے نصف سے زائد تعداد کالے لوگوں کی ہے۔ ایسے مقامات جہاں پر ہیروئن سرِعام استعمال کی جاتی ہے اب وہاں پر کریک کا قبضہ ہے سکولوں و کالجوں کے نوجوان طلباء و طالبات پوری آزادی کے ساتھ اسے استعمال کرتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔

امریکہ جیسے ترقی یافتہ ترین ملک میں کوکین کا استعمال زیادہ معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ اکثر لوگ اسے عادتاً استعمال کرتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس وقت امریکہ میں روزانہ کوکین استعمال کرنے والے افراد کی تعداد ۵ ملین سے زائد ہے۔ کوکین کو باقاعدہ نشہ کی صورت اختیار کرنے میں تین یا چار سال درکار ہوتے ہیں جبکہ کریک ایسا خطرناک نشہ ہے کہ اس کا عادی بننے کے لیے فقط چھ تا دس ہفتے ہی کافی تصور کیے جاتے ہیں۔ طبی ماہرین کے مطابق کوکین بہت آہستہ آہستہ جلدی خلیات کی بیرونی تہہ سے جذب ہوتی ہے اور خون گردش میں آنے کے آٹھ منٹ بعد دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ اور پھر اس سے کریک سے کہیں کم درجہ کا نشہ حاصل ہوتا ہے جو کہ عام طور پر ۲۰ منٹ تک برقرار رہتا ہے۔ اس کے برعکس کریک کا دھواں چند سیکنڈ میں پھیپھڑوں سے ہوتا ہوا دماغ کو براہِ راست متاثر کرتا ہے۔ کریک نشہ کو بہت جلد وسیع پیمانے پر پذیرائی حاصل ہونے کی وجوہات میں سے ایک وجہ اس کا بہ آسانی استعمال ہو جانا بھی ایک اہم ترین وجہ ہے۔

کریک کا اثر نظام خون و قلب پر انتہائی حیرت انگیز حد تک جلدی ہوتا ہے کیونکہ اس سے خون کی نالیاں فوری طور پر سکڑ جاتی ہیں اور اس طرح آپ سانس کے فیل

ہو جانے کے لیے ہر وقت تیار ہوتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ منشیات پر کنٹرول کے امریکی حکام کی رپورٹ کے مطابق ۱۵ سے ۲۰ لاکھ تک امریکی کوکین کا باقاعدہ استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ ایک کروڑ ۸۰ لاکھ سے ۲ کروڑ تک امریکی چرس استعمال کرنے کے عادی ہیں۔"

امریکی معاشرہ کی اندرونی حالت

روزنامہ جنگ کے کالم نویس جناب منو بھائی کے کہنے کے مطابق:

"مصیبت کا وقت کسی قوم کے لیے کسی معاشرہ کے لیے آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں اس قوم یا اس معاشرے کی اہلیت ظاہر ہوتی ہے جس طرح کوئی دیوار گر کر سارا منظر ننگا کر دیتی ہے، اسی طرح کوئی حادثہ معاشرے کے اندر چھپے ہوئے حقائق کو واضح کر دیتا ہے۔ (غالباً ۱۹۸۴ء میں) امریکہ میں تھوڑے عرصے کے لیے بجلی کے غائب ہو جانے سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی اور جس سطح پر لوٹ مار اور بداخلاقی اور بدتمیزی کا بازار گرم ہوا تھا، اس کی تفصیلات کے باعث پڑھنے والوں کے دلوں سے امریکی معاشرہ کی اخلاقی حالت کا جنازہ نکل گیا تھا اور امریکی ذرائع ابلاغ، امریکی ٹیلی ویژن کے پروگراموں، اور وہاں کی فلموں نے اپنے معاشرہ کے اخلاقی معیار کی تشہیر سے ہمارے دلوں میں جو احترام اور قدر و منزلت پیدا کی تھی، وہ اس ایک رات کے اندھیرے کے واقعات نے دھو دی تھی۔ لیکن اب تو امریکہ کے شہر میکسیکو جس کا شمار دنیا کے مشہور اور خوبصورت شہروں میں ہوتا ہے اور جو اس وقت ایک کروڑ اسی لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے (ستمبر ۱۹۸۵ء) ۸، ۷ تک کے ہولناک زلزلے نے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کر دی ہے کہ المناک حادثے نہیں ہوتے بلکہ ان حادثوں کے بعد رونما ہونے والے واقعات ہوتے ہیں۔"

میکسیکو میں آنے والے زلزلے نے کس قدر قیامت برپا کی اور ان حالات میں وہاں کے مکینوں نے کس قدر اخلاق سوز حرکات کا مظاہرہ کیا، اس کا ذکر کرتے ہوئے جناب منو بھائی تحریر کرتے ہیں:

"نیو میکسیکو کے بحرالکاہلی ساحل کے علاقے میں زبردست زلزلے سے تین ہزار سے زائد افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور لاتعداد لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ ایک کروڑ اسی لاکھ کی آبادی کے شہر میکسیکو سٹی میں جو دنیا کے بڑے بڑے خوبصورت شہروں میں شمار ہوتا ہے، تباہی و بربادی کا خوفناک منظر پیش کر رہا ہے۔ ایک تہائی شہر تباہ ہو چکا ہے۔ سینکڑوں عمارتوں کا نام و

نشان مٹ چکا ہے۔ بڑے بڑے ہوٹل منہدم ہوگئے ہیں۔ گیس کے پائپ پھٹنے سے جگہ جگہ آگ لگ گئی ہے۔ پانی کی سپلائی معطل ہوگئی ہے۔ ہسپتال زخمیوں سے بھر گئے ہیں اور ادویات غائب ہوگئی ہیں۔ بجلی، پانی اور گیس کی معطلی کے علاوہ ٹیلی فون کے تمام عالمی رابطے منقطع ہوچکے ہیں۔ اس قیامت خیز تباہی کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ لٹیرے اور بدمعاش سرگرم عمل ہوگئے ہیں اور انہوں نے لوٹ مار اور عصمت دری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔"

سچ ہے کہ:

"آفت زدگی کے عالم میں تھوڑے سے وقت میں وہ کچھ ہوجاتا ہے، جو عام حالات میں "سلوموشن" میں ہوتا رہتا ہے۔"

مغربی قوموں کی معاشرتی زندگی کس قدر اجیرن بن چکی ہے اور ان کی اجتماعی حالت کس قدر ناگفتہ بہ حد تک تباہی کے کنارے کھڑی ہے تو ہمیں یہ جاننے کے لیے (امریکہ کے سلسلہ میں مسکین حجازی صاحب کے بیان کے بعد) رئیس امروہوی صاحب کی دانست کے مطابق یہ جان لینا چاہیے کہ "مغربی قوموں میں تو خاندانی نظام مکمل طور پر تباہ ہوچکا ہے۔ اولاد جوان ہوئی اور ماں باپ ان سے کنارہ کش ہوگئے اور ماں باپ بوڑھے ہوئے تو اولاد نے انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔"

اور پھر جناب ڈاکٹر صلاح الدین اکبر جیسے صاحب نظر کے کہنے کے مطابق:

"مغربی معاشرہ کے لوگ خوش حال ہیں، بہت آزاد ہیں مگر پھر بھی بہت پریشان ہیں۔ مادیت کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے لوگ یوگا اور ویدانت ہی نہیں گانجا اور ہیروئن تک میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ . . . مغربی جرمنی خوشحالی سے بے حال ہو رہا ہے۔ ناروے، سوئیڈن سیکنڈے نیوئین ممالک فری سوسائٹی ہے، اخلاقیات سے بے نیاز، گھر کے تصور تک سے ناآشنا ہو رہے ہیں۔ مگر سوچنے والے ذہن ہر جگہ سوچتے ہیں۔ اپنی موجودہ حالت سے بے زار و نالاں ہیں، راستہ ڈھونڈتے ہیں مگر انہیں راستہ نہیں ملتا اور روائتی مذہب کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔"

چین کی حالت

امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کی اس ظاہری اور باطنی کیفیت کو جاننے کے بعد اگر چین کی ازدواجی زندگی کے متعلق معلوم کرنا ہو تو ہمارے لیے بیجنگ خواتین کی فیڈریشن کی رپورٹ کے یہ الفاظ ہی کافی ہیں اور وہ یہ کہ:

"چین میں طلاق کے ۲۵ فیصد واقعات ناجائز تعلقات کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے طلاق کی شرح بھی بڑھ رہی ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۸۵ء)

جاپان میں خودکشی کا رجحان

امریکہ اور چین کے بعد جاپان کی مثال پیشِ نظر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہاں کی قومی پولیس ایجنسی کی سالانہ رپورٹ کے مطابق پچھلے سال ۲۵ ہزار افراد نے خودکشی کی۔ ان خودکشی کرنے والوں میں بوڑھے جاپانیوں کا رجحان زیادہ ہے۔ اور اس خودکشی کی بڑی وجہ مختلف بیماریوں سے تنگ آنا ہے۔

ہندوستان کی حالت

اس کے بعد بھارت جو آبادی کے لحاظ سے دنیا کے دوسرے درجے پر ہے تو وہاں کے ایک اخبار کے مطابق "بمبئی میں ایک مربع میل کے علاقے میں ایک لاکھ افراد بستے ہیں۔ پورے ملک کے انکم ٹیکس کا ایک تہائی حصہ اور کسٹم ڈیوٹی کا ساٹھ فی صد حصہ بمبئی سے وصول ہوتا ہے لیکن یہاں کی نصف آبادی یعنی پچاس لاکھ افراد جھونپڑیوں اور فٹ پاتھوں پر رہتے ہیں۔ کثیر آبادی، فضائی آلودگی اور پانی کی خرابی کی وجہ سے پیچش، ہیضہ، پیٹ کے کیڑوں میں مبتلا ہونے اور یرقان کی بیماریاں یہاں ہر سال وبا کی صورت میں پھیلتی ہیں۔" (جنگ لاہور ۷ اپریل ۱۹۸۴ء)

نیز بھارتی جریدے اکنامک اینڈ پولیٹیکل ویکلی نے انکشاف کیا ہے کہ "۱۹۸۳ء میں بھارت کی ستر کروڑ آبادی میں سے ۳۳ کروڑ ۹۰ لاکھ افراد غربت کا شکار تھے اور غریبوں کی آبادی میں ۹۰ لاکھ ۶ ہزار کس فی سال کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے۔ جب غریبوں کا سروے کیا گیا تو ان میں سے ۵۰ فیصد خوراک کی کمی کا سامنا کر رہے تھے۔"

اس سے ملتی جلتی صورتِ حال تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ملائشیا جنوبی امریکہ اور وسطی امریکہ کے ممالک میں پائی جاتی ہے۔

برطانیہ کا انحطاط

بھارت کے بعد برطانیہ کے انحطاط کے متعلق اگر معلوم کرنا مقصود ہو تو ہمیں رئیس امروہوی صاحب کا شکرگزار ہونا ہوگا جنہوں نے اس کی وضاحت ۲۶ جون ۱۹۸۴ء کو روزنامہ جنگ لاہور میں کچھ اس طرح کی ہے کہ:

> "آج اس صفِ اوّل کے ملک اور باشعور حقیقت پسند قوم کا حال کیا ہے؟ حکومتِ برطانیہ کے ہوم آفس کی ایک خصوصی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہروں کا عالم یہ ہے کہ بارہ فیصد آبادی رات کے وقت ڈاکوؤں، چوروں اور جرائم پیشہ افراد کے ڈر سے گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ رپورٹ میں اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں۔ شہر

کے اندرونی حصّوں میں ۴۰ فیصد خواتین مارے خوف کے اڑوس پڑوس میں بھی نہیں جاتیں، مبادا کسی مسٹنڈے کے ہتھے چڑھ جائیں۔ ۶۰ فیصدی عورتیں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں۔ جرائم کا نشانہ عموماً نوجوان بنتے ہیں۔ لیکن بوڑھے اور عورتیں زیادہ خوف زدہ رہتی ہیں۔ برطانوی ہوم آفس کی اس سروے رپورٹ کا خاتمہ اس روداد عبرت پر ہوا ہے کہ سماجی دہشت گردی کے سبب لوگ خانہ نشینی پسند کرنے لگے ہیں ؏ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ تھیٹر ویران ہو گئے۔ ریستوران رات کو اجاڑ ہو جاتے ہیں۔ شاپنگ سنٹرز کی رونقیں ختم ہو گئی ہیں اور لوگوں نے مغرب کے بعد چہل قدمی ترک کر دی ہے۔"

یعنی ؏ نہ زندگی ہے نہ موت۔ اس کے بعد آپ نے ایک آہ کے ساتھ کہا:

"یا الٰہی! یہ کہاں کا ذکر ہے؟ برطانیہ کا! جسے ہم پانچ چھ پشتوں سے قبلۂ تہذیب اور کعبۂ ترقی سمجھتے آئے ہیں۔ انگلینڈ سوشل ویلفیئر سٹیٹ ہے۔ بیروزگاروں کو گزارہ الاؤنس ملتا ہے۔ تعلیم و تربیت کے اعلیٰ ترین انتظامات موجود ہیں۔ معاشرے میں جمہوریت (وہ بوژروا جمہوریت ہی سہی) لبرل ازم، آزاد خیالی اور روشن فکری پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جو برطانیہ نشیب کی طرف لڑھکنا شروع ہوا ہے تو اب کسی ایک مقام پر نہ حکومت، سکالر، صنعت، تجارت، فنی تعلیم، تعلیم، ایجاد کاری، غرض ترقی و تکمیل کا کوئی گوشہ ایسا نہیں کہ برطانوی قوم کے نقشِ قدم نمایاں و فروزاں نہ ہوں۔"

دنیائے عالم کے متعلق عالمی ادارہ کی رپورٹ

مختلف ممالک کی اس صورتِ حال کے بعد دنیائے عالم کے سلسلہ میں عالمی ادارہ کی رپورٹ کے مطابق تو دنیا کی آبادی کا دس فی صد حصّہ معذور افراد پر مشتمل ہے اور اس تنظیم کے پیش کردہ کوائف کے تحت اس وقت دنیا میں معذور افراد کی تعداد تقریباً ۴۵ کروڑ ہے اور ان کا پانچ چوتھائی حصّہ ترقی پذیر ممالک میں آباد ہے۔ ان میں سے ۴ کروڑ افراد منشیات کے عادی ہیں۔ ایک کروڑ ذہنی امراض میں مبتلا ہیں جبکہ ٹروما (آنکھوں کے ایک مرض) سے کروڑ ۸۰ لاکھ اور ملاوٹ شدہ اشیاء کی وجہ سے ایک کروڑ افراد معذور ہوتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے کل معذوروں میں سے تیسرا حصّہ بچوں پر مشتمل ہے اور ہر سال ۵۷ ہزار بچّے پولیو میں مبتلا ہوتے ہیں اور پانچ کروڑ بچّے نظر سے محروم ہیں۔ (بحوالہ روزنامہ جنگ ۱۹۸۴ء)

— اور اسی ادارہ کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر سات سیکنڈ کے بعد ایک بچّہ نمونیہ کے باعث جاں بحق ہوتا ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں ہر سال ۵ لاکھ بچّے ۵ سال کی عمر میں پہنچنے سے پہلے ہی اس مرض کا شکار

ہوجاتے ہیں اور اس بیماری کی وجہ مکانوں کی حالتِ زار ہے کیونکہ تنگ و تاریک رہائش کی ناگفتہ بہ حالت کے باعث سانس کی نالی میں انفیکشن ہوجاتی ہے — اور اس صورت حال کے بعد دنیا میں منشیات جیسی مہلک وبا کے سلسلہ میں اقوامِ متحدہ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ:

"دنیا بھر میں منشیات کا استعمال تشویشناک حد تک بڑھ چکا ہے اور اگر ایک علاقہ میں کاروائی کی جائے تو دوسرا علاقہ اس کی جگہ لے لیتا ہے اور ۱۹۸۳ء میں اس تجارت کی شرح ریکارڈ تو ڑ رہی۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور - ۲۱ جنوری ۱۹۸۴ء)

جہاں تک اس کرۂ ارض پر بھوک اور افلاس کا تعلق ہے تو اس کے لیے صرف ایک ہی خبر کافی ہے کہ

"ایک سال کے عرصہ میں ترقی پذیر ممالک کے کروڑوں معصوم بچے بھوک سے دم توڑ گئے ہیں۔"

(جنگ لاہور - ۲۷ راکتوبر ۱۹۸۳ء)

سچ تو یہ ہے کہ

ننگی ہو کر ناچ رہی ہے بھوکی روحوں کی مجبوری
جھانک سکو تو جھانک کے دیکھو جسموں کے انبار کے پیچھے

اگر دیکھا جائے تو دراصل انسانیت کی یہ زبوں حالی، اختلاط، پریشان خیالی، جنسی بے راہ روی، اخلاق سوزی اور چاردیواری سے آزادی کا رجحان یہ سب کا سب نوعِ انسانی کی گروہ بندانہ زندگی کا ہی نتیجہ ہے جس نے آج چاروں طرف سے اُسے گھیر رکھا ہے — لیکن اس قدر اذیت ناک زندگی کے باوجود انسان کی حالت یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے نظام کی بنیاد خالقِ کائنات کی طرف سے عطا کردہ مستقل اقدار پر رکھے وہ خود ساختہ نظام کے پیدا کردہ مصائب و آلام سے تنگ آکر جھوٹے سکون کے حصول کی خاطر منشیات کا بڑی تیزی سے عادی بنتا جا رہا ہے۔

قرآن حکیم نے جو کہا تھا کہ اس ضابطہ حیات کے مل جانے پر تم عید مناؤ، مسرتوں کے جھولے جھولو۔ کیونکہ یہ وہ متاعِ گراں ہے کہ جو کچھ تم اکٹھا کرتے ہو یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے تو اس نے یہ دعوے ایسے ہی نہیں کر دیا تھا۔ اس میں تو ہر مرض کا علاج مضمر ہے اور اس میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ دل کے ٹکڑوں کو اس طرح یکجا کر دے جس طرح ایک مقناطیس لوہے کے ذرّوں کو یکجا کر دیتا ہے۔

پاکستان میں منشیات کا رجحان

اس کے بعد اب ہم پاکستان کی طرف آتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ   لو آج کی رات بھی سو چکے ہم

سو جہاں تک پاکستان کی حالت[1] کا تعلق ہے صرف اس کے صوبہ پنجاب میں ہیروئن استعمال کرنے والوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ ہے اور مختلف رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہیروئن کے نشے کا مرض وبا کی طرح پھیل چکا ہے اور پاکستان میں ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک آدمی نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ یہ ہے پاکستان کی صورتِ حال جسے جناب رئیس امروہوی صاحب نے بڑے کرب و سوز سے بیان کرتے ہوئے اپنے قارئین سے سوال کیا تھا کہ "آخر یہ سب کچھ کیوں ہے اور ان سے فریاد کی تھی کہ ــــــ اگر اس کیوں کا جواب مِل جائے تو شاید وہ سکون و اطمینان سے مر سکیں۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ مورخہ ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء)

اور پنجاب طبی کانفرنس کے صدر حکیم نور احمد اور جنرل سیکرٹری محمد سعید حسن صاحب نے روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۸۴ء کے مطابق فرمایا کہ :

"ایک طویل عرصے سے بالعموم اور گزشتہ ۳ سال سے بالخصوص ایک بین الاقوامی سازش کے تحت پاکستان پر منشیات کی یلغار کر دی گئی ہے۔ اس ملک کے پندرہ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے نوجوان کو جن میں محنت کش اور طالب علم شامل ہیں نہایت خاموشی سے منشیات کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ (اس وقت) ملک کا ہر ۱۹ واں شہری یا پانچواں نوجوان ــــــ نشے کا مستقل عادی بن چکا ہے اور ان اعداد و شمار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے" اور اب حالت یہ ہے کہ :

"پاکستان میں ۱۵ سال سے زائد عمر کے پانچ میں سے چار نوجوان تمباکو نوشی کرتے ہیں۔"

یہ تو ایک مسلّم حقیقت ہے کہ سگریٹ کے استعمال سے کینسر تک کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا بنانا اور بیچنا کیونکر حکماً بند نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ جواز کیا ہے، یہ جاننے کے لیے ہمیں روزنامہ جنگ لاہور بابت ۵ جنوری سنہ ۱۹۸۳ء کی حسب ذیل خبر دیکھنا ہوگی :

"چار ارب کی آمدنی

اعلیٰ سرکاری ذرائع سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ سال کے دوران

---

[1] آج پاکستان میں تعلیم و تربیت کی کیا صورت ہے؟ اس کی تفصیل جاننے کے لیے تعلیم کے باب کا مطالعہ کریں۔

[2] روزنامہ نوائے وقت مورخہ ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۸۶ء کی اشاعت کے مطابق خلیجی علاقے میں منشیات سے متعلق اداروں کے سربراہوں کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے صدر مملکت جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے فرمایا کہ پاکستان میں اس وقت منشیات کے عادی افراد کی تعداد تیس لاکھ سے بڑھ گئی ہے۔

پاکستان میں لوگوں نے ۳۷ ارب ۶۶ کروڑ ۵ لاکھ سگریٹ پیئے۔ جن کی مجموعی مالیت ۵ ارب ۶۵ کروڑ ۲ ۹ لاکھ روپے بنتی ہے۔ سگریٹ پینے والوں میں زیادہ تعداد دانشوروں اور دوسرے دماغی کام کرنے والوں کی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق گذشتہ سال کے دوران صرف سگریٹ پر سے حکومت کو تین ارب ۶۹ کروڑ ۴۸ لاکھ روپے کی ڈیوٹی حاصل ہوئی۔ سگریٹ پر اس وقت قابل وصول قیمت کا ۵۲ فی صد اور ۲۰ فی صد ڈیوٹی ہے۔ اس طرح سگریٹ کے پیکٹ سے جس کی قیمت دس روپے بنتی ہے، ۷ روپے ۷۰ پیسے حکومت کو ڈیوٹی ملتی ہے۔"

چنانچہ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا تھا کہ:

"جتنی حکومت اپنی تین چار ارب کی آمدنی کی خاطر قوم کو بالائے کر رہی ہے۔ باقی رہا ڈبیوں پر زہر لکھنا تو وہ محض بغرضِ حصول "ثواب" ہے۔"

یہ ہیں حالات اور حقائق جن کے پیشِ نظر روزنامہ جنگ کو اپنے اداریہ میں لکھنا پڑا کہ:

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا و طالبات

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات میں منشیات کے استعمال کے روز افزوں رجحان کے متعلق خبریں تو موصول ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن اس لعنت میں مبتلا طلبہ و طالبات کے متعلق کوئی جامع سروے رپورٹ اب تک تیار نہ ہو سکی۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ سوشل ورک کے پروفیسر ایس کے ایچ جعفری نے قابلِ تعریف کام کیا ہے۔ انہوں نے ایک سروے رپورٹ تیار کی ہے جس کے مطابق طلبہ کی ۳۳ فی صد تعداد چرس کی عادی ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ ڈائزی پام، مارفین، شراب، افیون اور لبریم بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس مد میں طلبہ روزانہ ۵ روپے سے لے کر ۴۰ روپے تک خرچ کرتے ہیں۔ منشیات کے عادی طلبہ میں سے ۵۵ فیصد کے اہلِ خاندان بھی کسی نہ کسی نشے میں مبتلا ہیں۔ گذشتہ چند سال سے ہر نوع منشیات کے استعمال میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوا ہے۔ یہ صرف کراچی یونیورسٹی کی سروے رپورٹ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی دوسری یونیورسٹیوں کے متعلق بھی اگر اس قسم کے سروے کا اہتمام کیا جائے تو بڑے ناقابلِ رشک اور افسوسناک اعداد و شمار منظرِ عام پر آئیں گے۔ اس سے اندازہ لگانا آسان ہو جائے گا کہ درسگاہوں کے حالات کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں۔"

روزنامہ نوائے وقت لاہور نے ۱۶ جولائی ۱۹۸۵ء کو جو اداریہ سپردِ قلم کیا وہ حسبِ ذیل ہے:

"ایک خبر کے مطابق روس اور روس کے حواری ممالک کی طرف سے افغانستان میں روس کی شراب "واڈکا" اور اسی قسم کی دوسری شراب کثیر مقدار میں بھیجی گئی ہے۔ کابل انتظامیہ اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ملحقہ علاقوں سے اس کو "خاد" کی مدد سے پاکستان منتقل کر رہی ہے۔"

اس اداریہ کے علاوہ جناب رئیس امروہوی صاحب نے اسی تاریخ کو روزنامہ جنگ لاہور جولائی ۱۹۸۵ء کی وساطت سے اپنے کالم میں ایک رپورٹ "نشیلی اندھی" کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ :

"آصف کمال پاشا نوجوان نسل کے باشعور فرد ہیں۔ سوچتے تو خوب ہیں ہی لکھتے بھی خوب ہیں۔ حال ہی میں میری درخواست پر انہوں نے اپنے چند فرض شناس، حقیقت پسند اور مسئلہ فہم ساتھیوں کے ساتھ مشہور زمانہ کیمیاوی مرکب "ہیروئن" کے استعمال، اثرات اور امکانات کا جائزہ لے کر ایک خالی از حیرت مگر پُر از عبرت رپورٹ مرتب کی ہے۔ انہوں نے اس جامع، غور انگیز رپورٹ میں اعتراف کیا ہے کہ آج سے پانچ سال قبل پاکستان میں نفسیات دانوں کے علاوہ کوئی شخص ہیروئن کے نام سے واقف نہ تھا۔"

اس کے بعد تحریر ہے کہ :

"پاکستان کی آئینی سرحدوں سے باہر پہاڑوں کی سنگلاخ وادیوں میں ہیروئن سازی کی بہت سی فیکٹریاں قائم ہیں۔ اور ان کی دن رات اس مستعدی سے نگرانی کی جاتی ہے جس طرح جنگی قلعوں پر پہرہ دیا جاتا ہے۔ آصف کمال پاشا نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ ہیروئن کا خاص نشانہ اور نشان کالج کے طلبہ اور طالبات ہیں۔"

اس کے بعد آپ نے لکھا کہ :۔

"منشیات کے موضوع پر آصف کمال پاشا اور ان کے رفقاء کی رپورٹ سے اس صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے جس سے یہ بدنصیب قوم دوچار ہے۔ آصف کمال نے ہیروئن کی ہوشربا مقبولیت کی وجہ درسگاہوں کی بندش اور نوجوانوں کی بیروزگاری کو قرار دیا ہے۔ بے شک ظاہری وجوہ یہی ہیں لیکن دوسری بے اعتدالیوں کی طرح، ہیروئن، چرس، مینڈرکس، راکٹ، بمباٹ اور اس قسم کی دوسری خمار انگیز دواؤں کے ہمہ گیر استعمال کے اسباب نفسیاتی اور خالص نفسیاتی ہیں۔ مثلاً وہ روحانی حبس جس سے ہر شخص کا دم لبوں پر آگیا ہے شدید ڈپریشن جس سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ زندگی سے بیزاری، تنہائی کا شدید احساس اور دولت وعسرت کے وہ تضادات جس نے معاشرہ کو معرکہ آرا حریفوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس ذہنی اور روحانی بحران کی شدت کو کم کرنے (غم غلط کرنے) کے لیے لوگ ہیروئن کی طرف لپکتے ہیں اور ہیروئن کا نشہ اس بحران کو گہرا اور شدید کر دیتا ہے۔ یہ ایک شیطانی چکر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس چکر سے کس طرح نجات پائیں گے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہونا کیا ہے؟"

ان انکشافات کے بعد روزنامہ جنگ لاہور بابت ۸ اکتوبر ۱۹۸۵ء کی مندرجہ ذیل خبر حالات کو جاننے کے لئے کافی ہے :

"ہیروئن بے بی"

نوجوان لڑکیوں میں، ہیروئن کا استعمال اس تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ اب پاکستان میں پہلی مرتبہ ایک ہیروئن کی عادی خاتون کے ہاں ہیروئن کا عادی بچہ پیدا ہوا ہے۔ اس بچے میں وہ تمام علامات پیدائش کے وقت سے ہی موجود ہیں۔ جو ہیروئن کے عادی افراد کو ہیروئن نہ ملنے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ ہیروئن کی عادی ماں کے پیٹ میں بچے کو ہیروئن کی مناسب مقدار خون کے ذریعے ملتی رہتی ہے اور بچہ پیدائش سے قبل ہی ہیروئن کے نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے بعد جب بچے کو ہیروئن کی فراہمی کا تسلسل ٹوٹتا ہے تو اس میں وہ تمام صلاحیتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ جو ہیروئن کے عادی افراد میں ہیروئن نہ ملنے سے پیدا ہوتی ہیں ۔۔۔ ہیروئن کے پیدائشی عادی بچوں کو "ہیروئن بے بی" کا نام دیا گیا ہے۔ پاکستان میں ہیروئن بے بی کی پیدائش کا یہ پہلا واقعہ ہے ۔۔۔ یہ بچہ سول ہسپتال کے شعبہ سائیکاٹری کے سربراہ ڈاکٹر ظہیر خان کے زیر علاج ہے جنہوں نے اس بچے کی ماں کا نام بتانے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ بچے کی ماں کا تعلق ایک بہت امیر اور با اثر خاندان سے ہے۔ یہ عورت خفیہ طور پر اپنا علاج ایک پرائیویٹ کلینک سے کرا رہی ہے۔ اس طرح کی اور کتنی مائیں ہیں جنہوں نے ہیروئن بے بی کو جنم دیا ہے یا دینے والی ہیں۔ اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ ہیروئن کی عادی حاملہ خواتین جن کی خاصی تعداد اس ملک میں ہے اپنا علاج ڈاکٹروں سے نہیں کراتیں۔ ڈاکٹر ظہیر نے بتایا کہ مذکورہ بچے کی پیدائش معمول کے مطابق ہوئی تھی۔ اس کا وزن بھی نارمل تھا مگر پیدائش کے اٹھارہ گھنٹے کے بعد اس میں ہیروئن کا نشہ نہ ملنے کے آثار نمایاں ہوئے جن کے زیر اثر اسے چھینکوں، انگڑائیوں، بخار، اسہال، ناک کی بلغم اور دودھ پینے میں مشکل کے عارضے لاحق ہوگئے تاہم فوری طور پر ان کا علاج کیا گیا اور صورت حال کو چند گھنٹوں میں کنٹرول کر لیا گیا۔"

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی پکار

چرس، افیون اور ہیروئن سمگل کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، ملک کے معروف ادیب، شاعر اور صحافی جناب احمد ندیم قاسمی صاحب روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۵ مارچ ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں تحریر کرتے ہیں کہ:

"چرس اور افیون اور ہیروئن سمگل کرنے کے معاملے میں بھی ہمیں "عالمی چیمپئن" سمجھا جاتا ہے جو لوگ یورپ اور امریکہ جاتے ہیں بتاتے ہیں کہ جب ہوائی اڈوں کے کاؤنٹر پر کھڑے ہوئے کسٹم کے اہلکاروں

کو معلوم ہوتا ہے کہ مسافر پاکستان سے آرہا ہے تو وہ بھڑوں کی طرح ہجوم کرکے آتے ہیں اور پاکستانی کو گھیر کر اس کے سامان کی اس قدر "جزئیات" کی حد تک تلاشی لیتے ہیں کہ مسافر کو شرم آنے لگتی ہے۔ جب بھی لندن یا نیویارک یا واشنگٹن یا پیرس میں نشہ بازوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پاکستانی ایرپورٹ پر اترا ہے تو وہ اس کے تعاقب میں لگ جاتے ہیں۔"

دسمبر ۱۹۸۶ء میں کراچی کے علاقے سہراب گوٹھ میں جو سنگین حالات رونما ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ منشیات کے اڈوں کو ختم کرنے کے لیے فوج تک کو طلب کرنا پڑا۔ ایک ارب روپے کا نقصان ہوا۔ سینکڑوں آدمی قتل ہوئے۔ بچوں کو آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ بنک لوٹے گئے۔ ٹرانسپورٹیشن جلائی گئیں اور نوبت کرفیو تک پہنچی۔ آپ اس صورتِ حال کو سامنے رکھیں اور اس کے بعد جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی درج ذیل تحریر پڑھیں جو آپ نے روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں تحریر کیں:

"یقین تو نہیں آتا مگر خبر ایک مؤقر اخبار میں چھپ چکی ہے اس لیے یقین کیے بغیر چارہ نہیں۔ خبر یہ ہے کہ کراچی میں سی آئی اے.... امریکی سی آئی اے" نہیں بلکہ ہماری اپنی "کرائم انویسٹی گیشن ایجنسی" نے چند روز تک قمار بازی اور منشیات فروشی کے خلاف چھاپے مارنے کی ایک مؤثر مہم چلائی مگر پھر چند روز بعد اس مہم کو "نامساعد حالات" کی وجہ سے.... بند کر دیا گیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ کراچی سنٹرل جیل میں پہلے ہی گنجائش سے زیادہ قیدی بند ہیں اور جیل کے حکام نے مزید قیدی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ پھر جب مزید قیدیوں کی کھپت ہی ختم ہو گئی ہے تو مزید مجرموں کو قیدی بنانا بیکار ہے۔ اس لیے فی الحال قمار بازی اور منشیات فروشی کو جاری رہنے دیا گیا ہے۔ جب جیل میں قیدیوں کی اسامیاں خالی ہوں گی تو دیکھا جائے گا۔"

ہمارا خیال ہے کہ اس تمام تر صورتِ حال کی وجہ ہمارا خود ساختہ غیر قرآنی نظام ہے۔ جس کے باعث آج ہم ہر سو اس قسم کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا جس وقت تک ہم معاشی بدحالی اور ہوسِ زر کی علت کو ختم کرنے کے لیے قرآنِ حکیم کی طرف رجوع نہیں کرتے اس وقت تک تمام انتظامی امور صدا بصحرا ہوتے رہیں گے۔

ذہنی دباؤ اور کھچاؤ کی بیماریاں

یہ حالات کیا رُخ اختیار کر رہے ہیں اس کے لیے طبی اعداد و شمار کے ادارے کا یہ انکشاف ملاحظہ فرمائیں کہ:

"گذشتہ چھ سال میں پاکستان میں ذہنی دباؤ، پریشانیوں، اعصابی کھچاؤ اور اعصابی دردوں کے لیے استعمال ہونے والی دوائیوں کی مقدار میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ ۸۴-۱۹۸۳ء کے مالی سال میں ۶۰ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے ایسی دواؤں پر خرچ کیے گئے جو صرف اعصابی دباؤ اور کھچاؤ کو دور کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ حالانکہ

۷۷-۱۹۷۸ء میں ان ادویات پر خرچ ہونے والی رقم تین کروڑ روپے تھی۔"

امراضِ قلب کی وبا

اور روزنامہ جنگ لاہور بابت ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کے اداریہ کے مطابق ملک کے ایک ممتاز ماہر معالج کے اس انکشاف نے اہلِ وطن کو چونکا دیا ہے کہ پاکستان میں اس وقت ایک کروڑ افراد مختلف امراضِ قلب کے مریض ہیں جبکہ عملاً ملک میں ایک ہزار معالجین قلب بھی موجود نہیں۔

امراضِ چشم

امراضِ قلب کے اس تذکرہ کے بعد پاکستان کے معروف معالج ڈاکٹر شریف ہاشمانی صاحب نے امراضِ چشم اور نابینا پن کے ضمن میں جو حقائق بیان کیے ہیں ان کے مطابق " پاکستان میں زیرِ تعلیم بچوں میں پچاس فیصد سے زائد آنکھوں کی کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق " پاکستان میں ہر سال پچاس ہزار افراد بصارت سے محروم ہو جاتے ہیں اور اس وقت ملک بھر میں نابینا افراد کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے جن کی بحالی کے لیے اوسطاً ۶۰ (ساٹھ) کروڑ روپے ماہانہ کی ضرورت ہے۔"

(روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ جولائی ۱۹۸۵ء)

ارشاد احمد حقانی صاحب کی دل سوزی

حقیقت یہ ہے کہ بقول ارشاد احمد حقانی صاحب کے کہ :

" نشے کا استعمال اور بے خودی کا ذوق ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جو لوگ حالات کے سبب مستقل مایوسی، تشدد پسندی، ہنگامہ آرائی میں بغیر کسی سبب کے تشویش اور خوف میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ذہنی الجھنوں، بیزاری، تشویش، خوف اور تباہ کن روحانی عذاب سے بچنے کے لیے یا خودکشی کر لیتے ہیں یا تشدد پسندی (قتل و غارت) پر اتر آتے ہیں یا غمِ دنیا کو بھلانے کے لیے نشے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ اور آج حالت یہ ہے کہ روحانی امراض کی یہ تینوں علامتیں یعنی تشدد، خودکشی اور نشہ ابھر کر معاشرہ کی سطح پر نمودار ہو گئی ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور پر سوچنا چاہیے کہ کہیں ہمارے فہمِ اسلامی میں تو کوئی جھول نہیں کہ ہم جوں جوں اسلام کا ذکر کر رہے ہیں۔ معاشرہ اصلاح پذیر ہونے کی بجائے بگاڑ کی زد میں آ رہا ہے۔ شراب کا بے تحاشا استعمال، مسرفانہ طرزِ زندگی، فحش فلموں کی وسیع مانگ اور مذہبی تنازعات کی گرم بازاری کا اس کے سوا کیا سبب سمجھا جاتا ہے کہ جن خطوط پر ہم اسلامائزیشن کر رہے ہیں ان میں کوئی بنیادی خرابی ہے۔ یہ صورتِ حال حکومت اور قوم کو سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے اور ہمیں اپنے تصورِ اسلام اور فہمِ اسلام پر ایک ناقدانہ نظر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۹ فروری ۱۹۸۴ء)

رئیس امروہوی صاحب کی پکار

ارشاد احمد حقانی صاحب کی اس پکار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہم جناب رئیس امروہوی صاحب کے دردِ دل کی آواز کو بھی سُن لیں جسے آپ نے روزنامہ جنگ کے حوالے سے ۲۶ جون کو ہمیں سُنانے کی کوشش کی اور وہ یہ کہ:

"یہ بڑا غور طلب مسئلہ ہے کہ ہم قوم کی حیثیت سے جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ بڑھاپا طاری ہوگیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل جو جو خواب دیکھے گئے تھے۔ جو جو خیال آرائیاں کی گئی تھیں۔ اسلامی طرزِ زندگی کے آئینے میں جس خوبصورت معاشرے کی جھلک دکھائی گئی تھی ان میں سے ایک چیز بھی نظر نہیں آئی۔ یہ ایسا مسئلہ نہیں جس پر سرسری نظر ڈال کر گزر جائیں۔ ہمیں سوچنا سمجھنا پڑے گا کہ اگر حال یہی ہے تو مستقبل کیا ہوگا۔"

المختصر امریکہ ہو یا چین، جاپان ہو مغربی جرمنی ہو، ناروے ہو سویڈن ہو یا ہندوستان یا پاکستان غرضیکہ دنیا کے تمام ممالک کی حالت یہ ہے کہ:

"ہماری موجودہ تہذیب، اپنے قومی، معاشی، عائلی اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔"

G.A. DORSEY IN CIVILIATION

اور اقبال کے الفاظ میں ــــ

نہ ایشیا میں نہ یورپ میں سوز و سازِ حیات
خودی کی موت ہے یہ اور وہ ضمیر کی موت

دنیا کی حالتِ زار کے سلسلہ میں جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا گیا ہے اسے آپ سامنے رکھیئے اور پھر ایچ۔ جے ہیکین ماہرِ سیاسیات کے وہ الفاظ سامنے لائیے جو کتاب کے شروع میں پیش کیے گئے ہیں اور وہ یہ کہ:

عقل و فکر کی ناکامی

"تمام ناکامیوں میں سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان اور سب سے زیادہ عقلمند ہے اور وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ اپنے لیے کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جا سکے۔"

(TREATISE OF RIGHT & WRONG

عقل کی فتوحات

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے جبکہ آج کے "انسان نے فطرت کی بڑی بڑی مہیب قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ اسباب رسل و رسائل اور ذرائع آمد و رفت کی محیر العقول برق رفتاری سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ سمندر اس کے تابع فرمان ہے۔ پہاڑ اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ زمین اس کے پاؤں کی

کروں سے اپنے دبے ہوئے خزانے اُگل رہی ہے۔ آسمان کی بجلیاں اس کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ ایٹم غیر مرئی حیاتی توانائیاں اس کی مٹھی میں ہیں۔ وہ چاند اور سورج کو اپنے زیر دام لا رہا ہے۔ وہ کہکشاں پر کمندیں کی سوچ رہا ہے۔ انسان کو اپنی ساری تاریخ میں، کبھی اس قدر کائنات گیر قوت حاصل نہیں ہوئی تھی۔"

(مفہوم القرآن۔ ص از پرویز)

اور دوسری طرف کرہ ارض کا کوئی کونہ ایسا نہیں جس کا کوئی ذرہ انسانیت کے خون سے رنگین نہ ہوا ہو تو کا جواب اور وجہ جواز یہ ہے کہ "ہم نے زندگی کی ابتدا سائنس کی کاری گری سے کی۔ اس وثوق کے ساتھ دی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسایل اتنے آسان نہیں۔" سے

حقیقت کا اعتراف

اور اس حقیقت کا اعتراف اہل یورپ کے ایک دوسرے مفکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سلجھ سکتیں۔۔۔ اس لیے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنانا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PERSONALITY) نہیں ہے۔ عقل، اسباب و ذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے اندھی ہوتی ہے۔" ایضاً

مندرجہ بالا ہر دو اقوال کی تشریح کرتے ہوئے جناب پرویز صاحب (مرحوم) اپنے "مفہوم القرآن" تحریر کرتے ہیں کہ:

"انسانی عقل، فطرت کی قوتوں کو تو مسخر کر سکتی ہے لیکن انسانی معاملات کا اطمینان بخش حل دریافت نہیں کر سکتی۔ یہ اس کے دائرہ منصب سے باہر کی چیز ہے۔ انسانی معاملات کے حل کے لیے ضروری ہے کہ یہ متعین کیا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد اور نصب العین کیا ہے۔ افراد اور اقوام کے مفاد میں تصادم کیوں ہوتا ہے اور اسے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ کونسی چیز عالمگیر انسانیت کے لیے منفعت بخش ہے اور کون سی مضرت رساں۔ نوع انسان میں مشترک اقدار کونسی ہیں اور ان کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان اقدار کی حفاظت کیوں ضروری ہے۔ انسان کے بنیادی حقوق کیا ہیں اور ان حقوق کا تحفظ کس طرح ممکن ہے۔ ان امور کا تعین، عقل، اور اس کے مظاہر، علوم سائنس کے بس کی بات نہیں۔ سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے" وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"

اس لیے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رُو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں۔ (لیکن یہ اُن کی غلطی ہے) . . . سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو، اقدار، خیر و شر، نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے۔"

عقل سوال کرتی ہے

لہٰذا اب جبکہ عقل کے بس کی یہ بات ہی نہیں کہ وہ نسلِ انسانی کے لیے غیر متبدل اصولوں کی کوئی محکم چٹان مہیا کرے جس پر ہر آنے والی نسل بلا خوف و خطر محفوظ و مامون اپنے پاؤں ٹکا سکے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (۱) آخر انسانیت کس کے در پر دستک دے؟ (۲) اپنی اجتماعی زندگی کے لیے وہ منزہ اور مشہود اصول جو ہمیشہ کے لیے غیر متبدل بھی ہوں کہاں سے حاصل کرے؟ جن کو اپنانے کا نتیجہ جنتِ ارضی کی شکل میں نکل سکتا ہو؟ (۳) نیز وہ ان پر کس طرح یہ ایمان لائے کہ ان اصولوں پر عمل پیرائی کا نتیجہ یقینی طور پر سربلندی اور سرفرازی کی شکل میں نکلے گا!

خدا تعالیٰ کا جواب

تو اس کا جواب ہمیں خدا تعالیٰ کی طرف سے بآوازِ بلند یہ ملتا ہے کہ:

"جس خدا نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا۔ اسی نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے کہ ان اشیاء کو بتائے کہ ان کی منزلِ مقصود کونسی ہے اور وہ اس منزل تک کس طرح پہنچ سکتی ہیں۔" ۲۰/۵۰

بلکہ پژمردہ اور افسردہ انسانیت کو یہاں تک فرمایا کہ (اگر تمہاری حالت مٹی کے گھروندے کی سی ہو چکی ہے تو پھر بھی)

"وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۸) تم تباہی بربادی کی مہیب قوتوں سے مت خوف کھاؤ۔ تاریک مستقبل کی اندوہناکیوں اور ہلاکت سامانیوں سے مت گھبراؤ۔ جی نہ چھوڑو۔ حوصلہ نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو۔ میں جو نظام پیش کرتا ہوں اس کی صداقت پر بھروسہ کر کے دیکھو۔ کہ تم شکست و ریخت کی ان تمام قوتوں پر غلبہ پا کر کس طرح خاک کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچتے ہو۔"

قرآن حکیم اپنے اس دعوے کی صداقت کے لیے ستاروں کی شہادت پیش کرتے ہوئے سورۃ نجم کے شروع میں فرماتا ہے کہ:

ستاروں کی مثال

"(ان) لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ وحی کی جس راہنمائی کی طرف انہیں دعوت دی جا رہی ہے، وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ وہ سفرِ زندگی میں کہیں دھوکا تو نہیں دے جائے گی؟ وہ غلط راستے پر تو نہیں ڈال دے گی؟ وہ کسی مقام پر جا کر ساتھ تو نہیں چھوڑ دے گی؟ اِن سے کہو کہ جب تم راتوں کو صحرا میں سفر کرتے ہو، جہاں کوئی پختہ راستے یا نشاناتِ راہ نہیں ہوتے، تو تم اپنی راہ نمائی کہاں سے حاصل کرتے ہو؟ تم ستاروں کو دیکھ کر اپنا رُخ متعین کرتے ہو۔ تم بتاؤ کہ اِن کی راہ نمائی کے متعلق تمہارا تجربہ کیا ہے؟ کیا ان کی راہ نمائی قابلِ اعتماد ہے یا یہ اپنی روش بدل کر دھوکہ بھی دے دیتے ہیں؟ کیا یہ مستقلاً تمہاری راہبری کرتے ہیں یا کبھی ساتھ بھی چھوڑ دیتے ہیں؟ تمہارا جو جواب ستاروں کے متعلق ہے وہی جواب وحی کی راہ نمائی کے متعلق سمجھ لو، اس لیے کہ اس رسولؐ کو وحی بھی وہیں سے ملتی ہے جہاں سے ستاروں کو اپنی محکم روش پر چلے جانے کی وحی ملتی ہے۔ $\frac{۶}{۹۸}$، $\frac{۵۶}{۷۵}$ "

(مفہوم القرآن۔ از پرویز)

کائناتی معجزات

قرآن حکیم اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کی خاطر کائنات کے محیر العقول سلسلہ کی مزید مثالیں پیش کرتا ہے تاکہ انسان اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اِس خارجی دنیا میں جو قوانین جاری و ساری ہیں، وہ کس قدر حُسن و خوبی سے نتیجہ خیز ہو رہے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس لیے بھی بیان کیا گیا تاکہ کسی نہ کسی طرح انسان علیٰ وجہ بصیرت پکار اُٹھے کہ "انسانی عقل کو وحی کی راہ نمائی اتنی ہی ضروری ہے جتنی انسانی آنکھ کو سورج کی روشنی" چنانچہ فرمایا کہ:

"بلا شبہ آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات دن کے، ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں اور کشتی میں جو انسان کی کار برآریوں کے لیے سمندر میں چلتی ہے، اور بارش میں جسے اللہ آسمان سے برساتا ہے، اور اس کی آبپاشی سے زمین مرنے کے بعد پھر جی اٹھتی ہے، اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہواؤں کے (مختلف رُخ) پھیرنے میں، اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں، اُن لوگوں کے لیے

جو عقل و بینش رکھنے والے ہیں بڑی ہی نشانیاں ہیں ۔ ۲/۱۶۴

اس کے بعد اسی قسم کے دل نشین انداز میں دوسری جگہ فرمایا کہ :

"خدا وہ ہے جو بادلوں سے پانی برساتا ہے۔ اس میں سے کچھ تو تمہارے پینے کے کام آتا ہے۔ کچھ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے درختوں کے جنگل پیدا ہو جاتے ہیں، اور تم اپنے مویشی ان میں چراتے ہو! اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (ہر طرح کے غلّوں کی) کھیتیاں بھی پیدا کرتا ہے۔ نیز زیتون، کھجور، انگور اور ہر طرح کے پھل، یقیناً اس بات میں اُن لوگوں کے لیے ایک بڑی نشانی ہے جو غور و فکر کرنے والے ہیں! اور (دیکھو) اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند مسخر کر دیئے (جو تمہاری کار برآریوں) کے لیے کام کر رہے ہیں) اور اسی طرح ستارے بھی اس کے حکم سے تمہارے لیے مسخر ہو گئے ہیں، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں! اور زمین کی سطح پر طرح طرح کے رنگوں کی پیداوار جو تمہارے لیے پیدا کر دی ہے (اس پر غور کرو) بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک نشانی ہے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں!"

لیکن یہ سب کچھ سننے اور سمجھنے کے باوجود اگر کسی قسم کی کوئی تشنگی باقی ہو تو خالقِ کائنات کی طرف سے دی گئی رہنمائی کی اس آواز کو سُن لینا چاہیے کہ :

"یہ اللہ ہی ہے جس نے اجرامِ فلکی کو بلند کر دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ کوئی ستون انہیں تھامے ہوئے نہیں ہے اور ساری کائنات کا مرکزی کنٹرول اسی کے ہاتھ میں ہے اور سورج اور چاند کو کام پر لگا دیا۔ کہ ہر ایک اپنی ٹھہرائی ہوئی میعاد تک (اپنی اپنی راہ) چلا جا رہا ہے وہی (اس تمام کارخانۂ خلقت کا) انتظام کر رہا ہے اور (اپنی قدرت و حکمت کی) نشانیاں الگ کر کے بیان کر دیتا ہے تاکہ تمہیں اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کا یقین ہو جائے۔ اور (دیکھو) وہی ہے جس نے زمین کی سطح پھیلا دی۔ اس میں پہاڑ بنا دیئے، نہریں جاری کر دیں، اور ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے دو دو قسموں کے اُگا دیئے۔ اُس نے رات اور دن (کے بتدریج ظاہر ہونے) کا ایسا قاعدہ بنا دیا کہ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی ڈھانپ لیا کرتی ہے، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے کتنی ہی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرنے والے ہیں! اور (دیکھو) زمین میں (طرح طرح کے) قطعات ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ان میں انگور کے باغ ہیں (غلّہ کی) کھیتیاں ہیں کھجور کے درخت ہیں، باہم گر ملتے جلتے ہوئے، اور بعض ایسے کہ ملتے جلتے نہیں ہیں

سب ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ مگر ہم بعض پھلوں کو بعض پر برتری دیتے ہیں، یقیناً اس بات میں ان لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔" ۱۳/۴-۲

اس کے علاوہ قدرت نے یہ نغمہ سرائی اس طرح بھی کی کہ :

"خدا وہ ہے جس نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو روشن، اور پھر چاند کی منزلوں کا اندازہ ٹھہرا دیا، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ نے یہ سب کچھ حکمت و مصلحت کے ساتھ بنایا ہے اور ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، وہ (اپنی قدرت و حکمت کی) دلیلیں کھول کھول کر بیان کر دیتا ہے، بلاشبہ اس بات میں کہ رات کے پیچھے دن اور دن کے پیچھے رات آتی ہے، اور بلاشبہ ان تمام چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں میں اور زمینوں میں پیدا کی ہیں۔ ان لوگوں کے لیے (قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں۔" ۱۰/۶-۵

اور آخر پر اس حیوان ناطق کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے حیوانوں کی مثال دے کر فرمایا کہ :

"وہ پروردگار جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھا دی۔ نقل و حرکت کے لیے اس میں راہیں نکال دیں۔ آسمان سے پانی برسایا، اس کی آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دیئے کہ خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی نشانیاں ہیں۔" ۲۰/۵۴-۵۳

اس حسن کی وجہ جواز

خارجی کائنات کے متعلق ان بیان کردہ قرآنی حقائق کو اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ رموز و اسرار جنہیں خالقِ حقیقی نے ۱۴۰۰ سو سال پیشتر اس قدر واضح اور بلیغ انداز میں بیان کیا تھا وہ آج سائنسی انکشافات کے سامنے کس خوبصورتی کے ساتھ ایک ایک کر کے پورے اتر رہے ہیں۔ دراصل خارجی کائنات کے سلسلہ میں یہ تمام تعمیری نتائج ان قوانین کے ہی رہینِ منت ہیں جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں۔ نیز یہ بھی امر واقع ہے کہ ان تمام کے تمام محکم اور غیر متبدل قوانین کے بنانے میں کسی انسانی عقل کا کوئی عمل دخل نہیں اور نہ ہی انسانی عقل ان قوانین میں کسی قسم کا کوئی حک و اضافہ کرنے کی مجاز ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر اسی ہستی کی طرف سے خارجی کائنات کی طرح انسانی معاشرہ کو حسن و خوبی کے ساتھ چلانے کے لیے کوئی مستقل قوانین نوعِ انسانی کو عطا کر دیے جائیں تو یہ قوانین بھی یقینی طور پر ویسے ہی نتائج پیدا کریں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آج کی تباہ حال انسانیت کو ایسی ہی راہنمائی کی ضرورت ہے جسے وحی کے الفاظ سے پکارا جاتا ہے۔ اور جو آج قرآن حکیم کے اندر اپنی انتہائی اور مکمل شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے۔ یہی وہ وحی ہے جو نوعِ انسانی کو ایک ایسے حو بصورت اجتماعی نظامِ زندگی سے متعارف کراتی ہے جس کی صدا بہار شاخیں نہ تو کبھی خزاں آشنا ہوئی ہیں اور نہ ہی اُن کی جاذبیت کبھی ماند پڑی ہے۔ لہٰذا وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں انسانی عقل کبھی وضع نہیں کر سکتی لیکن ان پر عمل پیرائی کے لیے انہیں سمجھ تو پا سکتی ہے کہ یہ جو کچھ دیا گیا ہے، وہ بالحق ہے۔

سابقہ اقوام اور مقامِ عبرت

اوپر بیان کردہ کائناتی معجزات بھی اگر کسی کے ذہن میں بلندیٔ افکار پیدا نہ کریں تو خالقِ کائنات ایسے لوگوں کے سامنے سابقہ اقوام کے احوال و کوائف بطورِ شہادت پیش کرتا ہے تاکہ وہ یہ یقین کر لیں کہ ان مستقل اقدار کا انکار قوموں کے عروج و زوال پر کیا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"(اے رسول! کیا ان مخالفین پر) یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ ہم نے ان سے پہلے (اسی قانونِ مکافات کی رو سے) کتنی قوموں کو تباہ کر دیا (جنہوں نے ہمارے قوانین سے سرکشی اختیار کی تھی) اور جن کی بستیوں میں اب یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یقیناً (ان تاریخی شواہد میں) ان لوگوں کے لیے (حقیقت تک پہنچنے کی) نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتے ہیں۔" ۲۰/۱۲۸

اور دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

(تاریخ یہ بتائے گی کہ) "کتنی ہی بستیاں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہمارے قانونِ مکافات نے اپنی گرفت میں لے کر تباہ کر دیا اس لیے کہ انہوں نے ظلم و استبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔ (اور کمزور و ناتواں انسان ان کے ہاتھوں سخت نالاں تھے) وہ ایسی اُجڑیں کہ اُن کی فلک بوس عمارتیں اوندھی ہو کر گر پڑیں۔ ان کے کنویں بے کار ہو گئے۔ ان کے مستحکم قلعے کھنڈرات بن کر رہ گئے۔"

اور آخر پر ایک اور فرمان اور وہ یہ کہ:

"کیا یہ لوگ ان علاقوں میں چلے پھرے نہیں کہ (ان سابقہ اقوام کے عبرت انگیز انجام کو دیکھ کر) ان کے دلوں میں عقل و فکر سے کام لینے کی صلاحیت اور ان کے کانوں میں بات سننے کی استطاعت پیدا ہو جاتی! (اصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کی طرف سے آنکھیں بند

کرلیتاہے تو) یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں اندھی ہوجاتی ہیں (وہ تو بدستور بینا ہوتی ہیں لیکن) ان کے دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں (اور اس طرح ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے)" ۲۲/۴۶

وحی اور عقل کا رشتہ

ان بیان کردہ حقائق کے تحت اگر دیکھا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ وحی اور عقل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم جز ہیں اور کسی ایک کو بھی دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس حقیقت کو اوسپنکی جیسے عظیم مفکر نے اپنے ہاں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے۔ وہ دونوں باطل ہوتے ہیں۔" (بحوالہ "انسان نے کیا سوچا" ص از پرویز)

اور LOCKE کے الفاظ میں یہ حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ:

"جو شخص وحی کے لیے جگہ بنانے کی خاطر عقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گُل کر دیتا ہے۔" (بحوالہ "انسان نے کیا سوچا" ص از پرویز)

ان مفکرین کے بعد جناب پرویز صاحب نے اس حقیقت کی وضاحت اپنی کتاب "انسان نے کیا سوچا" میں اس طرح بیان کی ہے کہ: "بلند ترین مذہب" وہی ہوسکتا ہے جو انسانی علم و بصیرت کی راہ نمائی کرے نہ کہ وہ جو علم و بصیرت کے سامنے شرمائے"۔ چنانچہ آج دنیائے عالم اپنے ناکام تجارب سے تنگ آکر بھٹکتے پھرتے اور وقت کے تھپیڑے کھاتی ہوئی وحی کی ان تمام خصوصیات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو چکی ہے۔ اسے آپ اوسپنکی کے الفاظ میں ہی سنیئے:

"اگر وحی کا تصور نہ ہو تو مذہب ہی باقی نہیں رہتا اور مذہب میں کوئی نہ کوئی عنصر تو ضرور ایسا ہوتا ہے جو عام فکر انسانی کے احاطۂ علم سے باہر ہوتا ہے۔ اس لیے اگر یہ کوشش کی جائے کہ جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس مجموعہ کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اِس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ مذہب نہیں بلکہ ایک فلسفہ زبوں ہوگا۔"
(بحوالہ "انسان نے کیا سوچا" ص ۴۲۱ از پرویز)

بیمار انسانیت کی جستجو

اور اس کے بعد ینگ کی تشخیص کے مطابق:

"میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لیے مذہبی زاویہ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب (دین) انسانوں کو مہیا کرتا ہے۔ اُن کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جاتی جو ان سے گم ہو چکی ہے۔ یہی ان کی دوا تھی۔" (انسان نے کیا سوچا صہ ۳۳۸)

یہ "شے" انسان میں کس قسم کا شعور پیدا کر دیتی ہے اس کے لیے آخر پر مندرجہ ذیل جامع اقتباس یقیناً قابلِ غور اور قابلِ فہم ہوگا۔

حقیقی کائناتی شعور کی عظمت

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص میں کائناتی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ . . . اُس کے ادراک میں ایک ایسی نورانیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ اس انسان کے سامنے کائنات کا مقصود و مفہوم، بجلی کی سی چمک کے ساتھ غیر مبہم طور پر بے نقاب ہو جاتا ہے وہ اس حقیقت کو محض عقیدتاً نہیں مانتا بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ عظیم القدر کائنات جو عام نگاہوں میں، ایک غیر ذی حیات، مادہ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں، فی الحقیقت حیاتِ مشہود ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیتا ہے کہ انسانی زندگی ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے، اسے فنا نہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ محسوس کرتا ہے کہ کائنات جو کچھ دکھائی دیتی ہے فی الحقیقت ایسی نہیں۔ اس میں جن باتوں کو دراصل اہمیت دینی چاہیئے وہ وہ نہیں جنہیں عام طور پر اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک زندگی کی اقدار اور حقیقت کے متعلق اس کے شعور کے تمام تصورات بدل جاتے ہیں جسے اس سے پہلے اصل سمجھا جاتا تھا وہ سراب بن جاتا ہے اور جسے سراب قرار دیا جاتا تھا وہ اصل اور حق بن جاتا ہے۔ . . .

(یہی وجہ ہے کہ ایک نبی جو) ایسے مقام پر فائز ہوتا ہے وہ ان تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل کو جو دورِ حاضر میں اس طرح ہمارے گلوگیر ہو رہے ہیں، اس انداز سے حل کر کے رکھ دیتا ہے۔ جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی سے ایک ایسی ملت تیار ہو جاتی ہے جو اپنے مقام کو پہچانتی ہے۔ اور تمام اقوام و ملل سابقہ کے اعمال و کردار کے لیے میزان بن جاتی ہے۔"

اس کے بعد اوسپنسکی ایک فیصلہ کن انداز میں لکھتا ہے کہ:

"اِس کائناتی شعور کی بیداری کے بغیر زندگی میں ضبط و ربط ناممکن ہے۔"

علامہ مشرقی کا دنیا کے ہوشمند انسانوں کو خطاب

فکر قرآنی کی روشنی میں اسی قسم کا کائناتی شعور رکھنے والی ایک قابل فخر شخصیت (جسے دنیا علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کے نام سے یاد کرتی ہے) نے ستمبر ۱۹۵۲ء کو دنیا کے کئی ہزار مشہور عالمان فطرت کو ایک مراسلہ تحریر کیا تھا۔ جی نہیں چاہتا کہ آخر پر اس قسم کی بصیرت افروز حقائق پر مبنی تحریر کو اہل نظر کی خدمت میں پیش نہ کیا جائے اس میں شک نہیں کہ پیش کیا جانے والا مراسلہ کچھ طویل ہے لیکن ہمارا خیال ہے موضوع زیر نظر کی وضاحت کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ اسے زینت اوراق بنایا جائے اگر آپ حضرات نے ان سطور کا یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کیا تو آپ یقیناً بے ساختہ حضرت عمر فاروقؓ کے اس قول کو دہرانے پر مجبور ہو جائیں گے کہ

"مومن خدا کے دیئے ہوئے نور سے دیکھتا ہے" علامہ فرماتے ہیں

۱۔ ہوشمند انسانوں کو، جو روئے زمین کے انسانی مسائل کو بلند نظر سے دیکھنے کے لئے تیار ہیں۔ پہلا مسئلہ جو حیران کر دیتا ہے۔ حسبِ ذیل ہے۔

اربوں اور کھربوں میل کی دوریوں تک آسمانی فضا میں لاتعداد کُرّے موجود ہیں جن کے متعلق انتہائی کاوش کے بعد بھی اب تک انسان کو معلوم نہیں ہو سکا کہ ان میں کوئی جاندار آبادی موجود ہے یا نہیں۔ یا اگر ہے تو وہ اعضائی لحاظ سے انسان سے بہتر ہے یا کمتر۔ عقل باور نہیں کرتی کہ یہ سب دو ارب کُرّے جو زمین سے کروڑہا گنا بڑے ہیں ویران پڑے ہیں کیا فطرت اس انتہائی حد تک فضول خرچ ہے کہ صرف اس زمین پر فطرت کو سمجھنے والی مخلوق یعنی انسان پیدا کیا ہو اور ذی ہوش مخلوق کسی اور جگہ نہ ہو۔ فطرت نے اگر ان میں انسان سے بہتر کوئی مخلوق پیدا نہ کی تو تعجب ہے اگر کی ہے تو وہ مخلوق کیا کر رہی ہے کن اعضا سے مرتب ہے اور کن احوال میں زندہ ہے۔ اس مخلوق کا ہم انسانوں سے ربط ضبط اب تک کیوں پیدا نہیں ہوا اور چونکہ پیدا نہیں ہوا اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ وہ مخلوق انسان سے ذہن میں برابر یا کمتر ہے اس بنا پر صرف انسان ہی اشرف المخلوقات ہے اور اس کے ذمہ اہم ترین فرض ہے کہ اس تمام لامتناہی مخلوق کو دریافت بلکہ مسخر کرے لیکن حال یہ ہے کہ وہ صرف زمین ہی کی مخلوق کا کروڑواں حصہ مسخر نہیں کر سکا۔ نزدیک سے نزدیک ستارے کو مسخر کرنا تو درکنار رہا!

چند ارب انسانوں کا اس زمین پر وجود صحیفۂ فطرت کی بے کراں پہنائی کے مقابلے میں بمنزلہ صفر کے ہے۔ کیا یہ چھوٹی سی آبادی جو ایک نقطہ سے بھی کم ہے کبھی نہ کبھی تمام صحیفۂ فطرت کو مسخر کرے گی وہم

میں نہیں آتا لیکن اگر اور کوئی مخلوق انسان سے بہتر کسی جگہ نہیں تو صحیفۂ فطرت کو مسخر کرنا صرف انسان کا کام ہے اور اگر ہوشمند مخلوق کے ذریعہ سے فطرت کو دریافت اور مسخر کرنا فاطر زمین و آسمان کا منشا نہیں ہے تو پھر اس نے یہ عظیم الشان کارخانہ کیوں پیدا کیا؟ یہ بھی باور نہیں آتا کہ یہ تمام حیرت انگیز اور مفید کائنات بے مطلب پیدا کی گئی ہے!

ادھر انسان کی یہ حالت ہے کہ کروڑ در کروڑ انسان اپنی اپنی کشمکش حیات میں لگے ہیں ان کو صحیفہ فطرت کو دیکھ کر کچھ تعجب نہیں ہوتا ان کو فرض کا احساس تو الگ یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کے ذمہ کوئی فرض ہے ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے صرف چند ہیں جو صحیفۂ فطرت کی طرف انسانی مفاد کی خاطر لگے ہیں۔ ان چند میں سے لاکھوں اب تک اسی جستجو میں اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے باوجود کسی بڑی منزل تک نہیں پہنچے۔ چند گھومنے والی مشینیں بنا سکتے ہیں جو کچھ تیز حرکت کر سکتی ہیں۔ لیکن صحیفہ فطرت کے کروں کی حرکت کے مقابلے میں یہ حرکت کچھ شے نہیں۔ یہ لوگ چند میل سے زیادہ اوپر نہیں جا سکتے۔ چند ہزار میل سے زیادہ دور کی آواز سن نہیں سکتے۔ دوربین کے ذریعے کروڑوں میل تک کچھ نہ کچھ دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ فاصلے بھی صحیفۂ فطرت کے فاصلوں کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ الغرض صرف چند لوگ بصیرت رکھتے ہیں۔ باقی تمام مخلوق انسانوں کی اندھی اور بہری اور گونگی ہے۔

ادھر انسان کی ایک اور حالت یہ ہے کہ مذہب، نسل، رنگ، قومیت، خواجگی، غلامی، سرمایہ داری، مزدوری، تعصب، عصبیت، جمہوریت، اشتراکیت وغیرہ وغیرہ کے لامتناہی جھگڑوں میں پھنسا ہے۔ جب سے اس کا ظہور اس زمین پر ہوا، لاتعداد جنگیں، بے انتہا فساد، اس زمین پر برپا ہیں قوم سے قوم الگ ہے اور کوئی صورت انسان کے ایک امت بن جانے کی نظر نہیں آتی۔ تاکہ صحیفۂ فطرت کو اپنی مجموعی قوت سے فتح کر سکے جو وحشت اور درندگی انسان میں ہے خدا کی کسی اور مخلوق میں ہرگز نہیں اور تمام صحیفۂ فطرت میں صرف انسان ہی ایک وجود ہے جو ایک جنس کا ہو کر آپس میں برسرپیکار ہے فساد کا سب سے بڑا محرک اب بھی خودساختہ مذہب ہی ہے جو انسان کو ایک وحدت میں پرونے نہیں دیتا۔ دوسرے محرک بھی ہزاروں ہیں جو انسانی امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کی اجتماعی قوت کو ضائع کر رہے ہیں۔

۲۔ دوسرا مسئلہ جو ہوشمند انسانوں کے لئے تعجب خیز ہے۔ حسب ذیل ہے کشمکش حیات جس میں انسان مبتلا ہے زیادہ تر انسان کی آپس کی جنگوں کی وجہ سے ہے۔ صحیفۂ فطرت سے براہ راست جنگ کی وجہ سے نہیں روئے زمین پر اب بھی انسانی خوراک اور ضروریات کے وسائل اس قدر کثرت سے ہیں کہ اگر سب انسان مل جل کر زمین کے خزانوں کو مسخر کریں اور ایک قوم دوسری قوم کو مغلوب اور کمزور کرنے کی کوشش نہ کرے اور

ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرے تو موجودہ آبادی سے دس پچاس ہزار گنا آبادی بھی ایک معتدل معیار زندگی قائم رکھ سکتی ہے اگر ایک قوم (مثلاً امریکہ یا روس) کی قوم جن کی آبادی بہ مشکل ۲۵ کروڑ ہے۔ دنیا میں باقی سب قوموں پر غالب آ گئی تو بالآخر زور آور قوم کے دستِ تظلم سے زمین کی آبادی اور کم ہو جائے گی اور غالب قوم کی کشمکش حیات بھی اسی تناسب سے کم۔ ایسی حالت میں غالب قوم کو اپنی چھوٹی سی آبادی کو زندہ رکھنے کے لئے زیادہ آسانیاں ہو جائیں گی اور وہ غالب قوم بالآخر کاہل ہو کر ہلاکت کے قریب خود بخود آ پہنچے گی۔

تقاضائے فطرت یہ ہے کہ کسی جنس کی کشمکش حیات کثرت آبادی کی وجہ سے مجموعی طور پر اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ جنس وسائل حیات کو زیادہ عمدہ طور پر حاصل کرنے کے لئے نئی زمینوں کو تلاش کرے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں اعضائی ارتقا بھی پیدا ہوتا جائے جو حیات کے وسائل زیادہ عمدہ طریقہ پر فراہم کرے، ایک چھوٹی سی قوم کے باقی سب انسانی قوموں پر غالب آنے سے یہ تقاضا پیدا نہیں ہو سکتا نہ اس زمین سے باہر کسی دوسری زمین کی تلاش کرنے کا ولولہ پیدا ہو سکتا ہے۔

دوسری دقت یہ ہے کہ ایک قوم کے دوسری قوموں پر غالب آ جانے سے صحیفہ فطرت کی تلاش بھی کم ہو جائے گی اور جس سرعت سے زمین کے تمام وسائل کو مسخر کرنے کے بعد نئی زمینوں کو مسخر کرنے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے وہ سرعت بھی نہ رہے گی۔

القصہ یہ کہ انسان کی آپس میں ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش غیر فطری ہے اور اس کا نتیجہ انسان کی نسلی ہلاکت ہے دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ انسان صحیفۂ فطرت کو مسخر کرنے سے رہ جائے گا۔

۳۔ ان حالات میں انسان کے سامنے فطری طور پر حسب ذیل مسائل پیش ہو جاتے ہیں۔ انسان اس روئے زمین پر اپنی آبادی کو زیادہ سے زیادہ کثرت سے پیدا کرے تاکہ کشمکش حیات زیادہ سے زیادہ پیدا ہو انسان آپس کے تمام تعصبات جو مذہب رنگ نسل وغیرہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہوں چھوڑتا جائے۔ مقصد آپس میں جنگ نہ ہو بلکہ صحیفہ فطرت سے جنگ ہو، موانست بلکہ اخوت قائم کرے جیسا کہ ادنی اجناس حیوانی میں ایک جنس کے اندر ہے، صرف چند لوگ ہی نہیں بلکہ نسل انسانی کا اکثر حصہ (سو فیصدی تک) فطرت کے استعمال و دریافت اور تسخیر میں لگ جائے تاکہ نہ صرف یہ کہ زمین کے تمام وسائل ختم ہونے کو آ جائیں بلکہ پیہم عمل سے ایجادات میں انتہائی ترقی ہو تاکہ زمین سے باہر کی دوسری زمینوں پر قبضہ کرنے کے سامان پیدا ہوں۔

۴۔ (الف) انسان کے آپس کے جھگڑے مٹانے کا مسئلہ اس قدر حیرت ناک طور پر مشکل ہے کہ اس کا حل ناممکن نظر آتا ہے۔ "مذہب" کے مخمصے کے متعلق اگرچہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ ایک خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے کئی ہزار نبی بھی بدیہی

طور پر الگ الگ پیغام نہیں لا سکتے اور یا سب جھوٹے ہیں یا اگر وہ سچے ہیں تو ان کے پیغام کو انسان نے ضد اور ہٹ دھرمی کے باعث غلط لیا ہے۔ لیکن انسان کو ابھی تک یہ بات سمجھ نہ آئی کہ یہ دلیل قطعی طور پر درست ہے خدا کا منشا ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے بنائے ہوئے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں اور یہ زمین فساد کا گھر بن جائے اگر انسان کسی کشمکش میں مبتلا ہو سکتا ہے تو مجموعی طور پر صرف فطرت کے خلاف ہو سکتا ہے

علی ہذا القیاس نسلی جغرافیائی، قومیت، سرمایہ داری اور مزدوری، آقائی اور غلامی کے جھگڑوں کے متعلق بنی نوع انسان کو سمجھانا کہ یہ سب غیر فطری ہیں اور انسان کی اعلیٰ ترقی یافتہ جنس کے لئے انتہائی طور پر ناموزوں، کسی ایک بات پر متفق ہو سکے۔ ادھر اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بین الاقوامی جھگڑے تو الگ رہے انسانی قومیں اپنی داخلی تنظیم میں بھی شہنشاہیت، جمہوریت، اشتراکیت یا اس قسم کے اور ڈھونگ رچا کر در اصل انسان کو انسان کی غلامی میں رکھنے کی تجویزیں کرتی رہی ہیں۔ ایک قوم کے اندر ہی بشر کو بشر کا پابند کرنے اور قوم کے خلاف مجموعی سازش کرنے کے لئے سامان روز بروز بنتے جاتے ہیں اور وہ افراد کی آزادی جو ادنیٰ حیوانوں میں نمایاں ہے۔ انسانی مجتمعات میں ہرگز نہیں۔ مغربی طرز کی جمہوریت میں بھی جو انسانی آزادی کا ایک مکمل مظہر سمجھا جاتا ہے بالآخر چڑھ سرمایہ دار کی ہے اور غریب طبقہ کی جو ہر ملک میں اکثریت میں ہے اتفاقاً کہیں حکومت قائم نہیں ہوتی نہ سرمایہ دار اس امر کی اجازت دیتا ہے کہ ملک کے سپاہی طبقہ کی جو ملک کی حفاظت کے لئے جائیں دیتا ہے حکومت قائم ہو ان تمام حالات میں تمام صحیفہ کائنات اور اس کے بلند مقصد کو سامنے رکھ کر انسان سٹ پٹا جاتا ہے کہ کیونکر مذہب، رنگ، نسل جغرافیہ، قومیت، سرمایہ داری، آقائی وغیرہ کے تعصبات سے نوع انسانی کو آزاد کر کے ذہنی اور اعضائی ارتقاء کے اس بام تک پہنچا دے جس تک سب ادنیٰ حیوانات روز آفرینش سے اب تک اپنے نوعی اتحاد کے باعث پہنچتے رہے ہیں۔ انسان میں اگر یہ نوعی اتحاد نہ ہوا تو غالب یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نسل لڑ لڑ کر ہی نیست و نابود ہو جائے گی اور آفرینش کا یہ سلسلہ جو انسان تک کروڑوں برس کے اعضائی ارتقاء سے پہنچا تھا یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ اس تخیل کی پستی یہاں تک پہنچی ہے کہ دنیا کے بعض مشہور سائنس دان بھی اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ انسانی اعضاء اور انسانی ذہن اب اس سے زیادہ مکمل تر نہیں ہو سکے گا۔ گویا وہ ارتقاء جو کروڑوں برس سے ہو رہا تھا اب آخری طور پر رُک چکا ہے اور انسان کی قسمت یہ ہے کہ اپنی داخلی کشمکش حیات میں ہی ایک دوسرے کو فنا کر دے اور اس کی نسل منقطع ہو جائے۔

(ب) ہوشمند انسانوں کے لئے سائنسدانوں کی یہ کم نگاہی نہ صرف حد درجہ تک افسوس ناک ہے بلکہ صریحاً غلط ہے کیونکہ کائنات کا یہ ناپید اکنار سلسلہ اس امر کو گوارا نہیں کر سکتا کہ انسان جیسی ہوشمند خلقت کو کروڑوں اور اربوں برسوں کے ارتقاء کے بعد پیدا کر کے پھر اس پر ارتقاء کو ختم کر دے اور کائنات کو پیدا کرنے کی غرض و

غایت ہی فنا کر دے۔

(ج) احوالِ فطرت کے مطالعہ سے جو طبقاتِ زمین کی پیدائش پر غور کرنے سے جو نتیجہ نکلتا ہے صاف طور پر یہ ہے کہ اگر ادنےٰ حیوانوں کے ارتقا سے انسان پیدا ہوا ہے تو انسان سے اور ہزارہا قسم کی برتر مخلوق کا پیدا ہونا اٹل ہے انسان کی سمجھ اگر اس وقت اس قدر ناقص ہے کہ وہ آپس میں لڑ رہا ہے تو اس سمجھ میں کافی تلخ اور ہولناک تجربوں کے بعد ترقی ضرور ہوگی حتیٰ کہ کسی باخبر انسان کی آواز یا اس طرح کا کوئی اور بڑا واقعہ تمام دنیا کے انسانوں کو اس امر پر متفق کر کے رہے گا کہ انسان کا مقصد آپس میں لڑائی نہیں بلکہ سب سفلی تعصبات کو خیرباد کہہ کر صحیفۂ فطرت سے جنگ کر کے بہتر نوع کی ارتقا ہے (قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق آخر کار یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔)

۱۹۱۴ء کی عالمگیر جنگ کے بعد پچھلے تیس چالیس برس سے انسان میں یہ احساس کہ دنیا کی سب حکومتیں مل جل کر اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کریں یا پچھلے دس پندرہ برس سے یہ احساس کہ تمام دُنیا پر ایک حکومت ہو اس انسانی سمجھ میں ترقی کی صاف علامتیں ہیں اگرچہ اس کی ترقی میں بھی زور آور کی قوموں کی بدنیتی کی جھلک روز بروز ظاہر ہو رہی ہے۔

۵۔ دنیا کی حکومتوں میں جو زیادہ تر ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے میں لگی ہیں اور جن کی توجہ اکثر ان ہتھیاروں کے تیار کرنے میں لگی ہے جو انسان کو ہلاک کریں اس شعور کا آجانا کہ وہ صلح اور رواداری سے مل کر زمین پر حکومت کریں یا اپنے تعصبات اور طاقت کا کبر و غرور چھوڑ کر آپس میں ایک ہو جائیں ابھی دائرہ عمل سے بہت دور نظر آتا ہے اور جب تک امریکہ اور روس کی باہمی عالمگیر جنگ دونوں سلطنتوں اور ان کی رفقاء حکومتوں کو کئی سالوں کے کشت و خون کروڑوں انسانوں کو ہلاکت اور دنیا کے اکثر معاشی وسائل کی دردناک بربادی کے بعد اس قدر کمزور نہ کر دے کہ روس اور امریکہ دونوں آنے والی عالمگیر جنگ کے بعد سچ مچ پشیمان نہ ہو جائیں اور بالآخر اس نتیجے پر نہ پہنچیں کہ آجکل کی انسانی لڑائیوں میں فریقین کا ناقابلِ تلافی نقصان لازمی ہے اور اب درحقیقت نہ کوئی فریق فاتح ہو سکتا ہے نہ مفتوح۔ اس وقت تک نئے شعور کا پیدا ہو جانا محال ہے لیکن یہ واقع بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا کی اکثر آبادی لڑ مر

لے انسانی اعضائی ارتقا کے سلسلے میں جو بات روزِ روشن کی طرح واضح ہے یہ ہے کہ اگر فی الحقیقت انسان نے کروڑوں اور اربوں میل دور تک کے صحیفۂ فطرت کو ایک نہ ایک روز مکمل طور پر مسخر کرنا ہے تو یہ تسخیر ان گوشت کے بنے ہوئے اعضاء سے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ان اعضاء سے تو انسان زمین سے صرف چند میل اوپر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور نہ ستاروں میں وہ لوازمات موجود ہیں جو زمین پر ہیں اس لئے لامحالہ انسان کا اعضائی ارتقاء اس قدر انقلاب انگیز ہو کر رہے گا کہ موجودہ گوشت پوست کو چھوڑ کر صرف روح ہی رہ جائے اور شاید یہ آنکھیں اس کے دیکھنے کے لئے بھی نہ رہیں۔

کو ہلاکت کے کنارے پہنچ چکی ہوگی اور اس وقت تک اس شعور کا انسان کے دماغ میں آ جانا بھی کچھ نفع مند ثابت نہ ہوگا۔

۶۔ پچھلی کئی صدیوں میں ایک دوسرا فعل جو انسان نے انسان سے لڑنے کے متعلق کیا ہے۔ نمایاں ہے۔ وہ سرمایہ اندوزی اور بالآخر سیاست کے میدان میں اس کی جڑھ ہے یورپ اور امریکہ کی خانہ ساز جمہوریت اور دنیا میں نیا اشتراکی فریب دونوں اس جرم کے مجرم ہیں اشتراکیت تو جمہوریت سے بڑھ کر انتہائی قسم کی سرمایہ داری ہے جو تمام رعیت کی ملکیت کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے اور امریکہ کی سرمایہ داری سے بھی زیادہ عالمگیر جنگوں کی جارحانہ کارروائی میں مصروف ہے۔ اشتراکیت کا جمہور کو دنیا فریب کہ اس میں مزدور کی چڑھ ہے ایک حیرت انگیز فریب ہے کیونکہ یہ دراصل انتہائی سرمایہ داری کی طرف سے مزدور کی چڑھ نہیں بلکہ مزدور کی انتہائی طور پر غلامانہ تنظیم اور بالآخر انسان کی انفرادیت کو کچل دینا ہے۔ القصہ اس وقت انسان جس ہولناک نئی غلطی میں مبتلا ہے وہ سرمایہ داری کا غلبہ ہے اور یہ سرمایہ داری کا غلبہ انسانوں کو آئے دن کی عالمگیر جنگوں میں مبتلا کر کے بڑے پیمانے پر ہلاک کرنے کا زبردست آلہ ہے۔

(ب) عالم فطرت کا مقام بلند

(ب) پورے غور سے اگر دیکھا جائے تو زر اگر دنیا کے باشندوں کو آسائش کے سامان پہنچانے کا زبردست ہتھیار اور مزدور طبقہ اگرچہ آسائش اور ترقی کے سامان تیار کرنے کا واحد وسیلہ ہے لیکن سرمایہ دار اور مزدور دونوں طبقے انسانی تمدن اور تہذیب کی جڑ نہیں، سرمایہ دار صرف اپنا روپیہ جو اس نے جمع کیا ہوتا ہے۔ بڑے پیمانے پر صرف کرتا ہے اور انسانی تمدن کی آسائشوں کا خام سامان اس روپیہ سے خریدتا ہے۔ مزدور صرف اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے اس سامان کو کسی دوسرے شخص کی ہدایت کے مطابق تیار کر دیتا ہے۔ دنیا کے باشندوں کو آرام اور آسائش یا ترقی کے سامان پہنچانے میں اس سے زیادہ دخل سرمایہ دار اور مزدور کو ہرگز نہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہ سرمایہ دار اور مزدور دونوں کسی تیسرے شخص کے آلہ کار ہیں۔ ان دونوں میں کسی آرام دہ شے کے سامان فراہم کرنے یا تیار کرنے کی طاقت ضرور ہے لیکن ان دونوں میں اس شے کو ایجاد کرنے کا دماغ نہیں اور جب تک وہ ایجاد موجود نہ ہو سرمایہ دار اور مزدور دونوں بے کار شے ہیں اور دنیا ایک قدم اس ایجاد کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی

۷۔ پس اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا کی ترقی اور تمدن کا سب سے بڑا باعث بلکہ واحد باعث وہ عالم

فطرت ہے جو فطرت کا مطالعہ کر کے روز افزیش سے نئی ایجادیں کر رہا ہے اور جس کے دم سے دنیا کو مسلسل آرام پہنچ رہا ہے اس شخص کا ذہن عوام الناس کے مقابلے میں اس قدر روشن اور رسا ہے کہ وہ فطرت کی بےجان اشیاء کو لے کر اور ان کو آپس میں اپنی ترکیب سے رلا ملا کر وہ چیزیں پیدا کر رہا ہے جو انسان کی راحت اور آرام کا باعث ہیں جب تک اس کی وضع کی ہوئی شے منظر عام پر نہ آ جائے زر اور مزدور قطعاً بےکار ہیں اسی کی پیدا کی ہوئی کسی شے کے فائدے زر کی حرکت کے باعث ہیں اور یہی فائدے مزدور کے بازوؤں کو حرکت میں لاتے ہیں اس نقطۂ نظر سے روئے زمین پر عالم فطرت ہی سب سے زیادہ اہم وجود ہے اور زر اور مزدور اس کے صرف کارندے ہیں جو ہر لحاظ سے اپنی حیثیت میں اس سے بدرجہا ادنیٰ تر ہیں لیکن حیرت ہے کہ انسان نے اپنے مکر و فریب سے عالم فطرت کو ہمیشہ وہ حیثیت دی ہے کہ وہ دنیا کی ہلاکت انگیز اور جاں آشوب سیاست میں کسی شمار میں نہیں آتا وہ سرمایہ دار کا ادنیٰ غلام ہے اپنی انقلاب انگیز اور جہاں آرا ایجادوں کو روز بروز پیدا کرنے کے باوجود اس کے سامنے دم بخود ہے۔ اپنے معمل کے گوشوں میں عاجزوں اور یتیموں کی طرح بیٹھا ہے اور اپنے سیاسی سرمایہ دار کو اپنا رازق سمجھ کر اپنے افعال کو اس کی سیاست کے تابع سمجھتا ہے۔ ایٹم بم جیسی طاقتور شے کو اپنے زورِ دماغ سے ایجاد کر کے یتیموں کی طرح اس کو سیاسی درندوں کے سپرد کر دیتا ہے غلامی کے اس عجز پرور ماحول میں اس کو شعور نہیں رہا کہ دنیا اس کے بل بوتے پر قائم ہے اور اگر وہ نہ ہو تو دنیا کا ایک ایک گوشہ ظلمت اور جہالت میں پھنس جائے۔ احساس کمتری نے اس کا درجہ مزدور کے برابر کر دیا ہے اور سرمایہ دار اس کو مزدور سے بہتر سمجھنے سے جھجکتا ہے اور گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کو وہ درجہ دیا جائے جس کا وہ صاف اور منطقی طور پر حق دار ہے۔

صحیفہ فطرت اس کائنات میں واحد حقیقت ہے اس کے سوا جو کچھ انسان نے از خود پیدا کیا ہے ظن ہے۔ علم کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس صحیفۂ فطرت کا عالم اپنی ایجادوں کے باعث انسانوں میں بہترین ذہن کا مالک ہے اور اسی بہترین ذہن کا مالک ہونے کی وجہ سے صحیفہ کائنات کے پیدا ہونے کے مقصد کو اور انسانوں سے بہتر سمجھ سکتا ہے۔ عالم فطرت ہی اس نتیجہ پر بہتر ساز و سامان اور دلائل کے ساتھ پہنچ سکتا ہے کہ بنی نوع انسان کو اس زمین پر کس طریقے سے چلنا چاہیئے تاکہ فطرت کا مقصد پورا ہو۔ الغرض باوجود اس کے کہ عالم فطرت کی حیثیت موجودہ دنیا میں غلام سے زیادہ نہیں۔ انسان کی سیاست کو عالم فطرت ہی سمجھ سکتا ہے، عالم فطرت ہی انسان کی سیاست کو بحیثیت مجموعی سمجھنے کا اہل ہے۔

سیاسی لوگ جو اس وقت دنیا کو چلا رہے ہیں فطرت سے نابلد ہونے کی وجہ سے اس کو غیر فطری بنیادوں پر چلا کر اپنے انتہائی محدود ذاتی اغراض کو پورا کر رہے ہیں۔ فطرت کے مقصد کو پورا نہیں کرتے۔ ادنیٰ حیوانی

جنہیں ابتدائے آفرینش سے اب تک فطرت کے مقصد کو اس لئے پورا کرتی آتی ہیں کہ ان میں فہم و ادراک کا امتیازی وصف نہ تھا جو کچھ فطرت نے ان کو سکھایا اس پر بے سوچے سمجھے چلتی گئیں اور فطری تقاضا کے باعث ہی ارتقاء کرتی گئیں یا مٹتی گئیں۔ لیکن انسان فہم و ادراک کا حامل ہونے کے باعث اپنی مرضی سے نوع انسان کو جدھر چاہتا ہے لے چلتا ہے۔

فطرت کے بنیادی قاعدوں کا پابند رہنا اور انسان کو تقاضائے فطرت کے مطابق چلانا اس کو گوارا ہی نہیں بلکہ اس کے زعم میں اس کی توہین ہے۔ ان حالات میں عالم فطرت ہی وہ وجود ہے جو بنی نوع انسان کو ایسی راہ پر چلا سکتا ہے جو اس نوع کی مجموعی بہبودی کا باعث ہو۔

ادھر عالم فطرت ہی وہ وجود ہے جس کی قوت فکر اور وسعت نظر بہ باعث اس کی حیران کن ایجادوں کے عام انسانوں میں نہ صرف لائق احترام ہو سکتی ہے، بلکہ اس کے موجودہ خود غرض سیاستدانوں کے مقابلے میں بدرجہا صحیح تر نظریوں کا حامل ہونا لازمی ہے

دوم :۔ عالم کی اسی بے انداز برتری اور فوقیت کی وجہ سے ہی عالم کا مقام ہے کہ وہ انسان پر علمی اور ذہنی حکومت کے علاوہ سیاسی حکومت بھی کرے اور ہر سچائی کے معاملے میں دنیا کے تمام عالموں کے داخلی اتحاد اور یک جہتی کی وجہ سے بنی نوع انسان کو بحیثیت مجموعی ان راہوں پر چلاتا جائے جو فطرت کا تقاضا ہے۔

سوئم :۔ عالم کی حکومت ہی سرمایہ داری کے ناروا زور کو جو جمہوری طرز کے ملکوں میں غریب کے ووٹوں کو خرید کر زر کی حکومت پیدا کر رہے ہیں فنا کر کے کسی معتدل سطح پر لا سکتی ہے کیونکہ عالم کے علم کے مقابلے پر زر کی اہمیت اس قدر نہیں جس قدر کہ اب ہے۔

چہارم :۔ عالم کی حکومت ہی (چونکہ وہ خود مزدور ہے) اور غریب طبقے سے اس کا فطری تعلق ہے مزدور اور غریب طبقے کی اکثریت کو مدنظر رکھ کر جمہوریت کی سچی روح یعنی نہ صرف غریب کی حکومت قائم کر سکتی ہے بلکہ غریب اور مزدور طبقے کو زر کی حکومت سے آزاد کر کے نسل انسانی کے بڑے سے بڑے حصے کو فطری طور پر آزاد کر سکتی ہے۔

الجھے ہوئے انسانی مسئلوں کا حل

۹۔ ان بنیادوں پر زمین کے الجھے ہوئے انسانی مسئلوں کا فطری حل جو کسی ہوشمند انسان کے دماغ میں آ سکتا ہے۔ حسب ذیل ہے۔

اوّل :۔ ہر ملک میں انسانی آبادی کو دو طبقوں یعنی امیر اور غریب میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ غریب کے طبقے کا نمائندہ امیر اور امیر کے طبقے کا نمائندہ غریب نہ ہو سکے اور کیونکہ غریب ہر ملک میں بے انتہا زیادہ کثرت سے ہیں۔ غریب کی حکومت بلحاظ تناسب آبادی قائم کی جائے۔

دوئم :۔ غریب طبقے میں عالم فطرت کو ہر ملک میں نمائندگی دیئے جانے کا انتظام اس طریقہ سے کیا جائے کہ سوائے عالم کے کوئی دوسرا شخص منتخب نہ ہو سکے۔

سوئم :۔ صرف چند عالم ملکوں کے سیاسی نمائندے ہوں جو اور امور کے علاوہ تلاش صحیفۂ فطرت کی عام ہوا پیدا کریں۔ باقی بدستور اپنی ایجاد اور تلاش میں مصروف رہیں۔ ہر ملک کا سرکردہ شخص انتہائی طور پر وسیع النظر اور مشہور عالم ہو جو اپنے مدۃ العمر تجربہ کے بعد ملک کو فطرت کی راہ پر چلائے۔

چہارم : تمام ملکوں کے سرکردہ عالم حکمران متحدہ طور پر انسانی جنگوں کو بند کریں مذہبوں کو جو انسان نے آپس میں جنگ کرنے کے ڈھونگ بنائے ہیں ختم کر کے فطرت کے "مشترک مذہب" کا اعلان کریں جو سب نوع انسان کو قبول ہو، نسل اور رنگ کے بے ہودہ تفرقوں کو مٹائیں سرمایہ کو اس کا مناسب مقام دیں غریب اور مزدور کی سچی خوشحالی کے قواعد وضع کریں انسان کے غریب اور مزدور طبقے کو مجموعی طور پر زمین کی بہتری کے لئے استعمال کریں زمین کے وسائل کے متحدہ استعمال اور فطرت کی تسخیر کیلئے متحدہ منصوبے بنائیں تاکہ انسان متحدہ طور پر آگے بڑھنے کے قابل ہو۔

پنجم :۔ اگر ضرورت لاحق ہو تو تمام روئے زمین پر ایک حکومت قائم کی جائے جو نسل انسانی کو ایک راہ پر چلائے۔

ششم :۔ وسائل زمین کو زیادہ مؤثر طریقوں پر استعمال کرنے کے منصوبے اور طریقے متحدہ طور پر وضع کئے جائیں۔

ہفتم :۔ موجودہ علم چونکہ زیادہ تر بے جان اشیاء کی تحقیق و تلاش ہے اور زندگی کے راز کو انسان نے اب تک دریافت نہیں کیا۔ اس لئے علمائے فطرت کا یہ زمینی گروہ اس علم کو ناقص گردان کر اس سے بہتر علم کی راہ دریافت کرے اور صحیفہ فطرت کو زیادہ مکمل طور پر جاننے

کے لئے علم کی بنیادیں وسیع کی جائیں بلکہ فطرت کی زندہ اشیاء کی ماہیئت کو سمجھنے کے لئے پیمائش کی نئی فطری اکائیاں وضع کی جائیں جو موجودہ اکائیوں اور بنیادوں سے قطعی طور پر مختلف ہوں۔

ہشتم :۔ عالمانِ فطرت پیدائش کائنات کا کوئی متفقہ مقصد قرار دے کر بنی نوع انسان کو اس مقصد کی طرف لگا دیں تاکہ تمام نسل انسانی کسی نصب العین تک پہنچ سکے اور بالآخر اس مقصد تک پہنچنے کے لئے انسان میں کوئی اعضائی ارتقاء خود بخود پیدا ہو یا علماء اپنے اعضاء پر مجاہدے کر کے اس ارتقاء کو قریب تر لائیں۔

نہم :۔ بالآخر یہ کہ علم کی اس عظیم الشان اور انقلاب انگیز حکومت کے سائے میں نسل انسانی کو منشائے فطرت کے اس قدر تابع اور انسانی سعی و عمل کو اس حد تک وسیع اور نتیجہ خیز کیا جائے کہ صحیفۂ فطرت کی ان بے کراں پہنائیوں میں تلاش فاطر السمٰوٰت کا مسئلہ اس قدر ہیجان انگیز اور قریب الحل ہوتا جائے کہ ہزاروں اور لاکھوں سال کی زہرہ گداز اور جانکاہ کشمکش کے بعد منشائے فطرت پورا ہو اور انسان کی ملاقات خدا سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔

کیا ہوشمند انسانوں کا کوئی گروہ کائنات کے اس لازوال ہنگامے کو جو لاکھوں اور کروڑوں برس سے رونما ہے فکر و دانش کے ان فطری اور نتیجہ خیز خطوط پر چلا کر انسان کو راہ راست پر لا سکتا ہے؟

کیا لاکھوں سال کی نادانی اور بے ہوشی کے بعد آج ہر ملک اور خطے میں ایسے دانشور انسان پیدا ہو سکتے ہیں جو کائنات کی پیدائش کے اس مقصد کو پا کر دیوانہ وار اس سعی میں لگ جائیں کہ انسانوں کی مخلوق کو اس بھید سے آشنا کر کے ان میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی عالم آرا اور لازوال تڑپ پیدا کر دیں۔"

(حدیث القرآن : ۱۳ ستمبر ۱۹۵۴ء)

مملکت پاکستان کیوں؟

مملکتِ پاکستان اس قسم کی اُمّتِ واحدہ تیار کرنے کے لیے حاصل کی گئی تھی کہ جس کا جوہرِ حقیقی یقینی طور پر ہر قسم کی مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کے بندھنوں سے قطعی طور پر آزاد ہو اور جس کا کائناتی شعور قرآنِ حکیم کے تصور کے مطابق بیدار کیا جائے تاکہ پاکستان کا ایک ایک فرد وہ کچھ بن جائے جیسا کہ خدا چاہتا ہے۔ اور اس طرح ملّتِ پاکستان اپنی عملی زندگی کا ثبوت مہیا کرتے ہوئے اس کرۂ ارض پر ایک ایسے نظامِ حیات کی بنیاد رکھے جو بتدریج نوعِ انسانی کے لیے منفعت بخشی کا سامان فراہم کر سکنے کے علاوہ تمام اقوام و ملل کے اعمال و کردار کے لیے میزان بن جائے اور اس طرح یہ ملّت دنیا کے کونے کونے میں بسنے والے افراد کو بآوازِ بلند کہہ سکے کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

یہی وہ ایک عملی طریق ہے جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ قرآنِ حکیم کے غیر متبدل اصول ہی آج کی بیمار انسانیت کا آخری سہارا ہیں جس کی تعلیم اور حکمرانی کے بعد نہ کوئی کہیں ہامان باقی رہتا ہے نہ فرعون اور نہ قارون۔ ان امراض کے خاتمے کے بعد انسانیت یقیناً نفسیاتی بیماری میں مبتلا نہیں رہ سکے گی۔ لہٰذا اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ انہی امراض کے علاج میں پوشیدہ ہے۔ اب دیکھئے اس علاج کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصے آتی ہے۔

بہرحال مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی کی دلدل میں گرفتار ملّتِ اسلامیہ کے متعلق تمام روئیداد کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم ہر قسم کی فرقہ واریت کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے نکل کر سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ عالمگیر ضابطۂ حیات (قرآنِ حکیم) کو اتنا مضبوطی سے تھام لیں کہ ہم میں ایک بار پھر جہاں بانی و جہاں آرائی کی صلاحیتیں کچھ اس طرح بیدار ہو جائیں کہ ہم مرنے اور جینے کے آداب سے واقف ہو جائیں، خلوص کی دولت ہمارا شعار ہو، واضح نصب العین، حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اور سنجیدہ طرزِ عمل کے سرمایۂ حیات کے علاوہ نوعِ انسانی کی سطح تک کے مفادات کا تحفظ اور بے حد و حساب احترامِ آدمیت ہمارا مقصد ٹھہرے اور اس طرح قائدِ اعظم اور علامہ اقبال کی تمناؤں کا یہ گہوارہ بتدریج ایسا گہوارہ بن جائے کہ گھر گھر میں اسلحہ سازی کے بجائے انسان سازی کے باعث انسانیت کا حصول اتنا آسان ہو جائے جتنا آج مشکل ہے۔

کس قدر خوش بخت ہوگا وہ دور جس دَور میں یہ زمین اپنے پیدا کرنے والے کے نُور سے جگمگا اُٹھے گی اور جس دَور میں جنّت سے نکلا ہُوا آدم ایک بار پھر جنّت میں داخل ہو سکے گا۔ خدا کرے یہ سعادت اہلِ پاکستان کے حصے آئے اور اس خطے سے طلوع ہونے والا یہ خورشیدِ درخشاں اپنی ضیا پاشیوں سے پوری دنیا کی تاریکی کو منور کر دے۔

لیکن یہ مثالی زندگی قرآنِ حکیم کی روشنی میں اُمّتِ واحدہ کے تصور کو اپنانے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ فرقہ واریت کی نمازوں اور سیاسی گروہ بندیوں سے۔ یہ تمام عوامل تو انسان کو انفرادیت کی اندھیری غار میں کچھ اس طرح دھکیل دیتے ہیں کہ جہاں وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کے حسین نظاروں کو دیکھنے کے لیے انسانیت کی نظریں ترس کر رہ جاتی ہیں اور جہاں جنّت سے نکلا ہُوا یہ آدم بھرے معاشرے میں زندگی گزارنے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ جماعت سازی (اُمّتِ واحدہ) کی یہی وہ اہمیت تھی جس کے متعلق علامہ اقبال رح اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

ہر کہ آب از زمزمِ ملّت نخورد
شعلہ ہائے نغمہ در عودش فسرد

"جس فرد نے ملّت کے چاہِ زمزم سے آبِ حیات نہ پیا، اس کے بربطِ ہستی میں نغموں کے شعلے بجھ کر رہ گئے۔ فرد کے لہو میں جوش۔ اس کے جگر میں حرارت۔ اس کے سینے میں ولولے۔ اس کے بازوؤں میں قوت سب

ملت کے ساتھ وابستگی سے پیدا ہوتے ہیں۔" علامہ اقبال ؒ کے ہی الفاظ میں ؎

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

"زندگی تخلیقِ مقاصد کا نام ہے۔ لیکن تنہا فرد، تخلیقِ مقاصد کر ہی نہیں سکتا۔ وہ بے مقصد جیتا ہے۔
اور بے مقصد مرجاتا ہے اور اس کی قوتیں (DIFFUSED) اور اس کی توانائیاں
ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی تعمیری نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔"
یہی وہ عواقب ہیں جن سے بچنے کے لیے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا :

"جو جماعت سے الگ ہوا، اُسے شیطان اُچک کر لے گیا اور وہ جہنم کی انتھاہ گہرائیوں میں جا گرا۔"

اقبال نے کہا ہے — "اس میں شبہ نہیں کہ ہم آج راکھ کا ڈھیر ہیں لیکن ہماری خاکستر میں اس کے امکانات ہیں کہ اس سے وہ شعلہ پیدا ہوجائے جو باطل کے خس وخاشاک کو جلا کر خاکستر کردے ؎

غنچۂ ما گلستاں در دامن است — چشمِ ما از صبحِ فردا روشن است

ہماری ملت کا ننھا سا غنچۂ ناشگفتہ اپنے اندر پورے کا پورا گلستان لیے بیٹھا ہے۔ ذرا سی مساعد فضا مل جائے تو آپ دیکھیے گا کہ یہ غنچہ کس قدر بہار آفرینیوں کا موجب بنتا ہے۔ آج ہماری رات بے شک تاریک ہے لیکن ہماری آنکھ اس نور سے روشن ہے جو ہم میں مستقبل میں نمودار ہونے والا ہے۔"

والسلام

محمد اشرف ظفر ۳ ۲/۱۹۸۷

اتاترک کا آخری پیغام

(دسمبر 1948ء)

"ترکی کے نوجوانو! تمہارا اولین فریضہ ترکی کی آزادی کا تحفظ ہے۔ اسی پر تمہاری ہستی اور مستقبل کی بنیاد ہے' یہی تمہاری بیش بہا متاع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد خود تم میں ایسے لوگ پیدا ہو جائیں یا بیرونی قوتیں یہ مسموم ارادہ کر لیں کہ تمہیں اس متاع گراں بہا سے محروم کر دیا جائے۔ اس لئے اگر کسی ایسے دن تمہیں پکارا جائے کہ آؤ اپنی آزادی کے تحفظ کا سامان کرو تو تمہیں اس آواز پر فوراً" لبیک کہنا ہو گا۔ بے تامل اور بے توقف لبیک خواہ حالات کیسے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں۔

شاید حالات اس درجہ ناساز گار ہو جائیں کہ خود تمہاری عزت بھی معرض خطر میں ہو اور جو لوگ تمہاری آزادی کو سلب کرنا چاہتے ہیں' انہیں ایسی ایسی فتوحات حاصل ہو جائیں کہ جن کی مثال نہ ملتی ہو ملک کے تمام قلعے تمہارے ہاتھوں سے نکل جائیں۔ تمام اسلحہ خانے دشمن کے قبضہ میں چلے جائیں۔ ہمارے تمام لشکر منتشر ہو جائیں اور دشمن ملک کے کونے کونے پر مسلط ہو جائے۔ نہیں! بلکہ حالات یہاں تک مایوس کن ہو جائیں کہ خود تمہارے ارباب اقتدار ملک کی حفاظت کی طرف سے بے پرواہ اور بے راہ رو ہو جائیں اور وہ اپنے مفاد کو خود حملہ آوروں کے مفاد سے منسلک کر لیں۔ درآنحالیکہ قوم بھوک اور' فلاکت سے دم توڑ رہی ہو۔

لیکن اے ترکی مستقبل کے جانباز بچو! ایسے حوصلہ شکن اور روح فرسا حالات میں بھی تمہارا فریضہ یہی ہونا چاہئے کہ تم ترکی کی آزادی کو بچاؤ اس کے لئے تمہیں جس قوت کی ضرورت ہے وہ کہیں باہر سے نہیں آئے گی۔ وہ اس خون میں موجود ہے جو تمہاری رگوں میں موجزن ہے"۔

پاکستان کے شاہین بچو! اتاترک کا یہ پیغام تمہارے لئے بھی ہے۔ اگر تم نے بھی اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا سیکھ لیا تو تم دیکھ لو گے کہ حالات کس طرح خود بخود ساز گار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مسلم استی! سینہ را از آرزو آباد دار
ہر زماں پیش نظر لا یخلف المیعاد دار

حوالہ (جنگ خلیج کی تباہ کاریاں اور عالم اسلام کا مستقبل) از محمد اشرف ظفر

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

(اقبالؒ)